جلد اول

«صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي»

"تم ویسے نماز ادا کرو جیسے تم نے مجھے نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔"

فِقهُ الصَّلاة

نمازِ نبوی مدلل

تالیف

فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر

جلد اول

«صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي»

”تم ویسے نماز ادا کرو جیسے تم نے مجھے نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا ہے“

فِقهُ الصَّلاة

نمازِ نبوی مدلل

تالیف

فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ

《صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ》

"تم ویسے نماز ادا کرو، جیسے تم نے مجھے نماز ادا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔"

فِقهُ الصَّلاة

(جلد اول)

نمازِ نبوی مدلل

تالیف

فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ

تدوین و تبییض

حافظ ارشاد الحق و ام محمد شکیلہ قمر حفظہما اللہ

ناشر

مکتبہ کتاب و سنت

ریحان چیمہ - ڈسکہ

ام القریٰ پبلی کیشنز

سیالکوٹ روڈ گوجرانوالہ

نام کتاب

فِقهُ الصَّلاة

(جلد اول)

نمازِ نبوی مدلل

تالیف
فضیلۃ الشیخ مولانا محمد منیر قمر حفظہ اللہ

تدوین و تبییض
حافظ ارشاد الحق و ام محمد شکیلہ قمر حفظہما اللہ

طبع: ________ مئی 2016ء

کمپوزنگ: ________ عدنان قمر سلمہ اللہ

سیٹنگ: ________ ابوسفیان عزیزی

تعداد: ________ 800

ناشر

مکتبہ کتاب و سنت
ریحان چیمہ۔ ڈسکہ

ام القریٰ پبلی کیشنز
سیالکوٹ روڈ گوجرانوالہ

055-3823990 / 0321-6466422

بسم الله الرحمن الرحیم

فہرست مضامین

آغاز کتاب

پیش لفظ

اِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَ سَیِّئَاتِ أَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْ فَلَا ھَادِيَ لَہٗ وَأَشْھَدُ أَنْ لَّاإِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ. أَمَّا بَعْدُ:

زیرِنظر کتاب مولانا محمد منیر قمر صاحب ﷾ کی ان تقاریر کا مجموعہ ہے، جو متحدہ عرب امارات کی ریاست ام القیوین کے ریڈیو اسٹیشن کی اُردو سروس سے نماز کے بارے میں روزانہ نشر ہونے والے پروگرام ''دین و دنیا'' کے تحت نشر کی گئی ہیں اور بعد میں ان کو ترتیب دے کر کتابی شکل دی گئی ہے جو آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

ان تقاریر میں ہمارے فاضل دوست مولانا قمر صاحب نے موضوع اور اس کے متعلقات کے بارے میں کچھ تفصیلی گفتگو فرمائی ہے، جو نہایت ہی مفید اور مدلل ہونے کے ساتھ ساتھ آسان ہے۔

بندۂ عاجز نے افادۂ عام کے لیے ان ریڈیائی تقاریر کو ترتیب دیا ہے اور ''مَا لَا یُدْرَکُ کُلُّہٗ لَا یُتْرَکُ جُلُّہٗ'' کے تحت مختصر سا تخریج کا کام بھی کیا ہے۔ بعض جگہ جہاں کہیں اصل کتب کا حوالہ نہیں تھا، وہاں اصل کتب کا حوالہ دے دیا ہے۔

مولانا محمد منیر قمر صاحب نے یہ پروگرام مختلف کتبِ حدیث و فقہ اور ان کی شروحات کو سامنے رکھ کر بڑی محنت و کاوش سے تیار کیے ہیں۔ اس لیے کتبِ حدیث کے حوالے دیتے وقت تخریج یا حاشیہ میں مذکور کتب میں سے کسی ایک مصدر یا مرجع کی نص سے مطابقت ہوگی اور بعض جگہ اگر کوئی حدیث بخاری و مسلم کی ہے تو صرف ان دونوں ہی کے تذکرے پر اکتفا کیا گیا ہے، البتہ بعض جگہوں پر دوسری کتبِ حدیث کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ اس تقصیر و کوتاہی کی وجہ کتابت میں جلدی اور وقت کی کمی کے ساتھ ساتھ میرے اپنے فرائض منصبی بھی ہیں۔

ہاں اگر ترتیب میں کوئی خلل یا تخریج و تحقیق میں کوتاہی ہو تو بندہ اس کا معترف ہے اور احباب

سے گزارش ہے کہ اس پر مطلع فرمائیں، تاکہ آیندہ طباعت میں اس کا ازالہ کیا جاسکے۔

مولانا قمر صاحب نے حتی المقدور کوشش کر کے صحیح احادیث سے استدلال کرتے ہوئے ان پروگراموں کو پیش کیا ہے اور موقع بہ موقع ضعیف احادیث کی نشان دہی بھی کی ہے۔

ہاں! انسان علم میں کتنا ہی پختہ کیوں نہ ہو، پھر بھی اس کا علم ناقص ہے اور رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق ہر انسان خطا کار ہے۔ اس لیے اہلِ علم حضرات سے التماس ہے کہ اگر وہ کسی ضعیف حدیث پر اطلاع پائیں تو نشان دہی فرمائیں۔ ہم ان کے شکر گزار ہوں گے اور ان شاء اللہ آیندہ ایڈیشن میں ہم ان اہلِ علم و تحقیق حضرات کی آراء کا احترام کرتے ہوئے اس کی اصلاح کر دیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے فضل و کرم اور رحمت سے مجھے یہ کام کرنے کی توفیق بخشی اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کام کو پورا کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین ثم آمین

آخر میں مَیں اپنے فاضل دوست مولانا محمد منیر قمر صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے نماز کے بارے میں پیش کیے گئے پروگراموں کا تقریری مجموعہ ترتیب دینے کے لیے میرا انتخاب کیا اور اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کے علم و عمر میں برکت فرمائے اور انھیں مزید نیکی و خدمتِ دین کی توفیق بخشے۔

قارئین سے التماس ہے کہ مؤلف و ناشر کے ساتھ ساتھ بندہ کو بھی نیک دعاؤں میں یاد رکھیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے ہماری اس محنت و کاوش کو شرفِ قبولیت سے نوازے اور آخرت میں ہمارے لیے ذریعۂ نجات بنائے اور قارئین کے لیے اس کتاب کو نفع بخش بنائے۔ آمین ثم آمین

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ أَجْمَعِيْنَ وَمَنْ تَبِعَهُمْ بِإِحْسَانٍ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ.

حافظ ارشاد الحق

رکن مرکز الدعوۃ والارشاد۔ دبئ

۱۰/ ۱۱/ ۱۴۱۳ھ

حرفِ آغاز

إنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ، نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنفُسِنَا وَ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ، وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَا هَادِيَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَن لَّا اِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، وَأَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ.

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَ لَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ [آل عمران: ۱۰۲]

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَ لُوْنَ بِهٖ وَ الْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا﴾ [النساء: ۱]

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۝ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَ يَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا﴾ [الأحزاب: ۷۰، ۷۱] أَمَّا بَعْدُ:

معزز قارئین! السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

اللہ کی توفیق وعنایت اور اس کے فضل وکرم سے عرصہ پانچ سال کے دوران میں ہم نے مختلف مواقع کی جملہ سات سو چھیاسی (۷۸۶) نشستوں میں ریڈیو متحدہ عرب امارات، ام القیوین کی اردو سروس سے ''نماز'' کے احکام و مسائل اور اس کے متعلقات کے بارے میں تفصیلات جو مسائل و احکام طہارت یا اوقاتِ نماز اور نمازِ باجماعت سے متعلق ہیں، اس پہلی جلد میں پیش کی ہیں اور دوسری تیسری جلد بھی اس کے ساتھ ہی زیرِ طباعت ہے۔ اس طرح ''مسائل و احکامِ نماز'' سے متعلقہ تمام ضروری تفصیلات جو ریڈیو سے نشر ہوئیں، وہ ایسی ہی کئی جلدوں میں مرتب ہو کر آپ کے سامنے

آجائیں گی۔ إن شآء اللّٰہ، وَبِیَدِہِ التَّوفِیْقَ وَالسَّدَادَ.

اس کتاب کی ترتیب وتبییض کے سلسلے میں جتنی محنت ہمارے فاضل دوست جناب حافظ ارشاد الحق صاحب (فاضل مدینہ یونیورسٹی۔ مقیم الذید۔ شارجہ) نے کی ہے، وہ انتہائی قابلِ ستائش ہے، جس پر ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ فَجَزَاہُ اللّٰہُ فِي الدَّارَیْنِ خَیْراً.

اس کتاب کی پہلی طباعت و اشاعت کے سلسلے میں شارجہ کے ہمارے ایک دوست جناب عبدالعزیز صاحب میمن رحمہ اللہ کی مساعی جمیلہ انتہائی قابلِ قدر ہیں کہ انھوں نے اپنے اثر و رسوخ اور تعلقات کو بروے کار لاتے ہوئے دبئی کے بعض مخیّر تجار (جو اپنا نام تک ظاہر کرنا پسند نہیں کرتے) سے اس کے اخراجات کا انتظام کروایا تھا، جب کہ زیرِ نظر یہ کمپیوٹرائزڈ ایڈیشن اللہ کے ایک بندے نے اپنی والدہ محترمہ رانی مختار بیگم کے ایصالِ ثواب کے لیے شائع کروایا ہے۔ غَفَرَاللّٰہُ لَھَا وَرَحِمَھَا وَأَدْخَلَھَا الْفِرْدَوْسَ الْأَعْلیٰ. وَبَارَکَ اللّٰہُ فِیْمَا رَزَقَھُمْ وَزَادَھُمْ مِّنْہُ وَکَثَّرَ اَمْثَالَھُمْ.

تمام قارئین سے درخواست ہے کہ اپنی نیک دعاؤں میں یہ بھی شامل رکھیں کہ اللہ تعالیٰ مصنف ومرتب اور مشار الیہم اہلِ خیر اور الدال علی الخیر سب کی مساعی کو شرفِ قبول سے نوازے، اور اس کتاب کو تمام قارئین وسامعین کے لیے مفید بنائے۔ آمین

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

ابوسلمان محمد منیر قمر

اُم القیوین

www.mohammedmunirqamar.com

متحدہ عرب امارات

۱۹/۵/۱۴۱۴ھ

۳/۱۱/۱۹۹۳ھ

طہارت کے بنیادی احکام
قرآنِ کریم میں

قرآنِ کریم اصول کی کتاب ہے اور اس میں طہارت کے احکام و مسائل سے متعلق بنیادی اُمور بھی آگئے ہیں، جنھیں یہاں ہم الگ سے ذکر کر رہے ہیں اور آگے چل کر متعلقہ مقامات پر ان کی تفصیل بھی آجائے گی۔

(1)، (2) جنابت (جماع واحتلام) سے طہارت وغسل کا حکم:

[1] ﴿وَ اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا﴾ [المائدة: ٦]

''اگر جنابت (جماع یا احتلام) کی حالت میں ہو تو نہا کر پاک ہو جاؤ۔''

[2] ﴿اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ﴾ [المائدة: ٦]

''یا تم نے عورتوں کو ہاتھ لگایا (جماع کیا) ہو۔''

[3] ﴿وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا﴾ [النساء: ٤٣]

''اور جنابت کی حالت میں بھی (نماز کے قریب نہ جاؤ) جب تک کہ غسل نہ کر لو اِلّا یہ کہ راستے سے گزرتے ہو۔''

(3) حیض ونفاس سے طہارت وغسل کا حکم:

﴿وَ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِیْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِی الْمَحِیْضِ وَ لَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰی یَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَیْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ﴾ [البقرة: ٢٢٢]

''اور تم سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، کہہ دو کہ وہ تو نجاست ہے، سو

ایامِ حیض میں عورتوں سے کنارہ کش رہو اور جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں اُن سے مقاربت نہ کرو۔ ہاں جب (وہ غسل کر کے) پاک ہو جائیں تو جس طریق سے اللہ تعالیٰ نے تمھیں ارشاد فرمایا ہے، اُن کے پاس جاؤ، کچھ شک نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔‘‘

4 پیشاب اور پاخانے سے طہارت کا حکم:

﴿اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ﴾ [المائدة: ٦]

’’یا تم میں سے کوئی شخص رفعِ حاجت (پیشاب و پاخانہ) کرکے آئے۔‘‘

5 لباس کی طہارت کا حکم:

﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾ [المدثر: ٤] ’’اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو۔‘‘

6 جائے نماز کی طہارت کا حکم:

1 ﴿وَ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾ [البقرة: ١٢٥]

’’اور ابراہیم و اسماعیل کو کہا کہ طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے میرے گھر کو پاک صاف رکھا کرو۔‘‘

2 ﴿وَ طَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْقَآئِمِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾ [الحج: ٢٦]

’’اور طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں (اور) سجدہ کرنے والوں کے لیے میرے گھر کو صاف رکھا کرو۔‘‘

7 عام طہارت کا حکم:

① ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴾ [البقرة: ٢٢٢]

’’اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔‘‘

② ﴿وَ يُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ﴾ [الأنفال: ١١]

''اور تم پر آسمان سے پانی برسا دیا، تاکہ تمھیں اُس سے (نہلا کر) پاک کر دے۔''

③ ﴿فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ﴾ [التوبة: ۱۰۸]

''اُس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ پاک رہنے والوں ہی کو پسند کرتا ہے۔''

8 وضو کا حکم:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ [المائدة: ٦]

''مومنو! جب تم نماز پڑھنے کا قصد کیا کرو تو منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھولیا کرو اور سر کا مسح کرلیا کرو اور ٹخنوں تک پاؤں (دھولیا کرو)۔''

9 تیمّم کا حکم:

﴿وَ اِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ﴾ [المائدة: ٦]

''اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا کوئی تم میں سے بیت الخلا میں سے ہو کر آیا ہو یا تم عورتوں سے ہم بستر ہوئے ہو اور تمھیں پانی نہ مل سکے تو پاک مٹی لو اور اُس سے منہ اور ہاتھوں کا مسح (تیمّم) کر لو۔''

فلسفۂ تیمّم:

﴿مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّ لٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَ لِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ [المائدة: ٦]

''اللہ تعالیٰ تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنا چاہتا، بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کرے تاکہ تم شکر کرو۔''

10 ذریعۂ طہارت: ا۔ پانی:

1 کنویں، ٹیوب ویل اور ہینڈ پمپ وغیرہ کا پانی:

﴿وَ لَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ﴾ [القصص: ٢٣]

''اور جب وہ (موسیٰ) مدین کے کنویں پر پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ پانی پلا رہے ہیں۔''

﴿اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا﴾ [الكهف: ٤١]

''یا اس (نہر) کا پانی گہرا ہو جائے تو پھر تم اُسے نہ لا سکو۔''

﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ﴾ [الملك: ٣٠]

''کہو کہ بھلا دیکھو تو اگر تمھارا پانی (جو تم پیتے اور برتتے ہو) خشک ہو جائے تو (اللہ کے سوا) کون ہے، جو تمھارے لیے شیریں پانی کا چشمہ بہا لائے؟''

﴿وَجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا﴾ [المرسلات: ٢٧]

''اور اس (زمین) پر اونچے اونچے پہاڑ رکھ دیے اور تم لوگوں کو میٹھا پانی پلایا۔''

2 سوتوں، چشموں اور دریاؤں کا پانی:

﴿وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ﴾ [البقرة: ٧٤]

''اور پتھروں میں سے تو کوئی ایسا بھی ہوتا ہے، جس میں سے چشمے پھوٹ بہتے ہیں۔ کوئی پھٹتا ہے اور اس میں سے پانی نکل آتا ہے۔''

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ﴾ [الزمر: ٢١]

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ آسمان سے پانی نازل کرتا ہے، پھر اس کو زمین میں چشمے بنا کر جاری کرتا ہے؟''

3 بارش، اولوں اور برف وغیرہ کا پانی:

﴿وَ يُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَ يُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ

الشَّيْطٰنِ﴾ [الأنفال: ١١]

''اور وہ (اللہ تعالیٰ) تم پر آسمانوں سے پانی نازل فرماتا ہے، تاکہ اس سے تمھیں پاک کرے اور تم سے شیطان کی ڈالی ہوئی نجاست دور کر دے۔''

﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا﴾ [الفرقان: ٤٧]

''اور ہم نے آسمان سے پاک پانی نازل کیا۔''

﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرٰتِ مَآءً ثَجَّاجًا﴾ [النبأ: ١٤]

''اور نچڑتے بادلوں سے موسلا دھار مینہ برسایا۔''

❺ ندی، نالوں اور سیلاب وغیرہ کا پانی:

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا﴾

[السجدة: ٢٧]

''کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم بنجر زمین کی طرف پانی رواں کرتے ہیں، پھر اُس سے کھیتی پیدا کرتے ہیں۔''

❻ دریاؤں اور سمندر کا پانی:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَجَعَلَ بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا﴾ [الفرقان: ٥٣]

''اور وہی تو ہے جس نے دو دریاؤں کو ملا دیا، ایک کا پانی شریں ہے پیاس بجھانے والا اور دوسرے کا کھارا چھاتی جلانے والا اور دونوں کے درمیان ایک آڑ اور مضبوط اوٹ بنا دی۔''

﴿وَ مَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ﴾

[الفاطر: ١٢]

''اور پانی کے دونوں ذخیرے یکساں نہیں۔ ایک میٹھا اور پیاس بجھانے والا ہے، پینے میں خوشگوار، اور دوسرا سخت کھاری کہ حلق چھیل دے۔''

ب۔ پاک مٹی:

طہارت اور پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے پانی کے بعد دوسری چیز پاک مٹی بھی ہے، جس کا

ذکر قرآنِ کریم میں دو جگہ ان الفاظ میں آیا ہے:

﴿فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا﴾ [النساء: ٤٣، المائدة: ٦]

''اور پھر پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام (تیمّم کر) لو۔''

11 معنوی طہارت کا حکم:

اس سے قبل جسم، لباس اور مقام (جائے نماز) سے متعلق ظاہری طہارت کے احکام ذکر کیے گئے ہیں اور آگے معنوی طہارت (شرک و بدعات اور اَصنام و اَوثان سے طہارت) کا حکم بیان کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

١ ﴿وَ اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا﴾ [الحج: ٢٦]

''اور (ایک وقت تھا) جب ہم نے ابراہیم کے لیے خانہ کعبہ کو مقام مقرر کیا (اور ارشاد فرمایا:) کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرنا۔''

٢ ﴿وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾ [المدثر: ٥] ''اور (اصنام و آثام کی) ناپاکی سے دُور رہو۔''

اوقاتِ نماز

قرآنِ کریم میں

قرآنِ کریم کے متعدد مقامات پر نمازِ پنج گانہ اور ان کے اوقات کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ مثلاً:

(1) نمازِ فجر و مغرب اور عشا:

﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيۡلِ﴾ [هود: ١١٤]

''اور دن کے دونوں کناروں (صبح اور شام کے اوقات میں) اور رات کی چند (پہلی) ساعات میں نماز پڑھا کرو۔''

(2) نمازِ پنج گانہ:

(١) ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوۡكِ الشَّمۡسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيۡلِ وَقُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ كَانَ مَشۡهُوۡدًا﴾ [بني إسرائيل: ٧٨]

''(اے نبی!) سورج کے ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک (ظہر، عصر، مغرب، عشا کی) نمازیں اور صبح (فجر) کو قرآن پڑھا کرو، کیونکہ صبح کے وقت قرآن پڑھنا موجبِ حضور (ملائکہ) ہے۔''

(٢) ﴿وَ سَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَ قَبۡلَ غُرُوۡبِهَا وَ مِنۡ اٰنَآئِ الَّيۡلِ فَسَبِّحۡ وَ اَطۡرَافَ النَّهَارِ﴾ [طٰهٰ: ١٣٠]

''اور سورج کے نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اپنے رب کی تسبیح و تحمید کیا کرو اور رات کی ساعاتِ (اوّلین) میں بھی اُس کی تسبیح کیا کرو اور دن کے اطراف

(دوپہر کے قریب ظہر کے وقت) بھی۔''

③ ﴿فَسُبۡحٰنَ اللّٰهِ حِيۡنَ تُمۡسُوۡنَ وَ حِيۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ ۝ وَ لَهُ الۡحَمۡدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ عَشِيًّا وَّ حِيۡنَ تُظۡهِرُوۡنَ﴾ [الروم: ١٧، ١٨]

''تو جس وقت تم کو شام ہو اور جس وقت صبح ہو اللہ کی تسبیح (نماز) پڑھو۔ اور آسمانوں اور زمین میں اُسی کی تعریف ہے اور تیسرے پہر بھی اور جب دوپہر ہو (اُس وقت بھی نماز پڑھا کرو)۔''

③ نمازِ جمعہ:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا نُوۡدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنۡ يَّوۡمِ الۡجُمُعَةِ فَاسۡعَوۡا اِلٰي ذِكۡرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الۡبَيۡعَ ذٰلِكُمۡ خَيۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ﴾ [الجمعة: ٩]

'' مومنو! جب جمعے کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کی یاد (نماز) کے لیے جلدی کرو اور (خرید و) فروخت ترک کر دو، اگر سمجھو تو یہ تمھارے حق میں بہتر ہے۔''

④ نمازِ تہجد:

﴿وَ مِنَ الَّيۡلِ فَتَهَجَّدۡ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ﴾ [الإسراء: ٧٩]

''اور بعض حصۂ شب میں بیدار ہوا کرو (تہجد کی نماز پڑھا کرو) اس حال میں کہ آپ کے لیے وہ زائد ہے۔''

⑤ نماز میں پابندیِ وقت:

﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتۡ عَلَي الۡمُؤۡمِنِيۡنَ كِتٰبًا مَّوۡقُوۡتًا﴾ [النساء: ١٠٣]

''بے شک نماز کا مومنوں پر اوقات مقررہ میں ادا کرنا فرض ہے۔''

⑥ عدمِ پابندی کا انجام:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُلۡهِكُمۡ اَمۡوَالُكُمۡ وَلَاۤ اَوۡلَادُكُمۡ عَنۡ ذِكۡرِ اللّٰهِ وَمَنۡ يَّفۡعَلۡ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ﴾ [المنافقون: ٩]

''مومنو! تمھارا مال اور اولاد تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں اور جو ایسا کرے گا تو وہ لوگ خسارہ اٹھانے والے ہیں۔''

﴿فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَ اتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا﴾ [مريم: ٥٩]

''پھر ان کے بعد چند ناخلف اُن کے جانشین ہوئے، جنھوں نے نماز کو (چھوڑ دیا گویا اُسے) کھو دیا اور خواہشاتِ نفسانی کے پیچھے لگ گئے۔ سو عن قریب ان کو گمراہی (کی سزا) ملے گی۔''

﴿فَوَيۡلٌ لِّلۡمُصَلِّيۡنَ ۝ الَّذِيۡنَ هُمۡ عَنۡ صَلَاتِهِمۡ سَاهُوۡنَ﴾ [الماعون: ٤، ٥]

''تو ایسے نمازیوں کے لیے خرابی اور بربادی ہے۔ جو نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں۔''

7 تذکارِ نماز:

قرآنِ کریم کے کتنے ہی دوسرے مقامات پر بھی نمازوں اور ان کے اوقات کا کسی نہ کسی انداز سے تذکرہ آیا ہے۔ مثلاً دیکھیے:

① البقرہ (آیت: ۱۸۷) ② آلِ عمران (آیت: ۳)
③ الانعام (آیت: ۵۲) ④ یوسف (آیت: ۱۶)
⑤ الرّعد (آیت: ۱۵) ⑥ مریم (آیت: ۱۱، ۳۱)
⑦ الکہف (آیت: ۲۸) ⑧ صٓ (آیت: ۱۸)
⑨ النّور (آیت: ۳۶، ۵۸) ⑩ الغافر (آیت: ۵۵)
⑪ قٓ (آیت: ۳۹) ⑫ القدر (آیت: ۵)
⑬ الفجر (آیت: ۱) ⑭ العصر (آیت: ۱)

مذکورہ مقامات پر نمازوں اور ان کے اوقات کی طرف مختصر اشارات آئے ہیں، جبکہ ان کی تفصیلات کتبِ حدیث میں موجود ہیں، جو آگے چل کر متعلقہ مواقع پر آجائیں گی۔ إن شاء الله.

نمازِ با جماعت

قرآنِ کریم میں

1 ﴿وَ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَ ارۡکَعُوۡا مَعَ الرّٰکِعِیۡنَ﴾ [البقرۃ: ٤٣]

''اور نماز پڑھا کرو اور زکات دیا کرو اور (اللہ تعالیٰ کے آگے) جھکنے والوں کے ساتھ جھکا کرو۔''

2 ﴿حٰفِظُوۡا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوۃِ الۡوُسۡطٰی وَ قُوۡمُوۡا لِلّٰہِ قٰنِتِیۡنَ﴾

[البقرۃ: ٢٣٨]

'' اور سب نمازوں کی حفاظت کرو اور درمیانی نماز کی اور اللہ کے لیے فرماں بردار ہو کر کھڑے رہو۔''

﴿وَ اِذَا کُنۡتَ فِیۡہِمۡ فَاَقَمۡتَ لَہُمُ الصَّلٰوۃَ... الخ﴾ [النساء: ١٠٢]

''اور (اے پیغمبر!) جب تم ان (مجاہدین کے لشکر) میں ہو اور ان کو نماز پڑھانے لگو ....الخ۔''

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مطلق پانی کی اَقسام و اَحکام

بنیادی طور پر پانی کے حصول کے صرف دو ہی طریقے ہیں:

1. پانی زمین سے حاصل ہوا ہو، جیسا کہ سمندر، دریا، نہر، کنویں، ٹیوب ویل یا ہینڈ پمپ وغیرہ سے حاصل کیا جاتا ہے۔
2. پانی کے حصول کا دوسرا طریقہ آسمان سے برسنے والا پانی لینا ہے، خواہ وہ بارش کی شکل میں برسے یا اولے اور کہر کی شکل میں ہو اور اس برف سے پگھلنے سے پانی حاصل ہوتا ہے۔

زمین اور آسمان سے حاصل ہونے والے اس تمام پانی کو ''ماے مطلق'' کہا جا تا ہے، جو فی نفسہٖ تمام ائمہ وفقہا اور محدّثینِ کرام کے نزدیک بالاتفاق نہ صرف پاک و طاہر بلکہ مطہر بھی ہے، یعنی یہ خود پاک ہونے کے ساتھ ساتھ دوسری اشیا کو پاک کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ یہ تو ہوا مطلق پانی کا عام حکم، اب اس پاک پانی کی مختلف صورتوں کے لحاظ سے چار قسمیں ہوسکتی ہیں۔

پہلی قسم:

ان چار قسموں میں سے مطلق پانی کی پہلی قسم وہ پانی ہے، جو بارش، اولوں اور برف سے حاصل ہو۔ یہ پانی پاک و طاہر اور مطہر بھی ہے، کیوں کہ قرآنِ کریم میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَ یُنَزِّلُ عَلَیۡکُمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّیُطَہِّرَکُمۡ بِہٖ وَ یُذۡہِبَ عَنۡکُمۡ رِجۡزَ الشَّیۡطٰنِ وَ لِیَرۡبِطَ عَلٰی قُلُوۡبِکُمۡ وَ یُثَبِّتَ بِہِ الۡاَقۡدَامَ﴾ [الأنفال: ١١]

''اور تم پر آسمان سے پانی برسا دیا، تا کہ تمھیں اُس سے (نہلا کر) پاک کر دے اور شیطانی نجاست کو تم سے دور کر دے اور اس لیے بھی کہ تمھارے دلوں کو مضبوط کر دے اور اس سے تمھارے پاؤں جمائے رکھے۔''

یہ آیت پہلے معرکہ حق و باطل غزوہ بدر کے وقائع پر مشتمل ہے، جس کے الفاظ ﴿وَ یُنَزِّلُ عَلَیۡکُمۡ

مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ﴾ میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ آسمان سے برسنے والا پانی طاہر و پاک ہے اور مطہر بھی ہے، یعنی جس سے دوسری اشیا بھی پاک کی جاسکتی ہیں۔

سورۃ الفرقان میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ۝ لِّنُحْيِيَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ اَنْعَامًا وَّاَنَاسِيَّ كَثِيْرًا﴾ [الفرقان: ٤٨، ٤٩]

''اور ہم آسمان سے پاک (اور شفاف) پانی برساتے ہیں، تاکہ اس سے شہر مردہ (زمینِ افتادہ) کو زندہ کردیں اور پھر ہم اسے بہت سے چوپایوں اور آدمیوں کو جو ہم نے پیدا کیے ہیں، پلاتے ہیں۔''

ان کلمات کا مفہوم بڑا واضح ہے کہ آسمان سے نازل ہونے والا ہر شکل کا پانی طاہر و مطہر ہے، کیوں کہ لفظ ''طہور'' محض پاک کو نہیں، بلکہ پاک کرنے والی چیز کہا جاتا ہے، جیسا کہ تفسیر و لغت اور شروحِ حدیث کی کتب میں مذکور ہے۔[1]

اسی طرح نبیِ کریم ﷺ کی ایک دعاے استفتاح کے الفاظ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بارش، برف اور اولوں سے حاصل شدہ پانی طاہر و مطہر ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود و نسائی و ابن ماجہ، مسند احمد و ابی عوانہ اور سنن دارمی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نماز کی تکبیرِ تحریمہ کہنے کے بعد قراءت سے پہلے کچھ دیر خاموش رہتے۔ میں نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، آپ تکبیر اور قراءت کے درمیان سکوت میں کیا پڑھتے ہیں؟

تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں یہ دعا کرتا ہوں:

«اَللّٰهُمَّ بَاعِدْ بَيْنِيْ وَبَيْنَ خَطَايَايَ كَمَا بَاعَدْتَّ بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ، اَللّٰهُمَّ نَقِّنِيْ مِنَ الْخَطَايَا كَمَا يُنَقَّى الثَّوْبُ الْاَبْيَضُ مِنَ الدَّنَسِ، اَللّٰهُمَّ اغْسِلْ خَطَايَایَ بِالْمَآءِ وَالثَّلْجِ وَالْبَرَدِ»[2]

---

[1] دیکھیں: تفسير القرطبي (٧/ ٣٩) زاد المسير لابن الجوزي (٦/ ٩٤) نيل الأوطار (١/ ١٤۔ ١٦) مختار الصحاح (ص: ٣٩٩)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٢٧) صحيح مسلم (٥/ ٩٦ المطبعة المصرية) سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٨١) و صحيح سنن النّسائي، رقم الحديث (٨٦٠) إرواء الغليل (١/ ٤١، ٤٢)

''اے اللہ! مجھ میں اور میری خطاؤں میں اتنی دوری کر دے، جتنی دوری تو نے مشرق و مغرب کے مابین کی ہے۔ اے اللہ! مجھے خطاؤں سے اس طرح پاک کر دے، جیسے سفید کپڑا میل سے پاک کیا جاتا ہے۔ اے اللہ! مجھ سے میری خطاؤں کو پانی، برف اور اولوں سے دھو دے۔''

اس دعاے نبوی ﷺ کے آخری کلمات بارش، اولوں اور برف سے حاصل ہونے والے پانی کے طاہر و مطہر ہونے کی واضح دلیل ہیں۔ اس حدیث میں مذکور اس دعا کے الفاظ کتنے پیارے ہیں! ہمیں بھی چاہیے کہ ''سُبُحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَ بِحَمُدِكَ'' کے ساتھ ساتھ اپنی نمازوں میں یہ دعا بھی کرتے رہیں، جس میں ثنا کے علاوہ خطاؤں سے طہارت کی دعا بھی شامل ہے۔

دوسری قسم:

مطلق پانی کے تحت آنے والی دوسری قسم سمندر کا پانی ہے اور اسی کے حکم میں دریا اور نہروں کا پانی بھی آجاتا ہے۔ ایسے پانی کے طاہر و مطہر ہونے کی دلیل نبیِ اکرم ﷺ کا وہ ارشادِ گرامی ہے، جو سنن ابو داود و ترمذی و نسائی و ابن ماجہ، مسند احمد، موطا امام مالک، صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان کے ساتھ ساتھ مستدرک حاکم، سنن دارقطنی، مصنف ابن ابی شیبہ اور سنن دارمی میں مذکور ہے اور اس حدیث کو کبار ائمہ حدیث میں سے امام بخاری، ترمذی، حاکم، ابن حبان اور ابن المنذر اور اسی طرح امام طحاوی، بغوی، خطابی، ابن مندہ اور دیگر کثیر محدّثینِ کرام رحمہم اللہ نے صحیح قرار دیا ہے۔[1]

اس حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ کسی شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا:

«اِنَّا نَرُكَبُ الُبَحُرَ وَنَحُمِلُ مَعَنَا الُقَلِيُلَ مِنَ الُمَآءِ فَاِنُ تَوَضَّأُنَا بِهٖ عَطِشُنَا، أَفَنَتَوَضَّأُ بِمَآءِ الُبَحُرِ؟»

''ہم سمندر کا سفر کرتے ہیں اور اپنے ساتھ تھوڑا سا پانی لے جاتے ہیں۔ پس ہم اگر اس پانی سے وضو کریں تو خود پیاسے رہ جائیں۔ کیا ہم سمندر کے پانی سے وضو کر لیا کریں؟''

اس پر نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

---

[1] إرواء الغليل (١/ ٤٣)

«هُوَ الطَّهُوْرُ مَاؤُهُ، اَلْحِلُّ مَيْتَتُهُ»[1]

''سمندر کا پانی پاک و طاہر اور مطہر ہے اور اس کا مردہ حلال ہے۔''

اس حدیث میں جہاں مذکورہ پانی کے طاہر و مطہر ہونے کا ثبوت ہے، وہیں بظاہر تمام بحری جانوروں کے حلال ہونے کا بھی پتا چلتا ہے، جیسا کہ شافعیہ کا مسلک ہے۔ البتہ یہ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے، جس کی تفصیل تو کسی دوسرے موقع پر آئے گی، لیکن یہاں صرف اتنا ذہن میں رکھیں کہ مچھلی جو بحری جانوروں میں سے ہے، وہ زندہ شکار کی جائے تو بھی اسے ذبح کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی اور اگر وہ بے جان حالت میں ہاتھ لگے تو بھی وہ بہرحال پاک و حلال ہے۔ اس حدیث کے الفاظ کہ ''سمندر کا مردہ بھی حلال ہے۔'' ان میں اس مچھلی کی طرف بھی اشارہ ہے۔ یوں حدیث شریف کے مذکورہ الفاظ کا مفہوم بھی بہ آسانی سمجھ میں آجاتا ہے۔

تیسری قسم:

مطلق و عام یا طاہر و مطہر پانی کے تحت آنے والی تیسری قسم آبِ زمزم ہے، اس تیسری قسم کے پانی (آبِ زمزم) کو تو صرف پاک و طاہر اور مطہّر کہنا ہی کافی نہیں، بلکہ اس کے برعکس آبِ زمزم تو بڑے فضائل و برکات والا پانی ہے۔

1. جیسا کہ کتبِ حدیث میں سے مسند احمد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«صَبَّ مَآءَ زَمْزَمَ عَلٰى رَأْسِهٖ»[2]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آبِ زمزم اپنے سر مبارک پر بھی ڈالا۔''

2. اسی آبِ زمزم کے بارے میں سنن ابن ماجہ، مسند احمد اور سنن بیہقی میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«مَآءُ زَمْزَمَ لِمَا شُرِبَ لَهٗ»[3]

---

[1] حوالہ جات سابقہ۔ نیز دیکھیں: صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٦) و صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٥٩) و صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٢١) و سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٦) الموطأ مع شرحه المسوى (١/ ٩٣) المنتقى مع النيل (١/ ١/ ١٤) الفتح الرباني (١/ ٢٠١)

[2] مسند أحمد، الفتح الرباني (١/ ٢٠٣، ١٢/ ٧٢)

[3] حسنه الحافظ ابن حجر، و صححه المنذري والدمياطي، كما في الحاوي للفتاوٰى للسيوطي (١/ ٢٥٣) وصححه الألباني في الإرواء (ص: ١٢٣) و السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٨٨٣)

’’آبِ زمزم ہر اس مرض وغرض کے لیے مفید ہے، جس کی نیت کے لیے یہ پیا جائے۔‘‘

3 نیز صحیح مسلم، مسند ابو داود طیالسی، مسند احمد، مسند بزار اور معجم طبرانی صغیر میں نبیِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«اِنَّھَا لَمُبَارَکَۃُ ، وَھِیَ طَعَامُ طُعْمٍ، وَشِفَآءُ سُقْمٍ»[1]

’’یہ بڑا بابرکت پانی ہے۔ یہ بھوکے کے لیے غذا کا کام دیتا ہے اور یہ بیماری سے شفا کا موجب ہے۔‘‘

صحیح مسلم (باب فضائل ابی ذرؓ) اور مسند احمد (۵/ ۱۷۵) میں بھی یہ حدیث تو موجود ہے، البتہ ان دونوں میں صرف «شِفَاءُ سُقْمٍ» کے الفاظ نہیں ہیں۔

4 اسی حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ کے یہ الفاظ بھی مروی ہیں:

«خَیْرُ مَاءٍ عَلٰی وَجْہِ الْأَرْضِ مَاءُ زَمْزَمَ»[2]

’’یہ آبِ زمزم روئے زمین کا سب سے عمدہ اور افضل پانی ہے۔‘‘

5 زوائدِ احمد اور مسندِ احمد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے آبِ زمزم کا ڈول منگوایا:

«فَشَرِبَ مِنْہُ وَتَوَضَّأَ»[3] ’’آپ ﷺ نے اس سے پیا اور وضو بھی فرمایا۔‘‘

اہلِ علم اور خصوصاً علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ’’زاد المعاد‘‘ میں آبِ زمزم کے فضائل و برکات کے ساتھ ساتھ اس کے کئی مادی و باطنی فوائد بھی ذکر کیے ہیں، جن کی تفصیل ’’زاد المعاد‘‘ کی تحقیق والی طباعت (۴/۳۹۳،۳۹۴) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

5 آبِ زمزم کے فضائل و برکات اور فوائد و خواص کی اہمیت کا اندازہ تو اسی بات سے ہو جاتا ہے کہ ’’تاریخ کبیر امام بخاری‘‘ (۳/ ۱۸۹) سنن ترمذی، رقم الحدیث (۹۶۳) مستدرک حاکم (۱/ ۴۸۵) سنن بیہقی (۵/۲۰۲) اور مسند ابی یعلی (۴۹۲) میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

’’نبیِ اکرم ﷺ آبِ زمزم کے مشکیزے بھر بھر کر ساتھ لے جایا کرتے تھے اور مریضوں

---

[1] صحيح الجامع الصغير (١/ ٤٧٨) رقم الحديث (٢٤٣٠)

[2] صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٣٢٢)

[3] فقه السنة (١/ ١٨) الإرواء (١/ ٤٥) وحسنه الألباني و صححه أحمد شاكر في تحقيق المسند.

کو پلاتے اور ان پر چھڑکا کرتے تھے۔“

7 سنن کبریٰ بیہقی (۵/ ۲۰۲) اور مصنف عبدالرزاق، رقم الحدیث (۹۱۲۷) میں مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے تو تاکید فرمائی تھی:

((إِهْدِ لَنَا مِنْ مَّآءِ زَمْزَمَ وَلَا تَتْرُكْ فَيَبْعَثُ إِلَيْهِ بِمَزَادَتَيْنِ))

”ہمیں آبِ زمزم کا ہدیہ بھیجتے رہو اور یہ سلسلہ ترک نہ کرو اور وہ آپ کو (ہر مرتبہ) دو مشکیزے بھر کر بھیجا کرتے تھے۔“

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ سلف صالحین اپنے ساتھ آبِ زمزم لے جایا کرتے تھے۔[1]

جیسا کہ آج تک حجاجِ کرام اپنے ساتھ پانی لاتے ہیں۔ البتہ یہ جو حجاجِ کرام اپنے لیے کفن کا کپڑا آبِ زمزم میں تر کر کے لاتے ہیں اور کرنسی کے سکے بھگو کر لاتے ہیں اور سمجھا جاتا ہے کہ اس طرح برکت حاصل ہوگی اور نجات حاصل ہو جائے گی، تو یہ آنحضرت ﷺ، خلفا و صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کسی سے بھی ثابت نہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فعل بے کار اور بدعت ہے۔[2]

ویسے بھی مال و دولت میں برکت دینا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور اگر عقائد و اعمال درست نہ ہوئے تو آبِ زمزم میں بھیگا کفن ذریعہ نجات نہیں بن سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو نبیِ اکرم ﷺ ضرور بتا جاتے اور پھر عبداللہ بن اُبی کا واقعہ مشہور ہے۔ صحیح بخاری میں ہے:

”اسے نبیِ اکرم ﷺ کا کرتہ مبارک بطورِ کفن پہنایا گیا۔ آپ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھانے کی تیاری بھی کر لی اور حضرت عمر فاروق نے آپ ﷺ کو اس کا جنازہ نہ پڑھانے کا مشورہ بھی دیا، مگر پھر بھی نبیِ اکرم ﷺ نے اس کا جنازہ پڑھایا اور اس کی تدفین میں شرکت فرمائی، مگر اس کی نجات نہ ہو سکی، حتیٰ کہ قرآنِ حکیم کی آیات نازل ہوگئیں کہ اس شخص کی مغفرت نہیں ہوگی۔ چاہے آپ ستر مرتبہ اس کا جنازہ پڑھائیں، کیونکہ اس کے عقائد و اعمال درست نہ تھے۔“

---

[1] المناسك للألباني (ص: ٤٢)

[2] السنن و المبتدعات (ص: ١١٣) حجة النبي ﷺ للألباني (ص ١١٩)

اس واقعے کی تفصیلات مطلوب ہوں تو تفسیر کی کتابوں میں سورۃ التوبہ (آیت: ۸۰ تا ۸۴) کی تفسیر دیکھ لیں اور پھر اندازہ فرمائیں تو کفن بھگو کر لانے کی حقیقت خود بہ خود واضح ہو جائے گی۔[1]

چوتھی قسم:

طاہر و مطہّر، مطلق پانی کی چوتھی قسم سے مراد وہ پانی ہے، جو کسی جگہ دیر تک ٹھہرا رہے اور اس کے تا دیر ٹھہرے رہنے اور درختوں کے پتوں اور کائی و مٹی وغیرہ کے اثرات سے اس کے رنگ میں بھی تغیّر واقع ہو جائے، مگر اس میں کوئی نجاست و گندگی نہ پڑی ہو تو وہ پانی بھی پاک و طاہر اور مطہر ہی رہے گا۔ علامہ ابن رشد رحمہ اللہ نے ایسے پانی کے طاہر و مطہر ہونے پر اہلِ علم کا اتفاق نقل کیا ہے اور اسی بات کا اظہار امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے "المغني" میں کیا ہے۔[2]

نیز امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر "الجامع لأحكام القرآن" (۱۳/ ۷/ ٤٤) میں یہی بات ذکر کی اور لکھا ہے کہ علمائے کرام کا اس بات پر اتفاق ہے:

«فَاتَّفَقَ الْعُلَمَاءُ اَنَّ ذٰلِكَ لَا يَمْنَعُ مِنَ الْوُضُوءِ بِهٖ»

"یہ (درختوں کے پتوں، کائی اور مٹی وغیرہ کا پانی میں مل جانا) اس پانی سے وضو کرنے میں مانع نہیں ہے۔"

اسی سے بڑی بڑی جھیلوں اور تالابوں کے اس پانی کا حکم واضح ہو گیا، جو مدّتوں ٹھہرے رہنے اور مختلف اسباب سے اس میں پتے وغیرہ گرنے اور کائی اُگ آنے سے اس کا رنگ قدرے بدل جاتا ہے۔

غیر مطلق پانی کی اقسام:

مطلق یا عام پانی کے تحت آنے والے پانی کی چار قسمیں بیان کی جا چکی ہیں، جن کے پانی کو بالاتفاق پاک و طاہر اور مطہر قرار دیا گیا ہے۔ اب آیئے مطلق پانی کی ان چار قسموں کے علاوہ غیر مطلق پانی کی چار قسموں کے بارے میں بھی باری باری شریعت اسلامیہ کا حکم معلوم کریں کہ وہ پاک ہیں یا ناپاک؟ اگر وہ پاک ہیں تو وہ محض طاہر ہیں یا مطہر بھی کہ جس سے غسل و وضو جائز ہوتا ہے؟ اس اعتبار سے اس پانی کی بھی چار ہی قسمیں ہیں۔

---

[1] تفسير ابن كثير (۲/ ٤١٤ تا ٤١٦ اردو) و التجريد الصريح (۱/ ۹٤)

[2] بداية المجتهد (۱/ ۳٤۔ ۳۵) المغني (۱/ ۲۲۔ ۲۳)

پہلی قسم:

وہ پانی جس میں آٹا یا صابن جیسی کسی پاک چیز کی آمیزش ہو جانے سے اس کا رنگ معمولی سا بدل جائے۔

دوسری قسم:

ان میں سے دوسری قسم کا وہ پانی ہے، جسے ایک مرتبہ وضو یا غسل کے لیے استعمال کیا جا چکا ہو، جسے ''مستعمل پانی'' کہا جاتا ہے۔

تیسری قسم:

تیسری قسم کا وہ پانی ہے، جسے کسی انسان یا حیوان نے جھوٹا کر دیا ہو۔

چوتھی قسم:

وہ پانی ہے، جس میں قلیل یا کثیر مقدار میں کوئی نجاست گر گئی ہو۔

یوں تو آج الحمدللہ تقریباً ہر جگہ وافر مقدار میں پانی میسر ہے، لہٰذ کسی صاف ستھرے اور غیر مشتبہ پانی کو چھوڑ کر کسی شبہہ والے پانی کو استعمال کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی، مگر شریعتِ اسلامیہ چو نکہ قیامت تک کے لیے اور دنیا جہان کے چپے چپے پر بسنے والے لوگوں کے لیے ہے، لہٰذا اس کے اصول وقواعد بھی ابدی اور عالمگیر ہیں، پھر پانی کے کثیر اور وافر ہونے کے باوجود آج بھی ایسے کئی علاقے موجود ہیں، جہاں پانی کی تنگی وقلت موجود ہے اور سفر کے دوران میں بھی کبھی اس قلت سے سامنا ہو سکتا ہے، لہٰذا غیر مطلق پانی کی ان چاروں اقسام کے بارے میں بھی معلومات ہونا ضروری ہے۔

(1) کسی پاک چیز کی آمیزش والا پانی:

غیر مطلق پانی کی پہلی قسم وہ ہے، جس میں آٹا یا صابن وغیرہ مل گئے ہوں، جیسا کہ عموماً گھروں میں ایسا ہی ہو جاتا ہے، لہٰذا کسی پاک چیز کی آمیزش والے ایسے پانی کو پاک و طاہر اور مطہّر قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ امام ابن قدامہ نے ''المغني'' میں ذکر کیا ہے:

''چاروں ائمہ کرام سمیت تمام محدّثین و مجتہدین اور جمہور اہلِ علم کا یہی مسلک ہے۔

صرف امام زہری رحمہ اللہ سے کچھ اختلاف منقول ہے۔ ان کے نزدیک یہ پانی پاک و طاہر ہے، مگر مطہر نہیں، یعنی اس سے غسل و وضو نہیں کیا جاسکتا۔‘‘[1]

ان کا یہ مسلک جمہور اہلِ علم میں منفرد ہونے اور حدیثِ شریف کے موافق نہ ہونے کی وجہ قابلِ قبول نہیں، کیوں کہ صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ اور دیگر کتبِ حدیث میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی وفات پر ان کے غسل و کفن کا واقعہ مذکور ہے، جس کے ضمن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

« إِغْسِلْنَهَا ثَلَاثًا أَوْ خَمْساً أَوْ أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ -إِنْ رَأَيْتُنَّ- بِمَاءٍ وَ سِدْرٍ وَاجْعَلْنَ فِيْ الْأَخِيْرَةِ كَافُوْرًا أَوْ شَيْئًا مِنْ كَافُوْرٍ »[2]

’’انھیں تین مرتبہ یا پانچ مرتبہ اور اگر مناسب ہو تو اس سے بھی زیادہ مرتبہ بیری کے پتوں والے پانی سے غسل دو اور آخری مرتبہ غسل دیتے وقت پانی میں کافور بھی ملا لینا۔‘‘

معلوم ہوا کہ کافور اور بیری کے پتوں والے پانی کا اگرچہ معمولی سا رنگ بدل جاتا ہے، مگر اس کے باوجود نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے طاہر و مطہّر ہی قرار دیا ہے، کیوں کہ میت کو غسل صرف اسی پانی سے دیا جاسکتا ہے، جس سے زندہ آدمی کا بھی غسل و وضو کرنا صحیح ہو۔

اس کے علاوہ سنن نسائی و ابن ماجہ، صحیح ابن حبان، ابن خزیمہ، سنن بیہقی اور مسندِ احمد میں حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

« إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ اِغْتَسَلَ هُوَ وَ مَيْمُوْنَةُ مِنْ إِنَاءٍ وَّاحِدٍ (قَصْعَةٍ، وَفِي رِوَايَةٍ: جَفْنَةٍ) فِيْهَا اَثَرُ الْعَجِيْنِ »[3]

’’نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے ایک ایسے برتن والے

---

[1] المغني (١/ ٦٥)

[2] التجريد الصريح (١/ ٩٣) صحيح مسلم مترجم اردو (١، ٢/ ٣٧٩) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٩٤) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٧٧٧، ١٧٧٨) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٧٨٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٥٨)

[3] صححه الألباني في الارواء (١/ ٦٤) و صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٣٤) و صحيح سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٨)

پانی سے غسل کیا، جس میں آٹے کا اثر نظر آرہا تھا۔‘‘

ان دونوں حدیثوں میں مذکور پانی میں پاک اشیا کی ملاوٹ پائی گئی۔اس کے باوجود نبی کریم ﷺ نے اپنے قول وعملِ مبارک سے اسے مطہّر قرار دیا ہے، البتہ اہلِ علم نے یہ شرط لگائی ہے کہ کسی پاک چیز کی آمیزش اتنی زیادہ نہ ہو کہ وہ پانی کو مطلق پانی کی حدود ہی سے نکال دے۔ ہاں، جب تک وہ مطلق پانی کی حدود میں رہے گا، طاہر ومطہّر رہے گا،لیکن اگر اس کا پوری طرح رنگ ہی بدل گیا تو وہ مطلق پانی کی تعریف سے نکل جائے گا، تب وہ طاہر تو ہے مگر مطہر نہیں ہوگا اور اس سے غسل و وضو صحیح نہیں ہوگا۔ البتہ اس سے برتن اور کپڑے وغیرہ دھوئے جا سکتے ہیں۔

(2) مستعمل پانی:

غیر مطلق پانی کی دوسری قسم وہ پانی ہے، جو غسل یا وضو میں ایک مرتبہ استعمال کیا جا چکا ہو۔ اسے ’’مستعمل پانی‘‘ کہا جاتا ہے۔ اس پانی کے طاہر ومطہر یا محض طاہر ہونے میں اہلِ علم میں اختلاف پایا جاتا ہے۔بعض اہلِ علم نے ایسے پانی کو طاہر اور مطہر قرار دیا ہے کہ اس سے دوبارہ بھی غسل و وضو کیا جا سکتا ہے، جبکہ بعض دیگر اہلِ علم کے نزدیک مستعمل پانی طاہر تو ہے،مگر مطہر نہیں ہے۔

پہلا مسلک:

مستعمل پانی کا طاہر ومطہر ہونا مالکیہ اور ظاہریہ کا مسلک ہے۔ البتہ مالکیہ کے نزدیک دوسرے پانی کے ہوتے ہوئے مستعمل پانی سے غسل یا وضو کرنا مکروہ ہے اور مستعمل کی موجودگی میں تیمّم کرنا منع ہے۔ امام حسن بصری، زہری اور ابراہیم نخعی رحمہم اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

امام ابن قدامہ اور امام شوکانی رحمہما اللہ کے بقول ایسے پانی کے بارے میں امام ابو حنیفہ، امام احمد اور امام شافعی رحمہم اللہ سے دو الگ الگ روایتیں ملتی ہیں۔ ایک میں طاہر ومطہر اور دوسری میں صرف طاہر کہا گیا ہے۔ علامہ ابن حزم کے حوالے سے امام شوکانی اور یہی ابن قدامہ نے بھی لکھا ہے کہ ’’امام عطاء، سفیان ثوری اور ابوثور کا بھی یہی مسلک ہے۔‘‘[1]

مستعمل پانی کو طاہر ومطہر قرار دینے والوں کا استدلال متعدد احادیث سے ہے۔ مثلاً صحیح

[1] المغني (١/ ٣١) تفسير القرطبي (٧/ ١٣ / ٤٨) فتح الباري (١/ ٢٩٦) البداية (١/ ٤٠) نيل الأوطار (١/ ١/ ٢٣)

بخاری و مسلم، سنن ابو داود، دارمی، بیہقی اور مسندِ احمد میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

1 «مَرِضْتُ فَأَتَانِیَ النَّبِیُّ ﷺ هُوَ وَ أَبُو بَكْرِالصِّدِّيْقُ مَاشِيَيْنِ، وَقَدْ أُغْمِیَ عَلَيَّ فَلَمْ أُكَلِّمْهُ، فَتَوَضَّأَ فَصَبَّهُ عَلَيَّ فَأَفَقْتُ»[1]

''میں بیمار ہوگیا تو نبیِ اکرم ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ پیدل چل کر میری عیادت کے لیے تشریف لائے۔ جبکہ مجھ پر غشی طاری تھی لہٰذا میں آپ ﷺ سے کوئی بات نہ کر سکا۔ پھر آپ ﷺ نے وضو فرمایا اور وضو کا پانی مجھ پر چھڑکا تو مجھے افاقہ ہوگیا۔''

یہ الفاظ مسندِ احمد کے ہیں، جبکہ صحیح بخاری و مسلم میں مروی ہے:

«جَاءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَعُوْدُنِي وَانَا مَرِيْضٌ لَا أَعْقِلُ، فَتَوَضَّأَ وَ صَبَّ وَضُوْءَهٗ عَلَيَّ»[2]

''میری بیماری کی حالت میں رسول اللہ ﷺ میری عیادت کے لیے تشریف لائے، جبکہ میں کوئی بات نہیں سمجھتا تھا۔ آپ ﷺ نے وضو فرمایا اور وضو کا پانی مجھ پر چھڑکا۔''

ایسے پانی کے طاہر و مطہّر ہونے کے قائلین کا کہنا ہے کہ نبیِ کریم ﷺ کا اپنے وضو کے پانی کا چھڑکنا اس بات کی دلیل ہے کہ مستعمل پانی طاہر و مطہر ہی ہوتا ہے۔ صحیح بخاری اور مسند احمد میں صلح حدیبیہ کا واقعہ مذکور ہے۔ راویِ حدیث نبیِ اکرم ﷺ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عقیدت و محبت کی تصویر کشی کرتے ہوئے متعدد امور بیان کرتے ہیں، جن میں سے ایک یہ امر بھی ہے:

2 «وَاِذَا تَوَضَّأَ كَادُوْا يَقْتَتِلُوْنَ عَلَى وَضُوْءِهٖ»[3]

''جب آپ ﷺ نے وضو فرمایا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا آپ کے وضو والے پانی کو حاصل کرنے کے لیے یہ حال تھا کہ قریب تھا کہ باہم جھگڑ پڑیں۔''

3 مسند احمد میں ہے:

«لَا يَتَوَضَّأُ وُضُوْءًا اِلَّا ابْتَدَرُوْهُ»[4]

---

1. مسند أحمد، الفتح الرباني (١/ ٢٠٩)
2. صحيح البخاري مترجم أردو (٣/ ٢٩٣) الإرواء (١/ ٥٤) نيل الأوطار (١/ ١٨۔ ١٩)
3. صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٢٩٤) الفتح الرباني (١/ ٢٠٩) النيل مع المنتقى (١/ ١٩) الإرواء (١/ ٥٢)
4. مسند أحمد (٤/ ٤٢٣)

''آپ ﷺ جب وضو کرتے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پانی کو حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے۔''

اس مسلک کے قائلین کا کہنا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ ﷺ کے پانی کو اس شوق و محبت سے ہاتھوں ہاتھ لیتے اور اپنے جسم پر ملتے جاتے تھے، مگر آپ کا انھیں اس فعل سے روکنا ثابت نہیں ہے، جو مستعمل پانی کے طاہر و مطہر ہونے کی دلیل ہے۔

4 صحیح بخاری اور مسند احمد میں حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِالْهَاجِرَةِ، فَأُتِيَ بِوَضُوْءٍ فَتَوَضَّأَ فَجَعَلَ النَّاسُ يَأْخُذُوْنَ مِنْ فَضْلِ وَضُوْءِهٖ فَيَتَمَسَّحُوْنَ بِهٖ »[1]

''نبی مکرم ﷺ (ایک مرتبہ) دوپہر کے وقت ہمارے پاس تشریف لائے۔ آپ ﷺ کو وضو کے لیے پانی دیا گیا تو آپ ﷺ نے اس سے وضو فرمایا تو لوگ آپ ﷺ کے وضو سے گرنے والے پانی کو اٹھانے اور اسے اپنے جسموں پر ملنے لگے۔''

5 اسی موضوع کی ایک حدیث بھی صحیح بخاری میں مذکور ہے:

« دَعَا النَّبِيُّ ﷺ بِقَدَحٍ فِيْهِ مَآءٌ، فَغَسَلَ يَدَيْهِ وَ وَجْهَهٗ وَ مَجَّ فِيْهِ، ثُمَّ قَالَ لَهُمَا (يَعْنِي اَبَا مُوْسىٰ وَ بِلَالًا): اِشْرَبَا مِنْهُ، وَافْرِغَا عَلٰى وُجُوهِكُمَا وَ نُحُوْرِكُمَا »[2]

''نبی اکرم ﷺ نے ایک پیالہ منگوایا، جس میں پانی تھا۔ آپ ﷺ نے اس سے اپنے دونوں دستِ مبارک اور چہرۂ اقدس کو دھویا اور کلی کا پانی بھی اسی میں ڈالا، پھر آپ ﷺ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت بلال رضی اللہ عنہما کو حکم فرمایا: اس پانی کو پیو اور اپنے چہروں اور گلوں پر بھی ڈال لو۔''

6 نیز صحیح بخاری (۱/ ۲۹۶) ہی میں مروی ہے کہ حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

« ذَهَبَتْ بِيْ خَالَتِي إِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَتْ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ (ﷺ)! اِنَّ ابْنَ

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٢٩٢) الفتح الرباني (١/ ٢٠٩) و النيل (١/ ١٩)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٢٩٥)

اخْتِي وَجِعٌ فَمَسَحَ رَأْسِيُ وَدَعَا لِيُ بِالْبَرَكَةِ، ثُمَّ تَوَضَّأَ فَشَرِبْتُ مِنُ وَضُوئِهِ»
''مجھے میری خالہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے گئیں اور اس نے کہا: اے اللہ کے رسول (ﷺ)! میرا یہ بھانجا بیمار ہو گیا ہے، تو آپ ﷺ نے میرے سر پر اپنے دست مبارک کو پھیرا اور میرے لیے برکت کی دعا فرمائی، پھر آپ نے وضو فرمایا، تو میں نے آپ ﷺ کے وضو والے پانی سے پانی پیا۔''

7 سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ کی کسی زوجہ محترمہ نے آپ کے سامنے وضو کے لیے پانی کا برتن رکھا اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا:
«اِنِّي غَمَسْتُ يَدِيُ فِيهَا، وَأَنَا جُنُبٌ»
''میں نے بہ حالتِ جنابت اس پانی میں اپنا ہاتھ ڈبویا ہے۔''
تب آپ ﷺ نے فرمایا:
«اَلْمَاءُ لَا يَجْنُبُ»[1] ''پانی جنبی نہیں ہوتا۔''
نیز مسند احمد میں ہے:
«اَلْمَآءُ لَا يَنْجُسُ» ''پانی نجس نہیں ہوتا۔''

8 ایسے ہی ایک روایت، جو ضعیف ہے، سنن ابن ماجہ، دارقطنی اور مسند احمد میں مذکور ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:
«اِغْتَسَلَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ مِنُ جَنَابَةٍ، فَلَمَّا خَرَجَ رَأَىٰ لَمْعَةً عَلٰى مَنْكِبِهِ الْأَيْسَرِ لَمْ يُصِبْهَا الْمَآءُ، فَاَخَذَ مِنُ شَعْرِهٖ فَبَلَّهَا ثُمَّ مَضٰى اِلَى الصَّلَاةِ»[2]
''نبی ﷺ نے غسل جنابت فرمایا۔ جب آپ ﷺ غسل فرما کر نکلے تو دیکھا کہ آپ ﷺ کے بائیں کندھے پر تھوڑی سی جگہ خشک رہ گئی ہے۔ آپ نے اپنی زلفوں کو نچوڑا اور اس پانی سے اس جگہ کو گیلا کیا اور پھر نماز کے لیے چل دیے۔''

---

[1] صحيح سنن أبي داود (١/ ١٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٥) المغني (١/ ٣١، ٣٣) النيل و المنتقىٰ (١/ ٢٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٩٢٧)

[2] الفتح الرباني (٢/ ١٣٨) و المغني أيضاً.

یہ آخری حدیث تو ضعیف ہے، لہٰذا قابلِ استدلال نہیں اور پہلی صحیح احادیث میں غسل یا وضو میں استعمال ہونے والے پانی سے دوبارہ وضو کر لینے کی صراحت ہی نہیں ہے، بلکہ صراحت صرف اس بات کی ہے کہ وہ پانی پاک ہے، نجس نہیں، یعنی طاہر ہے۔ البتہ اس کے مطہر (دوسرے کو پاک کرنے والا) ہونے کا واضح ثبوت نہیں۔ پھر مذکورہ واقعات میں سے سوائے ایک زوجۂ محترمہ کے ہاتھ ڈبونے والے واقعے کے، سب کے سب نبیِ اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس سے تعلق رکھتے ہیں، اگرچہ صریح دلیل نہ ہونے کی وجہ سے اس معاملے کو خصائصِ مصطفی ﷺ میں سے تو شمار نہیں کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ امام شوکانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے۔[1]

دوسرا مسلک:

بعض دیگر احادیث میں نبیِ اکرم ﷺ نے ایسے پانی سے غسل و وضو کرنے سے منع فرمایا ہے، جس سے ایک مرتبہ غسل یا وضو کیا جا چکا ہو، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا پانی خود تو طاہر ہے، لیکن مطہر نہیں۔ یہ عام ائمہ اور علمائے احناف، اسی طرح حنابلہ اور شافعیہ کا مسلک ہے۔ امام لیث رحمہ اللہ، اوزاعی، مشہور مذہب کے مطابق امام ابو حنیفہ، ظاہری مذہب، امام شافعی رحمہ اللہ، ایک روایت کے مطابق امام مالک رحمہ اللہ کا بھی مسلک یہی ہے اور امام احمد رحمہ اللہ سے معروف روایت میں یہی مسلک منقول ہے۔[2] اس مسلک والوں کا استدلال بھی متعدد صحیح احادیث سے ہے۔

1. ان کی پہلی دلیل وہ حدیث ہے، جو صحیح بخاری و مسلم، سنن ابی داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور سنن دارمی میں مروی ہے، جس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«لَا يَغْتَسِلُ أَحَدُكُمْ فِي الْمَآءِ الدَّائِمِ وَهُوَ جُنُبٌ، فَقَالَ: كَيْفَ يَفْعَلُ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ؟ قَالَ: يَتَنَاوَلُهُ تَنَاوُلًا»[3]

---

[1] نيل الأوطار (١/ ٢٠)

[2] المغني (١/ ٣١) البداية لابن رشيد (١/ ٤٠) مؤسسه ناصر و نيل الأوطار (١/ ٢٢۔ ٢٣)

[3] صحيح مسلم مع شرحه للنووي (١/ ٣/ ١٨٨۔ ١٨٩ واللفظ لهٗ) صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٢٣٩) صحيح سنن أبي داود (١/ ١٦) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٢١٥) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٥٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٤٤) مشكاة المصابيح (١/ ١٤٨) صحيح الجامع رقم الحديث (٧٧٣٥)

''تم میں سے کوئی جب جنابت کی حالت میں ہو تو کھڑے پانی میں (داخل ہو کر) غسل نہ کرے۔ سننے والے لوگوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (راویِ حدیث) سے پوچھا: اے ابو ہریرہ! تو پھر وہ آدمی کیسے نہائے؟ تب انھوں نے طریقہ بتاتے ہوئے فرمایا: وہ پانی میں سے (چلو وغیرہ بھر کر) نکالے (اور باہر بیٹھ کر نہائے)۔''

② سنن ابی داود اور مسند احمد کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

«لَا يَبُوْلَنَّ اَحَدُكُمْ فِي الْمَآءِ الدَّائِمِ وَلَا يَغْتَسِلُ فِيهِ مِنَ الْجَنَابَةِ»[1]

''تم میں سے کوئی شخص کھڑے پانی میں ہرگز پیشاب نہ کرے اور نہ اس میں جنابت کی حالت میں غسل کرے۔''

یہاں کھڑے پانی میں غسلِ جنابت سے روکا گیا ہے، جس سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ غسلِ جنابت سے چونکہ وہ پانی خراب ہو جاتا ہے اور دوسرے کے غسل و وضو کے قابل نہیں رہتا، بلکہ خود ایسے آدمی کو طہارت کا فائدہ نہیں دے گا، کیوں کہ اس کے پانی میں داخل ہوتے ہی وہ پانی اپنی طہوریت کھو دے گا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے پانی سے غسلِ جنابت سے منع فرمایا ہے، اسی حدیث کی بنا پر امام ابو یوسف اور ایک غیر معروف بلکہ متروک روایت میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے مستعمل پانی کو نجس قرار دیا ہے۔[2]

غالباً امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے تو اس رائے سے رجوع کر لیا تھا اور صرف امام ابو یوسف اکیلے ہی اس کے قائل رہ گئے تھے، یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن رشد نے ''بدایۃ المجتہد'' میں یہ رائے امام ابو یوسف کی طرف منسوب کرتے ہوئے لکھا ہے:

«شَذَّ اَبُوْ يُوْسُفَ... فَقَالَ: اِنَّهٗ نَجِسٌ»[3]

''امام ابو یوسف ایسے پانی کی نجاست کی رائے میں شاذ اور تنہا رہ گئے ہیں۔''

اختلاف اس کے مطہر ہونے میں ہے کہ اس سے صرف غسل و وضو نہیں کیا جا سکتا اور دوسرے

---

[1] صحيح سنن أبي داود (١/ ١٦) رقم الحديث (٦٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٧) المنتقیٰ مع النيل (١/ ٢٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٥٩٠)

[2] المغني (١/ ٢٢)

[3] بداية المجتهد (١/ ٤٠)

استعمال میں لایا جاسکتا ہے، کیوں کہ وہ پلید ونجس نہیں ہوتا، جیسا کہ پہلے مسلک کے دلائل کے طور پر ذکر کی گئی احادیث سے معلوم و واضح ہوتا ہے۔ نیز اگر مستعمل پانی نجس و پلید ہو جاتا تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ نبیِ اکرم ﷺ اور صحابہ وصحابیات رضی اللہ عنہم بڑے بڑے پیالوں اور ڈبوں وغیرہ سے وضو کرتے، کیوں کہ اس طرح یقیناً مستعمل پانی کے چھینٹے تو پانی کے بڑے برتن میں گر جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابراہیم نخعی رحمہ اللہ (استاذ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ) کا ارشاد ہے:

«وَلَا بُدَّ ... مِنْ ذَلِكَ»[1] ''اس کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔''

الغرض صحاح وسنن کی مذکورہ حدیث سے یہ دلیل لی گئی ہے کہ مستعمل پانی خود تو پاک رہ جاتا ہے، مگر اس میں غسل و وضو کے لیے پاک کرنے کی صلاحیت نہیں رہتی، اسی لیے نبیِ اکرم ﷺ نے کھڑے پانی میں (خصوصاً جب کہ وہ کم مقدار میں ہو) غسل جنابت کرنے سے منع فرمایا ہے۔

مرد و زن کا اکٹھے غسل اور وضو کرنا:

اسی مسلک کی دوسری دلیل وہ حدیث ہے، جو سنن اربعہ یعنی سنن ابی داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد و مسند ابو داود طیالسی میں مروی ہے، جس میں حضرت حکم بن عمرو غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

1. «اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى اَنْ يَّتَوَضَّأَ الرَّجُلُ بِفَضْلِ طُهُوْرِ الْمَرْأَةِ»[2]

''نبیِ اکرم ﷺ نے عورت کے وضو سے بچے ہوئے پانی سے مرد کو وضو کرنے سے منع کیا ہے۔''

2. سنن نسائی و ابن ماجہ میں «طَهُوْرِ الْمَرْأَةِ» کے بجائے «وَضُوْءِ الْمَرْأَةِ» کے الفاظ ہیں، دونوں حدیثوں کا ایک ہی ہے۔''[3]

اس حدیث سے یوں دلیل لی گئی ہے کہ عورت کے وضو کرنے سے چونکہ وہ پانی مستعمل ہو جاتا ہے اور مطہر ہونے کی صلاحیت کھو دیتا ہے، اس لیے آپ ﷺ نے ایسے مستعمل پانی کے ساتھ

---

[1] المغني (١/ ٢٣)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٢) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٥٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٧٣)

[3] الفتح الرباني (١/ ٢١١) المنتقى مع النيل (١/ ٢٥) حسنه الترمذي و صححه الألباني في الإرواء (١/ ٤٣۔ ٤٤)

وضو کرنے سے منع فرما دیا۔

④ ایک تیسری حدیث سنن ابی داود و نسائی، مسند احمد اور سنن بیہقی میں مروی ہے، جس میں نبیِ اکرم ﷺ کی صحبت میں چار سال رہنے والے ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے روزانہ کنگی کرنے اور غسل خانے میں پیشاب کرنے سے منع کیا اور ارشاد فرمایا ہے:

« وَاَن تَغْتَسِلَ الْمَرْأَةُ بِفَضْلِ الرَّجُلِ، وَأَنْ يَّغْتَسِلَ الرَّجُلُ بِفَضْلِ الْمَرْأَةِ، وَلْيَغْتَرِفَا جَمِيْعاً »[1]

”اور عورت کو مرد کے اور مرد کو عورت کے بچے ہوئے پانی سے غسل کرنے سے بھی منع فرمایا اور چاہیے کہ میاں بیوی اکٹھے غسل کر لیں۔“

یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ غسل خانے میں پیشاب اس وقت منع ہے، جبکہ وہ صرف غسل کے لیے ہو اور پانی کی نکاسی کا خاص انتظام نہ ہو، لیکن اگر موجودہ حماموں یا باتھ رومز کی طرح وہاں پیشاب، پاخانے اور غسل کے لیے الگ مخصوص جگہ بنی ہو تو وہاں پیشاب سے چھینٹوں کا کوئی احتمال نہیں رہتا، لہٰذا پیشاب کیا جا سکتا ہے اور جمہور فقہا کے نزدیک یہ جائز ہے۔[2]

ایسے ہی مستعمل پانی طاہر، لیکن غیر مطہر ہونے کے بعض دیگر قیاسی قسم کے دلائل بھی نقل کیے گئے ہیں۔[3]

ان مذکورہ بالا احادیث سے تو استدلال بھی تب درست ہوتا، جب یہ کوئی زیرِ بحث مسئلے میں فیصلہ کن ہوتیں، حالانکہ اس کے برعکس صحیح مسلم اور مسند احمد میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

① « كَانَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَغْتَسِلُ بِفَضْلِ مَيْمُوْنَةَ »[4]

”رسول اللہ ﷺ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے غسل سے بچے پانی سے غسل فرماتے تھے۔“

② سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں خود حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے طریق سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٨١) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٢٣٢) الفتح الرباني (١/ ٢١٠)

[2] تهذيب معالم السنن لابن القيم على عون المعبود (١/ ١١٨) و غاية المقصود أيضاً.

[3] دیکھیں: نيل الأوطار (١/ ٢٣)

[4] صحيح مسلم مع شرحه النووي (٤/ ٦۔ ٧) الفتح الرباني (١/ ٢١٢) المنتقى مع النيل (١/ ٢٦)

«اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ تَوَضَّأَ بِفَضْلِ غُسْلِهَا مِنَ الْجَنَابَةِ»[1]

''رسول اللہ ﷺ نے ان کے غسلِ جنابت سے بچے ہوئے پانی سے وضو فرمایا۔''

اسی طرح اس سلسلے میں تیسری حدیث بھی ہے پہلے بھی گزر چکی ہے۔

۳ نبی کریم ﷺ کی کسی زوجہ محترمہ رضی اللہ عنہا نے ایک ٹب والے پانی سے غسل کیا۔ پھر نبیِ اکرم ﷺ اس سے غسل یا وضو کرنے لگے تو انھوں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں جنابت سے تھی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«اِنَّ الْمَآءَ لَا یَجْنُبُ» ''بے شک پانی جنبی نہیں ہوتا۔''

۴ نیز صحیح بخاری و مسلم میں مروی ہے:

«اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ وَ مَیْمُوْنَةَ کَانَا یَغْتَسِلَانِ مِنْ اِنَاءٍ وَّاحِدٍ»[2]

''نبیِ اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا ایک ہی برتن سے غسل کیا کرتے تھے۔''

۵ نبیِ اکرم ﷺ کی دوسری زوجہ محترمہ ام المومنین حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا کا بیان صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں منقول ہے:

«کُنْتُ اَغْتَسِلُ أَنَا وَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مِنْ اِنَاءٍ وَّاحِدٍ مِنَ الْجَنَابَةِ»[3]

''میں اور رسول اللہ ﷺ ایک ہی برتن سے غسلِ جنابت کیا کرتے تھے۔''

۶ آپ ﷺ کی ایک اور زوجہ محترمہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا بیان بھی صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں مروی ہے، جس میں وہ فرماتی ہیں:

«کُنْتُ اَغْتَسِلُ أَنَا وَ رَسُوْلُ اللہِ ﷺ مِنْ اِنَاءٍ وَاحِدٍ تَخْتَلِفُ أَیْدِیْنَا فِیْهِ مِنَ الْجَنَابَةِ»[4]

''میں اور رسول اللہ ﷺ ایک ہی برتن سے (بیک وقت) غسل جنابت کیا کرتے تھے،

---

[1] سنن ابن ماجه رقم الحديث (٣٧٢)

[2] صحيح البخارى مترجم (١/ ٢٠١) و مسلم مع شرح النووي (٤/ ٦) نيل الأوطار (١/ ٢٦)

[3] صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ٧) نيل الأوطار (١/ ٢٧)

[4] صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٦)

حتیٰ کہ ہمارے ہاتھ (پانی لیتے ہوئے) ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے تھے۔‘‘

ایک ہی برتن سے ایک ہی وقت میں اکٹھے بیٹھ کر غسل کرنے کی وضاحت و صراحت بھی موجود ہے، چنانچہ اسی حدیث میں بخاری شریف کے الفاظ بھی موجود ہیں:

«مِنْ اِنَاءٍ وَّاحِد نَغْتَرِفُ مِنْهُ جَمِيْعاً»

’’ہم اکٹھے ہی ایک برتن سے پانی کے چلو لیتے تھے۔‘‘

صحیح مسلم میں تو اور بھی صراحت ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں:

«مِنْ اِنَاءٍ بَيْنِيْ وَ بَيْنَهٗ وَاحِدٍ فَيُبَادِرُنِيْ حَتّٰى اَقُوْلَ: دَعْ لِيْ دَعْ لِيْ»[1]

’’ایک ہی برتن سے جو میرے اور آپ ﷺ کے درمیان پڑا ہوتا تھا اور آپ ﷺ جلدی پانی لیتے جاتے، حتیٰ میں کہتی: میرے لیے بھی چھوڑ دیں، میرے لیے بھی چھوڑ دیں۔‘‘

سنن نسائی شریف میں مروی ہے:

«مِنْ اِنَاءٍ وَّاحِدٍ يُبَادِرُنِيْ وَاُبَادِرُهٗ حَتّٰى يَقُوْلَ: دَعْ لِيْ، وَ أَنَا أَقُوْلُ: دَعْ لِيْ»[2]

’’ایک ہی برتن سے ہم نہاتے اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے، حتیٰ آپ ﷺ فرماتے، میرے لیے بھی پانی چھوڑ دو اور میں عرض کرتی کہ میرے لیے بھی پانی چھوڑ دیں۔‘‘

یہ تو نبیِ کریم ﷺ اور آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے بارے میں احادیث ہیں، جب کہ بعض دیگر احادیث میں عام مردوں اور عورتوں کا بھی ایک برتن سے اکٹھے وضو کرنا ثابت ہے، مگر ان احادیث کو اہلِ علم نے نزولِ حجاب یعنی پردے کا حکم نازل ہونے سے پہلے کے زمانے کے ساتھ خاص کیا ہے۔ البتہ محرم مرد و زن کے لیے یہ حکم مطلق ہے۔

چنانچہ سنن ابی داود میں قبیلہ بنی جہینہ کی ایک صحابیہ حضرت امّ حبیبہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

«اِخْتَلَفَتْ يَدِيْ وَيَدُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مِنْ اِنَاءٍ وَّاحِدٍ»[3]

’’ایک برتن سے وضو کرتے ہوئے میرے اور رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ باہم چھو گئے۔‘‘

---

[1] صحیح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ٦)

[2] صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (٢٣٣) نیل الأوطار (١/ ٢٧)

[3] نیل الأوطار (١/ ٢٧) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (٧١)

8 سنن ابی داود ہی کی دوسری حدیث میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

«كَانَ الرِّجَالُ وَ النِّسَاءُ يَتَوَضَّؤُوْنَ فِيْ زَمَانِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ (قَالَ مُسَدَّدٌ) مِنَ الْإِنَاءِ الْوَاحِدِ جَمِيْعاً»[1]

''نبیِ اکرم کے زمانے میں مرد اور عورتیں وضو کیا کرتے تھے اور ایک راوی حدیث مسدّد نے وضاحت کی ہے کہ سب اکٹھے ایک ہی برتن سے کرتے تھے۔''

ان آخری دو حدیثوں کے حکم کو نزولِ حجاب سے پہلے کے زمانے کے ساتھ خاص کیا گیا ہے اور حکمِ حجاب کے بعد یہ میاں بیوی کے لیے مطلق ہے۔

ان مذکورہ احادیث کے پیشِ نظر اہلِ علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ میاں بیوی دونوں اکٹھے ایک ہی برتن سے غسل و وضو کر سکتے ہیں۔[2]

فتح الباری (۱/ ۳۶۴) میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے داودی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ وہ اکٹھے غسل والی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میاں بیوی ایک دوسرے کی شرم گاہ کو دیکھ سکتے ہیں اور اس بات کی تائید صحیح ابن حبان کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں مشہور فقیہ و عالم اور معروف تابعی امام عطا رحمہ اللہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اس سلسلہ میں پوچھتے ہیں، تو ان کے جواب میں وہ یہی حدیث بیان کر دیتی ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کے نزدیک اس مسئلے میں یہ نص (قاطع) ہے۔[3]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے جد امجد ''المنتقی'' میں فرماتے ہیں:

''اکثر اہلِ علم نے عورت کے غسل سے بچے ہوئے پانی سے مرد کو غسل کرنے کی بھی رخصت دی ہے اس معاملے میں رخصت والی احادیث، عدمِ رخصت والی احادیث سے زیادہ صحیح ہیں، تو مرد کے بچے ہوئے پانی سے عورت کا غسل و وضو کرنا بالاولیٰ درست ہوگا۔ البتہ دونوں طرح کی احادیث ہونے کی وجہ سے صحابہ و ائمہ میں دونوں قسم کی آرا

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٧٢) نيل الأوطار (١/ ٢٧)

[2] فتح الباري شرح صحيح البخاري (١/ ٣٦٤) نيل الأوطار (١/ ٢٧)

[3] فتح الباري (١/ ٣٦٤)

موجود ہیں، ان دونوں طرح کی احادیث میں اہلِ علم نے مطابقت یوں پیدا کی ہے کہ نعت والی احادیث سے نہی تنزیہی مراد ہے، تحریمی نہیں، یعنی اگر ایسے پانی سے غسل و وضو کر لے تو جائز ہے اور اگر نہ کرے تو یہ زیادہ بہتر ہے، یہ بھی تب ہے کہ جب عورت پہلے غسل کر لے اور پانی بچ جائے، لیکن اگر اکٹھے ہی غسل کریں تو بلا اختلاف جائز ہے۔ جیسا کہ ابھی ذکر ہوا ہے۔''[1]

المختصر مرد و زن کے اکٹھے غسل و وضو کرنے یا ایک دوسرے کے بچے ہوئے پانی سے غسل و وضو کرنے کے جواز کی تفصیل پر غور کیا جائے تو تھوڑی مقدار کے مستعمل پانی کے بارے میں بھی فیصلہ ہو جاتا ہے کہ اگرچہ نفاست پسند طبائع ایسے پانی سے غسل و وضو میں تامّل کریں، جیسا کہ فریقِ ثانی کا مسلک بھی ہے، لیکن بعض مذکورہ دلائل کی رو سے وہ پانی طاہر و مطہر ثابت کیا گیا ہے اور پہلے فریق کے اس مسلک والے ائمہ و فقہا کے علاوہ امام شوکانی رحمہ اللہ جیسے مجتہدین و شارحینِ حدیث اور امام قرطبی و علامہ ابن عبدالبر جیسے علما سے بھی اس پانی کے طاہر و مطہر ہونے کی طرف میلان ہی کا پتا چلتا ہے۔[2]

تیسری قسم:

اسی سلسلے کی تیسری قسم وہ پانی ہے، جس میں کوئی نجاست گر گئی ہو، مثلاً جھیل کا پانی ہے یا وہ تالاب جو شہروں اور دیہات سے دور جنگلات اور صحراؤں وغیرہ میں بارش وغیرہ کے پانی سے بنے ہوں یا پانی کا حوض ہے، چاہے وہ کہاں بھی ہو، ان میں سے کسی میں کوئی نجس اور ناپاک چیز گر جائے تو اس پانی کا کیا حکم ہے؟

اس کی تفصیل میں جانے سے قبل یہ بات واضح کر دیں کہ شہروں اور دیہات سے دور پانی جانے والی جھیلوں اور تالابوں یا حوضوں کے ساتھ ''دور'' کی قید ہم نے اس لیے ذکر کی ہے کہ آس پاس میں پائے جانے والے تالاب وغیرہ عموماً ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں نالیوں کا گندہ پانی جمع ہوتا ہے اور اس پانی کے نجس و ناپاک ہونے میں تو اختلاف کی کوئی گنجایش ہی نہیں۔ دیگر مذکورہ شکلوں میں پائے جانے والے پانی کی بھی دو شکلیں ہیں۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: نیل الأوطار (۱/ ۲٦۔ ۲۷)

[2] نیل الأوطار (۱/ ۱۸۔ ۲۷) تفسیر القرطبي (۷/ ۱۳/ ٤۸۔ ۵۱)

پہلی شکل:

نجاست کے اثر سے جس پانی کے رنگ، بو یا ذائقے میں فرق آجائے، اگر ان تینوں میں سے کوئی ایک بھی تبدیل ہو جائے تو وہ پانی ناپاک ہو جاتا ہے، جیسا کہ سنن ابن ماجہ، دارقطنی اور بیہقی میں ایک حدیث ہے:

«اِنَّ الْمَآءَ طَھُورٌ لَا یُنَجِّسُهٗ شَیْئٌ اِلَّا مَا غَلَبَ عَلٰی رِیْحِهٖ وَطَعْمِهٖ وَلَوْنِهٖ»[1]

''پانی پاک ہے اور اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی، سوائے اس کے کہ اس کی بو یا ذائقہ یا رنگ بدل جائے۔''

محدّثین کرام رحمہم اللہ کے نزدیک یہ حدیث ضعیف ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ شارح بخاری نے اپنی دوسری کتاب ''بلوغ المرام'' میں ابو حاتم سے اس کے ضعیف ہونے کا قول نقل کیا ہے اور امام نووی رحمہ اللہ نے تو اس کے ضعیف ہونے پر تمام محدّثین کا اتفاق نقل کیا ہے۔[2]

لہٰذا محض یہ حدیث ہی ہوتی تو استدلال درست نہ ہوتا، لیکن امام ابن المنذر اور دیگر علما و محدّثین نے اس بات پر تمام علماے اُمت کا اجماع نقل کیا ہے کہ ان اوصاف میں سے کسی ایک کے بھی بدل جانے سے وہ پانی ناپاک ہو جاتا ہے اور یہ اجماعِ اُمت ہی دراصل یہاں دلیل و حجت ہے۔[3]

ان اوصاف میں سے کسی بھی ایک کے بدل جانے پر اس کے ناپاک ہو جانے میں یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ کم ہو، بلکہ کم ہو یا زیادہ، ہر حالت میں ناپاک ہو جاتا ہے۔

دوسری شکل:

جس پانی میں نجاست گر جائے، اس کی دوسری شکل یہ ہے کہ نجاست گرنے سے اس کا رنگ یا بو یا ذائقہ کچھ بھی تبدیل نہیں ہوا، اب اس پانی کے بارے میں کیا حکم ہے؟

اس سلسلے میں اہلِ علم کے تین اقوال ہیں اور یہ پانی کے قلیل یا کثیر ہونے میں اختلاف کی

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٢١)

[2] تفصیل کے لیے دیکھیں: نصب الراية للزيلعي (١/ ٩٤) التلخيص الحبير للحافظ ابن حجر (١/ ٩٤) و بلوغ المرام مع السبل (١/ ١٨) المغني (١/ ٣٩) المجموع للنووي (١/ ١٦٠۔ ١٦١)

[3] كتاب الإجماع (ص: ٣٣) الأوسط (١/ ٢٦٠) و المغني (١/ ٣٨) نيل الأوطار (٢٩)

بنیاد پر ہیں:

① بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اور ائمہ وفقہا کا کہنا ہے کہ پانی کم ہو یا زیادہ، اگر اس کا رنگ یا ذائقہ یا بو کچھ بھی تبدیل نہ ہوا ہو تو وہ پانی ناپاک نہ ہوگا، یعنی اس میں سے نجاست نکال کر اسے ہر قسم کے استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔

یہ ام المومنین حضرت عائشہ، ام المومنین حضرت میمونہ، امیر المومنین حضرت عمر فاروق، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت حسین شہیدِ کربلا، حضرت ابوہریرہ، حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کی ایک جماعت کا مسلک ہے، جیسا کہ علامہ ابن حزم نے اپنی کتاب ''المحلیٰ'' میں ذکر کیا ہے۔[1] نیز امام مالک، اوزاعی، لیث اور علماے مجتہدین کا بھی یہی مسلک ہے، جیسا کہ علامہ ابن عبدالبر نے ''التمھید'' میں اس کی تفصیل ذکر کی ہے۔[2]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ''إغاثۃ اللھفان'' (۱/ ۱۵۶) میں لکھا ہے:

اہلِ مدینہ، جمہور سلف، اکثر محدثین، سفیان ثوری، عبدالرحمٰن بن مہدی اور اہلِ ظاہر بھی اسی کے قائل ہیں۔ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کے علاوہ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے ''المغني'' میں ذکر کیا ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے بھی اس کی ایک روایت ملتی ہے اور فقہاے حنابلہ کی ایک جماعت نے بھی اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔[3] امام شوکانی رحمہ اللہ کے بقول امام حسن بصری، سعید ابن مسیّب، عکرمہ، ابن ابی لیلیٰ، ابراہیم نخعی، امام مالک اور غزالی رحمہم اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔[4]

محققین علما کی ایک جماعت نے بھی اسی مسلک کو صحیح قرار دیا ہے، مثلاً: علامہ ابن عبدالبر نے ''التمھید'' (۱/ ۳۲۸) میں، علامہ ابن حزم نے ''المحلّی'' (۱/ ۱۳۵) میں، امام ابن تیمیہ نے ''فتاویٰ'' (۲۱/ ۴۹۸ وما بعد) میں علامہ ابن قیم نے ''إغاثۃ اللھفان'' (۱/ ۱۵۶) اور ''تھذیب معالم السنن'' (تھذیب علیٰ عون المعبود: ۱/ ۱۱۹) میں، امیر صنعانی نے ''سبل السلام'' (۱/ ۱۸) میں، امام شوکانی نے ''السیل الجرار'' (۷۶۲) میں، شیخ عبدالرحمٰن یمانی نے

[1] المحلی (۱/ ۱۶۸)

[2] التمھید (۱/ ۳۲۷۔ ۳۲۸)

[3] المغني (۱/ ۳۹)

[4] نیل الأوطار (۱/ ۲۹)

"التنکیل" (٧٥٤) میں اور شیخ ناصر الدین البانی نے "التنکیل" (٧٦٢) کی تحقیق میں اسی مسلک کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام قرطبی رحمہ اللہ کا رجحان بھی اپنی تفسیر میں اسی طرف ہے، بلکہ وہ لکھتے ہیں:

«وَهُوَ الصَّحِيحُ فِي النَّظَرِ، وَجَيِّدُ الْأَثَرِ»[1]

"یہی مسلک زیادہ قرینِ قیاس ہے اور اسی کے دلائل بھی اچھے ہیں۔"

پھر انھوں نے آگے چل کر طوسی اکبر کے حوالے سے لکھا ہے:

اس مسئلے میں سب سے عمدہ و اچھا مسلک امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک ہے اور ان سب کا استدلال سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد، سنن دارقطنی و بیہقی، مستدرک حاکم اور مصنف ابن ابی شیبہ میں مذکور "بئر بضاعة" والی معروف حدیث سے ہے، جس میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کیا ہم "بضاعة" نامی کنویں سے وضو کر سکتے ہیں، جب کہ یہ ایسا کنواں ہے، جس میں حیض کے چیتھڑے، کتوں کا گوشت اور دوسری بدبودار اشیا ڈالی جاتی ہیں؟ تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلْمَاءُ طَهُورٌ، لَا يُنَجِّسُهُ شَيْءٌ»[2]

"پانی پاک ہے (طاہر و مطہّر ہے) اسے کوئی چیز نجس اور ناپاک نہیں کر سکتی۔"

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ "معالم السنن" (١/ ٣٧) میں امام خطابی رحمہ اللہ نے وضاحت کی ہے کہ اہلِ مدینہ جان بوجھ کر گندی اشیا "بئر بضاعة" میں ہرگز نہیں ڈالا کرتے تھے، بلکہ دراصل وہ کنواں ایک نشیبی اور ڈھلوان جگہ پر تھا اور بارش وغیرہ کا پانی مذکورہ بالا گندی اشیا کو اپنے ساتھ بہا کر اس کنویں میں لے جایا کرتا تھا، نیز قرآنِ کریم کے ان الفاظ:

﴿وَأَنزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا﴾ [الفرقان: ٤٨]

"اور ہم نے آسمان سے پاک پانی نازل کیا۔"

کا ظاہر بھی یہی بتاتا ہے کہ جب تک پانی کے اوصاف میں سے کوئی وصف تبدیل نہ ہو تو وہ

---

[1] تفسیر القرطبي (٧/ ١٣/ ٤٢۔ ٤٣)

[2] صحیح سنن الترمذي، رقم الحدیث (٥٦) صحیح سنن أبي داود(٥٩) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (٣١٥) المنتقی مع النیل (١/ ٢٨) المجموع للنووي (١/ ١٢٧) التلخیص الحبیر (١/ ١٣)

نجس نہیں ہوتا۔

اسی مفہوم کی کئی دیگر احادیث بھی مروی ہیں، جو متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مرفوعاً اور موقوفاً صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان، مسند احمد، مسند ابی یعلی و بزار اور معجم طبرانی اوسط میں مذکور ہیں۔[1]

(۲) ایسا پانی جس میں کوئی ناپاک چیز گر جائے، مگر اس سے اس کا رنگ، ذائقہ یا بو تبدیل نہ ہو، اس کے بارے میں اہلِ علم کا دوسرا قول ہے کہ اگر وہ پانی کثیر مقدار میں ہوگا تو ناپاک نہیں ہوگا اور اگر قلیل مقدار میں ہوا تو ناپاک ہو جائے گا۔ یہ حضرت ابن عمر، سعید بن جبیر، امام مجاہد، امام شافعی، امام اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ اور ایک روایت میں امام احمد اور ابو عبید رحمہما اللہ کا مسلک ہے۔[2]

پھر اس قلیل و کثیر پانی کی کوئی حد بندی بھی نہیں کی گئی، البتہ ایک متکلم فیہ حدیث اور قیاس سے قلیل و کثیر کی حدود طے کی گئی ہیں۔ قلیل و کثیر پانی کی حد بندی میں ائمہ و فقہا کی آرا بھی مختلف ہیں۔ چنانچہ امام شافعی رحمہ اللہ اور عام اہلِ حدیث علما کے نزدیک اس کی حد بندی یہ کی گئی ہے کہ اگر وہ پانی دو قلے یعنی مٹکے یا اس سے زیادہ ہو تو وہ کثیر شمار ہوگا اور اگر دو قلوں (مٹکوں) سے کم ہے تو وہ قلیل ہے۔

پہلی شکل (یعنی دو قلے یا زیادہ ہوا تو اس صورت) میں وہ پانی نجس نہیں ہوگا اور دوسری شکل میں (دو قلوں سے کم ہوا تو) وہ نجس ہو جائے گا۔

ان کی دلیل وہ حدیث ہے، جو سنن اربعہ، صحیح ابن حبان، صحیح ابن خزیمہ، مستدرک حاکم، سنن دارقطنی، سنن دارمی، مسند احمد و شافعی اور طیالسی میں مروی ہے، جس کے الفاظ ہیں:

«إِذَا كَانَ الْمَاءُ قُلَّتَيْنِ لَمْ يَحْمِلِ الْخَبُثَ»[3]

''جب پانی دو قلے ہو تو وہ نجاست کو نہیں اٹھاتا (یعنی نجس نہیں ہوتا)۔''

اس مفہوم کی تائید سنن ابن ماجہ اور مسند احمد کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے، جس میں «لَمْ يَحْمِلِ الْخَبُثَ» کے بجائے «لَمْ يُنَجِّسْهُ شَيْئٌ» کے الفاظ ہیں کہ ''دو قلّے یا اس سے زیادہ پانی کو کوئی چیز

---

[1] نيل الأوطار (١/ ٢٨)

[2] المغني (١/ ٣٩)

[3] الفتح الرباني (١/ ٢١٦۔ ٢١٧) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٨) صحيح سنن الترمذي (٥٧) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥١٧) موارد الظمآن، رقم الحديث (١١٧) نيل الأوطار و المنتقىٰ (١/ ٣٠)

نجس نہیں کر سکتی۔'' لیکن پہلے مسلک والے ائمہ وفقہا اور محققین علما، نیز امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس حدیث کے متن اور سند دونوں میں اضطراب یعنی جھول پایا جاتا ہے، لہٰذا یہ قابلِ استدلال نہیں۔

امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''نیل الأوطار'' میں ان دونوں قسم کے جھول یا اضطراب کو بڑی حد تک زائل کر دیا ہے، نیز محدث العصر شیخ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے اور اس اضطراب والی علت کو رد کیا ہے۔[1] امام طحاوی، ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم، ذہبی، نووی اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہم اللہ نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے قلتین والی حدیث سے دلیل لینے پر پندرہ اشکالات وارد کیے ہیں اور ان کی تفصیل بھی ذکر کی ہے، جو ان کی کتاب ''تهذيب معالم السنن'' (١/ ١٠٦ تا ١٢٥) یا ''مختصر السنن مع المعالم و التهذيب'' (١/ ٥٩۔ ٧٤) میں دیکھی جا سکتی ہے، جہاں انھوں نے اس حدیث کی سند و متن کے اضطراب اور قلیتن یا دو مٹکوں کے پانی کی تحدید پر کھل کر بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ دو مٹکوں سے مراد کتنا پانی ہے؟ اس میں آج تک علما کا کسی خاص مقدار پر اتفاق نہیں ہو سکا، مذکورہ مسئلے کی حدیث کے بارے میں موصوف کی یہ طویل بحث اہلِ علم کے لیے قابل مطالعہ ہے، جس کی تفصیلات یہاں ذکر کرنا باعثِ طوالت ہے۔ مذکورہ حدیث پر بہت کچھ کلام کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام غزالی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے:

«وَدِدْتُّ أَنَّ مَذْهَبَ الشَّافِعِيِّ فِي الْمِيَاهِ كَانَ كَمَذْهَبِ مَالِكٍ»[2]

''مجھے یہ بات پسند ہے کہ کاش امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک بھی پانی کے سلسلے میں امام مالک رحمہ اللہ والا ہوتا۔''

علامہ ابن عبد البر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

«اَمَّا مَا ذَهَبَ اِلَيْهِ الشَّافِعِيُّ مِنْ حَدِيْثِ قُلَّتَيْنِ، فَمَذْهَبٌ ضَعِيْفٌ مِنْ جِهَةِ النَّظَرِ، غَيْرُ ثَابِتٍ فِي الْأَثَرِ»

''کہ دو مٹکوں والی حدیث کی بنا پر امام شافعی رحمہ اللہ نے جو مسلک اختیار کیا ہے، وہ فکر و نظر

---

[1] دیکھیں: النيل (١/ ٣٠۔ ٣١) الإرواء (١/ ٦٠) تمام المنة (ص: ٤٩)

[2] بحوالہ فتاویٰ ابن تیمیة (٢١/ ٥٠١)

کے اعتبار سے ضعیف و کمزور ہے اور سند و استناد کی بنا پر غیر ثابت بھی ہے۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں کہ دو مٹکوں میں کتنا پانی ہوسکتا ہے؟ اس کے بارے میں نہ تو کوئی حدیث صحیح و ثابت ہے اور نہ اس پر اجماع ہی ملتا ہے۔ اگر یہ لازمی حد ہوتی تو علما پر واجب تھا کہ وہ بحث و تحقیق کر کے اس حد کی واقفیت حاصل کریں، جو نبیِ اکرم ﷺ نے مقرر فرمائی ہو، کیوں کہ یہ بات دین کے اصل الاصول اور فرائض میں شامل ہے۔[1]

امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ ابن المنذر نے دو مٹکوں کے بارے میں جو اختلاف ذکر کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی توقیف و تحدید ثابت نہیں ہے۔[2] الغرض اس مسلک کا استدلال جس حدیث سے ہے، اس پر اگرچہ کلام کیا گیا ہے، مگر اسے کثیر محدثین رحمہم اللہ نے صحیح بھی قرار دیا ہے۔

③ ایسے پانی کے بارے میں تیسرا قول یا مسلک امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب پانی میں نجاست گر جائے تو وہ نجس ہو جاتا ہے، وہ تھوڑا ہو یا زیادہ، جب اس میں نجاست کا عموم متحقق ہو جائے، ان کے نزدیک نجاست کا عموم کیسے متحقق ہوتا ہے؟ اسے اس مثال سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ایک تالاب میں پیشاب کا ایک قطرہ یا نجاست کا کوئی ذرّہ گر گیا۔ اب اگر اس تالاب کے ایک کنارے سے پانی کو حرکت دی جائے اور اس حرکت کا اثر دوسرے کنارے پر دیکھا جاسکے تو اس تالاب کا سارا پانی نجس ہوگیا، لیکن اگر ایک کنارے کی حرکت کا اثر دوسرے کنارے پر نہ دیکھا جاسکے اور اس کنارے کا پانی متحرک نہ ہو تو پھر وہ پانی نجس نہیں ہوگا۔[3]

پانی کے قلیل و کثیر کا معیار (دوسرے قول میں) تو ایک حدیث سے لیا گیا تھا، مگر یہاں معاملہ یہ ہے کہ اس معیار کی بنیاد نہ کسی قرآنی آیت پر ہے نہ کسی صحیح اور نہ ضعیف حدیث ہی پر، بلکہ یہ سراسر قیاسی بنیاد پر ہے۔ اسی معیار کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اگر ظنِ غالب یہ ہو کہ نجاست کا اثر پورے پانی میں پھیل چکا ہوگا، تو وہ سارا پانی ہی ناپاک ہو جائے گا اور اگر گمان غالب

---

[1] نيل الأوطار (١/ ٣١) تفسير القرطبي (٧/ ١٣/ ٤٢۔ ٤٣)

[2] تفسير القرطبي (٧/ ١٣/ ٤٣)

[3] تفسير القرطبي (٧/ ١٣ / ٤٢)

یہ ہو کہ اس نجاست کا اثر پانی میں نہیں پھیلا ہوگا تو وہ نجس ہوگا۔[1] اس کی بنیاد بھی قیاس پر ہی ہے نہ کہ کسی آیت یا حدیث پر۔ یہ معیار تو امام صاحب کی طرف منسوب ہے، جبکہ ان کے دونوں شاگر دان رشید امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک اگر پانی کا طول وعرض اور گہرائی دس ہاتھ ہو تو وہ نجس نہیں ہوگا اور اگر اس سے کم ہو تو نجس ہو جائے گا۔[2]

اس کی بنیاد بھی قرآن وسنت کی کسی نص پر نہیں، بلکہ قیاس محض پر ہے اور پھر مختلف قسم کے قیاسی معیاروں پر بھی کئی اعتراضات و اشکالات وارد ہوتے ہیں، مثلاً حرکت والے معیار میں ان کے مطابق اگر کم گہرا مگر کافی طول وعرض میں پھیلا پانی ہو اور اس کے دوسرے کنارے تک حرکت کا اثر نہ پہنچ سکے تو وہ نجس نہ ہوا اور اگر اس سے بیسیوں گنا زیادہ پانی ہو، گہرائی میں زیادہ اور طول وعرض کے اعتبار سے تنگ جگہ میں ہو تو اس میں چونکہ حرکت کا اثر دوسری طرف پہنچ جائے گا، لہٰذا وہ نجس ٹھہرا اور یہ بہت بڑا تضاد ہے۔[3] الغرض ایک تو قرآن وسنت سے دلیل نہیں، دوسرے یہاں اس قسم کے تضادات بھی پائے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قولِ اوّل میں مذکور اہلِ تحقیق علما وفقہا نے ان تینوں اقوال میں سے ’’أقرب الأقوال بالنظر إلى الدليل‘‘ یعنی از روے قوتِ دلیل سب سے صحیح ترین قول یا مسلک پہلے قول ہی کو قرار دیا ہے اور تیسرے قول کی کوئی نقلی دلیل ہی نہیں، محض عقلی دلیل ہے اور وہ بھی تناقض والی ہے۔

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ قول اوّل کے مطابق اگرچہ مذکورہ پانی نجس نہیں، لیکن کسی کو کسی بھی پانی سے وضو یا غسل کرنے پر مجبور تو بہر حال نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اپنی طبیعت کے موافق پانی ہی کو استعمال میں لایا جائے اور وہ پانی جو از روے قوتِ دلیل نجس نہ ہو، اُسے محض طبیعت کی عدمِ موافقت کی بنا پر نجس بھی نہ قرار دیا جائے۔

بہتے ہوئے پانی کا حکم:

اسی تیسری قسم کے ضمن میں وہ پانی بھی آجاتا ہے جو کھڑا نہیں، بلکہ بہہ رہا ہو اور اس میں کوئی

[1] المغني (١/ ٤١) المتعلق الصبيح (١/ ٢٣١)

[2] سبل السلام (١/ ١٧)

[3] تهذيب معالم السنن (١/ ١٢٠)

نجس چیز گر جائے۔ ایسے پانی کے بارے میں امام ابن قدامہ اپنی فقہ مقارن کی معروف کتاب ''المغني'' میں لکھتے ہیں کہ ایسا پانی پاک ہی رہتا ہے اور اس کے نجس و ناپاک ہونے کے بارے میں کوئی نص یا اجماع ہمارے علم میں نہیں، لہٰذا وہ اپنی اصل طہارت (طاہر و مطہّر ہونے) پر ہی باقی ہے اور وہ (مذکورہ بالا) نبیِ کریم ﷺ کے ارشاد:

«اَلْمَاءُ طَهُوْرٌ لَا يُنَجِّسُهُ شَيْئٌ»

''پانی پاک ہے (طاہر و مطہّر ہے) اسے کوئی چیز نجس اور ناپاک نہیں کر سکتی۔''

اور دوسری روایت:

«اَلْمَاءُ طَهُوْرٌ لَا يُنَجِّسُهُ شَيْئٌ اِلَّا مَا غَلَبَ عَلٰى رِيْحِهٖ وَطَعْمِهٖ وَلَوْنِهٖ»

''پانی پاک ہے، اس کو کوئی چیز نجس نہیں کر سکتی، مگر جو اس کی بو، ذائقے اور رنگ پر غالب آ جائے۔''

کے تحت ہی آ جاتا ہے۔ شوافع اور حنابلہ وغیرہ جو پانی کا دو مٹکوں یا اس سے زیادہ ہونا اس کے طاہر و مطہّر رہنے کے لیے شرط قرار دیتے ہیں، ان کی طرف سے اشکال وارد کر کے اس کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قلتین یا دو مٹکوں والی حدیث بھی ایسے پانی کے پاک ہونے ہی کی دلیل ہے، کیوں کہ بہتے ہوئے پانی کی مجموعی مقدار تو بہر حال دو مٹکوں سے زیادہ ہی ہو جاتی ہے اور پھر دو مٹکوں والی شرط کو بہتے ہوئے پانی پر نافذ کرنا، ایک قسم کا تحکم اور سینہ زوری ہے، جس کی کوئی دلیل نہیں ہے، کیوں کہ دو مٹکوں والی حدیث ٹھہرے ہوئے پانی کے بارے میں وارد ہوئی ہے اور چلتے پانی کو اسی پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔[1]

یہاں بھی بہتے ہوئے پانی سے گندے نالے وغیرہ ہرگز مراد نہ لیے جائیں، جیسا کہ شہروں کے قریب والے تالاب مراد نہیں لیے تھے، کیوں کہ ان بہنے والے نالوں میں پانی ہی ایسا جمع ہوتا ہے، جو نجس ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کے نجس اور ناپاک ہونے میں تو کسی کو کلام نہیں۔

گھی کا حکم:

پانی میں نجاست گرنے سے جو صورتِ حال بنتی ہے، تقریباً یہی معاملہ گھی کا بھی ہے، جب وہ

[1] المغني. تحقيق التركي (١/ ٤٧۔ ٤٨)

جامد نہیں، بلکہ سیال مائع ہو اور اس میں کوئی چوہا وغیرہ گر کر مر جائے تو اس گھی کا حکم بھی اس پانی ہی کا ہے، جس میں کوئی نجاست واقع ہو جائے۔ اس کی تفصیل فتاویٰ ابن تیمیہ (۲۱/ ۴۸۸ تا ۴۹۸) میں دیکھی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر وہ گھی سیال نہیں بلکہ جامد ہے اور اس جمے ہوئے گھی والے برتن میں چوہا گر جائے تو اس کے بارے میں تو حکم واضح تر ہے۔ خود نبیِ اکرم ﷺ کا فیصلہ "صحيح البخاري، كتاب الوضوء، باب ما يقع من النجاسات في السمن و الماء" اسی طرح "كتاب الذبائح والصيد، باب إذا وقعت الفأرة في السّمن الجامد أو الذائب" نیز بخاری شریف کے علاوہ سنن ابی داود، ترمذی، نسائی، سنن دارمی، دارقطنی اور مسند احمد میں مذکور ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ سے ایسے گھی کا حکم دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَلْقُوْهَا وَمَا حَوْلَهَا فَاطْرَحُوْهُ وَكُلُوْا سَمْنَكُمْ»[1]

''اسے نکال کر پھینک دو اور جس جگہ گر کر اس کی موت واقع ہوئی ہے، اس کے آس پاس والا گھی بھی نکال کر پھینک دو اور اپنا باقی گھی کھالو۔'' یعنی وہ پاک ہے، ناپاک نہیں ہوا۔

امام بخاری کی تبویب سے تو بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ جمے ہوئے اور سیال گھی میں کوئی فرق نہیں، کیوں کہ انھوں نے "السمن الجامد أو الذائب" کے تحت بھی یہی حدیث ذکر کی ہے۔[2] جب کہ جامد جمے ہوئے اور ذائب سیال کو کہا جاتا ہے۔ البتہ اس مسئلے میں اختلاف کے قوی ہونے کی وجہ سے انھوں نے پختہ حکم نہیں لگایا ہے۔

اب رہی وہ حدیث جس میں جمے ہوئے اور سائل گھی میں فرق کیا گیا ہے، وہ سنن ابی داود اور مسند احمد میں مروی ہے، اس روایت کو امام بخاری رحمہ اللہ نے خطا قرار دیا ہے اور ابو حاتم نے اسے وہم شمار کیا ہے، جبکہ امام ترمذی نے سیال و جامد کے ذکر والی اس روایت کو غیر محفوظ اور شاذ کہا ہے۔[3]

جامد اور سیال میں فرق کرنے والی روایت صرف ایک راوی معمر نے بیان کی ہے اور امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے قولِ معمر کو متروک قرار دیا ہے۔ البتہ بعض ائمہ وفقہا نے جامد اور سیال میں فرق بھی

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٢٤٣) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٥٤) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٦٩) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٩٧١) المغني (١/ ٥٣)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٩/ ٦٦٧)

[3] فتح الباري (١/ ٣٤٤) سنن الترمذي مع تحفة الأحوذي (٥/ ٥١٧) طبع مدني.

کیا ہے، جس کی تفصیل فتح الباری شرح صحیح بخاری، تحفۃ الاحوذی شرح جامع ترمذی، المغنی لابن قدامہ، فتاویٰ ابن تیمیہ اور دیگر شروحِ حدیث وکتبِ فقہ میں دیکھی جا سکتی ہے، جہاں ایسی صورت میں سیال کو نجس اور جامد کو طاہر کہا گیا ہے۔

قلّتین کی مقدار:

غیر مطلق پانی کی چوتھی اور آخری قسم یعنی جھوٹے پانی کے حکم کی تفصیلات میں جانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دو قلوں یا اس سے زیادہ میں نجاست گرنے سے اس کے نجس نہ ہونے کا مسلک رکھنے والوں کے ان دو قلوں یا مٹکوں میں سمانے والے پانی کی مقدار کی بھی وضاحت بیان کر دی جائے۔ اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ مٹکوں سے کون سے مٹکے مراد ہیں؟ اس کی تعیین ایک روایت میں بھی وارد ہوئی ہے، جسے امام خطابی رحمہ اللہ نے "معالم السنن شرح أبي داود" (مختصر السنن للمنذري) میں اور امام زیلعی نے "نصب الراية في تخريج أحاديث الهداية" (۱/ ۱۱۵۔ ۱۱۲) میں ذکر کیا ہے، جس میں ابن جریج سے مرسلا مروی ہے:

«اِذَا كَانَ الْمَآءُ قُلَّتَيْنِ بِقِلَالِ هَجَر»

"جب بستی ہجر کے مٹکوں جتنے دو مٹکوں کی مقدار میں پانی ہو۔"

مگر یہ روایت ایک تو مرسل ہے کہ جریج تابعی ہیں نہ کہ صحابی، اور وہ کسی صحابی کا ذکر کیے بغیر یہ روایت نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں۔[1] پھر "الكامل لابن عدي" میں یہ روایت مرفوعاً مروی ہے، جس کے منفرد راوی مغیرہ بن قلاب ہیں، جو محدّثین کے نزدیک منکر الحدیث تھے۔ اور نفیلی نے کہا ہے کہ وہ بیانِ حدیث میں امانت دار نہ تھے اور ابن عدی نے کہا ہے کہ ان کی بیان کردہ اکثر احادیث کی متابعت نہیں کی جاتی۔[2]

تاہم شافعیہ نے ہجر کے مٹکوں سے مقدار کی تعیین کو اختیار کیا ہے، کیوں کہ اہلِ عرب اپنے اَشعار میں ہجر کے مٹکوں کا بکثرت ذکر کرتے آئے ہیں، جیسا کہ ابو عبید نے "كتاب الطهور" میں ذکر کیا ہے اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہجر کے مٹکے ان کے یہاں مشہور و معروف تھے۔ یہی وجہ

[1] المغني (۱/ ۳۷)

[2] نیل الأوطار (۱/ ۳۱)

ہے کہ واقعۂ معراج کے ضمن میں نبیِ اکرم ﷺ نے سدرۃ المنتہی نامی بیری کے بیروں کا حجم ہجر کے مٹکوں جیسا بتایا ہے اور امام خطابی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ ہجر بستی کے مٹکے مشہور صنعت اور مقدار کے لحاظ معلوم و معروف تھے۔[1]

ہجر کے مٹکے میں کتنا پانی سماتا ہے؟ اس کی وضاحت ابن جریج ہی سے ملتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے ہجر کے مٹکے دیکھے ہیں، جن میں سے ایک میں دو اور دو سے کچھ زیادہ مشکیزوں کا پانی آتا ہے اور احتیاطاً ڈھائی مشکیزے کہنا چاہیے۔ جوزجانی نے یحییٰ بن عقیل کا قول نقل کیا ہے کہ میں نے ہجر کے مٹکے دیکھے ہیں، جو دو مشکیزوں کے برابر ہوتے ہیں۔ اثرم، اسماعیل بن سعید اور ابن منذر نے امام احمد سے نقل کیا ہے کہ ایک مٹکا چار مشکیزے کے برابر ہوتا ہے، ان میں سے اوسط درجے کا مٹکا ڈھائی مشکیزے ہے اور دو مٹکوں کا پانی پانچ مشکیزے بن جائے گا۔

اب یہ باری آجاتی ہے کہ مشکیزے میں کتنا پانی ہوگا؟

اس سلسلے میں فقہا نے لکھا ہے کہ ایک مشکیزے میں سو (۱۰۰) عراقی رطل پانی ہوتا ہے، تو پانچ مشکیزوں میں پانچ سو عراقی رطل پانی ہوا۔ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ کے بقول ایک مشکیزے کے اس وزن کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور حجازی مشکیزوں کا وزن بھی عراقی مشکیزوں کے برابر ہوتا ہے، اسی طرح عراقی اور حجازی ہر دو میں جو مجموعی مقدار سامنے آئی، وہ پانچ سو رطل ہے۔[2]

موجودہ پیمانہ وزن پونڈ کو رطل کہا جا رہا ہے، جو آدھے کلو سے تھوڑا سا زیادہ ہوتا ہے تو گویا پانچ سو رطل تقریباً پانچ سو پونڈ کے برابر ہوتا ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اس مسلک والوں کے نزدیک اگر پانچ سو پونڈ یا تقریباً و احتیاطاً پونے تین سو کلو یا پونے سات من پانی یا اس سے زیادہ ہو تو نجاست گرنے سے بھی نجس نہیں ہوتا اور اس سے کم ہو تو وہ نجس ہو جاتا ہے۔

[1] المنتقى (١/ ٣٨) والنيل أيضاً.

[2] المغني (١/ ٣٦)

جھوٹا پانی

پانی کی مختلف اقسام میں سے ایک قِسم جُھوٹا پانی ہے، یعنی وہ پانی جو پینے کے بعد برتن میں بچ جائے۔ پانی کے کسی برتن، تالاب یا حوض سے کوئی انسان، حیوان یا درندہ پانی پی لے اور کچھ باقی بھی بچ جائے تو اس بچے ہوئے پانی کو ''جھوٹا پانی'' کہا جاتا ہے۔ جسے عربی میں ''سؤر'' کہا جاتا ہے، اس کی تعریف یہ ہے:

''مَا بَقِيَ فِي الْإِنَاءِ بَعْدَ الشُّرْبِ''[1]

''پینے کے بعد جو برتن میں بچ جائے وہ جھوٹا ہوتا ہے۔''

جھوٹے پانی کی اقسام:

ایسا پانی، اس کے پینے والوں کے الگ الگ ہونے کی وجہ سے کئی نوعیّتوں کا ہوتا ہے اور اُن میں سے ہر کسی کا حکم معلوم کرنے کے لیے ہمیں ''جھوٹے'' کی الگ الگ نوعیتیں یا قسمیں بھی معلوم کرنا ہوں گی۔ مثلاً انسان کا جوٹھا، پھر ان میں سے بھی مسلمان کا جھوٹا اور کافر ومشرک کا جھوٹا، حیوان کا جھوٹا، پھر ان میں سے ایسے جانوروں کا جھوٹا جن کا گوشت کھایا جاتا ہے اور جن کا گوشت نہیں کھایا جاتا اور جو درندے ہیں اور جو محض جانور تو ہیں مگر درندے نہیں۔

① مسلمان کا جھوٹا:

مسلمان مرد ہو یا عورت، بچہ ہو یا جوان اور مرد چاہے جُنبی ہو اور اسے غسل کی حاجت ہو یا وہ طاہر ہو، اسی طرح عورت چاہے طہارت سے ہو یا جنابت سے، یا اپنے مخصوص فطری عُذر یعنی ایامِ حیض ونفاس میں ہو، ہر شکل میں ان کا جھوٹا پاک اور طاہر ومطہر ہے۔

اس بات کی دلیل وہ حدیث شریف ہے، جو صحیح بخاری ومسلم، سننِ اربعہ اور دیگر کتبِ حدیث

---

[1] فقه السنة (١/ ٢٠)

میں مذکور ہے، جس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَقِيَهُ فِي بَعْضِ طُرُقِ الْمَدِيْنَةِ، وَهُوَ جُنُبٌ فَانْخَنَسَ مِنْهُ فَذَهَبَ فَاغْتَسَلَ ثُمَّ جَاءَهُ فَقَالَ لَهُ: أَيْنَ كُنْتَ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ؟ (فَقَالَ:) كُنْتُ جُنُباً فَكَرِهْتُ أَنْ أُجَالِسَكَ، وَأَنَا عَلَى غَيْرِ طَهَارَةٍ، فَقَالَ ﷺ: سُبْحَانَ اللّٰهِ! إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا يَنْجُسُ» [1]

''نبی ﷺ ان سے مدینہ طیبہ کے ایک راستے میں ملے، جب کہ وہ (ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ) جنابت کی حالت میں تھے، لہٰذا وہ آپ ﷺ سے نظر بچا کر کسی طرف نکل گئے اور غسل کیا، پھر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوگئے۔ آپ ﷺ نے ان سے مخاطب ہوکر فرمایا: اے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ! تم کہاں تھے؟ تو انھوں نے جواب دیا: میں جنابت کی حالت میں تھا اور مجھے یہ بات اچھی نہ لگی کہ میں غیر طاہر ہونے کی حالت میں آپ ﷺ کے ساتھ مجلس کروں تو نبیِ مکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''سبحان اللہ! مومن (کبھی) نجس اور ناپاک نہیں ہوتا۔''

بالکل اسی طرح کا دوسرا واقعہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کو پیش آیا، جو صحیح مسلم، سنن ابو داود نسائی، ابن ماجہ اور دیگر کتبِ حدیث میں مروی ہے۔ اس واقعے میں نبیِ اکرم ﷺ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہوکر فرمایا:

«إِنَّ الْمُسْلِمَ لَا يَنْجُسُ» [2] ''مسلمان نجس اور ناپاک نہیں ہوتا۔''

ان دونوں احادیث میں مذکور دو صحابہ رضی اللہ عنہما کے الگ الگ واقعات سے معلوم ہوا کہ مومن نجس نہیں ہوتا، چاہے وہ جنابت کی حالت ہی میں کیوں نہ ہو اور وہ مَرد ہو یا عورت، اس میں بھی کوئی فرق نہیں، کیوں کہ مومن و مسلم ہونے کے اعتبار سے مَرد و زن اور پیر وجوان سب برابر ہیں، ان کا جُھوٹا بالاتفاق پاک

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٤/ ٦٦۔ ٦٧) صحيح البخاري مع فتح الباري (١/ ٤٦٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٣٤) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث ٢١٢) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٥) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٢٦٠)

[2] النيل مع المنتقىٰ (١/ ٢٠) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٦٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٣٥) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١١) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٢٥٨، ٢٥٩)

ہے اور جو ارشادِ نبوی ﷺ کے مطابق خود نجس نہیں ہوتا، اس کا جُھوٹا کیسے نجس ہوگا؟ یہ بڑی عام فہم سی بات ہے۔

ان واقعات سے مومن و مسلم کے جھُوٹے کے ناپاک نہ ہونے کے علاوہ بندۂ مومن و مسلم کے لیے عبرت و بصیرت کا سامان اور باہم بعض آداب بھی بیان ہوئے ہیں، مثلاً یہ کہ کسی عظیم الشان کام سے دوچار ہونا ہوتو اس سے پہلے طہارت وغسل کر لینا مشروع ہے۔

دُوسرے یہ کہ اہلِ علم وفضل اور مربی ومعلّم کا احترام واکرام اور عزت وتوقیر کرنی چاہیے اور ان کی مجلس وصحبت میں بیٹھنے کے لیے عمدہ واعلیٰ حالت اور کامل ومکمل طہارت سے ہوں تو یہ عین قرینِ ادب ہے، جیسا کہ حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابو حذیفہ رضی اللہ عنہما کے فعل میں پائے جانے والے کمالِ ادب سے پتا چلتا ہے اور المجد ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے تو ان واقعات سے یہ بھی استدلال کیا ہے کہ جب مومن ومسلم نجس نہیں ہوتا، تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے چُھو جانے سے پانی یعنی ''مستعمل پانی'' نجس ہو جائے؟[1]

حیض و نفاس، جو عورت کے فِطری عذر ہیں، ان کے دَوران بھی اس کا جُھوٹا پاک ہی ہوتا ہے، نجس وناپاک نہیں ہوتا، اس کی دلیل صحیح مسلم، سنن ابی داد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی اور مسند احمد میں مذکور وہ حدیث ہے، جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« كُنْتُ أَشْرَبُ وَأَنَا حَائِضٌ فَأُنَاوِلُهُ النَّبِيَّ ﷺ فَيَضَعُ فَاهُ عَلَىٰ مَوْضِعِ فِيَّ »[2]

''میں ایامِ حیض کے دَوران میں کسی برتن سے پانی پیتی، پھر میں وہی برتن نبیِ اکرم ﷺ کو پکڑا دیتی، تو آپ ﷺ اس برتن سے پانی پیتے ہوئے عین اسی جگہ سے مُنہ لگا کر پیتے جہاں مُنہ لگا کر میں نے پیا ہوتا۔''

جب کہ مذکورہ کتب ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے یہ الفاظ بھی منقول ہیں:

« كُنْتُ أَتَعَرَّقُ الْعَرَقَ، فَيَضَعُ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فَاهُ حَيْثُ وَضَعْتُ وَأَنَا حَائِضٌ »[3]

---

[1] المنتقىٰ للمجد ابن تيمية مع النيل (١/ ٢١۔ ٢٢)

[2] صحيح مسلم (١/ ٣/ ٢١٠۔ ٢١١) صحيح سنن أبي داود ، رقم الحديث (٢٣٢) صحيح النسائي، رقم الحديث (٢٦٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٤٣) المغني لابن قدامة (١/ ٦٩) فقه السنة (١/ ٢١)

[3] صحيح مسلم مع شرح النووي (١/ ٢١٠۔ ٢١١) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٣٢) سنن النسائي (١/ ١٢ و ١/ ٣٣)

”میں گوشت کی ہڈی چُوستی، پھر اسے آپ ﷺ لے لیتے اور میرے مُنہ رکھنے والی جگہ پر مُنہ رکھ کر ہی اُسے چُوستے تھے اور میں حیض کی حالت میں ہوتی تھی۔“

سُبحان اللہ! یہ تھی مثالی معاشرت، بلکہ حسنِ معاشرت!!

ایک جاہلانہ عادت:

اس حدیث سے فطری عذر میں مبتلا عورت کے جُھوٹے پانی کے پاک ہونے کا حکم واضح ہوگیا۔ یہیں پر ہم آپ کی توجہ ایک اور بات کی طرف مبذول کروانا چاہتے ہیں، جس سے بہت سے لوگ اور خصوصاً اَن پڑھ اور کم پڑھا لکھا طبقہ دوچار ہے اور وہ یہ کہ کچھ لوگ بیوی کے جُھوٹے پانی کو پینے یا کسی جُھوٹی چیز کو کھانے سے کچھ اس طرح کا پرہیز کرتے اور دُوسروں کو پرہیز کرنے کا مشورہ دیتے ہیں کہ جیسے یہ بیوی نہ ہو، کوئی نجس چیز یا ہندوانہ ذہن کے مطابق اچھوت قوم کی کوئی فرد ہو۔ یہ صرف ایامِ حیض کے دَوران ہی میں نہیں، بلکہ عام حالات میں بھی ہوتا ہے اور اس کے دلائل مہیّا کرنے کے لیے عقلی گھوڑے دوڑاتے ہیں اور کہتے ہیں:

”اس طرح آدمی زن مرید ہوجاتا ہے اور عورت کا جُھوٹا میٹھا کھانے سے اس میں یہ اور وہ عیب آجاتا ہے۔ نہ معلوم کیا سے کیا آفت ٹوٹ پڑتی ہے۔“

مذکورہ واقعہ آپ کے سامنے ہے۔ ایک زوجہ محترمہ جو حالتِ حیض میں ہیں۔ ان کا جُھوٹا پانی اور گوشت ہے۔ سرورِ کونین ﷺ نہ صرف یہ کہ اسی برتن میں پیتے ہیں، بلکہ عین اس جگہ مُنہ رکھ کر پیتے ہیں، جہاں زوجہ محترمہ نے منہ رکھ کر پیا تھا اور گوشت کی ہڈی بھی اسی جگہ سے چُوستے ہیں، جہاں سے زوجہ محترمہ نے چوسی تھی۔

یہ آپ ﷺ کا اپنی ازواجِ مطہرات سے مشفقانہ سلوک اور ان سے اظہارِ محبت و راَفت تھا، جو امت کے لیے چراغِ راہ اور سنت ہے، مگر آج آپ ﷺ کا امتی ہونے کا دعوے دار اپنے بھائیوں اور دوست واحباب کو عورت کا جُھوٹا میٹھا کھانے سے ”کُلّی پرہیز“ کا مشورہ دیتے ہوئے نظر آتا ہے۔ ایسے لوگوں میں دراصل عہدِ جاہلیت کی ذہنیت کا پَرتَو اور ان کے خیالات میں وہی جاہلانہ نظریات سمائے ہُوئے ہیں۔

عہدِ جاہلیت میں لوگوں کا عورت ذات اور بیویوں سے اور خاص ایامِ ماہواری اور فطری حالتِ عذر میں ان سے جو رویہ ہوا کرتا تھا اور کتبِ تاریخ کے ابواب ماقبل الاسلام میں اس کی جو ذہنی کوفت اور روحانی اذیت والی تفصیلات ملتی ہیں، ان کے احاطے کا تو یہاں موقع نہیں۔ البتہ اتنا ضرور کہیں گے کہ صاحبو! دائرہ اسلام میں ہوتے ہوئے بھی اگر اس قسم کی جاہلانہ عادات ورسوم کی پابندی نہ چھوڑی تو پھر کب چھوڑو گے؟ رسول اللہ ﷺ کے اسوہ حسنہ کو اپنانا تو درکنار، دُوسروں کو اس سے روکنے کے یہ مشورے آخر چہ معنیٰ دارد؟

عورت کے ماہانہ فطری عذر والے دنوں میں وہ صرف نماز نہیں پڑھے گی۔ روزہ قضا کرے گی، قرآنِ کریم کو ہاتھ میں نہ لے گی، طوافِ بیت اللہ نہ کرے گی اور اس کے شوہر کو جماع کی ممانعت ہے۔ اس کے علاوہ گھر داری میں وہ کسی قسم کے الگ معاملات کی متقاضی ہرگز نہیں۔ گھر کے سارے کام کاج کرے، شوہر کے ساتھ اُٹھے بیٹھے، اس کی کوئی ممانعت نہیں اور صرف جماع کو چھوڑ کر ہر طرح سے اپنے شوہر کی خدمت کرے، اس میں کوئی حرج نہیں۔

دلائلِ جواز:

کتبِ حدیث میں اس کے جواز کے متعدد دلائل موجود ہیں، مثلاً:

1. صحیح بخاری ومسلم، سنن نسائی و دارمی اور مسندِ احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مَروی ہے:

« كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يُومِئُ (وَفِي رِوَايَةٍ لِلنَّسَائِيِّ: يُخْرِجُ) إِلَيَّ رَأْسَهُ، وَهُوَ مُعْتَكِفٌ وَأَنَا حَائِضٌ »[1]

''نبی اکرم ﷺ اعتکاف کی حالت میں اپنا سرِ اقدس مسجد سے میری طرف (حجرے میں) بڑھا دیتے تھے، جب کہ میں حیض سے ہوتی تھی۔''

« فَأَغْسِلُهُ وَأَنَا حَائِضٌ »[2]

''میں آپ ﷺ کے سرِ اقدس کو دھو دیتی تھی، حالانکہ میں حیض کی حالت میں ہوتی تھی۔''

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٢٩٦) صحيح مسلم مع شرح النووي (١/ ٣/ ٢٠٩) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٢٦٥، ٢٦٦)

[2] حواله جات سابقه.

2 اسی طرح صحیح مسلم، سنن ابی داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی اور مسندِ احمد میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے ہی مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم فرمایا:

«نَاوِلِيْنِي الْخُمْرَةَ مِنَ الْمَسْجِدِ، قُلْتُ: إِنِّيْ حَائِضٌ... قَالَ: لَيْسَتْ حَيْضَتُكِ فِيْ يَدِكِ»[1]

''مجھے مسجد سے جا نماز پکڑاو، انھوں نے عرض کی کہ میں حیض سے ہوں تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمھارا حیض تمھارے ہاتھ میں نہیں ہے۔''

یہاں یہ بات ذہن میں رکھیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا حُجرہ مسجد سے ملا ہوا تھا اور مسجد کی طرف کھلنے والے دروازے یا کھڑکی سے ہاتھ بڑھا کر یہ جانماز پکڑنا تھا نہ کہ مسجد کے اندر جا کر، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سرِ اقدس دھونے والی حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے۔

3 ایسے ہی سنن نسائی اور دیگر کتبِ حدیث میں ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَضَعُ رَأْسَهٗ فِيْ حِجْرِ إِحْدَانَا فَيَتْلُو الْقُرْآنَ وَهِيَ حَائِضٌ»

''نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہم (ازواجِ مطہرات) میں سے کسی کی گود میں سرِ اقدس رکھ کر قرآن کی تلاوت کیا کرتے تھے، جبکہ وہ زوجہ محترمہ حیض کی حالت میں ہوتی تھیں۔''

اسی حدیث میں آگے یہ بھی مذکور ہے:

«وَتَقُوْمُ إِحْدَانَا بِالْخُمْرَةِ إِلٰى الْمَسْجِدِ فَتَبْسُطُهَا وَهِيَ حَائِضٌ»[2]

''ہم میں سے کوئی عورت جا نماز پکڑ کر مسجد میں بچھا دیتی، حالانکہ وہ حیض سے ہوتی۔''

ظاہر ہے کہ یہ جانماز بچھانا بھی مسجد سے باہر کھڑے ہو کر ہی ہوگا۔

4 سنن نسائی اور دیگر کتبِ حدیث ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ بھی مروی ہے:

«كَانَ رَأْسُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِيْ حِجْرِ إِحْدَانَا وَهِيَ حَائِضٌ وَهُوَ يَتْلُو الْقُرْآنَ»[3]

---

[1] صحيح مسلم (١/ ٣/ ٢٠٩) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٢٦٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٣٤) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٣٢)

[2] سنن النسائي مع التعليقات السلفية از مولانا عطاء الله حنيف بهوجياني (١/ ٣٣ـ ٣٤)

[3] حواله جات سابقه و صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٢٦٤)

''نبیِ اکرم ﷺ ہم میں سے کسی کے حالتِ حیض میں ہونے کے باوجود اس کی گود میں سرِ اقدس رکھ کر تلاوتِ قرآن فرمایا کرتے تھے۔''

5 صحیح بخاری اور سنن نسائی سمیت دیگر کتبِ حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مَروی ہے:

« كُنْتُ أَرَجِّلُ رَأْسَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ وَأَنَا حَائِضٌ »[1]

''میں حالتِ حیض میں نبیِ اکرم ﷺ کے گیسوے مُبارک کنگھے سے سنوار دیا کرتی تھی۔''

6 اس سے بڑھ کر ایک صحیح حدیث میں تو یہاں تک مذکور ہے کہ شوہر اپنی حائضہ بیوی کے ساتھ لیٹ لپٹ سکتا ہے، جیسا کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« بَيْنَمَا أَنَا مُضْطَجِعَةٌ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فِيْ الْخَمِيْلَةِ إِذْ حِضْتُ، فَانْسَلَلْتُ، فَأَخَذْتُ ثِيَابَ حَيْضَتِيْ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: أَنَفِسْتِ؟ قُلْتُ: نَعَمْ، فَدَعَانِيْ فَاضْطَجَعْتُ مَعَهٗ فِيْ الْخَمِيْلَةِ »[2]

''میں نبی ﷺ کے ساتھ ایک چادر میں لیٹی تھی کہ مجھے حیض شروع ہوگیا، میں چپکے سے کِھسک گئی اور حیض والے کپڑے پہن لیے۔ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: کیا تم حائضہ ہوگئی ہو؟ میں نے عرض کی: ہاں، (اس کے باوجود بھی) نبیِ کریم ﷺ نے مجھے اپنے پاس بلایا اور میں آپ ﷺ کے ساتھ اسی چادر میں لیٹ گئی۔''

7 حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

« كُنْتُ أَنَا وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ نَبِيْتُ فِيْ الشِّعَارِ الْوَاحِدِ وَأَنَا طَامِثٌ أَوْ حَائِضٌ... إلخ »[3]

''میں اور نبی ﷺ ایک ہی چادر میں رات گزارتے، جبکہ میں حیض کی حالت میں ہوتی تھی۔''

8 صحیح بخاری و مسلم کی ایک حدیث میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

---

1 حواله سابقه و التجريد الصريح يعنى مختصر صحيح البخاري از علامه زبيدى (١/ ٣٤)

2 مختصر صحيح البخاري للألباني، رقم الحديث (١٦٩)

3 سنن أبي داود، سنن النسائي، سنن الدارمي، مسند أحمد بحواله معجم الحديث (٤/ ٢٦)

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَأْمُرُ إِحْدَانَا إِذَا كَانَتْ حَائِضاً أَنْ تَشُدَّ إِزَارَهَا، ثُمَّ يُبَاشِرُهَا»[1]

''ہم میں سے جب کوئی حیض کی حالت میں ہوتی تو نبی ﷺ اسے چادر باندھنے کا حکم فرماتے اور پھر مباشرت (جسم کے ساتھ ملانا) کرتے۔''

9 ایک حدیث میں ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا (جو عمِ رسول حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی سالی اور ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی خالہ بھی ہیں) بیان فرماتی ہیں:

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُبَاشِرُ الْمَرْأَةَ مِنْ نِّسَائِهِ وَهِيَ حَائِضٌ، إِذَا كَانَ عَلَيْهَا إِزَارٌ يَبْلُغُ أَنْصَافَ الْفَخِذَيْنِ وَالرُّكْبَتَيْنِ (وَفِي حَدِيْثِ اللَّيْثِ): مُحْتَجِزَةً بِهِ»[2]

''نبی ﷺ اپنی بیویوں میں سے کسی کے حائضہ ہونے کی حالت میں بھی مباشرت (جسم کے ساتھ جسم ملانا) فرمالیتے تھے، بشرطیکہ اس نے نصف رانوں یا گھٹنوں تک چادر باندھی ہوئی ہوتی۔''

ان سب احادیث کا مجموعی مفاد اور خلاصہ وہی ہے، جو ہم نے پہلے صرف ایک ہی جملے میں ذکر کر دیا ہے، البتہ اس حالت (حیض) میں جماع کرنا منع اور حرام ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم، سورۃ البقرہ (آیت: ۲۲۲) کی تفسیر اور مسلم و نسائی میں مذکور ہے:

''یہودیوں میں یہ عادت تھی کہ جب بیوی فطری عذر کے ایام میں ہوتی تو وہ اس کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے نہ پیتے، حتیٰ کہ اسے اپنے گھر کے بیڈ روم میں بھی نہ رہنے دیتے تھے۔ (گویا ان ایام میں وہ بیوی سے ٹوٹل بائیکاٹ کر لیتے تھے) اس سلسلے میں نبیِ اکرم ﷺ سے سوال کیا گیا، تو اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ کی آیت (۲۲۲) ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ﴾ نازل فرمادی اور نبیِ اکرم ﷺ نے حکم فرمادیا کہ ان ایام میں اپنی بیویوں کے ساتھ مل کر کھاؤ پیو اور گھروں میں اکٹھے مل کر رہو۔

«... وَأَنْ يَّصْنَعُوْا بِهِنَّ كُلَّ شَيْءٍ مَا خَلَا الْجِمَاعَ»[3]

---

[1] بحوالۂ سابقہ (۱۳) نسائی مع تعلیقات السلفیہ ۳۴/۳۳/۱۔

[2] نسائی مع تعليقات السلفية (۱/ ۳۳۔ ۳۴)

[3] صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (۲۷۷)

”ایک جماع کو چھوڑ کر باقی سب کچھ بیویوں کے ساتھ کر سکتے ہیں۔“

اس فرمانِ رسالت مآب ﷺ پر یہودیوں نے (بھڑک کر) کہا کہ یہ نبی (ﷺ) کوئی معاملہ بھی ایسا نہ چھوڑیں گے، جس میں ہماری مخالفت نہ کریں، تو حضرت اسید بن حضیر اور عباد بن بشر رضی اللہ عنہما نے اس قول کی خبر نبیِ اکرم ﷺ کو پہنچائی اور ساتھ ہی کہنے لگے: کیا ہم ان ایام میں جماع بھی کر لیں؟ تو یہ سُن کر نبیِ اکرم ﷺ کا چہرہ اقدس (غصّے سے) متغیر ہو گیا۔ راویِ حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم سمجھے کہ آپ ﷺ ان پر سخت ناراض ہوں گے۔ اتنے میں وہ دونوں اُٹھ کر چلے گئے۔ عین اسی وقت کوئی شخص دُودھ کا ہدیہ خدمتِ اقدس میں لایا۔ آپ ﷺ نے کسی شخص کو بھیج کر ان دونوں کو واپس بلوایا اور انھیں دُودھ پلایا، جس سے ان کا یہ خدشہ جاتا رہا اور انھیں معلوم ہو گیا کہ آپ ﷺ ان پر ناراض نہیں ہیں۔[1]

صحاح وسنن کی مذکورہ احادیث اور مسلم و نسائی کی تفسیری حدیث سے ان مخصوص ایام میں عورت کے دائرہ کار اور شوہر کے تعلّقات کی حدُود واضح ہو کر سامنے آ گئی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مُسلمان مرد وزن، وہ چاہے کسی بھی حالت میں ہوں، اُن کے جُھوٹے کھانے اور پانی کے پاک ہونے کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ صرف ایک امام نخعی رحمہ اللہ سے مَروی ہے کہ وہ حائضہ عورت کے جُھوٹے کو ناپاک تو نہیں، البتہ مکروہ سمجھتے تھے۔[2] مگر ان کی یہ رائے جمہور اہلِ علم اور احادیث و آثار کے خلاف ہونے کی وجہ سے لائقِ اعتنا نہیں ہے اور یہی حال جابر بن زید کے قول کا ہے۔ جس میں وہ ایسے پانی سے وضو نہ کرنے کی رائے دیتے ہیں۔ امام ابنِ قدامہ نے ان کی تردید کی ہے۔[3]

② غیر مسلم کا جُھوٹا:

غیر مسلم مَرد وزن کے جُھوٹے کھانے اور پانی کے حکم کے بارے میں تین آرا ہیں:

① امام ابنِ قدامہ رحمہ اللہ کے بقول اکثر ائمہ وفقہا اور عام اہلِ علم کے نزدیک انسان کا جھوٹا پاک ہے۔ وہ مسلم ہو یا کافر، کیوں کہ کافر بہ حیثیتِ انسان اور بنی آدم کے مسلمان جیسا ہی ہے۔[4]

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۳۰۹) بروایت مسلم، سنن النسائي (۱/ ٣٤)

[2] المغني (۱/ ٦٩)

[3] حواله سابقه.

[4] المغني (۱/ ٦٣۔ ٦٩)

④ بعض اہلِ علم غیر مسلم کی ذات کو نجسِ عین اور اس کے جُھوٹے کو بھی نجس ہی قرار دیتے ہیں، جیسا کہ فتح الباری میں حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ اور نیل الاوطار میں امام شوکانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے۔[1]

③ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر ''الجامع الأحکام القرآن'' میں ذکر کیا ہے:

''ہمارے بعض علما کا کہنا ہے کہ عیسائی اور تمام کفّار و مشرکین، دائمی شرابی اور مُردار خور لوگوں کا جھُوٹا مکروہ ہے، لیکن اگر کوئی اُن کے جُھوٹے سے وضو کرلے تو اس پر کوئی مواخذہ بھی نہیں، جب تک کہ اُسے (کسی طرح سے) اس جُھوٹے پانی کے نجس ہونے کا یقین نہ ہو جائے۔''[2]

غیر مسلم کے جُھوٹے کے بارے میں یہ تین آرا ملتی ہیں، جنھیں ہم نے سرِدست اختصار کے ساتھ ذکر کر دیا ہے۔

مخلوط معاشرے:

یہ بات تو آپ کے علم میں ہے کہ ہمیں عرب اور خلیجی ممالک میں ایسا معاشرہ میسر ہے جس کے افراد میں مسلم و غیر مسلم ہر قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ غیر مسلم افراد میں کچھ وہ لوگ ہیں، جنھیں اہلِ کتاب ہونے کا دعویٰ ہے اور وہ اپنے دعوے میں کہاں تک حق بہ جانب ہیں؟ یہ ایک الگ موضوع ہے۔ اہلِ کتاب یا یہود و نصاریٰ یعنی عیسائیوں کے علاوہ بھی مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔ مثلاً ہندو، سِکھ، مرزائی یا قادیانی اور بدھسٹ یا بُدھ مَت وغیرہ ہیں اور دین سے تعلّق نہ رکھنے والے چاہے کسی بھی نظریے کی طرف منسُوب ہوں۔ خالقِ کائنات اور مالکِ ارض و سما کے منکر و ملحد کمیونسٹ ہوں یا اللہ تعالیٰ کی ذات کے تو معترف ہوں، مگر اس کی عبادت کے ساتھ ساتھ غیر اللہ کی پرستش کرنے والے مُشرک ہوں۔ ان سبھی انواع و اقسام کے لوگ جس طرح یہاں مخلوط طَور پر موجود ہیں ایسے ہی دیگر ممالک میں بھی پائے جاتے ہیں۔

مثلاً: پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے، مگر وہاں غیر مسلم بھی موجود ہیں۔ انڈیا ایک غیر مسلم ملک اور سیکولر حکومت ہے، لیکن وہاں کروڑوں مسلمان بھی بَستے ہیں۔ بنگلہ دیش، نیپال، بَرما اور ایران میں

---

[1] فتح الباري (١/ ٣٩٠) نيل الأوطار (١/ ٢٠)

[2] تفسير القرطبي (٧/ ٤٤) طبع مصر.

بھی مخلوط معاشرہ ہے۔ خلیجی و مشرقی ممالک کی طرح مغربی و یورپی ممالک اورامریکہ وکینیڈا میں رہنے والے لوگوں کو بھی اسی صورتِ حال کا سامنا ہے، کیوں کہ ان علاقوں میں بھی تارکینِ وطن بکثرت موجود ہیں اوران کی اکثریت بھی مسلمانوں ہی پر مشتمل ہے، کہیں مسلمان غیر مسلم حکومتوں کے زیرِ تسلّط رہ رہے ہیں تو کہیں غیر مسلم اسلامی حکومتوں کے زیرِ سایہ ہیں۔ لہٰذا غیر مسلم لوگوں کے جُھوٹے کھانے اور پانی یا دیگر مشروبات کا مسئلہ بھی نہایت اہم اور عالمگیر قسم کا ہے، اس لیے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع کو بھی قدرے تفصیل کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ دیا جائے۔ تا کہ صحیح صورتِ حال واضح ہو جائے اور بلا وجہ کسی بھی تشدد کا مظاہرہ نہ ہونے پائے۔

اسلامی احکام کی وسعت:

بلا وجہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے ساتھ تنگی کا رویہ اورتشدد کے رجحانات کی اسلام میں مذمت کی گئی ہے، جیسا کہ صحیح مسلم، سنن ابی داود (واللّفظ لہ) اور مسند احمد میں مروی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«أَلَا هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ، أَلَا هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ، أَلَا هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ»[1]

''خبردار! (دین میں) تشدد برپا کرنے والے ہلاک ہوگئے۔ خبردار! تشدد برپا کرنے والے ہلاک ہوگئے۔ خبردار! تشدد برپا کرنے والے ہلاک ہوگئے۔''

اس کا مفہوم یہ ہوا کہ دینِ اسلام بڑا فراخ اور کشادہ دین ہے۔ اس کی تعلیمات میں فطرت کی رعایت رکھی گئی ہے اورتشدد سے اس کے احکام خالی ہیں۔ اس مفہوم کی تائید ایک ضعیف روایت سے بھی ہوتی ہے، جو طبقات ابن سعد اور تاریخ بغداد میں مروی ہے:

«بُعِثْتُ بِالْحَنِيْفِيَّةِ السَّمْحَةِ»[2]

''میں وہ دین دے کر مبعوث کیا گیا ہوں، جو یکسوئی (توحید) اورفراخی والا ہے۔''

یہاں بھی دینِ اسلام کو حنیف اور فراخ ہی قرار دیا گیا ہے، مگر یہ روایت ضعیف ہے۔ البتہ اس سے قدرے اچھی سَند والی وہ روایت ہے، جس میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ

---

[1] صحيح الجامع الصغير للألباني (٣/ ٦/ ٨٩) غاية المرام في تخريج كتاب الحلال والحرام للقرضاوي علامه الباني (ص: ٢٠)

[2] ضعيف الجامع الصغير (٢/ ٣/ ١٠)

سے پوچھا گیا:

«أَيُّ الْأَدْيَانِ أَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ؟» ''اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ کون سا دین پسند ہے؟''

تو آپ ﷺ نے جواباً فرمایا:

«اَلْحَنِيفِيَّةُ السَّمْحَةُ» ''وہ دین جو حنیفیت و یکسوئی اور فراخی و وسعت والا ہے۔''

اس سے آپ ﷺ کا اشارہ دینِ اسلام اور اس کی وسعت والی تعلیمات کی طرف ہی تھا۔

یہ روایت بخاری شریف میں تعلیقاً، الادب المفرد اور مسند احمد (والزهد لأحمد، ص: ٢٨٩۔٢٩٠ مُرسلًا بسند صحيح) میں موصولاً مَروی ہے۔ فتح الباری میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اس کی سَند کو حسن قرار دیا ہے، مگر اس کی سَند میں ایک راوی محمد بن اسحاق بھی ہیں، جو محدثین کے نزدیک مدلّس معروف ہیں اور اگر وہ کسی حدیث کو صیغۂ تحدیث سے بیان کریں، تو وہ صحیح اور قابلِ قبول ہوتی ہے۔ اگر وہ محض عنعنہ سے بیان کریں تو وہ روایت قابلِ استدلال و حجت نہیں ہوتی اور یہ روایت انھوں نے عن ہی سے بیان کی ہے۔ لہٰذا اسے حَسن کہنے سے بھی بعض محدثین نے تامّل کیا ہے۔[1]

الغرض یہ روایات نہ بھی ہوں، تب بھی صحیح مسلم اور دیگر کتب والی پہلی حدیث ہی سے معلوم ہو رہا ہے کہ ہمارے دینِ اسلام میں تشدد برتنے کو اچھا نہیں سمجھا گیا، بلکہ وُسعت اور فراخی کی تعلیم دی گئی ہے۔

نیز صحیح بخاری، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دیگر کتبِ حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«إِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ، وَلَمْ تُبْعَثُوْا مُعَسِّرِيْنَ»[2]

''تم آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، شدت اور تنگی پیدا کرنے والے نہیں۔''

آپ ﷺ کی عادتِ مُبارکہ تھی کہ جسے بھی کسی مہم پر روانہ فرماتے تو اُسے «يَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا» ''آسانی پَیدا کرو، تنگی میں مبتلا نہ کرو۔'' کی نصیحت کر کے بھیجتے تھے۔

---

[1] غاية المرام (للألباني) في تخريج احاديث الحلال والحرام للقرضاوي (ص: ٢٢٠۔ ٢٢١) و تمام المنة (للألباني) في التعليق على فقه السنة لسيد سابق (ص: ٤٤۔ ٤٥)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٠) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٦) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٦) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٢٨) المنتقى مع النيل (١/ ٤١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٣٥٠)

③ غیر مسلم اہلِ کتاب کا جُھوٹا:

گذشتہ صفحات میں کفار ومشرکین کے جُھوٹے پانی یا کھانے کے بارے میں اہلِ علم کے تین اقوال ذکر کیے جا چکے ہیں، اب آیئے ان تینوں اقوال کے دلائل کا بھی جائزہ لیں۔

پہلا قول:

اس سلسلے میں پہلا قول اکثر ائمہ وفقہا، عام اہلِ علم اور جمہور علما کا ہے کہ کافر کا جُھوٹا پاک ہے اور پھر کافروں میں بھی دو طرح لوگ آتے ہیں۔ ایک وہ غیر مسلم جو اہلِ کتاب ہیں، جن میں یہودیوں اور عیسائیوں کا شمار ہوتا ہے اور دُوسرے وہ (کافر) غیر مسلم جو اہلِ کتاب نہیں ہیں، مثلاً: ہندُو، سِکھ اور بُدھ مت وغیرہ۔ ان میں سے اہلِ کتاب کے جُھوٹے کا پاک ہونا تو قرآن وحدیث دونوں سے ثابت ہے، جبکہ غیر اہلِ کتاب کفار ومشرکین کے جُھوٹے کا پاک ہونا، قول وفعلِ رسول ﷺ اور آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم سورۃ المائدہ (آیت: ۵) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ وَ طَعَامُ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ حِلٌّ لَّکُمْ وَ طَعَامُکُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ اِذَآ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ وَ لَا مُتَّخِذِیْٓ اَخْدَانٍ وَ مَنْ یَّکْفُرْ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَ هُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ﴾

”آج کے دن تمھارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کی گئی ہیں اور اہلِ کتاب کا کھانا تمھارے لیے حلال ہے اور مسلمان عورتوں میں سے پاک دامن عورتیں تمھارے لیے حلال ہیں، جبکہ تم ان کو ان کا حق مہر دے دو۔ بشرطیکہ تم (انھیں نکاح میں لا کر ان کے) محافظ بنو نہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو اور نہ چوری چُھپے آشنائیاں کرنے لگو اور جس کِسی نے ایمان کی روش پر چلنے سے انکار کیا، اس کے تمام اعمال ضائع ہوگئے اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔“

اس آیت سے اہلِ کتاب کے جُھوٹے کے پاک ہونے پر دو طرح سے استدلال کیا گیا ہے۔ لہٰذا

آیئے اس کی تفسیر و ترجمے پر مختصر سی نظر ڈالتے چلیں، جس میں دونوں طرح کے استدلال آ جائیں گے۔

اہلِ کتاب کا کھانا:

1 اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کا کھانا ہمارے لیے اور ہمارا ان کے لیے حلال قرار دیا ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان کھانے پینے میں کوئی جُھوٹ جھاٹ اور چُھوت چھات نہیں۔ ہم ان کے ساتھ کھا سکتے ہیں اور وہ ہمارے ساتھ کھا پی سکتے ہیں۔

اکثر علمائے تفسیر کے نزدیک یہاں کھانے سے مُراد ان کے ذبح کردہ جانور کا گوشت ہے۔ معلوم ہوا کہ یہودی اور عیسائی کا ذبیحہ مسلمان کے لیے بھی کھانا جائز و حلال ہے اور اللہ تعالیٰ کو ان کا طریقۂ ذبح تو معلوم ہی ہے، لہٰذا بعض اہلِ علم کے نزدیک تو ان کا ذبیحہ مطلقاً حلال ہے۔ البتہ حضرت علی، ام المومنین حضرت عائشہ، عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم اور امام طاؤس و حسن بصری رحمہما اللہ کے نزدیک اگر انھوں نے ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام لیا ہو تو اس کا کھانا جائز نہیں، انھوں نے اس بات پر سورت انعام کی آیت (۱۲۱) سے استدلال کیا ہے، جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَ لَا تَأْكُلُوْا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ اِنَّهٗ لَفِسْقٌ﴾

''اور (بہ وقتِ ذبح) جس ذبیحے پر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا گیا ہو، اُسے نہ کھاؤ، کیوں کہ ایسا کرنا فسق ہے۔''

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک ایسا ذبیحہ حرام تو نہیں، البتہ مکروہ ہے، جبکہ دوسرے اکثر علما ان کے ذبیحے کو مطلقاً حلال مانتے ہیں، کیوں کہ امام عطا رحمہ اللہ کے بقول اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ وہ کِس طرح ذبح کرتے اور بہ وقتِ ذبح کیا کہتے اور کس کا نام لیتے ہیں۔ ذبیحے کے علاوہ ان کے دوسرے کھانے مثلاً پھل اور گندم وغیرہ کا کھانا بالاتفاق حلال و جائز ہے، کیوں کہ ان کے تو کِسی مسلم یا غیر مسلم کی ملکیت میں ہونے سے کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔ ان کے تیار کردہ کھانوں کو بھی جائز قرار دیا گیا ہے، کیوں کہ جب ذبیحہ حلال ہے، جس کا عقیدہ و دین سے تعلق ہے تو پھر ان کا تیار کردہ کھانا کیسے حلال نہیں ہوسکتا کہ جس کا عقیدہ و دین اور بسم اللہ پڑھنے یا تکبیر پڑھنے سے کوئی تعلّق ہی نہیں، جب کہ مجوسی یا آتش پرست چونکہ ایک شاذ قول سے قطعِ نظر تمام علما کے مشہور قول کے مطابق اہلِ کتاب

نہیں ہیں، لہٰذا نہ ان کا ذبیحہ حلال ہے اور نہ اُن کی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔[1]

اہلِ کتاب کے ذبیحے اور دیگر کھانوں کے جائز ہونے اور انھیں کھانے کی عام اجازت دینے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ﴿اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ﴾ کا اعادہ فرمایا ہے کہ ''آج تمھارے لیے تمام پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔''

اس سے پتا چلتا ہے کہ اہلِ کتاب اگر طہارت اور پاکیزگی کے ان قوانین کی پابندی نہ کریں، جو شریعت کے نقطۂ نظر سے ضروری ہیں یا پھر ان کے کھانے میں حرام چیزیں شامل ہوں، تو پھر ان کا کھانا ہرگز جائز نہ ہوگا۔ مثلاً: اہلِ کتاب میں سے کسی کے دستر خوان پر کسی حرام جانور کا گوشت ہو، شراب وغیرہ مشروب ہو تو وہ ہرگز حلال نہیں ہوگا۔[2]

اہلِ کتاب عورتوں سے نکاح:

۲ اسی آیت کے دوسرے حصے ''ان (اہلِ کتاب) کی عورتیں بھی تمھارے لیے حلال ہیں۔'' اس سے بھی ان کے جُھوٹے کے پاک ہونے پر استدلال کیا گیا ہے کہ جب ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے تو ان کا جُھوٹا کیسے ناپاک ہوسکتا ہے؟

پھر عام علمائے دین کے نزدیک کسی کے جُھوٹے، اس کے پسینے اور اس کے لعابِ دہن کا حکم ایک ہی ہے اور کسی بھی شوہر کا اپنی بیوی کے پسینے سے پوری طرح بچے رہنا غیر معقول بلکہ ایک محال امر ہے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اور اہلِ علم میں سے کسی نے اہلِ کتاب بیوی کے پسینے کے لگ جانے سے غسل واجب قرار نہیں دیا، بلکہ صرف اسی شکل میں غسل واجب ہے، جس میں مسلمان بیوی سے واجب ہوتا ہے۔ اس طرح بھی اہلِ کتاب غیر مسلم کے جُھوٹے کو پاک قرار دیا گیا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہیں ہم ایک اہم بات کی طرف بھی اشارہ کر دیں کہ اللہ تعالیٰ نے غیر مسلم اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح صرف حلال و جائز قرار دیا ہے، مگر یہ مستحسن و پسندیدہ فعل نہیں ہے، لہٰذا اگر کسی کو کسی وجہ سے اہلِ کتاب عورت سے نکاح کرنا ہی پڑ جائے تو اسے اپنے مذہب و عقیدہ اور خاص طور پر اپنی اولاد کے مذہب و عقیدے کی بھی فکر کر لینی چاہیے کہ کہیں جذبات کے بہاؤ میں

---

[1] مختصراً از تفسیر القرطبي.

[2] اس تفصیل سے غیر مسلم اہلِ کتاب کے ذبیحے، کھانے اور جھوٹے کے پاک ہونے کا طریقۂ استدلال واضح ہوگیا۔

خود بھی بیوی کے عقیدے میں نہ بہہ جائے اور کہیں بچوں کو ایسی غیر اہلِ کتاب بیوی کی تربیت کی وجہ سے اپنے ہاتھوں سے نہ کھو دے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مذکورہ آیت کے آخر میں یہ تنبیہ بھی فرما دی ہے:

﴿وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾
[المائدۃ: ٥]

''جس کسی نے ایمان کی روش پر چلنے سے انکار کر دیا تو اس کے تمام اعمال ضائع ہو گئے اور وہ آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا۔''

ان کلمات سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ کہیں یہودی یا عیسائی ''میم'' کی شادی کی خاطر دولتِ ایمان نہ کھو بیٹھنا اور معروف مترجمِ قرآن حضرت محدث دہلوی رحمہ اللہ کے بقول اہلِ کتاب کو دوسرے کفار سے ان دو حکموں (کھانے اور نکاح) میں مخصوص کیا ہے، جو صرف دنیا کی حد تک ہے۔ آخرت میں دولتِ ایمان واسلام سے تہی دامن ہر کافر کا انجام بربادی ہے۔

یہیں یہ بات بھی ذہن نشیں کر لیں کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب عورتوں سے نکاح کی جو اجازت بخشی ہے اس کے ساتھ ہی چند شرائط بھی لگا دی ہیں کہ وہ محصنات یا محفوظ و پاک دامن ہوں، آوارہ نہ ہوں، ان سے حق مہر ادا کر کے نکاح کرنے میں ان کا محافظ بننا اصل غرض ہو، نہ کہ آزاد شہوت رانی کا ارادہ اور نہ چوری چھپے آشنائیاں کرنے کا قصد ہو۔

ان شرائط کو پورا کرنے والا ان سے نکاح کر سکتا ہے۔ یہ نہیں کہ پہلے آشنائیاں ہوں، خلوتِ محرمہ ہو، حتیٰ کہ جب پانی سر سے گزر جائے اور لڑکی کسی نئی رُوح کی آمد کی خبر دے کر نکاح کرنے کا مطالبہ کرے تو پھر اس آیت کا سہارا لے کر نکاح کا سوانگ رچایا جائے۔ اس آوارہ اور فحش انداز سے مذکورہ شرائط کہاں پُوری ہو سکتی ہیں اور وہ نکاح بھی کیا ہوگا؟ اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ.

سورۃ المائدہ کے بارے میں ابو میسرہ کا قول ہے:

''یہ نزول کے اعتبار سے سب سے آخری سورت ہے اور اس میں مذکورہ احکام میں سے کوئی حکم منسوخ نہیں ہوا۔

البتہ امام شعبی رحمہ اللہ کے نزدیک صرف ﴿وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ وَلَا الْهَدْيَ﴾ اور بعض کے

نزدیک ﴿أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ﴾ منسوخ ہیں اور باقی تمام احکام محکم ہیں۔“[1]

اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ کتاب کے کھانے کا جواز برقرار ہے، منسوخ نہیں ہوا۔ متعدد احادیث اور آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی اہلِ کتاب کے جُھوٹے پانی اور کھانے کو پاک ثابت کیا گیا ہے اور ان کے ہاتھوں کے تیار کردہ کھانے کو بھی جائز و پاک اور حلال قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری اور دیگر کتبِ حدیث و سیرت میں واقعہ مشہور ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی ایک یہودیہ عورت کی طرف سے ہدیہ دی گئی زہریلی بکری کا گوشت کھایا تھا۔[2]

سنن ابو داود اور مسند احمد میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسائی ممالک سے لایا گیا پنیر کھایا۔[3]

مسند احمد میں ایک یہ واقعہ بھی مذکور ہے:

”حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی نے جَو کی روٹی اور بدلی ہوئی ہَوا والا روغنی سالن تیار کرکے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی دعوت قبول فرمائی۔“[4]

سنن دارقطنی میں امیر المومنین حضرت عمرِ فارُوق رضی اللہ عنہ کے بارے میں مذکور ہے کہ انھوں نے ایک عیسائی گھر کے برتن سے وضو کیا، چنانچہ حضرت زید بن اسلم اپنے والد کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ جب ہم شام میں تھے تو میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے لیے پانی لایا، جس سے انھوں نے وضو کیا۔ وضو کر چکے تو پوچھا: یہ پانی کہاں سے لائے ہو؟ میں نے اس سے اچھا اور عمدہ پانی کہیں نہیں دیکھا۔ کہتے ہیں کہ میں نے بتایا کہ میں ایک بوڑھی عیسائی عورت کے گھر سے یہ پانی لایا ہوں، چنانچہ جب وہ وضو سے فارغ ہوئے تو اس بوڑھی عورت کے پاس تشریف لائے اور ان سے مخاطب ہوکر گویا ہوئے:

«أَيَّتُهَا الْعَجُوزُ أَسْلِمِي تَسْلَمِي، بَعَثَ اللّٰهُ مُحَمَّداً صلی اللہ علیہ وسلم بِالْحَقِّ»

”اے بوڑھی عورت! اسلام لے آؤ، سلامتی پاؤ گی، اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔“

اس عورت نے اپنا سر کھولا، جو بڑھاپے سے پوری طرح سفید ہو چکا تھا اور کہنے لگی: میں بہت بوڑھی عمر والی ہوں، اب تو میں مرنے جا رہی ہوں۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

---

[1] تفسير القرطبي (٣/ ٦/ ٣٠۔ ٣١)

[2] صحيح البخاري كتاب الهبة باب قبول الهدية من المشركين.

[3] نيل الأوطار (١/ ٢١)

[4] نيل الأوطار (١/ ٢١)

«أَللّٰهُمَّ اشْهَدْ»[1] ''اے اللہ گواہ رہنا۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک عیسائی عورت کے برتن سے لائے گئے پانی کے ساتھ وضو کا ذکر امام المحدثین حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی کیا ہے۔[2]

غیر اہلِ کتاب کفّار و مُشرکین کا جُھوٹا:

جہاں تک غیر اہلِ کتاب کفّار ومشرکین کے جھوٹے کا تعلق ہے تو اسے بھی جائز قرار دیا گیا ہے، کیوں کہ صحیح بخاری ومسلم سمیت دیگر کتبِ حدیث میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایک مشرک عورت کے مشکیزے سے وضو فرمایا تھا۔[3]

امام قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ کفّار ومشرکین جو اہلِ کتاب نہیں، ان کا پکایا ہوا کھانا کھانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں، بشرطیکہ وہ کھانا گوشت نہ ہو، جسے انھوں نے خود ذبح کیا ہو، کیوں کہ غیر اہلِ کتاب کا ذبیحہ حلال نہیں ہے۔[4]

دوسرے عام کھانے کے پاک اور حلال ہونے پر اکثر علما کا اتفاق ہے، بشرطیکہ وہ کسی حرام چیز پر مشتمل نہ ہو اور جس برتن میں اسے پکایا اور رکھا گیا ہو، وہ بھی ظاہری نجاست سے پاک ہو۔

فقہ حنفی کی معتبر کتب میں بھی کفّار کے جُھوٹے کو پاک قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ فتاویٰ عالمگیری جس کا عربی نام "الفتاویٰ الهندية" ہے اور مصر سے شائع ہوا ہے، اس کی جلد اوّل (ص: ۲۲) میں مذکور ہے:

«سُؤْرُ الْآدَمِيِّ طَاهِرٌ، وَيَدْخُلُ فِيْهِ الْجُنُبُ وَالْحَائِضُ وَالنُّفَسَآءُ وَالْكَافِرُ»

''آدمی کا جُھوٹا پاک ہے اور اِس حکم میں جنبی مَرد و زن، حیض و نفاس والی عورتیں اور کافر سب شامل ہیں۔''

نیز دُرِّ مختار میں ہے:

«فَسُؤْرُ الْآدَمِيِّ مُطْلَقًا، وَلَوْ جُنُباً أَوْ كَافِراً، طَاهِرٌ»[5]

''آدمی کا جھوٹا مطلقاً پاک ہے، چاہے وہ جنبی ہو یا کافر۔''

---

[1] بحواله تفسير القرطبي (٧/ ١٣/ ٤٤)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٢٩٨ تعليقاً)

[3] بلوغ المرام ابن حجر مع السبل (١/ ٧١) نيل الأوطار (١/ ٢١) التجريد الصريح (١/ ٣٧)

[4] تفسير القرطبي (٣/ ٦/ ٧٧۔ ٧٨)

[5] دُرِ مختار علىٰ هامش ردّ المحتار (١/ ١٤٨)

اہلِ کتاب اور غیر اہلِ کتاب کفّار و مُشرکین کے برتنوں کا حکم

(1) پہلا قول اور اس کے دلائل:

اہلِ کتاب اور غیر اہلِ کتاب کفّار و مشرکین کے برتنوں میں کھانا کھا لینے کی بھی شرعاً کوئی ممانعت نہیں۔ کتاب اللہ اور کسی صحیح وصریح حدیثِ رسول ﷺ سے اس کی حرمت ثابت نہیں ہے، بلکہ صحیح بخاری (کتاب الهبة، باب قبول الهدية من المشركين) میں چار احادیث ہیں، جن میں سے ایک میں وہ واقعہ بھی مذکور ہے، جو ہم نے سابقہ سطور میں ذکر کیا ہے کہ آپ ﷺ نے ایک یہودیہ عورت کی پیش کردہ زہر آلود بکری قبول کی اور اسے تناول فرمایا، نیز صحیح بخاری و مسلم میں مذکور ہے کہ نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک مشرکہ عورت کے مشکیزے سے وضو کیا۔

(1) سنن ابو داود اور مسند احمد اور اسی معنیٰ میں مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

« كُنَّا نَغْزُوْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَنُصِيْبُ مِنْ آنِيَةِ الْمُشْرِكِيْنَ وَأَسْقِيَتِهِمْ فَنَسْتَمْتِعُ بِهَا، فَلَا يَعِيْبُ ذٰلِكَ عَلَيْهِمْ »[1]

''ہم نبی ﷺ کی معیت میں غزوات پر نکلا کرتے تھے اور اس دوران میں مشرکین کے کھانے اور پینے کے برتن ہمارے ہاتھ لگتے۔ ہم ان برتنوں کو استعمال میں لاتے اور نبی ﷺ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر کوئی عیب نہیں لگاتے تھے۔''

مسند بزار میں مروی ہے:

« فَنَغْسِلُهَا وَنَأْكُلُ فِيْهَا »[2] ''ہم انھیں دھوتے اور ان میں کھانا کھاتے۔''

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٥١) نيل الأوطار (١/ ٢١)

[2] فتح الباري (٩/ ٦٢٣)

ہاں اگر یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی کافر ومشرک اپنے ہاں خنزیر پکاتا اور شراب پیتا ہے تو ایسے برتنوں کو دھو لینا چاہیے، تب وہ بھی قابلِ استعمال ہو جاتے ہیں۔

2 جیسا کہ صحیح بخاری ومسلم میں حضرت ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی:

«إِنَّا بِأَرْضِ قَوْمٍ أَهْلِ الْكِتَابِ، أَفَنَأْكُلُ فِيْ آنِيَتِهِمْ؟»

''ہم اہلِ کتاب لوگوں کے ملک (یا علاقے) میں رہتے ہیں، کیا ہم اُن کے برتنوں میں کھا سکتے ہیں؟''

اس پر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«إِنْ وَجَدتُّمْ غَيْرَهَا فَلَا تَأْكُلُوْا فِيْهَا، وَإِنْ لَمْ تَجِدُوْا فَاغْسِلُوْهَا وَكُلُوْا فِيْهَا»[1]

''اگر تمھیں دوسرے برتن ملیں تو پھر ان کے برتنوں میں نہ کھاؤ اور اگر دُوسرے نہ ملیں تو انھیں دھولو اور اُن ہی میں کھالو۔''

3 سنن ابی داود اور مسند احمد میں ہے:

«إِنَّ أَرْضَنَا أَرْضَ أَهْلِ الْكِتَابِ وَإِنَّهُمْ يَأْكُلُوْنَ لَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَيَشْرَبُوْنَ الْخَمْرَ فَكَيْفَ نَصْنَعُ بِآنِيَتِهِمْ وَقُدُوْرِهِمْ؟»

''ہمارا علاقہ اہلِ کتاب کا علاقہ ہے اور وہ خنزیر کھاتے اور شراب پیتے ہیں۔ ہم ان کے برتنوں اور ہَنڈیوں کا کیا کریں؟''

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«فَإِنْ لَّمْ تَجِدُوْا غَيْرَهَا فَارْحَضُوْهَا بِالْمَاءِ، وَاطْبَخُوْا فِيْهَا وَاشْرَبُوْا»[2]

''اگر تمھیں کوئی دوسرے برتن نہ ملیں تو انھیں پانی سے دھولو اور ان کی ہنڈیوں میں سالن پکاؤ اور برتنوں میں پانی پیو۔''

4 سنن ترمذی میں ہے:

---

[1] التجريد الصريح (١/ ٢/ ١٣٩)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣٥٢) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٦٨)

«سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ قُدُوْرِ الْمَجُوْسِ»

''نبیِ اکرم ﷺ سے آتش پرست مجوسیوں کی ہنڈیوں کے بارے میں پوچھا گیا۔''

تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَنْقُوْهَا غَسْلًا وَاطْبَخُوْا فِيْهَا»[1]

''انھیں دھوکر صاف کرلو اور ان میں اپنا کھانا پکاؤ۔''

5 مسند احمد کا واقعہ بھی اس بات کا ثبوت ہے کہ کفّار کے برتن میں کھانا کھایا جاسکتا ہے۔ کیونکہ خود نبیِ کریم ﷺ نے ایک یہودی کی دعوت قبول کی، جس میں اس نے جَو کی روٹی اور بدلی ہوئی ہوا والا روغنی سالن تیار کیا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ والا واقعہ بھی اس کی دلیل ہے کہ انھوں نے ایک عیسائی عورت کے برتن سے وضو کیا تھا۔

ان تمام واقعات سے غیر مسلموں کے برتنوں کے استعمال کا جواز نکلتا ہے۔ البتہ بعض اہلِ علم نے غیر اہلِ کتاب اور وہ اہلِ کتاب جو خنزیر کھاتے ہیں، ان کے برتنوں کو تو دھوئے بغیر استعمال کرنے سے مطلقاً منع کیا ہے اور جو اہلِ کتاب ایسا نہ کرتے ہوں، ان کے برتنوں کو دھوئے بغیر بھی استعمال کرنے کی اجازت دی ہے، تاکہ دونوں طرح کی احادیث میں مطابقت پیدا ہوجائے۔ بعض علما کے نزدیک مستحب یہ ہے کہ غیر مسلم چاہے کوئی ہو، ان کے برتنوں کو دھو لیا جائے۔ کیونکہ سنن ترمذی، نسائی، مسندِ احمد، مستدرک حاکم اور صحیح ابن حبان میں حضرت حَسن رضی اللہ عنہ سے مَروی ہے کہ میں نے نبیِ اکرم ﷺ سے یہ ارشاد حفظ کیا ہے:

«دَعْ مَا يُرِيْبُكَ إِلٰى مَا لَا يُرِيْبُكَ»[2]

''مشکوک چیز کو چھوڑ کر غیر مشکوک کو اختیار کرلو۔''

فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ مشرکین کے برتنوں میں انھیں دھوئے بغیر کھانا پینا مکروہ ہے، لیکن

---

[1] صحيح البخاري مع فتح الباري (٩/ ٢٢٢۔ ٢٢٣) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٦٧) نيل الأوطار (١/ ٢١)

[2] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٤٥) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٢٦٩) نيل الأوطار (١/ ٢٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٣٧٧)

اگر کوئی کھا پی لیتا ہے تو یہ حرام بھی نہیں ہے اور یہ تب ہے جب برتنوں کی نجاستِ ظاہری کا علم نہ ہو، اگر ان میں نجاست لگی معلوم ہو جائے تو پھر انھیں دھوئے بغیر ان میں کھانا جائز نہیں۔[1]

2 دوسرا قول اور اس کے دلائل:

غیر مسلم کے جُھوٹے کے بارے میں دوسرا قول بعض اہلِ ظاہر کا ہے کہ غیر مسلموں کا جُھوٹا ناپاک اور نجس ہے، حتیٰ کہ وہ خود بھی ناپاک اور نجس ہوتے ہیں۔ اُن کا استدلال ایک قرآنی آیت اور بعض احادیثِ نبویہ ﷺ سے ہے:

1 ان کی پہلی دلیل سورۃ التوبہ کی (آیت: ۲۸) ہے، جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا﴾

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، بلاشبہہ مشرک ناپاک ہیں۔ پس اس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکیں۔''

اس آیت کے ظاہری الفاظ سے مشرکین کے نجس و ناپاک ہونے اور ان کے جھوٹے کے بھی ناپاک ہونے کی دلیل لی گئی ہے۔

2 اس قول والوں کی دوسری دلیل صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں مذکور ایک ارشادِ نبوی ﷺ کا منطوق نہیں، بلکہ مفہوم ہے، جس میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا يَنْجُسُ))[2] ''مومن نجس و ناپاک نہیں ہوتا۔''

دوسری روایت میں ہے:

((إِنَّ الْمُسْلِمَ لَا يَنْجُسُ))[3] ''مسلمان ناپاک اور نجس نہیں ہوتا۔''

کفّار و مشرکین کے جُھوٹے کو ناپاک کہنے والوں نے اس سے یوں دلیل لی ہے کہ نبی ﷺ نے مومن و مسلم کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ کبھی ناپاک و نجس نہیں ہوتا، تو اس کا مفہومِ مخالف یہ ہوا

---

[1] الفتاوی الهندیة المعروف فتاویٰ عالمگیري (٥/ ٣٤٧) طبع مصر.

[2] صحیح البخاري مع فتح الباري (١/ ٤٦٦) صحیح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ٦٥)

[3] صحیح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ٦٥)

کہ مومن و مسلم کو چھوڑ کر تمام غیر مسلم اہلِ کتاب اور دیگر کفّار و مشرکین نجس و ناپاک ہیں اور ان کا جھوٹا بھی نجس و ناپاک ہے۔

3 تیسری دلیل وہ حدیث ہے جو صحیح بخاری و مسلم، سنن ابی داود و ترمذی اور مسند احمد میں مروی ہے، جس میں حضرت ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم اہلِ کتاب کے علاقے میں رہتے ہیں۔ کیا ہم ان کے برتنوں میں کھالیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اگر تمھیں دوسرے برتن ملیں تو ان برتنوں میں نہ کھاؤ اور اگر دوسرے نہ ملیں، تو پھر انھیں دھولو اور انھیں میں کھالو۔'' سنن ابو داود اور مسند احمد کے الفاظ میں یہ بھی مذکور ہے کہ'' وہ خنزیر کھاتے اور شراب پیتے ہیں۔''

اس حدیث سے یوں استدلال کیا جاتا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں نجس اور ناپاک سمجھا، اس لیے ان کے برتن دھو کر استعمال کرنے کا حکم فرمایا، لہٰذا عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ اور حسن بصری رحمہ اللہ انھیں نجسِ عین قرار دیتے تھے۔ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ تو ان کے معاملے میں یہاں تک کہا کرتے تھے:

"مَنْ صَافَحَهُمْ فَلْيَتَوَضَّأْ"[1] ''جو شخص ان سے مصافحہ کرے تو وہ بعد میں وضو کرے۔''

4 ان کی چوتھی دلیل وہ واقعہ ہے کہ جب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو ثقیف کے وفد کو مسجد میں بٹھایا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا تھا:

«قَوْمٌ أَنْجَاسٌ»[2] ''یہ تو نجس لوگ ہیں۔''

تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے اس قول کی تردید نہیں کی تھی، جو اُن کے واقعی نجس ہونے کی دلیل ہے۔

دَورِ حاضر کے معروف عالم اور انجمن خدّام القرآن لاہور پاکستان کے مؤسّس و امیر جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے دورۂ سعودی عرب کے دَوران میں ''الخُبر'' پاکستانی سکول میں قومی و ملّی مسائل پر گفتگو کی رپورٹ ۱۹/ نومبر ۱۹۸۵ء کے نوائے وقت کراچی میں نشر ہوئی اور وہی رپورٹ نوائے وقت کے حوالے سے موصوف نے اپنے پرچہ ماہنامہ ''میثاق'' لاہور کے شمارہ ماہ فروری ۱۹۸۶ء میں

---

[1] تفسير ابن كثير (٢/ ٣٤٦) زاد المسير (٣/ ٤١٧) تفسير القرطبي (٤/ ٨/ ١٠٣)

[2] نيل الأوطار (١/ ٢٠)

شائع کی، جس میں غیر مسلموں کے جُھوٹے کے سلسلے میں اسی ظاہری نقطۂ نظر (کہ غیر مسلموں کا جھوٹا ناپاک اور نجس ہے، اس لیے کہ وہ خود بھی ناپاک و نجس ہوتے ہیں) کو ہی اختیار کیا گیا تھا، جس پر ہمارے ایک فاضل دوست جناب غازی عزیر (مقیم الجبیل، حال جدہ، سعودی عرب) نے تعاقب کیا تو ڈاکٹر صاحب نے اس تنقیدی مضمون کو ''میثاق'' ماہِ ستمبر ۱۹۸۶ء کے شمارے میں شائع کر دیا، جو اُن کی وسعتِ ظرفی اور جذبۂ قبولِ حق کی دلیل ہے اور موصوف کا اپنی سابقہ رائے سے رجوع کا ثبوت بھی۔ جَزَاهُمَا اللّٰهُ خَيْراً وَالْحَقُّ أَحَقُّ أَنْ يُّتَّبَعَ.

ان دلائل کا جائزہ

① پہلی دلیل:

اب آیئے ان چاروں دلائل کا جائزہ لیں، جو بعض اہلِ ظاہر کے ہیں۔ ان کی پہلی دلیل وہ ہے، جو سورۃ التوبہ (آیت: ۲۸) سے لی گئی ہے کہ مشرکین نجس ہیں۔

جائزہ:

اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ یہ بات متفق علیہ نہیں کہ وہ ذات اور جسم و بدن کے لحاظ سے ناپاک اور نجسِ عین ہیں، بلکہ اس آیت میں ان کے عقیدے کی نجاست مُراد لی گئی ہے، جسے اعتقادی ومعنوی نجاست کہا جائے گا، ظاہری وحسّی نہیں، جیسا کہ تفسیر ابنِ کثیر میں ہے:

"أَمَّا نَجَاسَةُ بَدَنِهٖ فَالْجَمْهُوْرُ عَلٰى أَنَّهٗ لَيْسَ بِنَجِسِ الْبَدَنِ وَالذَّاتِ، لِأَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى أَحَلَّ طَعَامَ أَهْلِ الْكِتَابِ"[1]

''مشرک کے بدن کی نجاست کے بارے میں جمہور اہلِ علم کا قول یہ ہے کہ ان کا بدن اور ذات نجس نہیں، کیوں کہ خود اللہ تعالیٰ نے اُن کے کھانے کو حلال قرار دیا ہے۔''

علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ نے "زاد المسیر في علم التفسیر" میں اس سلسلے میں تین اقوال نقل کیے ہیں اور ظاہریہ کے ساتھ ساتھ عمر بن عبدالعزیز اور حسن بصری رحمہ اللہ کے قول کو چھوڑ کر

---

[1] تفسير ابنِ كثير (٢/ ٣٤٦)

دوسرے دونوں اقوال میں انھیں نجسِ عین قرار نہیں دیا گیا۔[1]

”تفسير جلالين (علىٰ هامش المصحف، آية التوبة، آيت: ٢٤)“، میں بھی یہی مذکور ہے کہ مشرکین اپنی باطنی خباثت کے باعث نجس ہیں (ظاہری طور پر نہیں)۔

مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے اس آیت (۲۸) کا ترجمہ یوں فرمایا ہے:

”مشرک لوگ (بوجہ عقائدِ خبیثہ) نِرے ناپاک ہیں۔“

گویا ان کے نزدیک بھی مشرکین کی نجاست اعتقادی ہے، ظاہری نہیں۔

تفہیم القرآن میں لکھا ہے:

”(مشرکین کے) ناپاک ہونے سے مُراد یہ نہیں ہے کہ وُہ خود ناپاک ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اعتقادات، ان کے اخلاق، ان کے اعمال اور ان کے جاہلانہ طریقِ زندگی ناپاک ہیں۔“[2]

ان تفسیری حوالوں کے علاوہ کتبِ فقہ اور شروحِ حدیث کا مطالعہ کریں تو بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نجاست سے اعتقادی نجاست ہی مراد ہے، چنانچہ فتح الباری شرح صحیح بخاری میں لکھا ہے:

”جمہور علما کے نزدیک اس آیت سے مراد یہ ہے کہ مشرکین اپنے عقائد میں نجس ہیں۔ جمہور کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کو مباح قرار دیا ہے اور ایسا مسلمان مرد اپنی کتابیہ بیوی کے پسینے سے نہیں بچ سکتا، مگر کتابیہ کا پسینہ لگنے سے کسی پر غسل واجب نہیں ہوتا، جو ان کے نجسِ عین نہ ہونے کی دلیل ہے۔“[3]

”نيل الأوطار شرح منتقي الأخبار“ میں امام شوکانی رحمہ اللہ نے، ”عون المعبود شرح أبي داود“ میں علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ نے اور ”تحفة الأحوذي شرح سنن الترمذي“ میں علامہ عبدالرحمٰن مُبارک پوری رحمہ اللہ نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے مشرک سے مصافحہ کے بعد وضو کرنے کی رائے کو مشرکین سے ان کے بُعد واحتراز میں ایک مبالغہ آمیز فعل قرار دیا ہے۔[4]

---

[1] زاد المسير امام ابن الجوزي (٣/ ٤١٧) طبع بيروت.

[2] تفهيم القرآن مولانا مودودي (٢/ ١٨٧) طبع اداره ترجمان لاهور وترجمه قرآن مولانا تهانوی، آیتِ مذکوره.

[3] مختصراً از فتح الباري (١/ ٣٩٠)

[4] عون المعبود شرح سنن أبي داود للعلامه شمس الحق عظيم آبادي (١/ ٩٢ و ١/ ٢٨) طبع قديم دهلی وملتان، تحفة الأحوذي شرح سنن الترمذي للعلامه عبدالرحمن مباركپوری طبع قديم (١/ ١١٦) نيل الأوطار (١/ ٢٠)

"الفقه على المذاهب الأربعه" میں علامہ جزیری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس ارشادِ الٰہی:
﴿إِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ﴾ سے مراد ان کی معنوی نجاست ہے، جس کا حکم شارح نے بیان فرما دیا ہے۔ اس سے یہ مُراد ہرگز نہیں کہ ان کی ذات و بدن (خنزیر کی طرح) نجسِ عین ہیں۔[1]

اسی طرح "المنار" میں علامہ مقبلی نے مذکورہ آیت سے کافر کی نجاست پر استدلال کرنے کو وہم قرار دیا ہے۔[2]

اہلِ علم کی ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ظاہریہ کی پہلی دلیل ہی کمزور ہے اور سورۃ التوبہ کی آیت (۲۸) میں مشرکین کی جو نجاست بیان ہوئی ہے، وہ اعتقادی و حکمی نجاست ہے، ظاہری وحسّی یا جسمانی و بدنی نہیں۔

2 دوسری دلیل:

ان کی دوسری دلیل صحاح وسنن میں مذکور اس ارشادِ نبوی ﷺ کے مفہومِ مخالف سے ہے، جس میں مذکور ہے:

«إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَا يَنْجُسُ»[3] "یقیناً مومن نجس نہیں ہوتا۔"

ایک روایت میں ہے:

«إِنَّ الْمُسْلِمَ لَا يَنْجُسُ»[4] "یقیناً مسلمان نجس نہیں ہوتا۔"

ان کے نزدیک آپ ﷺ کا یہ فرمانا کہ مومن نجس نہیں ہوتا، اس بات کا متقاضی ہے کہ غیر مومن اور غیر مسلم نجس ہوتا ہے۔

---

[1] الفقه على المذاهب الأربعة للجزيري (١/ ٦) طبع بيروت.

[2] نيل الأوطار (١/ ٢١) طبع بيروت

[3] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١١۔ ٢١٢) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٥) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٢٥٨، ٢٥٩، ٢٦٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٣٤، ٥٣٥) مسند أحمد (١/ ٢٣٥، ٣٨٤)

[4] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١١۔ ٢١٢) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٥) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٢٥٨، ٢٥٩، ٢٦٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٣٤، ٥٣٥) مسند أحمد (١/ ٢٣٥، ٣٨٤)

جائزہ:

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اکثر علماے اصول کے نزدیک مفہومِ مخالف شرعی حجت و دلیل نہیں بن سکتا اور شروحِ حدیث میں اس کا جواب جمہور اہلِ علم کی طرف سے یہ دیا گیا ہے کہ اس حدیث شریف سے مراد یہ ہے کہ مومن و مسلم نجاست سے احتراز و اجتناب کا عادی ہونے کی وجہ سے طاہر الاعضاء ہوتا ہے، مگر اس کے برعکس مشرک نجاستوں سے اتنا پرہیز نہیں کرتے، جتنا کہ مومن و مسلمان کی شان ہے، لہٰذا وہ اس عدمِ تحفظ کے اعتبار سے ان معنوں میں نجس ہیں اور درحقیقت وہ معنوی و اعتقادی طور پر ہی نجس ہیں، حسّی و جسمانی طور پر نہیں۔ آگے اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح کے جواز کو اپنے اس جواب کی تقویت کے لیے پیش کیا گیا ہے۔

دلیلِ اوّل و دوم یعنی مذکورہ آیت اور مفہومِ حدیث کا جمہور نے یہ جواب بھی دیا ہے کہ یہاں کفّار و مشرکین کے عقائد و اعمال کی وجہ سے ان سے نفرت دلائی گئی ہے اور مجازی طور پر انھیں نجس کہا گیا ہے، اس کے مجاز ہونے کا قرینہ یہ ہے کہ صحیحین میں نبیِ اکرم ﷺ کا مشرک عورت کے مشکیزے سے وضو کرنا، یمامہ کے مشرک سردار ثمامہ بن اثال کو مسجدِ نبوی ﷺ کے ستون سے باندھنا اور خیبر کی یہودیہ عورت کی زہر آلود بکری کا گوشت کھانا ثابت ہے۔

سنن ابی داود اور مسند احمد میں بلادِ نصاریٰ سے لائے گئے پنیر کا کھانا، ایک یہودی کی دعوت پر جَو کی روٹی اور بدلی ہوئی ہوا والا سالن کھانا بھی ثابت ہے اور مسلمان کے لیے کتابیہ سے نکاح مباح ہے، جو ان کے نجسِ عین نہ ہونے، بلکہ انھیں مجازی طور پر نجس کہے جانے کا قرینہ ہیں۔[1]

3 تیسری دلیل:

ان کی تیسری دلیل صحیح بخاری و مسلم، سنن ابی داود و ترمذی اور مسند احمد میں مذکور وہ حدیث ہے، جس میں حضرت ابو ثعلبہ خشنی رضی اللہ عنہ نبیِ کریم ﷺ سے استفسار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم اہلِ کتاب کے علاقے میں رہتے ہیں، کیا ہم ان کے برتنوں میں کھا پی لیں؟ تو نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر تمھیں دوسرے برتن مِل جائیں، تو ان میں نہ کھاؤ پیو اور اگر دوسرے برتن نہ ملیں تو کھا پی لو، مگر انھیں پہلے دھولو۔

---

1 نیل الأوطار (۱/ ۲۱)

اس حدیث سے یہ استدلال کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے ان کے برتنوں میں دھوئے بغیر کھانے سے منع فرمایا تھا، جو ان کے نجس اور ناپاک ہونے کی دلیل ہے۔

جائزہ:

اس کا جواب جمہور نے یہ دیا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے انھیں ان کے برتن دھونے کا حکم اس لیے نہیں دیا تھا کہ یہ اُن کے جُھوٹے ہیں اور وہ نجس ہیں، لہٰذا یہ برتن بھی نجس ہیں، بلکہ آپ ﷺ نے انھیں برتنوں کو دھونے کا حکم اس لیے دیا تھا کہ وہ اپنے برتنوں میں خنزیر کا گوشت کھاتے اور شراب پیتے تھے اور یہ دونوں چیزیں چونکہ حرام ہیں، اس لیے نبیِ مکرم ﷺ نے ان کے برتنوں کو دھونے کا حکم فرمایا تھا، جس کا ثبوت صحیح بخاری، سنن ابی داود و ترمذی اور مسند احمد میں حضرت ثعلبہ رضی اللہ عنہ کے اپنے بیان میں موجود ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

« إِنَّ أَرْضَنَا أَرْضَ أَهْلِ الْكِتَابِ وَإِنَّهُمْ يَأْكُلُونَ لَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَيَشْرَبُونَ الْخَمْرَ فَكَيْفَ نَصْنَعُ بِآنِيَتِهِمْ وَقُدُورِهِمْ؟ »[1]

''ہم اہلِ کتاب کے علاقے میں رہتے ہیں اور وہ خنزیر کا گوشت کھاتے اور شراب پیتے ہیں، ہم ان کے برتنوں اور ہنڈیوں کا کیا کریں؟''

تو نبیِ اکرم ﷺ نے انھیں دھو کر استعمال کرنے کا حکم فرمایا۔ اس طرح بات بالکل واضح ہوگئی کہ یہ دھونے کا حکم ان نجاستوں کی وجہ سے تھا نہ کہ اہلِ کتاب کے جُھوٹے اور ان کے نجس ہونے کی وجہ سے، لہٰذا اس حدیث سے ان کا استدلال درست نہیں۔

اس دلیل کا دوسرا جواب یہ بھی ہے کہ اگر برتنوں کو دھونے کا حکم کفّار اہلِ کتاب کے نجس عین ہونے کی وجہ سے ہوتا تو پھر نبیِ اکرم ﷺ اسے دوسرے برتنوں کی عدم موجودگی کے ساتھ مشروط ہی نہ کرتے، کیوں کہ جو برتن نجس ہو، اس کی نجاست کا ازالہ کر دینے کے بعد اس میں اور دُوسرے غیر نجس برتن میں تو کوئی فرق ہی نہیں رہتا، لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ حکم محض صفائی کے لیے تھا نہ کہ اُن کے نجس ہونے کی وجہ سے۔[2]

---

[1] التجريد الصريح (١/ ٢/ ١٣٩) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٥٢) صحيح سنن الترمذي (١٤٦٨) نيل الأوطار (١/ ٢١)

[2] نيل الأوطار (١/ ٢١)

4 چوتھی دلیل:

نجسِ عین قرار دینے والوں کی چوتھی دلیل وہ واقعہ ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے جب بنو ثقیف کا وفد مسجد میں بٹھایا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ یہ تو نجس لوگ ہیں۔ اس پر نبیِ اکرم ﷺ نے ان کے اس قول کو برقرار رکھا، ان کی تردید نہیں کی تھی۔

جائزہ:

اس سلسلے میں عرض ہے کہ اگر اس واقعے اور اس موقع پر نبیِ مکرم ﷺ کے ارشاد فرمائے ہُوئے الفاظ پر غور کیا جائے تو نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ وہ واقعہ نجس کہنے والوں کی دلیل بننا تو کُجا، وہ تو ان کے خلاف دلیل بنتا ہے اور وہ یوں کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا:

«قَوُمٌ أَنُجَاسٌ» ''یہ نجس قوم کے لوگ ہیں۔''

تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«لَیُسَ عَلَیٰ الْأَرُضِ مِنُ أَنُجَاسِ الْقَوُمِ شَيُءٌ، إِنَّمَا أَنُجَاسُ الْقَوُمِ عَلَیٰ أَنُفُسِهِمُ»

''قوم کی نجاست میں سے زمین پر کوئی چیز واقع نہیں ہو رہی، بلکہ ان کی نجاست ان کے اپنے آپ پر ہی واقع ہو رہی ہے۔''

ان الفاظ پر غور کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ آپ ﷺ نے ان کی نجاست کو ظاہری وحسّی قرار نہیں دیا کہ جو زمین کو متاثر کرے اور صحنِ مسجد کو نجس کرنے کا باعث ہو، بلکہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ان کی نجاست ان کے نفسوں ہی پر ہے، یعنی نجاست ان کے عقائد واعمال کی نجاست ہے، جسے معنوی واعتقادی نجاست کہا جاسکتا ہے، ظاہری وحسّی نہیں۔

3 تیسرا قول:

کفّار ومشرکین کے جُھوٹے کے سلسلے میں تیسرا قول یہ ہے کہ وہ مکروہ ہے اور بظاہر اس کے مکروہ ہونے کی رائے محض اس لیے ہے کہ ان کے جُھوٹے کے پاک اور ناپاک ہونے میں دلائل متعارض ہیں اور اس تعارضِ ادلّہ کے پیشِ نظر بعض اہلِ علم نے اسے حرام کہا نہ حلال بلکہ پاک اور ناپاک کے درمیانی درجے کو اختیار کرتے ہُوئے مکروہ قرار دے دیا ہے۔

نتیجہ:

اس طرح اب تک تینوں اقوال اور ان کے دلائل آپ کے سامنے آ گئے ہیں اور دلائل کی رُو سے تو جمہور کا قولِ اوّل ہی اَولیٰ ہے۔ البتہ یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ کسی چیز کو حلال اور پاک قرار دینے کا یہ معنیٰ بھی نہیں ہوتا کہ کسی کو اس کے کھانے پر مجبور کیا جائے، بلکہ کئی چیزیں ایسی ہیں کہ بالاتفاق پاکیزہ اور حلال ہیں، مگر جب کسی کی طبیعت اسے کھانے پر تیار نہ ہو تو وہ اسے کھانے پر مجبور نہیں ہے اور نہ اسے کھانے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔

گوہ کا گوشت:

اس بات کو اس مثال سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ نبیِ مکرم ﷺ نے ضب یا گوہ کو حرام قرار نہیں دیا، مگر اسے کھایا بھی نہیں اور صاف فرما دیا کہ اسے کھانے پر میری طبیعت تیار نہیں ہوتی، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن اور دیگر کتبِ حدیث میں اس بات کی تفصیل موجود ہے، مثلاً صحیح بخاری شریف میں ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ سے گوہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا آكُلُهُ وَلَا أُحَرِّمُهُ»[1] ''میں اسے نہیں کھاتا اور نہ ہی میں اسے حرام قرار دیتا ہوں۔''

ایسے ہی صحیح بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت خالد بن ولید سیف اللہ رضی اللہ عنہ، امّ المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر گئے جو ان کی خالہ تھیں، نبیِ مکرم ﷺ (اور ان دونوں) کے سامنے گوہ کا بھُونا ہوا گوشت رکھا گیا اور آپ ﷺ کی کسی زوجۂ محترمہ نے بتایا کہ یہ گوہ کا گوشت ہے تو آپ ﷺ نے اپنا دستِ مبارک کھینچ لیا، جو کھانے کے لیے آگے بڑھایا تھا۔ آپ ﷺ سے پُوچھا گیا کہ ''اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا یہ حرام ہے؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا، وَلٰكِنْ لَمْ يَكُنْ بِأَرْضِ قَوْمِي فَأَجِدُنِي أُعَافُهُ»[2]

''نہیں (حرام تو نہیں) لیکن یہ میری قوم کے علاقے (مکے) میں نہیں پائی جاتی، لہٰذا

---

[1] صحيح البخاري مترجم اردو (٣/ ٢٥٩) صحيح مسلم (١٣/ ٩٧) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٦٢) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٠٢٤)

[2] صحيح البخاري مترجم اردُو (٣/ ٢٥٩) صحيح مسلم مع شرح النووي (١٣/ ٩٩۔ ١٠٠) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٢٢) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٢٦٤٠) سنن ابن ماجه (٣٢٤١)

میری طبیعت اسے کھانے پر تیار نہیں ہوتی۔‘‘

حضرت خالد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

’’میں کھانے لگا اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (مجھے کھاتے) دیکھ رہے تھے۔‘‘

یزید بن اصم کی روایت صحیح مسلم میں ہے، جس میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«كُلُوا وَأَطْعِمُوا فَإِنَّهُ حَلَالٌ. أَوْ قَالَ: لَا بَأْسَ بِهِ، وَلٰكِنَّهُ لَيْسَ طَعَامِيْ»[1]

’’کھاؤ اور کھلاؤ، یہ حلال ہے یا پھر فرمایا کہ (اس کے کھانے میں) کوئی حرج نہیں، لیکن یہ میرا کھانا نہیں ہے۔‘‘

بعض روایات کی بنا پر احناف کے نزدیک یہ مکروہ ہے، جب کہ معروف حنفی محدث امام طحاوی رحمہ اللہ نے صحاح وسنن کی مذکورہ عدمِ کراہت بلکہ صریح جواز کے مفہوم والی احادیث و آثار نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

«فَثَبَتَ بِهٰذِهِ الْآثَارِ أَنَّهُ لَا بَأْسَ بِأَكْلِ الضَّبِّ، وَبِهِ أَقُوْلُ»[2]

’’ان احادیث سے ثابت ہوا کہ گوہ کا گوشت کھانے میں کوئی حرج نہیں اور میں اسے ہی اختیار کرتا (اور فتویٰ دیتا) ہوں۔‘‘

بہر حال یہ ایک ضمنی بات تھی، غرض صرف یہ ہے کہ کفّار کا جھوٹا کھانے یا پینے کو جی نہ چاہے تو مجبوری بھی نہیں، مگر دلائل کی رُو سے وہ ممنوع و مکروہ اور حرام بھی ثابت نہیں ہوتا۔

موجودہ حالات میں زیادہ سے زیادہ مکروہِ تنزیہی کہا جاسکتا ہے کہ اس سے بچا جا سکے تو بہتر ہے، کیونکہ وہ ظاہری وحسّی نہ سہی، اعتقادی ومعنوی طور پر تو نجس ہوتے ہی ہیں اور ان میں سے کتنے ہی لوگ خنزیر بھی کھاتے اور اکثر شراب پیتے ہیں تو ان لوگوں کے جھوٹے سے پرہیز ہی اَولیٰ ہے۔[3]

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (١٣/ ٩٨)

[2] فتح الباري (٩/ ٦٦٦) للتفصيل صحيح البخاري و فتح الباري (٩/ ٦٦٢۔ ٦٦٧)

[3] دیکھیں: جدید فقہی مسائل از مولانا خالد سیف اللہ (ص: ٣٦۔ ٣٧) طبع حیدر آباد۔ انڈیا۔ اس بارے میں مولانا عبدالسلام کیلانی کا مضمون اور مولانا غازی عزیر کا تعاقب بھی بہت مفید ہے۔ جسے ماہنامہ محدّث لاہور میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

کفّار و مسلمین کے باہمی تعلقات کی نوعیتیں:

ہمیں سعودی عرب اور دیگر ممالک میں ایسا معاشرہ میسر ہے جس کے افراد میں مسلم و غیر مسلم ہر قِسم کے لوگ پائے جاتے ہیں اور غیر مسلم افراد میں سے اہلِ کتاب یا یہود و نصاریٰ کے علاوہ بھی مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں۔ مثلاً ہندو، سِکھ، مرزائی یا قادیانی، بڈھسٹ یا بُدھ مت اور خالقِ ارض و سما کے مُنکر و ملحد اور اس کی عبادت کے ساتھ ساتھ انبیا و صالحین یا اپنے بزرگوں کی پرستش کرنے والے مشرک۔ ان تمام انواع و اقسام کے لوگوں کے ساتھ مسلمانوں کو کس قسم کے تعلقات رکھنے چاہییں؟ ان تعلّقات کی کیا کیا نوعیتیں ہیں اور ان میں سے کون کون سی نوعیّت کن حدود وقیود کے ساتھ جائز ہے اور کون سی ناجائز؟ جو جائز ہے، وہ کیوں اور جو ناجائز ہے، وہ کس لیے؟

یہ ایک نہایت اہم موضوع ہے جو ہر مسلمان کا مسئلہ ہے اور جس طرح یہاں ہمیں درپیش ہے، ایسے ہی دیگر ممالک حتیٰ کہ ہمارے اپنے ملکوں میں بھی موجود ہے، مثلاً پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے، مگر وہاں غیر مسلم بھی موجود ہیں۔ انڈیا ایک غیر مسلم حکومت ہے، لیکن وہاں کروڑوں کی تعداد میں مسلمان بھی بستے ہیں۔ بنگلہ دیش، نیپال اور بَرما میں بھی مخلوط معاشرہ ہے۔

ہمارے ان عرب مشرقی ممالک کے افرادِ معاشرہ کی طرح ہی یہ مسئلہ یورپی ممالک اور امریکہ و کینیڈا میں رہنے والے لوگوں کو بھی درپیش ہے، کیوں کہ ان علاقوں میں بھی تارکینِ وطن بکثرت موجود ہیں اور ان کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ یہاں اور وہاں کے معاشرے میں صرف اتنا فرق ہے کہ یہاں غیر مسلم لوگ اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ ہیں اور وہاں کے مسلمان غیر مسلم حکومتوں کے زیرِ تسلّط رہتے ہیں، الغرض یہ ایک عالمگیر مسئلہ ہے۔

قرآن کریم کی نظر میں:

آیئے سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآنِ کریم کا مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے میں ہماری کیا راہنمائی فرمائی ہے؟

1. سورت آلِ عمران (آیت: ۲۸) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ مَنْ یَّفْعَلْ

ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰةً وَ يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ﴾

''مومن لوگ اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کافروں (یا غیر مسلم افراد) کو اپنا رفیق اور یار و مددگار ہرگز نہ بنائیں اور جو ایسا کرے گا (یعنی مسلمانوں کو چھوڑ کر کفّار سے دِلی محبت رکھے گا) اس کا اللہ تعالیٰ سے کوئی تعلّق نہیں۔ ہاں! یہ معاف ہے کہ ان کے ظلم سے بچنے کے لیے بظاہر ایسا طرزِ عمل اختیار کر جاؤ، مگر اللہ تمھیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور تمھیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔''

امام ابن الجوزی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس آیت کے شانِ نزول کے بارے میں چار اقوال نقل کیے ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ یہ آیت حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ وغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی، جو کفّارِ مکہ کے ساتھ اپنی محبت ظاہر کرتے تھے اور اہلِ مکہ کے نام ان کا ایک خط بھی پکڑا گیا تھا۔[1]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دونوں قِسم کے معاشرے میں مسلم و غیر مسلم کے تعلّقات کی وضاحت کر دی ہے کہ اگر مسلم معاشرہ ہو اور کفّار بھی ساتھ رہتے ہوں اور مسلم حکومت کے تابع ہوں تو اس شکل میں مسلمانوں کو کفّار کے ساتھ موالات اور دوستی و محبت نہیں رکھنی چاہیے، اگر معاملہ اس کے برعکس ہو کہ حکومت غیر اسلامی ہو اور اسی کے زیرِ تسلّط مسلمان بھی رہتے ہوں اور مسلمانوں کو کفّار کے ظلم و ستم کا اندیشہ ہو تو انھیں دِلی موالات و محبت تو نہیں، البتہ ظاہری دوستانہ رسم وراہ رکھنے کی اجازت ہے، مگر اسلام کے مشن، مسلمانوں کے مفادات اور جان و مال کو کسی قِسم کا نقصان پہنچانے کی نوبت نہ آئے اور کفّار و کفر کی کوئی ایسی خدمت بھی نہ کی جائے، جس سے اسلام کے مقابلے میں کفر کو فروغ حاصل ہونے اور مسلمانوں پر کفّار کے غالب آجانے کا امکان ہو۔[2]

یہ بھی یاد رہے کہ اہلِ علم نے کفّار و مشرکین، یہود و نصاریٰ اور ملحدین سے دوستی گانٹھنے اور انبیا و صالحین کی پرستش جیسے ''شرک'' کا ارتکاب کرنے والے کی ہم نوائی کرنے کو ''کبیرہ گناہ'' شمار کیا ہے۔[3]

---

[1] زاد المسير (١/ ٣٧١) تفهيم القرآن (٥/ ٤٢٢)

[2] ترجمہ وحاشیہ مولانا مودودی، آیتِ مذکورہ۔

[3] تطهير المجتمعات علامه أحمد بن حجر آف قطر (مترجم اردو)، (ص: ٥٥) ملاحظہ فرمائیں۔

غیر مسلم افراد سے ترکِ موالات کا حکمِ الٰہی:

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآنِ کریم میں بعض دیگر مقامات پر بھی اسی مضمون کو مختلف عنوانات کے تحت بیان فرمایا ہے:

2 چنانچہ سورۃ النساء (آیت: ۱۴۴) میں اللہ تعالیٰ نے منافقین کے ذکر کے دوران میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْکٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اَتُرِیْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ عَلَیْکُمْ سُلْطٰنًا مُّبِیْنًا﴾

''اے ایمان والو! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔ کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے اوپر صریح حجت دے دو؟''

تفسیر ابنِ کثیر میں ابنِ ابی حاتم کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''قرآن کریم میں جہاں کہیں ایسی عبارتوں میں ''سلطان'' کا لفظ آیا ہے، وہاں اس سے مُراد حجت ہے۔'' یعنی تم نے اگر مومنوں کو چھوڑ کر کفّار سے دِلی دوستی کے تعلّقات پیدا کیے تو تمھارا یہ فِعل اس امر کا کافی ثبوت اور پوری دلیل ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تمھیں سزا دے۔[1]

3 سورۃ المائدہ (آیت: ۵۱) میں کفّار میں سے یہود و نصاریٰ کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْیَھُوْدَ وَ النَّصٰرٰٓی اَوْلِیَآءَ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ وَ مَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاِنَّہٗ مِنْھُمْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ﴾

''اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا دِلی رفیق نہ بناؤ، یہ تو آپس ہی میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں اور اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو خود اس کا شمار بھی پھر انھی میں سے ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ظالموں کو راہِ راست نہیں دکھاتا۔''[2]

3 آگے اسی سورۃ المائدہ (آیت: ۵۷۔ ۵۸) میں فرمایا ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَکُمْ ھُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَ الْکُفَّارَ اَوْلِیَآءَ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ اِنْ کُنْتُمْ

[1] تفسیر ابنِ کثیر اردو (۱/ ۷۰۰)

[2] اس سے اگلی دو آیتوں ۵۲ اور ۵۳ کا ترجمہ بھی ساتھ پڑھ لیں تو مزید فائدہ ہوگا۔

مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٥٧﴾ وَ اِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّ لَعِبًا ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ﴾

''اے ایمان والو! تمھارے پیش رَو اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں نے تمھارے دین کو مذاق اور تفریح کا سامان بنا لیا ہے، انھیں اور دوسرے کافروں کو اپنا دوست و رفیق نہ بناؤ، اگر تم سچّے مومن ہو تو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور جب تم نماز کے لیے منادی کرتے ہو، تو وہ اس کا مذاق اُڑاتے اور اسے ہنسی کھیل ٹھہرا لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل نہیں رکھتے۔''

یعنی اذان کی آواز سُن کر اس کی نقلیں اتارتے اور اس پر آوازے کستے ہیں، جو محض ان کی بے عقلی کا نتیجہ ہے۔ ورنہ مذہبی اختلافات کے باوجود آخر کون معقول آدمی یہ پسند کرسکتا ہے کہ جب کوئی گروہ اللہ کی عبادت کے لیے منادی کرے تو ایسی خفیف حرکات سے اس کا مذاق اُڑایا جائے؟[1]

کفّار کا اذان کی آواز پر نقلیں اتارنا، آوازے کسنا اور تمسخر کے لیے کچھ نہ کچھ کہنا محض خیال آرائی نہیں، بلکہ عین حقیقت ہے، جیسا کہ حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ اور دوسرے مفسّرین نے اپنی تفسیر میں ایک نصرانی اور آگے چل کر ابوسفیان بن حرب، عتاب بن اسید اور حارث بن ہشام کے واقعات نقل کیے ہیں۔[2]

امام شوکانی رحمہ اللہ نے تو اپنی تفسیر ''فتح القدیر'' میں لکھا ہے:

''اس آیت کی رو سے اُن اہلِ بدعت سے دوستی رکھنا بھی حرام ہے، جنھوں نے دین کو ہنسی کھیل بنا رکھا ہے، کیوں کہ ان میں بھی وہی وصف پایا جاتا ہے تو لازماً ان کا حکم بھی وہی ہونا چاہیے جو اہلِ کتاب کا ہے۔''[3]

5 سورۃ التوبہ (آیت: ۲۳) میں تو اللہ تعالیٰ نے یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر کسی کے ماں باپ اور بھائی بہن بھی کفر پر مُصِرّ ہوں تو ان کے ساتھ بھی دِلی محبت کا تعلّق نہیں رہنا چاہیے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَ كُمْ وَ اِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾

---

[1] تفهيم القرآن بتصرّف (١/ ٤٨٣)

[2] دیکھیں: تفسير ابن كثير اُردو (١/ ٨١٦) زاد المسير (٢/ ٣٨٥۔ ٣٨٦) تفسير القرطبي (٣/ ٦/ ٢٢٤)

[3] فوائد سلفية المسمّٰی به أشرف الحواشي مولانا محمد عبدة الفلاح (ص: ١٤٢)

’’اے ایمان والو! اگر تمھارے باپ اور بھائی بھی ایمان پر کفر کو ترجیح دیں تو انھیں بھی دِلی دوست یا رفیق نہ بناؤ اور تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے۔‘‘

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ کی تفسیر یوں بیان فرمائی ہے:

”هُوَ مُشْرِكٌ مِثْلَهُمْ، لِاَنَّ مَنْ رَضِيَ بِالشِّرْكِ فَهُوَ مُشْرِكٌ“

’’وہ (جو اپنے کافر اقربا کو اپنا دِلی دوست بنائے) ان کی طرح ہی مشرک ہے، کیوں کہ جو شخص شرک کو پسند کرے تو وہ مشرک ہے۔‘‘

غیر مسلم قرابت داروں سے ترکِ محبت:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے غیر مسلم کفّار سے ترکِ محبت اور ترکِ موالات کا حکم فرمایا ہے۔ یہ حکم نہ صرف یہ کہ اجنبی کفّار کے ساتھ خاص ہے، بلکہ اگر کسی کے ماں باپ، اولاد، بہن بھائی اور اہلِ خاندان بھی کفر پر مُصِرّ ہوں تو ان کے لیے بھی ترکِ موالات ہی کا حکم ہے۔

6 جیسا کہ سورۃ المجادلہ (آیت: ۲۲) میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ﴾

’’تم کبھی یہ نہ پاؤ گے کہ جو لوگ اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ اُن لوگوں سے محبت کرتے ہوں، جنھوں نے اللہ اور اس کے رسُول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کی ہے۔ خواہ وہ ان کے باپ ہوں یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے اہلِ خاندان۔‘‘

7 اس کے بعد اسی آیت میں کفّار سے ترکِ محبت کو اللہ کی جماعت کے لوگوں اور مضبوط ایمان والوں کا وصف قرار دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾

’’یہی وہ لوگ ہیں، جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کو ثبت کر دیا ہے اور اپنی طرف

سے ایک رُوح عطا کر کے ان کو قوّت بخشی ہے۔ وہ ان کو ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہ اللہ کی جماعت کے لوگ ہیں۔ خبردار! آگاہ رہو کہ بے شک اللہ کی جماعت والے ہی نجات وفلاح پانے والے ہیں۔‘‘

چند مثالیں:

کفر پر مُصِرّ والدین، بہن بھائیوں، اولاد اور اہلِ خاندان سے ترکِ محبت اور ترکِ موالات کوئی اَنہونی بات بھی نہیں، بلکہ ہمارے اسلاف اور صحابۂ رسول ﷺ نے اس بات کی روشن مثالیں قائم فرمائی ہیں کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرنے اور اسلام قبول نہ کرنے والے قرابت داروں کو تہہِ تیغ کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ کفر و اسلام کے مابین رونما ہونے والے پہلے معرکۂ حق و باطل، غزوۂ بدر میں نبیِ اکرم ﷺ کی طرف سے ”أمین هذه الأمة“ کا لقب پانے والے جلیل القدر صحابی حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی طرف سے شریکِ لشکر تھے، جبکہ ان کے باپ نے لشکرِ کفر کی طرف سے شرکت کی، آمنا سامنا ہوا تو بیٹے نے باپ کا سر قلم کرنے میں ذرا تامل نہیں کیا۔

حضرت سعید بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے بقول سورۃ المجادلہ کی سابقہ آیت حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کی شان ہی میں نازل ہوئی اور امام قرطبی رحمہ اللہ نے ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی، جب انھوں نے غزوۂ بدر اور بہ قولِ بعض غزوۂ احد میں اپنے باپ کو قتل کیا، جو مشرکین کی طرف سے شریک ہوا تھا۔[1]

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کے قتل کا ارادہ کیا تھا اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی عبید کو قتل کیا تھا۔ حضرت عمر، حضرت حمزہ، حضرت علی اور حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہم نے اپنے اپنے قریبی رِشتے داروں عتبہ، شیبہ اور ولید بن عتبہ کے سر تن سے جدا کیے تھے۔[2]

تبھی تو وہ اس آیت میں مذکورہ بلند درجات پر فائز ہوئے تھے۔

یہ شہادت گہہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آساں سمجھتے ہیں مُسلماں ہونا

[1] تفسير القرطبي (٩/ ١٧/ ٣٠٧)

[2] زاد المسير (٨/ ١٩٨، ١٩٩) تفسير ابن كثير (٥/ ٣٥٩) تفسير القرطبي (٩/ ١٧/ ٣٠٧ تا ٣٠٩)

8 اٹھائیسویں پارے کی سورۃ الممتحنہ کی پہلی ہی آیت میں اسی موضوع کے بارے میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ﴾ [الممتحنة: ١]

''اے ایمان والو! میرے دشمن اور اپنے دشمن (کفّار) کو دوست مت بناؤ، تم ان سے دوستانہ میل جول رکھتے ہو، حالانکہ وہ تمھارے پاس آنے والے سچے دین (سچّے کلام قرآن کریم) کو مانتے ہی نہیں ہیں۔''

اس آیت کے پسِ منظر میں بدری صحابی حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کا قصّہ ہے، جو کتبِ تفسیر و حدیث میں مذکور ہے۔ صحیحین میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مَروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے زبیر اور مقداد رضی اللہ عنہما کو یہ فرماتے ہوئے بھیجا کہ (مکہ مدینے کے مابین) روضۂ خاخ تک جاؤ۔ وہاں ایک عورت تمھیں ملے گی، جس کے پاس ایک خط ہے، وہ لے آؤ۔ ہم اس مقام پر پہنچے اور اس عورت سے مطالبہ کیا تو اس نے پس وپیش کیا، مگر بالآخر اس نے خط دے دیا۔ خط نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا، جو مشرکینِ مکہ کو نبیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پروگرام سے باخبر کرنے کے لیے لکھا گیا تھا۔ حضرت حاطب رضی اللہ عنہ نے جواب طلبی پر بتایا کہ اپنے اہل وعیال (جو مکہ میں تھے) کی خاطر مشرکین کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے میں نے یہ کام کیا تھا۔ ورنہ میں اسلام سے پھرا ہوں نہ ان کفّار کو دوست سمجھتا ہوں۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک تو نے سچ کہا ہے۔''

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اُن کی گردن اُڑا دینے کی اجازت مانگی، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''نہیں، یہ بَدری ہے اور بدری صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تم جو چاہو کرو، تمھیں اللہ تعالیٰ نے معافی دی۔''

اس وقت یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی تھی۔ یہ واقعہ صحیحین، سُننِ اربعہ (سوائے ابن ماجہ) اور صحیح ابن حبان وغیرہ سب میں موجود ہے۔[1]

***

[1] صحيح البخاري (٧/ ٤٠٠) صحيح مسلم (٤/ ١٩٤٢) مختصر ابن كثير للرفاعي (٤/ ٢١٧۔ ٢١٨) تفسير القرطبي (٩/ ١٨/ ٥٠۔ ٥١۔ ٥٢) زاد المسير (٨/ ٣٣٠۔ ٣٣١۔ ٣٣٢) الدر المنثور للسيوطي (٦/ ٢٠٢)

شبہہ وتعارض کا ازالہ

اور

موالات ومواسات کا فرق

اللہ تعالیٰ نے کفّار ومشرکین اور تمام غیرمسلم افراد کے ساتھ موالات یا دلی مودّت ومحبت رکھنے سے مسلمانوں کوسختی کے ساتھ منع فرمایا ہے۔ یہ مضمون قرآنِ کریم کی متعدد آیات میں مجمل اور مفصّل بیان ہوا ہے۔

ان تصریحات کو پڑھنے یا سننے کے بعد حقیقتِ حال سے ناواقف غیرمسلم لوگوں کو یہ شبہہ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے مذہبِ اسلام میں غیرمسلم افراد کے ساتھ کسی قسم کی رواداری اور تعلّق بلکہ حسنِ اخلاق کی بھی کوئی گنجایش نہیں اور دوسری طرف ان آیات کو سامنے رکھتے ہوئے، جب کوئی مسلمان رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیّبہ، آپ ﷺ کے اخلاقِ عالیہ اور غیرمسلموں کے ساتھ احسان وسلوک اور ہمدردی وغم خواری، ایسے ہی صحابہ وخلفاے راشدین رضی اللہ عنہم اور سلفِ اُمت کی غیرمسلموں سے ہمدردی ورواداری اور حسنِ سلوک کے واقعات پڑھے، جن کی مثالیں اقوامِ عالم میں ملنا مشکل ہیں، تو غیرمسلم بلکہ ایک سطحی نظر رکھنے والے مسلمان کو بھی قرآن وسنت کے احکام میں باہم تعارض وتصادم یا اختلاف محسوس ہونے لگتا ہے، حالانکہ حقیقت میں ایسا ہرگز نہیں ہے، بلکہ یہ دونوں خیال ہی غلط اور قرآن وسنت کی حقیقی تعلیمات سے ناواقفیت یا ناقص تحقیق کا نتیجہ ہیں۔

اس نقطے کو سمجھنے اور قرآن وسنت کی حقیقی تعلیمات معلوم کرنے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ دو شخصوں یا جماعتوں کے تعلّقات اور ان کے مختلف درجات کو مدّ نظر رکھا جائے، موالات اور احسان وسلوک یا ہمدردی ورواداری کا فرق اور ہر ایک کی حقیقت کو سمجھا جائے اور پھر قرآن وسنت کی روشنی میں دیکھا جائے کہ ان میں سے کون سا درجہ جائز اور کون سا ناجائز ہے؟ جو

ناجائز ہے، اس کی کیا وجوہ بیان کی گئی ہیں؟ اگر اسی نہج پر سوچا جائے تو غیر مسلموں کے لیے کوئی وجہ شکایت باقی نہیں رہتی اور نہ آیات و روایات ہی میں کسی قسم کا اختلاف رہ جاتا ہے۔ چنانچہ تفسیر معارف القرآن جلد دوم میں سورت آلِ عمران (آیت: ۲۸) کی تفسیر کے ضمن میں لکھا ہے:

”بات دراصل یہ ہے کہ دو جماعتوں یا دو شخصوں کے مابین باہمی تعلقات کے چار مختلف درجے ہوتے ہیں۔ پہلا موالات۔ دُوسرا مواسات۔ تیسرا مدارات اور چوتھا درجہ ہے معاملات۔“[1]

(1) موالات:

ان درجات میں سے جو پہلا درجہ موالات ہے، اس کا معنیٰ ہے:

”کسی کے ساتھ دل کی گہرائی سے محبت ومودّت رکھنا۔“

یہ صرف مومنوں، مُسلمانوں کے ساتھ ہی خاص ہے، کسی غیر مومن اور غیر مسلم کے ساتھ مسلمانوں کا یہ دِلی تعلّق کسی حال میں قطعاً جائز نہیں۔ قرآنِ کریم کی جتنی آیات ہم پیش کر چکے ہیں، ان سے مُراد اسی تعلّقِ خاطر کی ممانعت ہے۔

(2) مواسات:

باہمی تعلقات کی مختلف نوعیّتوں میں سے دُوسرا درجہ مواسات کا ہے، جس کا معنیٰ ہے:

”ہمدردی و خیر خواہی اور نفع رسانی کا رویہ اپنانا اور سلوک کرنا۔“

اہلِ حرب یا مسلمانوں کے ساتھ برسرِ جنگ کفّار ومشرکین کو چھوڑ کر باقی تمام غیر مسلموں کے ساتھ یہ تعلّق رکھنا جائز ہے، کیوں کہ اٹھائیسویں پارے کی سورۃ الممتحنہ جس کی پہلی ہی آیت میں اللہ تعالیٰ نے غیر مسلموں کے ساتھ موالات یا دِلی تعلّقات استوار کرنے سے روکا ہے اور مومنوں سے مخاطب ہو کر فرمایا ہے:

﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ﴾ [الممتحنة:۱]

---

[1] معارف القرآن مفتی محمد شفیع (۲/ ۵۰)

”اے ایمان والو! میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دِلی دوست مت بناؤ کہ تم ان کو دوستی کے پیغام بھیجو، حالانکہ تمھارے پاس جو دین آچکا ہے، وہ اس کے منکر ہیں۔“ [1]

آپ ذرا اس ارشادِ الٰہی پر غور کریں، آپ کا ذہن تسلیم کرے گا اور خود ہی کہہ اُٹھے گا کہ واقعی کوئی بھی معقول شخص کسی ایسے انسان کو دِلی دوست نہیں بنا سکتا اور نہ اس کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھا سکتا ہے، جو اس کے اپنے دینِ حق کا منکر ہو، مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ایسے منکرینِ دینِ حق کے ساتھ بھی کلّی طور پر ترکِ تعلقات کا حکم نہیں دیا، بلکہ اسی سورۃ الممتحنہ (آیت: ۸) میں اس کے ساتھ احسان و انصاف اور ہمدردی و رواداری کے سلوک کا حکم فرمایا، بشرطیکہ وہ حربی غیر مسلم نہ ہو، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْھِمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ﴾

”اللہ تمھیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو، جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی اور تمھیں گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔“

اس سے اگلی آیت (۹) میں اہلِ حرب کفّار سے موالات کے ساتھ ساتھ مواسات (احسان و ہمدردی کے سلوک) سے بھی منع کرتے ہوئے فرمایا:

---

[1] یہاں ترکِ موالات کی وجہ دینِ حق کا انکار بتایا ہے اور ساتھ ہی ان کے حربی ہونے کا بھی ذکر فرما دیا ہے، جیسا کہ اس آیت کے بقیہ کلمات سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:
﴿یُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِیَّاکُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ رَبِّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِھَادًا فِیْ سَبِیْلِیْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِیْ تُسِرُّوْنَ اِلَیْھِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَیْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ وَمَنْ یَّفْعَلْہُ مِنْکُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ﴾ [الممتحنة: ١]
(وہ تو ایسے ظالم ہیں کہ) رسول کو اور تمھیں صرف اتنی سی بات پر کہ تم اپنے مالک اللہ پر ایمان لائے ہو، مکہ سے نکال باہر... کرتے ہیں، اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے کے لیے نکلے ہو اور میری خوشی و رضا چاہتے ہو (تو ان سے ہرگز دوستی نہ رکھو) تم چپکے چپکے ان سے دوستی رکھتے ہو (اور یہ نہیں جانتے کہ) میں تمھاری پوشیدہ اور کھلی باتوں سے خوب آگاہ ہوں اور تم سے جو کوئی ایسا کرے گا (کافروں سے دلی دوستی رکھے گا) وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔“

﴿اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾

''اللہ تو تم کو ان لوگوں کی دوستی کرنے سے منع کرتا ہے، جو دین کے بارے میں تم سے لڑے (مذہبی جنگ کی) اور انھوں نے تمھیں گھروں سے باہر نکال دیا اور تمھارے نکالنے پر تمھارے دشمنوں کی مدد کی اور جو لوگ ایسے لوگوں سے دوستی رکھیں، وہ گناہ گار ہیں۔''

اوّل الذکر تعلق (موالات) تو صرف اہلِ ایمان مسلمانوں کے ساتھ خاص ہے، جب کہ یہ ثانی الذکر تعلّق (مواسات) صرف اہلِ حرب کفّار کو چھوڑ کر باقی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے۔

3 مدارات:

تعلقات کی ان چار قسموں میں سے تیسرا درجہ مدارات کا ہے، جس کا معنیٰ ہے: ''باہمی خوش اخلاقی اور دوستانہ راہ و رسم۔''

یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے، جب کہ اس کا بنیادی مقصد ان کو دینی اعتبار سے نفع پہنچانا اور اپنے قریب لانا ہو، تاکہ خوش گوار ماحول میں ان تک اسلام کا پیامِ امن پہنچایا جاسکے اور انھیں دینِ حق کی تبلیغ کی جاسکے یا پھر ان میں سے کوئی شخص مہمان بَن کر آجائے تو اس کے ساتھ خندہ روئی اور حسنِ اخلاق سے پیش آنا بھی اسلام کی ہمہ گیر تعلیمات کے منافی نہیں۔

ایسے ہی جہاں وہ غالب اکثریت والے ہوں اور ان کے شَر یا ضرر رسانی کا خدشہ ہو تو وہاں بھی اپنے آپ کو اس خدشے سے محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ محدود پیمانے پر خاطر و مدارات رکھنے کو جائز قرار دیا ہے۔ سورت آلِ عمران (آیت: ۲۸) میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو چھوڑ کر کافروں سے دِلی محبت کی پینگیں بڑھانے والوں کو سختی سے منع کیا ہے، جس سے عدمِ موالات مُراد ہے۔ ساتھ ہی ارشاد فرمایا:

﴿اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰةً﴾

''سوائے اس کے کہ تم ان کے شَر سے اور ضَرر سے بچاؤ کے لیے ان کے ساتھ کچھ تعلقات بحال رکھو۔''

یہاں جن تعلقات کو جائز قرار دیا گیا ہے، ان سے یہی مدارات کا درجہ ہی مُراد ہے، چونکہ اس درجۂ مدارات میں بھی دِلی موالات ہی کی ایک شکل پائی جاتی ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے مومن بندوں کے دلوں میں اس مشابہت کی وجہ سے خلش پیدا ہوسکتی تھی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسی خلش کے سدِباب کے لیے اس کو موالات سے مستثنیٰ کر کے جائز قرار دیا ہے۔ تمام اَدیانِ عالَم میں سے صرف دینِ اسلام ہی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں کو کسی بھی حالت میں کِسی حرج میں مبتلا ہونے نہیں دیتا اور نہ اپنے پیروکاروں کو کسی کے ساتھ بداخلاقی و بدخوئی سے پیش آنے کی تعلیم دیتا ہے، بلکہ پیغمبرِ اسلام ﷺ نے جو جنگی ضابطے مقرر کیے ہیں، انھیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے تو عین میدانِ کارزار میں بھی کِسی ایسے کام کی اجازت نہیں بخشی، جو اخلاق و مَردانگی کے خلاف ہو۔

کفار کے مقتولین کا مُثلہ نہ کرنا یا شکلیں بگاڑنے کے لیے ان کے ناک، کان کاٹنے کی ممانعت، فصلیں برباد نہ کرنا اور باغات نہ جلانا اور نہ اُجاڑنا۔ ایسے ہی عورتوں اور بچوں کو قتل نہ کرنے کے ضابطے نبیِ اسلام ﷺ اور اہلِ اسلام کے کریمانہ اخلاق کا مُنہ بولتا ثبوت ہیں۔

4 معاملات:

تعلقات کے مختلف چار دَرجوں میں سے چوتھا درجہ معاملات کا ہے، جس کا معنیٰ ہے: ''باہمی تجارتی لین دین، اجرت وملازمت اور صنعت وحرفت کے معاملات۔''

یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہیں، مگر ایک شرط کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہوگا کہ ان معاملات سے مسلمانوں کے مفادِ عامہ کو نقصان نہ پہنچتا ہو۔ رسولِ کریم ﷺ، خلفاے راشدین اور عام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تعامل اس بات پر شاہد ہے۔ تمام فقہاے اسلام نے اسی بنا پر اہلِ حرب کفّار کے ہاتھوں اسلحہ یا جنگی سامان فروخت کرنے کو ممنوع قرار دیا ہے اور باقی تجارت وغیرہ کی اجازت دی ہے۔ انھیں اپنے اداروں یا کارخانوں میں ملازم رکھنا یا خود ان کے یہاں ملازمت کرنا جائز ہے، بشرطیکہ ان اُمور سے عام مسلمانوں کو نقصان نہ پہنچتا ہو۔[1]

ان تفصیلات کو اگر سامنے رکھا جائے تو نہ غیر مسلموں کے لیے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف

[1] معارف القرآن (۲/ ۵۰۔ ۵۱) بتصرف.

تنگ نظری یا عدمِ رواداری کی کوئی وجہ شکایت باقی رہتی ہے اور نہ آیات و روایات میں کوئی تعارض یا اختلاف باقی رہتا ہے۔

اب رہی بات غیر مَردوں کو گھریلو امور کے لیے ڈرائیور رکھنے، کسی غیر مسلم مَرد یا عورت کو باوَرچی رکھنے یا کسی غیر مسلم کو بچوں کی پرورش وتربیت کے لیے گورنس یا دایہ رکھنے کی؟ تو ان اُمور میں مَرد وزن کے اختلاط کا تو کوئی جواز ہی نہیں، جو حرام و ناجائز ہے اور اگر اس کے دیگر نتائج وعواقب پر غور کیا جائے تو ان افعال کے ناجائز ہونے میں کسی شُبہے کی بھی کوئی گنجایش نہیں رہتی۔

قرونِ اُولیٰ میں مسلم اور غیر مسلم خوش گوار تعلّقات کی چند مثالیں

غیر مسلموں کے لیے ہمارے دینِ اسلام میں کتنی رواداری اور حسنِ سلوک کی تعلیم ہے، اِس بات کا اندازہ کرنا ہوتو ہمارے رسولِ رحمت ﷺ کی سیرتِ طیبہ پر ایک نظر ڈال لیں، اس سے ساری شکایتیں دُور ہو جائیں گی۔ آپ ﷺ نے غیر مسلموں کے ساتھ جو احسان و ہمدردی اور خوش اخلاقی کے معاملات کیے، ان کی دُنیا جہان میں نظیر ملنا مشکل ہے۔

1. مکہ مکرمہ میں قحط پڑا تو جن دُشمنوں نے آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے جانثاروں کو آبائی وطن چھوڑنے اور ملک بدر ہونے پر مجبور کیا تھا، ان کی خود امداد فرمائی۔
2. پھر فتح مکہ کے روز جب تمام دشمن آپ ﷺ کا اشارۂ اَبرو ملنے پر گاجر مولی کی طرح کاٹے جاسکتے تھے، اس موقع پر بھی آپ ﷺ نے اپنی رحمۃ للّعالمینی کا ثبوت دیتے ہوئے فرمایا:

   «لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ»[1]

   ''آج (تمھیں صِرف معافی ہی نہیں دی جاتی بلکہ تمھارے پچھلے ظلم وستم اور تکالیف و اِیذا رسانی پر) ہم تمھیں کوئی ملامت بھی نہیں کرتے۔''
3. غیر مسلم جنگی قیدی ہاتھ آئے تو ان کے ساتھ وہ سلوک کیا کہ ہر شخص اپنی اولاد کے ساتھ بھی نہیں کرسکتا۔
4. کفّار و مشرکین اور منافقین نے آپ ﷺ کو طرح طرح کی ذہنی و جسمانی تکلیفیں پہنچائیں، مگر کبھی آپ ﷺ کا دستِ مبارک انتقام کے لیے نہ اُٹھا۔
5. بنوثقیف جو ابھی مسلمان بھی نہیں ہوئے تھے، ان کا وفد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو

---

[1] زاد المعاد (٢/ ١٦٢، طبع قديم) و طبری کما في رحمة للعالمین للمنصور پوري رحمه الله (١/ ١٢٠)

انھیں مسجدِ نبوی ﷺ میں ٹھہرایا گیا، جو مسلمانوں کے لیے انتہائی عزت کا مقام تھا۔

غیر مسلموں کے لیے صرف نبیِ اسلام ﷺ ہی نے رواداری اور حسنِ سلُوک کی یہ تابناک مثالیں قائم نہیں کیں، بلکہ اسلام اور نبیِ اسلام ﷺ کے پیروکاروں نے بھی اس سلسلے میں بے نظیر عملی نمونے پیش کیے ہیں، جن کی ضیا باریوں اور ضوافشانیوں میں عقائد و اعمال کی ظلمتوں کا راہی آج بھی جادۂ حق کو تلاش کرسکتا ہے۔

خلفاے راشدین کی تاریخ اٹھایئے۔ ان کے عہدِ زرّیں کا مطالعہ کیجیے۔ سیرتِ فارُوق رضی اللہ عنہ پر اچٹتی ہوئی طائرانہ نظر ہی ڈال کر دیکھیں، آپ کو قدم قدم پر انسانی ہمدردی کی مثالیں ملیں گی اور آپ کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگے گی کہ آج یو۔ این۔ او یا اقوامِ متحدہ، جس انسانی منشور پر بڑی نازاں ہے، یہ ہمارے اسلاف کے حسین نامۂ اعمال کا عُشرِ عشیر بھی نہیں۔

6. حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ضعیف و معذور مسلمانوں کو بیت المال سے وظیفے دیے تو اپنی مملکت میں رہنے والے غیر مسلم معذور ومحتاج ذمیوں کے لیے بھی مسلمانوں کی طرح ہی بیت المال سے با قاعدہ وظیفے مقرر کیے۔

7. خلفاے راشدین، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اسلافِ امت کی تاریخ مواسات و مدارات اور حسنِ معاملات سے بھری پڑی ہے، البتہ ترکِ موالات کے قرآنی ضابطے کو کسی حالت میں بھی انھوں نے فراموش نہیں کیا۔[1]

تخلیقِ انسانی کا بنیادی مقصد اور عدمِ موالات میں شدت کی وجہ:

مسلم اور غیر مسلم افراد کے باہمی تعلّقات کی کُل چار ہی نوعیتیں ہیں جن میں سے تین قسم کے تعلقات تو بعض حالات میں بعض شرائط کے ساتھ جائز ہیں۔ صرف ایک ہی درجہ ایسا ہے جو کسی حالت اور کسی شکل میں بھی جائز نہیں اور وہ موالات یا دِلی محبت کا درجہ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آخر قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے کفّار کی موالات اور قلبی دوستی و محبت سے اتنی شدّت کے ساتھ کیوں روکا ہے اور اس میں آخر کیا حکمت ہے؟

اس کا جواب پانے کے لیے سب سے پہلے ہمیں تخلیقِ انسانیت کے بنیادی مقصد کی تعیین کرنا ہوگی۔

---

[1] معارف القرآن (۲/ ۵۱۔ ۵۲) بتصرّف.

بات دراصل یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے اس دُنیا میں انسان کا وجود عام جانوروں اور جنگل کے شجر وحجر یا گھاس پھُوس کی طرح نہیں کہ پیدا ہوئے، پھلے پھُولے اور پھر ہمیشہ کے لیے نیست و نابود اور ختم ہوگئے، بلکہ انسان کی زندگی اس جہاں میں ایک بامقصد زندگی ہے اور حیاتِ انسانی کے تمام ادوار، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، حتیٰ کہ جینا اور مرنا سب ایک مقصد کے گرد گھُومتے ہیں۔ جب تک وہ مقصد کے مطابق ہیں تو یہ سارے کام ہی درست وصحیح ہیں اور اگر یہ امور اس مقصد کے مخالف ہیں تو یہ سب غلط ہیں۔ وہ مقصد کیا ہے؟

قرآن کریم کی سُورۃ الذاریات (آیت: ۵۶) میں اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ انسانی کے اُس مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾

''میں نے جنّوں اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری بندگی کریں۔''

ساتھ ہی مزید وضاحت فرمادی:

﴿مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾ [الذاریات: ۵۷۔ ۵۸]

''میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں (اور فرمایا) اللہ ہی تو ہے جو رزّاق، بڑی قوّت والا اور زبردست ہے۔''

انسانی زندگی کے اسی مقصدِ تخلیق کے بارے میں دانائے رُوم نے اپنی مثنوی میں کیا خوب کہا ہے: ؎

زندگی از بہرِ ذکر و بندگی ست
بے عبادت زندگی شرمندگی ست

جو انسان اپنے اس بنیادی مقصدِ حیات کو پورا نہ کر رہا ہو تو اسے انسان کہلوانے کا کیا حق ہے؟ بقول مولانا روم رحمہ اللہ وہ انسان نہیں، بس انسان کا روپ دھارے ہُوئے ہے اور انسانیت کے غلاف میں پایا جاتا ہے۔ ؎

آنچہ می بینی خلافِ آدم اند
نیستند آدم در غلافِ آدم اند

قرآنِ کریم سورۃ الانعام (آیت: ۱۶۲ اور ۱۶۳) میں اللہ تعالیٰ نے اسی مقصدِ تخلیق کا اقرار انسان سے ان الفاظ میں لیا ہے:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ بِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ﴾

''آپ کہہ دیجیے کہ میری نماز وقربانی اور میری موت وحیات سب اللہ ربّ العالمین کے لیے ہے۔ اللہ کا کوئی شریک نہیں۔ اِسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سرِ اطاعت خم کرنے والا میں ہوں۔''

جب انسان کی زندگی کا مقصدِ وحید اللہ ربّ العالمین کی اطاعت وعبادت ہے تو دُنیا کے تمام کاروبارِ ریاست وسیاست اور عائلی ومنزلی تعلقات بھی سب اُسی کے تابع ٹھہرے اور جو انسان اس بنیادی مقصد کے مخالف ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے والے انسانوں کے سب سے زیادہ دشمن ہیں اور شیطانِ لعین چونکہ اس مقصد کی مخالفت میں سب سے آگے ہے، لہٰذا قرآنِ کریم کی سورۃ الفاطر (آیت: ٦) میں اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ عَدُوًّا﴾ [الفاطر: ٦]

''درحقیقت شیطان تمھارا دشمن ہے، اس لیے تم بھی اسے اپنا دشمن ہی سمجھو۔''[1]

اسی طرح جو لوگ شیطانی وساوس کے پیرو اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعے اسے آئے ہوئے احکامِ الٰہی کے مخالف ہیں، ان کے ساتھ دلی ہمدردی اور قلبی دوستی اس شخص کی ہو ہی نہیں سکتی، جس کی زندگی ایک با مقصد زندگی ہے اور جس کی دوستی اور موافقت ومخالفت سب اس مقصد کے تابع ہیں۔[2]

---

[1] اور اسی موضوع کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاعراف (آیت: ۲۲) سورت یوسف (آیت: ۵۳) سورت بنی اسرائیل (آیت: ۵۳) اور سورۃ الفرقان (آیت: ۲۹) میں بھی بیان فرمایا ہے۔

[2] اس موضوع کے صرف مرکزی نقطہ ومفہوم کے لیے ہمارا ماخذ ہے: معارف القرآن (۲/ ۵۲۔ ۵۳)

عدمِ موالات کے حکم میں شدت کا سبب:

جس انسان کو اپنی زندگی کے مقصد کا ادراک ہو جائے اور اسے پتا چل جائے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے اطاعت و عبادت کا مطالبہ کیا ہے تو پھر اس کی تمام حرکات و سکنات، اس کے تمام افعال و اعمال اور اس کے تمام تعلقات حکمِ الٰہی کے تابع ہو جاتے ہیں، جن سے وہ سرِمو انحراف کرنا بھی گناہ سمجھتا ہے۔

اللہ کے ایسے بندوں کی دُوسرے لوگوں سے دوستی و محبت یا بُغض و عداوت بھی خالص منشاے الٰہی کے تابع ہوتی ہے۔ وہ نہ اپنی ذات کے نفع و نقصان کی خاطر کِسی سے پیار کرتا ہے اور نہ ذاتی انتقام کے جذبے سے مغلوب ہو کر کِسی سے دشمنی یا نفرت رکھتا ہے۔ اس کی نفرت و محبت کا پیمانہ صرف رضاے الٰہی ہوتا ہے اور جس شخص میں یہ وصف پَیدا ہو جائے، رسولِ کریم ﷺ کی نگاہِ حق شناس میں وہی کامل الایمان شخص ہوتا ہے، جیسا کہ ابو داود شریف میں آپ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«مَنْ أَحَبَّ لِلّٰہِ وَأَبْغَضَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ إِيمَانَهٗ»[1]

''جس شخص نے اپنی دوستی و دشمنی کو صرف اللہ تعالیٰ کی منشا کے تابع کر دیا، اُس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایمان کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے، جب انسان اپنی محبت و دوستی اور نفرت و دشمنی کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع کر دے۔ اس لیے مومن کی موالات اور دلی محبت صرف اسی شخص کے لیے ہو سکتی ہے، جو اس مقصد کا ساتھی اور اللہ کا تابع فرمان ہو اور جو شخص اس مقصد کا متلاشی نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر مُصِرّ ہو تو پھر اُس سے وہی شخص دوستی کر سکتا ہے، جو اُسی جیسا ہو گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے کفّار کے ساتھ موالات کا تعلق رکھنے والوں کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿وَ مَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ﴾ [المائدۃ:٥١]

''تم میں سے جس نے اُن (اللہ کے نافرمان یہود و نصاریٰ) کے ساتھ دلی تعلّق رکھا تو

---

[1] صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (٣٩٥١) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٥٩٦٥) اور اس میں «مَنْ أَعْطیٰ لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ» کے الفاظ بھی ہیں کہ جس نے اللہ کے لیے دیا اور اُسی کی خاطر روکا۔ السلسلة الصحیحة، رقم الحدیث (٣٨٠)

خوداس کا اپنا شمار بھی انہی میں سے ہوگا۔‘‘

اس بات کی مزید وضاحت نبیِ اکرم ﷺ کی ایک دوسری حدیثِ شریف سے ہو جاتی ہے۔ سنن ابو داود میں حضرت سمرہ بن جُندب رضی اللہ عنہ سے مَروی ہے کہ نبیِ مکرم ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ جَامَعَ الْمُشْرِكَ وَسَكَنَ مَعَهُ فَإِنَّهُ مِثْلُهُ»[2]

’’جو کوئی (کفّارو) مشرکین کے ساتھ اختلاط یا میل جول رکھے، وہ خود بھی انہی جیسا ہوگا۔‘‘

اس سے معلوم ہوا کہ ان کے ساتھ رہن سہن رکھنے والا بھی انہی کے حکم اور وعید میں آ جاتا ہے۔ یہاں ہم اس بات کی طرف توجہ مبذول کروانا چاہتے ہیں کہ ہمارے وہ احباب جو نہ اللہ کی خاطر محبت رکھتے ہیں، نہ اس کی خاطر نفرت کرتے ہیں، بلکہ محض چند دنیوی مفادات کے پیشِ نظر اپنی بود وباش، میل جول، کھانا پینا اور رہن سہن غیر مسلموں کے ساتھ رکھتے ہیں، وہ اس حدیثِ رسُول ﷺ کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ لیں اور اپنے کردار کے اس کمزور پہلو کی اصلاح کرلیں، تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن جب بنی آدم کو حساب کتاب کے لیے اٹھایا جائے تو ان کا حشر بھی انھیں کے ساتھ ہو۔ أَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ.

یہ امرِ واقع ہے کہ ہمارے بعض مسلمان محض معمولی دنیوی اغراض اور گھٹیا قِسم کے مقاصد کی خاطر بعض غیر مسلم قوموں سے دوستانہ راہ و رسم رکھتے ہیں۔ مثلاً: بعض لوگ انگریزوں سے سلام دعا رکھتے ہیں اور بعض سِکھوں کے ساتھ میل جول اور مراسم پیدا کرلیتے ہیں اور اغراض و مقاصد کی فہرست انتہائی مختصر بلکہ صرف دو حرفی ’’مفت شراب‘‘ ہوتی ہے۔ ایک چیز جو پہلے ہی قرآن وسنت کی رو سے حرام ہے، اس کے حصول کے لیے دوسرے حرام کام کا بھی ارتکاب ہوتا ہے اور پھر یہ سلسلۂ حرام درحرام چل نکلتا ہے۔

ایسے ہی بعض لوگ غیر مسلموں کے ساتھ رہن سہن کے علاوہ مل کر کھانا پینا بھی کرتے ہیں، ایک ہنڈیا اور مشترکہ برتن اور ایک ہی دستر خوان، جو وسعتِ ظرفی نہیں، بلکہ ناشایستگی و بدتہذیبی اور ارشادِ نبوی ﷺ کی نافرمانی ہے اور بُرا ہو، ملکی و لسانی اور وطنی ونسلی تعصّب کا جو یہ کام کرواتا ہے کہ اپنے ملک وقوم کے کافر کو تو اپنے ساتھ رکھنا منظور ہے، دوسری قوم وملک کے مسلمان کو بھی روم میٹ

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧٨٧) السلسلة الصحيحة (٢٣٣٠) صحيح الجامع (٦١٨٦)

بنانا گوارہ نہیں کیا جاتا، جو انتہائی پست ذہنیت کی علامت ہے۔

سورۃ البقرہ (آیت: ۲۸) میں کفّار سے عدمِ موالات کی تاکید کرنے کے بعد فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ تمھیں اپنی ذاتِ عظیم سے ڈراتا ہے۔'' ایسا نہ ہو کہ چند روزہ اغراض و مقاصد کی خاطر موالاتِ کفّار میں مبتلا ہوکر اللہ کو ناراض کر بیٹھو اور چونکہ موالات کا تعلّق دل سے ہے اور دل کا حال اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اس لیے ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص حقیقت اور واقع میں تو کفّار کی محبت میں مبتلا ہو، مگر زبانی انکار کرے۔ لہٰذا آلِ عمران (آیت: ۲۹) میں فرمایا:

﴿قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ وَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾

''کہہ دیجیے (اے میرے پیغمبر ﷺ!) تم اپنے دل کی بات چھپاؤ یا ظاہر کرو، اللہ تعالیٰ تو اُسے بہرحال جانتا ہی ہے اور جو کچھ ارض و سما میں ہے، اسے سب معلوم ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

(1) کفّار ومشرکین کی تقلید اور پیروی:

احکامِ الٰہی کی بنیاد پر یہ مسئلہ طے ہوجانے کے بعد کہ کفّار ومشرکین کے ساتھ موالات منع ہے، اس بات کا فیصلہ کرنا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ ان (کفّار ومشرکین) کی عادات واطوار، گُفتار و کردار، خوراک و پوشاک اور خور ونوش کے انداز کی پیروی کرنا کیوں کر جائز ہوسکتا ہے؟ یہ سب امور بھی یقینی طور پر ناجائز اور قطعی منع ہیں۔ اہلِ علم نے قرآن وسنت کے دلائل کی بنا پر کفّار کی تقلید اور پیروی کو گناہِ کبیرہ شمار کیا ہے۔[1] کیوں کہ قرآن کریم کی سورۃ الجاثیہ (آیت: ۱۸) میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پیغمبر ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾

''(اے میرے نبی ﷺ!) ہم نے آپ (ﷺ) کو دین کے معاملے میں ایک شریعت پر

---

(1) تطهير المجتمعات (ص: ۲۹۵۔ ۲۹۹)

قائم کیا ہے، لہٰذا آپ اسی پر چلیں اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں جو علم نہیں رکھتے۔''

اس آیت میں ﴿اَلَّذِيْنَ لاَ يَعْلَمُوْنَ﴾ سے مُراد مشرکین لیے ہیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہودِ بنی قریظہ و بنی نضیر بھی منقول ہیں۔[1]

علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ نے اس آیت کے شانِ نزول میں لکھا ہے:

''جب کفّارِ قریش نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آبائی دین کی طرف لَوٹ آنے کی دعوت دی تو یہ آیت نازل ہوئی۔'' پھر انھوں نے ﴿اَلَّذِيْنَ لاَ يَعْلَمُوْنَ﴾ کی تفسیر کفّار ومشرکین کی ہے۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے ''روح المعانی'' میں مذکورہ بالا تفسیر کے ساتھ ہی اس سے مُراد جاہل اور گمراہ لوگ بیان کیے ہیں۔ امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے بھی ان سے حق و باطل کو نہ جاننے والے جاہل لوگ مُراد لیے ہیں۔[2]

اللہ تعالیٰ نے تو ہمیں ان لوگوں کی عادات واطوار اور ان کے طریقے پر نہ چلنے کی دُعائیں مانگنے کا حکم فرمایا ہے۔ ہم ہر رکعت میں قبلہ رو ہو کر سورۃ الفاتحہ (آیت: ۵، ۶، ۷) میں دُعا کرتے ہیں:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ﴾

''(اے اللہ!) ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ اُن لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا، جو معتوب نہیں ہُوئے اور جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں۔''

مفسرینِ کرام نے ان آخری الفاظ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ معتوب ومغضوب سے مُراد قومِ یہود اور ضالّین سے مراد نصاریٰ (عیسائی) ہیں۔[3]

مستدرک حاکم میں ہے کہ نبیِ مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((هَدْيُنَا مُخَالِفٌ لِهَدْيِهِمْ))

---

[1] تفسیر القرطبي (٨/ ١٦/ ١٦٤)

[2] زاد المسیر (٧/ ٣٦٠) حاشیہ زاد المسیر (٧/ ٣٦٠)

[3] تفسیر ابن کثیر اردو (١/ ٤٥۔ ٤٦)

''ہمارا طور طریقہ ان (یہود و نصاریٰ) کے طور طریقے کے مخالف ہے۔''

غیر مسلموں کے طور طریقے اپنانے والوں کو اس فعل کا انجام بتاتے ہوئے نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ غیروں کی مشابہت اختیار کرنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ تمھارا شمار بھی انھی میں سے ہوجائے گا، جیسا کہ سنن ابی داود اور صحیح ابن حبان میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

((مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ))[1]

''جس نے کِسی قوم کی مشابہت کی تو وہ انہی میں سے ہے۔''[2]

غیروں کی تقلید سے منع کرنے کی حکمت:

غیروں کی تقلید اور مشابہت سے منع کرنے کی حکمت یہ ہے کہ عادات و اطوار اور خوراک و پوشاک کے ظاہری اُمور میں مشابہت اختیار کرنے سے باطنی امور پر بھی اثر پڑتا ہے اور ان میں بھی یکسانیت آ جانا شروع ہوجاتی ہے۔ یہ عمل غیر ارادی طور پر از خود انجام پا جاتا ہے اور جس طرح احساس وتجربے کی رُو سے یہ ایک نا قابلِ تردید حقیقت ہے کہ باطنی محبت سے ظاہری مشابہت آ ہی جاتی ہے، ایسے ہی اس کے برعکس ظاہری مشابہت کا رنگ باطنی محبت کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ اسی عظیم حکمت کے پیشِ نظر رسولِ رحمت ﷺ نے غیر مسلم اقوام کی مشابہت سے منع فرمایا ہے، تاکہ ان کا رنگ غالب نہ آ جائے۔

مگر بُرا ہو اس اندھا دُھند تقلیدِ مغرب کا کہ قرآن وسنت کی ان واضح تصریحات کے باوجود بھی وہ پھیل رہی ہے۔ یہود ونصاریٰ اور مجوس ومشرکین کی تمام عادات ایک ایک کر کے مُسلم معاشرے میں سرایت کر رہی ہیں اور اس سارے عمل کے پیچھے یہُودی لابی اور کرسچن مشنری کا باقاعدہ ہاتھ ہے، جو خفیہ اور غیر محسوس انداز میں سرگرمِ عمل ہیں۔

---

[1] علامہ احمد حسن دہلوی نے لکھا ہے کہ اس حدیث میں ضعف پایا جاتا ہے، مگر اس کے شواہد موجود ہیں۔ مثلاً مسند ابی یعلی میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ((مَنْ رَضِيَ عَمَلَ قَوْمٍ كَانَ مِنْهُمْ)) ''جو کسی قوم کے کسی کام سے راضی ہوا، وہ انھی میں سے ہے۔'' حاشیہ الدهلوی علی بلوغ المرام (٢/ ١/ ٣٧٨) طبع المكتب الإسلامي

[2] اس حدیث کو البانی نے صحیح کہا ہے۔ صحیح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٤٠١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦١٤٩) إرواء الغليل (١٢٦٩) اس کی مزید تشریح کے لیے فتاویٰ اہلِ حدیث ملاحظہ فرمائیں۔

حدتو یہ ہے کہ آج ان فتنہ انگیز عادات واطوار اور فیشنوں کا پرچار کرنے والے صرف کفّار ہی نہیں، بلکہ ایسے مسلم نوجوان بھی ہیں جو علم وفن کے حصول کے لیئے مغربی ممالک کا سفر کرتے ہیں اور آتے ہوئے جہاں ہاتھوں میں علمی ڈگریاں لاتے ہیں، وہیں اپنے ذہنوں میں تقلیدِ مغرب کا میٹھا زہر بھی لیے چلے آتے ہیں۔ سامراجی طاقتوں اور ہمارے ان اپنوں کی مہربانیوں ہی کا نتیجہ ہے کہ آج کہیں کہیں مشرق کی فضاؤں پر بھی مغرب کا دھوکا ہوتا ہے اور مسلم وکافر کا فرق ناپید ہوتا جا رہا ہے۔

چند مثالیں:

بنی اسرائیل (یہود ونصاریٰ) کی بد اعمالیوں کی وجہ سے قرآنِ کریم کے بے شمار مقامات پر ان کی مذمّت کی گئی ہے، تاکہ اہلِ اسلام اس سے عبرت حاصل کریں اور ان کی عادات کو اختیار نہ کریں، لیکن قرآنِ کریم کی مخاطب اُمتِ اسلامیہ کے افراد نے یہود ونصاریٰ کی مذمّت سے عبرت پکڑنے کے بجائے انہی کے اطوار وافعال کو اختیار کرلیا ہے اور ان کی اندھی تقلید کیے چلے جارہے ہیں، حتیٰ کہ دینی، اخلاقی، معاشی اور معاشرتی کوئی شعبۂ حیات ایسا نہیں، جس میں ان کفّار کی پَیروی نہ کی جارہی ہو۔

(2) شرک اور بت پرستی:

پچھلی قوموں میں شرک اور بت پرستی پائی جاتی تھی، آج مسلمانوں میں بھی عبادتِ الٰہی کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کی کئی اور ''پرستیوں'' نے قدم جما لیے ہیں۔ ان میں بُت پرستی تھی تو ہمارے یہاں قبر پرستی ہے۔ وہ اپنے اَحبار ورہبان کی عبادت یا پیشوا پرستی میں مبتلا تھے تو ہمارے یہاں اسی کا متبادل پیر پرستی کی شکل میں موجود ہے۔ ہمارے احباب نے اپنے پیروں اور وَلیوں کو ''خدائی'' اختیارات سونپ رکھے ہیں اور ان کی قبروں کی پرستش کی جاتی ہے۔ علامہ اقبال رحمہ اللہ نے اپنی قوم کی اس پتلی حالت کے پیشِ نظر اللہ کے حضور دست بہ دُعا ہو کر کہا تھا: ؎

عطا کر دے انھیں یا رب بصارت بھی بصیرت بھی
مسلماں جاکے لٹتے ہیں سوادِ خانقاہی میں

حقیقت یہی ہے کہ کم ازکم عقیدۂ توحید تو ہم خانقاہوں ہی پر جاکے لٹا رہے ہیں۔ نذریں ان

کے لیے مانی جاتی ہیں، جبکہ غیر اللہ کے نام کی نذر ماننا شرک ہے۔ قبروں کا طواف کیا جاتا ہے، مزاروں پر جانور ذبح کیے جاتے ہیں، قسمیں انہی کی کھائی جاتی ہیں اور مشکل کے وقت فریاد انہی سے کی جاتی ہے، جبکہ یہ تمام شرکیہ اُمور ہیں۔[1]

جہاں شرک آ گیا، وہاں سے توحید کی دولت اُٹھ گئی اور جو گوہرِ توحید سے تہی دست ہوگیا، وہ سمجھ لے کہ اس کا سبھی کچھ لُٹ گیا۔

3 بے پردگی اور مَرد وزَن میں اختلاط:

اس خالص دینی پہلو کی مختصر روئیداد کے بعد اب دیگر شعبوں پر بھی سرسری نظر ڈال لیں۔ کفّار نے اپنے تعلیمی، تجارتی اور حکومتی اداروں میں مَردوزن کے بے حجاب اختلاط اور میل جول کو رواج دیا، جو اب ہمارے یہاں بھی ہے۔ انھوں نے کو ایجوکیشن یا مخلوط تعلیم شُروع کی، ہم نے بھی کر دی، ان کی عورتوں سے بے پردگی مسلمان عورتوں میں بھی آ چکی ہے۔ یہُودی اور دیگر غیر مسلم عورتیں پتلونیں اور شرٹیں پہن کر بے پَردہ بازار میں نکلتی ہیں۔ یہ عادت حوّا کی مسلمان بیٹی میں بھی آ گئی ہے۔ وہ مِنی سکرٹ پہنتی ہیں تو یہ اب یہاں بھی مقبول ہو رہی ہے۔

ہندو مرد اپنے انداز کا تہبند باندھتے آ رہے ہیں، جس کا نچلا درمیانی حصہ پکڑ کر وہ لوگ اسے اِزار بند کی جگہ سے باندھ دیتے ہیں۔ اب اسی سے مِلتی جلتی شلوار قمیص (دھوتی کُرتی) مسلم عورتوں میں بھی رواج پا رہی ہے۔ الغرض فیشن یا نقّالی کی بھی کوئی حد ہے کہ اب اگر آپ کسی کو ذاتی طور پر جانتے نہیں ہیں تو مسلم و غیر مسلم کا فرق نہیں کر سکیں گے۔

4 کھانا کھانے کا حیوانی انداز:

مغرب کے یہُود و نصاریٰ نے ٹیبلوں کے گِرد گھُومتے پھرتے اور کھڑے کھڑے کھانا کھانے کا حیوانی انداز اپنایا، جسے بفے سِسٹم کہا جاتا ہے، حالانکہ اسے بفیلو سِسٹم کہا جانا چاہیے تھا۔ مغرب کے ذہنی غلاموں نے اپنے یورپی آقاؤں کے اس ''دین'' کو بھی بہ صد احسان قبول کیا ہوا ہے!!

---

[1] ان امور کی تفصیلات بادلائل ہم اپنی کتاب ''قبولیتِ عمل کی شرائط'' کے ضمن میں ذکر کر چکے ہیں۔ اور یہ کتاب پاکستان اور اب ہندوستان میں بھی چھپ چکی ہے۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ عَلٰى ذٰلِكَ.

5 بائیں ہاتھ سے کھانا کھانا:

یہودی نے دیکھا کہ مسلمانوں کا نبی (ﷺ) دائیں ہاتھ سے کھانے اور پینے کی تعلیم دیتا ہے اور بائیں ہاتھ سے خور ونوش کو شیطان کی صفت قرار دیتا ہے، جیسا کہ صحیح مسلم، سنن ابی داود اور ترمذی میں ارشادِ رسالت مآب ﷺ ہے:

« إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَأْكُلْ بِيَمِينِهِ، وَإِذَا شَرِبَ فَلْيَشْرَبْ بِيَمِينِهِ، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَأْكُلُ بِشِمَالِهِ وَيَشْرَبُ بِشِمَالِهِ »[1]

''تم میں سے جب کوئی کھائے تو دائیں ہاتھ سے کھائے اور جب پیے تو دائیں ہاتھ سے پیے، کیوں کہ شیطان بائیں ہاتھ سے کھاتا اور بائیں ہی سے پیتا ہے۔''

جب یہودی نے دیکھا کہ مسلمانوں کے رسول (ﷺ) نے بائیں ہاتھ سے کھانے اور پینے کو شیطانی فعل قرار دیا ہے تو اس نے ایسی ایسی چالیں چلیں کہ مسلمان شیطانی فعل کا ارتکاب بھی کرے اور اسے محسوس بھی نہ ہو۔

آپ ذرا چُھری کانٹے سے کھانا کھانے والوں کو دیکھ لیں، ایک چیز کو دائیں ہاتھ سے کاٹیں گے تو بائیں ہاتھ سے کھالیں گے۔ ایک چیز دائیں سے پکڑ کر مُنہ تک پہنچائیں گے تو دوسری کو بائیں کے ذریعے سے نوالہ بنالیں گے۔ بائیں ہاتھ میں گلاس لے کر پانی پینا عام مشاہدے میں آتا رہتا ہے۔[2]

بعض چائے پینے والوں کو بھی دیکھ لیں جو لوگ کپ اور پرچ استعمال کرتے ہیں، ان کے دائیں ہاتھ میں کپ ہوتا ہے، جس سے چائے انڈیلتے ہیں اور بائیں ہاتھ میں پرچ ہوتی ہے، جس سے پیتے ہیں۔ إلَّا ماشآءَ الله.

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (١٣/ ١٩١) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٠٩) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٧٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٢٦٦) كذا في بلوغ المرام و حاشيه الدهلوي عليه (٢/ ٣٦٦ و ٣٦٧) صحيح الجامع (٣٨٤) السلسلة الصحيحة (١٢٣٦) الموطأ مع شرحه المسوىٰ (١٥٤٥) طبع دار الكتب العلمية.

[2] بائیں ہاتھ پر گھڑی باندھنا بھی یہودی چال ہی معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم
ورنہ چاہیے تو یہ تھا کہ گھڑی دائیں ہاتھ کی کلائی پر باندھی جاتی اور انگوٹھی بھی دائیں ہاتھ کی انگلی میں ہی پہنی جاتی اور معروف سنتِ رسول ﷺ کا تقاضا بھی یہی ہے۔ (ارشاد الحق)

6 کتّے پالنے کا رواج:

کفّار نے چھوٹی نسل کے کُتے پالنے کو رواج دیا، انھیں اپنے ساتھ کھلایا پلایا، چُوما چاٹا، گدّوں پر سلایا اور اُن کا شادی بیاہ بھی کیا۔[1] مسلمانوں نے بھی آج ثابت کردیا ہے کہ ہم بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ حالاں کہ صحیح بخاری و مسلم میں مذکور ارشادِ رسالت مآب ﷺ کی رُو سے جس گھر میں کُتا اور کسی بھی جاندار کی تصویر لگی ہو، وہاں فرشتۂ رحمت داخل نہیں ہوتا۔ چنانچہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«لَا تَدْخُلُ الْمَلآئِكَةُ بَيْتاً فِيهِ كَلْبٌ وَلَا صُورَةٌ»[2]

''فرشتے کسی ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے، جس میں کتا یا تصویر ہو۔''

---

[1] لاہور سے شائع ہونے والے سات مارچ ۱۹۸۹ء کے روزنامہ جنگ میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ''ترقی یافتہ یورپی معاشرہ'' ۲۱ سالہ نوجوان نے اپنی کتیا سے شادی رچا لی۔ جس کا متن من وعن نقل کیا:

''لاہور (نیوز ڈیسک) یورپ کے ترقی یافتہ معاشرے میں ایک ۲۱ سالہ نوجوان نے اپنی کتیا سے شادی رچا لی، دولہا کا نام ''مارک شیڈ'' اور دلہن جو اعلیٰ نسل کی کتیا ہے کا نام ''میکسی'' ہے۔ شادی کے دن مارک سیاہ رنگ کے سوٹ میں ملبوس اونچا ہَیٹ پہنے ہوئے تھا، جب کہ اس نے اپنی بیوی (کتیا) کے گلے میں سفید رنگ کی پٹی ڈال رکھی تھی۔ شادی کی تقریب میں ۶۰ مہمانوں نے شرکت کی۔

مارک نے شادی کے بعد کتیا سے کہا کہ بے شک تم کتیا ہو، لیکن میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ مارک جو آرٹس اور ڈیزائن کا طالب علم ہے، اس نے کہا کہ میں اپنی بیوی کی اتنی خدمت کروں گا، جتنی ایک خاوند اپنی اپنی بیوی کی کرتا ہے۔

ایک انگریزی جریدہ کے مطابق شادی کی دوسری تقریب مارک کے گھر کے واقع آکسفورڈ اسپکس میں ہوئی، جس میں مارک کی والدہ دو بہنوں اور ایک بھائی نے مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ جب کتیا سے پوچھا گیا کہ کیا وہ مارک کو بحیثیت خاوند قبول کرتی ہے تو ''میسکی'' نے جواباً اپنا سر زمین پر جھکا لیا۔ جس پر تمام مہمانوں نے خوشی سے ناچنا اور گانا شروع کر دیا۔ اِدھر مارک کے کالج کے پرنسپل نے اپنے ہونہار شاگرد کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا کہ یہ دونسلوں کے درمیان بہترین رابطہ ہے۔ بتایا گیا ہے کہ مارک اپنی دلہن کے ساتھ ہَنی مون منانے کے لیے ایک جزیرے پر چلا گیا ہے، یہ خبر کسی تبصرے یا تجزیے کی محتاج نہیں۔ بس مغرب کی اندھی تقلید کرنے والوں کو غور وفکر سے کام لینا چاہیے۔ (ارشاد)

[2] مختصر صحيح البخاري للألباني، رقم الحديث (١٣٩٠) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٩٩) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٤٨۔ ٢٢٤٩) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٩٤٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٦٤٩) دیکھیں: تطهير المجتمعات (ص: ٢٣٤۔ ٢٣٥)

سنن ابی داود کی روایت میں «وَلَا جُنُبٌ»[1] کے الفاظ بھی موجود ہیں کہ ''جس گھر میں جنبی رہتا ہو اُس میں بھی فرشتے داخل نہیں ہوتے۔''

امام خطابی رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''فرشتوں سے برکت و رحمت کے فرشتے مُراد ہیں، محافظ نہیں، کیوں کہ وہ تو ہر حال میں بندوں کے ساتھ ہی رہتے ہیں، وہ جنبی ہو یا غیر جنبی۔''[2]

ہمارا حال آج یہ ہے کہ ہمارے یہاں کمروں کی دیواروں پر تصویریں آویزاں ہیں اور بیگم یا صاحب کی گود میں کُتا بھی کھیل رہا ہوتا ہے۔ شاید دولت زیادہ ہوجانے کی وجہ سے وہ فرشتۂ رحمت کی آمد ضروری نہیں سمجھتے!!

7 یہُود و نصاریٰ کی پَیروی:

اس بارے میں ہم بس چند ارشاداتِ رسالت مآب ﷺ پر ہی اکتفا کریں گے۔ چنانچہ صحیح بخاری کی حدیث میں نبی کریم ﷺ نے سچ ہی فرمایا ہے کہ اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی، جب تک میری امت گذشتہ قوموں کی ہُو بہُو پیروی نہ کرے گی۔

1 بخاری شریف کی اس حدیث کے مکمّل الفاظ یہ ہیں:

«لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتَّى تَأْخُذَ أُمَّتِي بِأَخْذِ الْقُرُوْنِ قَبْلَهَا شِبْراً بِشِبْرٍ وَذِرَاعاً بِذِرَاعٍ، فَقِيْلَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ (ﷺ) كَفَارِسٍ وَرُوْم؟ فَقَالَ: وَمَنِ النَّاسُ إِلَّا أُوْلَئِكَ»[3]

''اس وقت تک قیامت نہیں آئے گی، جب تک میری امّت گذشتہ قوموں کی ایک ایک بالشت اور ایک ایک ہاتھ، یعنی ہُو بہُو پَیروی نہ کرے گی۔ عرض کی گئی: اے اللہ

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٥٢)

[2] جنبی سے مراد وہ شخص ہے، جو حالتِ جنابت میں غسل نہ کرے یا عادتاً اسے طویل مدت تک لیٹ کردے۔ رہا، وہ جنبی جو نماز کا وقت ہونے تک غسل میں تاخیر کرتا ہے۔ تو وہ یہاں مُراد نہیں ہے، کیونکہ نماز تک تاخیر کرنا تو خود نبی کریم ﷺ سے ثابت ہے۔ (الكبائر للذهبي ص ١٩٨) اور یہی بات علامہ ہیتمی نے بھی کہی ہے۔ دیکھیں: الزواجر (٢/ ٣٣۔ ٣٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٢٦٢)

[3] التجريد الصريح (٢/ ١٧٣) صحيح الجامع الصغير، رقم الحديث (٧٤٠٨)

کے رسول! (ﷺ) کیا ایران و روم کی طرح؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ نہیں تو اور کون لوگ ہیں؟''

2 ایسے ہی ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ شِبْراً بِشِبْرٍ، وَذِرَاعاً بِذِرَاعٍ حَتّٰى لَوْ دَخَلُوْا فِيْ جُحْرِ ضَبٍّ لَا تَّبَعْتُمُوْهُمْ. قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَلْيَهُوْدُ وَالنَّصَارىٰ؟ قَالَ فَمَنْ؟»[1]

''تم اپنے سے پہلے گزری ہوئی قوموں کی ایک ایک بالشت اور ایک ایک ہاتھ یعنی ہو بہو پیروی کرو گے۔ یہاں تک کہ اگر وہ کسی گوہ کے سوراخ (بل) میں گھسے ہوں گے تو تم بھی ان کے پیچھے ہی چل پڑو گے۔ ہم (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) نے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا آپ ﷺ کی مراد یہود ونصاریٰ ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اور کون؟''

3 ایک اور حدیث میں ہے:

«لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى تَعْبُدَ قَبَائِلُ مِنْ أُمَّتِيَ الْأَوْثَانَ»[2]

''اس وقت تک قیامت قائم نہیں ہوگی، جب تک کہ میری امّت کے لوگ گروہ در گروہ بتوں کی پرستش نہ کرنے لگیں گے۔''

4 ترمذی شریف اور مستدرک حاکم میں ارشادِ رسالت مآب ﷺ ہے:

«لَتَأْتِيَنَّ عَلٰى أُمَّتِيْ مَا أَتٰى عَلٰى بَنِيْ إِسْرَائِيْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ حَتّٰى إِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ أَتٰى أُمَّهٗ عَلَانِيَةً لَكَانَ فِيْ أُمَّتِيْ مَنْ يَّصْنَعُ ذٰلِكَ»[3]

''میری اُمت پر بھی ہو بہو وہ وقت آئے گا، جیسا کہ بنی اسرائیل پر آیا تھا۔ یہاں تک کہ ان میں سے اگر کسی نے اپنی ماں کے ساتھ کھلے عام بدکاری کی تو میری اُمت میں سے بھی بعض ایسا ہی کریں گے۔''

---

[1] مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (٢٠٠٢) صحيح الجامع الصغير، رقم الحديث (٥٠٦٣)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٧٧)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤١) المستدرك للحاكم (١/ ١٢٩)

ان ارشاداتِ نبویہ ﷺ کو پڑھیں اور پھر ہم اپنا جائزہ لیں کہ ہم کدھر اور کہاں جا رہے ہیں؟ ہمارا حال تو یہ ہے کہ یہُود و نصاریٰ کی پیروی میں کیے گئے ان افعال کو (جو پیچھے ذکر کیے گئے ہیں) کسی نہ کسی طرح جائز قرار دینے کے لیے سَو الٹی سِیدھی دلیلیں تراشی جاتی ہیں۔ بہ قولِ اقبال: ؎

آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق
خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں

حیوانات اور پرندوں کا جُھوٹا

بنی آدم میں سے مُسلم و غیر مُسلم اور غیر مسلموں میں اہلِ کتاب یہُود و نصاریٰ اور غیر اہلِ کتاب کفّار و مُشرکین کے جُھوٹے کے بارے میں تین اقوال، ان کے دلائل اور جائزہ، پھر کفّار و مسلمین کے باہمی تعلّقات کے اس موضوع کے آخر میں اب آیئے دیکھیں کہ حیوانوں اور پرندوں کے جُھوٹے کا کیا حکم ہے؟

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ حیوانات اور پرندے دو قِسموں کے ہوتے ہیں:

ا۔ ایک وُہ جو ماکول اللحم ہیں کہ جن کا گوشت حلال اور کھایا جاتا ہے۔ مثلاً بھیڑ، بکری، گائے، بھینس اور اونٹ وغیرہ اور پرندوں میں سے چڑیا، کبوتر اور مرغی وغیرہ۔

ب۔ دوسرے وہ جن کا گوشت نہیں کھایا جاتا، جیسے گدھا، خچر اور چیل وغیرہ۔

(1) حلال جانوروں کا جُھوٹا:

ان میں سے پہلی قِسم کے جو جانور اور پرندے ہیں، ان کا جھوٹا تو تمام ائمہ وفقہا کے نزدیک بالاتفاق پاک و طاہر اور مطہّر ہے اور ان کے جُھوٹے سے غسل و وضو کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ امام ابن المنذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"أَجْمَعَ أَهْلُ الْعِلْمِ عَلَىٰ أَنَّ سُؤْرَ مَا يُؤْكَلُ لَحْمُهٗ يَجُوْزُ شُرْبُهٗ وَالْوُضُوْءُ بِهٖ"[1]

''اہلِ علم کا اس پر اجماع ہے کہ جن (جانوروں اور پرندوں) کا گوشت کھایا جاتا ہے، ان کا جُھوٹا پاک ہے، جسے پیا جاسکتا ہے اور اُس سے وضو بھی کیا جاسکتا ہے۔''

امام ابنِ حزم رحمہ اللہ ''المحلّٰی'' میں لکھتے ہیں:

"كُلُّ مَا يُؤْكَلُ لَحْمُهٗ فَلَا خِلَافَ فِيْ أَنَّهٗ طَاهِرٌ"

[1] بحواله المغني لابنِ قدامة (١/ ٧٠)

''ہر وہ جانور جس کا گوشت کھایا جاتا ہے، اس کے طاہر ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔''

سورۃ الاعراف (آیت: ۱۵۷) میں نبی کریم ﷺ کے بارے میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ﴾

''اور آپ (ﷺ) ان کے لیے تمام پاکیزہ چیزیں حلال کرتے ہیں اور خبیث و ناپاک چیزیں ان پر حرام کرتے ہیں۔''

تھوڑا آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

"فَكُلُّ حَلَالٍ هُوَ طَيِّبٌ، وَالطَّيِّبُ لَا يَكُوْنُ نَجِساً بَلْ هُوَ طَاهِرٌ"[1]

''ہر حلال چیز پاکیزہ ہے اور پاکیزہ نجس نہیں ہوتی، بلکہ طاہر ہوتی ہے۔''

یہ تو متّفق علیہ اور اجماعی مسئلہ ہے۔[2]

2 دیگر جانوروں کا جُھوٹا:

دُوسری قِسم کے جانور اور پرندے وہ ہیں، جن کا گوشت نہیں کھایا جاتا، ان کے بارے میں اہلِ علم کے دو قول ہیں:

پہلا قول:

پہلا قول یہ ہے کہ (خنزیر اور کُتّے کے جُھوٹے کو چھوڑ کر) خچر، گدھے، جنگلی جانوروں یا درِندوں اور شکاری پرندوں کا جھوٹا بھی پاک ہوتا ہے اور وہ طاہر ہی نہیں بلکہ مطہّر بھی ہے۔

1. اس کی پہلی دلیل مسندِ امام شافعی، سنن دارقطنی اور معرفۃ السنن والآثار بیہقی کی وہ حدیث ہے، جس میں مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ سے پُوچھا گیا:

«أَنَتَوَضَّأُ بِمَا أَفْضَلَتِ الْحُمُرُ؟»

---

[1] المحلی لابنِ حزم (۱/ ۱۲۹)

[2] لیکن جلاّلہ کے بارے میں اختلاف ہے اور جلاّلہ اس حلال جانور (مرغی۔ بھیڑ وغیرہ) کو کہا جاتا ہے، جس کی غالب غذا نجاست ہو، اسے بعض نے نجس اور بعض نے طاہر قرار دیا ہے۔ (المغني: ۱/ ۷۰) اور صحیح یہی ہے کہ یہ طاہر ہے۔ البتہ اسے ذبح کرنے سے چند دن پہلے باندھ کر رکھا جائے اور پاکیزہ چارہ، دانا دیا جائے اور یہ بھی تب ہے، جبکہ نجاست خوری سے اس کے گوشت کے بدبودار ہو چکنے کا خدشہ ہو اور اگر ایسا نہ ہو تو پھر اسے بغیر باندھے رکھ کر ذبح کیا جاسکتا ہے۔

''کیا ہم گدھوں کے بچے ہُوئے (جُھوٹے) پانی سے وضو کرلیا کریں؟''

«قَالَ: نَعَمْ، وَبِمَا أَفْضَلَتِ السِّبَاعُ كُلُّهَا»[1]

''فرمایا: ہاں اور دُوسرے تمام جنگلی جانوروں کے جُھوٹے سے بھی۔''

امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی اسانید اتنی ہیں کہ اگر ان کو ملایا جائے تو وہ کافی قوّت اختیار کرجاتی ہیں۔

② دُوسری دلیل سنن دارقطنی کی وہ حدیث ہے، جس میں مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر میں تھے کہ راستے میں ایک آدمی کو ایک بڑے حوض پر بیٹھے پایا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس شخص سے پوچھا:

«أَوَلَغَتِ السِّبَاعُ عَلَيْكَ اللَّيْلَةَ فِيْ مِقْرَاتِكَ؟»

''کیا رات کے وقت جنگلی جانوروں نے تیرے حوض میں مُنہ ڈالا ہے؟''

تو حوض والے شخص سے فرمایا:

«يَا صَاحِبَ الْمِقْرَاةِ! لَا تُخْبِرْهُ، هٰذَا مُتَكَلِّفٌ، لَهَا مَا حَمَلَتْ فِيْ بُطُوْنِهَا، وَلَنَا مَا بَقِيَ شَرَابٌ وَطَهُوْرٌ»[2]

''اے حوض والے! اس کو کچھ مت بتاؤ، یہ تکلّف سے کام لے رہا ہے۔ جنگلی جانور اپنے پیٹوں میں جو پانی لے گئے، وُہ ان کا ہوگیا اور جو بچ گیا، وہ ہمارے لیے پینے کا پانی ہے اور پاک کرنے والا (وضو کرنے کے لائق) ہے۔''

③ ان کی تیسری دلیل وہ اثرِ فارُوقی رضی اللہ عنہ ہے جو موطا امام مالک رحمہ اللہ میں مروی ہے، جس میں مذکور ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ایک قافلے کے ساتھ نکلے، جس میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما بھی تھے۔ ایک حوض پر پہنچے تو حضرت عُمر و رضی اللہ عنہ نے حوض والے سے پوچھا:

"هَلْ تَرِدُ حَوْضَكَ السِّبَاعُ؟"

---

[1] نیل الأوطار (١/ ٣٦) فقه السنّة (١/ ٢١) امام نووی اور شیخ البانی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ (تمام المنّة، ص ٤٧)

[2] اس حدیث کو حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ نے "التلخیص" میں، امام شوکانی رحمہ اللہ نے "السیل الجرار" میں، اور علامہ البانی نے بھی ضعیف قرار دیا ہے۔ (تمام المنّة، ص: ٤٨)

''کیا تمھارے اس حوض سے جنگلی درندے پانی پیتے ہیں؟''

تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''لَا تُخْبِرْنَا! فَإِنَّا نَرِدُ عَلَى السِّبَاعِ وَتَرِدُ عَلَيْنَا''[1]

''ہمیں کچھ مت بتاؤ، کیوں کہ ہم ان کے بعد پیتے ہیں اور وہ ہمارے بعد۔''[2]

حضرتِ فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد یقیناً نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگلی جانوروں کے جُھوٹے کے بارے میں پاک ہونے کا ذکر سن چکنے کی بنیاد پر ہوگا، کیونکہ سنن دارقطنی والی حدیث میں دورانِ سفر وہ بھی ساتھ تھے، بلکہ انھیں ہی ''تکلف سے کام لینے والا'' فرماتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حوض والے کو جنگلی جانوروں کی آمد ورفت کے بارے میں کچھ بتانے سے منع فرما دیا تھا اور ایسے حوض کے پانی کو پاک قرار دیا تھا۔

سنن دارقطنی کی حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حوض والے کو کچھ بتانے سے اس لیے منع فرما دیا تھا کہ اس کا فائدہ بھی کچھ نہیں، کیوں کہ جانور آئے ہوں یا نہ آئے ہوں، وہ پانی پاک ہے۔

④ چوتھی دلیل جو خچر اور گدھے کے بارے میں خاص ذکر کی گئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم ان کی سواری کیا کرتے تھے۔ اگر وہ نجس ہوتے اور ان کا پسینا و لعاب نجس ہوتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہوتا، مگر ایسا نہیں ہے۔

یہ امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کا مسلک ہے۔ حضرت عُمر اور جابر رضی اللہ عنہما سے اسی کی روایت ملتی ہے۔ تابعین رحمہم اللہ میں سے امام حسن بصری، عطا، زہری اور امام ابن المنذر رحمہم اللہ نے بھی ان کے جھوٹے کو استعمال میں لانے اور اس سے وضو کرنے کی اجازت دی ہے۔[3]

دُوسرا قول:

ان کے بارے میں دُوسرا قول یہ ہے کہ ان کا جُھوٹا ناپاک ہے۔ ایک روایت کے مطابق اگر صرف ان جانوروں کا جھُوٹا پانی ہی موجود ہو اور اس سے وضو کرے تو ساتھ ہی تیمّم بھی کرلے۔ یہ ایک روایت میں امام ابو حنیفہ، ایک روایت میں امام احمد سے اور سفیان ثوری رحمہم اللہ سے منقول ہے۔

---

[1] یہ اثرِ فاروقی رضی اللہ عنہ بھی ضعیف ہے۔ تمام المنة (ص: ٢٩)

[2] موطأ الإمام مالك مع شرحه المسوىٰ (١/ ٩٣۔ ٩٤)

[3] المغني (١/ ٦٦۔ ٦٧)

امام ابنِ قدامہ ان ائمہ کا یہ مسلک اور امام احمد کی دُوسری روایت، اسی طرح امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے دوسری روایت ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان جانوروں کا جھوٹا ان حضرات کے نزدیک بھی نجس اور ناپاک نہیں بلکہ پاک ہی تھا، ورنہ اس سے وضو کرنے کی اجازت ہی نہ ہوتی، صرف تیمّم ہی کا کہتے۔“

بہر حال ان کا استدلال سننِ اربعہ، مسندِ احمد، مسند شافعی، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، مستدرک حاکم، سنن دارقطنی اور بیہقی کی اس حدیث سے ہے، جس میں مروی ہے:

«إِذَا كَانَ الْمَاءُ قُلَّتَيْنِ لَمْ يَحْمِلِ الْخَبَثَ»[1]

”اگر پانی دو مٹکے ہو جائے تو وہ پلیدی نہیں اٹھاتا (نجس نہیں ہوتا۔)“

اس سے وہ یوں استدلال کرتے ہیں کہ اگر ان کا جُھوٹا ناپاک ہوتا تو پھر آپ ﷺ دو مٹکوں کی تحدید نہ فرماتے۔ قول اوّل کے دلائل کے طور پر ذکر کی گئی احادیث کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ آپ ﷺ نے ان حوضوں کے پانی کو اس لیے پاک قرار دیا ہے کہ وہ زیادہ مقدار میں تھا۔

ان دونوں اقوال اور خصوصاً قولِ اوّل کے دلائل آپ کے سامنے ہیں، جب کہ حضرت عبداللہ بن عُمر رضی اللہ عنہما اور امام حسن بصری، ابن سیرین، شعبی، اوزاعی، حماد اور اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ گدھے کے جُھوٹے کو ناپاک نہیں سمجھتے تھے، البتہ اسے مکروہ قرار دیتے تھے۔[2]

امام ابن قدامہ رحمہ اللہ معروف حنبلی ہیں، مگر ان کے اجتہاد اور اتباعِ سنت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے ”المغني“ میں اپنے امام کی دو روایتیں نقل کرنے کے باوجود لکھا ہے:

«وَالصَّحِيحُ عِنْدِيْ: طَهَارَةُ الْبَغْلِ وَالْحِمَارِ، لِأَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَرْكَبُهُمَا، وَتُرْكَبُ فِيْ زَمَنِهٖ، وَفِيْ عَصْرِ الصَّحَابَةِ فَلَوْ كَانَ نَجِساً لَبَيَّنَ النَّبِيُّ ﷺ

---

[1] الفتح الرباني (١/ ٢١٦) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٨) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٥٧) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥١٧) الموارد، رقم الحديث (١١٧) المنتقى مع النيل (١/ ٢٠)

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیے: المغني (١/ ٦٦/ ٦٩)

ذَلِكَ لِأَنَّهُمَا مِمَّا لَا يُمْكِنُ التَّحَرُّزُ مِنْهُمَا لِمُقْتَنِيهِمَا فَأَشْبَهَ السِّنَّوْرَ»[1]

''میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ خچر اور گدھے کا جُھوٹا پانی پاک ہے، اس لیے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ان پر سواری فرمائی ہے، نیز آپ ﷺ کے زمانے اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دَور میں ان پر سواری کی جاتی تھی۔ اگر وہ نجس ہوتے تو نبیِ کریم ﷺ یہ ضرور بتا دیتے، کیوں کہ ان دونوں (کے پسینے) سے بچنا ممکن ہی نہیں ہے۔ پس یہ بلّی کے مشابہ ہیں۔''

3 بلّی کا جُھوٹا:

بلّی جو نہ تو ماکول اللحم ہے اور نہ جنگلی ہی، بلکہ گھر میں عام پایا جانے والا جانور ہے، اس کے گھروں میں بکثرت پائے جانے کی وجہ سے نبیِ اکرم ﷺ نے اسے گھر میں کام کاج کرنے والے خادموں سے تشبیہ دی ہے اور اس کا جُھوٹا پاک قرار دیا ہے۔

چنانچہ ایک حدیث سنن ابی داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، مسندِ احمد اور مسندِ شافعی، موطا امام مالک اور سنن بیہقی میں مروی ہے، جسے امام بخاری، عقیلی، ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم اور دارقطنی رحمہم اللہ نے صحیح قرار دیا ہے کہ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کی بہو کبشہ بنت کعب بن مالک بیان کرتی ہیں کہ (ان کے سُسر) حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ ان کے یہاں تشریف لائے تو انھوں نے ان کے لیے وُضو کا پانی ڈالا۔ اتنے میں ایک بلّی آئی اور اس پانی سے پینے لگی۔ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ نے برتن اس بلّی کی طرف ٹیڑھا کر دیا، یہاں تک کہ اس نے پانی پی لیا۔ کبشہ کہتی ہیں کہ جب انھوں نے مجھے تعجب سے دیکھتے ہوئے پایا تو کہنے لگے: ''اے میری بھتیجی! کیا تمھیں اس چیز پر تعجب ہو رہا ہے؟'' میں نے کہا: ہاں! تو انھوں نے کہا کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا ہے:

«إِنَّهَا لَيْسَتْ بِنَجَسٍ، إِنَّهَا مِنَ الطَّوَّافِينَ عَلَيْكُمْ وَالطَّوَّافَاتِ»[2]

---

[1] المغني لابن قدامة (١/ ٦٨)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٨) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٠) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٦ و ٣٢٩) سنن ابنِ ماجه، رقم الحديث (٣٦٧) المنتقى مع النيل (١/ ٣٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٤٣٧)

”یہ بِلّی نجس نہیں ہے، کیوں کہ یہ تو ان (خادم مَردوں اور عورتوں) میں سے ہے، جو ہر وقت تمھارے پاس آتے جاتے رہتے ہیں۔“

سنن ابی داود و دارقطنی میں اس بات کی تائید دیگر روایات سے بھی ہوتی ہے، مگر وہ متکلّم فیہ ہیں اور ان سے قطع نظر بھی کرلی جائے تو اس مذکورہ صحیح حدیث ہی سے پتا چل جاتا ہے کہ بِلّی نجس نہیں اور اس کا جُھوٹا بھی ناپاک نہیں، بلکہ طاہر ومطہّر ہے، جس سے غسل اور وضو کرنا جائز ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے بِلّی کے جُھوٹے کو ناپاک تو قرار نہیں دیا، البتہ مکروہ کہا ہے، ان کا استدلال مسند احمد اور دارقطنی، مستدرکِ حاکم اور سنن بیہقی کی ایک روایت سے ہے، جس میں بِلّی کو درندہ «اَلسِّنَّوْرُ سَبُعٌ» کہا گیا ہے کہ ”بلّی ایک درندہ ہے۔“ ان کے نزدیک درندے کا جھوٹا ناپاک ہوتا ہے، مگر بِلّی کے معاملے میں انھوں نے مزید تخفیف کی ہے اور اسے نجس تو نہیں، محض مکروہ کہا ہے، حالاں کہ کسی جانور کا محض درندہ ہونا اس کے جُھوٹے کے ناپاک یا مکرُوہ ہونے کو مستلزم نہیں ہوتا، کیوں کہ جو متکلم فیہ احادیث گزری ہیں، ان سے واضح ہوتا ہے کہ درندے کے جُھوٹے کو پاک قرار دیا گیا ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ محدّثینِ کرام رحمہم اللہ کے نزدیک بِلّی کو درندہ قرار دینے والی روایت متکلم فیہ اور ضعیف ہونے کی وجہ سے ناقابلِ استدلال ہے، حتیٰ کہ خود معروف حنفی محدّث امام زیلعی رحمہ اللہ نے ”نصب الرایة في تخریج أحادیث الهدایة“ میں اس حدیث کے طُرق ذکر کیے ہیں اور جس راوی عیسی بن میبّب پر تمام روایات کا انحصار ہے، اس پر کلام کیا ہے اور دیگر محدّثین نے بھی اسے ضعیف قرار دیا ہے۔[1] اگر بالفرض اسے صحیح اور قابلِ استدلال بھی مان لیا جائے، تب بھی کبشہ والی مذکورہ حدیث میں بلّی کی تخصیص کر دی گئی ہے کہ اس کا جُھوٹا پاک ہے۔[2]

امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ والی حدیث کو ”حسنٌ صحیحٌ“ کہا اور لکھا ہے کہ اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین، اکثر ائمہ، امام شافعی، احمد اور اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کا قول یہی ہے کہ بلی کے جُھوٹے میں کوئی حرج نہیں، اس موضوع کے بارے میں صحیح ترین حدیث یہی

---

[1] بحواله تحفة الأحوذي (١/ ٣١٠) المنتقى مع النيل (١/ ٣٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٤٣٧)

[2] نيل الأوطار (١/ ٣٦)

حدیثِ ابی قتادہ رضی اللہ عنہ ہے۔ امام مالک نے بھی اس حدیث کو جیّد کہا اور اسے دیگر تمام محدثین سے کامل ترنص سے ذکر کیا ہے۔[1]

امام مالک رحمہ اللہ اور دیگر اہلِ مدینہ، لیث اور دیگر اہلِ مصر، اوزاعی اور دیگر اہلِ شام، ثوری اور دیگر اہلِ عراق: ابو یوسف، محمد، ابو ثور، ابو عبید، علقمہ، ابراہیم نخعی اور عطا اور حسن بصری رحمہم اللہ بھی بلّی کے جُھوٹے کو پاک کہتے ہیں۔[2]

حافظ ابو عُمر ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ متنازع فیہ اور اختلافی مسائل میں حجت صرف سنتِ رسُول صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوسکتی ہے اور بلی کے جھوٹے کے پاک ہونے کے بارے میں صحیح حدیث وسنت ثابت ہوچکی ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے سوا تمام فقہاے امصار کا اسی حدیث پر اعتماد ہے۔ امام صاحب موصوف کو غالبًا یہ حدیث نہیں پہنچی ہوگی اور کُتّے کے جُھوٹے والی حدیث پہنچ گئی ہوگی تو انھوں نے اُسے بھی اُسی پر قیاس کیا ہوگا، جب کہ حدیث وسنتِ رسُول صلی اللہ علیہ وسلم میں کتے اور بلّی کا فرق واضح ہو چکا ہے۔[3]

امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ جمہور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فقہاے امصار رحمہم اللہ اور حجاز وعراق میں رہنے والے تمام تابعین کا یہی مسلک ہے کہ بلّی کا جُھوٹا پاک ہے اور اس سے وضو کر لینے میں کوئی حرج نہیں، جیسا کہ موطا امام مالک اور دیگر کتبِ حدیث میں حدیثِ ابی قتادہ رضی اللہ عنہ سے پتا چلتا ہے۔[4]

ایک روایت میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں: ''جب کتا کسی برتن میں منہ ڈال جائے تو اسے سات مرتبہ دھولو اور اگر بلّی منہ ڈال جائے، تو اسے ایک مرتبہ دھولو۔''

اس روایت میں جو بلّی کے منہ ڈالنے سے ایک مرتبہ دھونے کا ذکر آیا ہے، وہ الفاظ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں، بلکہ یہ الفاظ مُدرج ہیں۔ مُدرج اُن الفاظ کو کہا جاتا ہے، جو کسی راوی کی طرف سے روایت میں درج ہو جائیں۔ ممتاز حنفی عالم حضرت ملا علی قاری رحمہ اللہ نے ''مرقاۃ شرح مشکاۃ''

---

[1] سنن الترمذي مع التحفة (١/ ٣١٠۔ ٣٢١)

[2] بحواله تحفة الأحوذي (١/ ٣١٠)

[3] تفسیر القرطبي (٧/ ١٣/ ٤٧۔ ٤٨)

[4] تفسیر القرطبي (٧/ ١٣/ ٤٧)

میں لکھا ہے کہ امام بیہقی رحمہ اللہ وغیرہ نے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ بلّی کے منہ ڈالنے سے اس برتن کو ایک مرتبہ دھونے کے الفاظ مُدرج ہیں، نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں، بلکہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ہیں، مگر یہ بات امام طحاوی رحمہ اللہ سے مخفی رہ گئی، لہٰذا انھوں نے بلّی کے جھوٹے کو مکروہِ تحریمی قرار دے دیا۔

آگے علامہ قاری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''یہ جو لوگوں میں مشہور ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کپڑے کا وُہ حصّہ کاٹ ہی دیا تھا، جس پر بلّی سوگئی تھی۔ اس بات کی کوئی اصل نہیں (یعنی یہ بے اصل اور من گھڑت قصّہ ہے) اور رہا معاملہ بلّی کے درندہ ہونے کا تو یہ کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں، اس سلسلے میں جو روایت ہے، وہ ضعیف ہے اور بلّی کے نجس نہ ہونے کی صراحت کرنے والی احادیث کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔''[1]

علامہ علی قاری رحمہ اللہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ بلّی کے بارے میں ایک اور حدیث بھی مشہُور ہے، جس میں مروی ہے کہ ''بلّی سے محبت رکھنا ایمان کا حِصّہ ہے۔''

اس روایت کو بھی صنعانی اور دیگر جماعتِ محدّثین نے موضوع اور من گھڑت قرار دیا ہے۔[2]

یہ دونوں روایتیں بظاہر انتہا پسندوں کی گھڑی ہوئی ہیں۔ ایک نے بلّی سے نفرت میں تشدّد کا رویّہ اپنایا اور کپڑا کاٹنے والی حدیث گھڑ ماری اور دُوسرے نے بلّی سے محبت میں غلوّ کا رویّہ اختیار کیا، تو اس کی محبت کو جزوِ ایمان بنانے والی حدیث تراش دی، جب کہ نہ یہ صحیح ہے نہ وہ دُرست ہے۔ ہاں اتنا ہے کہ اہلِ علم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بلّی کو پانی پلانے، صحابی رضی اللہ عنہ کے پانی پلانے اور اس کے جُھوٹے سے وضو کرنے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بلّی کو دن رات گھروں میں آنے جانے والے خادموں جیسا قرار دینے والی احادیث و آثار سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بلّی رکھنا، اسے پالنا اور اس کی تربیّت کرنا جائز بلکہ مستحب ہے۔[3]

---

[1] بحواله تحفة الأحوذي (١/ ٣١١)

[2] تحفة الأحوذي (١/ ٣١٢)

[3] حواله سابقه.

4 خنزیر کا جھُوٹا، نجس اور ناپاک ہے:

خنزیر کے سلسلے میں تو کسی کا کوئی اختلاف نہیں کہ وہ نجسِ عین ہے اور اس کا جُھوٹا بھی نجس اور ناپاک ہے۔[1] لہٰذا اس کی تفصیل میں جانے کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں۔

ایک غلط افواہ:

البتہ یہاں ایک مشہُور ومعروف افواہ کی طرف اشارہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عموماً لوگ کہتے کہ خنزیر کا نام زبان پر نہیں لانا چاہیے، کیونکہ وہ نجسِ عین ہے اور اس کا نام زبان پر لانے سے اس شخص کی زبان چوبیس یا کتنے گھنٹے تک ناپاک رہتی ہے۔ یہ محض ایک گپ، پیدل خبر، بے اصل اور من گھڑت بات ہے۔قرآن وسنت سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ویسے بھی مومن ومسلمان مَرد وزن جب جنابت اور حیض ونفاس کے اوقات وایام میں بھی ناپاک نہیں ہوتے، جیسا کہ شروع کتاب میں مذکور صحاح وسنن کی احادیث سے ثابت ہے، تو پھر ایک نجس جانور کا نام لینے سے زبان کیسے ناپاک ہوجائے گی؟ مزید برآں قرآنِ کریم میں لفظِ خنزیر چار مقامات پر آیا ہے:

سورۃ البقرہ (آیت ۱۷۳) سورۃ المائدہ (آیت: ۳) سورۃ الانعام (آیت: ۱۴۵) سورۃ النحل (آیت: ۱۱۵) اور پانچویں مقام سورۃ المائدہ (آیت: ۶۰) میں اسی لفظ خنزیر کی جمع کا صیغہ خنازیر آیا ہے۔[2]

اگر خنزیر کہنے سے زبان ناپاک ہوتی ہوتو پھر قرآنِ کریم کی تلاوت کرنے والے کا کیا بنے گا؟ اسی طرح کتبِ احادیث میں سے صرف صحیح بخاری، سنن ابی داود، ترمذی، نسائی کی کتاب البیوع اور ابن ماجہ کی کتاب التجارات، سنن دارمی کی کتاب الاشربۃ، پھر صحیح بخاری شریف کی کتاب الانبیاء اور کتاب المظالم، صحیح مسلم کی کتاب المساقاۃ، کتاب الایمان، کتاب الشعر، کتاب القدر اور کتاب النکاح میں، سنن ترمذی کی کتاب اللباس اور کتاب الفتن میں، سنن ابی داود کی کتاب الصلاۃ، کتاب الادب، کتاب الاطعمۃ، کتاب الملاحم، کتاب الجهاد اور کتاب اللباس میں، سنن ابن ماجہ کی کتاب الادب، کتاب الفتن اور المقدمہ میں، موطا امام مالک کی کتاب الکلام، سنن دارمی کے مقدمہ اور

---

[1] بداية المجتهد للعلامه ابن رُشد (١/ ١٠٩)

[2] المعجم المفهرس لألفاظ القرآن الكريم (ص: ٢٤٦)

کتاب الاشربہ میں اور مسند احمد کے چونتیس مقامات پر متعدد احادیث آئی ہیں، جن میں لفظ خنزیر یا خنازیر موجود ہے۔[1]

اندازہ فرمایئے! اگر مذکورہ بے سروپا مسئلے کو مان لیا جائے تو معاملہ کہاں سے کہاں تک پہنچ جائے گا؟ مختصر یہ کہ خنزیر نجس عین ہے اور اس کا جھوٹا تو ناپاک ہے، مگر اس کا نام لینے سے زبان ہرگز ناپاک نہیں ہوتی۔

5 کُتّے کا جُھوٹا:

کُتے کے بارے میں صحاح وسُنن میں جتنی احادیث مروی ہیں، ان سب سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بھی نجس ہے اور اس کا جُھوٹا بھی ناپاک ہے، جیسا کہ صحیح بخاری ومسلم، سنن ابو داود ونسائی وترمذی اور موطا امام مالک میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مَروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِذَا شَرِبَ الْكَلْبُ فِيْ إِنَاءِ أَحَدِكُمْ فَلْيَغْسِلْهُ سَبْعَ مَرَّاتٍ»[2]

''جب تم میں سے کسی کے برتن سے کتا پانی پی جائے تو اُسے چاہیے کہ اس برتن کو سات مرتبہ دھوئے۔''

صحیح مسلم اور سنن نسائی میں مروی ہے:

«إِذَا وَلَغَ الْكَلْبُ فِيْ إِنَاءِ أَحَدِكُمْ فَلْيُرِقْهُ ثُمَّ لْيَغْسِلْهُ سَبْعَ مَرَّاتٍ»[3]

''اگر تم میں سے کِسی کے برتن میں کُتا منہ ڈال دے، تو اسے چاہیے کہ برتن والی چیز کو بہا (پھینک) دے اور پھر اس برتن کو سات مرتبہ دھوئے۔''

ایک روایت میں ہے:

«أُوْلَاهُنَّ بِالتُّرَابِ»[4]

---

[1] بحواله المعجم المفهرس لألفاظ الحديث (٢/ ٨٦)

[2] التجريد الصريح ٢٦/١، مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٨٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٤۔ ٦٥) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٧٩) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٢۔ ٦٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٦٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٢٧)

[3] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٨٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٨٤١) إرواء الغليل (٢٤)

[4] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٨٣) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٤) إرواء الغليل، رقم الحديث (١٦٧) صحيح الجامع، رقم الحديث (٨٤٣)

’’ان (سات مرتبہ میں) سے پہلی مرتبہ مٹی کے ساتھ (اس برتن کو مانجھے اور خوب صاف کرے)‘‘

سنن ترمذی میں ہے:

«أُولَاهُنَّ أَوْ أُخْرَاهُنَّ بِالتُّرَابِ»[1]

’’پہلی مرتبہ یا آخری مرتبہ مٹی سے صاف کرے۔‘‘

جب کہ صحیح مسلم، سنن ابی داود ونسائی، مسند احمد اور سنن دارمی میں یہ بھی مذکور ہے:

«وَعَفِّرُوْهُ الثَّامِنَةَ فِي التُّرَابِ»[2]

’’آٹھویں مرتبہ اسے مٹی سے مَل کر دھولو۔‘‘[3]

پہلی مرتبہ یا آخری مرتبہ یا ایک مرتبہ یا آٹھویں مرتبہ مٹی کے ساتھ دھونے والی احادیث میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یوں مطابقت پیدا کی ہے کہ کسی ایک مرتبہ دھونا تو مبہم ہے، جب کہ پہلی یا ساتویں مرتبہ معیّن ہے، لہٰذا ان میں سے کسی ایک کو اختیار کیا جاسکتا ہے اور ان میں سے بھی پہلی مرتبہ دھونے والی روایت اکثریت و احفظیت اور معنوی حیثیت سے راجح تر ہے۔[4] لہٰذا ایسے برتن کو پہلے مٹی مار کر دھو لینا چاہیے اور احادیث میں تو مٹی کے ساتھ دھونے ہی کا ذکر ہے۔

متحدہ عرب امارات کے سرکاری روزنامہ ’’الاتحاد‘‘ ۱۹۸۷ء میں ایک مضمون میں یہ انکشاف کیا گیا تھا کہ کتّے کے بیماریوں والے جراثیم مٹی کے علاوہ کسی دُوسری چیز سے بآسانی مرتے ہی نہیں ہیں۔[5]

سُبحان اللہ! طبِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو طبِ جدید بھی صحیح ثابت کر رہی ہے۔ ابو بکر خلال کے حوالے سے امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اگر مٹی کے بجائے اشنان، صابن یا چھلکا استعمال کر لیا جائے

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٥) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٧٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٨١١٦)

[2] مختصر صحيح مسلم، رقم الحديث (١١٩) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٧) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٦٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٨٤٠)

[3] سنن الترمذي مع التحفة (١/ ٣٠٠) جامع الأصول (٨/ ٣٦۔ ٣٧)

[4] فتح الباري (١/ ٢٧٦) ارواء الغليل (١/ ٦٢)

[5] روزنامه الاتحاد، أبو ظهبي.

تو بھی درست ہے۔[1] آج کل اس غرض کے لیے لیکوِڈ وغیرہ استعمال کیے جا سکتے ہیں، کیوں کہ یہ اشیا بھی جراثیم کا ازالہ کرنے والی اور مفیدِ مطلب ہیں۔

کُتّے کے جُھوٹے برتن کو سات مرتبہ دھونے کا حکم نجاست کی وجہ سے ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے بقول اس میں طبّی مصلحت بھی شامل ہے، کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زہریلے جانوروں کے زہر سے محفوظ رہنے کے لیے ہر صبح عجوہ کھجوروں کے کھانے میں بھی سات دانوں کے عدد کو ملحوظ رکھا ہے اور شدتِ مرض میں اپنے اوپر سات گھڑوں کا پانی ڈالنے کا فرمایا تھا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ طبّی طور پر بھی مفید ہے۔[2] کُتے کے جُھوٹے کو سات مرتبہ دھونے کا سختی سے حکم اس لیے فرمایا گیا کہ بقول علامہ احمد شاکر: ''طبِ جدید نے بھی یہ ثابت کر دیا ہے کہ کتّا اپنے لعاب میں بہت سی مہلک بیماریاں اٹھائے پھرتا ہے، جن سے بچنا ضروری ہے۔''[3]

وزارتِ اوقاف و امورِ اسلامیہ ابوظہبی سے جو ماہنامہ مجلّہ ''منار الاسلام'' شائع ہوتا ہے، اس (شمارہ ۷ بابت ماہ رجب ۱۴۰۶ھ) میں ایک ڈاکٹر کا تحقیقی مضمون شائع ہوا تھا، جس میں کُتّے کے لعاب سے پھیلنے والے امراض پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر موصوف نے لکھا تھا:

''اس مرض کے نتیجے میں انڈیا میں پندرہ ہزار سے زائد آدمی، سری لنکا میں ہر دس لاکھ میں سے تیس آدمی اور فلپائن میں ہر دس لاکھ میں سے بارہ آدمی سالانہ محض کُتّے کے لعاب سے پھیلنے والے امراض کی وجہ سے لقمۂ اجل بن رہے ہیں۔''[4]

مذکورہ احادیث کے پیشِ نظر جمہور اہلِ علم کا مسلک تو یہ ہے کہ کتّا نجس اور اس کا جھوٹا ناپاک ہے، مگر حضرت عکرمہ اور امام مالک رحمہ اللہ ایک روایت میں اسے طاہر قرار دیتے ہیں، جو شکاری اور غیر شکاری کتے کے فرق کی بنا پر ہے، مگر بظاہر احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اس نظریے کے خلاف ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ کی تبویب سے پتا چلتا ہے کہ ان کا رُجحان بھی کُتّے کے جھوٹے کے پاک

---

[1] المغني (١/ ٧٤)

[2] فتح الباري (١/ ٢٧٦)

[3] تحقيق المحلى لابن حزم (١/ ١٠٩۔ ١١٠)

[4] ماهنامه ''منار الإسلام أبي ظهبى'' (شماره: ٧، بابت: ٥، رجب١٤٠٦هـ)

ہونے کی طرف ہی ہے۔ جبکہ زیادہ صحیح وہی ہے جو جمہور کا مسلک ہے کہ کتّے کا جُھوٹا ناپاک ہے، جو سات مرتبہ دھونے کے حکم ہی سے معلوم ہو رہا ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک کتّے کے جھُوٹے کو سات مرتبہ دھونا ضُروری نہیں، بلکہ صرف تین مرتبہ دھو لینا ہی کافی ہے۔ مگر یہ تین مرتبہ والا قول حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا ہے اور قولِ رسُول صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کسی دُوسرے کا قول معتبر نہیں ہوتا۔[1] لہٰذا امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی یہ بات بھی حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف ہونے کی وجہ سے نا قابلِ عمل ہے۔

---

[1] تفصیل کے لیے محلی ابن حزم، فتح الباري، نيل الأوطار، المغني اور تحفة الأحوذي کا مطالعہ فرمائیں اور قولِ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ "نصب الراية" میں ملاحظہ فرمائیں۔

کپڑے، بدن یا جگہ کو پیشاب سے پاک کرنے کا طریقہ

مسائلِ طہارت سے قبل عموماً تطہیرِ نجاست کا موضوع کتبِ حدیث و فقہ میں ملتا ہے، جس میں نجس اشیا کو پاک کرنے کا طریقہ ذکر کیا گیا ہوتا ہے، مگر ہم طوالت سے بچنے کے لیے اس کی تفصیلات سے قطع نظر کر رہے ہیں۔ البتہ روز مرہ کے ضروری امور کی طرف اشارہ کیے بغیر گزر جانا بھی مناسب نہیں۔ لہٰذا اس سلسلے میں اختصار کے ساتھ عرض ہے کہ بنی آدم کا پیشاب و پاخانہ نجس ہیں اور ان کے ناپاک ہونے پر اہلِ علم کا اجماع ہے، جیسا کہ علامہ ابن رشد نے "بداية المجتهد" (۱/ ۱۰۹) میں ذکر کیا ہے۔

انسان مرد و زن، پیر و جوان اور بچوں سب کا حکم ایک ہی ہے۔ البتہ صرف شیر خوار لڑکے کے پیشاب کے بارے میں شریعتِ اسلامیہ میں کچھ تخفیف کی گئی ہے، جس کا اندازہ آیندہ تفصیل سے ہو جائے گا۔ کسی باشعور شخص سے تو یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ گھر کے کسی کمرے میں پیشاب کر دے، البتہ چھوٹی عمر کے بچوں سے اس بات کا امکان رہتا ہے، لہٰذا پیشاب کی نجاست دور کرنے کا طریقہ ذہن نشین کر لیں کہ کپڑے، بدن یا جس جگہ کوئی بچہ پیشاب کر دے تو اس جگہ پر پانی بہا دینے سے وہ پاک ہو جائے گی اور اس کے خشک ہو جانے پر اس جگہ پر نماز پڑھی جاسکتی ہے، چنانچہ صحیح بخاری، سننِ اربعہ اور مسندِ احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک اعرابی (دیہاتی) آیا اور مسجد نبوی کے صحن میں بیٹھ کر پیشاب کرنے لگا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسے پکڑنے اور روکنے کے لیے لپکے، مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں روکتے ہوئے فرمایا:

«دَعُوهُ وَأَرِيقُوا عَلَى بَوْلِهِ سِجْلًا مِّنْ مَآءٍ أَوْذَنُوباً مِّنْ مَّاءٍ، فَإِنَّمَا بُعِثْتُمْ مُيَسِّرِيْنَ وَلَمْ تُبْعَثُوا مُعَسِّرِيْنَ»[1]

[1] صحيح البخاري مترجم (۱/ ۱۹۱) صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (۲۲۰) صحيح مسلم مع ←

''اسے چھوڑ دو (اب پیشاب کرنے دو) اور اس کے پیشاب پر پانی کا ڈول بہا دو، تم آسانی کرنے والے بنا کر بھیجے گئے ہو، سختی کرنے والے نہیں۔''

سنن ابی داود، دارقطنی، دارمی اور سنن سعید بن منصور کی بعض روایتوں میں اس جگہ کو کھودنے کا بھی ذکر ملتا ہے، مگر وہ روایت متکلم فیہ، ضعیف اور ناقابلِ استدلال ہیں۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں ایک روایت کے الفاظ ہیں: «زَكَاةُ الْأَرْضِ يُبْسُهَا»

نیز مصنف عبدالرزاق میں ہے: «جَفَافُ الْأَرْضِ طُهُورُهَا»[1]

''زمین کا خشک ہو جانا ہی اس کا پاک ہو جانا ہے۔''

لیکن یہ الفاظ نبیِ اکرم ﷺ سے ثابت نہیں، لہٰذا مرفوع ہونے کے لحاظ سے یہ بے اصل ہیں اور سند کے اعتبار سے ضعیف اور ناقابلِ حجت، لہٰذا ایسی جگہ یا زمین کو پاک کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ اس پر پانی بہا دیا جائے، جیسا کہ مذکورہ حدیث سے پتا چلتا ہے۔ یہ واقعہ مذکورہ کتب کے علاوہ صحیح مسلم شریف میں بھی مذکور ہے، جس کے راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں، اس مسلم والی حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے بعد میں اس دیہاتی کو بلایا اور شفقت بھرے انداز سے اسے بتایا کہ مسجدیں اللہ کا ذکر کرنے، نمازیں پڑھنے اور تلاوت کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ ان میں پیشاب یا پاخانہ کرنا اچھا نہیں ہے۔[2]

شیر خوار بچے کے پیشاب کا حکم:

یہ تو ہوا بڑے انسان کی نسبت شریعت کا حکم، لیکن اگر کوئی بچہ شیر خوار ہو اور ماں کے دودھ کے سوا دوسری کوئی غذا نہ کھانے لگا ہو تو اس کے پیشاب کو دھونے کی بھی ضرورت نہیں، اس پر صرف چھینٹا مار دینا ہی کافی ہے، البتہ اس عمر کی لڑکی کے پیشاب کو دھونا ضروری ہے، جیسا کہ صحیحین اور

←شرح النووي (٣/ ١٩٠) عن أنس، صحيح سنن أبي داود (٣٦٦) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٦) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٢٨) عن أنس و موطأ الإمام مالك (٩٠) المنتقى مع النيل (١/ ٤١) مشكاة المصابيح (٤٩١)

[1] نيل الأوطار (١/ ٤٢)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٩١) سنن ابن ماجه (٥٢٩) مشكاة المصابيح، رقم الحديث (٤٩٢)

سننِ اربعہ میں حضرت اُمِ قیس رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ وہ اپنا لڑکا نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے کر آئیں، جو ابھی غذا نہیں کھانے لگا تھا۔ اس بچے نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں (کپڑے پر) پیشاب کر دیا۔

« فَدَعَا بِمَاءٍ فَنَضَحَهُ وَلَمْ يَغْسِلْهُ »[1]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی منگوایا اور اپنے کپڑے پر چھینٹے مارے اور اسے دھویا نہیں۔''

صحیح بخاری، سنن ابن ماجہ اور مسندِ احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک بچہ گھٹی دینے کے لیے لایا گیا تو اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پیشاب کر دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر پانی مار دیا۔ سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں ہے:

« وَلَمْ يَغْسِلْهُ » ''اور اسے دھویا نہیں۔''

صحیح مسلم شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے کہ (نومولود) بچے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے جاتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے دعاے برکت فرماتے اور انھیں گھٹی دیتے۔ ایک بچہ لایا گیا تو اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر پیشاب کر دیا:

« فَدَعَا بِمَآءٍ فَاَتْبَعَهُ بَوْلَهُ وَلَمْ يَغْسِلْهُ »[2]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی منگوایا اور پیشاب پر چھینٹا مارا اور اسے دھویا نہیں۔''

سنن ابی داود، ترمذی اور مسندِ احمد میں حضرت علی بن طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« بَوْلُ الْغُلَامِ الرَّضِيعِ يُنْضَحُ وَبَوْلُ الْجَارِيَةِ يُغْسَلُ »[3]

''دودھ پیتے لڑکے کے پیشاب پر چھینٹے مارے جائیں اور دودھ پیتی لڑکی کے پیشاب کو دھویا جائے گا۔''

---

[1] صحيح البخاري مترجم (١/ ١٩٢) رقم الحديث (٢٢٣) صحيح مسلم (٣/ ١٩٤) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٢) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٢٩١) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٦١) موطأ الإمام مالك مع المسوى، رقم الحديث (٩٢) مشكاة المصابيح، رقم الحديث (٤٩٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢٢) صحيح مسلم (٣/ ١٩٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٢٣)

[3] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٦٣) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٦١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٨٤٢) عن أمّ كرز، إرواء الغليل، رقم الحديث (١٦٠)

سنن ابی داود ونسائی و ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ اور مسندِ بزار میں خادمِ رسول ﷺ ابو سمح رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا:

«يُغْسَلُ مِنْ بَوْلِ الْجَارِيَةِ وَيُرَشُّ مِنْ بَوْلِ الْغُلَامِ»[1]

''لڑکی کا پیشاب دھویا جائے گا اورلڑکے کے پیشاب پر چھینٹا مارا جائے گا۔''

جبکہ سنن ابو داود و ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان، مستدرک حاکم اور طبرانی میں ام مغفل، حضرت لبانہ بنت حارث رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما نے نبیِ کریم ﷺ کی گود میں پیشاب کر دیا، تو میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ!

«اَعْطِنِیْ ثَوْبَكَ وَالْبَس ثَوْباً غَیْرَهٗ حَتّٰی اَغْسِلَهٗ»

''اپنا یہ کپڑا مجھے دے دیجیے اور دوسرا کوئی کپڑا پہن لیجیے، تا کہ میں یہ دھو دوں۔''

تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«اِنَّمَا يُنْضَحُ مِنْ بَوْلِ الذَّكَرِ وَ يُغْسَلُ مِنْ بَوْلِ الْأُنْثٰى»[2]

''شیرخوارلڑکے کے پیشاب پر چھینٹا دیا جاتا ہے اورلڑکی کا پیشاب دھویا جاتا ہے۔''

اسی طرح قبیلہ بنی خزاعہ کی ایک صحابیہ حضرت اُمِ کرز رضی اللہ عنہا کا بیان بھی دو الگ الگ روایتوں کی شکل میں سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں مذکور ہے، مگر اس کی سند میں انقطاع ہے۔[3]

صحاح وسنن کی احادیث سے معلوم ہوا کہ لڑکے کے پیشاب پر چھینٹا مار دینا بھی کافی ہے اور لڑکی کے پیشاب کو دھو لینا ضروری ہے، جبکہ لڑکی اور لڑکے کے پیشاب کے سلسلے میں فرق کی کئی وجوہات بیان کی گئی ہیں، جن کی تفصیل میں جانا باعثِ طوالت ہے۔

حلال جانوروں کے پیشاب اور پاخانے کا حکم:

انسان کے پیشاب کا حکم اور اس کی طہارت کا طریقہ بیان ہو چکا ہے، جبکہ وہ جانور جن کا

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٢٦) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٢) حسنه البخاري كما في النيل و صحيح الجامع، رقم الحديث (٨١١٧)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٢٢) الموارد الظمآن، رقم الحديث (٢٤٧) مشكاة المصابيح (٥٠١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٣٨٣)

[3] نيل الأوطار (١/ ٤٦)

گوشت حرام ہے، ان کا پیشاب اور پاخانہ بھی ناپاک ہوتا ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری، سنن ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور صحیح ابن خزیمہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم رفع حاجت کے لیے نکلے اور مجھے حکم فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تین پتھر ڈھونڈ کر لاؤں۔ مجھے دو پتھر مل گئے اور تیسرا پتھر نہ ملا، میں لید اٹھا کر لے گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں پتھر لے لیے اور لید کو پھینک دیا اور فرمایا:

«اِنّھَا رِجُسٌ»[1] ''یہ ناپاک ہے۔''

صحیح ابن خزیمہ کی ایک روایت میں ہے:

((اِنَّھَا رِکُسٌ إِنَّھَا رَوُثَۃٌ)) ''یہ پلید ہے، یہ گدھے کی لید ہے۔''

گدھے کے بارے میں تو یہ نص ہے، جب کہ دوسرے غیر ماکول اللحم جانوروں کو اس پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔ یہ تو ان جانوروں کی بابت حکم ہے، جن کا گوشت حرام ہے اور وہ جانور جن کا گوشت کھایا جاتا ہے، ان کے پیشاب و پاخانے میں بہت تخفیف کی گئی ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ایسے جانوروں اور چھوٹے پرندوں کا پیشاب اور پاخانہ نجاستِ خفیفہ ہے، جبکہ امام مالک، امام احمد، اوزعی، زہری، ابراہیم نخعی، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے شاگردانِ رشید امام محمد و امام زفر رحمہما اللہ، شافعیہ میں سے امام ابن المنذر، ابن خزیمہ، ابن حبان اور علماے حدیث رحمہم اللہ کا مسلک یہ ہے کہ ماکول اللحم جانوروں کا پیشاب و پاخانہ ناپاک نہیں ہوتا۔[2]

ان سب کا استدلال صحیح بخاری و مسلم، مسندِ احمد اور دیگر کتبِ حدیث میں مذکور اس حدیث سے ہے، جس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عُکل اور عُرینہ کے کچھ لوگ مدینہ منورہ آئے اور وہاں کی آب و ہوا اُن کو راس نہ آئی، چنانچہ وہ بیمار ہوگئے تو نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں حکم فرمایا کہ باہر جنگل میں ہمارے صدقے کے اونٹ ہیں، وہاں جائیں:

«وَ اَنُ یَّشُرَبُوُا مِنُ أَبُوَالِھَا وَأَلُبَانِھَا»[3] ''اور یہ کہ اونٹوں کا دودھ اور پیشاب پیو۔''

---

[1] صحيح البخاري (١/ ١٧٠) میں ہے: ''قال: هذا ركس'' تقریباً معنیٰ وہی ہے کہ یہ پلید ہے۔ صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٠) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤١) و سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٤) ابن ماجہ میں ''رِجُسٌ'' کے الفاظ ہیں۔

[2] نيل الأوطار (١/ ٤٩)

[3] صحيح البخاري مترجم (١/ ١٩٤) مع الفتح (٢٣٣) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٦٨)←

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اونٹوں کا پیشاب ناپاک نہیں ہوتا۔ باقی حلال گوشت والے جانور بھی اسی پر قیاس کیے جائیں گے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک حلال جانوروں کا پیشاب و پاخانہ بھی ناپاک ہے اور پیشاب پینے کا حکم دینے والے مذکورہ واقعے کو وہ انھیں کے ساتھ خاص قرار دیتے ہیں، جب کہ شافعیہ میں سے ایک معتبر عالم ابن منذر کا کہنا ہے:

”مَنْ زَعِمَ أَنَّ هَذَا خَاصٌ بِأُوْلَٓئِكَ الْقَوْمِ لَمْ يُصِبْ ، اِذِ الْخَصَائِصُ لَا تَثْبُتُ اِلَّا بِدَلِيْلٍ“ [1]

”جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہ واقعہ ان لوگوں کے ساتھ ہی خاص ہے، اس کا یہ قول صحیح نہیں، کیوں کہ خصائص دلیل کے بغیر ثابت نہیں ہوتے۔“

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”ہر وہ جانور جس کا گوشت کھایا جاتا ہے، اس کا بول و براز پاک ہے اور اسے نجس کہنے والوں کے پاس اس بات کی کوئی دلیل نہیں، جبکہ اشیا میں اصل براءت و طہارت ہی ہوتی ہے، جب تک کہ کوئی نص (نجاست) ثابت نہ کر دے اور ایسی کوئی نص نہیں ہے۔“ [2]

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی صحابی کا ایسا کوئی قول نہیں، جس میں حلال جانوروں کے بول و براز کو نجس کہا گیا ہو، اسے نجس قرار دینے والا قول سلفِ صالحین، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بہت بعد والے لوگوں کا ہے۔“ [3]

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹنی پر سوار ہو کر بیت اللہ کا طواف کیا تھا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ

←صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٠٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٥٠٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٧٥٧) المنتقىٰ (٤٨)

[1] نيل الأوطار (١/ ٤٩)

[2] نيل الأوطار (١/ ٥٠)

[3] بحواله فقه السنة (١/ ٢٨)

حلال جانوروں کا پیشاب و پاخانہ پاک ہے، اس لیے کہ عموم بلویٰ سے محفوظ نہیں رہا جا سکتا۔

ان تفصیلات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جو لوگ گایوں، بھینسوں، بھیڑوں، بکریوں اور اونٹوں کو چراتے ہیں اور ان کا دودھ دوہتے ہیں، اس دوران میں اگر ان کے کپڑوں یا بدن پر پیشاب کے چھینٹے پڑ جائیں تو اس میں کوئی حرج نہیں، وہ ان کپڑوں میں اطمینان کے ساتھ نماز ادا کر سکتے ہیں۔ ہاں اگر گوبر وغیرہ زیادہ لگ جائے تو اسے دھو لینا ہی بہتر اور افضل ہے، کیوں کہ کلی طہارت کی اپنی ایک اہمیت ہے۔

طہارت کی اہمیت

اسلام کی نظر میں

نماز کی صحت و قبولیت کے لیے دیگر شرائط کے علاوہ طہارت بھی ایک اہم شرط ہے، کیوں کہ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«لَا تُقْبَلُ صَلَاةٌ مِنْ أَحَدٍ حَتّٰی یَتَوَضَّأَ»[1]

''جب تک کوئی وضو نہ کر لے، اس کی نماز قبول نہیں ہوتی۔''

صحیح مسلم شریف کے الفاظ ہیں:

«لَا تُقْبَلُ صَلَاةٌ بِغَیْرِ طُهُوْرٍ»[2] ''طہارت کے بغیر کوئی نماز قبول نہیں ہوتی۔''

یاد رہے کہ اسلام میں طہارت اور پاکیزگی کی حیثیت صرف یہی نہیں کہ یہ نماز یا دیگر عبادات کے لیے ہی لازمی شرط ہے، بلکہ طہارت تو بجائے خود بھی دین کا ایک شعبہ اور بہ ذاتِ خود مطلوب ہے۔ ہر وقت طہارت اور پاکیزگی کا خیال رکھنے والے لوگوں کو سورۃ البقرہ (آیت: ۲۲۲) میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ﴾

''اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

سورۃ التوبہ (آیت: ۱۰۸) میں مدینہ طیبہ کی قریبی بستی اور مسجد قبا والے لوگوں کی تعریف بیان

---

[1] صحیح بخاري شریف مترجم اردو (۱/ ۱٦۳) صحیح مسلم (۳/ ۱۰٤) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (٥٤) مشکاة المصابیح (۱/ ۱۰۰)

[2] صحیح مسلم مع شرح النووي (۳/ ۱۰۲) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (٥۳) صحیح سنن الترمذي، رقم الحدیث (۱) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (۱۳٥) لیکن اس میں «لَا یَقْبَلُ اللّٰهُ صَلَاةً» کے الفاظ ہیں۔ سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۲۷۱) صحیح الجامع، رقم الحدیث (۷۳۸٤)

کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ﴾

''اُس میں ایسے لوگ ہیں جو پاک رہنے کو پسند کرتے ہیں اور اللہ پاک رہنے والوں ہی کو پسند کرتا ہے۔''

صرف ان دو آیتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام میں طہارت اور پاکیزگی کی بجائے خود کتنی اہمیت ہے۔ صحیح مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں تو ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اَلطَّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ»[1] ''طہارت و پاکیزگی ایمان کا حصہ ہے۔''

سنن ترمذی شریف کی ایک متکلم فیہ روایت میں مروی ہے:

«اَلطُّهُوْرُ نِصْفُ الْاِيْمَانِ»[2] ''طہارت نصف ایمان ہے۔''

معلوم ہوا کہ طہارت و پاکیزگی ایمان کا ایک جزو اور اہم شعبہ ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی بے نظیر کتاب ''حجة الله البالغة'' میں لکھا ہے:

شریعت کے اگرچہ بہت سے ابواب ہیں اور ہر باب کے تحت سیکڑوں ہزاروں احکام ہیں، لیکن اپنی بے پناہ کثرت کے باوجود سب ان چار عناوین کے تحت آجاتے ہیں:

① طہارت۔ ② اِخبات۔ ③ سماحت۔ ④ عدالت۔

گویا ان کے نزدیک شریعت کو کل چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، جن میں سے پہلا ایک چوتھائی حصہ صرف طہارت کو حاصل ہے، پھر انھوں نے ان چار اقسام کی الگ الگ حقیقت کئی صفحات میں بالتفصیل بیان کی ہے، جو قابلِ مطالعہ ہے اور آگے چل کر اَحکام و اَسرارِ طہارت کے بیان میں فرماتے ہیں کہ طہارت کی تین قسمیں ہیں:

ایک حدث سے طہارت یعنی جن حالتوں میں غسل یا وضو واجب ہے، ان حالتوں میں غسل یا وضو کر کے شرعی طہارت و پاکیزگی حاصل کرنا۔

---

[1] مختصر صحيح مسلم، رقم الحديث (١٢٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥١٧) لیکن اس میں «اَلْوُضُوْءُ شَطْرُ الْاِيْمَان» کے الفاظ ہیں۔ مشكاة المصابيح (١/ ٥٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٩٥٧)

[2] حسنه الترمذي، سنن الترمذي (١٥١٩) وقد تكلم على سنده الألباني، مشكاة المصابيح (١/ ٩٧)

دوسری قسم ہے، ظاہری نجاست اور پلیدی سے جسم، لباس اور جگہ کو پاک کرنا۔

تیسری قسم ہے، جسم کے مختلف حصوں میں جو گندگیاں اور میل پیدا ہوتا رہتا ہے، اس کی صفائی کرنا، جیسے ناک، دانتوں، ناخنوں اور زائد بالوں کی صفائی ہے۔[1]

قرآن وسنت کی تصریحات اور حضرت محدث دہلوی کی نفیس تحقیقات سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ اسلام میں صفائی وستھرائی اور طہارت و پاکیزگی کو بڑا مقام حاصل ہے اور اس کا اپنے پیروکاروں سے طہارت و پاکیزگی رکھنے کا بڑا پُرزور مطالبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عقائد و اعمال کی اور ظاہری و باطنی ہر قسم کی نجاستوں سے طہارت و پاکیزگی اختیار کرنے کی توفیق سے نوازے۔ آمین ثم آمین.

---

[1] حجة الله البالغة مترجم اردو از مولانا عبد الحق حقاني (ص: ٢٧٤) طبع كراچى.

اقسامِ حدث اور اَسبابِ غسل

صحیح بخاری ومسلم کی ایک حدیث ذکر ہو چکی ہے، جس میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«لَا تُقْبَلُ صَلَاةُ مَنْ أَحْدَثَ حَتّٰى يَتَوَضَّأَ»[1]

''جو آدمی ''حادث'' ہو جائے، اس کی اس وقت تک نماز قبول نہیں ہوتی، جب تک وہ وضو نہ کر لے۔''

اس حدیث شریف میں «مَنْ أَحْدَثَ» کے الفاظ میں ''حدث'' سے مراد سلیم الفطرت انسان کی وہ کیفیت ہے، جس میں وہ پیشاب، پاخانہ یا جماع وغیرہ سے فراغت کے بعد اپنے نفس میں ایک خاص قسم کا انقباض وتکدر اور گرانی و بے لطفی محسوس کرتا ہے اور جب وہی انسان استنجا وطہارت یا غسل کر لیتا ہے اور صاف ستھرے کپڑے پہن کر خوشبو لگا لیتا ہے تو اس کی طبیعت کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے اور ایک انشراح وانبساط اور سرور وفرحت کی کیفیت محسوس کرتا ہے۔ اسی دوسری حالت کا نام طہارت اور پاکیزگی ہے۔ قول شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ جن کی فطرتِ سلیم اور جن کا وجدان صحیح ہے، وہ ان دونوں حالتوں اور کیفیتوں کے فرق کو واضح طور پر محسوس کر سکتے ہیں اور اپنی طبیعت وفطرت کے تقاضے سے حدث کی حالت کو ناپسند اور طہارت کی حالت کو پسند کرتے ہیں۔[2]

حدثِ اصغر:

وہ حدث جو روحانی کدورت وآلودگی کا باعث ہوتا ہے، جسے آپ ناپاکی بھی کہہ سکتے ہیں، اس کی فقہی کتب میں دو قسمیں یا دو درجے بیان کیے گئے ہیں۔

ایک ''حدثِ اصغر'' جس کے ازالے کے لیے صرف وضو کر لینا ہی کافی ہو جاتا ہے۔ پیشاب، پاخانہ، خروجِ ہوا اور خروجِ مذی یا ودی حدثِ اصغر کے موجب ہوتے ہیں۔

[1] صحيح بخاري شريف مترجم اردو (١/ ١٦٣) صحيح مسلم مع النووي (٣/ ١٠٤) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٤) مشكاة المصابيح (١/ ١٠٠)

[2] حجة الله البالغة اردو (ص: ٢٧٤)

حدثِ اکبر:

حدث کی دوسری قسم یا درجہ ''حدثِ اکبر'' ہے، یعنی جس کے اثرات زیادہ گہرے اور وسیع ہو تے ہیں اور ان کا ازالہ پورے جسم کے غسل ہی سے ہوسکتا ہے۔ جماع و احتلام اور حیض و نفاس اس دوسرے قسم کے حدث یا ناپا کی سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا استنجا و طہارت اور وضو کے مسائل جاننے سے پہلے ضروری ہے کہ ہمیں اس غسلِ جنابت کا مسنون طریقہ معلوم ہو۔ یہ فطرتِ سلیمہ کا تقاضا بھی ہے اور شریعتِ اسلامیہ میں واجب بھی۔ جیسا کہ سورۃ المائدہ (آیت: ۶) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَ اِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا﴾

''اور اگر نہانے کی حاجت ہو تو (نہا کر) پاک ہو جایا کرو۔''

اس آیت میں غسلِ جنابت یعنی جماع اور احتلام یا بدخوابی کے نتیجے میں حاصل ہونے والی کیفیت سے غسل کر کے پاک ہونا مراد ہے، جبکہ حیض یا ماہواری کے بعد غسل کی فرضیت کی دلیل سورۃ البقرہ (آیت: ۲۲۲) میں مذکور ہے، جہاں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ وَ لَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴾

''اور تم سے حیض کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، کہہ دو کہ وہ تو نجاست ہے، سو ایامِ حیض میں عورتوں سے کنارہ کش رہو اور جب تک پاک نہ ہو جائیں اُن سے مقاربت نہ کرو۔ ہاں جب پاک ہو جائیں تو جس طریق سے اللہ تعالیٰ نے تمھیں ارشاد فرمایا ہے، اُن کے پاس جاؤ، کچھ شک نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

اسی طرح صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں نبی کریم ﷺ کے ارشادات بھی مذکور ہیں، جن سے خونِ حیض کے انقطاع کے بعد غسل کی فرضیت کا پتا چلتا ہے، نیز تمام صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اس بات پر اجماع ہے کہ نفاس یعنی بچے کی ولادت کے بعد زچہ کو جاری ہو جانے والے خون کے

انقطاع پر بھی اسی طرح غسل کرنا واجب ہے، جس طرح حیض کے بعد ضروری ہے۔

جماع و احتلام اور حیض و نفاس کے بعد کیے جانے والے غسل کی یہ چاروں قسمیں ''غسلِ فرض'' ہیں، جب کہ مسنون و مستحب غسل کی بھی بعض اقسام ہم ذکر کرنے والے ہیں، لیکن پہلے یہاں ایک بات یہ بھی ذہن نشین کرلیں کہ اگر کوئی شخص خواب میں دیکھے کہ اسے احتلام ہوگیا ہے، مگر سو کر اٹھنے پر اس کی کوئی علامت نظر نہ آئے، تو اس پر غسل واجب نہیں ہوگا، لیکن اگر احتلام ہونا تو یاد نہیں، مگر اٹھنے پر منی کی تری پائے تو اس پر غسل واجب ہوگا، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے، صحیح مسلم میں حضرت انس و حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما سے، مسندِ احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے، سنن نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد اور مصنف ابن ابی شیبہ کی روایات میں حضرت خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا سے اور سنن ابی داود، ترمذی، ابن ماجہ اور مسندِ احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ارشاداتِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پتا چلتا ہے۔[1]

یہ بات بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ صحیحین، سنن اربعہ، سنن کبری بیہقی اور مسند احمد و شافعی میں نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی متعدد روایات ملتی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کی طرح ہی عورتوں کو بھی بدخوابی ہو جاتی ہے، لہٰذا تری پانے کی صورت میں ان پر بھی غسل واجب ہوجاتا ہے اور محض بدخوابی ہونے اور اس کی علامت نہ پانے کی شکل میں ان پر غسل واجب نہیں ہوگا۔[2]

صحیح بخاری و مسلم شریف میں مذکور اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں حضرت اُمّ سلیم رضی اللہ عنہا کے جواب میں بدخوابی پر غسل واجب ہونے اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے جواب میں عورتوں میں بھی بدخوابی کے واقع ہونے کی عقلی دلیل کے طور پر نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

((فِيمَا يُشْبِهُهَا وَلَدُهَا))[3]

''تو پھر بچے کی شباہت کبھی اس پر اور کبھی اس پر کیسے چلی جاتی ہے؟''

---

[1] دیکھیں: المنتقی مع النیل (۱/ ۲۵۸۔ ۲۶۲۔ ۳۶۳ طبع مصر) الفتح الربانی (۲/ ۱۱۶)

[2] اگر مرد و زن دونوں اکٹھے سوئے ہوئے ہوں اور بستر پر تری پائیں اور معلوم نہ ہو کہ کس کو بدخوابی ہوئی ہے تو تری کو دیکھا جائے گا، اگر رنگ سفید ہو تو مرد غسل کرے گا اور اگر رنگ پیلا یا زرد ہو تو عورت پر غسل واجب ہوگا، لیکن اگر پانی یا تری میں فرق نہ ہو سکے تو پھر احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں ہی غسل کرلیں۔

[3] صحيح البخاري مع الفتح (۱/ ۲۷۶) صحيح مسلم مع شرح النووي (۳/ ۲۲۳، ۲۲٤) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۱۷) المنتقى (۱/ ۲۵۸) الفتح الرباني (۲/ ۱۱٦ تا ۱۲۰)

صحیح مسلم شریف اور بعض دیگر کتبِ حدیث میں مروی ہے:

''مرد کا مادۂ منویہ گاڑھا اور سفید ہوتا ہے، جبکہ عورت کا پتلا اور پیلا ہوتا ہے اور دونوں میں سے جس کا مادہ غالب آجائے، بچہ اسی کے مشابہ ہوتا ہے۔''[1]

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٢٢٢۔ ٢٢٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٩٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٠١) الفتح الرباني (٢/ ١١٦ تا ١٢٠)

حیض و نفاس اور استحاضہ کے بعض احکام

احکام و مسائلِ حیض کے سلسلے میں یہ باتیں بھی پیشِ نظر رہنی چاہییں:

حیض آنے کی عمر:

حیض آنے کی کم از کم اور زیادہ سے زیادہ عمر کتنی ہے؟

اس سلسلے میں احادیث و آثار ساکت ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ کرام کے مابین اس کے بارے میں اختلاف ہے، لیکن کم از کم عمر کے بارے میں تو تقریباً سب کا اتفاق ہے کہ وہ ۹ سال ہے۔ البتہ زیادہ سے زیادہ احناف کے نزدیک ۵۵ سال اور مالکیہ و حنابلہ کے نزدیک ۵۰ سال ہے، جب کہ شافعیہ کے نزدیک زیادہ سے زیادہ عمر کی کوئی تعیین نہیں۔[1]

حیض کی مدت:

ہر ماہ کے ایامِ حیض کی گنتی مختلف طبائع کے لحاظ سے مختلف ہوسکتی ہے۔ نبیِ کریم ﷺ سے اس سلسلے میں جو بعض روایات ملتی ہیں، وہ سب متکلم فیہ ہیں اور کوئی صحیح حدیث ثابت نہ ہونے کی بنا پر ائمہ کرام کے مابین بھی اختلاف ہے۔

امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ کے نزدیک حیض کی کم از کم مدت ایک دن اور ایک رات اور زیادہ سے زیادہ مدت ایک روایت میں پندرہ روز اور دوسری روایت میں ۱۷ روز ہے۔ اس کی ایک روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملتی ہے، بلکہ طبرانی اور سنن دارقطنی میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی ایک مرفوع حدیث میں بھی یہی مذکور ہے، مگر وہ سخت کمزور ہے۔[2]

امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک حیض کی کم از کم مدت تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہے۔ اس کی ایک روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی ملتی ہے، جس سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے، لیکن اس

---

[1] الفقه على المذاهب الأربعة (١/ ١٢٤ تا ١٢٧)

[2] تحفة الأحوذي (١/ ٤٠٢۔ ٤٠٤) الفقه على المذاهب الأربعة (١/ ١٢٨) و المغني (١/ ٢٧٧)

کی سند ضعیف ہے۔ کم ازکم تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن مدتِ حیض پر دلالت کرنے والی ایک مرفوع حدیث بھی حضرت واثلہ بنت اسقع رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، مگر وہ ضعیف اور ناقابلِ استدلال ہے۔[1]

سنن ابی داود، ترمذی، ابن ماجہ، دارقطنی، بیہقی، مستدرکِ حاکم، مسندِ احمد اور معانی الآثار طحاوی میں حمنہ بنت جحش رضی اللہ عنہا کی حدیث میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حیض کی مدت چھے یا سات دن مقرر فرمائی ہے۔[2]

حقیقت تو یہ ہے کہ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ کے بقول حیض کا ذکر مطلق وارد ہوا ہے۔ شریعت اور لغت میں اس کے قلیل و کثیر کی کوئی تحدید نہیں آئی، لہٰذا اس معاملے میں عادت اور عرفِ عام کی طرف رجوع کرنا ہی واجب ہے اور ایسی عورتیں بھی پائی گئی ہیں، جو صرف ایک ہی دن کے لیے حائضہ ہوتی ہیں، بعض مسلسل پندرہ دن اور کوئی دو دن، حتیٰ کہ امام ابن المنذر نے نقل کیا ہے کہ امام اوزاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''ہمارے یہاں ایک ایسی عورت بھی ہے، جسے صبح حیض آتا ہے اور شام کو وہ پاک ہو جاتی ہے۔''[3]

اس سے معلوم ہوا کہ عرف ہی کا اعتبار ہوگا، کسی حدبندی کی پابندی واجب نہیں، کیوں کہ شریعت حد بندی سے خاموش ہے، لہٰذا علاقے و قبیلے کا عرف ہی معتبر ہے۔[4]

نفاس:

بچے کے پیدا یا ساقط ہونے کے بعد آنے والے خون کی کم ازکم مدت کوئی نہیں، بلکہ جب بھی خون بند ہو جائے، نفاس کی مدت ختم ہو جاتی ہے اور میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات کی ممانعت ختم ہو جاتی ہے۔ البتہ مستحب یہ ہے کہ چالیس دن تک ازدواجی تعلقات سے پرہیز کیا جائے۔[5] لیکن اس استحباب کی کوئی صریح دلیل نہیں ہے۔[6]

---

[1] البداية لابن رشد (١/ ٧٢۔ ٧٣) المغني (١/ ٢٧٦۔ ٢٧٧) الفقه على المذهب الأربعة (١/ ١٢٨)

[2] إرواء الغليل (١/ ٢٠٢) حسنه الترمذي مع التحفة (١/ ٣٩٦۔ ٣٩٧)

[3] المغني لابن قدامة (١/ ٢٢٥)

[4] الروضة الندية مع شرحه الدرر البهية (١/ ٦٢) دار المعرفة بيروت.

[5] المغني (١/ ٣٠٩)

[6] اگر بچہ خشک پیدا ہو جائے اور خون بالکل ہی نہ آئے تو عورت غسل کے بعد نماز شروع کر دے گی۔ دیکھیں: بداية المجتهد.

نفاس کی مدت:

نفاس کی زیادہ سے زیادہ مدت چالیس دن ہے۔ احناف اور حنابلہ کا یہی مسلک ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی غالب احوال میں یہی حد مقرر کی ہے۔[1] ان کا استدلال، سنن ابی داود، مستدرک حاکم اور سنن بیہقی میں حضرت امِّ سلمہ رضی اللہ عنہا کی حدیث سے ہے، جس میں وہ فرماتی ہیں:

«كَانَتِ الْمَرْأَةُ مِنْ نِسَآءِ النَّبِيِّ ﷺ تَقْعُدُ فِي النِّفَاسِ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً»[2]

''نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات میں سے کوئی عورت نفاس کی صورت میں (زیادہ سے زیادہ) چالیس دن تک بیٹھتی (یعنی نماز روزہ ترک کرتی) تھی۔''

جبکہ سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی، دارقطنی، بیہقی، مسندِ احمد اور مستدرکِ حاکم میں اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

«كَانَتِ النُّفَسَآءُ تَجْلِسُ عَلَىٰ عَهْدِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ أَرْبَعِينَ يَوْماً»[3]

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں نفاس والی عورتیں چالیس روز تک بیٹھتی (یعنی نماز روزہ ترک کرتی) تھیں۔''

امام ترمذی رحمہ اللہ اپنی سنن میں فرماتے ہیں:

صحابہ اور تابعین میں تمام اہلِ علم میں اس بات پر اتفاق ہے کہ عورت چالیس دن تک نفاس میں نماز چھوڑے گی، سوائے اس کے کہ وہ اس سے پہلے ہی پاک ہو جائے۔ اس صورت میں خون بند ہونے پر وہ غسل کر کے نماز شروع کر دے گی اور اگر چالیس دن کے بعد بھی خون آتا رہے تو اکثر اہلِ علم کے نزدیک وہ نماز نہیں چھوڑے گی۔''[4]

بعض حالات میں شافعیہ نفاس کی زیادہ سے زیادہ مدت ساٹھ دن کہتے ہیں۔[5] ساٹھ کی ہی ایک

---

[1] المغني لابن قدامة (٣٠٨)

[2] إرواء الغليل (١/ ٢٢٢) وحسنه، و صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٠٤)

[3] سنن الترمذي مع التحفة (١/ ٤٢٨) صحيح أبي داود، رقم الحديث (٣٠٤) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٤٨) المغني (١/ ٣٠٨)

[4] سنن الترمذي مع التحفة (١/ ٤٢٩۔ ٤٣٠) صحيح سنن الترمذي (١/ ٤٦)

[5] الفقه على المذاهب الأربعة (١/ ١٣٢)

روایت امام احمد رحمہ اللہ سے بھی ملتی ہے، کیوں کہ امام اوزاعی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

''ہمارے یہاں ایک عورت ہے، جو دو ماہ تک خونِ نفاس سے رہتی ہے۔''

امام عطا رحمہ اللہ سے بھی ایک ایسا ہی واقعہ مروی ہے کہ انھوں نے بھی ایک ایسی ہی عورت دیکھی ہے اور اس مسلک کی دلیل وجود میں آنے والے یہی واقعات ہیں۔[1] جبکہ چالیس دن والے مسلک کی دلیل حدیث شریف ہے۔ تحفۃ الاحوذی (۱/ ۲۳۱) میں علامہ عبدالرحمٰن مبارک پوری رحمہ اللہ نے چالیس دن والے مسلک ہی کو ترجیح دی ہے اور امام شوکانی رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے۔[2]

گویا چالیس دن تک نفاس اور بعد میں آنے والے خون کا حکم استحاضہ کا ہے، جس میں نماز روزہ وغیرہ سب ضروری ہیں اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ نفاس کا حکم حیض والا ہی ہے۔[3]

حیض و نفاس کی حالت میں نماز اور روزے کا حکم:

حائضہ عورت کے گھر داری اور شوہر کی خدمت سے تعلق رکھنے والے بعض احکام تو پہلے ذکر کیے جا چکے ہیں، جبکہ اس کی نمازوں اور روزوں کے سلسلے میں شرعی حکم یہ ہے کہ ان ایام میں وہ نمازیں ادا کرے گی نہ روزے ہی رکھے گی۔ نمازیں تو کلی طور پر اسے معاف ہیں، مگر روزے بعد میں قضا کرنا ضروری ہیں۔ چنانچہ صحاح و سنن میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كَانَ يُصِيبُنَا ذٰلِكَ مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَنُؤْمَرُ بِقَضَاءِ الصَّوْمِ وَلَا نُؤْمَرُ بِقَضَاءِ الصَّلَاةِ»[4]

''نبیِ کریم ﷺ کے عہدِ مسعود میں ہمیں حیض آتا تو آپ ﷺ کی طرف سے ہمیں روزے قضا کرنے کا حکم تو ملتا، مگر نمازوں کی قضا کا حکم نہیں ملتا تھا۔''

نفاس والی عورتیں بھی روزے تو قضا کریں گی، مگر نمازیں نہیں، کیونکہ سنن ابی داود، مستدرکِ حاکم اور سنن بیہقی میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

---

[1] المغني (۱/ ۳۰۸)

[2] تحفة الأحوذي (۱/ ٤۳۱)

[3] الروضة الندية مع الدرر البهية (۱/ ٦٥۔ ٦٦)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (۳۲۱) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۳٦) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۱۲) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦۳۱)

« كَانَتِ الْمَرْأَةُ مِنْ نِسَآءِ النَّبِيِّ ﷺ تَقْعُدُ فِي النِّفَاسِ أَرْبَعِينَ يَوْماً لَا يَأْمُرُهَا النَّبِيُّ ﷺ بِقَضَاءِ صَلٰوةِ النِّفَاسِ »[1]

''نبیِ کریم ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے عورت نفاس کے چالیس دن بیٹھا کرتی تھی اور نبی ﷺ اسے نمازیں قضا کرنے کا حکم نہیں فرماتے تھے۔''

جب کہ سنن ترمذی اور المغنی لابن قدامہ میں ہے کہ اگر چالیس دن سے پہلے خونِ نفاس بند ہو جائے تو وہ غسل کرے اور نمازیں روزے وغیرہ شروع کر دے۔[2] اگر کسی کو چالیس دن سے بھی زیادہ خون جاری رہے اور اتفاق سے وہ ایامِ حیض ہوں تو انھیں حیض شمار کرے اور اگر وہ ایامِ معتاد نہیں تو پھر وہ استحاضہ ہوگا، جو ایک بیماری ہے، جس میں عورت کو خون جاری رہتا ہے۔ اس شکل میں وہ غسل کرے، نمازیں وغیرہ شروع کردے اور ہر نماز کے لیے نیا وضو کرے، ایک وضو سے کئی نمازیں نہیں پڑھ سکتی، جیسا کہ بخاری شریف میں مروی ہے کہ فاطمہ بنت ابی جحش رضی اللہ عنہا کو نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا تھا:

« تَوَضَّئِي لِكُلِّ صَلَاةٍ »[3] ''ہر نماز کے لیے وضو کرو۔''

یہی جمہور کا مسلک ہے، ان کے نزدیک ایک ہی غسل کافی ہے۔ بعض روایات میں ظہر و عصر کے لیے ایک غسل، مغرب وعشا کے لیے دوسرے اور فجر کے لیے تیسرے غسل کا ذکر ہے۔ مگر امام بیہقی نے اسے ضعیف اور بعض نے منسوخ قرار دیا ہے۔[4]

استحاضے کی حالت میں عورت اپنے خاوند کے لیے بھی حلال ہوتی ہے، مگر حیض و نفاس میں نہیں، لیکن اگر کوئی شخص حیض کی حالت میں اپنی بیوی سے جماع کر بیٹھے تو اس گناہ کا کفارہ ادا کرے۔ سنن ابی داود، نسائی اور ابن ماجہ میں (مرفوعاً لیکن صحیح موقوفاً ہے) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایسے شخص کے بارے میں مروی ہے:

« يَتَصَدَّقُ بِدِينَارٍ أَوْ بِنِصْفِ دِينَارٍ »[5] ''وہ ایک دینار یا نصف دینار صدقہ کرے۔''

---

[1] حسنه الألباني في الإرواء (١/ ٢٢٢) و صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٠٥)

[2] سنن الترمذي مع التحفة (١/ ٤٢٨۔ ٤٣٠) و المغني (١/ ٣٠٨) طبع مصر.

[3] صحيح البخاري مع الفتح (٢٢٨) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٧۔ ٢٨٩) سبل السلام (١/ ١٠٣)

[4] سبل السلام (١/ ١٠٠۔ ١٠٣) و نيل الأوطار (١/ ٤٢١۔ ٢٤٢، ٢٦٨ تا ٢٧٦)

[5] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٩٠٠) و رقم الحديث (٢٣٠٠) و صحيح سنن الترمذي، رقم ←

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے اس کی تفسیر سنن ابی داود میں یوں مروی ہے:

"اِذَا أَصَابَهَا فِیْ أَوَّلِ الدَّمِ فَدِیْنَارٌ، وَ اِذَا أَصَابَهَا فِیْ انْقِطَاعِ الدَّمِ فَنِصْفُ دِیْنَارٍ"[1]

''اگر حیض کی ابتدا میں جماع کر بیٹھے تو ایک دینار صدقہ کرے اور اگر آخری ایام میں ہو تو نصف دینار۔''

بعض ضعیف روایات سے پتا چلتا کہ اگر طاقت ہو تو ایک دینار صدقہ کرے اور اگر اس کی استطاعت نہیں تو نصف دینار صدقہ کرے۔[2] یہ سب روایات ضعیف ہیں، اس لیے بعض کے نزدیک صرف استغفار ہی کافی ہے۔

← الحدیث (۱۱۷) و صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (۲۷۸) صححه غیر واحد ووافقهم الألباني في الإرواء (۱/ ۲۱۷۔ ۲۱۸) طبع جامعه الإمام.

1. صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۲۳۸۔ ۱۹۰) الإرواء (۱/ ۲۱۸) یہ روایت مرفوعاً بھی مروی ہے، لیکن صحیح اس کا موقوف ہونا ہے۔
2. إرواء الغلیل (۱/ ۲۱۸)

غسل کا حکم اور اس کا طریقہ

غسل کب واجب ہوتا ہے؟

جنابت اور خصوصاً جماع کی شکل میں غسل کب واجب ہوتا ہے؟

١ صحیح مسلم میں مروی ہے:

«اِذَا قَعَدَ بَیۡنَ شُعَبِهَا الۡأَرۡبَعِ ثُمَّ أَلۡزَقَ الۡخِتَانَ بِالۡخِتَانِ فَقَدۡ وَجَبَ الۡغُسۡلُ»[1]

''جب مرد اپنی بیوی کے چاروں ارکان (ہاتھ پاؤں) کے درمیان بیٹھ جائے اور اپنی جائے ختنہ عورت کی جائے ختنہ سے ملا دے تو غسل واجب ہوگیا۔''

٢ سنن ابن ماجہ اور مصنف ابن ابی شیبہ میں مروی ہے:

«اِذَا الۡتَقَی الۡخِتَانُ بِالۡخِتَانِ وَتَوَارَتِ الۡحَشۡفَةُ فَقَدۡ وَجَبَ الۡغُسۡلُ»[2]

''جب دونوں کی جائے ختنہ باہم مل جائیں اور مرد کا حشفہ (عضوِ تناسل کا اگلا حصہ) عورت کی شرم گاہ میں داخل ہو جائے تو غسل واجب ہوگیا۔''

٣ جب کہ صحیح بخاری و مسلم اور بعض دوسری کتبِ حدیث میں مروی ہے:

«اِذَا جَلَسَ بَیۡنَ شُعَبِهَا الۡأَرۡبَعِ وَأَجۡهَدَ نَفۡسَهٗ (وَفِیۡ رِوَایَةٍ: ثُمَّ جَهَدَ) فَقَدۡ وَجَبَ الۡغُسۡلُ، أَنۡزَلَ أَوۡ لَمۡ یُنۡزِلۡ»[3]

''جب مرد عورت کے ہاتھوں اور پاؤں میں بیٹھ گیا اور اس نے جماع کیا تو غسل واجب ہے، انزال ہو یا نہ ہو۔''

---

[1] صحیح مسلم (٤/ ٤١۔ ٤٢) صحیح الجامع (٧٣٦) الفاظ تھوڑے سے مختلف ہیں لیکن معانی ایک ہی ہیں۔

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦١١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٨٦)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩١) صحيح مسلم مع شرح النووي (٤/ ٣٩۔ ٤٠) الفتح الرباني (٢/ ١١٣۔ ١١٤)

مسنون اور مستحب غسل:

غسلِ واجب کی مذکورہ چار اقسام (جنابت، حیض، نفاس اور جماع سے غسل) کے علاوہ بعض اقسامِ غسل مسنون اور مستحب ہیں، مثلاً جمعہ کے دن ہر عاقل و بالغ مسلمان کے لیے غسل کی نبیِ کریم ﷺ نے بڑی تاکید فرمائی ہے۔ بعض احادیث میں اسے ضروری اور بعض میں اسے اچھا فعل قرار دیا گیا ہے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ نے "نیل الأوطار، شرح منتقی الأخبار" میں ہر قسم کی احادیث نقل کرنے کے بعد غسلِ جمعہ کے مستحب ہونے کا حکم اخذ کیا ہے اور بعض احادیث کی رو سے عیدین کے غسل کے بھی مستحب ہونے کا پتا چلتا ہے۔ اسی طرح میت کو غسل دینے کے بعد، مشرک کو دفن کرنے کے بعد، غشی یا بے ہوشی کے بعد، احرام باندھتے وقت، دخولِ مکہ سے قبل اور وقوفِ عرفہ سے پہلے غسل کرنا بھی احادیث سے ثابت ہے، مگر یہ سب اَقسام فرض یا واجب نہیں، بلکہ مسنون، مستحب اور کارِ ثواب ہونے کا درجہ رکھتی ہیں۔[1]

البتہ ان تمام اقسام فرض و واجب اور مستحب و مسنون کے لیے غسل کا طریقہ تقریباً ایک جیسا ہی ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ غسلِ جنابت کے لیے عورت کا اپنے سر کی چٹیا کھولنا ضروری نہیں، جبکہ حیض و نفاس کے لیے غسل کرتے وقت بالوں کا کھولنا اور خوب مل کر دھونا ضروری ہے۔

غسل کا مسنون طریقہ:

اب رہا غسل کا مسنون طریقہ تو اس کی عموماً دو شکلیں پائی جاتی ہیں۔ ایک غسلِ عادت اور دوسرا غسل عبادت ہے۔

غسلِ عادت تو یہ ہے کہ کوئی شخص محض اپنے جسم کا میل کچیل اور پسینا زائل کرنے، صفائی ستھرائی کی خاطر یا گرمی کی شدت کم کرنے اور حصولِ برودت کی غرض سے نہائے اور غسل کے مسنون طریقہ سے قطع نظر اپنی ہی مرضی سے بدن پر پانی بہائے اور صابن، شیمپو سے غسل کر لے۔ اسے آپ "غسل عادت" کہہ سکتے ہیں، کیوں کہ اس سے صفائی ستھرائی اور ٹھنڈک تو حاصل ہو جائے گی، مگر وہ

[1] الفتح الرباني (٢/ ١٤٤ تا ١٤٧) المنتقى مع النيل (١/ ٢٣١) تمام المنة (ص: ١٢٢۔ ١٢٣)

اجر وثواب اور فضیلت حاصل نہیں ہوگی، جو مسنون طریقے سے غسل کرنے پر حاصل ہوتی ہے۔

اس لیے اس مسنون طریقے کو ''غسلِ عبادت'' بھی کہا جاسکتا ہے۔ ان دونوں میں باہم کوئی فرق بھی نہیں، کیوں کہ پہلے سے بھی صفائی ستھرائی اور ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے اور دوسرے سے بھی، پہلے میں بھی سرد یا گرم پانی اور صابن وشیمپو استعمال ہوتا ہے اور دوسرے میں بھی، مگر پہلا عادت اور دوسرا عبادت، پہلا محض دنیا اور دوسرا دین ہے، مگر پہلا خرما ہے تو دوسرا ہم خرما وہم ثواب ہے۔

اس فرق کی وجہ صرف اتنی سی ہے کہ جب بھی کوئی شخص غسل کرنے لگے تو اسے (وہ غسل فرض و واجب یا مسنون ومستحب) ہر شکل میں مسنون طریقے کو اختیار کرنا چاہیے اور اس تصور کے آجانے سے جہاں آپ طبی و دنیاوی فوائد سے بہرہ ور ہوں گے، وہیں اس کے دینی و روحانی ثمرات بھی سمیٹیں گے اور اتباعِ سنت کا اجر وثواب بھی پائیں گے۔ لہٰذا آیئے دیکھیں کہ نبیِ کریم ﷺ کا مسنون طریقہ غسل کیا تھا؟

صحیح بخاری ومسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اغْتَسَلَ مِنَ الْجَنَابَةِ ، يَبْدَأُ فَيَغْسِلُ يَدَيْهِ ثُمَّ يُفْرِغُ بِيَمِيْنِهٖ عَلَى شِمَالِهٖ فَيَغْسِلُ فَرْجَهُ ، ثُمَّ يَتَوَضَّأُ وُضُوءَهُ لِلصَّلٰوةِ ثُمَّ يَأْخُذُ الْمَآءَ فَيُدْخِلُ أَصَابِعَه فِيْ أُصُوْلِ الشَّعَرِ حَتّٰى اِذَا رَأٰى أَنْ قَدِ اسْتَبْرَأَ حَفَنَ عَلٰى رَأْسِهٖ ثَلَاثَ حَفَنَاتٍ ، ثُمَّ أَفَاضَ عَلٰى سَائِرِ جَسَدِهٖ، ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ»[1]

''نبیِ اکرم ﷺ جب غسلِ جنابت فرماتے تو پہلے اپنے دونوں ہاتھوں کو دھو لیتے۔ پھر دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈال کر مقامِ استنجا کو دھوتے۔ پھر اسی طرح وضو فرماتے، جس طرح نماز کے لیے وضو کیا جاتا ہے۔ پھر پانی لیتے اور بالوں کی جڑوں میں انگلیاں ڈال کر وہاں پانی پہنچاتے۔ جب آپ ﷺ محسوس فرما لیتے کہ پانی بالوں کی جڑوں تک پہنچ گیا ہے تو پھر پانی کے تین چلّو بھر کر اپنے سر پر ڈالتے۔ اس کے بعد باقی سارے جسم پر پانی بہاتے تھے اور اس کے بعد اپنے دونوں پاؤں دھوتے تھے۔''

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٨) صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٣/ ٢٢٨ دار الفكر بيروت) صحيح سنن أبي داود (٢٢٢) صحيح سنن النسائي (٢٤١) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٩١)

صحاح وسنن ہی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میری خالہ اُم المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے مجھے (نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا) طریقۂ غسل بتاتے ہوئے فرمایا:

«أَدْنَيْتُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ غُسْلَهٗ مِنَ الْجَنَابَةِ فَغَسَلَ كَفَّيْهِ مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا، ثُمَّ أَدْخَلَ يَدَهٗ فِيْ الْإِنَاءِ ثُمَّ أَفْرَغَ بِهٖ عَلٰى فَرْجِهٖ وَغَسَلَهٗ بِشِمَالِهٖ، ثُمَّ ضَرَبَ بِشِمَالِهِ الْأَرْضَ فَدَلَكَهَا دَلْكاً شَدِيْداً ثُمَّ تَوَضَّأَ وُضُوْءَهٗ لِلصَّلَاةِ ثُمَّ أَفْرَغَ عَلٰى رَأْسِهٖ ثَلَاثَ حَفَنَاتٍ مِلْأَ كَفِّهٖ، ثُمَّ غَسَلَ سَائِرَ جَسَدِهٖ، ثُمَّ تَنَحّٰى عَنْ مَقَامِهٖ ذٰلِكَ فَغَسَلَ رِجْلَيْهِ»[1]

”میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غسلِ جنابت کے لیے پانی بھر کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رکھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے دو یا تین مرتبہ اپنے ہاتھوں کو دھویا۔ پھر اپنا دھلا ہوا ہاتھ پانی کے اس برتن میں ڈالا اور دائیں ہاتھ سے پانی لے کر اپنے مقامِ استنجا پر ڈالا اور اپنے بائیں ہاتھ سے اسے دھویا۔ پھر اپنا بایاں ہاتھ زمین پر مارا اور اسے مٹی کے ساتھ خوب رگڑ رگڑ کر ملا۔ پھر نماز کے لیے وضو کرنے جیسا وضو کیا۔ پھر تین دفعہ چلو بھر کر سر پر پانی ڈالا۔ پھر اپنے سارے جسم کو دھویا۔ پھر اس جگہ سے ہٹ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں پاؤں دھوئے۔“

اس حدیث میں آگے یہ الفاظ بھی مذکور ہیں:

”پھر میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تولیہ دیا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس کر دیا۔“

نیز صحیح بخاری و مسلم ہی کی ایک حدیث میں ہے:

”آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی (اپنے دونوں ہاتھوں سے) جھاڑا۔“

ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب پانی کا جھاڑنا ثابت ہے تو پھر تولیے سے بدن کو صاف کر لینا بھی جائز ہے۔[2] یہ جو کہا جاتا ہے کہ وضو یا غسل کا پانی پونچھنا نہیں چاہیے، یہ بات شرعاً بے بنیاد ہے، اس سلسلے میں مسند الفردوس دیلمی کی وہ روایت جسے امام سیوطی رحمہ اللہ نے ”الجامع الصغیر“

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٢٤٩) صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٣/ ٢٣١) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٤) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٠) سنن ابن ماجه (٥٧٣)

[2] تولیے کے استعمال کے بارے میں ”سبل السلام“ کا مراجعہ کریں۔

میں نقل کیا ہے، محدثینِ کرام نے اس روایت کو نا قابلِ حجت قرار دیا ہے۔[1]

مذکورہ بالا دو احادیث (جو حضرت عائشہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہیں) کے مجموعی مفاد سے غسلِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا جو مسنون طریقہ سامنے آتا ہے، ظاہر ہے کہ غسل کا سب سے پاکیزہ طریقہ اور باسلیقہ انداز یہی ہوسکتا ہے۔ غسل کی جگہ سے ہٹ کر آخر میں پاؤں دھونے کی وجہ یہ ہوگی کہ غسل کی وہ جگہ پختہ نہ ہوگی اور وہاں پانی رکتا اور جمع ہوتا ہوگا۔ اس طرح کیے گئے غسل کے بعد دوبارہ وضو کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں رہتی، بلکہ اسی غسل والے وضو سے نماز وغیرہ پڑھی جاسکتی ہے، بشرطیکہ دورانِ غسل وضوٹوٹنے کی کوئی ضرورت پیش نہ آئے۔ کیوں کہ سنن اربعہ اور مستدرک حاکم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَتَوَضَّأُ بَعْدَ الْغُسْلِ»[2]

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غسل کے بعد وضو نہیں کیا کرتے تھے۔

غسلِ حیض و نفاس کے لیے پانی میں بیری کے پتے ڈالنا بھی بخاری و مسلم اور مسند احمد میں ثابت ہے۔[3]

عورتوں کا غسلِ حیض کے لیے چوٹیاں کھولنا:

جیسا کہ پہلے بھی ہم مختصراً اشارہ کر چکے ہیں کہ عورت کے لیے غسلِ جنابت کے وقت سر کے بالوں کو کھولنا ضروری نہیں، البتہ حیض و نفاس کے غسل کے لیے اپنی چوٹی کو کھولنا ضروری ہے، جیسا کہ صحیح مسلم، سننِ اربعہ اور مسندِ احمد میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے اس بات کا پتا چلتا ہے۔[4]

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٣/ ٢٣١۔ ٢٣٢) نيل الأوطار (١/ ١٧٥۔ ١٧٦) تحفة الأحوذي (١/ ١٧٤۔ ١٧٥) الفتح الرباني (٢/ ١٣٧۔ ١٣٨) السلسلة الضعيفة للألباني (٢/ ٣٣) تحقيق مشكاة المصابيح للألباني (١/ ١٣٦)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٢٥) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٧٩) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٢٤٦) صححه الترمذي و الحاكم و الذهبي و الألباني في مشكاة المصابيح (١/ ١٣٩) حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غسل کے بعد پاؤں دھویا کرتے تھے۔ یعنی پاؤں کے دھونے کو موخر کرنا، یہ صرف حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں ہے۔

[3] الفتح الرباني (٢/ ١٦٧)

[4] حواله سابقه (٣/ ١٣٥)

عورت کے لیے جنابت کے غسل کے وقت چوٹی نہ کھولنے اور حیض و نفاس کے لیے چوٹی کھولنے کے الگ الگ حکم کی فقہا نے یہ توجیہ کی ہے کہ حالتِ جنابت چونکہ بکثرت ہوتی ہے، لہٰذا اس کے لیے ہر مرتبہ چوٹی کھول کر سر دھونا باعثِ مشقت فعل ہے، جبکہ حیض تو ایک ماہ میں صرف ایک ہی بار اور نفاس سالوں میں کبھی کبھار ہوتا ہے، لہٰذا ان میں چوٹی کھولنا باعثِ مشقت نہیں رہتا۔[1]

آدابِ غسل ہی میں سے یہ بھی ہے کہ پردے میں غسل کریں، کیوں کہ سنن ابی داود ونسائی اور مسندِ احمد میں ارشادِ نبوی ﷺ مروی ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ تَعَالَىٰ حَيِيٌّ سِتِّيرٌ، يُحِبُّ الْحَيَاءَ وَالتَّسَتُّرَ، فَإِذَا اغْتَسَلَ أَحَدُكُمْ فَلْيَسْتَتِرْ»[2]

''اللہ تعالیٰ بہت حیا اور پردے والا ہے اور حیا اور پردے کو پسند کرتا ہے، پس تم میں سے جب کوئی شخص غسل کرے تو اسے چاہیے کہ پردے میں غسل کرے۔''

[1] المغني (١/ ٢٢٦) إرواء الغليل (١/ ١٦٧)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣٨٧) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٩٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٣٦) و صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٩) مشكاة المصابيح (١/ ١٣٩) صحيح الجامع (١٧٥٦)

قضاے حاجت کے آداب

حدیثِ اصغر، جو پیشاب، پاخانہ، خروجِ ہوا اور خروجِ مذی و ودی کی شکل میں رونما ہوتا ہے، اس کا ازالہ صرف طہارت و وضو ہی سے ہو جاتا ہے، اس کے لیے غسل کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ اس حدثِ اصغر کے موجبات میں سے ایک قضاے حاجت بھی ہے۔ لہٰذا آیئے پہلے ارشاداتِ رسول ﷺ کی روشنی میں قضاے حاجت کے آداب کا مطالعہ کریں۔

اوّل:

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ قضاے حاجت کے وقت پردے کی خاص کوشش کی جائے۔ لیٹرین یا بیت الخلاء تو عموماً باپردہ ہی ہوتے ہیں، لیکن اگر کبھی کھلے میدان میں اس کا موقع آجائے تو لوگوں کی نظروں سے دور نکل جانا چاہیے، کیوں کہ سننِ اربعہ اور مسندِ احمد میں مختلف الفاظ، مگر ایک ہی مفہوم کی یہ حدیث مروی ہے:

((كَانَ اِذَا اَرَادَ الْحَاجَةَ اَبعَدَ))[1]

''نبیِ کریم ﷺ جب قضاے حاجت کا ارادہ فرماتے تو دور نکل جاتے تھے۔''

سنن ابی داود میں یہ الفاظ بھی مذکور ہیں:

((حتیٰ لَا یَراہُ اَحَدٌ))[2] ''یہاں تک کہ کوئی شخص آپ ﷺ کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔''

سنن ابن ماجہ میں مروی ہے:

((فَلَا یُرٰی))[3] ''آپ ﷺ نظر نہیں آتے تھے۔''

---

[1] دیکھیں: الفتح الرباني (١/ ٢٦١) منتقى الأخبار (١/ ٧٥)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٣٥)

دوم:

دوسری بات یہ کہ اس وقت اپنے پاس کوئی ایسی چیز نہیں رکھنی چاہیے، جس پر اللہ کا کوئی نام لکھا ہوا ہو، کیوں کہ یہ باعثِ توہین ہے۔ سنن اربعہ اور مسند احمد میں مروی ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا دَخَلَ الْخَلَاءَ نَزَع خَاتَمَهُ»[1]

''نبی ﷺ جب بیت الخلاء میں داخل ہوتے تو اپنی انگوٹھی اتار کر جاتے۔''

اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ کی انگوٹھی میں «مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ» کے کلمات نقش تھے، آپ ﷺ اس سے مہر لگانے کا کام لیا کرتے تھے۔ انگوٹھی اتار کر بیت الخلاء میں جانے والی اس روایت کو بعض محدّثین نے ضعیف قرار دیا ہے اور بعض نے اسے صحیح کہا ہے۔[2]

سند کے اعتبار سے اس کی حیثیت چاہے کیسی بھی ہے، مفہوم کے اعتبار سے یہی درست اور قرینِ احتیاط ہے، تاکہ اسمِ جلالت کی توہین کا کوئی پہلو نہ نکلے اور اسی سے ایسے لاکٹ کا حکم بھی واضح ہو جاتا ہے، جس میں لفظِ ''اللہ'' نقش ہوتا ہے۔ اوّل تو ایسا لاکٹ عورت یا بچی کے لیے خریدنا ہی نہیں چاہیے، کیوں کہ اس کے احترام کو کما حقہٗ ادا کرنے میں مشکل ہو جاتی ہے اور اگر بس وہی لینا ہے تو پھر اس کے احترام و مقام کا پورا پورا خیال رکھنا ہوگا اور حیض و نفاس کے ایام، اوقاتِ جماع اور بیت الخلاء میں داخل ہونے سے قبل اسے اتارنا ہوگا۔

سوم:

قضاے حاجت کے آداب میں سے تیسری بات یہ ہے کہ بیت الخلاء میں داخل ہونے سے قبل وہ دعا مانگی جائے، جس کی نبیِ کریم ﷺ نے تعلیم فرمائی ہے۔ چنانچہ صحاح و سنن اور معاجم و مسانید میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ کریم ﷺ بیت الخلاء میں داخل ہونے سے قبل یہ دعا مانگا کرتے تھے:

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٩) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٤٦) سنن النسائي، باب نزع الخاتم عند دخول الخلاء، سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٠٣) المنتقى مع النيل (١/ ٧٣) ضعيف الجامع (٤٣٩٥)

[2] تفصیل کے لیے دیکھیں: نيل الأوطار (١/ ٧٣۔ ٧٤) تحقيق المشكاة للألباني (١/ ١١١)

«اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَ الْخَبَائِثِ»[1]

''اے اللہ! میں نر و مادہ تمام ناپاک روحوں (جنوں اور شیطانوں) سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔''

بیت الخلاء سے نکلتے وقت سنن ابی داود، ترمذی، ابن ماجہ اور مسندِ احمد میں مذکور وہ دعا کرنا بھی سنت ہے، جس کا صرف ایک ہی لفظ ہے:

«غُفْرَانَكَ»[2] ''اے اللہ! میں تیری بخشش چاہتا ہوں۔''

سنن ابن ماجہ میں ایک دعا اور بھی مذکور ہے:

«اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنِّی الْأَذٰی وَ عَافَانِیْ»[3]

''تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں، جس نے میرے جسم سے اذیت کو دور فرمایا اور مجھے عافیت سے نوازا۔''

مگر اس کی سند ضعیف ہے۔

چہارم:

اسی سلسلے میں چوتھی بات یہ ہے کہ قضائے حاجت کے دوران میں آدمی چونکہ عریاں بیٹھا ہوتا ہے، لہٰذا ایسے میں کسی قسم کی کوئی بات کرنا جائز نہیں، حتیٰ کہ کسی کے سلام کا جواب بھی نہیں دینا چاہیے، کیوں کہ صحیح مسلم اور سننِ اربعہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایسی حالت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک شخص گزرا اور اس نے سلام کہا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جواب نہیں دیا۔ جبکہ سنن ابو داود، ابن ماجہ اور مسند احمد میں ہے:

«فَاِنَّ اللّٰهَ يَمْقُتُ عَلٰی ذٰلِكَ»[4]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٢) مختصر صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٨) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٩) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٩٦) مسند أحمد (٣/ ٩٩۔ ١٠١) المنتقى مع النيل (١/ ٧٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٧١٢)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٣) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٠٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٤٧٠٧) الإرواء، رقم الحديث (٩٢)

[3] سنن ابن ماجه (٣٠١) المنتقى مع النيل (١/ ٧٣) تحقيق المشكاة (١/ ١٢٠)

[4] **یہ حدیث ضعیف ہے۔** تمام المنة (٥٨۔ ٥٩) سنن ابن ماجه (٣٤٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥)

’’اس حالت میں باتیں کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ سخت ناراض ہوتا ہے۔‘‘

یہ ناراضی ننگے ہونے کی حالت میں باتیں کرنے پر ہے، تو حمام میں باتیں کرنے اور گنگنانے والے بھی اسی کے تحت آجاتے ہیں۔ وہ بھی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں۔

پنجم:

قضاے حاجت کے آداب ہی میں سے پانچویں بات یہ ہے کہ کہیں کھلی فضا میں رفعِ حاجت کی نوبت آجائے تو قبلہ شریف کی طرف منہ کرنا اور ادھر پیٹھ کر کے بیٹھنا دونوں ہی ممنوع ہیں، کیوں کہ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اِذَا أَتَیْتُمُ الغَائِطَ، فلا تَستَقبِلُوا الْقِبْلَةَ وَ لَا تَسْتَدْبِرُوْهَا»[1]

’’جب تم رفعِ حاجت کے لیے بیٹھو تو نہ قبلہ شریف کی طرف رُخ کرو اور نہ پیٹھ کرو۔‘‘

یہ ممانعت کھلی فضا میں رفعِ حاجت کے لیے ہے، البتہ اگر گھروں میں یا کہیں بھی جو حمام یا لیٹرینیں بنی ہوئی ہوتی ہیں، ان کی چار دیواری کے اندر قضاے حاجت اس ممانعت سے مستثنیٰ ہے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ اور صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اور سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد، صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان، مسند بزار، سنن دارقطنی اور مستدرک حاکم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایات اور سنن ابی داود میں مروان الاصغر کے طریق سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے فعل سے ثابت ہے۔[2] البتہ امام شوکانی اور شیخ البانی کا رجحان مطلق تحریم کی طرف ہے، صحرا میں ہوں یا چار دیواری میں۔[3]

ششم:

قضاے حاجت کے آداب میں سے چھٹا ادب یہ ہے کہ کسی ایسی جگہ اور ایسے انداز سے پیشاب نہیں کرنا، جہاں سے پیشاب کے چھینٹے پڑنے کا خدشہ ہو، کیوں کہ پیشاب کے چھینٹوں

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٤) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٥٢۔ ١٥٣) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٧) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٢١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٨) المنتقى (١/ ٨٠) و المشكاة، رقم الحديث (٣٣٤)

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: المنتقى مع النيل (١/ ٨٠۔ ٨٣)

[3] نيل الأوطار (١/ ٨٠) تمام المنة (ص: ٦٠)

سے پرہیز نہ کرنا گناہِ کبیرہ اور عذابِ الٰہی کو دعوت دینے والی بات ہے، کیوں کہ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ نبیِ کریم ﷺ کا گزر دو قبروں کے پاس سے ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«اِنَّھُما لَیُعَذَّ بَانِ وَ مَا یُعَذَّ بَانِ فِیْ کَبِیْرٍ وَلٰکِنَّہٗ کَبِیْرٌ»

''ان دونوں قبروں والوں کو عذاب دیا جا رہا ہے اور یہ عذاب بھی انھیں بظاہر کسی بڑے گناہ پر نہیں ہو رہا، لیکن وہ کبیرہ ہی ہے۔''

آگے ان دونوں کے عذاب کے اسباب و موجبات بتاتے ہوئے فرمایا:

«أَمَّا أَحَدُھُمَا فَکَانَ لَا یَسْتَتِرُ مِنَ الْبَوْلِ (وَفِيْ رِوَایَةٍ لِّمُسْلِمُ: لَا یَسْتَنْزِہُ مِنَ الْبَوْلِ) وَأَمَّا الْآخِرُ فَکَانَ یَمْشِيْ بِالنَّمِیْمَةِ»[1]

''ان میں سے ایک کا گناہ تو یہ ہے کہ وہ پیشاب کے چھینٹوں سے پرہیز نہیں کیا کرتا تھا اور دوسرا چغل خوری کی عادت میں مبتلا تھا۔''

لہٰذا اگر لیٹرین میں پیشاب کیا جائے تو چھینٹوں سے بچنے کی پوری کوشش کی جائے اور اگر کہیں باہر اس کی نوبت آجائے تو نرم و پست جگہ تلاش کرنی چاہیے، تاکہ چھینٹوں سے بچا جاسکے اور کھڑے ہوکر پیشاب کرنے میں بھی چھینٹوں کا خدشہ ہوتا ہے، لہٰذا اس سے بھی پرہیز کیا جائے۔

ہفتم:

قضائے حاجت کے آداب میں سے ساتویں بات یہ ہے کہ کسی ایسی جگہ بیٹھنا موجبِ لعنت ہے، جو لوگوں کی گزرگاہ، عام راستہ یا بیٹھنے کی جگہ ہو، کیوں کہ صحیح مسلم اور سنن ابی داود میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«اِتَّقُوْا اللَّا عِنَیْنِ» ''دو موجبِ لعنت کاموں سے بچو۔''

پوچھا گیا کہ وہ کون کون سے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«اَلَّذِيْ یَتَخَلّٰی فِيْ طَرِیْقِ النَّاسِ أَوْ ظِلِّھِمْ»[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢١٦) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٢٠١۔ ٢٠٠) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥) صحيح سنن الترمذي (٦٠) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٩٥٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٤٧) مشكاة المصابيح (١/ ١١٠)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٦١) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠)

’’لوگوں کی گزر گاہ یا راستے اور اس جگہ قضاے حاجت کے لیے بیٹھنا، جہاں وہ سائے کے لیے بیٹھتے ہوں۔‘‘

ہشتم:

آٹھویں بات یہ کہ کہیں ٹھہرے ہوئے پانی میں ہرگز پیشاب نہ کیا جائے، کیوں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے اس سے منع کیا ہے۔ چنانچہ صحیح سنن نسائی، سنن ابن ماجہ اور مسندِ احمد میں مروی ہے:

«اَنَّهٗ نَهٰى أَنْ يُّبَالَ فِيْ الْمَآءِ الرَّاكِدِ»[1]

’’نبیِ کریم ﷺ نے ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا ہے۔‘‘

صحیح مسلم اور سنن ابی داود کے الفاظ ہیں:

«لَا يَبُوْلَنَّ أَحَدُكُمْ فِيْ الْمَآءِ الدَّائِمِ»[2]

’’تم میں سے کوئی شخص ٹھہرے ہوئے پانی میں ہرگز پیشاب نہ کرے۔‘‘

نہم:

بیت الخلاء میں قضاے حاجت کی شکل تو ظاہر ہے کہ پانی ساتھ موجود ہوگا، لیکن اگر کبھی کھلی جگہ پر رفعِ حاجت کی نوبت آجائے تو کم از کم تین ڈھیلے استعمال میں لائے جائیں، کیوں کہ صحیح مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« نَهَانَا [يَعْنِي الرَّسُوْلَ ﷺ] أَنْ نَّسْتَنْجِيَ بِأَقَلَّ مِنْ ثَلَاثَةِ أَحْجَارٍ »

’’نبیِ اکرم ﷺ ہمیں تین ڈھیلوں (پتھروں) سے کم کے ساتھ طہارت کرنے سے منع فرمایا ہے۔‘‘

آگے ڈھیلوں کی مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

«أَوْ أَنْ نَّسْتَنجِي بِرَجِيْعٍ أَوْ بِعَظْمٍ»[3]

---

[1] صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٤٣)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٨٧) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٢۔ ٦٣)

[3] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٥٢) و صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥) و سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٦) مشكاة المصابيح (١/ ١٠٩۔ ١١٠)

''اور اس سے بھی منع فرمایا کہ ہم کسی جانور کے فضلے (گوبر یا لید وغیرہ) سے یا ہڈی سے استنجا کریں۔''

سنن ابی داود، نسائی، ابن ماجہ، دارمی اور صحیح ابی عوانہ میں بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک ارشادِ نبوی ﷺ میں تین ڈھیلے استعمال کرنے کا حکم اور گوبر و ہڈی سے استنجا کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ اسی معنیٰ کی ایک حدیث سنن ترمذی ونسائی میں بھی مروی ہے۔[1]

سنن ترمذی شریف میں ان کے ساتھ استنجا نہ کرنے کی وجہ بھی بیان کی گئی ہے:

«فَإِنَّهُ زَادُ إِخْوَانِكُمْ مِنَ الْجِنِّ»[2]

''یہ چیزیں تمھارے جن بھائیوں کی خوراک ہیں۔''

سنن ابو داود ونسائی میں ایک ارشادِ نبوی ﷺ میں تو بڑی سرزنش فرمائی ہے:

«مَنْ عَقَدَ لِحُيَتَهُ اَو تَقَلَّدَ وَتَراً اَوِ اسْتَنْجَىٰ بِرَجِيعِ دَابَّةٍ أَوْ عَظْمٍ فَإِنَّ مُحَمَّداً بَرِيْءٌ مِّنْهُ»[3]

''جس نے اپنی ڈاڑھی کو گرہ لگائی یا تندی کو لٹکایا یا کسی جانور کے فضلے یا ہڈی سے استنجا کیا تو محمد (ﷺ) اس شخص سے بری ہیں۔''

دہم:

اس سلسلے میں دسویں ہدایت یہ ہے کہ استنجا کے لیے دائیں ہاتھ کو ہرگز استعمال نہ کیا جائے بلکہ بائیں ہاتھ سے کیا جائے۔ کیوں کہ صحیح مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہمیں نبی کریم ﷺ نے اس سے منع فرمایا:

«أَنْ نَّسْتَنْجِيَ بِالْيَمِيْنِ»[4]

''ہمیں نبیِ کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ ہم دائیں ہاتھ سے استنجا کریں۔''

---

[1] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٨۔ ٣٩)

[2] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧) مشكاة المصابيح (١/ ١١٣)

[3] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٧) مشكاة المصابيح (١/ ١١٣۔ ١١٤)

[4] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٥٢) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٦) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥) مشكاة المصابيح (١/ ١٠٩)

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِذَا شَرِبَ أَحَدُكُمُ الْمَآءَ فَلَا يَتَنَفَّسْ فِيْ الْإِنَاءِ، وَإِذَا أَتَى الْخَلَاءَ فَلَا يَمُسَّ ذَكَرَهٗ بِيَمِيْنِهٖ، وَلَا يَتَمَسَّحْ بِيَمِيْنِهٖ»[1]

''جب تم میں سے کسی نے کچھ پینا ہو تو برتن میں سانس نہ لے اور جب بیت الخلاء میں داخل ہو تو اپنے دائیں ہاتھ سے شرم گاہ کو چھوئے نہ اس سے اسے پونچھے۔''

سنن ابی داود، نسائی، ابن ماجہ، دارمی اور صحیح ابن عوانہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث کے آخری الفاظ ہیں:

«وَنَهٰى أَنْ يَّسْتَطِيْبَ الرَّجُلُ بِيَمِيْنِهٖ»[2]

''نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں ہاتھ سے طہارت کرنے سے منع فرمایا ہے۔''

یازدہم:

قضاے حاجت اور استنجا کے آداب میں سے گیارھویں بات یہ ہے کہ استنجا کرنے کے بعد اپنے بائیں ہاتھ کو زمین پر رگڑ کر دھوئیں، کیوں کہ سنن ابی داود و دارمی اور انھی سے ملتی جلتی حدیث سنن نسائی میں مروی ہے، جس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے استنجا کیا:

«ثُمَّ مَسَحَ يَدَهٗ عَلَى الْأَرْضِ»[3] ''پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا ہاتھ زمین پر ملا۔''

آج کل باتھ روم اور بیت الخلاء جس انداز کے بنے ہوتے ہیں، ان میں اگر کھردری جگہ ہو تو وہاں ہاتھ مل لیا جائے، بہ صورتِ دیگر صابن سے ہاتھ دھو لیا جائے تو بھی ان شاء اللہ مقصود حاصل ہو جاتا ہے، اگرچہ زمین پر ہاتھ رگڑنے کی اپنی ہی ایک حیثیت ہے۔

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١٥٣) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٥٩۔ ١٦٠) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٦) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٠) مشكاة المصابيح (١/ ١١١)

[2] صحيح أبي داود، رقم الحديث (٦) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣١٢) مشكاة المصابيح (١/ ١١٢)

[3] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٥٨) مشكاة المصابيح (١/ ١١٦)

دوازدہم:

اسی سلسلے کی بارھویں ہدایت یہ ہے کہ جب قضاے حاجت کے بعد وضو کیا جائے تو وضو سے فارغ ہونے کے بعد شرم گاہ پر پانی کا چھینٹا مار دیا جائے، کیوں کہ سنن ابی داود ونسائی میں مروی ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا بَالَ تَوَضَّأَ، وَنَضَحَ فَرْجَهُ»[1]

''نبیِ اکرم ﷺ نے جب بھی پیشاب کیا اور وضو کیا تو اپنی شرم گاہ پر چھینٹا مارا۔''

ایسے ہی مسند احمد، سنن دارقطنی اور ابن ماجہ میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے اس چھینٹا مارنے کی تائید ہوتی ہے، جس میں مذکور ہے:

''جب پہلی مرتبہ حضرت جبرائیل علیہ السلام وحی لے کر وضو اور نماز سکھلانے آئے اور وضو سے فارغ ہوئے تو انھوں نے پانی کا چلو لیا اور شرم گاہ پر چھینٹا مارا۔''[2]

چھینٹا مارنے کا بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جنھیں پیشاب کے بعد قطرہ آنے کی شکایت ہو، وہ دور ہو جاتی ہے، ذہن سے شک دور ہو جاتا ہے اور آدمی پورے اطمینان سے نماز ادا کر سکتا ہے۔

سیز دہم:

قضاے حاجت کے آداب میں سے تیرھواں اور آخری ادب یہ ہے کہ رفعِ حاجت کے لیے بیٹھنے کا انداز یہ ہونا چاہیے کہ دایاں پاؤں کھڑا ہو اور بایاں حسبِ عادت رکھا ہو اور اس پر ٹیک لگائی ہو۔ اس سلسلے میں معجم طبرانی کبیر، مستدرکِ حاکم اور سنن بیہقی میں سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت بھی مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«اَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ نَّتَوَكَّأَ عَلَى الْيُسْرٰى و اَن نَّنْصِبَ الْيُمْنٰى»[3]

''ہمیں نبیِ کریم ﷺ نے حکم فرمایا کہ (رفعِ حاجت کے وقت) ہم اپنا دایاں پاؤں کھڑا رکھیں اور بائیں پر ٹیک لگائیں۔''

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٢) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٦١) مشكاة المصابيح و صححه الألباني (١/ ١١٦ لشواهده)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٦٢) السلسلة الضعيفة للألباني، رقم الحديث (٣١٢) مشكاة المصابيح (١/ ١١٧۔ ١١٨)

[3] المعجم الكبير (٧/ ١٦٠۔ ١٦١) و الأوسط (١/ ٣٣٩)

اس روایت کی سند میں تو تابعی اور ان سے روایت کرنے والے دو راوی مجہول ہیں، لہٰذا اس کی سند تو ضعیف ٹھہری، البتہ یہ انداز طبی طور پر مفید ہے، کیوں کہ امام ابن قدامہ لکھتے ہیں:

''اس طرح قضائے حاجت میں آسانی رہتی ہے اور زیادہ دیر تک بیٹھے رہنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ (زیادہ دیر بیٹھنا) بواسیر کا سبب بنتا ہے اور اس میں بعض دیگر طبی نقصانات بھی پائے جاتے ہیں، لہٰذا مذکورہ انداز ہی مفیدِ مطلب ہے۔ یہی انداز امام ابن المنذر نے ''الأوسط'' میں بھی ذکر کیا ہے۔''[1]

---

[1] المغني لابن قدامة (١/ ١٥٩)

بعض وضاحتیں

پچھلے اوراق میں ہم نے معلمِ انسانیت نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں قضائے حاجت اور طہارت و استنجا کے آداب ذکر کیے ہیں، اسی سلسلے میں دو ایک وضاحتیں بھی ہیں۔

پہلی وضاحت:

ان میں سے پہلی وضاحت یہ ہے کہ صحرا یا کھلی فضا میں رفعِ حاجت کی شکل میں صرف ڈھیلوں سے استنجا کرنے پر اکتفا بھی جائز ہے اور ٹائلٹ میں صرف پانی سے طہارت کر لینا بھی صحیح بلکہ پہلی صورت سے بہتر ہے۔ پانی نہ ہونے کے وقت ڈھیلے استعمال کیے جائیں، پھر پانی ملنے پر اس سے بھی طہارت کرلی جائے اور دونوں طریقے جمع کر لیے جائیں تو یہ جائز و درست ہی نہیں، بلکہ زیادہ افضل اور بہتر ہے، بہرحال یہ تینوں شکلیں جائز اور ثابت ہیں۔

صرف ڈھیلے اور صرف پانی سے طہارت کی دونوں شکلوں کے دلائل تو آپ کے سامنے آچکے ہیں، جبکہ پہلے ڈھیلے اور پھر پانی سے جواز وفضیلت کا پتا سنن ابی داود، ترمذی، ابن ماجہ اور مسندِ بزار میں مختصر و مفصل حدیث سے لگتا ہے، جس میں مروی ہے کہ اہلِ قبا کی تعریف میں سورۃ التوبہ کی آیت (۱۰۸) نازل ہوئی، جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ﴾

''اس میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو بڑے طہارت پسند ہیں اور اللہ خوب طہارت و پاکیزگی رکھنے والوں کو پسند کرتا اور محبوب رکھتا ہے۔''

اس آیت کے نزول کے بعد نبیِ اکرم ﷺ نے اہلِ قبا سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''اے انصار کے لوگو! اللہ تعالیٰ نے طہارت کے بارے میں تمھاری تعریف فرمائی ہے۔ بھلا بتاؤ تو تمھاری طہارت کیا ہے؟''

تو انھوں نے جواباً عرض کی کہ ہم نماز کے لیے وضو کرتے ہیں، جنابت سے غسل کرتے ہیں اور (ڈھیلوں کے استعمال کے باوجود) پانی سے استنجا کرتے ہیں۔ اس پر نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا:

((فَهُوَ ذَاكَ، فَعَلَيْكُمُوْهُ)) [1] ''تو پھر یہی وجۂ تعریف ہے، لہٰذا تم اس طریقے پر کاربند رہو۔''

یہ روایت سنن ابی داود و ترمذی میں قدرے مختصر مروی ہے۔[2] ڈھیلوں کے استعمال کے باوجود بعد میں پانی سے استنجا کرنے کے الفاظ مسند بزار میں مروی ہیں۔ سنن ابن ماجہ والی روایت کی سند تو ضعیف ہے، مگر اس کے کئی شواہد موجود ہیں، جن سے اس ضعف کا کسی حد تک ازالہ ہو جاتا ہے۔[3]

دوسری وضاحت:

اس سلسلے میں دوسری وضاحت یہ ہے کہ ڈھیلوں اور پانی دونوں سے طہارت کی فضیلت حاصل کرنے یا کسی عادت کے ہاتھوں مجبور ہو کر بعض لوگ طہارت خانوں میں پانی ہونے کے باوجود ڈھیلے بھی ساتھ لے جاتے ہیں، جس سے طہارت خانوں میں غلاظت و گندگی پیدا ہوتی ہے اور بعض اوقات پانی کی نکاسی میں رکاوٹ کا باعث بن کر بدبو پھیلانے کا سبب بھی بنتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل بہر حال ٹھیک نہیں، جہاں پانی میسر ہو، وہاں صرف پانی ہی پر اکتفا کرنا سنت ہے اور اسی میں کفایت ہے، تکلفات مطلوب نہیں ہیں، خصوصاً جبکہ وہ دوسروں کے لیے تکلیف کا باعث بھی بنتے ہوں۔

تیسری اہم وضاحت:

اب یہاں ذرا معلمِ انسانیت ﷺ کے سکھلائے ہوئے ان تمام آداب کو دوبارہ ذہن میں لائیں تو بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ حیاتِ انسانی کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں ہو سکتا، جس کے بارے میں نبیِ اکرم ﷺ کی تعلیمات موجود نہ ہوں۔ یہ اسلامی تعلیمات کی ہمہ گیری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

صحیح مسلم اور مسند احمد (واللفظ لہ) میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے ارشاد سے پتا چلتا ہے کہ انھیں کسی مشرک نے از راہِ مذاق کہا تھا:

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٥٥)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٤)

[3] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: تحقيق مشكاة المصابيح للألباني (١/ ١١٨) المنتقى مع النيل (١/١٠٠۔ ١٠١)

«إِنِّي لَأَرَىٰ صَاحِبَكُمْ يُعَلِّمُكُمْ حَتَّى الْخِرَاءَةَ»[1]

''میں دیکھ رہا ہوں کہ تمھارا ساتھی (نبی ﷺ) تمھیں قضاے حاجت تک کے آداب بھی سکھلاتا ہے۔''

اس پر انھوں نے جواب دیا: ہاں! پھر ساتھ ہی اسے وہ آداب بھی بتا دیے۔ اس مشرک نے اگرچہ یہ مذاقاً کہا تھا، مگر یہ بات عقل وفکر اور فہم و دانش کے لیے عبرت کا سامان لیے ہوئے ہے کہ جس دین کی تعلیمات میں اس حد تک ہمہ گیری ہے، اس میں کسی بڑے شعبۂ حیات کو نظر انداز کیسے کیا گیا ہوگا؟ ہاں، اگر کوئی اسلامی تعلیمات کو حاصل کرنے کی توفیق نہ رکھتا ہو اور اپنی اس بے توفیقی پر یہ بھی کہہ دے کہ یہ دین موجودہ دَور کی ضروریات کے حل پیش نہیں کرتا تو پھر یہ اس دین کا قصور نہیں، بلکہ اس کی اپنی عقل کا فتور ہے۔ اُلّو یا چمگادڑ اگر دن دھاڑے آنکھ نہ کھول سکیں تو اس میں سورج کی ضیا باریوں پر کیسے شک کیا جا سکتا ہے؟ فاعتبروا یا أولي الأبصار.

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٥٢) مشكاة المصابيح (١/ ١١٩)

اسباب وموجبات یا نواقضِ وضو

اور

وضو سے قبل چند امور

حدثِ اصغر جس کے اسباب و موجبات بول و براز، نیند، خروجِ ہوا، خروجِ مذی، خروجِ ودی اور خونِ استحاضہ وغیرہ ہیں۔ اس حدث کا ازالہ صرف استنجا اور وضو کر لینے ہی سے ہو جاتا ہے۔ جبکہ نیند اور خروجِ ہوا کے بعد استنجا کی بھی ضرورت نہیں ہوتی، محض وضو کر لینا ہی کافی ہو جاتا ہے۔ وضو کا نبیِ کریم ﷺ سے ثابت شدہ صحیح احادیث میں جو مسنون طریقہ بتایا گیا ہے، اس کی تفصیل میں جانے سے پہلے چند امور کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔

(1) ہاتھ دھونا:

پہلا یہ کہ اگر کوئی شخص سو کر نہیں اٹھا، بلکہ حالتِ بیداری ہی میں ہے تو وہ پانی کے برتن سے بلا توقف جب چاہے یا جب ضرورت ہو وضو کر لے، لیکن اگر کوئی شخص سو کر اٹھا ہو اور کسی ٹب یا برتن سے وضو کرنا ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس برتن میں اس وقت تک ہاتھ نہ ڈالے، جب تک پہلے کسی چیز سے پانی نکال کر اپنے ہاتھوں کو نہ دھو لے، کیوں کہ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«إِذَا اسْتَيْقَظَ أَحَدُكُمْ مِنْ نَّوْمِهٖ فَلَا يَغْمِسْ يَدَهٗ فِي الْإِنَاءِ حَتّٰى يَغْسِلَهَا فَإِنَّهٗ لَا يَدْرِيْ أَيْنَ بَاتَتْ يَدُهٗ»[1]

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (١٦٢) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٧٨۔ ١٧٩) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٩٦) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٩٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١) مشكاة المصابيح (١/ ١٢٥)

''جب تم میں سے کوئی شخص نیند سے بیدار ہوتو وہ اپنا ہاتھ پانی کے برتن میں نہ ڈالے، یہاں تک کہ پہلے اسے دھو نہ لے، کیوں کہ کیا معلوم کہ نیند کے عالَم میں اس کے ہاتھ نے رات کہاں گزاری ہے؟''

یعنی ہوسکتا ہے کہ سوتے میں ہاتھ بدن کے پوشیدہ اعضا کو لگ کر ناپاک ہو گیا ہو۔ اگر اسی حالت میں پانی کے برتن میں ہاتھ ڈال دیا تو وہ پانی بھی متاثر ہوگا۔ اندازہ فرمائیں کہ طہارت اور پاکیزگی کی کتنی عمدہ تعلیم دی جا رہی ہے؟

(2) ناک جھاڑنا:

اسی طرح نیند سے بیدار ہونے والے شخص کے لیے صحیح بخاری و مسلم اور سنن میں ایک دوسری ہدایت بھی مذکور ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«إِذَا اسْتَيْقَظَ أَحَدُكُمْ مِنْ مَّنَامِهٖ فَلْيَسْتَنْثِرْ ثَلَاثاً، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ يَبِيْتُ عَلٰى خَيْشُوْمِهٖ»[1]

''جب تم میں سے کوئی شخص نیند سے بیدار ہوتو اسے چاہیے کہ اپنی ناک کو تین مرتبہ اچھی طرح جھاڑ لے، کیوں کہ شیطان اس کی ناک کے بانسے پر رات گزارتا ہے۔''

سونے والے کی ناک کے بانسے پر شیطان کے رات گزارنے کی کیا کیفیت ہوسکتی ہے؟ اس کی اصل حقیقت تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہمارا کام اَسرار و رموز کو جاننا نہیں بلکہ صادق و مصدوق نبی ﷺ کے ارشادات پر ایمان لانا ہے۔ البتہ یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ سونے کے دوران میں فضلات ونجاسات اور غبار و رینٹھ وغیرہ دماغ کے قریب جمع ہو جاتے ہیں، جن سے حواس میں تکدر آجاتا ہے اور عبادت میں کاہلی و سستی پیدا ہو جاتی ہے، جس سے شیطان خوش ہوتا ہے اور وہ رات بھر وہیں رہتا ہے۔ لہٰذا نیند سے بیدار ہو کر طبِ نبوی ﷺ کا یہ نسخہ استعمال کریں۔ اس طرح واقعی شیطان کا عمل دخل ختم ہو جاتا ہے اور ایسا کر لینے کے بعد انسان میں مستعدی و چستی آجاتی ہے۔ اس طرح نبی کریم ﷺ کے مذکورہ ارشادِ گرامی کو سمجھنے میں بھی کوئی دقت نہیں رہتی۔

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٣٢٩٥) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٢٧) و صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٩٤) و صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٨٨)

3 مسواک کرنا:

تیسرا امر یہ ہے کہ نیند سے بیدار ہونے کے بعد وضو کرنے سے پہلے یہ بھی سنت ہے کہ مسواک کی جائے۔ چنانچہ صحیح بخاری ومسلم، سنن نسائی و ابن ماجہ، مسند احمد، سنن دارمی اور بیہقی میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم إِذَا قَامَ لِلتَّهَجُّدِ مِنَ اللَّيْلِ يَشُوصُ فَاهُ بِالسِّوَاكِ»[1]

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات جب نمازِ تہجد کے لیے بیدار ہوتے تو خوب رگڑ کر مسواک فرماتے تھے۔''

جبکہ سنن ابی داود اور مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم لَا يَرْقُدُ مِنْ لَيْلٍ وَلَا نَهَارٍ فَيَسْتَيْقِظُ إِلَّا يَتَسَوَّكُ قَبْلَ أَنْ يَتَوَضَّأَ»[2]

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات یا دن کو جب بھی سو کر بیدار ہوتے تو وضو کرنے سے قبل مسواک فرمایا کرتے تھے۔''

البتہ بعض محدثینِ کرام نے اس حدیث میں «وَلَا نَهَارٍ» کے الفاظ کو ضعیف قرار دیا ہے اور ان کے بغیر اس حدیث کی سند کو حسن کہا ہے۔[3]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دن کو سو کر اٹھنے پر ہو نہ ہو، رات کے سونے کے بعد جب وضو کریں تو پہلے مسواک ضرور کر لیں اور مجموعی طور پر ہر نماز سے قبل وضو کے ساتھ مسواک کرنے کی نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت تاکید فرمائی ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری ومسلم، سنن ابی داود، ترمذی و نسائی، مسند احمد، سنن بیہقی اور دارمی میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«لَوْلَا أَنْ أَشُقَّ عَلٰى أُمَّتِي لَأَمَرْتُهُمْ بِتَأْخِيرِ الْعِشَآءِ وَ بِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ»[4]

---

1. صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٤٥) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٤٤) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨٦) مشكاة المصابيح (١/ ١٢١)
2. صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١) مسند أحمد (٦/ ١٦٠) مشكاة تحقيق الألباني (١/ ١٢٢)
3. مشكاة المصابيح أيضاً، و صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١)
4. صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٨٧) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٤٣) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٧) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨٧) مشكاة المصابيح (١/ ١٢١)

''اگر میں اپنی امت کے لیے باعثِ مشقت نہ سمجھتا تو حکم دے دیتا کہ نمازِ عشا تاخیر سے ادا کریں اور ہر نماز سے قبل مسواک کیا کریں۔''

مسواک کے طبی اور روحانی فوائد:

مسواک کو امورِ فطرت میں شمار کیا گیا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم شریف کی ایک متفق علیہ اور سنن کی حدیث میں پانچ امورِ فطرت شمار کرتے ہوئے نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«اَلْفِطْرَةُ خَمْسٌ: اَلْخِتَانُ وَالْإِسْتِحْدَادُ وَقَصُّ الشَّوَارِبِ، وَتَقْلِيمُ الْأَظْفَارِ وَنَتْفُ الْإِبِطِ»[1]

''امورِ فطرت پانچ ہیں: ① ختنہ کرنا۔ ② زیرِ ناف بالوں کو صاف کرنا۔ ③ مونچھوں کو کاٹنا۔ ④ ناخن تراشنا۔ ⑤ بغلوں کے بال اکھاڑنا۔''

جب کہ صحیح مسلم شریف اور سنن میں مزید تفصیل بھی مذکور ہے اور ایک ارشادِ نبوی ﷺ میں دس امور کو فطرت قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«عَشْرٌ مِنَ الْفِطْرَةِ: قَصُّ الشَّوَارِبِ وَإِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ، وَالسِّوَاكُ، وَاسْتِنْشَاقُ الْمَآءِ، وَقَصُّ الْأَظْفَارِ، وَغَسْلُ الْبَرَاجِمِ، وَنَتْفُ الْإِبِطِ، وَحَلْقُ الْعَانَةِ، وَانْتِقَاصُ الْمَآءِ، قَالَ الرَّاوِي: وَنَسِيتُ الْعَاشِرَةَ إِلَّا أَنْ تَكُونَ الْمَضْمَضَةُ»[2]

''دس امورِ فطرت میں سے ہیں: ① مونچھوں کو کاٹنا۔ ② ڈاڑھی بڑھانا۔ ③ مسواک کرنا۔ ④ ناک میں پانی چڑھانا۔ ⑤ ناخن تراشنا۔ ⑥ انگلیوں کے بنیادی جوڑوں (یعنی ہاتھوں) کو دھونا۔ ⑦ بغلوں کے بالوں کو اکھاڑنا۔ ⑧ زیرِ ناف بالوں کو اکھاڑنا۔ ⑨ استنجا کرنا (پانی سے)۔ راویِ حدیث فرماتے ہیں کہ دسویں چیز میں بھول گیا ہوں، غالباً وہ کلی کرنا تھی۔''

---

[1] صحیح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٤٦) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (٩) صحیح سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٢١٣) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٢٩٢) إرواء الغلیل (١/ ١١٢)

[2] صحیح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٤٧) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤٣) صحیح سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٢١٤) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٢٩٣) إرواء الغلیل (١/ ١٢١)

یہیں یہ ضروری وضاحت بھی سن لیں کہ سنن ابی داود میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

《وُقِّتَ لَنَا حَلْقَ الْعَانَةِ وَتَقْلِمَ الْأَظْفَارِ وَقَصَّ الشَّارِبِ وَنَتْفَ الْإِبِطِ أَرْبَعِيْنَ يَوْماً مَرَّةً》[1]

''ہمارے لیے وقت مقرر کیا گیا ہے کہ ہم (زیادہ سے زیادہ) ہر چالیس دن میں ایک مرتبہ ضرور زیرِ ناف بالوں کو صاف کریں، ناخن تراشیں، مونچھیں کاٹیں اور بغلوں کے بال اُکھاڑیں۔''

مسواک کی اہمیت یہی نہیں کہ وہ امورِ فطرت میں سے ہے، بلکہ صحیح بخاری میں تعلیقاً اور سنن نسائی، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، سنن دارمی، مسندِ احمد، مسندِ شافعی اور سنن کبریٰ بیہقی میں موصولاً مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

《اَلسِّوَاكُ مَطْهَرَةٌ لِّلْفَمِ، مَرْضَاةٌ لِلرَّبِّ》[2]

''مسواک منہ کے لیے طہارت کا باعث اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا سبب ہے۔''

معجم طبرانی الاوسط کی ایک ضعیف روایت میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں:

《مَجْلَاةٌ لِلْبَصَرِ》[3] ''نظر کو تیز کرتی ہے۔''

معلوم ہوا کہ صرف سو کر اٹھنے کے بعد ہی نہیں، بلکہ ہر وضو سے پہلے مسواک کر لینا باعثِ اجر و ثواب اور ذریعہ فضیلت ہے، حتیٰ کہ اگر روزہ ہو تو جمہور اہلِ علم کے نزدیک روزے کی حالت میں بھی ہر وقت مسواک کی جا سکتی ہے، اس سے روزے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔[4]

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو لکڑی کی اور وہ بھی پیلو کی لکڑی کی مسواک کیا کرتے تھے، جیسا کہ صحیح ابن حبان، مسند احمد، ابو یعلیٰ، بزار، طیالسی، حلیۃ الاولیا ابو نعیم اور طبرانی میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

---

[1] سنن أبي داود (٢/ ٤/ ٨٤ طبع مكتبة الرياض الحديثة) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٣٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٤) صحيح سنن الترمذي (٢٢١٥ـ ٢٢١٦) سنن ابن ماجه (٢٩٢)

[2] صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥) صحيح البخاري تعليقاً مع الفتح (٤/ ١٨٧) مشكاة المصابيح (١/ ١٢٢)

[3] إرواء الغليل (١/ ١٠٥) مگر اس روایت کی سند ضعیف ہے۔

[4] نيل الأوطار (١/ ١٠٧ـ ١٠٨)

«كُنْتُ أَجْتَنِي لِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ سِوَاكًا مِّنَ الْأَرَاكِ»[1]

”میں نبی کریم ﷺ کے لیے اراک (پیلو) کی مسواک کاٹ کر لایا کرتا تھا۔“

اراک یا پیلو کے علاوہ کیکر، شیشم، نیم اور پیپل کی مسواک بھی دانتوں کے لیے طبی طور پر مفید قرار دی گئی ہے۔

[1] إرواء الغليل (١/ ١٠٤)

وضو کا مسنون طریقہ

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ احکام و مسائلِ نماز اور اس کو ادا کرنے کے مسنون طریقے کو مکمل تحقیقات کے ساتھ قدرے مفصل انداز سے ذکر کیا جائے اور نماز کے لیے وضو چونکہ بنیادی حیثیت رکھنے والا عمل بلکہ نماز کی چابی ہے، لہٰذا وضو کے طریقے سے بات شروع کرتے ہیں۔

فرضیتِ وضو:

نماز کے لیے وضو فرض ہے، اس کی فرضیت قرآن و سنت اور اجماعِ امت تینوں مصادر سے ثابت ہے۔ قرآنِ کریم میں فرضیتِ وضو کا ذکر سورۃ المائدہ (آیت: ۶) میں مذکور ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾

''مومنو! جب تم نماز پڑھنے کا قصد کیا کرو تو منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھو لیا کرو اور سر کا مسح کر لیا کرو اور ٹخنوں تک پاؤں (دھو لیا کرو)۔''

آیت کے اس حصے میں وضو کے وجوب و فرضیت کے علاوہ طریقۂ وضو کے اصول بھی ذکر کر دیے گئے ہیں، جس کی تفصیل نبیِ اکرم ﷺ کے ارشادات اور عمل میں موجود ہے، جو آگے چل کر ذکر کی جائے گی۔ قرآن کی طرح ہی سنتِ رسول ﷺ کی رُو سے بھی وضو کی فرضیت ثابت ہے اور اس کے بارے میں کئی ایک احادیث مروی ہیں، جن میں سے ایک صحیح بخاری و مسلم، سنن ابی داود اور ترمذی شریف میں ہے، جس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«لَا تُقْبَلُ صَلَاةُ مَنْ أَحْدَثَ حَتّٰى يَتَوَضَّأَ»[1]

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١٣٥) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٠٤) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٤) مشكاة المصابيح بتحقيق الألباني (١/ ١٠٠) المشكاة مع المرعاة (١/ ٣٨٣) طبع سانگله.

”جس شخص کا وضوٹوٹ جائے (یا سرے سے وضو ہی نہ ہو) اللہ تعالیٰ اس کی نماز قبول نہیں کرتا، تا وقتیکہ وہ وضو نہ کرلے۔“

ایسے ہی صحیح مسلم، سنن ترمذی و ابن ماجہ اور مسندِ احمد میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا تُقْبَلُ صَلَاةٌ بِغَيْرِ طُهُورٍ»[1]

”طہارت اور وضو کے بغیر کوئی نماز قبول نہیں کی جاتی۔“

یہی حدیث سنن ابي داود، نسائی اور ابن ماجہ میں ابو ملیح کے والد سے اور سنن ابن ماجہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ اور ابو بکرہ رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔[2]

فضیلتِ وضو:

وضو کی فضیلت کے بارے میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے متعدد ارشادات ثابت ہیں، جن میں سے ایک صحیح مسلم اور مسندِ احمد میں حضرت ابو امامہ باہلی، حضرت عمرو بن عنبسہ رضی اللہ عنہما ”رابع أربعة في الاسلام“ سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

«أَخْبِرْنِي عَنِ الْوُضُوءِ» ”مجھے وضو کے بارے میں بتائیے!“

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ يَقْرُبُ الْوُضُوءَ ثُمَّ يَتَمَضْمَضُ وَيَسْتَنْشِقُ وَيَسْتَنْثِرُ إِلَّا خَرَجَتْ خَطَايَاهُ مِنْ فَمِهِ وَخَيَا شِيمِهِ مَعَ الْمَآءِ حِينَ يَسْتَنْثِرُ، ثُمَّ يَغْسِلُ وَجْهَهُ كَمَا أَمَرَهُ اللّٰهُ تَعَالٰى إِلَّا خَرَجَتْ خَطَايَا وَجْهِهِ مِنْ أَطْرَافِ لِحْيَتِهِ مَعَ الْمَآءِ، ثُمَّ يَغْسِلُ يَدَيْهِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ إِلَّا خَرَجَتْ خَطَايَا يَدَيْهِ مِنْ أَطْرَافِ أَنَامِلِهِ، ثُمَّ يَمْسَحُ رَأْسَهُ إِلَّا خَرَجَتْ خَطَايَا رَأْسِهِ مِنْ أَطْرَافِ شَعْرِهِ مَعَ الْمَآءِ، ثُمَّ يَغْسِلُ قَدَمَيْهِ إِلَى الْكَعْبَيْنِ كَمَا أَمَرَهُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ إِلَّا

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٠٢) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٢) حواله جاتِ سابقه أيضاً.

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٣٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٧٣۔ ٢٧٤۔ ٢٧١) المرعاة (١/ ٣٨٤)

خَرَجَتْ خَطَايَا قَدَمَيْهِ مِنْ أَطْرَافِ أَصَابِعِهِ مَعَ الْمَاءِ »

''تم میں سے کوئی شخص جب وضو کرنے لگتا ہے اور پھر کلی کرتا ہے، ناک میں پانی چڑھاتا ہے اور ناک جھاڑ کر صاف کرتا ہے تو اس کے منہ اور ناک کے تمام گناہ اس پانی کے ساتھ ہی بہہ جاتے ہیں، جس کے ساتھ منہ اور ناک کو صاف کیا ہوتا ہے۔ پھر جب وہ اپنا منہ دھوتا ہے، جیسا کہ اللہ کا حکم ہے تو اس کی ڈاڑھی کے اطراف سے اس کے چہرے کی تمام خطائیں بھی پانی سے دھل جاتی ہیں۔ پھر جب وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوتا ہے، تو ان دونوں ہاتھوں کے گناہ اس کی انگلیوں کے پوروں کے راستے نکل جاتے ہیں، پھر جب وہ اپنے سر کا مسح کرتا ہے تو اس کے سر کی تمام خطائیں اس کے بالوں کے راستے پانی کے ساتھ ہی مٹ جاتی ہیں، پھر جب وہ حکمِ الٰہی کے مطابق دونوں پاؤں کو ٹخنوں تک دھوتا ہے تو اس کے پاؤں کی تمام خطائیں پاؤں کی انگلیوں کے راستے پانی کے ساتھ ہی بہہ جاتی ہیں۔''

اسی حدیث میں آگے یہ بھی مذکور ہے کہ جب کوئی شخص مسنون طریقے سے وضو کر کے اللہ کے حضور کھڑے ہو کر دو رکعت نماز ''تحیۃ الوضوء'' ادا کرتا ہے تو اس کی یہ حالت ہوتی ہے:

« خَرَجَ مِنْ ذَنْبِهِ كَهَيْئَتِهِ يَوْمَ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ »[1]

''وہ گناہوں سے اس طرح پاک ہو جاتا ہے، گویا آج ہی اس کی ماں نے اسے جنم دیا ہو۔''

جب کہ صحیح مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں اس بات کی وضاحت بھی موجود ہے کہ یہ صغیرہ گناہوں سے پاک ہونا ہے، کیوں کہ اس حدیث میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے « إِذَا اجْتُنِبَتِ الْكَبَائِرُ » کی شرط بھی عائد فرمائی ہے کہ ''اگر وہ کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرنے والا ہو۔'' تو صغیرہ گناہوں کا یوں کفارہ ہو جائے گا اور بقول قاضی عیاض رحمہ اللہ تمام اہلِ سنت کا مذہب یہی ہے کہ کبیرہ گناہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے اور مذکورہ بخشش سے صغیرہ گناہوں کی بخشش مراد ہے۔[2]

---

1. الفتح الرباني (١/ ٢٩٩۔ ٢٠٠) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٤٣)
2. فتح الباري (١/ ٢٦٠۔ ٢٦١) الفتح الرباني ترتيب مسند أحمد (١/ ٢٠٠)

صحیح مسلم میں حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«مَا مِنَ امْرِئٍ مُسْلِمٍ تَحْضُرُهُ صَلَاةٌ مَكْتُوبَةٌ فَيُحْسِنُ وُضُوءَهَا وَخُشُوعَهَا وَرُكُوعَهَا إِلَّا كَانَتْ كَفَّارَةً لِّمَا قَبْلَهَا مِنَ الذُّنُوبِ مَا لَمْ يُؤْتَ كَبِيرَةً، وَذٰلِكَ الدَّهْرُ كُلُّهُ»[1]

''جب کسی مسلمان پر کسی فرض نماز کا وقت آپہنچے تو وہ اس کا وضو، خشوع وخضوع اور رکوع بڑی عمدگی سے پورا کرے تو یہ اس کے پہلے تمام گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا۔ اگر وہ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب نہ کیے ہوئے ہو اور یہ کفارۂ ذنوب ہر وقت و زمانے کے لیے عام ہے۔ (کسی عہد کے ساتھ خاص نہیں)۔''

صحیح مسلم، سنن نسائی و ابن ماجہ اور مسندِ احمد میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث کے الفاظ یوں ہیں:

«مَنْ تَوَضَّأَ فَأَحْسَنَ الْوُضُوءَ خَرَجَتْ خَطَايَاهُ مِنْ جَسَدِهِ حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ أَظْفَارِهِ»[2]

''جو شخص مسنون طریقے کے ساتھ اچھی طرح وضو کرے، اس کے جسم کی تمام خطائیں معاف ہوجاتی ہیں، یہاں تک کہ اس کے ناخنوں کے نیچے سے بھی گناہ نکل جاتے ہیں۔''

اس حدیث کو صاحبِ مشکات شریف نے متفق علیہ لکھ کر صحیح بخاری ومسلم کی طرف منسوب کیا ہے، مگر یہ حدیث بخاری شریف میں نہیں، بلکہ یہ افرادِ مسلم میں سے ہے، جیسا کہ ''منهاج المشكاة'' میں شیخ عبد العزیز ابہری نے، ''هداية الرواة بتخريج المصابيح و المشكاة'' میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے، ''الترغيب و الترهيب'' میں امام منذری نے اور علامہ ابن حجر مکی نے، ایسے ہی علامہ عبیداللہ رحمانی مبارک پوری نے تحقیق کی ہے۔[3]

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١١٢) مشكاة المصابيح مع المرعاة (١/ ٣٦٩۔ ٣٧٠)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٣٣) الفتح الرباني (١/ ٣٠٤) صحيح الترغيب، رقم الحديث (١٧٧) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٤٢۔ ١٤٣) و سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨٣، ٢٨٥) میں یہ حدیث عمرو بن عنبسہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ المرعاة (١/ ٣٦٨)

[3] مرعاة المصابيح (١/ ٣٦٨)

صحیح مسلم، سنن ترمذی اور موطا امام مالک میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''جب کوئی مومن مسلمان وضو کرتا ہے اور اپنا چہرہ دھوتا ہے تو اس کے چہرے کی تمام خطائیں مٹ جاتی ہیں، جو وہ شخص اپنی آنکھوں سے کرتا ہے۔ پھر جب وہ ہاتھ دھوتا ہے تو اس کے تمام وہ گناہ بخش دیے جاتے ہیں، جو اُس نے ہاتھوں کے ساتھ کیے ہوتے ہیں، پھر جب وہ پاؤں دھوتا ہے تو وہ تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں، جن کی طرف ان پاؤں سے چل کر گیا تھا۔''

((حَتّٰى يَخْرُجَ نَقِيًّا عَنِ الذُّنُوْبِ))[1]

''یہاں تک کہ وہ شخص (وضو کے ساتھ) تمام گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔''

صحیح مسلم، سنن ابی داود اور نسائی میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

((مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَتَوَضَّأُ فَيُحْسِنُ وُضُوْءَهٗ ثُمَّ يَقُوْمُ فَيُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ، مُقْبِلًا عَلَيْهِمَا بِقَلْبِهٖ وَوَجْهِهٖ إِلَّا وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ))[2]

''جو مسلمان اچھی طرح وضو کر کے دو رکعت نماز ادا کرتا ہے، جس کے دوران میں توجہ الیٰ اللہ اور قلبی یک سوئی اختیار کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے لیے جنت واجب کر دیتا ہے۔''

ایسے ہی بعض دیگر احادیث میں ایک ایک اعضاے وضو کے پانی کے ساتھ پاک ہونے کا ذکر پایا جاتا ہے، جس سے وضو کی فضیلت و برکت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ تمام فضائل و برکات صرف اُسی وقت حاصل ہوں گی، جب وضو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے مسنون طریقے سے کیا جائے اور اس میں اپنی طرف سے کوئی کمی بیشی نہ کی جائے۔

وضو کا مسنون طریقہ:

وضو کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ اس سلسلے میں صحیح بخاری و مسلم، سنن ابی داود اور سنن نسائی میں

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٢٢۔ ١٣٣) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢) الموطأ مع المسوى (١/ ٦٩ طبع دار الكتب العلمية) الفتح الرباني (١/ ٢٠٥۔ ٢٠٦) مشكاة المصابيح مع المرعاة (١/ ٣٦٩)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٨۔ ١١٩) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٠١) و صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٤٧) مشكاة المصابيح (١/ ٣٧٢)

حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِنَّهُ تَوَضَّأَ فَأَفْرَغَ عَلٰى يَدَيْهِ ثَلَاثًا، ثُمَّ تَمَضْمَضَ وَاسْتَنْثَرَ ثَلَاثًا، ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثًا، ثُمَّ غَسَلَ يَدَهُ الْيُمْنٰى إِلَى الْمِرْفَقِ ثَلَاثًا، ثُمَّ غَسَلَ يَدَه الْيُسْرٰى إِلَى الْمِرْفَقِ ثَلَاثًا، ثُمَّ مَسَحَ بِرَأْسِهٖ»[1]

''انھوں نے وضو کرتے وقت پہلے اپنے دونوں ہاتھوں پر تین مرتبہ پانی بہایا (یعنی اپنے دونوں ہاتھوں کو تین مرتبہ دھویا) پھر انھوں نے تین مرتبہ کلی کی اور تین مرتبہ ہی ناک کو جھاڑا۔ پھر تین مرتبہ اپنا منہ دھویا۔ پھر تین مرتبہ کہنی تک اپنا دایاں ہاتھ دھویا۔ پھر تین مرتبہ ہی کہنی تک اپنا بایاں ہاتھ۔ پھر اپنے سر کا مسح کیا۔''

تمام اعضائے وضو کے دھونے کے ذکر کے ساتھ ساتھ ہی تین تین بار کے الفاظ بھی وارد ہیں، مگر سر کے مسح کے ساتھ تین بار کا ذکر نہیں، بلکہ صحیحین میں اس حدیث کے جتنے بھی طُرق ہیں، ان میں سے کسی میں بھی مسح کی تعداد مذکور نہیں ہے۔ لہٰذا سر کا مسح صرف ایک مرتبہ ہی کر لینا کافی ہے اور یہی جمہور علمائے امت کا مسلک ہے۔[2] اس بات کی تائید بخاری شریف کی ایک دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

«فَمَسَحَ رَأْسَهٗ فَأَقْبَلَ بِهِمَا وَأَدْبَرَ مَرَّةً وَّاحِدَةً»[3]

''انھوں نے اپنے سر کا مسح کیا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے سر کے اگلے حصے سے پھیرتے ہوئے پچھلے حصے تک لے گئے اور پیچھے سے آگے کو لائے اور یہ (مسح) ایک ہی بار کیا۔''

نیز اس بات کا ثبوت سنن اربعہ،[4] مسند احمد، طبرانی اوسط اور سنن بیہقی کی متعدد احادیث میں

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (١٥٩) صحيح مسلم مع شرح النووي (١/ ٣/ ١٠٥۔ ١١٠) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٩٧) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٨٢۔ ٨٣)

[2] المرعاة (١/ ٢٧١)

[3] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (١٨٦) مشكاة المصابيح مع المرعاة (١/ ٤٥٧)

[4] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٢) صحيح الترمذي، رقم الحديث (٣١۔ ٤٤) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٩٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣٥۔ ٤٣٦۔ ٤٣٧)

بھی مذکور ہے۔ بعض روایات میں تین مرتبہ سر کا مسح کرنے کا ذکر آیا ہے اور بعض میں دو مرتبہ مسح کا ذکر، وہ احادیث ضعیف ہیں۔[1]

مسحِ راس کے بعد حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے وضو کو بیان کرنے والے راوی فرماتے ہیں:

«ثُمَّ غَسَلَ رِجلَهُ الْيُمْنٰى ثَلَاثًا، ثُمَّ الْيُسْرىٰ ثَلَاثًا، (وَقَالَ:) رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ تَوَضَّأَ نَحوَ وُضُوئِي هٰذَا (فَقَالَ:) مَنْ تَوَضَّأَ نَحوَ وُضُوئِي هٰذَا، ثُمَّ يُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ، لَا يُحَدِّثُ نَفْسَهٗ فِيهَا بِشَيْءٍ، غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ»[2]

''پھر انھوں نے تین مرتبہ اپنا دایاں پاؤں دھویا۔ پھر تین مرتبہ ہی بایاں دھویا۔ پھر فرمایا: میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ آپ ﷺ نے میرے اس وضو کی طرح وضو کیا اور فرمایا: جو شخص میرے اس وضو کی طرح وضو کرے، پھر دو رکعتیں ایسے خشوع و خضوع سے پڑھے، جن کے دوران میں وہ اپنے آپ سے باتیں نہ کرے (یعنی آر پار کی سوچوں میں نہ کھو جائے) تو اس کے پہلے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔''

صحیح بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم رضی اللہ عنہ سے کہا گیا: ہمارے سامنے نبیِ مکرم ﷺ کے وضو کی کیفیت عملی طور پر بیان کریں تو انھوں نے پانی کا برتن منگوایا، اس سے اپنے ہاتھوں پر پانی انڈیل کر انھیں تین مرتبہ دھویا۔ پھر اپنا (دایاں) ہاتھ پانی کے برتن میں ڈال کر اس سے پانی نکالا اور ایک ہی چلو سے کلی کی اور ناک میں پانی چڑھایا۔ یہ فعل تین مرتبہ دہرایا۔ پھر ہاتھ ڈال کر پانی نکالا اور تین مرتبہ منہ دھویا۔ پھر ہاتھ ڈال کر پانی نکالا اور کہنیوں سمیت اپنے دونوں ہاتھوں کو دو دو مرتبہ دھویا۔ پھر ہاتھ ڈال کر پانی نکالا اور اپنے سر کا مسح کیا (اور وہ یوں کہ) اپنے دونوں ہاتھوں کو سر کے اگلے حصے سے پچھلے حصے تک (بالوں پر پھیرتے ہوئے) لے گئے۔ پھر اپنے دونوں پاؤں کو ٹخنوں تک دھویا اور فرمایا:

---

[1] فتح الباري (١/ ٢٦٠) نيل الأوطار (١/ ١/ ١٨٦۔ ١٨٨) عون المعبود، تهذيب السنن لابن القيم.

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١٥٩) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٠٧۔ ١٠٨) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٩٧) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٨٣) منتقى الأخبار مع نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٣٩) مشكاة المصابيح مع المرعاة (١/ ٣٧٠۔ ٣٧١)

«هٰكَذَا كَانَ وُضُوءُ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ»[1] ''رسول اللہ ﷺ کا وضو اسی طرح تھا۔''

اس حدیث میں کلی کرنے اور ناک میں پانی چڑھانے کا ذکر موجود ہے، مگر ناک جھاڑنے کا ذکر نہیں، جبکہ اس سے پہلی حدیث میں جھاڑنے کا ذکر تھا، ناک میں پانی چڑھانے کا لفظ نہیں تھا۔ البتہ صحیح بخاری و مسلم ہی کی ایک دوسری حدیث میں ہے:

«فَمَضْمَضَ وَ اسْتَنْشَقَ وَاسْتَنْثَرَ ثَلَاثًا بِثَلَاثِ غُرُفَاتٍ مِنْ مَّاءٍ»[2]

''انھوں نے تین مرتبہ کلی کی، ناک میں پانی چڑھایا اور ناک کو جھاڑ کر صاف کیا، پانی کے صرف تین چلوؤں سے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایک ہی چلو سے کلی بھی کی اور اسی سے ناک میں پانی چڑھا کر اسے صاف بھی کیا۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ پانی کا چلو لے کر اس کے آدھے حصے کو کلی کے لیے منہ میں ڈال لیا جائے اور بقیہ آدھے کو ناک میں چڑھایا جائے اور اسے جھاڑ کر صاف کیا جائے۔ یہ عمل تین مرتبہ دہرایا جائے۔

اعضاے وضو کو دھونے کی تعداد:

اعضاے وضو کو کتنی مرتبہ دھویا جائے؟ اس سلسلے میں نبیِ اکرم ﷺ سے تین قسم کی احادیث صحیح بخاری و مسلم میں مروی ہیں۔ تین تین بار دھونے کی، دو دو بار دھونے کی اور ایک ایک ہی بار دھونے کی بھی احادیث موجود ہیں۔ مثلاً صحیح مسلم اور مسندِ احمد میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے مدینہ منورہ کے قریب ایک مقام ''مقاعد'' پر وضو کرتے ہوئے فرمایا:

«أَلَا أُرِيكُمْ وُضُوءَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ ثُمَّ تَوَضَّأَ ثَلَاثًا»[3]

''کیا میں تمھیں نبیِ مکرم ﷺ کی طرح وضو کر کے نہ دکھاؤں؟ پھر انھوں نے تمام اعضا کو تین تین بار دھویا۔''

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٩١) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٢٣) مشكاة المصابيح بتحقيق الألباني (١/ ١٢٥۔ ١٢٦)

[2] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (١٩٢) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٢٣۔ ١٢٤) مشكاة المصابيح أيضاً.

[3] صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٣/ ١١٤)

اس موضوع کی دیگر احادیث بھی متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں، جنھیں علامہ عینی نے ''عمدة القاري'' میں جمع کر دیا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبد اللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَوَضَّأَ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ»[1]

''نبیِ اکرم ﷺ نے وضو فرمایا اور تمام اعضا کو دو دو مرتبہ دھویا۔''

یہی حدیث مسندِ احمد میں بھی مروی ہے اور سنن ابی داود و ترمذی اور صحیح ابن حبان میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی سیاق و مفہوم کی ایک حدیث مروی ہے۔[2]

صحیح بخاری (باب غسل الوجه باليدين من غرفة واحدة) میں، اسی طرح سنن ابی داود میں مختصراً و مطولاً اور سنن ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور مسندِ احمد میں مختصراً حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں:

«تَوَضَّأَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَرَّةً مَرَّةً [وَلَمْ يَزِدْ عَلٰى هٰذَا]»[3]

''نبیِ اکرم ﷺ نے وضو فرمایا اور تمام اعضاے وضو کو ایک ایک مرتبہ دھویا [اور اس پر زیادہ نہیں کیا]۔''

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے یہ الفاظ «وَلَمْ يَزِدْ عَلٰى هٰذَا» کہ ''آپ ﷺ نے ایک ایک مرتبہ سے زیادہ نہیں کیا۔'' اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ یا تو اسی وضو کے بارے میں ہیں، جو انھوں نے ایک موقع پر دیکھا، یا پھر یہ بات ان کی معلومات کی حد تک عام ہے۔ ورنہ صحیح احادیث میں ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے تمام اعضاے وضو کو دو دو بار اور تین تین بار بھی دھویا ہے، بلکہ ایک حدیث میں تو یہ بھی مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے بعض اعضا کو تین تین بار اور اسی وضو کے دوران میں بعض اعضا کو دو دو بار دھویا تھا۔ بہر حال تمام اعضاے وضو کو صرف ایک ایک بار دھو لینا۔ حدیثِ ابن عباس رضی اللہ عنہما

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١٥٨) مشكاة المصابيح (١/ ١٢٦)

[2] فتح الباري (١/ ٢٥٩) المرعاة (١/ ٤٥٨)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥٧) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٢٦) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٩) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٧٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١١) مشكاة المصابيح مع المرعاة (١/ ٤٥٨) سوائے مشکات کے دوسری کتابوں کی مذکورہ احادیث میں ''ولم يزد علىٰ هذا'' کے الفاظ نہیں ہیں۔

کے علاوہ متعدد دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی احادیث سے بھی ثابت ہے۔ ان احادیث کو امام شوکانی رحمہ اللہ نے "نیل الأوطار" میں جمع کر دیا ہے اور ان کی اسانید پر کلام بھی کیا ہے۔[1]

ایک ایک مرتبہ اعضا کو دھونے والی احادیث ذکر کرنے کے بعد امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ اس بات کی دلیل ہیں کہ وضو کے لیے صرف ایک ایک مرتبہ ہی اعضاے وضو کو دھونا واجب ہے۔ اسی لیے آپ ﷺ نے اس پر اکتفا کیا ہے۔ اگر دو دو مرتبہ یا تین تین مرتبہ دھونا واجب ہوتا تو پھر آپ ﷺ ایک ایک مرتبہ دھونے پر ہرگز اکتفا نہ کرتے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس بات پر مسلمانوں کا اجماع ہے کہ تمام اعضاے وضو کو ایک ایک مرتبہ دھونا تو واجب ہے اور تین تین مرتبہ دھونا سنت ہے۔[2]

گویا یہ تینوں طریقے ثابت اور جائز ہیں۔ البتہ نبیِ اکرم ﷺ کا اکثر معمول تین تین بار دھونا تھا اور بیانِ جواز کے لیے آپ ﷺ نے دو دو مرتبہ اور ایک ایک بار بھی دھویا اور تین تین بار دھونا اکمل ہے۔[3]

تین بار سے زیادہ دھونے کی ممانعت:

تین مرتبہ سے زیادہ دھونا وسواسی قسم کے لوگوں کا کام ہے۔ انھیں یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ اعضاے وضو سے اگر کوئی چیز تین مرتبہ دھونے سے بھی زائل نہیں ہوتی تو وہ پچاس مرتبہ دھونے سے بھی زائل نہیں ہوگی۔ مسلسل کتنی کتنی دیر تک پانی بہانے بلکہ ضائع کرتے رہنے سے کیا حاصل؟ پھر نبیِ اکرم ﷺ نے اس فعل سے منع کیا ہے۔

محدّثین کرام رحمہم اللہ نے تین مرتبہ سے زیادہ اعضاے وضو کو دھونے کے مکروہ ہونے کے باقاعدہ باب قائم کیے ہیں اور ان کی دلیل وہ حدیث ہے، جسے امام ابو داود، نسائی، ابن ماجہ، ابن خزیمہ اور احمد نے روایت کیا ہے۔ حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ اور دادا کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ ایک اعرابی نبیِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے آپ ﷺ سے وضو کا طریقہ پوچھا۔ آپ ﷺ نے اسے تین تین مرتبہ اعضاے وضو کو دھونے کی تعلیم فرمائی اور آخر میں فرمایا:

---

[1] نیل الأوطار (۱/ ۱/ ۲۰۲۔ ۲۰۳)

[2] نیل الأوطار (۱/ ۱/ ۲۰۳)

[3] مرعاۃ المفاتیح (۱/ ٤٥٨)

«هٰذَا الْوُضُوْءُ، فَمَنْ زَادَ عَلٰى هٰذَا فَقَدْ أَساَءَ وَتَعَدّٰى وَظَلَمَ»[1]

''یہ وضو ہے اور جو اس سے زیادہ مرتبہ دھوئے، اس نے برا کیا، زیادتی کی اور ظلم کیا۔''

اس برائی، زیادتی اور ظلم کی اہلِ علم نے متعدد توجیہات بیان کی ہیں، جن میں حد سے تجاوز، ترکِ اَولیٰ اور ترکِ سنت کی وجوہات ہیں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "التلخيص الحبير في تخريج أحاديث الرافعي الكبير" میں اور امام شوکانی رحمہ اللہ نے "نيل الأوطار" میں وہ توجیہات ذکر کی ہیں۔

امام ابن مبارک رحمہ اللہ ایسے شخص کے بارے میں فرماتے ہیں:

''جو شخص دورانِ وضو تین سے زیادہ مرتبہ اعضاے وضو دھوئے، مجھے خدشہ ہے کہ وہ گناہ گار ہوگا۔''

امام احمد اور امام اسحاق ابن راہو یہ رحمہما اللہ سے منقول ہے:

«لَا يَزِيْدُ عَلٰى ثَلَاثٍ إِلَّا رَجُلٌ مُبْتَلًى»[2]

''تین مرتبہ سے زیادہ اعضاے وضو کو دھونے والا شخص مبتلاے وہم اور مریضِ وسواس ہے۔''

ہاں! یہاں یہ بات بھی واضح کر دیں کہ تین سے زیادہ مرتبہ اعضاے وضو کو دھونے والے شخص کو نبیِ کریم ﷺ نے جس حدیث میں برائی، زیادتی اور ظلم کرنے والا کہا ہے، اس کے طُرق کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے اور فتح الباری میں اس حدیث کے بارے میں امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ اور دیگر محدّثین کی تصحیح نقل کی ہے۔ دورِ حاضر کے معروف محدث علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے بھی اسے حسن قرار دیا ہے۔ البتہ سنن ابو داود کی روایت میں «فَمَنْ زَادَ عَلٰى هٰذَا» کے بعد والے الفاظ «أَوْ نَقَصَ» کو منکر یا شاذ قرار دیا ہے۔[3] اس سلسلہ میں امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

«اَلْعَمَلُ عَلٰى هٰذَا عِنْدَ عَامَّةِ أَهْلِ الْعِلْمِ أَنَّ الْوُضُوْءَ يُجْزِئُ مَرَّةً، وَمَرَّتَيْنِ أَفْضَلُ، وَأَفْضَلُهُ ثَلَاثًا، وَلَيْسَ بَعْدَهُ شَيْئٌ»[4]

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٢٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٣٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٣) المنتقىٰ مع النيل (١/ ١/ ٢٠٣)

[2] نيل الأوطار (١/ ١/ ٢٠٤)

[3] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١/ ٢٨) نيل الأوطار (١/ ١/ ٢٠٣) و تحقيق المشكاة (١/ ١٣١)

[4] سنن الترمذي مع التحفة (١/ ١٥٩)

”عام اہلِ علم کے نزدیک اسی بات پر عمل ہے کہ ایک ایک مرتبہ اعضاے وضو کو دھونا کافی ہے اور دو دو مرتبہ افضل اور تین تین مرتبہ دھونا افضل ترین ہے اور اس کے بعد کچھ (جائز) نہیں ہے۔“

سنن ابی داود و ابن ماجہ اور مسندِ احمد میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے نے دعا کرتے ہوئے کہا: اے اللہ! میں تجھ سے جنت کے دائیں گوشے میں سفید محل کا سوال کرتا ہوں تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے کہا: اے بیٹے! اللہ سے جنت کا سوال اور جہنم سے پناہ کی دعا کرو، کیوں کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

«إِنَّهُ سَيَكُوْنُ فِيْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ قَوْمٌ يَعْتَدُوْنَ فِيْ الطُّهُوْرِ وَالدُّعَاءِ»[1]

”بے شک اس امت میں ایک ایسی قوم ہوگی، جو دعا اور طہارت میں حدود سے تجاوز کریں گے۔“

وضو میں وسواس کا شکار ہو کر بکثرت پانی بہانا بھی حد سے تجاوز اور ممنوع ہے، بلکہ ایک روایت میں تو وضو کے دوران میں وسوسے میں مبتلا کرنے والے شیطان کا نام ”ولہان“ بھی ملتا ہے، مگر وہ روایت سخت ضعیف ہے۔[2]

ویسے بھی صحیح بخاری اور سنن ترمذی میں ایک حدیث ہے:

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَتَوَضَّأُ بِالْمُدِّ، وَيَغْتَسِلُ بِالصَّاعِ»[3]

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مد پانی سے وضو کرتے اور ایک صاع پانی سے غسل فرماتے تھے۔“

اگر پانی اس مسنون مقدار میں استعمال کرنا مشکل ہو تو کم از کم اتنا بھی تو نہ بہایا جائے جو فضول اور اِسراف میں داخل ہو۔ اس مفہوم کی ایک حدیث بھی مروی ہے، مگر وہ ضعیف ہے۔[4]

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٨٦٤) لیکن سنن ابن ماجہ کی حدیث میں «يعتدون في الطهور» کے الفاظ نہیں ہیں۔ مشكاة المصابيح (١/ ١٣١) و صححه الألباني.

[2] تحقيق مشكاة المصابيح (١/ ١٣١)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (٢٠١) سنن الترمذي مع تحفة الأحوذي (١/ ١٨٣۔ ١٨٨)

[4] مشكاة المصابيح بتحقيق الألباني (١/ ١٣٣) و تحقيق زاد المعاد (١/ ١٩١)

وضو کے ارکان وفرائض اور سنن ومستحبات

وضو کے ارکان وفرائض:

یہاں تک تو نبیِ اکرم ﷺ کے وضو کا مسنون طریقہ ہے، جس میں وضو کے وہ چاروں ارکان یا فرائض آ گئے ہیں، جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ المائدہ (آیت: ۶) میں فرمایا ہے۔ وہ چاروں ارکان یا فرائضِ وضو یہ ہیں:

① چہرہ دھونا۔

② دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک دھونا۔

③ سر کا مسح کرنا۔

④ دونوں پاؤں کو ٹخنوں تک دھونا۔

وضو کے سنن ومستحبات:

مذکورہ بالا چاروں امور کے علاوہ نبیِ اکرم ﷺ جن امور کا اہتمام فرماتے اور اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو جن کا حکم دیتے یا ترغیب دلاتے تھے، وہ وضو کے آداب وسنن اور مستحبات کہلاتے ہیں۔ ان سے وضو کی تکمیل ہوتی ہے، لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسائل واحکامِ وضو کی تمام ضروری تفصیلات آپ کے سامنے ترتیب کے ساتھ رکھ دی جائیں، تاکہ نبیِ کریم ﷺ کے بتائے ہوئے مسنون وضو کے بارے میں کوئی اشکال اور تشنگی باقی نہ رہے، کیوں کہ نماز جیسے اہم رکنِ دین کی اساس وبنیاد تو یہ وضو ہی ہے، بلکہ سنن ترمذی اور مسند احمد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک ضعیف السند حدیث میں مذکور ہے:

«مِفْتَاحُ الْجَنَّةِ الصَّلَاةُ، وَمِفْتَاحُ الصَّلَاةِ الطُّهُورُ»[1]

''جنت کی چابی نماز ہے اور نماز کی چابی وضو۔''

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٤) مشكاة المصابيح (١/ ٩٧) ضعيف الجامع، رقم الحديث (٥٢٧٠)

اس حدیث کی سند کو ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ البتہ اس کے جزوِ ثانی یعنی نماز کی چابی وضو ہے، اس کی شاہد ایک حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔[1] لہٰذا ان الفاظ کی تائید اس شاہد سے بھی ہوگئی۔ اسی لیے ہم نے اس حدیث کے الفاظ ذکر کر دیے ہیں، ورنہ اگر سنن ترمذی اور مسندِ احمد والی صرف مذکورہ حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ ہی ہوتی تو وہ قابلِ حجت نہیں تھی۔

1 نیت:

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ دیگر عبادات کی طرح وضو کے لیے بھی نیت شرط ہے، کیوں کہ صحیح بخاری و مسلم، سننِ اربعہ اور اکثر کتبِ حدیث میں خلیفۂ ثانی امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَاتِ»[2] ''تمام اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے۔''

اس حدیث کی عظمت و رفعت:

یہ صحیح بخاری کی سب سے پہلی حدیث ہے اور اس کے علاوہ بھی چھے دوسرے مقامات پر امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں اسے وارد کیا ہے۔ ائمہ کرام سے تواتر کے ساتھ اس حدیث کی عظمت و اہمیت منقول ہے، حتیٰ کہ امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں جامع و مانع اور کثیر الفائدہ ہونے کے اعتبار سے اس حدیث کا مقابلہ دوسری کوئی حدیث نہیں کرسکتی۔ امام شافعی، عبد الرحمٰن بن مہدی، احمد بن حنبل، علی بن مدینی استاذِ امام بخاری، ابو داود، ترمذی، دارقطنی اور حمزہ الکنانی رحمہم اللہ نے بالاتفاق اس حدیث کو اسلام کا ایک تہائی حصہ قرار دیا ہے۔ بعض علما نے کل احکامِ اسلام کا ایک چوتھائی اس حدیث کو کہا ہے۔

امام ابن مہدی کہتے ہیں کہ یہ حدیث علم کے تیس ابواب پر مشتمل ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اسے علمِ دین کے ستر ابواب پر مشتمل قرار دیا ہے اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے اسے احکامِ اسلام کا ایک تہائی

[1] صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (٥٥) صحیح سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٢٧٥) تحقیق مشکاة المصابیح (١/ ٩٧)

[2] صحیح البخاري مع الفتح (١/ ٩) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (١٩٢٧) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (٧٣، ٣٢١٥، ٣٥٥٢) صحیح سنن الترمذي، رقم الحدیث (١٣٤٤) المنتقیٰ مع النیل (١/ ١/ ١٥٦)

حصہ ثابت کرنے کے لیےلکھا ہے کہ انسان کا کسب وعمل تین ہی اشیا سے وقوع پذیر ہوتا ہے، جن میں پہلی چیز دِل، دوسری زبان اور تیسری اعضاے جسمانی ہیں اور نیت ان تین میں سے ایک بلکہ راجح ہے،، لہٰذا یہ حدیث ''ثلث العلم'' ہوئی۔

امام احمد رحمہ اللہ نے اس کے ثلث العلم ہونے کی ایک دوسری توجیہ بیان کی ہے کہ اسلام کے احکام جن تین قواعد کے گرد گھومتے ہیں، ان میں سے ایک قاعدہ اس حدیث میں مذکور ہے، لہٰذا یہ ثلث العلم ہے۔ ایسی ہی احادیث میں سے دوسری حدیث صحیح بخاری ومسلم میں مذکور ہے:

«اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا أُمُورٌ مُشْتَبِهَاتٌ»[1]

''(اسلام میں) حلال وحرام واضح ہیں اور ان دونوں (حرام وحلال) کے درمیان مشتبہ امور ہیں۔''

اس سلسلے کی تیسری حدیث وہ ہے، جس میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«مَنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ»[2]

''کسی کے حسنِ اسلام کی علامت یہ ہے کہ وہ لایعنی امور کو ترک کر دے۔''

بعض علما نے اس حدیث کو احکام وعلمِ دین کا ایک چوتھائی حصہ قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک چوتھی حدیث وہ ہے، جس میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِأَخِيهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ»[3]

''اس وقت تک کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا، جب تک وہ اپنے دوسرے مسلمان بھائی کے لیے وہی چیز پسند نہ کرے، جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔''

بعض اہلِ علم نے اس کے بجائے چوتھی حدیث اسے قرار دیا، جس میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

---

[1] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٦٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٩٨٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣١٩٣)

[2] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٨٨٦۔ ١٨٨٧) سنن ابن ماجه (٣٩٧٦) صحيح الجامع (٥٩١١)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (١٣) صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ١٦۔ ١٧) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٤٢) صحيح سنن النسائي (٣٦٤٣) صحيح الجامع، رقم الحديث (٨٣۔ ٧٥)

« إِزْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبُّكَ اللّٰهُ، وَازْهَدْ فِيمَا أَيْدِي النَّاسِ يُحِبُّكَ النَّاسُ »[1]

''مال ومتاعِ دنیا کی محبت چھوڑ دو، اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور جو کچھ لوگوں کے پاس ہے، اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنا چھوڑ دو تو لوگ بھی تم سے محبت کرنے لگیں گے۔''

نیت کے مسئلے سے تعلق رکھنے والی اس حدیث کے مقام و مرتبے کی عظمت و رفعت کے پیشِ نظر یہ تھوڑی سی تفصیل بھی آ گئی ہے۔ بہر حال امام ابن قدامہ رحمہ اللہ ''المغني'' میں لکھتے ہیں:

''وضو بھی ایک عبادت ہے اور کوئی عبادت نیت کے بغیر نہیں ہوتی، کیوں کہ اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کا تقرب، اس کی اطاعت اور اس کے فرمان کی بجا آوری ہوتا ہے اور یہ بغیر نیت حاصل نہیں ہوسکتا۔''[2]

امام ابو البرکات المجد ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ''المنتقیٰ'' میں اسی حدیث « إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ » پر جو عنوان ذکر کیا ہے، وہ یہ ہے: ''باب الدلیل علیٰ وجوب النیة له'' یعنی ''وضو کے لیے نیت کے واجب ہونے کی دلیل کا بیان۔'' اس حدیث کی شرح بیان کرنے کے بعد امام شوکانی رحمہ اللہ ''نیل الأوطار شرح منتقیٰ الأخبار'' میں لکھتے ہیں:

''یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ نیک اعمال میں نیت شرط ہے۔''[3]

نیت کے الفاظ کی شرعی حیثیت:

یہاں یہ بات ذہن میں رکھیں کہ وضو کی نیت تو واجب یا شرط ہے، مگر اس کے لیے یہ درست نہیں کہ کوئی شخص اس نیت کے الفاظ بھی ادا کرے اور اس پریشانی میں مبتلا ہو جائے کہ نیت کے الفاظ کیا ہیں؟ زبانی یاد کرنے پڑیں گے، یاد بھی ہوں گے یا نہیں؟ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی سے بھی نیت کے کوئی بھی الفاظ ثابت نہیں ہیں۔ شارح صحیح مسلم امام نووی رحمہ اللہ اور دیگر علما کا کہنا ہے کہ نیت دل کا فعل ہے نہ کہ زبان کا، یعنی صرف دل کے

[1] صحيح البخاري مع فتح الباري (١/ ١١) صحيح مسلم مع شرح للنووي (٦/ ١١/ ٢٩) تحقيق و تعليق صحيح مسلم از محمد فواد عبدالباقي (٣/ ١٢١٩۔ ١٢٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١٠٢) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٩٤٤) صحيح الجامع، رقم الحديث (٩٢٢)

[2] المغني (١/ ١١٣۔ ١١٤)

[3] نيل الأوطار (١/ ١/ ١٣٣)

ارادے سے ہی نیت ہوجاتی ہے، زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے "زاد المعاد في هدي خير العباد" میں بالتحقیق ذکر کیا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وضو کے شروع میں "نَوَيْتُ رَفْعَ الْحَدَثِ" جیسے الفاظ ہرگز ذکر نہیں فرمایا کرتے تھے کہ "میں نے رفعِ حدث یعنی وضو کرنے کی نیت کی۔" اور نہ اس قسم کی نیت کسی صحابی سے ثابت ہے اور صرف یہی نہیں کہ یہ الفاظ کسی صحیح حدیث میں نہیں آئے، بلکہ لفظوں میں اس نیت کا ذکر تو کسی ضعیف حدیث میں بھی نہیں ملتا۔[1]

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ جو معروف بزرگ گزرے ہیں، بعض لوگ انھیں گیارھویں والے پیر صاحب بھی کہتے ہیں اور چاند کی ہر گیارھویں تاریخ کو ان کے نام کی گیارھویں کی نیاز دینے کی بدعت پر بڑی پابندی کا مظاہرہ کرتے ہیں، وہ جیلانی بزرگ رحمہ اللہ اپنی کتاب "غنية الطالبين" کے پہلے ہی باب میں نیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وَمَحَلُّهَا الْقَلْبُ" "نیت دل سے کی جاتی ہے۔" یعنی دلی ارادے کا نام ہی نیت ہے۔

اس سے آگے دلی ارادے کے ساتھ ساتھ موصوف نے زبان سے نیت کرنے کے استحسان کو بھی ذکر کیا ہے، مگر بے دلیل استحسان قابلِ قبول نہیں ہوتا اور بالآخر اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے:

"وَإِنِ اقْتَصَرَ عَلٰى الْإِعْتِقَادِ أَجْزَأَهُ"[2]

"اگر دلی ارادے ہی پر قناعت کی جائے تو کافی ہے۔"

بلکہ شرعی نقطۂ نظر سے صرف یہی چاہیے کہ دل کے ارادے ہی پر اکتفا کیا جائے اور یہی بات علامہ عبدالحی لکھنوی حنفی رحمہ اللہ نے "عمدة الرعاية حاشية شرح الوقاية" میں بھی کہی ہے:

"مَحَلُّهَا الْقَلْبُ" "نیت کا مقام دل ہے (نہ کہ زبان)۔"

جب کہ مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے بہشتی زیور کے دوسرے حصے میں نماز کی شرطوں کے بیان میں مسئلہ نمبر (۱۱) کے تحت یوں لکھا ہے:

"زبان سے نیت کرنا ضروری نہیں، بلکہ دل میں جب اتنا سوچ لیوے کہ میں آج ظہر کی نماز پڑھتی (یا پڑھتا) ہوں اور اگر سنت پڑھتی (یا پڑھتا) ہو تو یہ سوچ لے کہ ظہر کی سنت

[1] زاد المعاد (۱/ ۱۹٦)

[2] غنية الطالبين اردو مترجم مع عربی مولانا راغب رحماني دهلوى (ص: ۱۸۔ ۱۹) طبع نفیس اکیڈمی، کراچی.

پڑھتی (یا پڑھتا) ہوں۔ بس اتنا خیال کر کے اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لیوے تو نماز ہو جائے گی۔ جو لمبی چوڑی نیت لوگوں میں مشہور ہے، اس کا کہنا کچھ ضروری نہیں ہے۔“

پھر موصوف کے مشورے اور اجازت سے لکھے گئے حاشیے میں مذکور ہے:

”یعنی لوگ نماز میں بڑی لمبی چوڑی نیت کرتے ہیں، یہاں تک کہ امام قراءت پڑھنے لگتا ہے اور اس کی نیت ختم نہیں ہوتی، ایسا کرنا برا ہے۔“

پھر آگے مسئلہ نمبر ۱۲ میں تھوڑی سی ڈھیل بھی دے دی ہے، جو بلا دلیل ہے۔[1]

2 بِسْمِ اللّٰہ پڑھنا:

وضو کے سلسلے کی دوسری بات اس کے شروع میں ”بسم اللہ“ کا پڑھنا بھی ہے۔[2]

امام نووی نے بھی لکھا ہے:

”اگر صرف ”بسم اللہ“ پڑھ لے تو بھی کفایت کر جاتا ہے۔“[3]

کیوں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سنن ابی داود، ابن ماجہ، دار قطنی، بیہقی، مستدرکِ حاکم اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا صَلَاۃَ لِمَنْ وَ لَا وُضُوْءَ لِمَنْ لَّمْ یَذْکُرِ اسْمَ اللّٰہِ»[4]

”اس کی کوئی نماز نہیں، جس کا وضو نہیں اور اس کا کوئی وضو نہیں، جس نے اس کے شروع میں ”بسم اللہ“ نہیں پڑھی۔“

شواہد کی بنا پر شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔ امام منذری، حافظ ابن حجر،

---

1. بہشتی زیور، مکمل و مدلل (ص: ۱۳۔۱۴) تاج کمپنی.
2. صرف ”بسم اللہ“ ہی پڑھیں، کیوں کہ اس جگہ ”الرحمن الرحیم“ کا اضافہ تو کسی ضعیف حدیث میں بھی مروی نہیں، اس لیے صرف ”بسم اللہ“ کہنا ہی سنت ہے۔ اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ ہمارے فاضل دوست حافظ عبدالرؤف (شارجہ، حال وارد کویت) نے اور دوسرا شیخ انصار زبیر محمدی (الجبیل، حال ممبئ) نے لکھا ہے اور یہ دونوں مطبوع ہیں۔
3. الأذکار للنووي (ص: ۲۲)
4. صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۹۲) سنن ابن ماجہ، رقم الحدیث (۳۹۹) إرواء الغلیل (۱/ ۱۲۲) والمنتقیٰ (۱/ ۱/ ۱۳٤) زاد المعاد تحقیق الأرناؤوط (۱/ ۹۵)

ابن الصلاح اور امام ابن کثیر رحمہما اللہ نے اسے قوی قرار دیا ہے اور حافظ عراقی نے حسن کہا ہے۔ دولابی نے ''الکنیٰ'' (۱/ ۱۲۰) میں امام بخاری رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ اس موضوع کی صحیح ترین حدیث یہی ہے۔[1]

امام منذری رحمہ اللہ نے مختصر سنن ابی داود میں لکھا ہے کہ اس موضوع کی احادیث میں سے سب سے اچھی سند اسی حدیث کی ہے۔[2]

یہی حدیث مسندِ احمد، سنن ابن ماجہ و، دارمی، العلل للترمذی، مسند بزار، سنن دارقطنی، مستدرک حاکم اور سنن بیہقی میں حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ اور سنن ترمذی و ابن ماجہ، مسندِ احمد و بزار، مستدرکِ حاکم اور سنن دارقطنی میں حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے۔ ''منتقیٰ الأخبار'' میں شیخ ابو البرکات المجد ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے مطابق امام بخاری رحمہ اللہ نے سعید بن زید رضی اللہ عنہ والی حدیث کو اس موضوع کی عمدہ ترین حدیث قرار دیا ہے، جب کہ اسحاق بن راہویہ نے حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ والی حدیث کو صحیح تر کہا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے بھی اسے ہی ''أحسن شيئ في الباب'' قرار دیا ہے۔ مذکورہ تین صحابہ کے علاوہ امام شوکانی رحمہ اللہ کے بقول حضرت عائشہ، سہل بن سعد، ابو سبرۃ، علی اور انس رضی اللہ عنہم سے بھی یہ حدیث مروی ہے۔ مختلف طُرق سے بکثرت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس حدیث کے مروی ہونے کی وجہ سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ان روایات کی مجموعی حیثیت اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی کوئی نہ کوئی اصل ضرور ہے۔''

امام ابن ابی شیبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ہمارے نزدیک یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ یہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔''

امام ابن سید الناس کا قول امام شوکانی رحمہ اللہ نے ان کی شرح ترمذی سے نقل کیا ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ اس موضوع کی حسن درجے والی صریح اور صحیح درجے والی غیر صریح روایات موجود ہیں۔[3]

ان تمام روایات کو نقل کرنے کے بعد امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ احادیث تو وضو کے

---

[1] الإرواء الغليل (١/ ١٢٢)

[2] مختصر السنن مع معالم السنن للخطابي و تهذيب السنن لابن القيم (١/ ٨٨) طبع دار المعرفة.

[3] التلخيص الكبير (١/ ١/ ٧٢_ ٧٣) نيل الأوطار (١/ ١/ ١٣٤_ ١٣٥)

شروع میں ''بسم اللہ'' پڑھنے کے واجب ہونے پر دلالت کرتی ہیں اور بظاہر اسحاق بن راہویہ اور ایک روایت میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اس کے واجب ہونے کے قائل ہیں۔ ظاہریہ کے نزدیک مطلقاً واجب ہے، جب کہ دیگر کے نزدیک یاد ہونے کی شکل میں واجب ہے، ورنہ نہیں (یعنی اگر بھولے سے چھوٹ جائے تو وضو ہو جائے گا۔ جان بوجھ کر نہ چھوڑے) جب کہ حنفیہ، شافعیہ، امام مالک اور ربیعہ اور جمہور نے اسے سنت قرار دیا ہے۔[1]

امام نسائی، ابن خزیمہ اور بیہقی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی اُس حدیث سے ''بسم اللہ'' کہنے کے استحباب پر استدلال کیا ہے، جس میں ایک معجزے کا بیان ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہ نے پانی تلاش کیا، مگر پانی نہ ملا تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم میں سے کسی کے پاس تھوڑا سا پانی ہے؟ (اور جب کسی کے پاس تھوڑا سا پانی مل گیا تو) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دستِ مبارک اس پانی والے برتن میں ڈال دیا اور فرمایا:

«تَوَضَّؤُوا بِسْمِ اللّٰه»[2] ''بسم اللہ پڑھ کر وضو کرنا شروع کرو۔''

یہ حدیث اور یہ واقعہ یا معجزہ صحیح بخاری و مسلم میں بھی مذکور ہے۔[3]

دورانِ وضو کی دوسری دعائیں:

وضو شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ تو ضرور ہی پڑھ لینی چاہیے، کیوں کہ تکمیلِ وضو کے ساتھ ساتھ یہ باعثِ برکت بھی ہے۔

1. ''معجم طبراني صغير'' میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں صرف بسم اللہ نہیں، بلکہ ''بسم الله و الحمد لله'' ہے اور ان کلمات کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ ''مجمع الزوائد'' میں علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ذکر کرکے اسے حسن قرار دیا ہے، مگر حافظ ابنِ طاہر اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اسے منکر قرار دیا ہے۔[4] لہٰذا صرف بسم اللہ کہنے پر اکتفا کرنا ہی بہتر ہے۔

---

[1] تحقيق الأذكار (ص: ٢٢) و نيل الأوطار أيضاً.

[2] صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٧٦)

[3] دیکھیں: نيل الأوطار (١/ ١/ ١٣٥۔ ١٣٦)

[4] مجمع الزوائد (١/ ٢٢٥) تحقيق الفوائد المجموعة للشوكاني، رقم الحديث (٣٢)

۴ بسم اللہ کے بعد وضو ختم کر لینے تک جو مختلف دعائیں اور اذکار رواج پا چکے ہیں، مثلاً: کلی کرنے کی دعا، ناک میں پانی چڑھانے کی دعا، منہ دھونے کی دعا، دایاں ہاتھ دھونے کی دعا، بایاں ہاتھ دھونے کی دعا، سر کے مسح کی دعا، دایاں پاؤں دھونے کی دعا، بایاں پاؤں دھونے کی دعا؛ یہ سب دعائیں من گھڑت ہیں۔ جو نبیِ اکرم ﷺ نے خود مانگی ہیں نہ اپنی امت کے لوگوں کو مانگنے کا کہا ہے اور نہ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہی سے ثابت ہیں۔

یہ دعائیں "كبيرى شرح منية المصلي" میں مذکور ہیں، ایسے ہی بازار میں ملنے والی نماز کے موضوع کی چھوٹی چھوٹی کتابوں میں بھی منقول ہوتی ہیں۔ ان میں سے صرف پہلی دو دعائیں چھوڑ کر بقیہ آٹھ دعاؤں کو نقل کر کے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ان کی تردید کی ہے اور امام نووی رحمہ اللہ کی کتاب "روضة الطالبين" کے حوالے سے لکھا ہے کہ "یہ دعائیں بے اصل ہیں۔"

امام شافعی اور جمہور میں سے کسی نے بھی یہ دعائیں ذکر نہیں کی ہیں۔ پھر امام نووی کی کتاب "المجموع شرح المهذّب" کے حوالے سے لکھا ہے کہ متقدمین علما و فقہا میں سے کسی نے انھیں ذکر نہیں کیا اور محدثِ شہیر علامہ ابن صلاح رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان دعاؤں کے بارے میں کوئی حدیث صحیح نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے "التلخيص الحبير" میں لکھا ہے:

> "اس کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک روایت امالی ابن عساکر، الدعوات للمستغفری اور مسند الفردوس دیلمی میں ہے، مگر اس روایت کے جملہ طُرق ضعیف ہیں۔ امام ابن حبان نے یہی روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ سے "الضعفاء" میں اور مستغفری نے "الدعوات" میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے بیان کی ہے، مگر ان کی سندیں بھی ضعیف اور واہی قرار دی گئی ہیں۔"[1]

ایسے ہی امام شوکانی رحمہ اللہ نے بھی "نيل الأوطار" میں ہر ہر عضو کے دھوتے وقت کی جانے والی دعاؤں کی تردید کی ہے اور متعدد کبار محدثینِ کرام سے تنقیدی تبصرے بھی نقل کیے ہیں۔[2]

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ "زاد المعاد" میں لکھتے ہیں:

---

[1] التلخيص الحبير لابن حجر (١/١/ ١٠٠)

[2] نيل الأوطار (١/١/ ٢٠٥)

''بسم اللہ کے سوا نبیِ اکرم ﷺ سے ہر ہر عضو کو دھوتے وقت کی کوئی بھی دعا ثابت نہیں ہے، بلکہ ان دعاؤں پر مشتمل ہر روایت کذب و اختلاق پر مشتمل ہے۔ نبیِ کریم ﷺ نے ایسی کوئی دعائیں کی ہیں اور نہ اپنی امت ہی کو سکھلائی ہیں۔ پھر انھوں نے آگے وضو کے اوّل و آخر میں ثابت شدہ دعائیں ذکر کی ہیں۔''[1]

امام نووی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الأذکار'' (ص: ۳۰) میں ان دعاؤں کو بناوٹی اور بے اصل قرار دیا ہے۔ شارح بخاری حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے مسائل و احکامِ اسلام کے موضوع پر جامع ومانع کتاب ''بلوغ المرام'' مرتب کی تو مسائلِ وضو اور خصوصاً وضو کی دعاؤں میں صرف اس کے آغاز میں ''بسم اللّٰہ'' اور آخر میں کلمہ شہادت اور «اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَھِّرِیْنَ» والی دعا ذکر کرنے پر ہی اکتفا کیا اور جب علامہ صنعانی حضرت امیر یمانی نے ''سبل السلام'' کے نام سے اس کتاب کی بہترین شرح لکھی تو مصنف کے اس طرزِ عمل کو سراہتے ہوئے لکھا کہ انھوں نے اعضاے وضو کو دھوتے وقت کی الگ الگ دعائیں ذکر ہی نہیں کیں، کیوں کہ وہ بالاتفاق ضعیف ہیں، پھر انھوں نے امام نووی اور حافظ ابن الصلاح رحمہما اللہ کے اقوال بھی نقل کیے ہیں، جن میں انھوں نے ان دعاؤں کو غیر صحیح اور بے اصل قرار دیا ہے۔[2]

سنن ترمذی کی شرح تحفۃ الاحوذی میں علامہ مبارک پوری نے بھی متعدد محدثینِ کرام کے اقوال نقل کر کے ان دعاؤں کے من گھڑت ہونے کی تائید کی ہے۔[3]

جب ان دعاؤں کی اسنادی حیثیت یہ ہے تو پھر اب انھیں نقل کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، جسے وہ دعائیں ضرور ہی دیکھنا ہو، وہ حافظ ابن حجر کی ''التلخیص الحبیر'' (۱/ ۱/ ۱۰۰)، ''إحیاء علوم الدین للغزالي'' (۱/ ۱۱۸۔ ۱۱۹) یا ''الأذکار للنووي'' (ص ٢٤) اور پاکستان کی وفاقی شرعی عدالت کے سابق مشیر مولانا ابو عبدالسلام محمد صدیق صاحب سرگودھوی کی کتاب ''راہِ سنت'' (ص: ۱۲۷۔ ۱۲۸) میں دیکھ سکتے ہیں۔

---

[1] زاد المعاد محقق (۱/ ۱۹۵۔ ۱۹۶)

[2] سبل السلام (۱/ ۵۵۔ ۵٦) طبع مصر.

[3] تحفة الأحوذي (۱/ ۱۸۲)

③ وضو کی دعاؤں کے ضمن میں یہ بھی ملتا ہے کہ وضو مکمل کر کے سورۃ القدر ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ...﴾ کی تلاوت کی جائے، لیکن اس سلسلے میں عرض ہے کہ سورۃ القدر قرآنِ کریم کی ایک قابلِ قدر سورت ہے اور اس کی تلاوت کارِ ثواب ہے، مگر اس کی تلاوت کے لیے وضو مکمل کر لینے کے بعد کے وقت کی تعیین کہاں سے آگئی؟ یہی وجہ ہے کہ اس موقع پر اس سورت کی تلاوت کو امام سخاوی رحمہ اللہ نے اصل قرار دیا ہے اور اس موقع پر اس کی تعیین کو دوسری مسنون و ثابت شدہ دعاؤں کے فوت کرنے کا سبب شمار کیا ہے۔[1]

④ دورانِ وضو یا وضو کر لینے کے بعد ایک دعا ثابت ہے، جو امام نسائی اور ابن السنی کی "عمل الیوم واللیلة للنسائي" میں مروی ہے، اس دعا کے الفاظ یہ ہیں:

«اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ ذَنْبِيْ، وَوَسِّعْ لِيْ فِيْ دَارِيْ وَبَارِكْ لِيْ فِيْ رِزْقِيْ»

"اے اللہ! مجھے بخش دے، میرے گھر میں کشائش فرما اور رزق میں برکت فرما۔"

امام نسائی کی تبویب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دعا وضو مکمل کر لینے کے بعد کی ہے، جب کہ امام ابن السنی کی تبویب سے اس کا دورانِ وضو کی دعا ہونا معلوم ہوتا ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس دعا کے دونوں مواقع کے لیے ہونے کا امکان ہے۔ امام نووی اور علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔[2]

علامہ ابن قیم نے "زاد المعاد" (۱/ ۲۶۲) میں اسے تشہّد کی دعاؤں میں شمار کیا ہے اور دوسری جگہ (زاد المعاد: ۲/ ۳۸۹) اسے وضو کی دعاؤں میں بیان کیا ہے۔ شیخ البانی نے "تمام المنة" (ص: ۹۴۔ ۹۶) میں اور "صلاۃ الرسول" کی تحقیق میں حافظ عبدالرؤف حفظہ اللہ نے بعض قرائن ذکر کر کے اس کے نماز کی دعاؤں میں سے ہونے ہی کو راجح کہا ہے۔[3]

اثنائے وضو باتیں کرنا:

دورانِ وضو کی ثابت اور غیر ثابت دعاؤں کا ذکر چل رہا ہے تو آگے بڑھنے سے پہلے مناسب

---

[1] سلسلة الأحاديث الضعيفة و الموضوعة للألباني (۱/ ۹۷)

[2] عمل اليوم والليلة للنسائي (ص: ۱۷۲) تحقيق فاروق أحمد حماده طبع مراكش.

[3] صلاة الرسول (تخريج: ۱۱٦)

معلوم ہوتا ہے کہ یہیں اس بات کی وضاحت بھی کر دی جائے کہ اثنائے وضو باتیں کرنے کی حیثیت کیا ہے؟ جائز ومباح یا ناجائز وممنوع؟

اس سلسلے میں ہمارے پاک و ہند کی مساجد میں وضو خانوں کی دیواروں پر عموماً یہ الفاظ لکھے ہوئے دیکھے گئے ہیں کہ وضو کرتے ہوئے باتیں کرنا منع ہے۔ اگر بات اسی حد تک رہتی تو ممکن تھا کہ اسے احتیاط و اخلاق یا آداب وغیرہ کے عمومی امور سے شمار کرلیا جاتا، مگر وہاں تو ان الفاظ کے آخر میں بین القوسین (حدیث) کا لفظ بھی لکھا ہوتا ہے، جس سے شک گزرتا ہے، بلکہ عام آدمی اس بات کا یقین کر لیتا ہے کہ یہ نبیِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہوگا کہ دورانِ وضو باتیں کرنا منع ہے۔ حالاں کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے اور اثنائے وضو میں باتیں کرنے کی ممانعت کی کوئی دلیل نہیں ہے، مگر اس کا یہ مطلب بھی نہ سمجھ لیا جائے کہ اس اثنا میں آپ جو جی میں آئے کہتے جائیں، بلکہ جو جی میں آئے، اس کے کہتے جانے کی تو عام حالات میں بھی شرعاً اجازت نہیں، چہ جائے کہ یہ دورانِ وضو جائز ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کے محاسبے کا عمل ایسا جامع اور وسیع ہے کہ اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ لکھا جاتا ہے۔ اگر وہ اچھا ہے تو ثواب اور اگر برا ہے تو عقاب لکھا جاتا ہے، ہاں اگر مباح ہو تو نہ ثواب نہ عقاب۔ چنانچہ اس عملِ محاسبہ کا ثبوت تو خود قرآنِ کریم میں موجود ہے، جیسا کہ سورت ق (آیت: ۱۸) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾

''کوئی بات اس (انسان) کی زبان پر نہیں آتی، مگر ایک نگہبان اس کے پاس تیار رہتا ہے۔''

سورۃ الانفطار (آیت: ۱۰، ۱۱، ۱۲) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۝ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ﴾

''حالانکہ تم پر نگہبان مقرر ہیں۔ عالی قدر (تمھاری باتوں کے) لکھنے والے۔ جو کچھ تم کرتے ہو وہ اسے جانتے ہیں۔''

معلوم ہوا کہ کسی کا یہ سمجھ کر زندگی گزارنا کہ اس کی غلطیاں، کوتاہیاں اور گناہ اللہ تعالیٰ کے ریکارڈ میں نہیں آتے ہوں گے، یہ سوچ سراسر حماقت ہے، کیوں کہ ہر شخص کی نیکیاں اور برائیاں لکھنے والے فرشتے اس کے ساتھ ہوتے ہیں، جن کا ذکر سورۃ الانفطار کے علاوہ سورۃ الرعد (آیت: ۱۱) میں

بھی آتا ہے، بلکہ وہاں سے تو دائیں بائیں والوں کے علاوہ ایک آگے اور ایک پیچھے یعنی ہر انسان کے ساتھ چار فرشتوں کی تعیناتی کا پتا چلتا ہے۔ ایک صحیح حدیث کی رو سے ان فرشتوں کی صبح و شام تبدیلی ہوتی رہتی ہے، پہلے جاتے اور نئے آتے رہتے ہیں۔

گویا زبان سے نکلی ہوئی ہر بات کا لفظ لفظ ریکارڈ ہوتا رہتا ہے، لہٰذا ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ منہ سے کسی بھی وقت کوئی بری بات نہ نکلے۔ قرآنِ کریم کے ان تینوں مقامات کے علاوہ متعدد احادیث میں بھی ناروا باتوں سے اپنی زبان کی حفاظت کا حکم وارد ہوا ہے، جس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں، کیوں کہ حفاظتِ زبان اور آفاتِ زبان تو الگ ایک مستقل موضوع ہے۔

سرِدست غرض صرف یہ ہے کہ جب عام حالات میں ناجائز اور ناروا بات کا زبان سے نکالنا ٹھیک نہیں تو ایسی باتیں دورانِ وضو کیسے ٹھیک ہوسکتی ہیں؟ مگر بقول علامہ سید سابق باتیں کرنے کی مخالفت بھی وارد نہیں تو اس کا معنیٰ یہ ہوا کہ دورانِ وضو اگر کوئی مباح بات ہو تو کی جاسکتی ہے۔[1] فتاوی علماے حدیث میں بھی یہی مذکور ہے۔[2]

ایسی بات کا کرنا مباح ہوگا، گناہ نہیں۔ احادیث میں مذکور بعض واقعات سے پتا چلتا ہے کہ دورانِ وضو مباح بات کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم اور سنن ابو داود میں موزوں اور جرابوں پر مسح کے باب میں حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے، جس میں ان کے سامنے نبیِ اکرم ﷺ کے وضو کرنے کا واقعہ مذکور ہے اور اس بات کا ذکر بھی ہے کہ جب پاؤں دھونے کی باری آئی تو حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نبیِ اکرم ﷺ کے پاؤں سے آپ ﷺ کے موزے اتارنے کے لیے جھکے تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«دَعْهُمَا فَإِنِّي أَدْخَلْتُهُمَا طَاهِرَتَيْنِ فَمَسَحَ عَلَيْهِمَا»[3]

''انھیں رہنے دو، کیوں کہ میں نے یہ اسی وقت پہنے تھے، جب میرے دونوں پاؤں پاک تھے (یعنی میں وضو سے تھا) پھر آپ ﷺ نے ان پر مسح کیا۔''

---

[1] فقه السنة (١/ ٦٠)

[2] فتاویٰ علماے حدیث (١/ ٥٨)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٣٠٩) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٠٧) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٣٧) المنتقىٰ مع النيل (١/ ١٨٠)

اس واقعے سے معلوم ہوا کہ نبیِ اکرم ﷺ نے وضو کے دوران میں بات کی اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ کے موزے اتارنے سے روکتے ہوئے نہ اتارنے کا سبب بھی بتایا تھا۔

اعضاے وضو کو دھونے میں تیامن:

جسم کے جو اعضاے وضو جوڑا جوڑا ہیں، جیسے ہاتھ، پاؤں، کلائیاں؛ انھیں وضو کے دوران میں دھوتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ پہلے دائیں کو دھویا جائے اور پھر بائیں کو، کیوں کہ صحیح بخاری و مسلم اور سننِ اربعہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُحِبُّ التَّيَمُّنَ مَا اسْتَطَاعَ فِيْ شَأْنِهٖ كُلِّهٖ، فِيْ وُضُوْءِهٖ وَتَرَجُّلِهٖ وَتَنَعُّلِهٖ»[1]

''نبی ﷺ حسبِ استطاعت اپنے تمام امور میں دائیں پہلو کو محبوب رکھتے تھے۔ طہارت (کے دوران میں اعضاے وضو کو دھونے) میں، سر کو کنگھا کرنے میں اور جوتا پہننے میں بھی (دائیں جانب سے آغاز کرنا ہی محبوب تھا)۔''

اس عام مفہوم والی حدیث کے علاوہ خاص وضو کے بارے میں بھی سنن ابی داود و ابن ماجہ، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، مسند احمد اور سنن کبریٰ بیہقی میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا:

«اِذَا لَبِسْتُم وَإِذَا تَوَضَّأْتُمْ فَابْدَأُوْا بِأَيَا مِنِكُمْ»[2]

''جب تم کوئی لباس پہنو اور جب وضو کرو، تو دائیں اعضا سے شروع کرو۔''

مثلاً اگر قمیص پہننے لگیں تو پہلے دایاں بازو پہنیں، شلوار، پاجامہ یا پتلون پہننے لگیں تو پہلے دائیں

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٤٢٦) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٦٠۔ ١٦١) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٤٨٧) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٩٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٠٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠١) مشكاة المصابيح مع المرعاة (١/ ٤٦٧۔ ٤٦٨)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٤٨٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٢) موارد الظمآن، رقم الحديث (١٤٧) و صحيح الجامع، رقم الحديث (٧٨٧) مشكاة المصابيح مع مرعاة المفاتيح (١/ ١٦٨۔ ١٩٦) و صححه الألباني في تحقيق المشكاة (١/ ١٢٧)

پاؤں کو اس میں داخل کریں، جوتا پہنیں تو بھی پہلے دایاں اور پھر بایاں۔ ایسے ہی اس بات کی تائید سنن ترمذی اور نسائی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی اُس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

« إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ إِذَا لَبِسَ قَمِيْصاً بَدَأَ بِمَيَامِنِهِ »[1]

''نبیِ اکرم ﷺ جب قمیص پہننے لگتے تو دائیں بازو سے شروع کرتے تھے۔''

اس طرح وضو کے دوران میں پہلے دایاں ہاتھ اور بازو، پھر بایاں ہاتھ اور بازو دھوئیں۔ اسی طرح پاؤں دھوتے وقت پہلے دایاں پاؤں اور پھر بایاں پاؤں دھوئیں۔ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں مذکور حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مسنون وضو کی ترتیب بھی اسی طرح وارد ہوئی ہے۔

4 کلی کرنا اور ناک صاف کرنا:

مسنون طریقۂ وضو میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ایک ہی چلو لیا اور اسی کے ساتھ ہی کلی بھی کی اور ناک بھی صاف کیا۔ یہ عمل آپ ﷺ نے تین مرتبہ دہرایا، گویا نبیِ اکرم ﷺ ایک چلو سے پانی لیتے اور اس کا نصف حصہ کلی کرنے کے لیے منہ میں ڈال لیتے اور دوسرا نصف حصہ ناک میں چڑھاتے اور اسے جھاڑ کر صاف کرتے تھے۔ جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم اور سنن ترمذی کے الفاظ « فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ كَفَّةٍ وَّاحِدَةٍ »[2] سے ظاہر ہو رہا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کلی اور ناک کے لیے ایک ہی چلو پانی کو آدھا آدھا کر کے استعمال کرنا چاہیے، بلکہ امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں صحیح و مختار مذہب کی دلیل موجود ہے کہ سنت یہی ہے کہ ایک چلو سے منہ میں پانی ڈال کر کلی کی جائے اور اسی کے آدھے حصہ سے ناک میں پانی چڑھایا جائے۔

صحیح بخاری کی شرح فتح الباری میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

---

[1] المشكاة مع المرعاة (١/ ٤٦٩)

[2] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (١٩١) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٢٢) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦)

”ایک ہی چلو سے کلی کرنے اور ناک میں پانی چڑھانے کی یہ صریح دلیل ہے۔“[1]

اسی موضوع پر دیگر احادیث بھی مروی ہیں، مثلاً صحیح ابن حبان، سنن دارمی اور مستدرکِ حاکم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

« إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَوَضَّأَ مَرَّةً، وَجَمَعَ بَيْنَ الْمَضْمَضَةِ وَالْإِسْتِنْشَاقِ »[2]

”نبیِ اکرم ﷺ نے تمام اعضا کو ایک مرتبہ دھو کر وضو کیا اور کلی و ناک میں ایک ہی چلو سے پانی چڑھایا۔“

ایسے ہی سنن نسائی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

« تَوَضَّأَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَغَرَفَ غَرْفَةً، فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ، ثُمَّ غَرَفَ غَرْفَةً فَغَسَلَ وَجْهَهُ »[3]

”نبیِ اکرم ﷺ نے وضو کیا تو آپ ﷺ نے ایک چلو پانی لیا، اس سے کلی کی اور ناک میں بھی چڑھایا۔ پھر آپ ﷺ نے ایک چلو پانی اور لیا اور اس سے منہ دھویا۔“

صحیح بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے نبیِ اکرم ﷺ کے وضو کی مسنون کیفیت بیان کرنے کے لیے جب وضو کیا:

« أَخَذَ غَرْفَةً مِنْ مَّآءٍ فَمَضْمَضَ بِهَا وَاسْتَنْشَقَ »[4]

”انھوں نے ایک چلو پانی لیا، جس سے کلی بھی کی اور ناک میں بھی چڑھایا۔“

نیز سنن ابی داود و نسائی اور مسند احمد و طیالسی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی تین روایات ہیں، ان تینوں میں بھی ایک چلو پانی ہی سے کلی کرنے اور ناک میں چڑھانے کا ذکر ہے۔[5]

یہ طریقہ جو عام طور پر مروج ہے کہ پہلے تین مرتبہ تین چلوؤں سے کلی کی جاتی ہے اور پھر تین مرتبہ ناک میں پانی چڑھا کر اسے صاف کیا جاتا ہے، یہ طریقہ صحیح احادیث سے ثابت نہیں۔ ہاں سنن

---

[1] فتح الباري (١/ ٢٩١)

[2] تحفة الأحوذي و حسنه (١/ ١٢٣)

[3] صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٩٩) و تحفة الأحوذي و حسنه (١/ ١٢٣)

[4] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٢٤٠)

[5] التلخيص الحبير (١/ ١/ ٧٩۔ ٨١) و تحفة الأحوذي (١/ ١٢٤)

ابی داود میں ایک روایت ہے، جسے طلحہ بن مصرف اپنے باپ اور دادا کے واسطے سے بیان کرتے ہیں کہ ان کے دادا نے کہا:

«رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَفْصِلُ بَيْنَ الْمَضْمَضَةِ وَالْإِسْتِنْشَاقِ»[1]

''میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ وضو کے دوران میں کلی اور ناک میں پانی چڑھانے میں فصل کیا کرتے تھے (یعنی دونوں کے لیے الگ الگ چلو پانی لیتے تھے)۔''

مگر اس حدیث کو علامہ ابن قیم اور دیگر محدثینِ کرام رحمہم اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے، کیوں کہ طلحہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبیِ کریم ﷺ کو کلی اور ناک کے لیے الگ الگ پانی لیتے دیکھا، حالانکہ طلحہ کے دادا کا صحابی ہونا ہی ثابت نہیں اور جو شخص صحابی نہ ہو اور یہ کہے کہ میں نے نبیِ کریم ﷺ کو یہ کرتے دیکھا ہے تو اس کی بات معتبر نہ ہوئی، نیز طلحہ کے والد بھی غیر معروف اور مجہول ہیں۔ اس کے علاوہ طلحہ والی اس روایت میں ایک راوی ''لیث بن ابی سلیم'' بھی ہے، جسے محدّثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ ان تینوں وجوہات کی بنا پر اس حدیث کو ضعیف اور نا قابلِ حجت قرار دیا گیا ہے۔[2]

ایسے ہی صحت وضعف کے اعتبار سے بعض غیر واضح، غیر صریح بلکہ محتمل روایات سے کلی اور ناک میں پانی چڑھانے کو الگ الگ کرنے پر استدلال کیا گیا ہے۔ اگر بالفرض انھیں بھی قابلِ حجت سمجھ لیا جائے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ کلی اور ناک میں پانی چڑھانے میں وصل اور فصل دونوں ہی جائز ہیں، لیکن (مذکورہ تفصیل کے پیشِ نظر) صحیح تو یہی ہے کہ وصل کیا جائے، کیوں کہ فصل کا جو انداز عموماً مروج ہے، وہ ضعیف، غیر واضح اور غیر صریح روایات پر مبنی ہے، جب کہ وصل کا ثبوت صحیح بخاری و مسلم جیسی کتب میں مذکور ہے۔ لہٰذا وصل ہی افضل ہے اور فصل محض ''گزارہ'' ہے۔ یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ فصل اور وصل کے جواز میں تو کوئی اختلاف نہیں، بلکہ دونوں جائز ہیں، یہ اختلافِ رائے صرف افضلیت میں ہے۔

محدّثِ برصغیر علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے ''تحفة الأحوذي'' میں اس موضوع پر

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٣٩) زاد المعاد (١/ ١٩٢۔ ١٩٣)

[2] تحفة الأحوذي (١/ ١٢٦)

بڑی نفیس بحث کی ہے اور علامہ عینی رحمہ اللہ کا قول ذکر کیا ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ بہتر یہ ہے کہ دونوں صورتوں ہی کو جواز پر محمول کیا جائے، پھر انھوں نے امیر صنعانی کی کتاب "سبل السلام شرح بلوغ المرام" سے ان کا قول نقل کیا ہے، جس میں وہ کہتے ہیں:

"فصل اور وصل کے دونوں طریقے ہی روایات میں وارد ہیں۔ لہٰذا اقرب بات اختیار ہی ہے اور اگرچہ دونوں طریقے ہی سنت ہیں، لیکن وصل کی روایت اکثر اور صحیح تر ہے۔ امام ابن العربی رحمہ اللہ نے "عارضة الأحوذي شرح جامع الترمذي" میں وصل والے انداز ہی کو "أقویٰ في النظر، و علیه یدل الظاهر من الأثر" قرار دیا ہے۔" [1]

احادیث میں اس بات کا ثبوت بھی موجود ہے کہ ناک میں پانی چڑھانے میں مبالغے سے کام لیا جائے، سوائے اس کے کہ کوئی شخص روزہ سے ہو، کیوں کہ روزے دار کو دورانِ وضو ناک میں پانی چڑھاتے وقت احتیاط سے کام لینا چاہیے۔ مبادا پانی حلق سے نیچے اتر جائے، کیوں کہ سنن ابی داود و ترمذی، نسائی و ابن ماجہ، مسندِ احمد و شافعی، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، مستدرکِ حاکم اور سنن کبریٰ بیہقی میں حضرت لقیط بن صبرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَبَالِغْ فِي الْإِسْتِنْشَاقِ إِلَّا أَنْ تَكُوْنَ صَائِمًا» [2]

"ناک میں پانی چڑھانے میں مبالغہ کرو، سوائے اس کے کہ تم روزے سے ہو۔"

یاد رہے کہ ناک میں پانی تو دائیں ہاتھ ہی سے چڑھایا جائے گا، لیکن اس کو جھاڑنے اور صاف کرنے کے لیے بائیں ہاتھ سے کام لینا ضروری ہے، جیسا کہ استنجے اور ناک صاف کرنے کے آداب میں سے یہ بات معروف ہے۔ سنن نسائی اور مسند احمد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے:

«وَنَثَرَ بِيَدِهِ الْيُسْرٰى، فَفَعَلَ هٰذَا ثَلَاثًا، ثُمَّ قَالَ: هٰذَا طُهُوْرُ نَبِيِّ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم» [3]

"انھوں نے بائیں ہاتھ سے ناک کو جھاڑا اور تین مرتبہ ایسا کیا اور پھر فرمایا: اللہ کے

---

[1] تحفة الأحوذي (١/ ١٢١۔ ١٢٦) سبل السلام (١/ ١/ ٥٤)

[2] صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (١٢٩) صحیح سنن الترمذي، رقم الحدیث (٦٣١) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (٨٥) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٤٠٧) و موارد الظمآن، رقم الحدیث (١٥٩) مسند أحمد (٤/ ٣٣) المشکاة مع المرعاة (١/ ٤٧١۔ ٤٧٢) علامہ مبارک پوری رحمہ اللہ نے محدثین کی ایک جماعت سے اس حدیث کی تصحیح نقل کی ہے۔ اسی طرح علامہ البانی نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔ تحقیق المشکاة (١/ ١٢٨)

[3] صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (٨٩) المنتقیٰ مع النیل (١/ ١/ ١٤٣)

نبی ﷺ کا وضو اس طرح تھا۔‘‘

سنن نسائی، مسند احمد اور سننِ دارمی میں عبد خیر بیان کرتے ہیں کہ نمازِ فجر کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک جگہ بیٹھ کر کسی غلام کے ہاتھوں پانی منگوایا اور وضو کرنے لگے، جبکہ ہم سب انھیں دیکھ رہے تھے۔ اس حدیث میں ہے:

﴿وَنَثَرَ بِيَدِهِ الْيُسْرٰى، فَعَلَ هٰذَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ﴾

’’انھوں نے اپنے بائیں ہاتھ سے ناک کو جھاڑا اور ایسا تین مرتبہ کیا۔‘‘

آخر میں فرمایا:

﴿مَنْ سَرَّهُ أَنْ يَّنْظُرَ إِلٰى طُهُوْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَهٰذَا طُهُوْرُهُ﴾[1]

’’جسے یہ بات خوش گوار معلوم ہو کہ وہ نبی ﷺ کا وضو دیکھے تو (وہ جان لے کہ) یہ نبی ﷺ کا وضو ہے۔‘‘

5 منہ دھونا:

ہاتھ دھونے، کلی کرنے اور ناک میں پانی چڑھانے اور جھاڑنے کے بعد تین تین مرتبہ منہ دھویا جاتا ہے، مگر کتنے ہی لوگ ایسے بھی ہیں، جو منہ دھونے میں اتنی جلد بازی اور بے پروائی کرتے ہیں کہ ان کی ٹھوڑی نیچے سے خشک رہ جاتی ہے، جب کہ اس طرح وضو مکمل نہیں ہوتا، کیوں کہ اس طرح چہرہ پورا نہیں دھلتا۔

چہرے کی حدود:

فقہا نے منہ یا چہرے کی جو حدود بیان کی ہیں، وہ امام ابن قدامہ، علامہ ابو القاسم خرقی اور شیخ سید سابق وغیرہ کے بقول اس طرح ہیں کہ ماتھے کا وہ مقام جہاں سے سر کے بال شروع ہوتے ہیں، وہاں سے لے کر جبڑوں تک اور ٹھوڑی کے نچلے حصے تک اور دائیں کان سے لے کر بائیں کان تک کے مابین والے حصے کو منہ یا چہرہ شمار کیا جاتا ہے۔[2] لہٰذا منہ دھوتے وقت ٹھوڑی اور دونوں جبڑوں کے نچلے حصے کو دھونا بھی ضروری ہے۔

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٢) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٩١) المشكاة مع المرعاة (١/ ٤٧٥۔ ٤٧٦) وصححه الألباني في تحقيق المشكاة (١/ ١٢٩)

[2] المغني (١/ ١١٤) وفقه السنة (١/ ٤٣)

ڈاڑھی کا خلال:

جو لوگ سنتِ رسول بلکہ سنتِ انبیا رضی اللہ عنہم سے عداوت نہیں رکھتے، بلکہ ڈاڑھی رکھے ہوئے ہوں، ان کے لیے منہ دھوتے وقت ڈاڑھی کا خلال بھی مستحب ہے، کیوں کہ سنن ترمذی و ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان، مستدرک حاکم اور سنن دارقطنی میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُخَلِّلُ لِحْيَتَهُ »[1]

''نبیِ اکرم ﷺ اپنی ڈاڑھی کا خلال کیا کرتے تھے۔''

ڈاڑھی کے خلال کا طریقہ سنن ابو داود میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے یوں مروی ہے:

« إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ إِذَا تَوَضَّأَ أَخَذَ كَفًّا مِنْ مَّاءٍ فَأَدْخَلَهُ تَحْتَ حَنَكِهِ فَخَلَّلَ بِهِ لِحْيَتَهُ وَقَالَ: هٰكَذَا أَمَرَنِي رَبِّي عَزَّوَجَلَّ »[2]

''نبیِ اکرم ﷺ جب وضو کرتے تو پانی کا ایک چلو لے کر اسے اپنی ٹھوڑی کے نیچے داخل کرتے اور اس سے ڈاڑھی کا خلال کرتے اور فرمایا: مجھے میرے پروردگار نے اسی طرح حکم دیا ہے۔''

اس موضوع کی اور بھی کئی احادیث متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں، مگر وہ تقریباً سب کی سب متکلم فیہ ہیں۔[3]

یہ احادیث بکثرت ہیں، یہی وجہ ہے کہ علامہ مبارک پوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کی یہ کثرت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ خلال کی اصل ضرور ہے اور کیسے نہ ہو، جب کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے حدیثِ عثمان رضی اللہ عنہ کو صحیح کہا ہے۔ امام بخاری نے اسے حسن کہا ہے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے خلال کے بارے میں حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا کو حسن قرار دیا ہے۔ یہ احادیث مجموعی طور پر خلال کے استحباب پر دلالت کرتی ہیں اور میرے نزدیک یہی حق ہے۔

---

[1] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣٠) موارد الظمآن، رقم الحديث (١٥٤) المنتقىٰ مع النيل (١/ ١/ ١٤٨۔ ١٤٩)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٣٢) و الحاكم في المستدرك (١/ ١٤٩) صححه الألباني في تحقيق المشكاة (١/ ١٢٩) و إرواء الغليل (١/ ١٣٠)

[3] تفصیل کے لیے دیکھیں: نيل الأوطار (١/ ١/ ١٤٩)

خلال کے طریقے پر مشتمل دوسری حدیثِ انس رضی اللہ عنہ کو بھی شیخ البانی رحمہ اللہ نے "إرواء الغليل" (۱/ ۱۳۰) اور "تحقيق المشكاة" (۱/ ۱۲۹) میں صحیح قرار دیا ہے۔ لہٰذا ڈاڑھی کے خلال کی مشروعیت بلاشبہہ ثابت ہوگئی۔

6 کہنیوں سمیت دونوں ہاتھ دھونا:

پہلے دائیں ہاتھ کو کہنی سمیت دھوئیں اور پھر بائیں ہاتھ کو بھی کہنی سمیت دھوئیں۔ ہاتھوں کو کہنیوں سمیت اور پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھونا تو نصِ قرآنی کی رُو سے بھی فرض ہے، جیسا کہ آیت اور اس کا ترجمہ ذکر کیا جا چکا ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص کہنیوں سے بھی آگے تک بازو اور ٹخنوں سے بھی آگے تک پنڈلیاں دھونا چاہے تو یہ مستحب ہے، کیوں کہ صحیح بخاری و مسلم شریف، مسندِ احمد اور سنن بیہقی میں مروی ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ وضو کرنے لگے تو جب انھوں نے اپنا منہ اچھی طرح دھولیا اور دایاں ہاتھ دھویا تو کہنی سے بھی اوپر تک بازو کو دھونے لگے، پھر جب بایاں ہاتھ دھویا تو کہنی سے بھی اوپر تک بازو کو دھونے لگے اور سر کا مسح کیا اور دایاں پاؤں دھویا، تو ٹخنے سے اوپر پنڈلی تک دھونے لگے اور پھر جب بایاں پاؤں دھویا تو اس کے ٹخنے سے بھی اوپر تک پنڈلی دھوئی اور پھر کہا:

«هٰكَذَا رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَتَوَضَّأُ»

"میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو اسی طرح وضو کرتے دیکھا ہے۔"

اس طرح وضو کر کے نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«أَنْتُمُ الْغُرُّ الْمُحَجَّلُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ إِسْبَاغِ الْوُضُوْءِ»[1]

"قیامت کے دن تم لوگ پوری طرح وضو کرنے کی بدولت چمکتے ہوئے ہاتھوں اور پیروں والے اور روشن چہروں والے ہوگے۔"

مدرج جملہ:

اس حدیث میں آگے یہ الفاظ بھی ہیں جو کہ مدرج ہیں:

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (۱۳٦) صحيح مسلم مع شرح النووي (۳/ ۱۳٤۔ ۱۳۵)

«فَمَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ فَلْيُطِلْ غُرَّتَهُ وَتَحْجِيلَهُ» [1]

’’تم میں سے جو شخص استطاعت رکھے، وہ اپنے اعضاے وضو کی چمک بڑھا لے۔‘‘

یہ آخری الفاظ بظاہر تو نبیِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہی معلوم ہوتے ہیں، مگر بعض کبار محدّثین نے تحقیق و تدقیق کے بعد ثابت کیا ہے کہ «فَمَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ فَلْيُطِلْ غُرَّتَهُ وَتَحْجِيلَهُ» کے الفاظ مدرج ہیں، یعنی نبیِ کریم ﷺ کے نہیں، بلکہ کسی راوی کے تفسیری و تشریحی الفاظ ہیں، مگر کسی وجہ سے واضح طور پر فرق نہیں کیا گیا ہے۔ چنانچہ امام منذری رحمہ اللہ نے ’’الترغیب و الترھیب‘‘ میں اس بات کی وضاحت کی ہے۔ [2]

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے مسند (۲/ ۳۳٤۔ ۵۲۳) میں بھی اس آخری جملے کو مدرج قرار دیتے ہوئے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے بعد والے راوی نعیم کا قول ذکر کیا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ یہ آخری جملہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ہے یا نبیِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے۔ [3]

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے بخاری شریف کی شرح فتح الباری میں کہا ہے:

’’اس روایت کو دس صحابہ رضی اللہ عنہم نے روایت کیا ہے۔ ان میں سے کسی کی روایت میں یہ آخری جملہ ہے نہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے والوں کی روایت میں ہے، سوائے نعیم کی اس روایت کے۔‘‘ [4]

’’أعلام الموقعین‘‘ میں علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنے استاذ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے:

«هٰذِهِ اللَّفْظَةُ لَا يُمْكِنُ أَنْ تَكُونَ مِنْ كَلَامِهِ ﷺ»

’’یہ جملہ ممکن ہی نہیں کہ نبیِ کریم ﷺ کا کلامِ مبارک ہو۔‘‘

آگے وہ اس کی دلیل کے طور پر فرماتے ہیں:

’’چمک (غرہ) ہاتھ میں نہیں ہوگی، بلکہ چہرے کے سوا کہیں بھی نہیں ہوسکتی اور اس کو طویل

[1] صحیح مسلم (۳٤/ ۲٤٦، ۳۵) ریاض الصالحین (۱۰۳۱) المنتقیٰ مع النیل (۱/ ۱/ ۱۵۲) إرواء الغلیل (۱/ ۱۳۲)

[2] الترغیب و الترھیب (۱/ ۱۲٤)

[3] إرواء الغلیل (۱/ ۱۳۲)

[4] فتح الباري (۱/ ۱۳٦) التلخیص (۱/ ۱/ ۵۸)

کرنا ناممکن ہے، کیوں کہ یہ تو سر میں بھی داخل ہے، جب کہ اسے غرہ کہا ہی نہیں جاتا۔‘‘[1]

حفاظِ حدیث کی ان تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ آخری جملہ نبیِ اکرم ﷺ کا ارشاد نہیں، بلکہ کسی راوی کی طرف سے اِدراج ہے۔ البتہ حافظ ابن حجر کے بقول ایک جماعتِ سلف اور اکثر شافعیہ و حنفیہ نے اِطالتِ غرہ کو مستحب قرار دیا ہے اور شیخ ابن باز نے بھی اِلاطتِ تحجیل کو مشروع قرار دیا ہے۔[2]

⑦ انگلیوں کا خلال:

ہاتھوں کو دھونے کے دوران میں انگلیوں کا خلال کرنا اور ایسے ہی پاؤں کو دھونے کے دوران میں پاؤں کی انگلیوں کا خلال کرنا بھی سنت ہے اور قاضی عیاض کے بقول یہ واجب ہے۔[3]

یہ خلال کئی احادیث سے ثابت ہے، جیسا کہ سنن ترمذی و ابن ماجہ، مسندِ احمد اور مستدرکِ حاکم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبیِ کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِذَا تَوَضَّأْتَ فَخَلِّلْ بَيْنَ أَصَابِعِ يَدَيْكَ وَرِجْلَيْكَ))[4]

’’جب تم وضو کرو، تو ہاتھوں اور پیروں کی انگلیوں میں خلال بھی کرو۔‘‘

ہاتھوں کی انگلیوں کا خلال تو انھیں ایک دوسرے میں داخل کرنے سے بہ آسانی ہو جاتا ہے، جبکہ پاؤں کی انگلیوں کے خلال کا طریقہ بھی ایک حدیث میں موجود ہے۔ چنانچہ سنن ابی داود، ترمذی،

---

[1] أعلام الموقعين (٦/ ٣١٦) بحواله تمام المنة (ص: ٩٢) إرواء الغليل (١/ ١٣٢۔ ١٣٣)

[2] فتح الباري بتعليق ابن باز (١/ ٢٣٦۔ ٢٣٧)

[3] نيل الأوطار (١/ ١/ ١٥٤)

[4] المنتقىٰ مع النيل (١/ ١/ ١٥٣۔ ١٥٤) اس حدیث کی سند میں ایک راوی صالح ہے جو حافظے میں اختلاط ہو جانے کی وجہ سے ضعیف ہے۔ مگر امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے، کیوں کہ یہ موسیٰ بن عقبہ کی صالح سے روایت ہے اور اس کا سماع اختلاط سے پہلے کا ہے۔ (نيل الأوطار ١/ ١/ ١٥٤) اور تحقيق المشكاة (١/ ١٢٨) میں شیخ البانی نے بھی اسے حسن کہا ہے اور امام ترمذی کی تحسین نقل کی ہے۔ ایسے ہی سننِ اربعہ، صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان، مسند احمد، مستدرکِ حاکم، سنن بیہقی، شافعی اور دارمی میں حضرت لقیط بن صبرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبیِ اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کی: مجھے وضو کے بارے میں بتایئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((أَسْبِغِ الْوُضُوْءَ وَخَلِّلْ بَيْنَ الْأَصَابِعِ)) ’’وضو اچھی طرح کرو اور انگلیوں کا خلال بھی کرو۔‘‘
المشكاة مع المرعاة (١/ ٤٧١۔ ٤٧٢) وقد صححه جمع كبير كما في المرعاة و تحقيق الألباني (١/ ١٣٨)

ابن ماجہ، مسندِ احمد اور بیہقی میں حضرت مستورد بن شداد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ إِذَا تَوَضَّأَ يَدْلُكُ أَصَابِعَ رِجْلَيْهِ بِخِنْصَرِهِ»[1]

''میں نے نبیِ کریم ﷺ کو دیکھا کہ جب آپ ﷺ وضو کر رہے تھے تو پاؤں کی انگلیوں کو اپنے ہاتھ کی چھنگلی (سب سے چھوٹی انگلی) سے مَل رہے تھے۔''

ایسے ہی سنن دار قطنی میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے، طبرانی اوسط میں حضرت ربیع بنت معوّذ رضی اللہ عنہا سے، طبرانی کبیر میں حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے، سنن دار قطنی ہی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے، مسندِ احمد میں حضرت عبداللہ بن زائد بن عاصم رضی اللہ عنہ سے اور ایسے ہی مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ میں بھی خلال کے بارے میں احادیث موجود ہیں، لیکن ان میں سے تو ہر روایت ہی متکلم فیہ ہے، مگر وہ تین احادیث جو ہم نے ذکر کی ہیں، صحیح و حسن درجے کی ہیں۔ ان کے ساتھ یہ متکلم فیہ احادیث بھی تقویت حاصل کر جاتی ہیں اور ان سب کا مجموعی مفاد خلال کی مشروعیت کے لیے ایک مضبوط دلیل بن جاتا ہے۔[2]

امام ابن قدامہ نے اپنی کتاب ''المغني'' میں لکھا ہے کہ خلال کرتے وقت دائیں پاؤں کی چھنگلی سے شروع کریں اور انگوٹھے تک پہنچیں اور بائیں پاؤں کے انگوٹھے سے شروع کریں اور چھنگلی تک جائیں، اس لیے کہ نبیِ کریم ﷺ کو تمام امور میں دایاں پہلو محبوب تھا، جیسا کہ صحاح و سنن کے حوالے سے حدیث بھی گزری ہے، لہٰذا اس طرح خلال کرنے میں نبیِ اکرم ﷺ کا محبوب انداز آجائے گا۔[3]

دوسری بات یہ کہ پاؤں کی انگلیوں کا خلال کرنے کے لیے جو بھی ہاتھ استعمال کریں، جائز ہے۔ ویسے چونکہ پاؤں دھوئے بھی بائیں ہاتھ سے جاتے ہیں تو ان کی انگلیوں کا خلال بھی بائیں ہاتھ ہی سے بہتر ہے۔ امام غزالی رحمہ اللہ نے بھی بائیں ہاتھ ہی کا ذکر کیا ہے اور یہ بات کسی نص سے تو

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٣٤) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٤٦) مسند أحمد (٤/ ٢٢٩) المشكاة مع المرعاة (١/ ٤٧٣) علامہ مبارک پوری رحمہ اللہ نے بعض محدّثین سے اس حدیث کی تصحیح نقل کی ہے۔ و صححه الألباني في تحقيق المشكاة (١/ ١٢٨)

[2] نيل الأوطار (١/ ١/ ١٥٤)

[3] المغني لابن قدامة (١/ ١٠٨)

ثابت نہیں، لیکن امام غزالی رحمہ اللہ نے پاؤں کی انگلیوں کے خلال کو استنجا پر قیاس کیا ہے اور بائیں ہاتھ کی تجویز پیش کی ہے۔[1]

انگوٹھی اور چوڑیوں کا ہلانا:

وضو کے لیے جب ہاتھ دھونے لگیں تو ایک چیز یہ بھی پیشِ نظر رکھیں کہ اگر کسی ہاتھ میں انگوٹھی ہو یا کسی عورت نے کنگن یا چوڑیاں پہن رکھی ہوں تو انھیں ہلا دینا چاہیے، تاکہ کہیں ان کے تنگ ہونے کی وجہ سے نیچے کی جگہ خشک نہ رہ جائے۔ اس سلسلے میں ایک ضعیف روایت بھی مروی ہے، جو ابن ماجہ اور دارقطنی میں حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا تَوَضَّأَ وُضُوءَ الصَّلَاةِ حَرَّكَ خَاتَمَهٗ فِي إِصْبَعِهٖ»[2]

''نبی ﷺ جب نماز کا وضو کرنے لگتے تو اپنی انگلی میں انگوٹھی کو ہلاتے تھے۔''

مگر یہ روایت معمر بن عبداللہ کی وجہ سے ضعیف ہے۔ محدثین نے اسے منکر الحدیث کہا ہے۔ وہ اپنے باپ محمد بن عبیداللہ سے بیان کرتے ہیں، جبکہ وہ بھی سخت منکر الحدیث اور ذاہب و متروک ہیں، لہٰذا یہ سند ضعیف ہوئی۔[3] زاد المعاد میں علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے۔[4]

البتہ صحیح بخاری شریف میں تعلیقاً اور تاریخِ امام بخاری اور مصنف ابن شیبہ میں موصولاً امام ابن سیرین رحمہ اللہ سے صحیح سند کے ساتھ یہی مروی ہے، چنانچہ بخاری شریف ''باب غسل الأعقاب'' کے ترجمے میں مذکور ہے:

''وَكَانَ ابْنُ سِيرِيْنَ يَغْسِلُ مَوْضِعَ الْخَاتَمِ إِذَا تَوَضَّأَ''[5]

---

[1] سبل السلام (١/ ١/ ٤٨) إحياء علوم الدين للغزالي (١/ ١١٩) طبع عالم الكتب دمشق.

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٤٩) مشكاة المصابيح بتحقيق الألباني (١/ ١٣٣۔ ١٣٤) ضعيف الجامع الصغير، رقم الحديث (٤٣٦٦)

[3] المرعاة شرح المشكاة علامه عبيد الله رحمانى مباركپورى (١/ ٤٨٩) تحقيق المشكاة للألباني (١/ ١٣٤)

[4] زاد المعاد (١/ ١٩٨)

[5] صحيح البخاري مع فتح الباري (١/ ٢٦٧) یہ صحیح اثر امام ابن سیرین رحمہ اللہ کے بارے میں تاریخ امام بخاری میں موصولاً مہدی بن میمون کے حوالے سے اور مصنف ابن ابی شیبہ میں بھی موصولاً ہی مروی ہے، لیکن خالد کے حوالے سے مروی ہے۔ فتح الباري شرح صحيح البخاري (١/ ٢٦٧)

’’امام ابن سیرین رحمہ اللہ وضو کرتے وقت اپنی انگوٹھی کی جگہ کو دھویا کرتے تھے۔‘‘

تاریخِ امام بخاری میں یہی اثر موصولاً بھی مروی ہے اور مصنف ابن ابی شیبہ میں موصولاً یوں مروی ہے:

«إِنَّهُ كَانَ إِذَا تَوَضَّأَ حَرَّكَ خَاتَمَهُ»[1]

’’حضرت ابن سیرین رحمہ اللہ جب وضو کرتے تو اپنی انگوٹھی کو حرکت دیتے (ہلاتے) تھے۔‘‘

تاریخِ امام بخاری اور مصنف ابن ابی شیبہ والی دونوں سندوں کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے۔[2]

مرفوع مگر ضعیف حدیث سے قطع نظر اس اثر ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وضو کرتے وقت انگوٹھی، کنگن، یا چوڑیوں کو پھیر کر ان کے نیچے کی جگہ کو اچھی طرح تر کر لینا چاہیے، تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے نیچے کی جگہ خشک رہ جائے اور اگر کوئی ناخن برابر جگہ بھی اعضائے وضو سے خشک رہ جائے تو وضو نہیں ہوتا اور اگر وضو ہی نہ ہوا تو نماز کیا ہوگی؟ یہی وجہ ہے کہ احتیاطاً مذکورہ چیزوں کو دورانِ وضو ضرور ہلا لینا چاہیے۔

کچھ یہی صورت ناک کی تیلی یا کوکے یا نتھ کی بھی ہے کہ ان کو بھی حرکت دے کر ان کے نیچے تک پانی پہنچانا ضروری ہوگا، لیکن اگر معمولی حرکت دینے سے پانی کے ان کے نیچے تک پہنچ جانے کی غالب توقّع ہو تو پھر انھیں نکالنے کی ضرورت ہے نہ اس سوراخ میں تنکے سے پانی داخل کرنے کی ضرورت ہے۔ فتاوٰی عالمگیری کی جلد اوّل کے ابتدائی صفحات (۷) ہی میں یہ بات مذکور ہے، جو ’’البحر الرائق‘‘ سے منقول ہے۔ البتہ وہاں انگوٹھی کے ساتھ کان کی بالی کو حرکت دینے کا ذکر ہے۔ ناک میں ڈالی جانے والی نتھ یا تیلی وغیرہ کا نہیں، حالانکہ یہ چاہیے تھا، کیوں کہ ناک دھونے کی جگہ ہے نہ کہ کان۔ کان پر تو صرف مسح ہی کافی ہے۔[3]

---

[1] فتح الباري (۱/۲٦۷)

[2] حوالہ سابقہ

[3] (فتاویٰ عالمگیری: ۱/۷ فرائضِ وضو بحوالہ جدید فقہی مسائل، ص: ۲۰/ ۲۱ از مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، طبع حیدر آباد۔ انڈیا)

ناخن پالش کا حکم:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ناخن پالش کا حکم بھی ذکر کردیا جائے، کیوں کہ عورتیں عموماً نیل پالش استعمال کرتی ہیں، جو ان کے لیے جائز بھی ہے کہ وہ استعمال کرسکتی ہیں، مگر اس کے لیے صرف اتنی احتیاط ضروری ہے کہ اگر اس کے لگائے ہوئے ہی کسی نماز کا وقت ہو جائے تو ریمُوور سے اسے اتار کر وضو کریں اور نماز ادا کریں، اسی طرح غسلِ حیض و نفاس یا غسلِ جنابت واجب ہو تو بھی پہلے اسے اتار لیں اور پھر غسل کریں۔ وضو اور غسلِ واجب کے وقت یہ احتیاط کیوں ضروری ہے اور اسے اتارنا کیوں لازمی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ناخن جسم کے ان حصوں میں سے ہے، جسے غسلِ واجب یا وضو کرتے وقت دھونا ضروری ہے اور پھر اعضاے وضو پر کسی حقیقی ضرورت اور مجبوری کے بغیر کوئی ایسی چیز لگا لینا، جو پانی کو جسم تک پہنچنے سے روکے رکھے، ایسی چیز کی موجودگی میں وضو درست نہیں ہوگا، بلکہ وضو صرف اسی وقت ہو سکے گا، جب اس چیز کو کھرچ دیا جائے۔ نیل پالش یا کوئی بھی ایسا پینٹ جو خواتین لگایا کرتی ہیں، یہ حقیقی ضرورت کے حکم میں نہیں آتے، بلکہ محض زینت شمار ہوتے ہیں۔ اس لیے وضو کرتے وقت ضروری ہوگا کہ ان کو کُھرچ دیا جائے، تاکہ ناخنوں کی تہہ تک پانی پہنچ سکے۔ اس سلسلے میں فتاوٰی عالمگیری کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں:

"أَوْ لَزِقَ بِأَصْلِ ظُفُرِهِ طِينٌ يَابِسٌ أَوْ رَطْبٌ لَمْ يَجُزْ"[1]

"اگر اصل ناخن سے خشک یا گیلی مٹی چمٹی ہوئی ہو اور اس کے اوپر سے پانی گزار دیا جائے تو یہ کافی ہوگا نہ وضو صحیح ہوگا۔"

برصغیر کے اہلِ حدیث علماے کرام میں سے ایک معروف عالم حافظ عبداللہ محدّث روپڑی رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ کیا عورت ناخن پر ناخن پالش لگا کر وضو کر کے نماز پڑھ سکتی ہے؟ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ناخن پالش لگا کر وضو کرے تو وضو نہیں ہوتا؟ اس سوال کا جواب موصوف نے اپنے ہفت روزہ اخبار "تنظیم اہلِ حدیث" (جلد: ۱۷ شمارہ: ۳۳) میں شائع کیا، جو لفظ بہ لفظ یہ ہے:

"ناخن پالش منہدی کی قِسم سے ہے۔ منہدی کا رنگ بھی دو تین دفعہ لگانے سے گاڑھا

---

[1] بحوالہ جدید فقہی مسائل (ص: ۱۹)

اور موٹا ہو جاتا ہے، جو بالاتفاق جائز ہے۔ ایسا ہی ناخن پالش کو سمجھ لیا جائے۔''[1]

مولانا علی محمد سعیدی رحمہ اللہ نے اس جواب کو فتاویٰ علماے حدیث میں نقل کیا تو اپنی طرف سے اس پر کوئی توضیحی نوٹ نہیں لکھا، جیسا کہ متعدد مقامات پر انھوں نے کیا ہے، جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ موصوف بھی اس جواب پر متفق ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اس جواب سے اتفاق نہیں،[2] کیوں کہ موصوف کو علمی مقام و مرتبے کے باوجود معصوم عن الخطا تو نہیں کہا جا سکتا۔

نہ ان کا اپنا دعواے عصمت تھا۔ اس لیے امام مالک رحمہ اللہ کا وہ قول انتہائی اہم ہے، جو وہ مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں درس کے دوران میں کہا کرتے تھے:

''كُلٌّ يُؤْخَذُ وَيُرَدُّ عَلَيْهِ إِلَّا صَاحِبُ هٰذَا الْقَبْرِ''[3]

''ہر کسی کی کوئی بات مانی اور کوئی رد کی جا سکتی ہے، سوائے اس قبر والے کی بات کے۔''

یہ کہتے ہوئے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبرِ اقدس کی طرف اشارہ کیا کرتے تھے۔ غرض نیل پالش کو منہدی پر قیاس کرنے والی رائے مستقیم نہیں اور اس کی کئی وجوہات ہیں۔ مثلاً یہ کہ منہدی کو چاہے کتنی دفعہ استعمال کریں، اس کا رنگ تو گاڑھا ہوتا جائے گا، جسے موٹا بھی کہا جا سکتا ہے، مگر اس کی کوئی جسامت نہیں ہوگی۔ یعنی ہتھیلی یا ناخن پر اس کی تہہ نہیں جمے گی اور ریموور سے اسے زائل کرنا ممکن نہیں ہوگا، جب کہ نیل پالش کی باقاعدہ تہہ جم جاتی ہے، جسے ریموور کے ساتھ آسانی سے یا کسی بھی دوسری چیز کے ساتھ کھرچ کر زائل کیا جا سکتا ہے۔ منہدی اور پالش کے اس واضح فرق کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ پالش پانی کے ناخن تک پہنچنے میں حائل ہو جاتی ہے، مگر منہدی حائل نہیں ہوتی۔

لہٰذا پالش کو منہدی پر قیاس کرنا درست نہ ہوا اور پالش اتارے بغیر وضو درست نہ ہوا، یہی وجہ ہے کہ عورتوں کے لیے نیل پالش کے استعمال کے جواز کے باوجود یہ احتیاط ضروری ہے کہ اسے بہ وقتِ وضو زائل کر لیا جائے، ورنہ وضو صحیح نہیں ہوگا۔

---

[1] فتاویٰ علماے حدیث مولانا علی محمد سعیدی، خانیوال (۱/ ۶۹)

[2] ممکن ہے کہ اس وقت نیل پالش اتنی گاڑھی نہ ہوتی ہو، جس کی تہہ جم جاتی ہو، جیسا کہ آج کل ہوتا ہے۔ بلکہ پانی کی طرح پتلی ہوتی ہو، جس کی بنا پر حافظ محدّث روپڑی رحمہ اللہ نے جواز کا فتویٰ دیا ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آج حافظ صاحب زندہ ہوتے تو اس کے عدمِ جواز ہی کا فتویٰ دیتے۔

[3] الاعتصام للشاطبي و صفة الصلاة للألباني (ص: ٤٩) طبع مكتبة المعارف، الرياض.

عمامہ یا پگڑی پر مسح کرنا:

سر کے مسح کے مسائل میں سے یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ اگر کسی نے سر پر پگڑی یا عمامہ باندھ رکھا ہو، تو اس وقت مسح کی کیفیت کیا ہوگی؟ اس سلسلے میں صحیح مسلم میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ تَوَضَّأَ فَمَسَحَ بِنَاصِيَتِهِ وَعَلَى الْعَمَامَةِ وَالْخُفَّيْنِ" [1]

''نبیِ اکرم ﷺ نے وضو کیا تو آپ نے اپنی پیشانی اور دستار مبارک اور موزوں پر مسح کیا۔''

امام شافعی نے امام عطا سے ایک مرسل روایت بیان کی ہے، جس میں امام عطا فرماتے ہیں:

"أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ تَوَضَّأَ فَحَسَرَ الْعَمَامَةَ عَنْ رَأْسِهِ، وَمَسَحَ مُقَدَّمَ رَأْسِهِ" [2]

''نبی کریم ﷺ نے وضو فرمایا تو آپ ﷺ نے اپنے عمامے کو سرِ اقدس سے اتارا اور اپنے سر کے اگلے حصے پر مسح کیا۔''

اس کی تائید سنن ابی داود میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے موصولاً مروی حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

"رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَتَوَضَّأُ، وَعَلَيْهِ عَمَامَةٌ قَطَرِيَّةٌ، فَأَدْخَلَ يَدَيْهِ تَحْتَ الْعِمَامَةِ فَمَسَحَ مُقَدَّمَ رَأْسِهِ وَلَمْ يَنْقُضِ الْعَمَامَةَ" [3]

''میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ قطری عمامہ باندھے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک عمامہ کے نیچے داخل کیے اور سر کے اگلے حصے کا مسح کیا اور پورا عمامہ نہیں اتارا۔''

اگرچہ اس کی سَند میں ایک راوی ابو معقل غیر معروف ہے، لیکن حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کے قول کے مطابق مرسل و موصول ان دونوں احادیث کا مجموعی مفاد ایک دوسرے سے مل کر قوت اختیار کر جاتا ہے، جبکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے صحیح سند کے ساتھ ثابت ہے کہ انھوں نے سر کے

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٧٣، ١٧٤) بلوغ المرام مع السبل (١/ ١/ ٥١، طبع بيروت)

[2] فتح الباري (١/ ٢٩٣ طبع دار الإفتاء. الرياض)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٤٧) المنتقى مع النيل (١/ ١/ ١٥٧ طبع بيروت)

کچھ حصے کا مسح کیا، جیسا کہ امام ابن المنذر رحمہ اللہ نے کہا ہے اور علامہ ابن حزم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے بھی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے اس فعل سے اختلاف نہیں کیا۔ یہ سب امور بھی سابق الذکر مرسل روایت کو تقویت دیتے ہیں۔[1]

اس طرح معلوم ہوا کہ سر پر پگڑی ہو تو اسے پُورا اُتارنے کی ضرورت نہیں، بلکہ اسے تھوڑا سا اٹھا کر اس طرح مسح کر لیں کہ پیشانی اور سر کے کچھ حصے پر مسح ہو جائے اور پھر پگڑی کے اوپر سے گُدی تک سر کے مسح کو مکمل کر لیں۔

علامہ ابنِ قیّم رحمہ اللہ ''زاد المعاد'' میں فرماتے ہیں:

''نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سر کے مسح کی تین صورتیں تھیں۔ کبھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پورے سر کا مسح فرماتے تھے۔ کبھی دستار مبارک کے اوپر سے مسح کر لیتے تھے اور کبھی پیشانی کے بالوں اور دستار دونوں پر مسح کیا کرتے تھے۔''

علامہ موصوف کی تحقیق یہ ہے کہ کسی صحیح حدیث سے یہ ہرگز ثابت نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر کے صرف کچھ حصے پر مسح کیا ہو، بلکہ اگر سر کے کچھ حصے پر مسح کرتے تو بقیہ عمامے پر پورا کر لیتے تھے، جیسا کہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیثِ مسلم میں ہے اور امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ انھوں نے یہ حدیث ساٹھ (۶۰) رواۃ سے بیان کی ہے۔ امیر صنعانی رحمہ اللہ کے بقول سر کے کچھ حصے کو شامل کیے بغیر صرف پگڑی کے اُوپر کفایت کرنے کو جمہور اہلِ علم درست قرار نہیں دیتے۔[2]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی تحقیق اپنی جگہ، لیکن صحیح بخاری، سنن ابنِ ماجہ اور مسندِ احمد میں حضرت عَمرو بن اُمیّہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

''رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یَمْسَحُ عَلٰی عَمَامَتِہٖ وَخُفَّیْہِ''[3]

''میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عمامے (دستارِ مبارک) اور موزوں پر مسح کرتے تھے۔''

---

[1] فتح الباري (١/ ٢٩٣) نیز دیکھیں: نیل الأوطار إمام شوكاني (١/ ١/ ١٥٧۔ ١٥٨) سبل السلام علامه صنعاني (١/ ١/ ٥١) طبع بیروت.

[2] زاد المعاد و تحقیقه (١/ ١٩٤ طبع قطر) سبل السلام (١/ ١/ ٥١۔ ٥٢)

[3] صحیح البخاري مع الفتح (١/ ٣٠٨۔ ٣٠٩) سنن ابن ماجه (٥٦٢) فقه السنة سید سابق (١/ ٤٣)

ایسے ہی صحیح بخاری و مسلم اور بعض دیگر کتب میں بھی بعض احادیث موجود ہیں۔ اکثر اہلِ علم کا عمل بھی یہی رہا ہے اور وہ صرف پگڑی پر مسح کر لینے پر ہی اکتفا کیا کرتے تھے۔[1]

اس سے تو بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ صرف سر کے مسح پر کفایت کرنا بھی جائز ہے۔ امام اوزاعی، ایک روایت میں ثوری، احمد، ابوثور، طبری، ابن خزیمہ اور ابن المنذر کا یہی مسلک ہے۔ امام ابن المنذر کا کہنا ہے کہ حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما سے بھی یہ ثابت ہے اور صحیح حدیث میں یہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«إِنْ يُّطِعِ النَّاسُ أَبَا بَكْرٍ وَعُمَرَ يَرْشُدُوْا»[2]

''اگر لوگ ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کی اطاعت کریں گے تو رشد و ہدایت پا جائیں گے۔''

صحیح بخاری کی مذکورہ حدیث میں عمامہ کے لفظ کو شاذ قرار دینے اور کئی دیگر تعلیلیں ذکر کرنے کے بعد حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے انھیں لا یعنی قرار دیا ہے اور لفظِ عمامہ کو ثقہ راوی کا اضافہ اور قابلِ قبول کہا ہے، پھر صرف عمامہ پر مسح پر اکتفا کرنے کو جائز کہنے کی رائے کی طرف اپنا میلان ظاہر کیا ہے۔ البتہ اس میں شرط یہ ہے کہ عمامہ اتارنے میں مشقت ہو تو اس پر کفایت کی جا سکتی ہے۔[3]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کی تحقیق ایک مسلک کی تائید ہے اور جمہور کا مسلک بھی وہی ہے، البتہ حافظ عسقلانی رحمہ اللہ اور کثیر علما نے صرف عمامہ پر اکتفا کو بھی جائز قرار دیا ہے اور مذکورہ بالا حدیثِ بخاری ان کی موید ہے۔

ٹوپی کا حکم:

یہ حکم تو عمامہ اور پگڑی کے بارے میں ہے، جس کا دَورانِ وُضو مکمل طور پر اتارنا حرج کا باعث ہو سکتا ہے۔ اب رہا معاملہ ٹوپی کا، جیسے قراقلی اور رام پوری ٹوپیاں یا جناح کیپ وغیرہ ہیں، ظاہر ہے کہ انہیں اتارنا مشکل نہیں ہوتا، لہٰذا انھیں اتار کر پورے سر ہی کا مسح کرنا چاہیے۔ امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک ٹوپی پر مسح جائز ہی نہیں ہے۔ امام ابن المنذر کا کہنا ہے کہ ٹوپی پر مسح کرنے کا کوئی قول نہیں سوائے اس کے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ٹوپی پر مسح کیا۔

---

[1] فقه السنة (١/ ٤٣ طبع بيروت)

[2] فتح الباري (١/ ٣٠٩)

[3] فتح الباري (١/ ٣٠٨۔ ٣٠٩)

سنن اثرم کے حوالے سے امام ابنِ قدامہ نے "المغني" میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ اگر کوئی چاہے تو سر ننگا کر کے مسح کر لے اور اگر چاہے تو پگڑی یا ٹوپی پر مسح کر لے۔[1]

غرض کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تو ٹوپی پر مسح کے بارے میں کوئی قولی یا عملی حدیث ثابت نہیں، البتہ مطلقاً ٹوپی کا استعمال ثابت ہے، جیسے سترے کے باب میں مذکور ایک متکلم فیہ حدیث کے الفاظ «رُبَّمَا نَزَعَ قَلَنْسُوَتَهٗ» سے پتا چلتا ہے۔ حضرت انس اور عمر رضی اللہ عنہما کے قول و عمل سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص پگڑی کی طرح ہی ٹوپی کو بھی اٹھا کر سر کے کچھ حصے پر مسح کر کے بقیہ ٹوپی پر کر لے تو مسح ہو جائے گا۔ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے بھی یہی مسلک اختیار کیا ہے۔[2]

عورتوں کے دوپٹے کا حکم:

خواتین کی چادر ہو یا دوپٹا، وہ انھوں نے سر پر باندھا ہوا تو ہوتا نہیں، لہٰذا اس کا اتارنا آسان ہوتا ہے، انھیں اسے اُتار کر سر ہی پر مسح کرنا چاہیے۔ البتہ بعض خواتین کا جو یہ خیال ہے کہ وضو کرتے وقت سر کے بال ننگے نہیں ہونے چاہییں، ان کا یہ خیال درست نہیں، کیوں کہ سر کے بالوں کے ننگے ہوتے ہوئے وضو کرنا تو کجا غسل سے قبل سارے جسم کے ننگے ہوتے ہوئے کیا ہوا وضو بھی صحیح ہوتا ہے اور دورانِ غسل اگر کوئی دوسرا ناقضِ وضو فعل سرزد نہ ہو تو اسی وضو سے نماز ادا کی جا سکتی ہے۔ از سرِ نو وضو کرنا ضروری نہیں ہوتا، جیسا کہ سننِ اربعہ اور مستدرکِ حاکم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ارشاد فرماتی ہیں:

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يَتَوَضَّأُ بَعْدَ الْغُسْلِ»[3]

"نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم غسل کے بعد وضو نہیں کیا کرتے تھے۔"

گھر کے اندر یا صرف عورتوں کی موجودگی میں بالوں کا ننگا کر لینا جائز ہے اور غیر محرم مردوں کی موجودگی میں سر ننگا کر لینا منع ہے، تو ان کی موجودگی میں ظاہر ہے کہ وضو کا انداز بھی پردے کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہی اختیار کرنا ہوگا، لہٰذا دونوں صورتوں کا فرق واضح ہے۔

---

[1] المغني (١/ ٣٠٤_ ٣٠٥)

[2] المحلى لابن حزم (١/ ٢/ ٥٨) المغني (١/ ٣٠٤_ ٣٠٥)

[3] صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٢٤٦) صحيح سنن أبي داد، رقم الحديث (٢٢٥) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٣) سنن ابن ماجه (٥٧٩) المستدرك (١/ ١٥٣) صححه الترمذي و الحاكم و الذهبي والألباني كما في تحقيق المشكاة (١/ ١٣٩) و صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٨٤٣)

کانوں کا مسح کرنے کے لیے نیا پانی لینا

اب رہا معاملہ کانوں کے مسح کے لیے پانی کا تو اس سلسلے میں سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ اور مسندِ احمد میں ایک حدیث مروی ہے، جس کے موقوف یا مرفوع ہونے میں قدرے اختلاف ہے۔ البتہ اکثر اہلِ علم کا قول یہ ہے کہ یہ مرفوعاً نبیِ اکرم ﷺ سے مروی ہے، جس میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

«اَلْأُذُنَانِ مِنَ الرَّأْسِ» [1] ''کان سر ہی کا حصہ ہیں۔''

یعنی ان کا بھی سر کی طرح ہی مسح کیا جائے گا نہ کہ انھیں منہ کی طرح دھویا جائے گا۔ کانوں کے سر کا حصہ ہونے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سر کے مسح والے بچے ہوئے پانی سے کانوں کا مسح بھی کیا جاسکتا ہے۔ نیا پانی لینے کی ضرورت نہیں، جب کہ سنن بیہقی اور مستدرکِ حاکم کی ایک روایت حضرت عبداللہ بن زائد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

«إِنَّهٗ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ يَأْخُذُ لِأُذُنَيْهِ مَاءًا غَيْرَ الَّذِيْ اَخَذَهٗ لِرَأْسِهٖ» [2]

''انھوں نے دیکھا کہ نبیِ اکرم ﷺ کانوں کے مسح کے لیے سر کے مسح والے پانی کے علاوہ نیا پانی لیتے تھے۔''

امام مالک، احمد، شافعی اور ابو ثور رحمہم اللہ کے نزدیک اس حدیث کی بنا پر کانوں کے مسح کے لیے نیا پانی لینا چاہیے۔ یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے۔ [3] تو گویا ان دونوں طریقوں کے دلائل ہی موجود ہیں۔ سر کے مسح سے بچی ہوئی تری سے مسح کرنے اور نیا پانی لینے پر دلالت کرنے والی مستدرک حاکم کی روایت کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بظاہر صحیح کہا ہے اور بیہقی والی روایت کو امام بیہقی نے صحیح قرار دیا ہے۔ [4]

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٢٢) المشكاة مع المرعاة (١/ ٤٧٩۔ ٤٨٠)

[2] بلوغ المرام مع سبل السلام (١/ ١/ ٤٩) و نيل الأوطار (١/ ١/ ١٦١)

[3] حواله جات سابقه.

[4] نيل الأوطار (١/ ١/ ١٦١)

لہٰذا جائز تو دونوں صورتیں ہی ہوئیں۔ اب بات رہ جاتی ہے صرف ترجیح کی کہ ان دونوں صورتوں میں سے راجح صورت کون سی ہے؟ اس سلسلے میں مولانا ابوسعید شرف الدین دہلوی رحمہ اللہ نے کانوں کے لیے نیا پانی لینے کے راجح ہونے کا میلان ظاہر کیا ہے۔[1]

موطا امام مالک رحمہ اللہ میں حضرت نافع رحمہ اللہ، حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں بیان فرماتے ہیں:

"إِنَّهٗ كَانَ (إِذَا تَوَضَّأَ) يَأْخُذُ الْمَآءَ بِإِصْبَعَيْهِ لِأُذُنَيْهِ"[2]

''جب وہ وضو فرماتے تو کانوں کا مسح کرنے کے لیے اپنی (شہادت کی) دونوں انگلیوں کے ساتھ پانی لیتے تھے۔''

علامہ ابن قیم کی تحقیق کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کانوں کے لیے نیا پانی لینا تو ثابت نہیں، البتہ یہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ثابت ہے۔[3]

گردن کا مسح:

مسائلِ وضو کے ضمن میں سر اور کانوں کے مسح کا ذکر ہو چکا ہے۔ بعض لوگ ان کے ساتھ ہی اپنے الٹے ہاتھوں سے گردن کا مسح بھی کرتے ہیں، مگر یہ فعل کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ اسے جائز ثابت کرنے کے لیے بعض روایتوں کا سہارا لیا جاتا ہے، جب کہ وہ ضعیف ہونے کی وجہ سے قابلِ استدلال نہیں۔ ان میں سے ایک مسند احمد میں مروی ہے، جسے طلحہ بن مصرف اپنے باپ اور دادا کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

« إِنَّهٗ رَأَى رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَمْسَحُ رَأْسَهٗ حَتّٰى بَلَغَ الْقَذَالَ، وَمَا يَلِيْهِ مِنْ مُقَدَّمِ الْعُنُقِ »[4]

''انھوں نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سر کا مسح کرتے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گدی اور گردن کے

---

[1] فتاویٰ علماے حدیث (۱/۱۰۳)

[2] الموطأ مع تنوير الحوالك للسيوطي (١/ ١/ ٥٦) طبع بيروت.

[3] نيل الأوطار (١/ ١/ ١٦٢) زاد المعاد (١/ ١٩٤۔ ١٩٥)

[4] المنتقىٰ مع النيل (١/ ١/ ١٦٣)

پہلے حصے کا بھی مسح کیا۔‘‘

امامِ مجتہد قاضی شوکانی رحمہ اللہ اس روایت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس کی سند میں ایک راوی لیث ابن ابی سلیم ہے، جو ضعیف ہے، پھر انھوں نے کبار محدّثین مثلاً: امام ابن حبان، یحییٰ بن قطان، ابن مہدی، ابن معین اور احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے اس راوی کے بارے میں اقوالِ جرح نقل کیے ہیں اور تہذیب الاسماء نووی کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ اس راوی کے ضعیف ہونے پر تمام علما کا اتفاق ہے، نیز اس روایت میں جو طلحہ کے دادا ہیں، ان کا صحابی ہونا ہی مختلف فیہ ہے، بلکہ ان کے اہلِ خاندان ان کے صحابی نہ ہونے کے قائل ہیں اور طلحہ کے والد بھی غیر معروف ہیں۔ غرض کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔[1]

اگر اس روایت کو صحیح بھی مان لیا جائے، تب بھی گردن کے مسح کا ثبوت اس روایت سے نہیں ملتا، بلکہ زیادہ سے زیادہ صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب سر کا مسح کرتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اتنا پیچھے لے جاتے کہ گدی اور گردن تک ہاتھ پہنچ جاتے۔ اس روایت میں الٹے ہاتھوں اور نئے سرے سے مسح کرنے کا تو ذکر ہی نہیں۔ اس سلسلے میں ایک دوسری حدیث بھی مروی ہے، جس سے گردن کے مسح کی دلیل لی جاسکتی ہے۔ وہ روایت سنن ابو داود میں اسی سند سے مذکور ہے، جس کا ابھی ہم نے ذکر کیا ہے۔ اس حدیث میں ہے:

«وَمَسَحَ رَأْسَهُ مِنْ مُقَدَّمِهِ إِلٰى مُؤَخَّرِهِ حَتَّىٰ أَخْرَجَ يَدَيْهِ مِنْ تَحْتِ أُذُنَيْهِ»[2]

’’آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سر کا مسح کیا، اس کے شروع سے لے کر اس کے آخری حصے تک، حتیٰ کہ اپنے ہاتھوں کو کانوں کے نیچے سے نکالا۔‘‘

اس کی سند پر بھی وہی جرح ہے، جو پہلی روایت پر گزری ہے۔ لہٰذا اس میں بھی جب تین وجوہات یعنی ① لیث ابن ابی سلیم کا ضعف۔ ② ابو طلحہ کے والد مصرف کی جہالت۔ ③ مصرف کے والد کی صحابیت میں اختلاف یکجا ہیں، تو اس روایت کے امام نووی، ابن تیمیہ اور حافظ ابن حجر کے بقول ضعیف اور نا قابلِ استدلال ہونے میں بھی کوئی شک نہ رہا۔[3]

---

[1] نيل الأوطار (١/ ١/ ١٦٣)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٣٢) الضعيفة للألباني (١/ ٩٩)

[3] نيل الأوطار (١/ ١/ ١٦٣) و السلسلة الضعيفة (١/ ٩٩)

اسی موضوع کی ایک تیسری حدیث بھی ہے، جس میں مروی ہے:

«مَسْحُ الرَّقَبَةِ أَمَانٌ مِنَ الْغُلِّ»[1]

''گردن کا مسح کرنا قیامت کے دن گلے میں طوق پہنائے جانے سے امان کا سبب ہے۔''

اس روایت کے بارے میں ''المجموع شرح المهذب'' میں امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں ''کہ یہ حدیث من گھڑت ہے، نبیِ کریم ﷺ کا کلام نہیں ہے۔''

امام سیوطی نے من گھڑت حدیثوں کا جو مجموعہ تیار کیا ہے، اس کے ذیل میں یہ حدیث اور امام نووی رحمہ اللہ کا من گھڑت کہنا نقل کیا ہے اور اسے برقرار رکھا ہے۔ ''تخريج أحاديث إحياء علوم الدين'' (۱/ ۱۱۹) میں علامہ عراقی نے بھی اسے ضعیف کہا ہے۔ ''تلخيص الحبير'' میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام الحرمین ابو محمد جوینی کے حوالے سے لکھا ہے کہ ائمہ حدیث اس روایت کی سند کو پسند نہیں کرتے اور علامہ ابن صلاح نے کہا ہے:

''یہ نبیِ کریم ﷺ کا کلام نہیں، بلکہ سلف میں سے کسی شخص کا کلام ہے۔''[2]

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ گردن کا مسح کرنا سنت نہیں، بلکہ بدعت ہے۔[3]

اسی موضوع کی ایک اور روایت حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''تلخيص الحبير'' میں تاریخِ اصفہان ابو نعیم کے حوالہ سے ذکر کی ہے، جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ مرفوعاً بیان کرتے ہیں:

«مَنْ تَوَضَّأَ وَمَسَحَ عُنُقَهُ، لَمْ يُغَلَّ بِالْأَغْلَالِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»[4]

''جس شخص نے وضو کیا اور اپنی گردن کا مسح بھی کیا، اسے قیامت کے دن طوق نہیں پہنایا جائے گا۔''

''البحر للروماني'' کے حوالے سے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت بیان کی گئی ہے، جس میں مروی ہے:

---

[1] السلسلة الضعيفة (۱/ ۹۷)

[2] مصدر سابق.

[3] نيل الأوطار (۱/ ۱/ ۱۶۳)

[4] سلسلة الأحاديث الضعيفة للألباني (۱/ ۹۸)

«مَنْ تَوَضَّأَ وَمَسَح بِيَدَيْهِ عُنُقَهُ، وُقِيَ الغُلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»[1]

''جس شخص نے وضو کیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن کا مسح کیا تو وہ قیامت کے دن طوق سے بچ جائے گا۔''

ابن عمر رضی اللہ عنہما والی اس روایت کو ملا علی قاری نے موضوعات میں مسند الفردوس دیلمی کی طرف منسوب کرتے ہوئے ضعیف قرار دیا ہے۔[2] غرض کہ اس موضوع کی یہ پانچ روایتیں ہیں اور پانچوں ہی من گھڑت یا ضعیف ہیں۔ چنانچہ علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ''زاد المعاد'' میں سچ ہی کہا ہے:

''وَلَمْ يَصِحَّ عَنْهُ (ﷺ) فِي مَسْحِ الْعُنُقِ حَدِيثٌ الْبَتَّةَ''[3]

''نبیِ کریم ﷺ سے گردن کے مسح کے بارے میں کوئی بھی صحیح حدیث نہیں ملتی۔''

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ کے استاد اور معروف مجدد و مصلح شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے گردن کے مسح کے بارے میں سوال کیا گیا تو انھوں نے جو فتویٰ دیا، وہ ان کے مجموع الفتاویٰ (۲۱/ ۱۲۷۔ ۱۲۸) میں مذکور ہے، جس میں موصوف فرماتے ہیں:

''نبی ﷺ سے کوئی صحیح حدیث نہیں ملتی کہ آپ ﷺ نے دورانِ وضو گردن کا مسح کیا ہو اور نہ کسی صحیح حدیث (روایت) میں یہ بات مذکور ہے، بلکہ آپ ﷺ کے مسنون وضو کا طریقہ بتانے والی صحیح حدیث سے تو پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ گردن کا مسح نہیں کیا کرتے تھے۔ لہٰذا جمہور علما و ائمہ جیسے امام مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ اسے مستحب قرار نہیں دیتے اور جو کوئی گردن کے مسح کو مستحب قرار دیتا ہے، اس کا اعتماد اسی اثر یا روایت پر ہے، جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، یا اس ضعیف روایت پر ہے، جس میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے سر کا مسح کیا، یہاں تک کہ ہاتھ گدی تک پہنچ گئے۔ ایسی ضعیف روایات قابلِ استدلال و حجت نہیں ہوتیں اور نہ ایسی روایات صحیح احادیث کے مدلول کی معارض و مخالف ہوسکتی ہیں۔ لہٰذا جو شخص گردن کا مسح نہ کرے، اس کا وضو علما کے اتفاق کے ساتھ صحیح ہے۔''

---

[1] سلسلة الأحاديث الضعيفة للألباني (۱/ ۹۸)

[2] حوالہ جات سابقہ.

[3] زاد المعاد (۱/ ۹۵) نیز ''فتح القدير لابن همام'' اور ''عون المعبود'' کا مراجعہ فرمائیں۔

امام شوکانی رحمہ اللہ نے مذکورہ روایات کے علاوہ بھی بعض روایات نقل کی ہیں اور بعض اہلِ علم کا گردن کے مسح کو مستحب کہنے کا قول نقل کیا ہے۔[1] جب کہ وہ قول جمہور ائمہ کے خلاف ہے۔

ان تمام تصریحات سے معلوم ہوا کہ گردن کے مروجہ مسح کی بات بلا دلیل و بلا ثبوت ہے اور جس قدر مسح کا پتا چلتا ہے، وہ سر کے مسح میں داخل اور اسی کا تتمہ ہے۔ الٹے ہاتھوں سے گردن کا مسح صحیح تو کیا کسی ضعیف حدیث میں بھی مذکور نہیں ہے، لہٰذا سے ترک کرنا ہی اولیٰ ہے۔

10 ٹخنوں سمیت پاؤں دھونا:

سر اور کانوں کے مسح کے بعد پہلے دایاں اور پھر بایاں پاؤں ٹخنوں تک دھویا جاتا ہے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ کے وضو کا مسنون طریقہ بتانے والی صحیح احادیث گزری ہیں، نیز ہاتھوں کی انگلیوں کے خلال کے ساتھ ہی یہ بھی ذکر ہوا تھا کہ پاؤں کی انگلیوں کا خلال کرنا بھی مستحب ہے اور اس سلسلے کی تین احادیث حضرت ابن صبرہ، ابن عباس اور مستور بن شداد رضی اللہ عنہم سے ذکر کی گئی تھیں، لہٰذا اب انھیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

ایڑیاں دھونے پر توجہ دینا:

یہاں ایک اور بات بھی بطورِ خاص ذہن نشین کر لیں کہ بعض لوگ پاؤں کو دھوتے وقت جلد بازی اور بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس طرح اٹھ جاتے ہیں کہ ان کے پاؤں کی ایڑیوں کے سوکھے رہ جانے کا امکان ہوتا ہے۔ پوری ایڑیاں نہیں تو کہیں کہیں کوئی جگہ خشک رہ جائے، چاہے وہ ناخن برابر ہی کیوں نہ ہو تو اس طرح وضو نہیں ہوتا، بلکہ ایسے لوگوں کو نبیِ اکرم ﷺ نے سخت وعید سنائی ہے، جو متعدد صحیح احادیث میں مذکور ہے۔ مثلاً صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ (مکہ سے مدینہ تک) ایک سفر میں نبیِ اکرم ﷺ ہم سے پیچھے رہ گئے اور پھر آپ ﷺ نے ہمیں آلیا، جب کہ عصر کا وقت نکل رہا تھا۔ لہٰذا ہم نے وضو کرنا اور پاؤں پر مسح کرنا شروع کیا تو یہ دیکھ کہ نبیِ اکرم ﷺ نے بلند آواز سے پکار کر دو تین مرتبہ فرمایا:

«وَيْلٌ لِّلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ»[2]

---

1. نیل الأوطار (١/ ١/ ١٦٤)
2. صحیح البخاري مع الفتح، رقم الحدیث (٦٠) صحیح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٢٨) صحیح ←

’’خشک رہ جانے والی ایڑیوں کے لیے جہنم کی آگ کا عذاب ہے۔‘‘

صحیح بخاری و مسلم اور سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث تو اور بھی واضح تر ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَأَىٰ رَجُلًا لَمْ يَغْسِلْ عَقِبَهُ، فَقَالَ: وَيْلٌ لِّلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ»[1]

’’نبیِ کریم ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا، جس نے اپنی ایڑی نہیں دھوئی تھی تو آپ ﷺ نے اس وقت فرمایا: ایسی ایڑیوں کے لیے آگ کا عذاب ہے۔‘‘

ایک تیسری حدیث سنن ابن ماجہ اور مسندِ احمد میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«رَأَىٰ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ قَوْمًا تَوَضَّؤُوا، وَلَمْ يَمَسَّ أَعْقَابَهُمُ الْمَاءُ فَقَالِ: وَيْلٌ لِّلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ»[2]

’’نبیِ اکرم ﷺ نے بعض لوگوں کو دیکھا کہ ان کی ایڑیوں کو پانی نہیں پہنچا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ایسی ایڑیوں کے لیے نارِ جہنم کا عذاب ہے۔‘‘

اس موضوع کی کئی اور احادیث بھی ہیں، مگر ان سے قطع نظر صرف ان مذکورہ تین احادیث ہی کو سامنے رکھا جائے، جن میں صحیح بخاری و مسلم کی احادیث بھی ہیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایڑیوں سمیت دونوں پاؤں کو دھونا ہی فرض ہے نہ کہ ان پر مسح کرنا۔ اس طرح سورۃ المائدہ (آیت: ٦) میں جہاں وضو کا ذکر ہے اور اس آیت: ﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ﴾ کے بعد ہے: ﴿وَ اَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ﴾ جس کا معنیٰ ﴿اَرْجُلَكُمْ﴾ کی لام پر زبر ہونے کی شکل میں یہ بنتا ہے کہ ’’اپنے پیروں کو ٹخنوں تک دھوؤ۔‘‘

جمہور علمائے تفسیر کے نزدیک قراءت یہی ہے، جب کہ بعض نے منہ اور ہاتھوں پر پاؤں کا

← سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٠٧) المنتقىٰ مع النيل (١/ ١/ ١٦٧)

[1] صحيح البخاري (١/ ١٧٣) مترجم اردو، صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٣١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٥٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٠٧) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٥٤) و المنتقىٰ مع النيل (١/ ١/ ١٦٩)

عطف ماننے کے بجائے پاؤں کا عطف سروں پر مانا ہے اور ''اَرْجُلِکُمْ''، یعنی لام کی زیر سے پڑھا ہے۔ اس طرح معنیٰ یہ بنتا ہے: ''سروں اور ٹخنوں تک پیروں کا مسح کرو۔'' جب کہ احادیثِ رسول ﷺ اور آپ ﷺ کا عمر بھر کا اسوۂ حسنہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تعامل شاہد ہیں کہ پاؤں کا مسح نہیں، بلکہ پاؤں کو دھویا ہی جاتا ہے۔ لہٰذا مذکورہ آیت میں ''اَرْجُلِکُمْ'' والی قراءت کے بجائے صحیح تر قراءت ''اَرْجُلَکُمْ'' ہی ہے[1] اور پاؤں کا دھونا ہی فرض و واجب ہے۔ اب اگر یہاں مفسرینِ کرام کی تصریحات کا ذکر شروع کر دیا جائے تو بات لمبی ہو جائے گی۔ لہٰذا ہم صرف ایک مفسر زمخشری رحمہ اللہ کی ''تفسیر الکشاف'' (۱/ ۵۹۷ طبع دار المعرفۃ بیروت) سے صرف ایک نکتہ ذکر کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ چنانچہ موصوف لکھتے ہیں:

''علما (تفسیر ونحو اور اہلِ لغت) کی ایک جماعت نے لام کی زبر کے ساتھ ''اَرْجُلَکُمْ'' ہی پڑھا ہے کہ پاؤں دھوئے جانے والے اعضا ہیں۔ اگر تم کہو کہ اس کی زیر والی قراءت اور مسح کے حکم میں دخول کے بارے میں کیا کہتے ہو؟ تو میرا جواب یہ ہے کہ پاؤں اُن اعضا میں سے ہیں، جو دھوئے جاتے ہیں اور انھیں اوپر سے پانی بہا کر دھویا جاتا ہے۔ ان کے دھونے میں پانی میں غیر ضروری اور ممنوع و مذموم فضول خرچی کا امکان تھا، لہٰذا ان کا عطف دھوئے جانے والے اعضا کے بجائے عضوِ مسح (سر) پر کر دیا ہے۔ یہ اس لیے نہیں کہ اس کا بھی مسح ہی کیا جائے، بلکہ اس لیے کہ انھیں دھوتے وقت پانی میں میانہ روی کے وجوب پر تنبیہ کی جا سکے، پھر ساتھ ہی ﴿اِلَی الْکَعْبَیْنِ﴾ بھی ذکر کر دیا کہ یہ دھونا ٹخنوں تک ہوگا اور یہ غایت مسح کا ظن دور کرنے کے لیے لائی گئی ہے، کیوں کہ مسح کی شریعت میں کوئی غایت و انتہا نہیں آئی اور جہاں اس غایت کا ذکر ہے، وہاں متعلقہ عضو کو دھونے کا ذکر ہے۔''[2]

اس نکتے کے بعد علامہ زمخشری نے پاؤں کو دھونے کے بجائے ان کے مسح پر مصر حضرات کے امامِ اول حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ انھوں نے بعض قریشی نوجوانوں کو وضو میں

---

[1] شرح العقیدۃ الطحاویۃ. صحیح بات یہ ہے کہ دونوں قراءات ہی صحیح ہیں اور متواتر ہیں۔

[2] الکشاف (۱/ ۵۹۷) المحلیٰ لابن حزم (۱/ ۲/ ۵۸)

جلدی کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا:

﴿وَيْلٌ لِّلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ﴾

''ان ایڑیوں کے لیے نارِ جہنم کا عذاب ہے (جو خشک رہ جائیں)۔''

جب ان نوجوان نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زبان سے یہ الفاظ سنے تو انھوں نے پاؤں کو اچھی طرح مل مل کر دھونا شروع کر دیا۔[1]

معروف تابعی اور محدث امام عطاء رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''وَاللّٰهِ مَا عَلِمْتُ اَنَّ أَحَدًا مِّنْ أَصْحَابِ رَسولِ اللّٰهِ ﷺ مَسَحَ عَلَى الْقَدَمَيْنِ''[2]

''اللہ کی قسم! نبیِ اکرم ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کوئی ایک بھی ایسا صحابی میرے علم میں نہیں، جو پاؤں (کو دھونے کے بجائے ان) پر مسح کرتا ہو۔''

سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ اور صحیح ابن خزیمہ میں مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے وضو کیا، جس میں اپنے پاؤں مبارک دھوئے اور آخر میں فرمایا:

﴿فَمَنْ زَادَ عَلٰى هٰذَا أَوْ نَقَصَ فَقَدْ سَآءَ وَظَلَمَ﴾[3]

''جس نے اس سے زیادہ یا کم کیا، اس نے برا کیا اور ظلم کیا۔''

اس حدیث کے پیشِ نظر پاؤں پر مسح کرنا، بلاشبہہ دھونے کی نسبت نقص اور کمی کرنا ہے، جسے آپ ﷺ نے برائی اور ظلم قرار دیا ہے۔ ان احادیث اور اجماعِ صحابہ کے پیشِ نظر اس آیت کی قراءت زبر ہی سے صحیح تر ہے اور پیروں کا دھونا ہی فرض ہے نہ کہ مسح کرنا۔

جب آپ وضو مکمل کر لیں تو اب یہاں تین مسئلے پیش آتے ہیں:

1. ان میں سے ایک تو وضو کے سابقہ تمام مسائل کی طرح مرد و زن سب کے لیے یکساں ہے اور وہ ہے: وضو سے فارغ ہونے کے بعد کھڑے ہو کر ایک آدھ گھونٹ پانی پینا۔

---

[1] تفسير الكشاف (١/ ٥٩٧۔ ٥٩٨)

[2] مصدر سابق (ص: ٥٥٨)

[3] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٢٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٣٦) نيل الأوطار (١/ ١/ ١٦٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٢) لیکن اس میں ''أَوْ نَقَصَ'' کے الفاظ نہیں ہیں۔ ''أَوْ نَقَصَ'' کے الفاظ شاذ ہیں۔ فتح الباری ملاحظہ فرمائیں۔

۲ دوسرا مسند بعض وجوہات کی بنا پر مردوں کے ساتھ خاص ہے اور وہ ہے: وضو سے فارغ ہو کر شرم گاہ پر پانی کا چھینٹا مارنا۔

۳ تیسرا بھی سب کے لیے برابر ہے اور وہ ہے: وضو مکمل کرنے کی دعا کرنا۔

ان تینوں امور کی تفصیل و وجوہات اور دلائل کو سرِدست ہم موخر کر رہے ہیں، تا کہ وضو ہی سے تعلق رکھنے والے بعض دیگر اُمور کا تذکرہ پہلے کرلیں، جو عام حالات سے تو تعلق نہیں رکھتے، البتہ بعض حالات میں ان کی ضرورت پیش آجاتی ہے، مثلاً:

۱ کسی کے دانت مصنوعی ہوں، تو ان کے بارے میں کیا حکم ہے؟

۲ کسی کے بعض دیگر اعضا میں سے کوئی عضو مصنوعی ہو تو اس وقت اس کے وضو کی کیا صورت ہوگی؟

۳ ہاتھ پاؤں وغیرہ پر بوجہ مجبوری پلاسٹر لگایا گیا ہو تو وضو کیسے ہوگا؟

۴ اعضائے وضو میں سے کسی پر ''ڈامر'' لگا ہو تو وضو کی کیفیت کیا ہوگی؟

۵ اگر کسی مرد یا عورت نے وِگ لگا رکھی ہو تو سر کے مسح کا طریقہ کیا ہوگا؟

۶ موسمِ سرما میں سردی سے بچنے کے لیے یا ویسے ہی کسی نے چمڑے کے موزے ایسے ہی اون، فوم، کاٹن یا نائیلون کی جرابیں پہن رکھی ہوں، تو وہ کیسی ہونی چاہییں اور ان کی موجودگی میں مسح کے احکام و مسائل کیا ہیں؟ ان چھے مسائل کے بعد ہم مذکورہ تین امور ذکر کریں گے اور پھر ان کے ساتھ ہی مسائلِ وضو مکمل ہو جائیں گے۔ (ان شاء اللہ)

مصنوعی اعضا[1] کی صورت میں غُسل اور وضو کے احکام

مصنوعی دانتوں کا حکم:

آیئے پہلے دیکھیں کہ اگر کسی کے اصلی دانت کسی بیماری کی وجہ سے یا اپنی طبعی مدت کو پہنچنے کی وجہ سے نہ رہے ہوں اور اس نے مصنوعی دانت لگوا رکھے ہوں تو اس صورت میں غسل اور وضو کے کیا احکام و مسائل ہیں؟

اس سلسلے میں بنیادی بات یہ ہے کہ مصنوعی دانت دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو مستقل طور پر لگا دیے جاتے ہیں اور انھیں آسانی سے نکالا نہیں جاسکتا۔ دوسرے وہ جو بنائے ہی اس طرح جاتے ہیں کہ حسبِ ضرورت ان کا استعمال کیا جاتا ہے اور جب چاہیں انھیں نکال کر رکھ لیا جاتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں سے پہلی صورت میں تو یہ مصنوعی دانت بھی اصل کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کا حکم بھی اصلی دانتوں ہی کا ہوگا۔ وضو میں ان دانتوں تک پانی پہنچانا مسنون اور ضروری غسل میں فرض ہوگا۔ ایسے دانتوں کو نکال کر ان کی نچلی جگہ تک پانی پہنچانے کی ضرورت نہیں ہے، جس کا واضح قرینہ یہ ہے کہ فقہا نے اس طرح کے دانت لگانے یا دانتوں کو سونے یا چاندی کی تاروں کے ساتھ مضبوط کرنے کی اجازت دی ہے، جیسا کہ فقہ حنفی کی کتاب درّ مختار کے حاشیہ و شرح ''ردّ المحتار'' (۵/ ۳۱۸) میں بھی یہ بات مذکور ہے۔

اب ظاہر ہے کہ مصنوعی دانتوں کو سونے یا چاندی کے تاروں سے مضبوط کرنے کی اجازت کا مطلب یہی ہوگا کہ ان کے اندرونی حصّوں میں پانی پہنچانا ضروری نہیں ہے۔ ورنہ یہ اجازت بڑی پریشان کن بھی ہوگی اور لا یعنی بھی۔ یہ حکم تو ان مصنوعی دانتوں کے بارے میں ہے، جو تاروں کے

[1] ''مصنوعی اعضاء اور خارجی اشیاء (زیورات وغیرہ) کی صورت میں احکامِ غسل و وضو'' کے نام سے ہماری ایک کتاب الگ سے بھی شائع ہو چکی ہے۔ وللّٰهِ الْحمدُ وَمِنهُ الْقَبُولُ

ساتھ مضبوط کیے ہوئے ہوں یا پوری بتیسی ہو اور اسے اتارا نہ جاتا ہو، سوائے کبھی کبھار کے، جبکہ دوسری صورت ان دانتوں کی ہے، جو حسبِ ضرورت لگائے اور اتارے جاتے ہیں اور انھیں اتارنا اور لگانا آسان بھی ہوتا ہے، بلکہ بعض لوگ اپنی زبان کے دباؤ سے انھیں ہلاتے بھی رہتے ہیں۔ ایسے دانتوں کی حیثیت ایک زائد چیز کی ہوگی، یعنی ایسے مصنوعی دانت کی شکل میں غسل اسی وقت درست ہوگا، جب اس کے نیچے کی جگہ تک پانی پہنچ جائے۔ یہ کوئی مشکل بھی نہیں ہوتا کہ زبان کے معمولی دباؤ سے انھیں ڈھیلا کر لینے سے اصل جسم تک پانی پہنچ جائے گا اور ایسا ہی وضو کرتے وقت بھی کر لیں۔[1]

مصنوعی اعضا کے وضو کا حکم:

چھے مسائل میں سے دوسرا مسئلہ یہ ذکر کیا گیا تھا کہ اگر کسی کے دیگر اعضا میں سے کوئی عضو مصنوعی ہو تو اس سلسلے میں بھی احکامِ وضو اور طریقہ وہی ہوگا، جو مصنوعی دانتوں کے سلسلے میں ذکر ہوا ہے، یعنی اگر عضو کی بناوٹ اس نوعیت کی ہو کہ جرّاحی یا آپریشن کے بغیر اسے الگ کرنا ممکن نہ ہو تو اس کی حیثیت اصل عضو ہی کی ہوگی۔ اگر وہ عضو اعضاے وضو میں سے ہو تو اُسے دھونا واجب ہوگا اور غسل میں بھی اس پر پانی پہنچانا واجب ہوگا، لیکن اگر اس کی بناوٹ اور نوعیت ایسی ہو کہ وہ آسانی سے علاحدہ کیا جا سکتا ہو تو غسل کے وقت، اسی طرح اگر وہ اعضاے وضو میں سے ہو تو وضو کرتے وقت، اس عضو کو الگ کر کے یا ڈھیلا کر کے جِسم کے اصل حصّے پر پانی پہنچانا ضروری ہوگا۔ جو اعضا آسانی سے الگ ہو سکتے ہیں، انھیں تو الگ کرنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی، بلکہ خود بہ خود ان کے نیچے پانی گھس جاتا ہے، البتہ بہ وقتِ غسل و وضو معمولی توجّہ سے بطورِ خاص اس کے نیچے پانی پہنچا لینا کافی ہوگا اور یہ کوئی دِقّت طلب امر بھی نہیں ہوگا، بلکہ یہی سمجھیں گے کہ جس طرح انگوٹھی، کنگن یا چوڑیوں کے ذرا تنگ ہونے کی شکل میں ہوتا ہے، وہی معاملہ یہاں بھی ہوگا اور جیسے انھیں معمولی حرکت دے لینے سے مقصود حاصل ہو جاتا ہے، ویسے یہاں بھی ہو جائے گا۔[2]

پلاسٹر پر مسح:

اگر بالفرض کِسی مجبوری کی وجہ سے کسی کے ہاتھ یا پاؤں وغیرہ پر پلاسٹر لگا ہوا ہو، تو غسل یا وضو

[1] جدید فقہی مسائل (ص: ۱۹، ۲۰)

[2] جدید فقہی مسائل (ص: ۲۰)

کے لیے اس صورت میں کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا؟ اس سلسلے میں بھی شریعتِ اسلامیہ کے مصادر میں ہدایات موجود ہیں کہ اس پلاسٹر پر صرف مسح کر لیا جائے، یعنی اس کے اُوپر صرف گیلا ہاتھ پھیر دیا جائے، اُسے دھونے کی بھی ضرورت نہیں ہے اور اس کی حیثیت جبیرہ یعنی پٹی پر مسح کی ہوگی، جو فقہ اسلامی کا معروف مسئلہ ہے۔ جبیرہ یا جبارۃ کی تعریف میں امام ابنِ قدامہ ''المغني'' (١/ ٢٧٧) میں اور صاحبِ ''مغني المحتاج'' (١/ ٩٤) لکھتے ہیں:

''کسی لکڑی وغیرہ کی وہ پٹی جو برابر تراش کر کسی جوڑ کے اُتر جانے پر یا کسی ہڈی کے ٹوٹ جانے پر اُسے صحیح اور سیدھا رکھنے کے لیے اس جوڑ یا ہڈی پر باندھ دی جاتی ہے۔''

ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے ''الفقه الإسلامي وأدلته'' میں لکھا ہے:

''کسی ہڈی کے ٹوٹ جانے پر اُسے جوڑ کر جو چپس لگا دی جاتی ہے (جسے پلاسٹر کہا جاتا ہے) وہ بھی جبیرہ کے معنوں میں داخل ہے۔ اگر سر پر چوٹ آ کر زخم ہو جائے یا کسی جگہ فصد لگوائی ہو یا کوئی پھنسی پھوڑا یا کسی آپریشن کے بعد پٹی باندھی گئی ہو تو یہ ساری پٹیاں بھی جبیرہ کے حکم میں داخل ہیں۔''[1]

''المسح عَلَی الجبيرة'' (پٹی پر مسح) کو عقلاً اور شرعاً ہر دو اعتبار سے مشروع کہا گیا ہے۔ عقلاً اس طرح کہ ضرورت اس مسح کی متقاضی ہے اور پلاسٹر یا پٹی کو اتارنا حرج وضرر کا باعث ہے، بلکہ فقہ حنفی کی کتاب ہدایہ کے مولّف علامہ مرغینانی کے بقول موزے اتارنے سے پٹی اتارنے کا حرج کئی گنا زیادہ ہے۔ لہٰذا جب موزوں پر مسح جائز ہے تو پلاسٹر یا پٹی پر بالاولیٰ جائز ہوگا۔[2]

شرعاً بھی اس مسح کے جواز پر متعدد احادیث سے استدلال کیا گیا ہے، لیکن ان احادیث میں سے کوئی ایک بھی مرفوع حدیث صحیح نہیں، بلکہ سب ضعیف اور متکلم فیہ ہیں۔ ان کے ضعف اور کمزوری کو واضح کرنے کے لیے محدّثین کرام کی تصریحات کو اگر بالتفصیل ذکر کیا جائے تو بات طویل ہو جاتی ہے، لہٰذا ہم ان کا خلاصہ ذکر کر دیتے ہیں:

1 جن احادیث سے ''المسح عَلَی الجبيره'' کی مشروعیت پر استدلال کیا جاتا ہے، ان میں سے پہلی

---

[1] الفقه الإسلامي (١/ ٣٤٦)

[2] هداية مع فتح القدير (١/ ١٠٩)

حدیث سنن ابن ماجہ، دارقطنی اور بیہقی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«اِنْكَسَرَتْ إِحْدَىٰ زَنْدَيَّ فَسَأَلْتُ النَّبِيَّ ﷺ»

''میرا ایک ہاتھ ٹوٹ گیا تو میں نے نبیِ اکرم ﷺ سے استفسار کیا (کہ میں کیا کروں)؟''

اس روایت میں وہ فرماتے ہیں:

«فَأَمَرَنِي أَنْ أَمْسَحَ عَلَى الْجَبَائِرِ»[1]

''مجھے نبیِ اکرم ﷺ نے حکم فرمایا کہ میں پٹیوں پر مسح کر لیا کروں۔''

اس روایت کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ ''بلوغ المرام'' میں فرماتے ہیں کہ اسے ابن ماجہ نے سخت ناکارہ سی سند سے روایت کیا ہے، جب کہ ''سُبل السلام'' میں امیر صنعانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''امام احمد اور یحییٰ بن معین نے اس حدیث کا انکار کیا ہے (یعنی اسے صحیح نہیں مانا) اس حدیث کو دارقطنی اور بیہقی نے بھی روایت کیا ہے اور ان کی سند ابن ماجہ والی سند سے بھی زیادہ ناکارہ ہے۔''

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''حفّاظِ حدیث اس روایت کے ضعف پر متفق ہے۔ ''نصب الرایة'' میں علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کے ضعف کو نقل کیا ہے اور ابن ابی حاتم نے تو ''العلل'' میں اپنے والد سے نقل کیا ہے کہ یہ حدیث باطل ہے، اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔''[2]

1 دوسری حدیث سنن ابو داود، ابن ماجہ اور دارقطنی میں مروی ہے، جس میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

''ہم ایک سفر پر روانہ ہوئے۔ ہم میں سے ایک شخص کے سر میں پتھر لگا اور اس کا سر پھٹ گیا۔ وہ پھر بدخوابی (احتلام) کا شکار ہوا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا تو انھوں نے اسے غسل کرنے کا مشورہ دیا، اس نے غسل کیا (مگر سر کے زخم میں پانی پڑنے

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٥٧)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٧٢) بلوغ المرام و سبل السلام (١/ ١/ ٩٩) الفقه الإسلامي للذهيلي (١/ ٣٤٦) تمام المنة للألباني (ص: ١٣٤) تلخيص الحبير (١/ ١/ ١٤٦)

کے نتیجے میں) اس کی موت واقع ہوگئی۔ جب اس واقعہ کی خبر نبیِ کریم ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«قَتَلُوهُ قَتَلَهُمُ اللّٰهُ»[1] ''اللہ انھیں غارت کرے، انھوں نے اسے قتل کر دیا۔''

جب انھیں اصلی حکم معلوم نہیں تھا تو انھوں نے پوچھ کیوں نہ لیا؟ کیوں کہ ایسے بیمار کی شفا پوچھ لینا ہے، اُسے یہی کافی تھا کہ وہ تیمّم کر لیتا اور زخم پر پٹی وغیرہ باندھ کر اس پر مسح کر لیتا اور باقی سارے جسم کا غسل کر لیتا۔''

اسے ''بلوغ المرام'' میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''ضعیف السند'' کہا ہے اور ''سُبل السلام'' میں امیر صنعانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''یہ حدیث اور حضرت علی رضی اللہ عنہ والی حدیث دونوں مل کر ''المسح علی الجبیرۃ'' کے وجوب کا پتا دیتی ہیں، لیکن وجوب میں علما کا اختلاف ہے۔''[2]

بعض کہتے ہیں کہ ان دونوں حدیثوں کی بنا پر مسح کرے اور ان میں اگرچہ ضعف ہے، لیکن باہم مل کر کچھ قوت اختیار کر جاتی ہیں۔ اس لیے بھی کہ اب اس عضو کو دھونا ناممکن ہوگیا ہے تو سر کے بالوں پر مسح کی طرح ہی پٹی پر مسح ہوگا اور موزوں پر مسح کرنے پر بھی قیاس کیا گیا ہے۔ امیر صنعانی رحمہ اللہ نے اس قیاس کو قوی قرار دیا ہے۔

امام بیہقی نے بھی اس دوسری حدیثِ جابر کو ضعیف کہا ہے، لیکن صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان اور مستدرک حاکم میں اس حدیث کی شاہد ایک دوسری حسن درجے کی اور بعض کے نزدیک صحیح حدیث حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ اس کے ساتھ مل کر یہ حدیثِ جابر حسن درجے کی ہو جاتی ہے، مگر صرف تیمّم کے ذکر تک، کیوں کہ حدیثِ ابن عباس رضی اللہ عنہما میں آگے پٹی باندھنے، اس پر مسح کرنے اور باقی سارے جسم کا غسل کرنے کے الفاظ نہیں ہیں۔ لہٰذا بعض کبار محدّثین رحمہ اللہ نے کہا ہے:

''یہ آخری حِصّہ ضعیف و منکر ہے، کیونکہ یہ الفاظ صرف ضعیف سند سے وارد ہیں۔''[3]

---

[1] صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۳۲۵) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۵۷۲)

[2] بلوغ المرام و سبل السلام (۱/ ۱/ ۹۹)

[3] تلخیص الحبیر (۱/ ۱/ ۱۴۷۔ ۱۴۸) و تمام المنة (ص: ۱۳۱) مشکاة المصابیح (۱/ ۱۶۶)

3 تیسری حدیث معجم طبرانی کبیر میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ لَمَّا رَمَاهُ ابْنُ قُمَيْئَةَ يَوْمَ أُحُدٍ، رَأَيْتُهُ إِذَا تَوَضَّأَ حَلَّ إِصَابَتَهُ وَمَسَحَ عَلَيْهَا بِالْوُضُوْءِ»[1]

''غزوۂ اُحد کے دن ابن قمیئہ نے نبیِ کریم ﷺ کو تیر مارا تو میں نے دیکھا کہ نبیِ کریم ﷺ اس کے لگائے ہوئے زخم کی پٹی پر وضو کے وقت مسح کرتے تھے۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''التلخیص الحبیر'' میں اس کی سند کو ضعیف کہا ہے اور اہم بات یہ ہے کہ ان کے بقول حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ غزوہ احد میں شامل ہی نہیں تھے۔ اس روایت کو امام زیلعی نے ''نصب الرایۃ'' میں بھی نقل کیا ہے۔[2]

4 اس موضوع کی چوتھی روایت سنن دارقطنی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَمْسَحُ عَلَى الْجَبَائِرِ»

''نبیِ اکرم ﷺ پٹیوں پر مسح کیا کرتے تھے۔''

اس روایت کو بیان کر کے خود امام دارقطنی ہی نے لکھا ہے:

''یہ مرفوعاً صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس کا ایک راوی ابو عمارہ سخت ضعیف ہے۔''[3]

عام فقہا و محدّثین کا مسلک:

سابقہ سطور میں ہم پلاسٹر وغیرہ پر مسح کے مشروعیت کے دلائل پر مشتمل احادیث ذکر کر رہے تھے اور کبار محدثین کرام کے اقوال کا خلاصہ بھی نقل کیا جا چکا ہے کہ وہ احادیث ضعیف ہیں اور ایسی احادیث جن میں سے ہر حدیث کی سند ضعیف ہو اور اس کا کوئی شاہد بھی نہ ہو ایسی روایات تو چاہے کتنی ہوں، ان کا مجموعہ قوی نہیں ہو پاتا۔ یہی وجہ ہے کہ امام بیہقی نے اپنی سُننِ کبریٰ میں ان میں سے بعض روایات کو نقل کرنے کے باوجود لکھا ہے:

---

[1] نصب الراية (١/ ١٨٦)

[2] كذا في تمام المنة (ص: ١٣٤) نیز دیکھیں: تلخيص الحبير (١/ ١/ ١٤٦۔ ١٤٧)

[3] تمام المنة (ص: ١٣٤) التلخيص الحبير (١/ ١٤٦) نصب الراية للزيلعي (١/ ١٨٦)

"وَلَا يَثْبُتُ فِي هٰذَا شَيْءٌ" "اس موضوع کی کوئی مرفوع حدیث صحیح نہیں ہے۔"

ان روایات میں سے سب سے صحیح تر وہ روایت ہے، جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، مگر وہ بھی قوی نہیں۔ اس موضوع میں صرف فقہاے تابعین اور ان کے بعد والے ائمہ وفقہا کے اقوال ہی ہیں یا پھر ایک روایت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے موقوفاً صحیح سند سے مروی ہے کہ انھوں نے پٹی پر مسح کیا ہے۔[1]

گویا امام بیہقی جیسے محدّثِ کبیر کے نزدیک اس موضوع کی مرفوع حدیث تو کوئی بھی صحیح نہیں، جس سے ثابت ہوتا ہو کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کیا یا ایسا کرنے کا حکم فرمایا۔ البتہ آثارِ صحابہ و تابعین اور خصوصاً اثر ابن عمر رضی اللہ عنہما پر ہی اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ امیر صنعانی رحمہ اللہ نے بھی "سبل السلام" میں "المسح عَلَى الْجبيره" کی مشروعیت کو قبول کیا ہے۔[2] اسی بنا پر شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ وجوبِ مسح کے قائل ہیں۔[3]

امام شوکانی رحمہ اللہ نے بھی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے طُرق باہم مل جانے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ والی حدیث کی وجہ سے ان کے مجموعے کو قابلِ استدلال قرار دیا ہے اور سید سابق بھی مشروعیت و وجوب ہی کے قائل ہیں۔[4]

"نيل الأوطار" میں لکھا ہے:

"امام ابو حنیفہ، شافعی، فقہاے سبعہ اور بعد والے کثیر فقہا رحمہم اللہ مسح کے وجوب کے قائل ہیں، لیکن امام شافعی رحمہ اللہ نے یہ شرط رکھی ہے کہ وہ پٹی طہارت کی حالت میں لگائی گئی ہو اور اس کے نیچے جسم صحیح سالم نہ ہو، سوائے اس کے جس کے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہ ہو۔"

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ کسی ایسے عضو پر، جس پر پلاسٹر لگا ہو، اس پر نہ تو مسح کیا جائے گا اور نہ اسے کھولا ہی جائے گا، بلکہ اسے ویسے ہی چھوڑ دیا جائے گا، کیونکہ یہ جبیرہ یا پلاسٹر ایک الگ عضو کی شکل میں ہے اور آیتِ وضو میں اس کے دھونے یا مسح کرنے کا

[1] تمام المنة (ص: ١٣٤۔ ١٣٥)
[2] سبل السلام (١/ ١/ ٩٩)
[3] الفقه الإسلامي للزحيلي (١/ ٣٤٧)
[4] فقه السنة (١/ ٨١)

ذکر نہیں، اس معاملے میں حضرت جابر اور علی رضی اللہ عنہما سے مروی احادیث ضعیف ہونے کی وجہ سے ناقابلِ استدلال ہیں۔[1]

امام ابو حنیفہ اور علامہ ابنِ حزم رحمہما اللہ کا مسلک:

فقہ حنفی کی معتبر اور معروف کتاب "بدائع الصنائع" (۱/ ۱۳) میں امام صاحب رحمہ اللہ کا مسلک یہ مذکور ہے کہ جبیرہ پر مسح صرف مستحب ہے واجب نہیں، جبکہ صاحبین یعنی امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک واجب ہے اور امام صاحب سے "البدائع" میں منقول ہے:

"فرضیت کسی قطعی دلیل کے بغیر ثابت نہیں ہوسکتی، جب کہ مسح کے بارے میں جو حدیثِ علی ہے، وہ (اخبارِ آحاد میں سے ہے اور) ضعیف ہے، لہٰذا اس سے فرضیت ثابت نہیں ہوسکتی۔"[2]

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی یہ رائے اگرچہ کتبِ فقہ حنفیہ کی رو سے مفتیٰ بہ نہیں، بلکہ فتویٰ ان کے دوسرے قول اور صاحبین کے قول کے مطابق وجوب ہی کا ہے، لیکن موصوف کی رائے سے علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کا اتفاق ہے، بلکہ انھوں نے تو "المحلّی" میں دوٹوک فیصلہ دیا ہے کہ جبیرہ پر مسح کرنا مشروع نہیں ہے، ان کے نزدیک اس کی دلیل ایک تو سورۃ البقرہ کی آخری آیت (۲۸۶) میں مذکور یہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾

"اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی وسعت و طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔"

دوسری دلیل صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی و ابن ماجہ اور مسندِ احمد میں مروی یہ ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«إِذَ أَمَرْتُكُمْ بِأَمْرٍ فَأْتُوا مِنْهُ مَا اسْتَطَعْتُمْ»[3]

"جب میں تمھیں کسی کام کا حکم دوں تو حسبِ استطاعت اس کی تعمیل کرو۔"

لہٰذا قرآن وسنت دونوں کی رُو سے ہر وہ عمل ساقط ہوگیا، جو کسی کی طاقت سے باہر ہو، اس کا

---

[1] نيل الأوطار (۱/ ۱/ ۲۵۷۔ ۲۵۸)

[2] دیکھیں: الفقه الإسلامي للزحيلي (۱/ ۳٤۷)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (۷۲۸۹) صحيح مسلم مع شرح النووي (۹/ ۱۰۱) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (۲٤٥٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۲) كذا في إرواء الغليل (۱/ ۱۸۳)

عوض مقرر کرنا شریعت کا کام ہے اور شریعت قرآن وسنت کے سوا کسی طرح سے لازم نہیں ہوتی، جبکہ قرآن وسنت کسی میں بھی جبیرے یا پلاسٹر پر اس عضو کو دھونے کے عوض میں مسح کرنے کا حکم نہیں آیا، لہٰذا اس مسح کی مشروعیت ساقط ہوگئی۔ آگے انھوں نے امام شعبی، امام داؤد اور اُن کے اصحاب سے بھی ایسے ہی اقوال نقل کیے ہیں، جن سے ان کے قول یعنی مسح کی عدمِ مشروعیت کی تائید ہوتی ہے۔ انھوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی موقوف اثر کہ انھوں نے پٹی پر مسح کیا، کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:

''وہ ان کا اپنا عمل تھا اور وہ بھی پٹی پر مسح کو واجب قرار دینے کے لیے نہیں تھا، جب کہ ان سے تو صحیح سند کے ساتھ یہ بھی ثابت ہے کہ وہ غسل و وضو کے دوران میں اپنی آنکھوں کے اندر پانی داخل کیا کرتے تھے، حالانکہ فرض ہونا تو کجا یہ مشروع تک بھی نہیں ہے۔''[1]

یعنی جب انھی کا ایک فعل مشروع تک بھی نہیں تو انھی کے ایک دوسرے فعل کو وجوب کا درجہ کیسے دیا جاسکتا ہے؟

اس ساری تفصیل سے معلوم ہوا کہ پلاسٹر یا پٹی پر مسح کے بارے میں جمہور فقہا کا مسلک تو مشروعیت اور وجوب کا ہے، جب کہ امام شعبی، امام داود اور ان کے اصحاب علامہ ابنِ حزم اور ایک قول میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اس مسح کی مشروعیت کے بھی قائل نہیں، چہ جائیکہ وجوب کو تسلیم کریں۔ دورِ حاضر کے بعض کبار محدّثین (مثل العلّامة الألباني في تمام المنّة) نے اسی رائے کو حق قرار دیا ہے، کیوں کہ قرآن وسنت انھی کے حلیف ہیں اور جمہور کا مسلک ضعیف روایات پر مبنی ہے۔ ایک تیسری رائے بھی ہے جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف ہی منسوب ہے کہ جبیرہ پر مسح واجب تو نہیں، البتہ مستحب ہے کہ کرلیا جائے تو اچھا ہے اور نہ کریں تو کوئی حرج نہیں۔

موصوف کی یہ رائے اگرچہ مفتیٰ بہ نہیں، لیکن ساری تفصیل کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی اقرب الیٰ الصواب ہے۔ امام صاحب رحمہ اللہ کا یہ قول بھی کسی معمولی کتاب یا رسالے میں نہیں، بلکہ فقہ حنفی کی ایک معتبر اور معروف کتاب ''بدائع الصنائع'' میں علامہ کاسانی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔[2]

---

[1] المحلی لابن حزم (١/ ٢/ ٧٤۔ ٧٧) تمام المنة (ص: ١٣٥)

[2] المغني لابن قدامة (١/ ٣٥٥) وما بعد الشرح للصغير (١/ ٢٠٢) وما بعد طبع على نفقة الشيخ الزائد حاكم الإمارات.

پلاسٹر یا پٹی پر مسح کرنے کی شرائط:

جبیرہ یا پلاسٹر وغیرہ پر مسح کرنے کی بعض شرطیں بھی فقہاے کرام نے ذکر کی ہیں:

① پہلی شرط:

ان میں سے پہلی شرط یہ ہے کہ اس پلاسٹر یا پٹی کا کھولنا ممکن ہی نہ ہو یا اسے کھول کر دھونے سے اس مرض کے بڑھ جانے یا کسی دوسرے مرض کے پیدا ہو جانے یا شفا یابی کے موخر ہو جانے کا خدشہ ہو۔ مالکیہ کا کہنا ہے کہ ہلاکت کا خوف، مرض کے شدت اختیار کر جانے یا افاقے کے مؤخر ومعطل ہونے کا خدشہ ہو تو مسح واجب ہے۔

② دوسری شرط:

دوسری شرط یہ ہے کہ پلاسٹر یا پٹی سخت ضرورت کی جگہ پر ہو، صحیح وسالم جگہ پر نہ ہو اور ایسی جگہ بھی اس کے نیچے موجود ہو تو اسے ننگا کر کے دھویا جائے۔

③ تیسری شرط:

تیسری شرط یہ ہے کہ وہ پلاسٹر یا پٹی طہارت یعنی غسل یا وضو کر کے لگائی گئی ہو۔ یہ شرط صرف شافعیہ اور حنابلہ ہی نے عائد کی ہے۔ بظاہر یہ شرط پلاسٹر یا پٹی کی ضرورت ومجبوری سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی، بلکہ ایک لایعنی شرط ہے، کیوں کہ ایک شخص کا وضو نہیں تھا، اچانک کسی وجہ سے اسے کوئی حادثہ پیش آ گیا، جس سے مثلاً اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا یا کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ڈاکٹر نے فوری طور پر دوا وغیرہ لگائی اور حسبِ ضرورت پلاسٹر چڑھا دیا یا پٹی لگا دی اور تھوڑی ہی دیر کے بعد نماز کا وقت ہوگیا۔ اس شرط کی رُو سے تو اب اس مریض کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس پلاسٹر کو کٹوا دیں یا پٹی اتروا کر وضو کرے، پھر وضو کی حالت ہی میں پلاسٹر یا پٹی لگوائے، تاکہ وہ مسح کی رخصت پر عمل کر سکے۔ یہ عام فہم سی بات ہے کہ یہ شرط درست نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حنفیہ اور مالکیہ کے یہاں یہ شرط سرے سے ہے ہی نہیں، بلکہ ان کے نزدیک پٹی پر مسح جائز ہے، خواہ وہ طہارت کی حالت میں لگائی ہو یا بلا طہارت کی حالت میں اور یہی معقول بات ہے، کیوں کہ اعضا کی ٹوٹ پھوٹ جس ہنگامی شکل میں واقع ہوتی ہے، اس کے پیشِ نظر طہارت وعدمِ طہارت کا لحاظ رکھنا ایک مشکل اور باعثِ حرج ومشقت چیز ہے

اور اسلام وہ دین ہے جو آسان احکام پر مشتمل ہے اور کسی معاملے میں حرج کی بھی کوئی صورت نہیں رکھی گئی، جیسا کہ سورۃ الحج (آیت: ۷۸) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾

''اللہ تعالیٰ نے دین کے احکام میں تم پر کوئی حرج نہیں رکھا۔''

یہی بات اللہ تعالیٰ نے سورۃ المائدہ (آیت: ۶) میں یوں بیان فرمائی ہے:

﴿مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ﴾

''اللہ تمھیں کسی حرج و مشقّت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔''

نیز حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

« إِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ »[1] ''دین تو آسان ہے۔''

سُنن نسائی اور صحیح ابن حبان میں اس ارشادِ نبوی کے الفاظ یوں ہیں:

« إِنَّ هٰذَا الدِّيْنَ يُسْرٌ »[2] ''یہ دینِ اسلام آسان احکام والا دین ہے۔''

یہ شافعیہ و حنابلہ والی شرط آسان ہے نہ حرج ہی سے خالی ہے، لہٰذا یہ غیر معقول ہے۔

④ چوتھی شرط:

''المسح عَلَى الجبيره'' کی چوتھی شرط یہ ہے کہ پلاسٹر یا پٹی کسی ایسی چیز سے نہ ہو، جو غصب کی گئی ہو، یعنی چوری یا ظلماً چھینی ہوئی نہ ہو اور پٹی کا کپڑا ریشم کا بھی نہ ہو، جو مردوں پر حرام ہے۔ ایسے ہی پلاسٹر یا پٹی کسی نجس چیز پر مشتمل نہ ہو، ورنہ مسح باطل ہوگا اور نماز بھی نہیں ہوگی۔ یہ شرط فقہاے حنابلہ نے عائد کی ہے اور معقول بھی ہے۔ ایسے ہی بعض دیگر شرائط بھی ذکر کی گئی ہیں، لیکن وہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔[3]

پلاسٹر یا پٹی پر مسح کے نواقض:

یہ بات پیشِ نظر رہے کہ فقہاے مذاہبِ اربعہ نے نواقض ''المسح على الجبيره'' کہ پٹی

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٩٣۔ ٩٤) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٦٦١) تمام المنة (ص: ٤٣)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٢٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٦١١)

[3] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: الفقه الإسلامي وأدلة (١/ ٣٤٨۔ ٣٥٠)

یا پلاسٹر پر کیے ہوئے مسح کی مدّت کب ختم ہوگی؟ اس سلسلے میں دو حالتیں ذکر کی ہیں:

① ناقضِ اوّل:

مسح کے بعد جب تک وضوٹوٹنے کے اسباب میں سے کسی کا وقوع نہ ہو، اس وقت تک مسح کی مدّت بحال رہے گی اور جونہی وضوٹوٹ گیا، مسح کی مدّت بھی ختم ہوگئی۔ نئے وضو کے ساتھ از سرِ نو مسح کرنا ضروری ہوگا۔ اس پر تمام مذاہب کا اتفاق ہے۔

② ناقضِ ثانی:

یہ متفق علیہ نہیں، بلکہ مختلف مذاہب کے فقہا نے اس کی تفصیلات میں مختلف آرا کا اظہار کیا ہے، لیکن جو چیز ان سب کے یہاں مشترک ہے، وہ یہ ہے کہ مسح کرنے سے لے کر جب تک پلاسٹر کو اتار نہ لیا جائے یا وہ خود بہ خود نہ گر جائے (اور نہ وضوٹوٹے) تو وہ مسح بحال رہے گا، جب کہ پلاسٹر، پٹی یا جبیرہ کو جونہی کھولا گیا، اس مسح کی مدّت ختم ہو جائے گی اور وضوٹوٹ جائے گا۔ چاہے وضوٹوٹنے کا دوسرا کوئی بھی سبب نہ بنا ہو۔[1]

کتبِ فقہ میں عموماً جبیرہ، پلاسٹر یا پٹی کو اتارنے کے ساتھ ہی اس کے خود بہ خود گر جانے کا ذکر بھی ہوتا ہے۔ جب کہ یہ پُرانے زمانے کی باتیں ہیں۔ موجودہ دور میں لگایا گیا پلاسٹر تو جب تک ڈاکٹر سے نہ کٹوایا جائے کٹتا ہی نہیں اور تقریباً یہی معاملہ پٹی کا ہے، مگر کبھی ایسا ہو جائے کہ خود بہ خود گر جائے تو اس کا حکم بھی موجود ہے۔

موزوں پر مسح اور پلاسٹر پر مسح میں فرق:

جبیرہ، پلاسٹر یا پٹی پر مسح بظاہر تو موزوں پر مسح ہی کی طرح ہے، لیکن ان دونوں پر مسح کے مابین کچھ فرق ہے، جس کی مختلف شکلیں ہوسکتی ہیں۔ مثلاً:

1. پلاسٹر یا پٹی پر مسح کی توقیت دنوں کے ساتھ نہیں ہوتی، بلکہ شفا پر منحصر ہوتی ہے، جب کہ موزوں پر مسح کی توقیت دنوں کے ساتھ ہے کہ مسافر تین دنوں اور تین راتوں تک موزوں پر مسح کرسکتا

---

[1] بدائع الصنائع (١/ ١٤) فتح القدير شرح هداية (١/ ١١٠) اللباب شرح قدوري (١/ ٤١ طبع المكتب العربي) الفقه الإسلامي (١/ ٣٥٤ـ ٣٥٥ـ ٣٥٦)

ہے اور مقیم صرف ایک دن اور ایک رات تک۔ اس مدت کے بعد اُسے موزے اتار کر پاؤں کو لازماً دھونا ہوگا، لیکن پلاسٹر یا پٹی میں ایسا نہیں، جب تک زخم مندمل نہ ہوجائے اور ہڈی جڑ کر ٹھیک نہ ہوجائے، اُسے اتارنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

2 ان دونوں چیزوں میں دوسرا فرق یہ ہے کہ موزوں پر مسح کے جواز میں یہ شرط ہے کہ طہارت و وضو کی حالت میں پہنے گئے ہوں۔ پلاسٹر یا پٹی میں یہ کوئی شرط نہیں اور حنابلہ اور شافعیہ نے جو یہ شرط عائد کی ہے تو اہلِ علم نے اُسے غیر معقول و ناحق قرار دیا ہے۔[1]

3 ان میں تیسرا فرق یہ ہے کہ پلاسٹر یا پٹی حصولِ شفا سے پہلے ہی کسی وجہ سے گر جائے تو بھی مسح کی مدّت ختم نہیں ہوگی، بلکہ دوبارہ پٹی کر لینے کے بعد پھر اس پر مسح جائز ہے، لیکن موزہ اگر پاؤں سے اتار لیا جائے یا دونوں اتار دیے جائیں اور وضو بھی نہ ہو تو اب ان پر مسح کی مدّت ختم ہوگئی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ وضو کر کے انھیں پہنیں، ورنہ ان پر مسح جائز نہیں ہوگا۔

4 ان دونوں کے مابین چوتھا فرق یہ ہے کہ پٹی پر مسح تو اس وقت جائز ہے کہ جب زخم پر مسح کرنا اور اُسے دھونا نقصان دہ ہو، جبکہ موزوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے کہ اگرچہ کوئی پاؤں دھونے سے عاجز نہ بھی ہو، تب بھی مسح جائز ہے اور موسمِ سرما کی سردی سے بچاؤ تو کوئی بہت بڑا عذر نہیں، اس کے باوجود شریعت نے اجازت دے رکھی ہے۔

5 پانچواں فرق یہ ہے کہ موزوں پر مسح تو صرف پاؤں کے ساتھ خاص ہے، جسم کے دوسرے حصے پر موزہ نما چیز چڑھائی جائے یا دستانے پہن لیے جائیں، تب بھی ان پر مسح جائز نہیں، جب کہ پلاسٹر یا پٹی سر سے پاؤں تک جسم کے کسی بھی حصے پر ہو، اس پر مسح کرنا جائز ہے۔[2]

ڈامر لگانے کی صورت میں وضو کا حکم:

اگر اعضاے وضو میں سے کسی پر ڈامر لگا ہو تو وضو کی کیفیت کیا ہوگی؟ اس سلسلے میں بنیادی بات یہ ہے کہ ڈامر ان چیزوں میں سے ہے، جو پانی کو جسم تک نہیں پہنچنے دیتیں۔ لہٰذا ڈامر یا کولتار کا حکم بھی تقریباً نیل پالش جیسا ہی ہے کہ وضو کرتے وقت جس طرح اسے ریموور سے صاف کرنا

---

[1] الفقه الإسلامي وأدلة (١/ ٣٤٩، ٣٥٣)

[2] بدائع الصنائع (١/ ١٤) المغني لابن قدامة (١/ ٣٥٦) الفقه الإسلامي (١/ ٣٥٦۔ ٣٥٧) جدید فقہی مسائل (ص:٦١)

ضروری ہے، ایسے ہی ڈامر کو بھی اتارنا ضروری ہے اور اس کے بعد وضو کرنا ہوگا، ورنہ اس کی موجودگی میں اتنی جگہ کے اصل جسم تک پانی نہیں پہنچے گا اور وضو نہیں ہوگا۔ ہاں نیل پالش اور ڈامر میں اتنا فرق ہے کہ نیل پالش کی ضرورت ہرگز نہیں ہوتی، وہ تو صرف ایک زینت ہوتی ہے، البتہ ایک ضرورت ہونے کی شکل میں اس سے مختلف ہے، لہٰذا اگر کسی عذر و ضرورت کی بنا پر ڈامر لگانا ناگزیر ہو جائے اور اُسے اتارنا یا چھڑانا نقصان دِہ ہو تو پھر وہ بھی جبیرہ، پلاسٹر اور زخم کی پٹی کے حکم میں آئے گا اور اُسے اتارے بغیر وضو ہو جائے گا اور نماز ادا کی جا سکے گی۔ [1]

غسل و وضو میں مصنوعی بالوں کے جُوڑوں یا وِگوں کا حُکم:

اب باری ہے اِس جدید فقہی مسئلے کی کہ اگر کِسی مرد یا عورت نے مصنوعی بالوں کا بنا ہوا جوڑا یا وِگ لگا رکھی ہو تو غسل و وضو کا طریقہ کیا ہوگا اور سر کے مسح کے لیے کیا صورت اختیار کرنا پڑے گی؟

اس سوال کے جواب سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ مصنوعی بال لگانے یا ان سے بنا ہوا جُوڑا یا وِگ استعمال کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ زیب و زینت اور بناؤ سنگار کرنا عورت کا ایک فطری جذبہ اور شوق ہے، جس کی رعایت رکھتے ہوئے اسلام نے ان کے لیے ریشمی لباس، زیورات، کاسمیٹک اور میک اپ کے سامان کا استعمال جائز قرار دیا ہے، بشرطیکہ یہ سب چیزیں چار دیواری کے اندر اندر اور خاص کر شوہر کے لیے ہوں۔ بے حجاب ہو کر سیر و سیاحت کے دَوران اور مرد و زن کی مخلوط پارٹیوں میں شرکت کر کے غیر مردوں کو دکھانے کے لیے نہ ہوں۔ ایسے ہی اسلام نے جہاں عورتوں کو حدود کے اندر رہتے ہوئے بناؤ سنگار اور زیب و زینت کی اجازت بخشی ہے، وہیں یہ پابندی بھی عائد کی ہے کہ اس میں غلو نہ کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ بناوٹ و شناخت میں کوئی تغیر و تبدل نہ کیا جائے، کیوں کہ یہ ایک شیطانی فعل ہے، چنانچہ سورۃ النساء (آیت: ۱۱۸) میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے شیطان پر لعنت کی تھی تو اس نے کہا تھا:

﴿لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا﴾

’’میں تیرے بندوں میں سے ایک مقرر حصہ لے کر رہوں گا۔‘‘

یعنی ان کے اوقات میں، ان کی محنتوں میں، ان کی قوتوں و قابلیتوں میں، ان کے مال اور

---

[1] جدید فقہی مسائل (ص: ۲۱۔۲۲) بتصرّف.

ان کی اولاد میں اپنا حصہ نکالوں گا اور ان کو فریب دے کر ایسا پرچاؤں گا کہ وہ ان ساری چیزوں کا ایک معتد بہ حِصّہ میری راہ میں صَرف کریں گے۔ مزید شیطان نے جو اس وقت کہا تھا، اُسے اللہ تعالیٰ نے اگلی آیت میں یوں بیان فرمایا ہے:

﴿وَ لَاُضِلَّنَّهُمْ وَ لَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ﴾ [النساء: ١١٩]

''میں انھیں بہکاؤں گا۔ میں انھیں آرزوؤں میں اُلجھاؤں گا، میں انھیں حکم دوں گا اور وہ میرے حکم سے جانوروں کے کان پھاڑیں گے اور میں انھیں ضرور حکم دوں گا اور وہ میرے حکم سے اللہ کی بخشی ہوئی ساخت و بناوٹ میں ردّ و بدل کریں گے۔''

آیت کے اس حصے میں جو شیطان کی ڈھینگیں نقل کی گئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ وہ جانوروں کے کان پھاڑیں گے۔ یہاں اہلِ عرب کے توہّمات میں سے ایک توہم کی طرف اشارہ ہے۔ ان کے ہاں قانون تھا کہ اونٹنی پانچ بچے یا دس بچے جَن لیتی تو اس کے کان پھاڑ کر اُسے اپنے دیوتا کے نام پر چھوڑ دیتے اور اس سے کوئی کام لینا حرام سمجھتے تھے۔ اسی طرح جس اونٹ کے نطفے سے دس بچے ہو جاتے، اُسے بھی کسی دیوتا کے نام پر کان چیر کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ یہ کان چیرنا اس بات کی علامت تھی کہ یہ کسی دیوتا کے نام پر چھوڑا ہوا جانور ہے، جس کا پھر دوسرے لوگ بھی احترام کیا کرتے تھے۔

یہ دراصل شیطان کی سکھائی ہوئی چال تھی۔ دَورِ جاہلیت کی یہ مشرکانہ رسم تھوڑی سی شکل بدل کر آج بھی برّصغیر میں موجود ہے (البتہ علاقے اور ماحول کی مناسبت سے دیوی اور دیوتاؤں کی جگہ مزاروں نے اور اونٹوں، اونٹنیوں کی جگہ بیلوں اور گائیوں نے لے رکھی ہے)۔

یہاں جو دوسری بات کہی گئی ہے کہ اللہ کی بخشی ہوئی ساخت و بناوٹ میں ردّ و بدل کریں گے، اس کے مفاہیم و مطالب میں سے ایک یہ بھی ہے کہ لوگ کسی نہ کسی طرح اللہ کی بخشی ہوئی ساخت و بناوٹ میں تبدیلی کریں گے۔ ہمارا محلِ استشہاد یہی الفاظ ہیں کہ عورتوں کا مصنوعی بالوں کے جوڑے اور مرد و زن سب کا طرح طرح کی وِگوں کا استعمال کرنا بھی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ساخت میں تغیّر و تبدّل ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے شیطانی فعل قرار دیا ہے اور شیطانی فعل کو اپنانے والے کے بارے میں اسی آیت (١١٩) میں اللہ تعالیٰ نے وعید سُناتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿وَ مَنْ يَّتَّخِذِ الشَّيْطٰنَ وَلِيًّا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَقَدْ خَسِرَ خُسْرَانًا مُّبِيْنًا﴾

''اور جس نے اللہ کے بجائے اس شیطان کو اپنا ولی و سرپرست بنا لیا ہے، وہ صریح نقصان میں پڑ گیا۔''

قرآنِ کریم کے اِس مقام پر اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی ساخت کو تبدیل کرنے کے شیطانی فعل قرار دیے جانے کے پیشِ نظر اسلام نے مرد و زن ہر دو کے لیے زینت کی خاطر اپنے اصل بالوں کے ساتھ کسی دوسرے کے اصلی یا مصنوعی طریقے سے بنائے گئے بالوں کو جوڑنا حرام قرار دیا ہے۔ موجودہ دَور میں جو مصنوعی بالوں کے رنگا رنگ جُوڑوں کا استعمال عورتوں اور طرح طرح کی وِگوں کا استعمال مردوں اور عورتوں سب میں عام ہو چکا ہے، یہ مطلقاً ناجائز و حرام ہے، بلکہ اہلِ علم نے اسے کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن حجر ہیتمی رحمہ اللہ نے کبیرہ گناہوں کے موضوع پر ایک کتاب: "الزواجر عن اقتراف الكبائر" لکھی ہے، اس میں انھوں نے چار سو اڑسٹھ (۴۶۸) گناہوں کو کبیرہ گناہ شمار کیا ہے۔ جن میں باطنی اعمال سے تعلق رکھنے والے کبائر بھی ہیں۔ جیسے شرک، ریا، نفاق وغیرہ اور ظاہری اعمال سے تعلق رکھنے والے بھی جیسے زنا کاری، شراب نوشی اور رشوت خوری وغیرہ ہیں۔

موصوف نے اس کتاب کی جلد اوّل میں کبیرہ گناہ (نمبر ۸۰) اِسی مصنوعی جُوڑے یا وِگ کے استعمال کرنے کو شمار کیا ہے۔[1]

کبائر کے موضوع پر شیخ احمد بن حجر آل بوطامی آف قطر نے حال ہی میں ایک کتاب "تطهير المجتمعات من أرجاس الموبقات" کے نام سے لکھی ہے، جس کا اردو ترجمہ بھی بمبئی کے ایک اشاعتی ادارے الدار السّلفیہ نے ''معاشرے کی مہلک بیماریاں اور ان کا علاج'' کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ اس میں اسّی (۸۰) کبیرہ گناہوں کو منتخب کر کے قرآن و سنت کی رو سے ان کی قباحت و ممانعت بیان کی گئی ہے، اس میں کبیرہ نمبر (۷۰) "وصل الشَّعر"، یعنی بال جوڑنا یا وگ کا استعمال کرنا ہی ہے۔[2]

دنیا کی معروف اور قدیم یونیورسٹی ''جامعہ ازہر قاہرہ'' نے آج سے مدّتوں پہلے جب

---

[1] الزواجر (١/ ١٤) دار المعرفة بيروت.

[2] تطهير المجتمعات عربی (ص: ۳۱۲) معاشرے کی مہلک بیماریاں (ص: ٦٧٨) ترجمہ مولانا نصیر احمد ملّی.

امریکہ و یورپی ممالک میں مقیم مسلمانوں کی راہنمائی اور وہاں کے غیر مسلم لوگوں کو اسلامی تعلیمات سے متعارف کروانے کے لیے ایک پروگرام بنایا اور مختلف علما کو مختلف موضوعات پر کتابیں لکھنے پر متعین کیا، جنھیں انگلش ترجمہ کرکے ان ممالک میں پہنچایا جانا طے پایا تو قطر میں مقیم عرب ممالک کے معروف اسکالر ڈاکٹر یوسف قرضاوی کے ذمّے یہ لگایا گیا کہ وہ ''اسلام میں حلال و حرام'' کے موضوع پر کتاب لکھیں گے۔ چنانچہ ۱۳۸۰ھ = ۱۹۶۰ء میں ''الحلال و الحرام في الإسلام'' کے نام سے ان کی کتاب شائع ہوئی، جس کے اب تک بیسیوں اڈیشن چھپ چکے ہیں اور دُنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہوچکی ہے، حتیٰ کہ الدار السلفیۃ بمبئی نے اسے اردو میں بھی شائع کر دیا ہے۔ اس میں موصوف نے بھی مصنوعی بالوں کے جوڑوں یا وِگوں کو ممنوع اشیا میں شمار کیا ہے۔[1]

اس فعل کی حرمت وممانعت پر یوں تو صرف قرآنِ کریم میں سورۃ النساء (آیت: ۱۱۹) کے الفاظ کی دلالت بھی کافی ہے، جب کہ اس پر مستزاد نبیِ اکرم ﷺ کی متعدد احادیث بھی ہیں، جن میں اس فعل کو ناجائز وممنوع قرار دیا گیا ہے اور اس کا ارتکاب کرنے والوں پر لعنت کی گئی ہے، بلکہ بعض احادیث میں تو یہاں تک مذکور ہے کہ اس فعل کا ارتکاب کرنے والوں پر اللہ نے لعنت فرمائی۔ یہ فعل چونکہ عموماً زیادہ تر عورتوں میں پایا جاتا ہے، اس لیے احادیث میں جو صیغے آئے ہیں، وہ مونث ہی کے ہیں، مگر اس فعل کا ارتکاب اگر کوئی مرد کرے تو وہ بھی ان احادیث کا مصداق ہو کر ملعون ہوتا ہے، کیوں کہ مونث کے صیغے محض تغلیباً ہیں، ورنہ حکم سب کے لیے برابر ہے، بلکہ ڈاکٹر یوسف قرضاوی کے بہ قول: ''مرد کا اس تحریم میں دخول تو بہ درجہ اولیٰ ہے۔''[2]

وہ چاہے خود وِگ استعمال کرے یا کسی دوسرے مرد و زن کے لیے وِگ تیار کرے اور اس کی کنگھی پٹی کرے۔ اس موضوع کی متعدد احادیث کئی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہیں۔

1 صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

---

[1] دیکھیں: ''الحلال و الحرام في الإسلام'' ڈاکٹر یوسف القرضاوی (ص: ۸۸۔ ۹۰) طبع المکتب الإسلامي و مترجم اردو از مولانا شمس پیر زادہ (ص: ۱۲۱۔ ۱۲۳) طبع الدار السلفیۃ بمبئی.

[2] الحلال و الحرام (ص: ۸۹)

''نبی ﷺ نے بال جوڑنے اور جڑوانے والی پر لعنت فرمائی ہے۔''[1]

2 سنن نسائی اور مسندِ احمد میں صحیح سند سے حضرت مسروق رحمہ اللہ بیان فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس ایک عورت آئی اور کہنے لگی:

''مجھے اطلاع ملی ہے کہ آپ بال جوڑنے سے منع کرتے ہیں؟'' انھوں نے کہا: ہاں، تو اس عورت نے کہا: ''کیا اس کے بارے میں قرآن کریم سے کوئی دلیل پاتے ہو یا تم نے نبیِ اکرم ﷺ سے کچھ سُنا ہوا ہے؟''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا:

''میں اس کی ممانعت کی دلیل کتاب اللہ میں بھی پاتا ہوں اور رسول اللہ ﷺ سے بھی اس کی ممانعت کے بارے میں سُن چکا ہوں۔''

اُس عورت نے کہا:

''اللہ کی قسم! میں نے قرآن کریم کی اوّل تا آخر ورق گردانی کی ہے، مجھے تو وہ کچھ نہیں ملا جو تم کہتے ہو۔''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: کیا تمھیں قرآنِ کریم میں سورۃ الحشر کی آیت (۷) میں یہ الفاظ نہیں ملے ہیں:

﴿وَمَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾

''رسول اللہ تمھیں جس کا حکم دیں اُسے اختیار کرلو اور آپ جس سے منع کر دیں اس سے رک جاؤ۔''

اس عورت نے کہا ہاں تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''میں نے نبیِ کریم ﷺ کو بال جوڑنے سے منع فرماتے ہوئے سُنا ہے۔''

---

[1] صحيح البخاري مع فتح الباري (١٠/ ٣٧٨) صحيح مسلم مترجم أُردو (٥/ ٣٣٣ ترجمه علامه وحيد الزمان) صحيح سنن النسائي للألباني، رقم الحديث (٤٧١٦) صحيح سنن أبي داود، للألباني، رقم الحديث (٣٥١٣) صحيح سنن الترمذي للألباني، رقم الحديث (١٤٤١ و ٢٢٣٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٨٧) غاية المرام في تخريج أحاديث الحلال و الحرام للألباني (ص: ٧٤ـ ٧٥ المكتب الإسلامى)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس طرح قرآن و سنت دونوں کی رُو سے اس فعل کو ممنوع ثابت کر دیا، تو اس عورت نے کہا: ''ممکن ہے کہ آپ کے گھر کی عورتوں میں سے کوئی ایسا کرتی ہو۔'' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اندر جا کر دیکھ لو، وہ عورت ان کے گھر میں داخل ہوئی اور جب دیکھ بھال کر باہر آئی تو کہنے لگی: ''مجھے ایسی کوئی (قابلِ اعتراض) چیز نظر نہیں آئی۔''

تب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: (اگر میرے گھر میں ایسی کوئی چیز پائی جاتی) تو پھر میں نے ایک بندہ صالح کی وصیت کو کیا اپنایا ہوتا، جنھوں نے فرمایا تھا:

''میں نہیں چاہتا کہ جس چیز سے میں تمھیں منع کروں، خود اسی میں تمھاری خلاف ورزی کروں۔''[1]

ایک عورت اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے مابین رونما ہونے والے مکالمے کی شکل کے اس واقعے میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بال جوڑنے یا وِگ لگانے کو پہلے قرآنِ کریم، پھر حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ممنوع ثابت کیا اور پھر اس کے ممنوع ہونے کا اپنے گھر کی عورتوں سے عملی ثبوت بھی مہیّا فرمایا۔ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَ عَنْ اَهْلِ بَيْتِهٖ وَأَرْضَاهُمْ.

3 اس موضوع کی تیسری حدیث صحیح بخاری اور مسندِ احمد میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں مذکور ہے:

''اللہ بال جوڑنے اور جڑوانے والی عورت پر لعنت کرے۔''

3 چوتھی حدیث صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی اور مسندِ احمد میں امّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انصار کی ایک لڑکی کی شادی ہوئی، جبکہ کسی بیماری کی وجہ سے اس کے سر کے بال گر چکے تھے، اس کے گھر والوں نے چاہا کہ (دُلہن بناتے وقت) اس کے سر پر کوئی دوسرے بال جوڑ دیے جائیں۔ (لیکن یہ کام کرنے سے پہلے) انھوں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلے میں استفسار کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے بال جوڑنے اور جڑوانے والی عورت پر لعنت کی ہے۔''

[1] صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٧١٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٨٩) ولكن عن علقمة عن عبدالله، صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥١٣)

اس واقعے سے معلوم ہوا کہ آئے دن وِگیں بدلنے والے مرد و زن تو کُجا، نبیِ اکرم ﷺ نے تو کِسی ایسی عورت کو بھی دوسرے بال لگوانے یا بالفاظ دیگر وِگ لگانے کی اجازت نہیں دی، جس کے بال کِسی بیماری کی وجہ سے گر چکے ہیں اور خواہ وہ پہلی شب کی دُلہن ہی کیوں نہ ہو۔

5 صحیح بخاری و مسلم اور مسندِ احمد میں امّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بہن حضرت اسماء رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ کِسی عورت نے نبیِ اکرم ﷺ سے پوچھا: اے اللہ کے رسول! میری بیٹی کو خسرے کی بیماری لگنے سے اس کے بال گر گئے ہیں۔ میں نے اس کی شادی کر دی ہے تو کیا میں اس کے بالوں کے ساتھ دوسرے بال جوڑ دوں؟'' تو نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے بال جوڑنے اور جڑوانے والی عورت پر لعنت کی ہے۔''[1]

6 صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی اور مسند احمد میں مروی ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ جب آخری مرتبہ مدینہ طیبہ آئے تو خطبے کے دوران میں انھوں نے بالوں کا ایک گُچھا نکالا اور فرمایا:

''میں نے یہودیوں کے علاوہ کسی کو اس فعل (بال جوڑنے) کا ارتکاب کرتے نہیں دیکھا اور نبیِ اکرم ﷺ نے بالوں کے جوڑنے کے اس فعل کو سراسر جھوٹ (دھوکا) قرار دیا ہے۔''[2]

7 حضرت امیر معاویہ بن ابو سفیان رضی اللہ عنہ نے بر سر منبر اپنے ایک خادم کے ہاتھ سے بالوں کا گُچھا لے کر لہرایا اور فرمایا:

''تمھارے علما کہاں گئے ہیں (جو تمھیں اس کے بارے میں شرعی حکم بتائیں؟)۔ میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو اس سے منع کرتے اور یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے:

''بنی اسرائیل کی عورتوں نے جب ان (مصنوعی جُوڑوں اور وِگوں) کا استعمال اپنایا تو وہ لوگ ہلاک ہوگئے۔''[3]

---

[1] صحيح البخاري (١٠/ ٣٧٨) صحيح مسلم مترجم اردو (٥/ ٣٣٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٨٨) غاية المرام (ص: ٧٩)

[2] صحيح البخارى مع الفتح (١٠/ ٣٧٤) صحيح مسلم مترجم (٥/ ٣٣٤، ٣٣٥) و صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٧١٤) غاية المرام (ص: ٧٩۔ ٨٠)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (٥٩٣٢) مختصر صحيح مسلم للمنذري بتحقيق الألباني، رقم الحديث (١٣٨٥) بحواله صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٣٧٥) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥١١)

فتح الباری میں اس حدیث کی شرح میں حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ حدیث جمہور کی دلیل ہے، جو کہتے ہیں کہ بالوں کے ساتھ دوسرے بال یا کوئی اور چیز جوڑنا منع ہے، چاہے کوئی بھی کیوں نہ ہو اور اس کی تائید صحیح مسلم اور مسند احمد میں مذکور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

''نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عورت کو ڈانٹا، جس نے بالوں کے ساتھ کسی بھی دوسری چیز کو جوڑا۔''[1]

آگے چل کر انھوں نے امام لیث رحمہ اللہ اور دیگر فقہا سے نقل کیا ہے کہ وہ صرف بالوں کی ممانعت کے قائل ہیں۔ دوسری چیز کی ممانعت کے نہیں، جیسے دھاگا وغیرہ ہے، آگے سنن ابی داود کے حوالے سے حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

''اونی یا ریشمی دھاگے جوڑنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔''

امام احمد رحمہ اللہ کا بھی یہی مسلک بتایا ہے اور حضرت سعید رحمہ اللہ کے اس قول کی سند کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے۔[2] جب کہ بعض دیگر محدّثین کے نزدیک یہ سند ضعیف ہے۔[3] لہٰذا قابلِ حجت نہیں، ویسے بھی یہ ایک تابعی کا قول ہے، جبکہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ والی مرفوع حدیث اس کے مخالف ہے، نیز یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ والی صحیحین کی حدیث کے مفہوم اور صحیح مسلم ومسند احمد میں حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کی ''الزُّوْر'' کی تشریح کے بھی مخالف ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ ''الزُّوْر'' سے مراد وہ اشیا ہیں، جن سے عورتیں اپنے بالوں کو بڑھاتی ہیں۔[4]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ بالوں کو زیادہ ثابت کرنے کے لیے دوسرے بال جوڑے جائیں یا کبھی کوئی دھاگا وغیرہ، یہ سب ممنوع ہے۔ بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ اگر کوئی بالوں کے ساتھ دوسری کوئی چیز اس طرح جوڑے، جس سے یہ دھوکا ہو کہ سب اصلی بال ہی ہیں تو یہ ممنوع ہے اور اگر اصلی بال اور یہ ساتھ جوڑی جانے والی چیز دونوں الگ نظر آتی ہوں تو پھر یہ جائز ہے۔[5]

---

[1] صحيح مسلم مترجم اردو (٥/ ٣٣٤)

[2] فتح الباري (١٠/ ٣٧٥)

[3] غاية المرام (ص: ٨١)

[4] فتح الباري (١٠/ ٣٧٥) غاية المرام (ص: ٧٨)

[5] فتح الباري (١٠/ ٣٧٥)

خود حافظ ابنِ حجر نے اس بات کو قوی قرار دیا ہے، لیکن یہ بھی ان کا اور بعض دیگر علما کا محض خیال ہے۔ ورنہ احادیث کے الفاظ میں ایسی کوئی صراحت نہیں ملتی، حتیٰ کہ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اگر کوئی عورت اپنے شوہر کی اجازت اور اس کے حکم سے دوسرے بال یا کوئی بھی چیز لگالے تو جائز ہے، مگر حافظ عسقلانی کے بقول ''باب وصل الشعر'' میں مذکور احادیث ان کے خلاف ہیں۔[1]

جب کہ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں جو حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، اس بات کی واضح طور پر تردید موجود ہے، کیوں کہ اس حدیث میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں:

''میری بیٹی کا شوہر مجھے اس بات پر برانگیختہ کرتا تھا (کہ میں کچھ جوڑوں) کیا میں کوئی چیز جوڑوں؟ تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بال جوڑنے اور جڑوانے والی عورت کو بُرا کہا۔''[2]

وِگ لگانے کی ممانعت:

وِگ کے استعمال کو کبار معاصرین اہلِ علم نے بھی اپنے فتاویٰ میں ناجائز قرار دیا ہے۔ مثلاً فتویٰ صادر کرنے والے متعدد مفتیانِ کرام پر مشتمل دائمی کمیٹی نے بھی اس کے عدمِ جواز کا فتوی دیا ہے اور یاد رہے کہ اس کمیٹی میں شیخ ابن باز رحمہ اللہ اور انھی جیسے دیگر بلند پایہ علما شامل ہیں۔ خاص کر شیخ ابن باز رحمہ اللہ اور دوسرے معروف سعودی عالم شیخ محمد بن صالح العثیمین نیز بعض دیگر اہلِ علم نے بھی ایسا ہی فتویٰ دیا ہے۔[3]

عورتوں کو بال کٹوانے کی ممانعت:

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لیں کہ جس طرح عورتوں کا اپنے اصل بالوں کے ساتھ کوئی دوسرے بال جوڑنا حرام ہے، اُسی طرح عورتوں کا بال منڈوانا بھی حرام ہے، سوائے کسی عذر و مجبوری کے، کیوں کہ طبرانی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«نَهَىٰ النَّبِيُّ ﷺ أَنْ تحْلِقَ الْمَرْأَةُ رَأْسَهَا»

''نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو اپنا سر مونڈنے سے منع فرمایا ہے۔''

---

[1] فتح الباري (۱۰/ ۳۷۵)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (۱۰/ ۳۷٤)

[3] فتاویٰ اسلامیه (۳/ ۱۷۹۔ ۱۸۱۔ ۲۰۲۔ ۵۰۲) طبع دار القلم۔ بیروت.

جب کہ سنن ابی داود میں مسائلِ حج میں ایک روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، اس حدیث کے الفاظ ہیں:

«لَيْسَ عَلَى النِّسَاءِ حَلْقٌ، وَإِنَّمَا عَلَى النِّسَاءِ التَّقْصِيرُ»[1]

''عورتوں پر سر مونڈنا نہیں ہے۔ ان پر (حج و عمرے کے موقع پر) صرف (تھوڑے سے) بالوں کا کاٹنا ہے۔''

ان دونوں حدیثوں سے عورتوں کا اپنے بالوں کو مونڈنا تو بالصراحت ناجائز ثابت ہوا، جب کہ ان کا بالوں کو کاٹنا اور تراش خراش سے مختلف ڈیزائنوں میں بدلنا بھی منع ہے، کیوں کہ عورتوں کا بالوں کی ایسی تراش خراش کرنا مردوں سے مشابہت پیدا کرنے کے مترادف ہے اور ایسی عورتوں پر جو کسی بھی طرح مردوں سے مشابہت پیدا کریں، نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے اور جو مرد اپنے کسی فعل سے عورتوں سے مشابہت پیدا کریں، ان پر بھی لعنت کی گئی ہے، چنانچہ صحیح بخاری، سنن ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی، مسندِ طیالسی اور مسندِ احمد میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«لَعَنَ النَّبِيُّ ﷺ... الْمُتَرَجِّلَاتِ مِنَ النِّسَاءِ»[2]

''نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں سے مشابہت کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔''

جبکہ صحیح بخاری میں یہ الفاظ بھی ہیں:

«لَعَنَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ الْمُتَشَبِّهِينَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ وَالْمُتَشَبِّهَاتِ مِنَ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ»[3]

''نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے مشابہت پیدا کرنے والے مردوں پر اور مردوں سے مشابہت پیدا کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔''

سنن ابی داود میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ارشادِ نبوی ہے:

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٩٨٤ و ١٩٨٥) سلسلة الأحاديث الصحيحة للألباني (٦٠٥ طبع بيروت.

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١٠/ ٣٣٣) بحواله حجاب المرأة المسلمة للألباني (ص: ٦٧، طبع المكتب الإسلامي- بيروت) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٣١) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٣٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٠٤)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (١٠/ ٣٣٢) و حجاب المرأة المسلمة أيضاً.

«لَعَنَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ الرَّجُلَةَ مِنَ النِّسَاءِ»[1]

''نبیِ اکرم ﷺ نے مردوں سے مشابہت پیدا کرنے والی عورت پر لعنت فرمائی ہے۔''

اس موضوع کی اور بھی کئی احادیث ہیں۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک غلط فہمی کی طرف بھی اشارہ کر دیا جائے کہ صحیح مسلم میں حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں:

"كَانَ أَزْوَاجُ النَّبِيِّ ﷺ يَأْخُذْنَ مِنْ رُؤُوسِهِنَّ حَتَّى تَكُوْنَ كَالْوَفْرَةِ"[2]

''نبیِ اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن اپنے سروں کے بال لمبائی سے لے لیتی تھیں، یہاں تک کہ وہ وفرہ کی مانند ہو جاتے۔''

''وفرہ'' ایسے بالوں کو کہا جاتا ہے جو کانوں تک ہوں۔ بال اس سے زیادہ لمبے اور کندھوں تک پہنچتے ہوں تو انھیں ''لِمّہ'' اور اس سے بھی لمبے ہوں تو انھیں ''جُمّہ'' کہا جاتا ہے۔ بعض علما کے نزدیک اس کے برعکس ''وفرہ'' وہ بال ہیں، جو سب سے زیادہ لمبے ہوں اور پھر اس کے بعد ''لِمّہ'' اور پھر جُمّہ جو سب سے چھوٹے ہوں۔

حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ نے ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (جلد ۴۱ شمارہ ۳۶ بابت ۶ صفر ۱۴۱۰ھ بہ مطابق ستمبر ۱۹۸۹ء) میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا تھا:

''ازواجِ مطہّرات کے اس فعل کے بارے میں شارحینِ حدیث نے یہ صراحت کی ہے کہ ان کا یہ فعل نبیِ اکرم ﷺ کی وفات کے بعد کا ہے اور اس سے ان کا مقصود ترکِ تزیّن تھا، کیونکہ لمبے بال حُسن و زینت میں شمار ہوتے ہیں، جس سے وہ بچنا چاہتی تھیں۔''

آگے چل کر موصوف لکھتے ہیں:

''تاہم اس کے ساتھ ساتھ شارحینِ حدیث نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ عورتیں اپنے بال ہلکے کر سکتی یعنی کاٹ سکتی ہیں۔ "فِيهِ دَلِيْلٌ عَلَى جَوَازِ تَخْفِيفِ الشُّعُوْرِ لِلنِّسَاءِ"''[3]

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٤٥٥) حجاب المرأة المسلمة (ص: ٦٨)

[2] صحيح مسلم شرح النووي (٤/ ٤)

[3] شرح النووي علىٰ صحيح مسلم (١/ ١٤٨) فتح الملهم (١/ ٤٧٢) مختصر صحيح مسلم للمنذري بتحقيق علامه الباني (ص: ٥٠) السراج الوهاج (١/ ١٢٦) إكمال المعلم المعروف شرح الأبي (١/ ٩٦)

آگے حافظ صاحب موصوف نے لکھا ہے:

''ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کے اس طرزِ عمل سے اس امر کا جواز تو یقیناً معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں ایسے بال رکھ سکتی ہیں، جنھیں ہمارے ہاں عام طور پر پٹے کہا جاتا ہے۔ تاہم اس سے نوجوان عورتوں کے بالوں کے فیشن کا جواز ہرگز نہیں نکلتا، جو ایک تو وفرہ (پٹے) کی تعریف میں نہیں آتے۔ دوسرے اس کی بُنیاد تبرّج (اظہارِ زیب و زینت) اور بے پردگی پر ہے۔ تیسرے اس سے مقصود مغربی عورتوں کی نقالی ہے۔ جو «مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ» کی رو سے ناجائز ہے۔ چوتھے اس میں بالعموم غیر محرم مردوں سے بال کٹوانے پڑتے ہیں، جو سراسر بے غیرتی کا مظاہرہ ہے۔

''ان وجوہِ اربعہ کے پیشِ نظر عورتوں کے بال کٹوانے کی موجودہ روش سراسر غیر اسلامی اور ناجائز ہے۔ اسی طرح بیوٹی پارلروں کا موجودہ کاروبار جو عورتوں میں بالوں کے مغربی فیشن اور بے پردگی کو عام کرنے کا باعث ہے، غلط اور ناجائز ہے۔ تاہم اگر کوئی عورت مذکورہ تمام قباحتوں سے بچتے ہوئے لمبے بال رکھنے کے بجائے پٹے بال رکھنا پسند کرے تو اس کا جواز موجود ہے۔''[1]

دیگر محققین کی رائے:

موصوف کے اس جواب میں موجودہ فیشن کی تردید تو بہر حال موجود ہے اور بالوں کی تراش و خراش سے مراد صرف فیشن کی پیروی ہی ہوتی ہے نہ کہ دوسری غرضِ شریف۔ جہاں تک وجوہِ اربعہ اور دیگر قباحتوں سے بچتے ہوئے پٹے بال کٹوانے کے جواز کا کہا گیا ہے اور امام نووی رحمہ اللہ اور دیگر شارحینِ حدیث (جن کی غالب اکثریت نے امام نووی رحمہ اللہ ہی کا قول نقل کر کے اسے برقرار رکھا ہے) کے اس جواز کو تسلیم کرنے کا ذکر کیا ہے، اسے بعض دیگر محقّق علماے کرام درست تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ الاعتصام (شمارہ ۴۵ جلد ۴۱ بابت ۱۰ ربیع الثانی ۱۴۱۰ھ بہ مطابق ۱۰ نومبر ۱۹۸۹ء) ہی میں استاذی شیخ الحدیث مولانا ثناء اللہ خاں مدنی (لاہور) نے ایک تفصیلی مضمون لکھا اور ثابت کیا کہ حافظ صلاح الدین یوسف صاحب اور دیگر شارحین کی رائے درست نہیں ہے۔ اسی طرح ایک فاضل

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' (جلد: ۴۱، شمارہ: ۴۶) لاہور۔

محقق مولانا ابو الاشبال صغیر احمد شاغف بہاری (مکہ مکرمہ) کا مکتوب بھی اسی شمارے میں شائع ہوا۔ مولانا موصوف نے اپنے مکتوب میں لکھا ہے:

''حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا میں جو علّت موجود ہے، یعنی بعد وفاتِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم انھوں نے ایسا کیا تو اسی حدیث سے استنباط بدونِ علّت ازروئے فقہ جائز نہیں۔ البتہ اس حدیث سے ان بیوہ عورتوں کے لیے جواز کی دلیل ہے، جو شادی کرنے کی بہ وجہ مجبوری خواہش مند نہ ہوں۔ بہ صورتِ دیگر اس سے جوازِ عام کی صورت میں محض مقلّدانہ اندھا پن ہے کہ جو اگلوں نے لکھ دیا، اگرچہ ان سے اس نص کے سمجھنے میں سہو ہوا ہو، ان کے بعد آنے والے آنکھ بند کرکے اُسی پر فتویٰ صادر کرتے چلے گئے۔ پھر اس حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا پر خیر القرون کی عورتوں یعنی امّہات المومنین کے علاوہ دیگر صحابیات اور تابعیات اور اس کے بعد میں اس پر عمل ہوا یا نہیں؟ کم از کم میری نظر سے تو اس پر عمل کرنے کا ثبوت نہیں گزرا، لہٰذا میری نظر میں یہ فتویٰ قابلِ گرفت و تصحیح ہے، یعنی جواز کی صورت صحیح نہیں۔ رہی یہ بات کہ عدمِ جواز کی بھی کوئی روایت ثابت ہے یا نہیں؟ تو اس سلسلے میں یہ عملی تواتر از عہدِ صحابیات تا ایں دم کافی ہے۔''

حافظ ثناء اللہ صاحب مدنی نے اپنے مُفّصل مضمون میں جس کا عنوان ''عورت معقول عذر کے بغیر سر کے بال نہیں کٹوا سکتی'' طویل بالوں سے متعلقہ ابتدائیہ کے بعد لکھا:

''اسلام میں جہاں تک مرد کے بالوں کا تعلّق ہے، اگرچہ بعض احادیث سے منڈوانے کا جواز مِلتا ہے، لیکن افضل و اولیٰ امر یہ ہے کہ بال رکھے جائیں اور صاف کرانے سے احتراز کیا جائے۔ بخاری و مسلم کی متفق علیہ حدیث سے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں کا اسوۂ حسنہ بیان کیا ہے کہ وہ نصف کانوں تک اور ایک روایت کی رُو سے کانوں اور کندھوں کے درمیان تھے۔ "مجمع البحار" سے اس اختلاف کی وجہ جمع یہ نقل کی ہے کہ ان دونوں روایتوں میں مذکور لمبائی کو مختلف اوقات پر محمول کیا جائے گا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بال کاٹنے میں تساہل برتتے تو کندھوں تک پہنچ جاتے اور جب کاٹتے تو کان تک ہوتے۔''

آگے حافظ صاحب لکھتے ہیں:

”اس سے معلوم ہوا کہ مردوں کے لیے بال رکھنے کا اندازہ اس حد بندی میں محدود ہے، جب کہ عورتوں کو یہ ہیئت اختیار کرنی ممنوع ہے، جس طرح کہ عورتوں کو مردوں سے تشبّہ اختیار کرنا ناجائز ہے۔“

آگے تشبّہ اختیار کرنے والی عورتوں پر لعنت کے ورود سے متعلقہ احادیث (جن میں سے بعض گزر چکی ہیں) نقل کرنے کے بعد صحیح مسلم والی موضوعِ بحث سے متعلق حدیث کے لفظ ”یَأْخُذْنَ“ کے بارے میں لکھا ہے:

”اس کا ترجمہ ضروری نہیں کہ کاٹنا ہی ہو (جیسا کہ حافظ صلاح الدین صاحب یوسف نے کہا ہے) احتمال ہے کہ اس کا معنیٰ یہ ہو کہ وہ اپنے بالوں کا خاص انداز میں جوڑا بنا لیتی تھیں، جو وفرہ کی شکل میں نظر آتے۔ مسائلِ طہارت سے اس معنیٰ کی مناسبت بھی ہے، کیوں کہ عورتیں عموماً غسل کے موقع پر ایسا فعل کرتی ہیں۔“

”پھر مصنف رحمہ اللہ (امام مسلم) کا اسے اس کے مناسب محل و مقام پر ذکر نہ کرنا بھی ہمارے مدّعا کا مؤیّد ہے، جب کہ صحیح مسلم اپنے حسنِ ترتیب اور سہل الماخذ ہونے میں معروف ہے۔ دوسری بات یہ کہ شرع میں وفرہ، لِمّہ، جُمّہ، بالوں کے اوصاف صرف مردوں کے لیے بیان ہوئے ہیں، عورتوں کے لیے نہیں۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بال حقیقتاً وفرہ نہ تھے۔ صرف دیکھنے میں وفرہ معلوم ہوتے تھے۔ اس لیے یہاں کافِ تشبیہ سے تعبیر کی گئی ہے۔ ”کَالْوَفْرَۃ“ یعنی وفرہ جیسے تھے۔

”اگر یہ بات تسلیم بھی کر لی جائے کہ ”یأخُذْنَ“ کا معنیٰ کاٹنا ہے تو یہ ازواجِ مطہّرات رضی اللہ عنہن کا خاصا ہوگا، کیونکہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اِن کی حیثیت معتدات (عدت گزارنے والیاں) جیسی تھی۔ قرآنِ مجید میں ہے:

﴿وَ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَ لَاۤ اَنْ تَنْكِحُوْۤا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖۤ اَبَدًا اِنَّ ذٰلِكُمْ كَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِیْمًا﴾ [الأحزاب: ٥٣]

”تمھارے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ اللہ کے رسول کو تکلیف دو، اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد ان کی بیویوں (ازواجِ مطہّرات) سے نکاح کرو۔ یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا

گناہ ہے۔تم خواہ کوئی بات ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ کو ہر بات کا علم ہے۔‘‘

’’قاضی عیاض رحمہ اللہ شارح صحیح مسلم نے اس بات کا اشارہ دیا ہے کہ ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فعل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد تھا اور صاحبِ تفسیر ’’أضواء البیان‘‘ نے امام نووی رحمہ اللہ کی پیروی میں بایں الفاظ کہا ہے:

’’وَهُوَ مُتَعَيِّنٌ وَلَا يُظَنُّ بِهِنَّ فِعْلُهُ فِي حَيَاتِهِ ﷺ‘‘ [1]

’’اس حکم کے پیشِ نظر ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سادگی اور ترکِ زینت کو ضروری سمجھ کر فعلِ ہذا کا ارتکاب کیا، تاکہ کلّی طور پر نکاح کے دواعی سے قطع و یاس ہو سکے۔ ہر دو صورت میں امام نووی رحمہ اللہ کے قول: ’’وَفِيهِ دَلِيلٌ عَلَى جَوَازِ تَخْفِيفِ الشُّعُورِ لِلنِّسَاءِ‘‘ ’’اس میں عورتوں کے بال ہلکے کرنے کی دلیل ہے۔‘‘ کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے کہ ان کا استدلال درست نہیں۔ بالخصوص جب انھوں نے خود بھی قاضی عیاض رحمہ اللہ کے موقف کو درست قرار دیا ہے۔ نیز اس میں تغییرِ لخلق اللہ اور مُثلہ کا شائبہ بھی موجود ہے، جو اس فعل سے مانع ہے۔ **واللہ أعلم.**‘‘

آگے حافظ ثناء اللہ صاحب مدنی لکھتے ہیں:

’’عام حالات میں اگر عورت کو بال کاٹنے کی اجازت ہوتی تو میرے خیال میں کم از کم حج کے موقع پر اس کو مونڈنے کا حکم ضرور ہونا چاہیے تھا، تاکہ «اللّٰهُمَّ ارْحَمِ الْمُحَلِّقِينَ» کی سعادت سے محروم نہ رہتی۔ اس کے برعکس معاملہ یہاں تک محدود ہے کہ ما سوائے چند بالوں کے سر کی تقصیر کی بھی اجازت نہیں تو عام حالات میں بلاوجہ بال کاٹنے کیسے جائز ہوں گے؟ ہرگز نہیں۔ البتہ کسی معقول علّت و عذر کی بنا پر یہ فعل جائز ہے، جیسے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نے بیماری کی وجہ سے اپنا سر منڈوایا تھا۔‘‘

﴿وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ﴾ [الأنعام: ١٠٦]

تفصیلی قصّہ صحیح ابن حبان میں گیارھویں نوع اور پانچویں قسم میں بھی موجود ہے۔ علامہ البانی کتاب ’’حِجَابُ الْمَرْأَةِ الْمُسْلِمَةِ‘‘ میں فرماتے ہیں:

---

[1] أضواء البیان علامه شنقیطي (٥/ ٥٩٨)

''بال کٹانے سے اگر غیر مسلموں کی مشابہت مقصود ہو تو حدیث «مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ» کی بنا پر ناجائز ہے، ورنہ جائز ہے۔''

''میرے خیال میں یہ بات بھی درست نہیں۔ وہ اس کی کوئی نئی دلیل بیان نہیں کر سکے، بلکہ بنیاد ازواجِ مطہّرات کے فعل پر ہے، جس کی معقول توجیہات پہلے بیان ہو چکی ہیں۔ نیز حدیث «مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ» کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اس کی جھلک فتاویٰ اہلِ حدیث میں موجود ہے:

''دراصل ہمارے ماحول اور معاشرے میں آج کل جو کچھ نظر آ رہا ہے، اسلامی تہذیب و تمدّن کا قطعاً اس سے کوئی تعلّق اور واسطہ نہیں۔ یہ خالصتاً مغربی اور استعماری تہذیب و تقلید کا نتیجہ ہے، جس کی یلغار میں بڑے بڑے بُرج بھی منہدم اور بہتے نظر آ رہے ہیں (نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ هٰذِهِ الْفِتَنِ)۔''[1]

پھر عورتوں کا مردوں سے مشابہت پیدا کرنا، بالوں کی تراش و خراش کے علاوہ بھی کئی طرح سے ممکن ہے، جس کی تفصیل کا یہاں اب موقع نہیں کہ یہ خارج از موضوع بات ہو جائے گی۔

مصنوعی بالوں کے جوڑوں اور وِگوں کی ممانعت کا تذکرہ ہو رہا ہے، جس کے آخر میں عورتوں کے بال منڈوانے اور کٹوانے کی ممانعت کا تذکرہ بھی آ گیا ہے۔ صحیح بخاری شریف میں ''باب وصل الشعر'' کے تحت امام بخاری رحمہ اللہ نے پانچ صحابہ و صحابیات رضی اللہ عنہم سے جو احادیث سات طُرق سے بیان کی ہیں، ان کی شرح کے آخر میں بطورِ نتیجہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''ان احادیث میں بالوں کو جوڑنے اور جڑوانے کو حرام قرار دینے کی رائے رکھنے والوں کے لیے دلیل ہے۔ بعض لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اس ممانعت کو نہی تنزیہی پر محمول کیا جائے، یہ ان کا واضح رد ہے، کیوں کہ کسی کام پر لعنت بھیجا جانا، اس کے حرام ہونے کے قوی دلائل میں سے ہے، بلکہ بعض لوگوں کے نزدیک لعنت بھیجا جانا تو اس فعل کے کبیرہ گناہ ہونے کی علامت ہے۔''

(جیسا کہ علامہ ہیتمی اور شیخ احمد آل بو طامی کی کبیرہ گناہوں پر مشتمل کتب کا تذکرہ ہم بھی

[1] ہفت روزہ ''الاعتصام'' (جلد: ۴۱، شمارہ: ۳۶) لاہور۔

کر چکے ہیں) آگے موصوف لکھتے ہیں:

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے طبرانی میں جو روایت نقل کی گئی ہے، جو ان کی طرف سے بالوں کو جوڑنے کی رخصت پر دلالت کرتی ہے، وہ باطل ہے، کیوں کہ یہاں بخاری شریف میں دلہن کو بھی بال جوڑنے کی اجازت نہ دینے والی حدیث شاہد ہے کہ وہ رخصت و اجازت کی قائل نہیں تھیں۔''[1]

حرمت ولعنت کا سبب:

وِگ کے استعمال کی حرمت یا مصنوعی جُوڑوں پر لعنت فرمائے جانے کی وجہ دراصل دجل وفریب، دھوکا دہی اور تغییر خلق اللہ ہے، خود نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فیشن یا فعل کو ''زُور'' یعنی جھوٹ اور فریب سے تعبیر فرمایا ہے، جیسا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں گزرا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر قسم کی جعل سازی اور فریب کاری سے بھی سختی سے منع فرمایا ہے، جیسا کہ صحیح مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، مستدرکِ حاکم، سنن بیہقی، مسندِ احمد اور بعض دیگر کتبِ حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک واقعہ مذکور ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر غلّے کے ایک ڈھیر کے قریب سے ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دستِ مبارک اس ڈھیر کے اندر گھُسا دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلیوں کو نمی سی لگی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلّے والے سے پُوچھا کہ معاملہ کیا ہے تو اس نے بتایا کہ اسے آسمان سے یہ نمی (بارش یا شبنم کی وجہ سے) پہنچی ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَفَلَا جَعَلْتَهُ فَوْقَ الطَّعَامِ كَيْ يَرَاهُ النَّاسُ؟»

''تم نے یہ گیلا غلّہ اُوپر کیوں نہ ڈال دیا، تاکہ لوگ اسے دیکھ لیتے؟''

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ مشہور و معروف الفاظ ارشاد فرمائے، جو زبان زدِ خاص وعام ہیں اور صحیح مسلم، مسند ابی عوانہ اور سنن ابی داود میں مروی ہیں:

«مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا» ''جس نے دھوکا دیا، وہ مجھ سے نہیں۔''

صحیح مسلم کی ایک دوسری روایت اور سنن ابن ماجہ میں یہ الفاظ منقول ہیں:

«مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنِّي» ''جس نے دھوکا دہی کی، وہ ہم سے نہیں۔''

---

[1] فتح الباري (١٠/ ٣٧٧)

صحیح مسلم کی تیسری روایت اور سنن ترمذی میں یہ الفاظ منقول ہیں:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ غَشَّ» ''جس نے دھوکا دہی کی، وہ ہم سے نہیں۔''

صحیح مسلم کی چوتھی روایت اور مستدرک حاکم میں یہ الفاظ منقول ہیں:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ غَشَّنَا» ''جس نے ہم سے دھوکا دہی کی، وہ ہم سے نہیں۔''

صحیح مسلم کی ایک پانچویں روایت، جو مسند احمد اور سنن بیہقی میں بھی مروی ہے، اس میں ارشادِ نبوی ﷺ کے الفاظ یہ ہیں:

«أَلَا مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا»[1]

''خبردار! جس نے ہم سے دھوکا دہی کی تو وہ ہم سے نہیں۔''

اِس حدیث کی یہ پانچ روایتیں ہیں، جن کے الفاظ ملتے جلتے ہیں، اور ان میں معمولی فرق ہے، لیکن معنیٰ سب کا ایک ہی ہے، ان میں سے جو الفاظ زبان زدِ خاص و عام ہیں، وہ «مَنْ غَشَّ فَلَيْسَ مِنَّا» ہیں۔ ان الفاظ میں «فَلَيْسَ مِنِّيْ» وہ مجھ سے نہیں۔ یا «فَلَيْسَ مِنَّا» وہ ہم سے نہیں، سے مراد یہ ہے کہ وہ میری امّت سے نہیں یا بالفاظ دیگر وہ امتِ اسلامیہ کا فرد نہیں۔ اندازہ فرمائیں کہ کتنی سخت وعید ہے؟

صحیح ابن حبان، طبرانی صغیر، طبرانی کبیر، حلیۃ الاولیا ابونعیم اور مسند الشہاب للقضاعی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

«مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا، وَالْمَكْرُ وَالْخَدِيْعَةُ فِي النَّارِ»[2]

''جس نے ہم سے دھوکا کیا، وہ ہم سے نہیں اور مکر وفریب کا انجام جہنّم ہے۔''

مجمع الزوائد میں امام ہیثمی رحمہ اللہ نے اس کی سند کے ایک راوی عاصم کو سوے حفظ والا قرار دیا ہے، جب کہ شیخ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے ''إرواء الغليل في تخريج أحاديث منار السبيل'' میں لکھا ہے:

---

[1] یہ حدیثِ ابو ہریرہ مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (١٢٣٥) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٩٤٦) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٦٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٢٢٤) إرواء الغليل (٥/ ١٦١) میں ملاحظہ فرمائیں۔

[2] إرواء الغليل (٥/ ١٦٤) موارد الظمآن لزوائد ابن حبان للهيثمي (١١٠٧) و السلسلة الصحيحة (١٠٥٨)

”ماہرینِ علمِ حدیث کے نزدیک یہ بات طے شُدہ ہے کہ یہ راوی حسن الحدیث ہیں اور ان سے حجت و دلیل لی جائے گی، خصوصاً جب کہ وہ دوسرے ثقہ راویوں کے موافق کوئی بات نقل کریں۔“

یہی وجہ ہے کہ امام منذری رحمہ اللہ نے ترغیب وترہیب میں جب یہ حدیث نقل کی تو کہا کہ اس کی سند جیّد ہے۔ امام ابو داود نے اپنی کتاب ”المراسیل“ میں حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے مرسلاً اور قدرے اختصار سے یہ حدیث یوں بیان کی ہے:

«اَلْمَكْرُ وَالْخَدِيعَةُ وَالْخِيَانَةُ فِي النَّارِ»[1]

”مکر وفریب اور خیانت کرنے والوں کا ٹھکانا جہنّم ہے۔“

امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”مصنوعی جُوڑوں اور وِگوں (نیز نقش کروانے اور بھنوؤں کے بال کاٹ یا چُن کر انھیں باریک کرنے) وغیرہ کے بارے میں سخت وعید اس لیے وارد ہوئی ہے کہ ان میں کھوٹ اور فریب ہے۔ اگر ان کی رخصت دے دی جاتی تو پھر یہ کھوٹ اور فریب کی دوسری صورتوں کو بھی جائز کر لینے کا وسیلہ و ذریعہ بن جاتیں، اس سخت وعید کی دوسری وجہ قدرتی ساخت میں ردّ و بدل کا پہلو بھی ہے۔“

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے الفاظ: «اَلْمُغَيِّرَاتِ خَلْقَ اللّٰهِ» سے بھی اس کا اشارہ ملتا ہے۔[2]

ان الفاظ والی جس حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ صحیح بخاری ومسلم میں ہے، جس میں کئی طرح کی عورتوں پر لعنت کی گئی ہے، جن میں سے ایک یہ بھی ہے:

«لَعَنَ اللّٰهُ... اَلْمُغَيِّرَاتِ خَلْقَ اللّٰهِ، مَا لِيَ لَا أَلْعَنُ مَنْ لَعَنَهُ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ مَلْعُونٌ فِي كِتَابِ اللّٰهِ»[3]

---

[1] مراسیل سنن أبي داود (ص:٨١ طبع معهد الشريعة كوٹ ادّو، تحقيق مولانا محمد عبده) و الإرواء (٥/ ١٦٤)

[2] فتح الباري (١٠/ ٢٨٠)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (١٠/ ٣٧٨) صحيح مسلم مترجم اُردو (٥/ ٣٣٣) آداب الزفاف للألباني (ص: ١٢٣)

”قدرتی ساخت میں ردّ و بدل کرنے والیوں پر اللہ کی لعنت ہو، مجھے کیا ہے کہ میں اس پر لعنت نہ کروں، جس پر نبیِ اکرم ﷺ نے لعنت کی ہے اور جو کتاب اللہ کی رُو سے بھی ملعون ہے۔“

کتاب اللہ میں لعنت سے مراد سورۃ النساء (آیت: ۱۱۷) میں مذکور لعنت ہے۔ وِگوں کے استعمال میں چونکہ فریب کاری اور دھوکا دہی ہے، لہٰذا مذکورہ حدیث کی رو سے یہ ممنوع وحرام اور کبیرہ گناہ ہے۔ اس کے علاوہ صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی اور مسندِ احمد میں حضرت سعید بن مسیّب سے مروی حدیث میں ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«مَا كُنْتُ أَرَى أَحَدًا يَفْعَلُ هٰذَا غَيْرَ الْيَهُوْدِ»[1]

”میں نے یہودیوں کے سوا کسی کو اس فعل کا ارتکاب کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔“

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے بیٹے حضرت حمید سے مروی حدیث میں ہے کہ خود نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«إِنَّمَا هَلَكَتْ بَنُو إِسْرَائِيْلَ حِيْنَ اتَّخَذَ هٰذِهِ نِسَاؤُهُمْ»[2]

”بنی اسرائیل کی عورتوں نے جب اس فعل کا ارتکاب شروع کیا تو وہ ہلاک ہوگئے۔“

معلوم ہوا کہ مصنوعی جوڑے اور وگیں لگانا یہودیوں کا فعل ہے، جو ان کی ہلاکت کے اسباب میں سے بھی ہے، لہٰذا جب بنی اسرائیل کی ہلاکت کے اسباب میں سے ایک یہ بھی ہے تو یہ مسلمانوں کے لیے روا کیسے ہوسکتا ہے؟ اس کے علاوہ جب یہ فعلِ یہود ہے تو اس کا ارتکاب کرنے والا یہودیوں کی مشابہت کرتا ہے، جو خود ممنوع ہے، کیوں کہ صحیح ابن حبان، سنن ابی داود اور مستدرکِ حاکم میں مذکور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی مشہور حدیث ہے:

«مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ»[3]

”جس نے کسی قوم کی مشابہت کی تو وہ انھیں میں سے ہے۔“

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٩/ ٦٦٧)

[2] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٩٥٣٢) صحيح مسلم مترجم أُردو (٥/ ٣٣٤)

[3] بحواله حجاب المرأة المسلمة (ص: ١٠٤) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٤٠١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٦١٤٩) و الإرواء (١٢٦٩)

وِگ پر مسح کا حکم:

قرآن وسنت پر مبنی دلائل کی رو سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ مصنوعی جوُڑے یا وگیں ناجائز وحرام ہیں اور ان کا ارتکاب کبیرہ گناہ ہے۔ یہ تو تھی ان کی شرعی حیثیت۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر عورت ایسا جوڑا لگا ہی لے یا کوئی مرد وزن ایسی وِگ لگا لے تو غسل اور وضو میں ان کا کیا حکم ہے؟ تو اس سلسلے میں عرض ہے کہ چونکہ ایسے جوُڑوں اور وِگوں کے بال جسم کا حِصّہ ہوتے ہیں نہ یہ کسی جائز صورت ومجبوری کی بنا پر لگائے جاتے ہیں اور نہ ان کا اتارنا چنداں دشوار ہوتا ہے، اس لیے ان کی حیثیت ایک خارجی چیز کی ہوگی، لہٰذا اگر کوئی عورت یا مرد وِگ لگائے ہوئے ہو اور وضو کرتے ہوئے سر کا مسح اس طرح کرے کہ ان مصنوعی بالوں کے اُوپر ہی مسح کر لے اور اصلی بالوں پر مسح نہ ہو پائے تو وہ کافی نہ ہوگا اور چونکہ سر کا مسح وضو کے فرائض و واجبات میں سے ہے، لہٰذا اس کا وضو صحیح نہیں ہوگا۔ اُسے مصنوعی جُوڑا یا وِگ اتار کر اپنے اصلی بالوں پر مسح کرنا ہوگا۔[1]

وِگ کے ساتھ غسل کی صورت:

غسل کے سلسلے میں مردوں کے لیے تو ضروری ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے بالوں والا ہو یا زلفوں والا، چاہے اس نے مینڈھیاں رکھی ہوئی ہوں، بہر حال بالوں کو کھول کر پورے بالوں کو بھی دھوئے گا اور سر کو بھی۔ لہٰذا مردوں کو تو بہر صورت وِگ اتار کر ہی غسل کرنا ہوگا، تا کہ سر کے اصل بال اور سر کی کوئی جگہ خشک نہ رہ جائے۔

عورتوں کا معاملہ اس سے کچھ مختلف ہے، کیوں کہ انھیں غسل کی بعض صورتوں میں کچھ رعایت دی گئی ہے۔ ہدایہ، بدائع الصنائع اور قدوری وغیرہ میں اس کی رعایت کو مطلق ہی قرار دے دیا گیا ہے کہ غسل چاہے کوئی بھی ہو، عورت کو اپنے سر کی چوٹی یا مینڈھیاں کھولنے کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ صاحبِ ہدایہ وقدوری لکھتے ہیں:

”وَلَيْسَ عَلَى الْمَرْأَةِ أَنْ تَنْقُضَ ضَفَائِرَهَا فِي الْغُسْلِ إِذَا بَلَغَ الْمَاءُ أُصُولَ الشَّعْرِ“[2]

”غسل کے دَوران میں اگر پانی بالوں کی جڑوں تک پہنچ جائے تو عورت کے لیے بالوں

[1] جدید فقہی مسائل (ص: ۲۹)

[2] هداية، و البدائع بحواله شرح قدوري: اللباب في شرح الكتاب (١/ ١/ ١٦)

کی مینڈھیاں کھولنا ضروری نہیں ہے۔‘‘

لیکن حقیقت یہ ہے کہ کتبِ فقہ میں مذکورہ اس اطلاق و توسّع کو احادیثِ رسولِ اکرم ﷺ غسلِ جنابت کے ساتھ مقیّد کر دیتی ہیں، کیوں کہ غسلِ حیض کے دَوران میں بالوں کو کھولنے کا حکم ثابت ہے اور غسلِ نفاس کا حکم بھی غسلِ حیض والا ہی ہے۔ چنانچہ سُنن ابن ماجہ اور مصنف ابن ابی شیبہ میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ وہ حیض سے تھیں اور جب غسل کا وقت آیا تو انھیں نبیِ اکرم ﷺ نے حکم فرمایا:

«اُنْقُضِيْ شَعْرَكِ وَاغْتَسِلِيْ»[1]

’’اپنے سر کے بالوں (مینڈھیوں وغیرہ) کو کھول دو اور غسل کرو۔‘‘

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی اس حدیث کو علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے ’’المحلّٰی‘‘ (۱/ ۲/ ۳۸) میں بھی روایت کیا ہے اور اسے اپنانے کو واجب قرار دیا ہے اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی وہ حدیث جس میں عورت کو غسلِ حیض و جنابت ہر دو میں بال نہ کھولنے کا حکم ہے، اُسے ساقط الاعتبار قرار دیا ہے اور ساقط ہونے کی وجوہات بھی ذکر کی ہیں۔

علامہ سندھی کے حاشیہ ابن ماجہ سے نقل کرتے ہوئے شیخ محمد فواد عبدالباقی نے لکھا ہے:

’’حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی وہ حدیث جس میں نبیِ اکرم ﷺ نے غسلِ حیض کے لیے سر کے بالوں کو کھولنے کا حکم فرمایا۔ اس کی اصل صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں موجود ہے۔‘‘[2]

چنانچہ صحیح بخاری میں امام صاحب موصوف نے ’’کتاب الحیض‘‘ میں جہاں اصل واقعہ ذکر کیا ہے، وہاں ’’بَابُ نَقْضِ الْمَرْأَةِ شَعْرَهَا عِنْدَ غُسْلِ الْمَحِيْضِ‘‘ کے تحت روایت کیا ہے کہ غسلِ حیض کے لیے عورت کا بالوں کے کھولنے کا حکم کیا ہے؟ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس کی شرح میں لکھا ہے:

’’اس حدیث کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ حائضہ پر اپنے بالوں کو کھول کر غسل کرنا واجب

---

[1] سنن ابن ماجه بتحقيق محمد فؤاد عبدالباقي (١/ ٢١٠) مصنّف ابن أبي شيبة (١/ ٧٩) طبع الدار السلفية بمبئى.

[2] تحقيق سنن ابن ماجه (١/ ٢١٠)

ہے۔ حضرت حسن بصری، امام طاؤس اور امام احمد رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے اور علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے اسے صحیح کہا ہے۔ البتہ امام احمد کے اصحاب میں سے ایک جماعت نے بالوں کو کھولنا مستحب قرار دیا ہے، واجب نہیں کہا اور جمہور کا مسلک بھی عدمِ وجوب کا ہے۔''[1]

امام مسلم رحمہ اللہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے واقعہ والی مذکورہ حدیث کتاب الحج میں روایت کی ہے، جس پر امام نووی رحمہ اللہ نے ''بیانُ حجِّ الحائض'' کے الفاظ سے تبویب کی ہے۔[2]

اس سے معلوم ہوا کہ حیض و نفاس کی صورت میں اصل بالوں کی چوٹیوں کو بھی کھولنے ہی کا حکم ہے تو مصنوعی جوڑے یا وِگ کو بھی اتارے بغیر غسل صحیح نہیں ہوگا اور غسل کے وقت تو شاید اسے رکھتا بھی کوئی نہیں، بلکہ اتار ہی لیا جاتا ہے، کیوں کہ اس کا اتارنا کوئی مشکل تو ہوتا نہیں۔ اصل مسئلہ وضو کا تھا تو وہ الحمد للہ ذکر ہوگیا کہ وِگ وغیرہ کو اتارے بغیر وضو صحیح نہیں ہوتا۔ غسلِ جنابت میں عورتوں کو رخصت دی گئی ہے کہ وہ بے شک بالوں کی چوٹیاں نہ کھولیں۔ چنانچہ صحیح مسلم، سننِ اربعہ اور مسندِ احمد میں حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں اپنے بالوں کو خوب مضبوطی سے گوندتی یا مینڈھیاں بناتی ہوں۔ کیا غسلِ جنابت کے لیے میں انھیں کھولا کروں تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا، إِنَّمَا يَكْفِيكِ أَنْ تَحْثِيَ عَلَىٰ رَأْسِكِ ثَلَاثَ حَثَيَاتٍ ثُمَّ تُفِيضِينَ عَلَيْكِ الْمَاءَ فَتَطْهُرِينَ»[3]

''نہیں تمھارے لیے بس اتنا کافی ہے کہ تین چلّو پانی اپنے سر پر ڈال لو اور پھر سارے بدن پر پانی بہالو۔ تم پاک ہو جاؤ گی۔''

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا ہی سے ایک روایت میں جنابت کے ساتھ حیض کا لفظ بھی مروی ہے، جسے امام نووی رحمہ اللہ نے ''ليس بشيء'' کہا ہے۔ اس موضوع کی بعض دیگر تفصیلات ''المنهاج

---

[1] فتح الباري (١/ ٤١٨) معالم السنن للخطّابی (١/ ١٦٦ دار المعرفة)

[2] دیکھیں: صحيح مسلم مع شرح النووي (٤/ ٨/ ١٣٨۔ ١٣٩)

[3] صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ١١) الفتح الرباني (٣/ ١٣٥) مختصر سنن أبي داود للمنذري (١/ ١٦٦) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٩٢) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٢٣٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٠٣)

شرح صحیح مسلم بن الحجاج للنووي" (۲/ ٤/ ۱۱۔ ۱۲) "المحلی لابن حزم" (۱/ ۲/ ۳۸۔ ۳۹) اور "تهذيب السنن القيم" (۱/ ۱٦٥ تا ۱٦۸) میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

الغرض غسلِ جنابت کی صورت میں وِگ نہ اتارنے کی تو گنجایش ہے، بشرطیکہ پانی اصل بالوں کی جڑوں تک پہنچ سکتا ہو اور سر خشک رہ جانے کا خدشہ نہ ہو۔ ویسے ایسی اشیا کو اتارا ہی جاتا ہے کہ خراب نہ ہو جائیں، مگر مسئلہ اپنی جگہ موجود ہے۔

غسلِ حیض و جنابت میں فرق کی توجیہ:

غسلِ حیض و جنابت میں جو یہ فرق کیا گیا ہے، اہلِ علم نے اس کی یہ توجیہ کی ہے کہ حالتِ جنابت تو چونکہ بکثرت ہوتی ہے، لہٰذا اس کے لیے ہر مرتبہ سر کو کھولنا باعثِ مشقّت ہے، جب کہ حیض تو ایک ماہ میں ایک ہی بار اور نفاس سالوں میں کبھی کبھار ہوتا ہے، لہٰذا ان میں چوٹی اور مینڈھیاں کھولنا تو کوئی باعثِ مشقت نہیں رہتا۔[1]

موزوں پر مسح:

موسمِ سرما میں سردی سے بچنے کے لیے یا کسی بھی دوسری غرض سے، جس شخص نے چمڑے کے موزے پہن رکھے ہوں اور پہنے بھی وضو و طہارت کی حالت میں ہوں، تو اسے اجازت ہے کہ انھیں اتار کر پاؤں دھونے کے بجائے ان موزوں کے اُوپر ہی گیلا ہاتھ پھیر کر مسح کر لے، کیوں کہ یہ مسح نبیِ اکرم ﷺ سے صحیح احادیث میں ثابت ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سُنن اربعہ اور مسندِ احمد میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے وضو کیا اور پاؤں کے موزوں پر مسح کیا۔ اُن سے پوچھا گیا کہ آپ ایسا کرتے ہیں؟ تو انھوں نے فرمایا:

«نَعَمْ، رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ بَالَ، ثُمَّ تَوَضَّأَ، وَمَسَحَ عَلٰى خُفَّيْهِ»[2]

''ہاں میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو دیکھا کہ آپ ﷺ نے پیشاب کرنے کے بعد وضو فرمایا اور اپنے موزوں پر مسح کیا۔''

---

[1] المغني لابن قدامة (۱/ ۲۲٦ بتحقيق محمد خليل هراس) إرواء الغليل (۱/ ۱٦۷)

[2] الفتح الرباني (٤/ ٥۷) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (۱٤۰) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (۸۱، ۸۲) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (۱۱٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٤۳)

اس حدیث کے راوی حضرت جریر رضی اللہ عنہ چونکہ سورۃ المائدہ کی آیتِ وضو نازل ہونے کے بعد اسلام لائے تھے، اس لیے لوگ ان کی اس روایت کو بہت معتبر مانتے تھے، کیوں کہ اس آیت کے ذریعے سے جن صحابہ رضی اللہ عنہم کو مسح کے منسوخ ہو جانے کا گمان تھا، وہ ان کی روایت سے دُور ہوگیا، کیوں کہ وہ تو مشرّف بہ اسلام ہی آیتِ وضو کے نزول کے بعد ہوئے تھے، جب کہ آیتِ وضو ۵ھ یا ۶ھ میں غزوہ بنی مصطلق کے موقع پر نازل ہوئی تھی اور حضرت جریر رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام ماہِ رمضان ۱۰ھ میں واقع ہوا تھا۔[1]

ایسے ہی صحیح بخاری، موطا امام مالک اور مسندِ احمد میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان فرماتے ہیں:

﴿إِنَّهٗ مَسَحَ عَلَى الْخُفَّيْنِ﴾[2] ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے موزوں پر مسح کیا۔''

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے اپنے عظیم المرتبت والد امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے اس سلسلے میں پوچھا تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''نَعَمْ، إِذَا حَدَّثَكَ شَيْئًا سَعْدٌ عَنِ النَّبِي ﷺ فَلَا تَسْأَلْ عَنْهُ غَيْرَهٗ''[3]

''ہاں! جب تمھیں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی چیز سعد بیان کریں تو پھر اس کے بارے میں کسی دوسرے سے مت پوچھو۔''

صحیح بخاری میں حضرت عمرو بن اُمیہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

﴿رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَمْسَحُ عَلَى عَمَامَتِهٖ وَخُفَّيْهِ﴾[4]

''میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دستارِ مبارک اور موزوں پر مسح کرتے دیکھا ہے۔''

فتح الباری میں لکھا ہے:

''حفّاظِ حدیث کی ایک بڑی جماعت نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ موزوں پر مسح

---

[1] الفتح الرباني و شرحه بلوغ الأماني (۲/ ۵۷۔ ۵۸) نیز فتح الباری جلد سات میں بھی سیدنا جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کا واقعہ ملاحظہ فرمائیں۔

[2] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (۲۰۲) الموطأ مع شرحه المسوى، رقم الحديث (۵۸)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (۱/ ۳۰۵) و الفتح الرباني (۲/ ۵۹)

[4] صحيح البخاري مع الفتح (۱/ ۳۰۸)

کرنا تواتر سے ثابت ہے۔ ان میں سے بعض محدّثین کرام نے موزوں پر مسح کرنے کی مشروعیت بیان کرنے والے صحابہ رضی اللہ عنہم کو شمار کیا تو ان کی تعداد اَسّی (۸۰) سے بھی تجاوز کرگئی، جن میں اس دنیا میں ہوتے ہوئے ہی جنت کی خوش خبری پانے والے دس صحابہ بھی شامل ہیں۔''

مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''حَدَّثَنِيْ سَبْعُوْنَ مِنَ الصَّحَابَةِ بِالْمَسْحِ عَلَى الْخُفَّيْنِ''[1]

''مجھے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ستّر (۷۰) حضرات نے موزوں پر مسح کرنے والی حدیث سنائی ہے۔''

جرابوں پر مسح اور احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم:

چمڑے کے موزوں کی طرح ہی اون، فوم، کاٹن یا نائیلون کی جرابوں پر مسح کرنا بھی جائز ہے، جس کا ثبوت سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، مسندِ احمد، سنن بیہقی اور صحیح ابن حبان میں صحیح سند سے مروی حدیث میں موجود ہے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم تَوَضَّأَ وَمَسَحَ عَلَى الْجَوْرَبَيْنِ وَالنَّعْلَيْنِ»[2]

''نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا اور اپنی جرابوں اور جوتوں پر مسح کیا۔''

محدثین کرام کے معیارِ صحت پر پوری اترنے والی اس حدیث کے علاوہ بھی متعدد احادیث میں جرابوں پر مسح کی مشروعیت کا ذِکر آیا ہے، اگرچہ ان میں سے بعض کی اسانید اور راویوں پر کچھ کلام بھی کیا گیا ہے، مگر ان میں سے بھی متکلم فیہ احادیث اکثر محدثینِ کرام کے نزدیک صحیح ہیں، ان روایات کی نصوص اور محدّثین کے ان پر تبصرے ''نصب الراية تخريج أحاديث الهداية للإمام الزيلعي'' (۱/ ۱۸۴ تا ۱۸۶) ''عون المعبود شرح أبي داود للعلامه شمس الحق

---

[1] فتح الباري (۱/ ۳۰۶) الفتح الرباني (۲/ ۵۸۔ ۵۹)

[2] سنن أبي داود مع العون (۱/ ۲۶۹) سنن الترمذي مع التحفة (۱/ ۳۲۷) مسند أحمد (۲/ ۷۱) و صححه الألباني في الإرواء (۱/ ۱۳۷۔ ۱۳۸) و تحقيق المشكاة (۱/ ۱۶۲) و تمام المنة (ص: ۱۱۳) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۵۵۹) موارد الظمآن، رقم الحديث (۱۷۶) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (۸۶)

العظیم آبادي“ (۱/ ۲٦۹۔ ۲۷۵ طبع مدني) ”معالم السنن للخّطابي (۱/ ۱۲۱) ”تهذيب السنن لابن القيم“ (ص: ۲۲۔۱۲۳) ”تحفة الأحوذي شرح سنن الترمذي للمباركفوري“ (۱/ ۳۳۰۔ ۳۳۳ طبع مدني) میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ علامہ ابن قیّم کی کتاب ”زاد المعاد“ کے محقق نے لکھا ہے:

”علامہ جمال الدین قاسمی نے جرابوں پر مسح کے موضوع پر ایک رسالہ لکھا، جس میں کئی صحیح و ثابت احادیث جمع کیں اور پھر علامہ احمد شاکر نے اس رسالے کی تخریج کی تو کئی دیگر احادیث کا اس میں اضافہ بھی کیا ہے۔“[1]

آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ایک جماعت سے جرابوں پر مسح کرنا ثابت ہے۔ چنانچہ سنن ابی داود میں خود امام صاحب نے ان نو (۹) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تفصیل یوں ذکر کی ہے:

① حضرت علی بن ابی طالب۔ ② عبداللہ بن مسعود۔
③ براء بن عازب۔ ④ انس بن مالک۔
⑤ ابو امامہ۔ ⑥ سہل بن سعد۔
⑦ عمرو بن حریث۔ ⑧ عمر بن خطاب۔
⑨ ابن عباس رضی اللہ عنہم۔[2]

”تهذيب السنن“ میں علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ابن المنذر کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ جرابوں پر مسح نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نو (۹) صحابہ سے مروی ہے۔

① حضرت علی، ② حضرت عمّار، ③ حضرت ابو مسعود انصاری، ④ حضرت انس، ⑤ حضرت عبداللہ بن عمر، ⑥ حضرت براء، ⑦ حضرت بلال، ⑧ عبداللہ بن ابی اوفی، ⑨ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہم۔[3]

---

[1] تحقيق زاد المعاد (۱/ ۱۹٤)

[2] سنن أبي داود مع العون (۱/ ۲۷٤۔ ۲۷۵)

[3] تهذيب السنن لابن القيم على هامش العون (۱/ ۲۷۲)

ان اٹھارہ صحابہ کرام کے اسمائے گرامی میں سے حضرت علی، انس، براء اور سہل بن سعد رضی اللہ عنہم کے نام مکرّر آئے ہیں تو گویا چودہ صحابہ سے جرابوں پر مسح کی روایت ملتی ہے، جب کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ، حضرت ثوبان اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم سے "المسح علی الجوربین" کی مرفوع روایات آئی ہیں، لہٰذا ان کی تعداد سترہ ہوگئی۔[1]

اختصار کے پیشِ نظر ہم ان آثار کی نصوص اور ان کے ترجمے سے صرفِ نظر کر رہے ہیں۔ البتہ ان کا خلاصہ یہی ہے کہ ان سب نے مختلف مواقع پر اپنی جرابوں پر مسح کیا، جو جرابوں پر مسح کی مشروعیت کی دلیل ہے۔

آثارِ تابعین اور اقوالِ ائمہ رحمہم اللہ:

جس طرح قدسی نفوس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت جرابوں پر مسح کرنے کے جواز کی قائل ہے، اُسی طرح ہی تابعینِ کرام رحمہم اللہ کی بھی ایک جماعت اس کی قائل و فاعل ہے۔[2]

چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ (۱/ ۱۸۹) اور علامہ ابن قیّم کی "أعلام الموقعین" (۱/ ۷۵) پر جن تیرہ تابعین کے اسمائے گرامی مذکور ہیں۔ ان میں:

① حسن بصری۔ ② سعید بن مسیّب۔ ③ ابن جریج۔
④ عطاء۔ ⑤ ابراہیم نخعی۔ ⑥ فضل بن وکیع۔
⑦ اعمش۔ ⑧ قتادہ۔ ⑨ خلاّص۔
⑩ سعید بن جبیر۔ ⑪ نافع۔ ⑫ سفیان ثوری۔
⑬ ابوثور رحمہ اللہ جیسے اساطینِ علم شامل ہیں۔

ان حضرات کے اقوال و فتاویٰ بھی مذکورہ کتب میں منقول ہیں۔ جن کی نصوص و ترجمہ سے اختصار کے پیشِ نظر ہم صرفِ نظر کرتے ہیں، جب کہ جامع ترمذی میں امام صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

[1] عون المعبود (۱/ ۲۷۴۔ ۲۷۵) تحفة الأحوذي (۱/ ۳۲۸۔ ۳۲۹) المحلی لابنِ حزم (۱/ ۲/ ۸۱۔ ۸۲۔ ۱۰۳) مصنف ابن أبي شيبة (۱/ ۱۸۸۔ ۱۸۹) مصنف عبد الرزاق (۱/ ۱۹۰، ۷۴۵، ۷۷۳، ۷۸۱، ۷۸۲) اور "نصب الراية للزيلعي"، میں ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار بھی منقول ہیں۔

[2] بحوالہ ہفت روزہ "اہل حدیث" (جلد ۲۰ شمارہ ۵۲ بابت ۲۹ جمادی الاوّل ۱۴۱۰ھ بمطابق ۲۹ دسمبر ۱۹۸۹ء)

''جرابوں پر مسح کے جواز کا قول کئی اہلِ علم کا ہے اور حضرت سفیان ثوری، ابن المبارک، شافعی، احمد اور اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔''[1]

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ ''تہذیب السنن'' میں فرماتے ہیں:

''جرابوں پر مسح کے جواز کا قول اکثر اہلِ علم کا ہے اور جن صحابہ کے نام ذکر کیے گئے ہیں، ان کے علاوہ امام احمد، اسحاق بن راہویہ، عبداللہ بن مبارک، سفیان ثوری، عطاء بن ابی رباح، حسن بصری، سعید بن مسیّب اور ابو یوسف قاضی رحمہم اللہ بھی جواز کے قائل تھے اور جن صحابہ رضی اللہ عنہم کے نام ہم ذکر کر آئے ہیں، ان کا مخالف بھی دوسرا کوئی صحابی ہم نہیں جانتے۔''[2]

احناف کا مسلک:

معالم السنن میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے دونوں شاگردانِ گرامی امام قاضی ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کا مسلک یوں منقول ہے:

''يُمْسَحُ عَلَيْهِمَا إِذَا كَانَا ثَخِيْنَيْنِ لَا يَشِفَّانِ''

''جرابوں پر مسح کیا جائے گا، جب کہ وہ موٹی ہوں۔''

خاص فقہ حنفی کی کتاب قدوری میں ہے کہ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کہتے ہیں:

''يَجُوْزُ الْمَسْحُ عَلَى الْجَوْرَبَيْنِ إِذَا كَانَا ثَخِيْنَيْنِ لَا يَشِفَّانِ الْمَاءَ''[3]

''جرابوں پر مسح جائز ہے جب کہ وہ موٹی ہوں اور پانی کو (مسح کے وقت) چوس کر پاؤں تک نہ پہنچاتی ہوں۔''

خود امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ شروع میں جرابوں پر مسح کے قائل نہ تھے، مگر بعد میں انھوں نے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا اور صاحبین والا قول ہی اختیار فرما لیا تھا۔ چنانچہ قدوری کی شرح اللباب میں شیخ عبدالغنی غنیمی دمشقی میدانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔ ہدایہ کے حوالے سے تصحیح میں ہے:

---

[1] سنن الترمذي مع تحفة الأحوذي (١/ ٣٢٩)

[2] تهذيب السنن لابن القيّم على هامش عون المعبود (١/ ٢٧٣ـ ٢٧٤)

[3] قدوري مع شرحه اللباب (١/ ١/ ٤٠ دار الكتاب)

”أَنَّهٗ رَجَعَ إِلٰى قَوْلِهِمَا وَعَلَيْهِ الْفَتْوٰى“

”امام صاحب نے بھی صاحبین کے قول کی طرف رجوع کر لیا تھا اور اسی پر فتویٰ ہے۔“

حاصل کلام کے طور پر شرح الجامع المعروف قاضی خاں سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اگر جرابیں موٹی ہوں، مگر جوتے میں نہ ہوں تو امام صاحب کے نزدیک ان پر مسح جائز نہیں۔ صاحبین کے نزدیک جائز ہے اور آگے ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ بیان کیا جاتا ہے:

”إِنَّ الْإِمَامَ رَجَعَ إِلٰى قَوْلِهِمَا فِي الْمَرَضِ الَّذِيْ مَاتَ فِيْهِ“ [1]

”امام صاحب نے اپنے اس مرض کے دوران میں جس سے پھر آپ جانبر نہ ہو سکے تھے، صاحبین کے قول کی طرف رجوع کر لیا تھا۔“

نیز ہدایہ میں لکھا ہے:

”وَقَالَا: يَجُوْزُ الْمَسْحُ عَلَى الْجَوْرَبَيْنِ إِذَا كَانَا ثَخِيْنَيْنِ لَا يَشِفَّانِ، لِمَا رُوِيَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ مَسَحَ عَلٰى جَوْرَبَيْهِ، وَعَلَيْهِ الْفَتْوٰى“ [2]

”صاحبین کا کہنا ہے کہ جرابیں اگر موٹی ہوں تو ان پر مسح کرنا جائز ہے، کیونکہ روایت بیان کی گئی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے اپنی دونوں جرابوں پر مسح کیا تھا اور اسی بات پر (علمائے احناف کا) فتویٰ ہے۔“

ان الفاظ سے پہلے صاحبِ ہدایہ نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کے نزدیک جرابوں پر مسح جائز نہیں اور پھر تین سطروں کے بعد ہی ذکر کر دیا ہے کہ امام صاحب نے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا تھا۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا رجوع:

یہ جو ذکر ہو رہا ہے کہ صاحبین یعنی امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے شاگردانِ رشید امام قاضی ابو یوسف و امام محمد رحمہما اللہ تو شروع ہی سے جرابوں پر مسح کے جواز کے قائل تھے اور دلیل کے طور پر وہ نبیِ اکرم ﷺ

[1] اللباب (١/ ١/ ٤٠)

[2] الهداية (١/ ٤٤) طبع مجتبائي.

کے عمل مبارک کا حوالہ دیا کرتے تھے اور بالآخر خود امام صاحب جو پہلے جواز کے قائل نہیں تھے، وہ بھی صاحبین کے قول کی طرف رجوع کر کے جواز کے قائل ہوگئے، ان کے اس رجوع کی تفصیل ہدایہ کے حاشیے پر مولانا عبدالحی حنفی لکھنوی نے ذکر کی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

''امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے اپنی آخری بیماری میں اپنے شاگردوں کے سامنے وضو فرمایا، جب کہ آپ نے جرابیں پہنی ہوئی تھیں۔ اس وقت آپ نے وضو کر کے جرابوں پر مسح کیا اور اپنے شاگردوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ میں نے یہ عمل اس لیے کیا ہے کہ میں جرابوں پر مسح سے روکا کرتا تھا، مگر اب میری تحقیق یہ ہے کہ جرابوں پر مسح نہ صرف جائز ہے، بلکہ یہ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اس لیے میں نے یہ عمل کر کے تمھیں بتایا ہے، تاکہ تم عوام الناس اور علما کو بتاؤ کہ ابو حنیفہ نے اپنے مسلک سے رجوع کر لیا ہے۔''

صرف جرابوں پر مسح کے مسئلے پر رجوع ہی نہیں، بلکہ امام صاحب رحمہ اللہ نے کثیر مسائل میں تحقیق کے بعد ان سے رجوع کیا تھا اور یہی محققین کی شان ہے اور یہی ہونا بھی چاہیے کہ جب صحیح مسئلہ سامنے آجائے تو اپنے پرانے عمل کو فوراً ترک کر دیا جائے جو بلا دلیل ہو اور از روے دلیل صحیح کو اختیار کر لیا جائے۔ ''طبقات الحنفية'' (ص: ۹۲ تا ۱۰۰) میں شیخ عبدالقادر نے ذکر کیا ہے:

''امام صاحب نے قاضی ابو یوسف کو ایسے چوبیس (۲۴) مسئلے تحریر کرائے، جن میں انھوں نے اپنے سابقہ مسلک سے رجوع کیا تھا اور قاضی ابو یوسف کو یہ تاکید فرمائی کہ یہ مسائل اور ان میں رجوع علما کو بھی بتا دینا اور عوام تک بھی پہنچا دینا، تاکہ کہیں میری وجہ سے لوگ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ترک نہ کرتے رہیں، اس لیے کہ نعمان غلطی کر سکتا ہے، مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غلطی نہیں کر سکتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر اور معصوم ہیں اور نعمان بن ثابت پیغمبر ہے نہ معصوم۔ یاد رکھنا کہ جب میرا کوئی قول حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پاؤ تو میرے قول کو دیوار پر مار دو اور حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سینے سے لگا لو۔''

اس طرح امام صاحب رحمہ اللہ نے اپنے آپ کو بَریٔ الذمہ کر لیا۔ جو ان کی تواضع کے ساتھ ساتھ رفعت اور بلند مقامی کا ثبوت ہے۔ رحمہٗ اللّٰہ رحمة واسعة۔[1]

[1] ہفت روزہ ''اہل حدیث'' (جلد ۲۰ شمارہ ۵۲ بابت ماہ ۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ بہ مطابق ۲۹ دسمبر ۱۹۸۹ء)

”معالم السنن للخطابي“ (۱۲۱/۱) ”عمدة الرعاية حاشية شرح الوقاية“ (بحوالہ تحفة الأحوذي: ۱/ ۳۳۵) اور ”رد المحتار حاشية درّ مختار“ (۱/ ۲۷۸) میں بھی فقہاے احناف کا فتویٰ یہی مذکور ہے کہ جرابوں پر مسح کرنا جائز ہے۔

لفظِ جراب کی لغوی تحقیق:

جراب ایک معروف چیز ہے، لیکن بعض لوگ بلا وجہ اسے ایسے معنوں میں لینے لگتے ہیں کہ جسے تشدّد اور غلو کہا جاسکتا ہے، جیسے کوئی کہہ دیتا ہے کہ جراب سے چمڑے کی جرابیں مراد ہیں، حالانکہ ان کے لیے تو حدیث شریف حتیٰ کہ بخاری و مسلم میں ”خُفَّین“ کا لفظ موجود ہے، لہٰذا جراب سے چمڑے کی جرابیں مراد لینا لغت سے نا واقفیت کا نتیجہ ہے، لہٰذا آیئے اس لفظ کی تھوڑی سی لغوی تحقیق کریں، تاکہ اصل حقیقت تک پہنچا جاسکے۔ چنانچہ عربی کی درمیانی مگر معروف و متداول ڈکشنری ”المنجد“ (ص: ۸۴) اور ”قاموس المحيط فيروز آبادی“ (۱/ ٤٧) میں لکھا ہے:

”اَلْجَوْرَبُ: لَفَافَةُ الرِّجْلِ“

”جراب پاؤں کا لفافہ یعنی پاؤں کو لپیٹنے کے لیے ہوتی ہے۔“

ماہرِ لغت علامہ احمد رضا دمشقی ”معجم متن اللغة“ نامی پانچ ضخیم جلدوں پر مشتمل ڈکشنری (۱/ ۴۹۹، ۵۰۰) میں لکھتے ہیں:

”جو رب پاؤں پر لپیٹے جانے والے لفافے کو کہتے ہیں۔ دراصل یہ ایک فارسی لفظ ”گورِپا“ سے معرّب ہے، جس کا معنیٰ ”پاؤں کی قبر“ ہے۔“

پندرہ جلدوں پر مشتمل ”لسان العرب لابنِ منظور“ (۱/ ۲٦۳) میں لکھا ہے:

”اَلْجَرَابُ وِعَاءٌ مَعْرُوْفٌ“ ”جراب ایک معروف ظرف ہے۔“

صاحبِ ”عون المعبود“ اور ”تحفة الأحوذي“ نے امام سیوطی رحمہ اللہ اور امام ابوبکر ابن العربی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے:

”اَلْجَوْرَبُ غَشَاةٌ لِلْقَدَمِ مِنْ صُوْفٍ يُتَّخَذُ لِلدِّفْءِ وَهُوَالتَّخِيْنُ“[1]

”جراب پاؤں پر چڑھانے کا ایک پَردہ ہوتا ہے، جو پاؤں کو گرم رکھنے کے لیے اُون کا

[1] عون المعبود (۱/ ۲٦۹) تحفة الأحوذي (۱/ ۳۳٤)

بنایا جاتا ہے اور موٹا ہوتا ہے۔‘‘

علامہ عیسیٰ حنفی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

’’جراب ملکِ شام کے سرد ترین علاقوں میں پاؤں میں ٹخنوں سے اُوپر تک پہنی جاتی ہے اور وہ دھاگے یا اون سے تیار شدہ ہوتی ہے۔‘‘[1]

کبار علمائے احناف میں سے علامہ عینی رحمہ اللہ نے ’’جورب‘‘ کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

’’جورب شامی ممالک میں سخت سردی کے وقت پہنی جاتی ہے، جو اون کی بنی ہوتی ہے اور پاؤں سمیت ٹخنوں کے اُوپر تک ہوتی ہے۔‘‘[2]

تاج العروس زبیدی میں بھی ’’جورب‘‘ کو پاؤں کا لفافہ اور اصل فارسی ’’گورِپا‘‘ ہی لکھا ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے فتاویٰ میں ہے کہ ’’جوربین‘‘ اور ’’نعلین‘‘ میں فرق یہ ہے کہ جوربین اون اور نعلین چمڑے سے بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ مجدالدین فیروزآبادی کی "القاموس المحیط" میں ’’جورب‘‘ کی عام تعریف کی گئی ہے، جو چمڑے، اُون، بال اور دھاگے سے بنی ہر جراب کو شامل ہے۔[3]

اس ساری لغوی تحقیق و تشریح سے معلوم ہوا کہ جورب میں ہر طرح کی جرابیں آ جاتی ہیں، وہ چمڑے کی ہوں، ریشم کی، اون کی، دھاگے کی، بالوں کی، یا نائیلون کی اور ہر اس جراب پر مسح جائز ہے، جو صحیح و سالم اور موٹی ہو، لیکن اگر وہ صحیح سالم تو ہو، مگر اتنی باریک ہو کہ اس سے پاؤں صاف نظر آتا ہو تو وہ مسح کے قابل نہیں ہوتی۔ ہاں اگر جراب میں کہیں معمولی سا سوراخ ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، جیسا کہ فقہا کی کتب میں مذکور ہے۔

مسح کی شرط:

جبیرہ، پلاسٹر اور پٹی کے ضمن میں یہ تفصیل گزر چکی ہے کہ ان پر مسح اور موزوں یا جرابوں پر مسح میں کن کن پہلوؤں میں فرق ہے، لہٰذا یہاں اس تفصیل کو دُہرانے کی ضرورت نہیں اور وہیں شرائطِ مسح بھی ذکر ہوئی تھیں۔ لیکن یہاں صرف ایک ہی شرط قابلِ ذکر ہے اور وہ ہے طہارت و وضو کہ موزوں یا

---

[1] بحوالہ ہفت روزہ ’’اہل حدیث‘‘ (جلد ۲۰ شمارہ ۵۱ بابت ۲۲ جمادی الاوّل ۱۴۱۰ھ بمطابق ۲۲ دسمبر ۱۹۸۹ء)

[2] عون المعبود (۱/ ۲۷۰) و تحفة الأحوذي (۱/ ۳۳٤)

[3] حواله جات سابقه.

جرابوں پر مسح صرف اسی صورت میں جائز ہے کہ جب انھیں با وضو ہونے کی حالت میں پہنا گیا ہو، کیوں کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک سفر کے دوران میں مَیں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم وضو فرمانے لگے تو میں برتن سے پانی ڈال رہا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب چہرہ اقدس اور بازوؤں کو دھولیا اور سر اقدس کا مسح کر لیا تو میں جھکا کہ آپ کے موزے اتاروں، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«دَعْهُمَا فَإِنِّيْ أَدْخَلْتُهُمَا طَاهِرَتَيْنِ فَمَسَحَ عَلَيْهِمَا»[1]

''انھیں رہنے دو، کیوں کہ میں نے یہ طہارت کی حالت میں پہنے تھے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر مسح کر لیا۔''

مقامِ مسح:

موزوں یا جرابوں پر مسح بظاہر تو پاؤں کی نچلی جانب چاہیے، مگر مسنون یہ ہے کہ پاؤں کے تلوؤں کے بجائے ان کے اوپر والے حصے پر مسح کر لیا جائے، کیوں کہ سنن ابی داود و دارقطنی، مسند احمد، سنن بیہقی، دارمی اور محلّی ابن حزم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

«لَوْ كَانَ الدِّيْنُ بِالرَّأْيِ لَكَانَ أَسْفَلَ الْخُفِّ أَوْلٰى بِالْمَسْحِ مِنْ أَعْلَاهُ وَقَدْ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَمْسَحُ عَلٰى ظَاهِرِ خُفَّيْهِ»[2]

''اگر دین کی بنیاد عقل و قیاس پر ہوتی تو موزوں کے نیچے مسح کرنا ان کے اُوپر مسح کرنے سے اولیٰ تھا، لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم موزوں کے اُوپر مسح کرتے تھے۔''

کیفیتِ مسح:

مسح کرنے کا طریقہ و کیفیت کیا ہے؟ اس سلسلے میں متعدد احادیث مروی ہیں، لیکن وہ سبھی متکلَّم فیہ ہیں، لیکن ان کا مجموعی مفاد یہ ہے کہ دائیں ہاتھ کی گیلی انگلیاں کھول کر دائیں پاؤں کے

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٣٠٩) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٧٠) المنتقى (١/ ١/ ١٨٠) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٣٧) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٥)

[2] صححه الحافظ في التلخيص (١/ ١/ ١٦٠) و الألباني في الإرواء (١/ ١٤٠) و تحقيق المشكاة (١/ ٦٣)

موزے یا جراب کے اوپر پاؤں کی انگلیوں والی جگہ سے لے کر ان کے پنڈلی پر چڑھنے والے حصے تک اس طرح لے جائیں، گویا خط کھینچا جا رہا ہے یا کوئی لکیریں بنا رہا ہے، اس طرح بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے بائیں پاؤں کی انگلیوں سے لے کر پنڈلیوں کے شروع والی جگہ تک مسح کریں۔[1] لیکن چونکہ یہ روایات متکلم فیہ ہیں، لہٰذا اس کیفیت کا التزام واجب نہیں، بلکہ کسی بھی طرح مسح کرلیں، مسح ہو جائے گا، البتہ مذکورہ طریقہ اختیار کرنا اولیٰ ہے۔

ان ضعیف اور نا قابلِ استدلال روایات میں سے ایک سُنن کبریٰ بیہقی میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

«إِنَّهُ ﷺ مَسَحَ عَلَىٰ خُفَّيْهِ، وَوَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلَىٰ خُفِّهِ الْأَيْمَنِ، وَيَدَهُ الْيُسْرىٰ عَلَىٰ خُفِّهِ الْأَيْسَرِ، ثُمَّ مَسَحَ أَعْلَاهُمَا مَسْحَةً وَّاحِدَةً، كَأَنِّي أَنْظُرُ أَصَابِعَهُ عَلَى الْخُفَّيْنِ»

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دائیں موزے پر اپنا دایاں ہاتھ اور بائیں موزے پر اپنا بایاں ہاتھ رکھا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں موزوں کے اُوپر صرف ایک بار مسح کیا، گویا میں موزوں پر آپ کی انگلیاں دیکھ رہا ہوں۔''

لیکن اس روایت کو محدّثین میں سے امیر صنعانی رحمہ اللہ نے منقطع قرار دیا ہے۔ اس موضوع کی دوسری روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں:

«إِنَّهُ رَأَىٰ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَمْسَحُ عَلَى ظَهْرِ الْخُفِّ خُطُوطاً بِالْأَصَابِعِ»

''انھوں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو موزے کے اوپر مسح کرتے دیکھا، گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم انگلیوں سے لکیریں لگا رہے ہیں۔''

امام نووی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے بارے میں کہا ہے کہ یہ ضعیف ہے۔ اسی سلسلے کی ایک تیسری روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں:

«إِنَّهُ ﷺ أَرَىٰ بَعْضَ مَنْ عَلَّمَهُ الْمَسْحَ أَنْ يَّمْسَحَ بِيَدِهٖ مِنْ مُقَدَّمِ الْخُفَّيْنِ إِلَى أَصْلِ السَّاقِ مَرَّةً، وَفَرَّجَ بَيْنَ أَصَابِعِهٖ»

---

[1] سُبل السلام (۱/ ۱/ ۵۹)

”آپ ﷺ نے کسی شخص کو مسح کا طریقہ سکھلاتے ہوئے دکھایا کہ وہ اپنے ہاتھ سے موزے کے اگلے حصّے سے لے کر پنڈلی شروع ہونے کی جگہ تک ایک مرتبہ مسح کرے۔ آپ ﷺ نے یہ دکھلاتے ہوئے اپنی انگلیوں کو کھول کر ایک دوسرے سے الگ رکھا۔“

لیکن اس روایت کو حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے سخت ضعیف کہا ہے۔[1]

یہ تینوں روایات ہم نے محض تنبیہ کے لیے ذکر کر دی ہیں، ورنہ ان میں سے کوئی ایک بھی قابلِ استدلال ہے نہ کیفیت وکمیت کے بارے میں دوسری کوئی روایت ہے، جس پر اعتماد کیا جا سکے، لہٰذا امیر یمانی کے بقول اگر کوئی شخص اپنے موزے (یا جراب) پر اس طرح ہاتھ پھیر لے، جسے لغوی اعتبار سے مسح کرنا کہا جا سکتا ہو تو وہ کفایت کر جائے گا، خواہ وہ کسی طرح بھی کر لے۔[2]

مسح کی مدت:

اب رہی یہ بات کہ جب وضو کر کے موزے یا جرابیں پہن لی جائیں تو کتنے عرصے کے لیے ان پر مسح کیا جا سکتا ہے؟ اس سلسلے میں دس سے زیادہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں، جن سے پتا چلتا ہے کہ مقیم کے لیے ایک دن رات یعنی چوبیس ۲۴ گھنٹے اور مسافر کے لیے تین دن اور تین راتیں یعنی بہتّر (۷۲) گھنٹے تک ان موزوں یا جرابوں پر مسح کر لینے کی گنجایش ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم، سنن نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن حبان اور مسندِ احمد میں شریح بن ہانی بیان کرتے ہیں کہ میں حضرت عائشہ صدّیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا اور موزوں پر مسح کی مدّت کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا کہ تم ابن ابی طالب یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس چلے جاؤ اور ان سے جا کر پوچھو، کیوں کہ وہ سفر میں نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ ہونے کی وجہ سے اس بات کو مجھ سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ میں ان کے پاس گیا اور ان سے مسح کی مدّت کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا:

«جَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ وَلَيَالِيهِنَّ لِلْمُسَافِرِ، وَيَوْماً وَلَيْلَةً لِلْمُقِيْمِ»[3]

---

[1] سُبل السلام (١/ ١/ ٥٩) التلخيص الحبير (١/ ١/ ١٦٠۔ ١٦١)

[2] سبل السلام (١/ ٨٩) طبع مكتبه عاطف۔ ازهر.

[3] صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٣/ ١٧٦) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٢٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٥٢) المشكاة مع المرعاة (١/ ٥٧٥)

''رسول اللہ ﷺ نے (موزوں یا جرابوں پر) مسح کی مدّت مسافر کے لیے تین دن اور تین راتیں اور مقیم کے لیے ایک دن اور ایک رات مقرر کی ہے۔''

اِسی طرح سنن ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ و ابن حبان، سنن دارقطنی، مسندِ احمد و شافعی اور سنن بیہقی میں ایک حدیث مروی ہے، جسے امام ترمذی، ابن خزیمہ اور خطابی رحمہم اللہ نے صحیح قرار دیا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے اسے اس موضوع کی صحیح ترین حدیث قرار دیا ہے، جس میں حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

«كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَأْمُرُنَا إِذَا كُنَّا سَفْرًا أَن لَّا نَنْزِعَ خِفَافَنَا ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ وَلَيَالِيهِنَّ إِلَّا مِنْ جَنَابَةٍ، وَلٰكِنْ مِنْ غَائِطٍ وَبَوْلٍ وَنَوْمٍ»[1]

''نبیِ اکرم ﷺ ہمیں حکم فرمایا کرتے تھے کہ جب ہم سفر میں ہوں تو بول و براز اور نیند سے وضوٹوٹنے کی صورت میں تین دن اور تین راتوں تک اپنے موزے نہ اتاریں۔ ہاں جنابت ہو جائے تو اتارنے ضروری ہیں۔''

اس حدیث میں حکم فرمانے کے الفاظ سے محسوس ہوتا ہے کہ مسح واجب ہونا چاہیے، لیکن اجماع نے اس وجوب کو اباحت و ندب میں بدل دیا ہے۔ مسح کے واجب نہیں، بلکہ محض ایک رخصت ہونے کا پتا ایک دوسری حدیث سے بھی چلتا ہے، جو صحیح ابن خزیمہ، سنن دارقطنی، صحیح ابن حبان، مصنف ابن ابی شیبہ، مسندِ شافعی اور سُنن بیہقی میں مروی ہے، جسے المجد ابن تیمیہ اور شوکانی رحمہ اللہ کے بقول امام خطابی، شافعی اور ابن خزیمہ رحمہم اللہ نے صحیح قرار دیا ہے، اس میں حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ نبیِ اکرم ﷺ سے بیان کرتے ہیں:

«إِنَّهٗ رَخَّصَ لِلْمُسَافِرِ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ وَلَيَالِيهِنَّ، وَلِلْمُقِيمِ يَوماً وَّلَيْلَةً، إِذَا تَطَهَّرَ فَلَبِسَ خُفَّيْهِ أَنْ يَّمْسَحَ عَلَيْهِمَا»[2]

---

[1] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٤) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٢٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٧٨) موارد الظمآن، رقم الحديث (١٧٩) المشكاة مع المرعاة (١/ ١٧٩۔ ١٨٠) سبل السلام (١/ ١/ ٥٩) و المنتقى مع النيل (١/ ١/ ١٨١)

[2] موارد الظمآن (١٨٤) مشكاة المصابيح (١/ ٥٧٨، ٥٧٩) بلوغ المرام مع السبل (١/ ١/ ١٦١) المنتقى مع النيل (١/ ١/ ٨٢) فتح الباري (١/ ٣١٠)

''آپ ﷺ نے مسافر کو تین دن اور تین راتیں اور مقیم کو ایک دن اور ایک رات کے لیے موزوں پر مسح کی رخصت دی، جب کہ اس نے وضو کر کے موزے پہنے ہوں۔''

مسح کی مدت کا آغاز کب ہوتا ہے؟

مسح کے متعلق ایک بات یہ بھی ہے کہ مسح کی مُدّت جو ایک دن مقیم کے لیے اور تین دن مسافر کے لیے ہے، اس کی ابتدا کب سے شمار کی جائے گی؟ تا کہ چوبیس (۲۴) گھنٹے یا بہتّر (۷۲) گھنٹے کا شمار کیا جا سکے۔ علامہ عبید اللہ رحمانی مبارکپوری نے ''المرعاۃ شرح المشکاۃ'' میں لکھا ہے:

''کثیر علما کا قول یہ ہے کہ موزوں پر مسح کی مدت کی ابتدا موزے پہننے کے بعد جب وضو ٹوٹے تو اس وقت سے ہوگی نہ کہ وضو کرنے یا مسح کرنے کے وقت سے اور نہ موزے پہننے کے وقت ہی سے۔ اور امام احمد رحمہ اللہ سے منقول ہے:

''موزے پہننے کے وقت سے ابتدا شمار ہوگی۔''[1]

''المنھاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج'' میں امام نووی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''امام شافعی اور کثیر اہلِ علم کا مذہب یہ ہے کہ اس مدّت کی ابتدا موزے پہننے کے بعد وضو ٹوٹنے کے وقت سے ہے، موزے پہننے سے نہیں اور نہ ان پر مسح کرنے ہی سے۔''[2]

صحیح مسلم اور دیگر کتب میں مذکور حدیثِ علی رضی اللہ عنہ اور اسی مفہوم کی دوسری احادیث کے ظاہری معنیٰ سے شیخ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے یہ اخذ کیا ہے:

''ابتداے مدّت کا اعتبار (پہلی مرتبہ) مسح کرنے سے ہوگا نہ کہ مسح کرنے کے بعد وضو ٹوٹنے کے وقت سے، امام نووی رحمہ اللہ نے اسے ہی ترجیح دی ہے، اگرچہ ان کے مذہب کے یہ خلاف ہے۔''[3]

محققین علما کی شان ہی یہ رہی ہے کہ جس بات کو قرآن و سنت کی رو سے صحیح تر سمجھیں، وہ اسے قبول کر لیتے ہیں، اگرچہ ان کا فقہی مذہب، حتیٰ کہ امامِ مذہب اس کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

---

[1] المرعاة (١/ ٥٧٥)

[2] شرح مسلم للنووي (٢/ ٣/ ١٧٦)

[3] تحقيق المشكاة (١/ ١٦٠)

امام نووی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ چنانچہ اپنی کتاب ’’شرح صحیح مسلم‘‘ میں اختصار سے امام شافعی رحمہ اللہ اور کثیر علما کے حوالے سے بیان کر دیا کہ وضو کر کے موزے پہن لینے کے بعد جب وضو ٹوٹے تو اس وقت سے مسح کی مدت کا آغاز ہوگا۔ اس وقت سے مقیم ایک دن اور ایک رات اور مسافر تین دن اور تین رات مسح کر سکے گا۔ اسے مثال سے یوں سمجھ لیں کہ ایک نمازی نے ظہر کے وقت وضو کیا اور موزے یا جرابیں پہن لیں۔ عشا تک اس کا وضو بحال رہا اور عشا کے بعد مثلاً نو بجے اس کا وضوٹوٹ گیا۔ اب اُسے اجازت ہے کہ اگلی رات کے نو بجے تک وہ جتنی مرتبہ اور جس غرض کے لیے وضو کرے، اُسے پاؤں سے موزے اور جرابیں اتارنے کی ضرورت نہیں، بلکہ وہ ان پر مسح کرسکتا ہے، اگر وہ اس سے پہلے جب موزے اتار کر پورا وضو کرنا اور پاؤں دھونا چاہے تو اسے اختیار ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ کے بقول یہ امام شافعی، ابوحنیفہ، ان کے اصحاب، سفیان اور جمہور اہلِ علم رحمہم اللہ کا مسلک ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ سے صحیح تر روایت کے مطابق یہی مروی ہے اور امام داود رحمہ اللہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ ان کا استدلال تو حضرت صفوان رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے اضافی الفاظ ﴿ مِنَ الْحَدَثِ إِلَى الْحَدَثِ﴾ سے ہے، لیکن یہ اضافہ ثابت نہیں، بلکہ خود امام نووی رحمہ اللہ نے ’’المجموع شرح المهذّب‘‘ میں اسے ’’غریب‘‘ قرار دیا ہے یا پھر ان کا استدلال قیاس سے ہے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ مسح کی مدّت کا آغاز موزے پہننے ہی سے ہو جائے گا، مثلاً ایک شخص نے دوپہر نمازِ ظہر کے لیے وضو کر کے موزے پہن لیے۔ موزے پہننے کے ساتھ ہی آغازِ مدّت شمار کیا جائے گا اور آیندہ ظہر تک مقیم کے لیے اور تیسرے دِن کی ظہر تک مسافر کے لیے مسح کی گنجایش ہوگی۔ گویا مقیم روزانہ ظہر کے وقت وضو کر کے موزے پہن لیا کرے اور اگر درمیان میں اتارے نہیں تو چوبیس (۲۴) گھنٹے تک اور مسافر بہتر (۷۲) گھنٹے تک مسح کرسکتا ہے۔ مسح کی مدّت کے آغاز کے سلسلے میں ایک تیسرا قول امام اوزاعی اور ابوثور رحمہما اللہ کا ہے، ایک روایت میں امام احمد رحمہ اللہ اور داود رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے بھی یہی منقول ہے کہ مدّتِ مسح کی ابتدا اس مسح سے ہوگی، جو موزے پہننے کے بعد وضو ٹوٹنے پر دوبارہ وضو کرتے وقت کیا جائے گا۔ مثلاً ایک شخص نے ظہر کے وقت وضو کیا اور عشا تک اسی وضو سے نمازیں ادا کرتا رہا، عشا کے بعد اس کا وضوٹوٹ گیا۔ پھر صبح نمازِ فجر کے لیے وہ اٹھا اور وضو کیا اور پاؤں پر مسح کیا، اب اس مسح

کے وقت سے لے کر مقیم کے لیے چوبیس (۲۴) گھنٹے اور مسافر لیے بہتّر (۷۲) گھنٹے مسح کر لینے کی رخصت ہے۔

ان حضرات کا استدلال صحیح مسلم اور دیگر کتب والی ان صحیح احادیث کے ظاہری مفہوم سے ہے، جن میں مقیم کو ایک دن اور ایک رات اور مسافر کو تین دن اور تین راتیں مسح کرنے کی گنجایش دی گئی ہے۔ اس گنجایش سے تین دن اور تین راتیں یا ایک دن اور ایک رات کا پوری طرح استفادہ صرف اسی صورت میں کیا جاسکتا ہے کہ مدتِ مسح کا شمار پہلے مسح سے کیا جائے۔ مثلاً ایک آدمی نے نمازِ ظہر کے لیے وضو کیا اور موزے پہن لیے، نمازِ عشا تک اس کا وضو بحال رہا اور پھر وضو ٹوٹ گیا۔ صبح فجر کے لیے اس نے وضو کیا اور مسح کیا۔ اب اگر مسح کی مدت کا آغاز وضو ٹوٹ جانے سے شمار کیا جائے تو اس طرح اُسے صرف دن دن کے وقت یا دن اور نمازِ عشا تک مسح کرنے کا اختیار دیا جاتا ہے۔ عشا کے بعد اور تہجّد کے لیے اگر وہ اُٹھے تو اسے مسح کا اختیار نہیں ہوگا، کیوں کہ اس شکل میں عشا کے بعد وضو ٹوٹ جانے سے مسح کا اختیار صرف اسی وقت تک رہ گیا ہے، جب کہ صحیح احادیث اُسے پورا دن اور پوری رات مسح کا اختیار دے رہی ہیں اور یہ صرف اسی شکل میں ممکن ہے، جب مدتِ مسح کا آغاز پہلے مسح سے شمار کیا جائے نہ کہ موزے پہننے یا وضو ٹوٹنے سے کیا جائے۔ اس مسلک کے بارے میں امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”وَهُوَ الْمُخْتَارُ الرَّاجِحُ دَلِيلًا، وَاخْتَارَهُ ابْنُ الْمُنْذِرِ، وَحُكِيَ نَحْوُهُ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رضی اللہ عنہ“[1]

”دلیل کی رو سے یہی مختار اور راجح مسلک ہے اور امام ابن المنذر نے بھی اسے ہی اختیار کیا ہے، اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے بھی یہی منقول ہے۔“

یہ تو ایک علمی بحث اور اس کی تفصیلات تھیں۔ ویسے اگر مطلقاً روزانہ ظہر کے وقت پورا وضو کر لیا جائے تو مقیم کو اس کی گنجایش ہے۔ باقی اوقات میں پاؤں کے موزوں یا جرابوں پر مسح کرتا رہے۔ مسافر تین راتیں اور تین دن کرلے۔ یہ موٹا سا حساب ہے اور جواز کی حدود کے اندر بھی اور اگر باریکیوں کو ہی اختیار کرنا ہو تو وہ بھی ہم نے ذکر کر دی ہیں۔ وَاللّٰهُ الْمُوَفِّقُ.

[1] المجموع شرح المهذّب (١/ ٥٢٥) طبع قاهره

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ مسح کی گنجایش حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ موزوں یا جرابوں کو اتارے نہیں، بلکہ مسلسل پہنے رہے۔ یہ نہیں کہ جب چاہے پہن لے اور مسح کرلے، کیوں کہ فتح الباری میں ''فائدہ'' کے تحت حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''اگر مسح کرنے کے بعد مسح کی مدّت ختم ہونے سے پہلے ہی کسی نے اپنے موزے اتار لیے تو امام احمد و اسحاق اور دوسرے توقیت کے قائل ائمہ کے نزدیک اسے دوبارہ وضو کرنا پڑے گا، جب کہ فقہاے کوفہ امام مزنی اور ابوثور رحمہما اللہ کے نزدیک صرف دونوں پاؤں ہی دھولے۔ امام مالک ولیث کا بھی یہی قول ہے، جب کہ حضرت حسن بصری، ابن ابی لیلی اور علما کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ اس کے لیے پاؤں دھونا بھی ضروری نہیں۔''

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور شیخ البانی نے اسی کی تائید کی ہے۔[1]

انھوں نے اس شخص پر قیاس کیا ہے، جس نے سر کا مسح کیا، پھر منڈوا ڈالا تو اس کے لیے دوبارہ سر کا مسح کرنا واجب نہیں، لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس قیاس کو محلِ نظر قرار دیا ہے۔ شیخ ابن باز کی نگرانی میں فتح الباری کی جو تحقیق و تصحیح ہوئی ہے، اس میں حافظ ابن حجر کے اس تبصرے کی تائید کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ اسے سر کے مسح پر قیاس کرنا، اس لیے محلِ نظر ہے کہ سر اصل ہے، جس پر مسح کیا جائے گا، بال چاہے ہوں یا نہ ہوں، جب کہ موزوں پر مسح پاؤں کو دھونے کے عوض میں ہے، لہٰذا یہ دونوں امور الگ الگ ہوئے۔ اسی بنا پر راجح قول یہی ہے کہ اگر کوئی شخص موزے اتار دے تو اس کا وضو باطل ہوگیا اور اب صرف پاؤں کا دھو لینا ہی کافی نہیں۔ کیوں کہ اس طرح موالات یا وہ تسلسل فوت ہوجاتا ہے، جو اعضاے وضو کو دھونے میں ضروری ہے۔[2]

نواقضِ مسح:

یہاں یہ بھی یاد رہے کہ نواقضِ مسح بھی وہی ہیں، جو نواقضِ وضو ہیں، یعنی جب وضو ٹوٹا تو ساتھ ہی مسح بھی ٹوٹ گیا۔ جب نیا وضو کریں تو نئے سرے سے مسح بھی کریں۔

---

[1] تمام المنّة (ص: ١١٤۔ ١١٥)

[2] فتح الباري (١/ ٣١٠ حاشيه)

12- موالات یا تسلسل

اب یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موالات یا تسلسل کی کچھ وضاحت کر دی جائے۔ یہ بات تو ویسے ہی معروف و مروج ہے کہ جب کوئی مرد یا عورت وضو کرنے لگے تو ہاتھ دھونے سے لے کر پاؤں دھونے تک مسلسل ہی وضو کیا جاتا ہے اور عموماً ایسا نہیں ہوتا کہ ہاتھ منہ دھویا اور پھر کسی کام لگ گئے، پھر آ کر بازو دھوئے، سر کا مسح کیا اور قدم دھو لیے، عموماً ایسا نہیں ہوتا، لیکن اگر کسی وجہ سے ہو ہی جائے، مثلاً ایک آدمی وضو کر رہا تھا اور صرف پاؤں دھونے باقی تھے کہ کسی نے آواز دے کر متوجہ کر لیا اور اس کی باتیں یا گفتگو ایسی تھی کہ اسے وضو کا سلسلہ ترک کر کے ہمہ تن گوش ہو کر اسے سننا پڑا اور جب تک اس کی بات مکمل ہوئی، اس شخص کے وہ اعضائے وضو جو اس نے دھو لیے تھے، وہ سب خشک ہو چکے تھے۔ اب جب یہ دوبارہ وضو کرنے لگے تو اسے صرف پاؤں دھو لینے پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ از سرِ نو وضو کرنا چاہیے، کیوں کہ اعضا کو دھونے میں جس موالات یا تسلسل کی ضرورت تھی، وہ برابر قائم نہیں رہ سکا۔

ایسے ہی گھر میں ہوتے ہوئے کسی عورت سے یہ واقعہ پیش آ سکتا ہے یا اس سے ملتی جلتی کوئی دوسری صورت رونما ہو سکتی ہے۔ مثلاً وہ وضو کر رہی ہو اور صرف پاؤں دھونے باقی ہوں کہ بچے کے رونے اور گر جانے کے خدشے سے وہ فوراً بچے کے پاس آ گئی اور اسے بہلانے میں اتنا وقت لگ گیا کہ اعضائے وضو سے وضو کے آثار تک ختم ہو گئے۔ اب جب وہ وضو کرنے لگے تو اسے از سرِ نو وضو کرنا ہوگا، کیوں کہ اس سے مطلوبہ تسلسل قائم نہیں رہ سکا۔ صحتِ وضو کے لیے اس موالات یا تسلسل کو شرط قرار دیا گیا ہے اور تسلسل کے شرط ہونے پر ایک حدیث سے استدلال کیا گیا ہے، جو سنن ابی داود، مسندِ احمد اور مستدرکِ حاکم میں خالد بن معدان سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ کے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کا بیان ہے:

« إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَأَىٰ رَجُلًا يُصَلِّي وَفِي ظَهْرِ قَدَمِهِ لَمْعَةٌ قَدْرَ الدِّرْهَمِ، لَمْ يُصِبْهَا الْمَاءُ فَأَمَرَهُ أَنْ يُعِيدَ الْوُضُوءَ »

''نبیِ اکرم ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا جو نماز ادا کر رہا تھا اور اس کے پاؤں پر ایک درہم کے برابر جگہ خشک رہ جانے کی وجہ سے چمک رہی تھی۔ نبیِ اکرم ﷺ نے اسے حکم فرمایا کہ وہ وضو دوبارہ کرے۔''

سنن ابو داود میں تو یہاں تک ہے:

« فَأَمَرَهُ أَنْ يُعِيدَ الْوُضُوءَ وَالصَّلَاةَ »[1]

''آپ ﷺ نے تو اسے وضو دہرانے اور نماز دوبارہ پڑھنے کا حکم فرمایا۔''[2]

اس حدیث کی شاہد ایک دوسری حدیث بھی ہے، جو سنن ابو داود و ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ، مسند ابوعوانہ، سنن دارقطنی و بیہقی اور مسند احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« إِنَّ رَجُلًا جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ وَقَدْ تَوَضَّأَ، وَتَرَكَ عَلَىٰ قَدَمِهِ مِثْلَ مَوْضِعِ الظُّفُرِ، فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: إِرْجِعْ أَحْسِنْ وُضُوءَكَ »[3]

''ایک آدمی نبیِ اکرم ﷺ کے پاس آیا جو وضو کر چکا تھا، مگر اس کے پاؤں پر ناخن برابر جگہ خشک چھوٹ گئی تھی۔ نبیِ اکرم ﷺ نے اسے فرمایا: لوٹ جاؤ اور اچھی طرح وضو کر کے آؤ۔''

اس کی شاہد ہی ایک تیسری حدیث بھی ہے، جو صحیح مسلم، مسند ابی عوانہ، سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس کا مفہوم بھی مذکورہ حدیث والا ہی ہے۔[4]

ان احادیث کے پیشِ نظر یہ تو واضح بات ہے کہ اگر اعضائے وضو میں سے کوئی خشک رہ جائے تو دوبارہ از سرِ نو وضو کیا جائے اور اگر اس وضو سے نماز شروع کر دی ہو تو معلوم ہوتے ہی نماز توڑ دی

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦١)

[2] المنتقىٰ مع النيل (١/ ١/ ٣٠٥ـ ٣٠٦) إرواء الغليل (١/ ٢٦ـ ١٢٧) و صححه.

[3] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٦٥) الإرواء (١/ ٢٧) و صححه، نيل الأوطار (١/ ١/ ٢٠٦) و المنتقىٰ (١/ ١/ ٣٠٠)

[4] الإرواء (١/ ١٢٧) و المنتقىٰ مع النيل (١/ ١/ ٢٠٦)

جائے اور وہ بھی وضو کر کے دوبارہ ادا کی جائے۔ انھی احادیث کی بنا پر کثیر اہلِ علم نے اعضاے وضو کو دھونے میں موالات یا تسلسل کو واجب قرار دیا ہے، لیکن بعض محققین اس کے وجوب کے قائل نہیں ہیں۔ وجوب کے قائلین میں سے جمہور اہلِ علم ہیں، جن میں امام اوزاعی، مالک، احمد بن حنبل اور ایک قول میں امام شافعی رحمہم اللہ بھی شامل ہیں، جب کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ایک دوسرے قول کے مطابق امام شافعی رحمہ اللہ وجوبِ تسلسل کے قائل نہیں ہیں۔

قائلینِ وجوب کا استدلال اس طرح ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ایک آدمی کے پاؤں پر درہم کے برابر جگہ خشک دیکھی تو اسے وضو کرنے کا حکم دیا۔ یہ نہیں فرمایا کہ صرف اتنی جگہ کو جا کر گیلا کر کے آجاؤ۔ اس کے علاوہ بعض اور احادیث بھی ہیں، جن سے وجوبِ تسلسل پر استدلال کیا جاتا ہے۔ جیسے سنن ابن ماجہ، دارقطنی، بیہقی، مسند ابو یعلی اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک حدیث مروی ہے، جس میں مذکور ہے:

«إِنَّهُ ﷺ تَوَضَّأَ عَلٰى الْوَلَاءِ، وَقَالَ: هٰذَا وُضُوْءٌ، لَا يَقْبَلُ اللّٰهُ الصَّلَاةَ إِلَّا بِهِ»[1]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا، جس کے دوران میں تسلسل قائم رکھا اور آخر میں فرمایا کہ وضو یہ ہے۔ ایسے وضو کے سوا اللہ تعالیٰ نماز قبول نہیں کرتا۔''

اگر یہ روایت صحیح ہوتی تو وجوبِ تسلسل کی بڑی زبردست دلیل تھی، مگر امام ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ میں نے ابو زرعہ سے اس روایت کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے اسے بیکار، منکر اور ضعیف کہا ہے اور ایک دفعہ تو اسے بے اصل قرار دیا۔

امام دارقطنی نے اسے غرائبِ مالک میں بیان کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ وجوبِ موالات یا تسلسل اگرچہ جمہور اہلِ علم کا مسلک ہے، لیکن اس کے وجوب پر دلالت کرنے والی واضح اور صریح نص کوئی نہیں۔ امام ابن قدامہ کا رجحان وجوب کی طرف ہی ہے، جب کہ امام شوکانی اور امیر صنعانی رحمہما اللہ کے انداز سے عدمِ وجوب کا رجحان مترشح ہوتا ہے۔ بعض دیگر محققین کا میلان بھی عدمِ وجوب کی طرف ہی ہے۔[2]

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١٩) الإرواء (١/ ١٢٥) نيل الأوطار (١/ ١/ ٢٠٦)

[2] اس موضوع کی تفصیل: المغني (١/ ١/ ١٩، ٩٢) نيل الأوطار (١/ ١/ ٢٠٦مصر) سبل السلام شرح بلوغ المرام (١/ ١/ ٥٤ مصر) اور سلسلة الأحاديث الصحيحة (١/ ٤٦٦) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

13- ترتیب

اعضائے وضو کو دھونے میں موالات وتسلسل کی طرح ہی ترتیبِ اعضا کا مسئلہ بھی ہے۔ اہلِ علم میں ترتیب کے بارے میں بھی دو مسلک ہیں۔ ایک یہ کہ اعضائے وضو کو دھونے میں ترتیب واجب ہے۔ یہ مسلک امام احمد بن حنبل، امام شافعی، ابوثور اور ابو عبید رحمہم اللہ کا ہے۔ ان کے نزدیک آیتِ وضو میں ایک قرینہ موجود ہے، جو ترتیب کے وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ ایسے ہی ان کا کہنا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کا طریقہ جس نے بھی بیان کیا ہے، ترتیب وار ہی بیان کیا ہے۔ سنن ابن ماجہ، دارقطنی، بیہقی، مسند ابویعلیٰ اور مسند احمد والی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ولاء والی روایت سے بھی استدلال کیا جاتا ہے، مگر جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، وہ حدیث سخت ضعیف ہے۔[1]

یہی وجہ ہے کہ ایک روایت میں امام احمد بن حنبل، اسی طرح امام مالک، امام سفیان ثوری اور احناف رحمہم اللہ کا مسلک عدمِ وجوب کا ہے۔ حضرت سعید بن مسیّب، امام عطاء اور حسن بصری رحمہم اللہ بھی عدمِ وجوب کے قائل ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، مکحول، زہری، نخعی اور اوزاعی رحمہم اللہ سے مروی ہے کہ اگر کوئی شخص سر کا مسح کرنا بھول جائے اور اس کی ڈاڑھی میں تری باقی ہو تو وہ اس تری سے سر کا مسح کر لے۔[2] انھوں نے اسے دوبارہ پاؤں دھونے کا حکم نہیں دیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ترتیب واجب نہیں۔ امام ابن المنذر کا اختیار بھی یہی ہے، جب کہ مغنی ابن قدامہ میں حضرت علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے آثار نقل کیے گئے ہیں، جو ترتیب کے غیر واجب ہونے کا پتا دیتے ہیں۔[3]

امام شوکانی رحمہ اللہ نے بھی سنن دارقطنی، بیہقی، مسندِ احمد اور مصنف ابن ابی شیبہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ

---

[1] إرواء الغليل (١/ ١٢٥۔ ١٢٦) نيل الأوطار (١/ ١/ ٢٠٦)

[2] مجمع الزوائد میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ڈاڑھی کی تری والی بات طبرانی اوسط کے حوالے سے مروی ہے، مگر علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس کی سند میں ''نہشل بن سعید'' ہے، جو کذاب ہے۔ (مجمع الزوائد: ١/ ١/ ٢٤٥ بیروت)

[3] المغني (١/ ١٨٩۔ ١٩١) وبه قال الألباني في الإرواء (١/ ١٢٩)

کے آثار نقل کر کے اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی عدمِ وجوب ہی کا فیصلہ دیا ہے۔[1] البتہ امیر صنعانی کا رجحان "سبل السلام" (۱/ ۱/ ۵۰) میں وجوب کی طرف ہے۔ الغرض اعضاے وضو کو دھوتے وقت ترتیب کا خیال رکھنا چاہیے۔ وجوباً نہیں تو استحباباً اور ندباً ہی سہی۔ وضو کی جو مسنون کیفیت بیان کی جا چکی ہے، اس کے مطابق جب پوری طرح وضو سے فارغ ہو جائیں، یعنی پاؤں دھو کر یا ان پر مسح کر کے کھڑے ہوں تو اب یہاں تین کام کرنے ثابت ہیں:

1. ایک آدھ گھونٹ پانی پینا۔
2. مردوں کے لیے شرم گاہ پر پانی کا چھینٹا مارنا۔
3. تکمیلِ وضو کی دعا کرنا۔

بلکہ ان میں یہاں تین اور مسائل کا اضافہ بھی کر لیں۔ ایک وضو کر کے تولیے وغیرہ سے ہاتھ پونچھنا، دوسرا دو رکعتیں "تحية الوضوء" کے طور پر پڑھنا اور تیسرا تیمّم کا طریقہ ومشروعیت ہے۔ آیئے یکے بعد دیگرے ان تینوں بلکہ چھے امور کی کچھ تفصیل دیکھیں۔

ایک آدھ گھونٹ پانی پینا:

یہ تو معروف ہے کہ بیٹھ کر ہی کھانا اور پینا چاہیے۔ یہ بات کھانے پینے کے آداب میں سے شمار ہوتی ہے اور اس کی بڑی تاکید بھی آئی ہے۔

① مثلاً صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ زَجَرَ عَنِ الشُّرْبِ قَائِمًا»[2]

"نبیِ اکرم ﷺ نے کھڑے ہو کر پینے سے ڈانٹا ہے۔"

② صحیح مسلم ہی میں حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهٰى عَنِ الشُّرْبِ قَائِمًا»[3]

---

[1] نيل الأوطار (۱/ ۱/ ۲۰۱، ۲۰۲) فتح الباري (۱/ ۲۷۰)

[2] صحيح مسلم مترجم اردو (۵/ ۲۶۲) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۱۷۷)

[3] صحيح مسلم مترجم اردو (۵/ ۲۶۲) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۵۳۱) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۱٦۱) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۳٤۲٤)

''نبی کریم ﷺ نے کھڑے ہو کر پینے سے منع فرمایا۔''

③ صحیح مسلم ہی میں ایک تیسری حدیث حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی ہے:

«لَا يَشْرَبَنَّ أَحَدٌ مِّنْكُمْ قَائِمًا فَمَنْ نَسِيَ فَلْيَسْتَقِيْ»[1]

''تم میں سے کھڑے ہو کر کوئی ہر گز نہ پیے اور اگر کوئی بھول کر پی بیٹھے تو اسے چاہیے کہ قے کر دے۔''

معمولی فرق کے ساتھ یہی حدیث مسند احمد اور ابن حبان میں بھی مروی ہے۔

④ صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک اور حدیث میں ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهٰى أَنْ يَّشْرَبَ الرَّجُلَ قَائِمًا»[2]

''نبیِ اکرم ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ کوئی شخص کھڑے ہو کر کچھ پیے۔''

اسی حدیث کے آخر میں حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کھڑے ہو کر کھانے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا:

''ذَاكَ أَشَرُّ أَوْ أَخْبَثُ''[3] ''یہ تو اور بھی بدتر یا خبیث تر ہے۔''

یہ سب احادیث تو عام آدابِ اکل و شرب کا پتا دے رہی ہیں، جب کہ بعض صورتوں میں کھڑے ہو کر پینا بھی جائز ہے۔

① مثلاً صحیح مسلم میں، جہاں مذکورہ چاروں احادیث وارد ہوئی ہیں، ان میں سے اگلے ہی باب میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں:

«سَقَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مِنْ زَمْزَمَ فَشَرِبَ وَهُوَ قَائِمٌ»[4]

''نبیِ کریم ﷺ کو میں نے آبِ زمزم پلایا تو آپ ﷺ نے کھڑے کھڑے ہی پی لیا۔''

② جب کہ یہی حدیث ''صحيح البخاري، كتاب الأشربة، باب الشرب قائماً'' میں

[1] صحیح مسلم مترجم (۵/ ۲۶۳) السلسلة الصحيحة (۱/ ۲/ ۱۲۶) طبع المكتب الاسلامي.

[2] صحیح مسلم مترجم (۵/ ۲۶۲) صحيح الجامع، رقم الحديث (۶۸۲۹)

[3] صحیح مسلم تحقيق محمد فؤاد عبد الباقي (۳/ ۱۶۰۰، ۱۶۰۱) فتح الباري (۱۰/ ۸۲) و الصحيحة (۱/ ۲/ ۱۲۸)

[4] صحیح مسلم (۳/ ۱۶۰۱) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۳۴۲۲)

بھی ہے جہاں الفاظ یوں ہیں:

«شَرِبَ النَّبِيُّ ﷺ قَائِمًا مِنْ زَمْزَمَ»[1]

''نبیِ اکرم ﷺ نے کھڑے کھڑے آبِ زمزم پیا۔''

۳ صحیح بخاری، سنن ترمذی، نسائی، مسند احمد اور مسند ابی داود طیالسی میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا واقعہ مذکور ہے کہ انھوں نے ظہر کی نماز ادا کی، پھر لوگوں کی حاجتیں سننے کے لیے کوفے کی ایک کھلی جگہ پر کچہری لگائی، یہاں تک کہ نمازِ عصر کا وقت ہوگیا۔ آپ کو پانی لا کر دیا گیا۔ آپ نے اس میں سے کچھ پیا، پھر چہرہ اور ہاتھ دھوئے۔ سر (کے مسح) اور پاؤں (کے دھونے) کا بھی ذکر ہے۔ آگے راویِ حدیث بیان کرتے ہیں:

«ثُمَّ قَامَ فَشَرِبَ فَضْلَهُ وَهُوَ قَائِمٌ»

''پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور وضو سے بچا ہوا پانی پیا۔''

پھر اس کے بعد فرمایا:

«إِنَّ نَاسًا يَكْرَهُونَ الشُّرْبَ قَائِمًا، وَإِنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَنَعَ مِثْلَ مَا صَنَعْتُ»[2]

''بعض لوگ کھڑے ہو کر پینے کو برا سمجھتے ہیں، حالانکہ نبیِ اکرم ﷺ نے اسی طرح کیا جس طرح میں نے کیا ہے۔''

دوسری روایت کے الفاظ ہیں:

«وَإِنِّي رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَعَلَ كَمَا رَأَيْتُمُونِي فَعَلْتُ»

''میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو ایسے ہی کرتے دیکھا، جس طرح کرتے آپ لوگوں نے مجھے دیکھا ہے۔''

یہاں آبِ زمزم کے سلسلے میں تو صرف اتنی سی بات پیشِ نظر رکھیں کہ بعض لوگ اس حدیث کی بنا پر آبِ زمزم کو کھڑے ہو کر پینا اس کے آداب میں سے شمار کرتے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے،

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١٠/ ٨١)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١٠/ ٨١) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٤، ٤٥) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١٦٢) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٢٦، ١٣٢)

بلکہ یہ زیادہ سے زیادہ محض بیانِ جواز کے لیے ہے۔[1]

وضو کر لینے کے بعد کھڑے ہو کر وضو سے بچے ہوئے پانی سے دو ایک گھونٹ پینا بھی ان احادیث کی رو سے جائز ہے، بلکہ "تحفة الأحوذي شرح سنن الترمذي" میں علامہ عبد الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے عبد المالک کے حوالے سے لکھا ہے کہ وضو چونکہ عبادت ہے اور جس پانی سے یہ عبادت بجا لائی گئی ہے، اسی کے بچے ہوئے سے کچھ پی لینا باعثِ برکت ہے اور اس کا کھڑے ہو کر پینا بہتر ہے، تاکہ امت کو اس بات کی تعلیم دی جائے کہ اس موقع پر کھڑے ہو کر پینا جائز ہے۔[2]

کھڑے ہو کر پانی پینے کے جواز اور ممانعت پر دلالت کرنے والی دونوں طرح کی احادیث وارد ہونے کی بنا پر اہلِ علم نے اس سلسلے میں متعدد آرا ظاہر کی ہیں، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، البتہ "فتح الباري" (۱۰/ ۸۱ تا ۸۵) اور "تحفة الأحوذي" (۱/ ۱۶۴، ۱۶۵، ۶/ ۳۔۷) میں اس کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔ مختصراً یہ کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے سب سے احسن، سلیم تر اور اعتراض سے بعید تر مسلک امام خطابی اور ابن بطال رحمہما اللہ کی اس رائے کو قرار دیا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ کھڑے ہو کر پانی پینے کی ممانعت والی احادیث کو نہی تنزیہی پر محمول کیا جائے اور دوسری احادیث کو بیانِ جواز پر، جب کہ ایک رائے میں کھڑے ہو کر پینے کو طبی طور پر نقصان دہ قرار دیا گیا ہے۔[3]

شرم گاہ پر پانی کا چھینٹا مارنا:

وضو کر کے جب کھڑے ہوں تو شرم گاہ پر پانی کا چھینٹا مارنا مشروع اور مفید ہے، اگرچہ اس موضوع کی احادیث میں یہ صراحت تو نہیں کہ یہ عورتوں کے لیے نہیں، بلکہ مردوں کے لیے ہے، لیکن اس چھینٹے کی وجہ اور فائدہ اس بات کا پتا دیتا ہے کہ یہ مردوں کے ساتھ خاص ہے، جیسا کہ تفصیل میں آگے آئے گا۔ اس چھینٹے کی مشروعیت پر دلالت کرنے والی احادیث تو متعدد ہیں، لیکن ان میں سے بعض کی سند ضعیف اور بعض کی حسن اور مجموعی حیثیت سے یہ حدیث صحیح کے درجے کو پہنچ جاتی ہے، چنانچہ "تحفة الأحوذي" میں علامہ الرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

---

[1] دیکھیں: فتح الباري (۳/ ٤٩٣)

[2] تحفة الأحوذي (۱/ ۱٦٤)

[3] فتح الباري (۱۰/ ۸٤)

”وَفِي الْبَابِ أَحَادِيثُ عَدِيدَةٌ، مَجْمُوعُهَا تَدُلُّ عَلٰى أَنَّ لَهٗ أَصْلًا“[1]

”اس موضوع کی احادیث متعدد ہیں اور ان سب کا مجموعہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس حدیث کی کوئی اصل ضرور ہے۔“

جب کہ دورِ حاضر کے معروف محدث علامہ البانی رحمہ اللہ نے مشکوٰۃ شریف کی تحقیق میں اس حدیث کی سند کو شدید اضطراب کی وجہ سے ضعیف قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

”لٰكِنَّ الْحَدِيثَ صَحِيحٌ لِشَوَاهِده“

”لیکن یہ حدیث اپنے شواہد کی بنا پر صحیح ہے۔“

آگے لکھتے ہیں کہ ان شواہد میں سے میں نے بعض ”سنن أبي داود“ (ص: ۱۵۹) میں ذکر کیے۔ ایک شاہد تو ”مشكاة المصابيح“ ہی میں (حدیث نمبر ۳۶۶) ہے، جس کی سند کو موصوف نے حسن درجے کی قرار دیا ہے۔ اس فنّی تفصیل سے معلوم ہوا کہ چھینٹا مارنے کی مشروعیت پر دلالت کرنے والی احادیث مجموعی طور پر صحیح ہیں، اگرچہ انفرادی طور پر ان کی اسانید متکلم فیہ ہیں۔

1. ان میں سے پہلی حدیث سنن ابو داود، نسائی اور ابن ماجہ میں مروی ہے، جس میں حکم بن سفیان یا سفیان بن حکم ثقفی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا بَالَ يَتَوَضَّأُ وَ يَنْتَضِحُ» وَفِي رِوَايَة: «ثُمَّ نَضَحَ فَرْجَهٗ»[2]

”نبیِ اکرم ﷺ پیشاب کرنے کے بعد وضو کرتے، پھر شرم گاہ پر چھینٹا بھی مارتے۔“

ایک روایت میں ہے: ”پھر آپ ﷺ نے شرم گاہ پر چھینٹا مارا۔“

امام ترمذی، منذری اور ابن عبدالبر نے کہا ہے کہ اس حدیث کی سند میں اضطراب ہے، لیکن شواہد کی بنا پر شیخ البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔[3]

2. ایک حدیث سنن ترمذی و ابن ماجہ میں مروی ہے، جس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً بیان

---

[1] تحفة الأحوذي (١/ ١٦٩)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٢) مختصر سنن أبي داود للمنذري مع معالم السنن و التهذيب (١/ ١٢٥۔ ١٢٦) صحيح سنن النسائي (١٣٠۔ ١٣١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٦١)

[3] مختصر السنن أيضاً، تحقيق المشكاة (١/ ١١٦) و سنن الترمذي مع تحفة الأحوذي (١/ ١٦٩۔ ١٧٠)

فرماتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«جَاءَ نِي جِبْرِيْلُ فَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ إِذَا تَوَضَّأْتَ فَانْتَضِحْ»[1]

''حضرت جبرائیل علیہ السلام میرے پاس آئے اور کہنے لگے: اے محمد ﷺ! جب آپ ﷺ وضو کریں تو چھینٹا مارا کریں۔''

اس حدیث کی سند کے ایک راوی حسن بن علی ہاشمی ہیں، جن پر امام بخاری، ترمذی، نسائی، احمد، ابو حاتم اور دارقطنی نے کلام کیا ہے۔ اسی حدیث کو ضعیف السند قرار دیتے ہوئے ''تحفة الأحوذي'' کے مولف نے لکھا ہے کہ اس موضوع کی متعدد احادیث ہیں، جن کا مجموعہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ان کی کوئی اصل ہے۔[2]

٣ ایک تیسری حدیث حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے سنن ابن ماجہ، دارقطنی اور مسندِ احمد میں مروی ہے، جس میں وہ نبیِ اکرم ﷺ سے بیان کرتے ہیں:

«إِنَّ جَبْرِيْلَ أَتَاهُ أَوَّلَ مَا أُوْحِيَ إِلَيْهِ فَعَلَّمَهُ الْوُضُوْءَ وَالصَّلَاةَ، فَلَمَّا فَرَغَ مِنَ الْوُضُوْءِ أَخَذَ غَرْفَةً مِنْ مَّاءٍ فَنَضَحَ بِهَا فَرْجَهُ»[3]

''حضرت جبرائیل علیہ السلام نزولِ وحی کے آغاز ہی میں ایک مرتبہ آئے، تو انھوں نے آپ ﷺ کو وضو اور نماز کا طریقہ سکھلایا۔ جب وہ وضو سے فارغ ہوئے تو انھوں نے پانی کا چلو لیا اور شرم گاہ پر چھینٹا مارا۔''

سنن ابن ماجہ میں یہ الفاظ ہیں:

«عَلَّمَنِيْ جِبْرِيْلُ الْوُضُوْءَ، وَأَمَرَنِيْ أَنْ أَنْضَحَ تَحْتَ ثَوْبِيْ لِمَا يَخْرُجُ مِنَ الْبَوْلِ بَعْدَ الْوُضُوْءِ»[4]

''جبرائیل علیہ السلام نے مجھے وضو سکھایا تو اس بات کا حکم دیا کہ میں اپنے کپڑے کے نیچے چھینٹا ماروں، جو وضو کے بعد نکلنے والے پیشاب کے قطرے کا علاج ہے۔''

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٥٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٦٤) و مشكاة المصابيح (١/ ١١٨)

[2] سنن الترمذي و التحفة (١/ ١٦٩)

[3] سنن الدار قطني مع التعليق المغني (١/ ١/ ١١١) مشكاة المصابيح (١/ ١١٧۔ ١١٨)

[4] سنن ابن ماجه (١/ ١٥٧) تحقيق محمد فؤاد.

اس حدیث کی سند میں ابن لہیعہ معروف متکلم فیہ راوی ہے، لیکن شواہد کی بنا پر اس کو حسن درجے کی حدیث قرار دیا گیا ہے۔[1]

۴ مسند احمد اور سنن دارقطنی میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں چھینٹے کی کیفیت پر مبنی الفاظ یوں ہیں:

«فَرَشَّ بِهَا نَحْوَ الْفَرْجِ»[2]

''پھر جب وہ وضو سے فارغ ہوئے تو انھوں نے شرم گاہ کی طرف چھینٹا مارا۔''

اس حدیث کے ایک راوی ''رشدین'' کی بعض ائمہ نے توثیق کی ہے اور بعض نے اسے ضعیف کہا ہے۔[3]

۵ چھینٹا مارنے کی کیفیت کے علاوہ مصنف عبدالرزاق میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت مروی ہے، جسے ''تحفة الأحوذي'' میں علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ کسی شخص نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ شکایت کی:

«إِنِّي أَكُونُ فِي الصَّلَاةِ فَيَتَخَيَّلُ لِي أَنَّ بِذَكَرِي بَلَلًا، قَالَ: قَاتَلَ اللّٰهُ الشَّيْطَانَ! إِنَّهُ يَمَسُّ ذَكَرَ الْإِنْسَانِ لِيُرِيَهُ أَنَّهُ قَدْ أَحْدَثَ، فَإِذَا تَوَضَّأْتَ فَانْضَحْ فَرْجَكَ بِالْمَاءِ، فَإِنْ وَجَدْتَّ فَقُلْ هُوَ مِنَ الْمَاءِ فَفَعَلَ ذٰلِكَ فَذَهَبَ»[4]

''میں نماز میں ہوتا ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ جیسے میرے آلہ تناسل پر تری لگی ہے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ شیطان کو غارت کرے، وہ انسان کے آلہ تناسل کو چھوکر اسے اس احساس میں مبتلا کر دیتا ہے کہ اس کا وضو (قطرہ نکلنے سے) ٹوٹ گیا ہے، جب تم وضو کرو تو شرم گاہ پر چھینٹا مارلو اور پھر اگر (پیشاب کا قطرہ نکلنے کا) احساس ہو تو دل میں کہہ لو کہ تری تو اس چھینٹے کی ہے، جو خود میرا اپنا مارا ہوا ہے۔ اس آدمی نے اس ترکیب پر عمل کیا تو اس کا یہ مرضِ وسواس ختم ہو گیا۔''

---

[1] تحقيق المشكاة (١/ ١١٨) و تحقيق سنن ابن ماجه (١/ ١٥٧)

[2] مسند أحمد، و اللفظ له، بحواله تحفة الأحوذي و سنن الدارقطني مع التعليق (١/ ١/ ١١١)

[3] مجمع الزوائد (١/ ١/ ٢٤٧) التعليق المغني (١/ ١/ ١١٢) تحفة الأحوذي (١/ ١٧٠)

[4] تحفة الأحوذي (١/ ١٦٩)

اس موضوع کی اور احادیث بھی ہیں، مگر ہم ان پانچ روایتوں ہی پر اکتفا کرتے ہیں، کیوں کہ انھی میں چھینٹا مارنے کی مشروعیت، اس کی کیفیت، سبب اور فائدہ سبھی امور آگئے ہیں۔ پیشاب کے بعد استنجا اور وضو کر لینے کے بعد پھر پیشاب کی نالی سے قطرہ آنے کا مرض یا وہم صرف مردوں ہی کو ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان احادیث کے مجموعی مفاد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم نے اس چھینٹا مارنے کو مردوں کے ساتھ خاص کہا ہے۔ ویسے اگر محض اس سنت پر عمل پیرا ہونے کے لیے کوئی عورت بھی گیلے ہاتھوں کا چھینٹا کپڑے پر مار لے تو نیت پر ثواب ہوگا۔ چادر کا استعمال کرنے والوں کے لیے کپڑا اٹھا کر چھینٹا مارنا آسان ہے۔ ویسے اوپر سے کپڑے ہی پر چھینٹا مار لیا جائے تو مسند احمد اور سنن دارقطنی والی حدیثِ اسامہ رضی اللہ عنہ کے الفاظ: ﴿ فَرَشَّ بِهَا نَحْوَ الْفَرْجِ ﴾ سے اس کیفیت کا بھی پتا چلتا ہے اور دفعِ وسواس کا مقصود بھی اس طرح حاصل ہوسکتا ہے۔

امام ابن العربی نے "عارضة الأحوذي" میں "نضح" کے مختلف معانی بیان کیے ہیں اور اہلِ علم کے اس سلسلے میں چار اقوال بالتفصیل نقل کیے ہیں۔ اسی طرح "معالم السنن" میں امام خطابی رحمہ اللہ نے بھی "نضح" کے مختلف معانی لکھے ہیں، جب کہ "عارضة الأحوذي" اور "عون المعبود" میں امام نووی رحمہ اللہ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ ان کے نزدیک جمہور اہلِ علم نے ان احادیث میں "نضح" سے مراد چھینٹا مارنا ہی لیا ہے۔

امام ابن العربی رحمہ اللہ نے بھی اس چھینٹے کا یہ فائدہ ذکر کیا ہے کہ جس شخص کو وضو کے بعد پیشاب کا قطرہ آنے کی بیماری یا وسواس ہو، وہ اس سے ٹھیک ہو جاتا ہے۔ امام منذری رحمہ اللہ کی "مختصر سنن أبي داود" کی شرح "معالم السنن" میں امام خطابی رحمہ اللہ نے بھی اس سے شیطانی وسوسے کے ازالے کا تذکرہ کیا ہے۔ صحیحین، سنن اربعہ، موطا امام مالک اور سنن رزین کو یکجا کر کے امام ابن الاثیر رحمہ اللہ نے ایک کتاب ترتیب دی ہے، جو عہدِ قدیم سے لے کر آج تک "جامع الأصول" کے نام سے اہلِ علم سے خراج تحسین وصول کرتی آرہی ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں بعض کلمات کی تشریح بھی کی ہے اور "نضح" کے ضمن انھوں نے بھی لکھا کہ بعض دفعہ انسان محسوس کرتا ہے کہ اس کے آلہ تناسل سے پیشاب کا کوئی قطرہ نکلا ہے، ایسا شخص اگر وضو کے بعد پانی کا چھینٹا مار لیتا ہے تو کسی تری وغیرہ کے نکلنے کا وسوسہ ہوتے ہی معاً اس کی دلجمعی اس امر سے ہو جائے

گی کہ یہ جگہ تو میرے چھینٹا مارنے سے گیلی ہوئی ہے۔[1]

سُنّت کی سُنّت، علاج کا علاج۔ اسے ہی کہتے ہیں: ''ہم خرما، ہم ثواب''

تکمیلِ وضو کی دعا:

جب وضو مسنون طریقے کے مطابق مکمل کرلیں تو کلمہ شہادت پڑھیں اور دربارِ رسالت مآب ﷺ سے جنت کی خوش خبری پائیں، کیوں کہ صحیح مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد اور سنن بیہقی میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ يَتَوَضَّأُ فَيُسْبِغُ الْوُضُوْءَ، ثُمَّ يَقُوْلُ: أَشْهَدُ أَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اِلَا فُتِحَتْ لَهٗ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ الثَّمَانِيَةُ يَدْخُلُ مِنْ أَيِّهَا شَآءَ»[2]

''تم میں سے جو شخص وضو کرے اور اچھی طرح سے وضو کر لے، پھر یہ کہے: ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبودِ برحق نہیں، وہ یکتا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔'' اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ ان میں سے وہ جس سے چاہے داخل ہو جائے۔''

سنن ابی داود، سنن دارمی اور مسند احمد کی ایک روایت میں آسمان کی طرف نظریں اٹھا کر کلمہ شہادت پڑھنے کا بھی ذکر آیا ہے، مگر اس کی سند میں ایک راوی ابن عمِّ عقیل مجہول ہے اور نظریں اٹھانے والا اضافہ منکر ہے۔[3]

سنن ترمذی شریف میں اختتامِ وضو کی دعا میں کلمہ شہادت کے علاوہ یہ الفاظ بھی مروی ہیں:

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: معالم السنن (١/ ١٢٥) عون المعبود (١/ ٢٨٥۔ ٢٨٧) تحفة الأحوذي (١/ ١٦٧، ١٧٠)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١١٨، ١١٩) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٥) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٨) سنن الترمذي مع التحفة (١٠٠/ ١٧٩، ١٨٢) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٧٠) و صحيح الترغيب، رقم الحديث (٢١٩) المنتقىٰ مع النيل (١/ ١/ ١٧٣، ١٧٤) إرواء الغليل (١/ ١٣٤)

[3] نيل الأوطار (١/ ١٧٤) إرواء الغليل (١/ ١٣٥)

«اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِي مِنَ التَّوَّابِيْنَ، وَاجْعَلْنِي مِنَ الْمُتَطَهِّرِيْنَ »[1]

اس اضافے کے بغیر تو مذکورہ بالا حدیث صحیح مسلم اور دیگر کتب میں بھی مذکور ہے، جو ہر قسم کے اضطراب سے صحیح و سالم ہے۔ البتہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس اضافے والی روایت کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی سند میں اضطراب ہے، جب کہ دیگر کبار محدّثین نے اس اضطراب کو مرجوح قرار دیا ہے اور اس اضافے کو بزار، طبرانی نے معجم کبیر اور اوسط میں اور ابن السنی نے ''عمل اليوم و الليلة'' میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے اور ابن ماجہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بھی بیان کیا ہے۔ لہٰذا اس اضافے کو بھی صحیح قرار دیا گیا ہے، جس کی تفصیل ''التلخيص الحبير'' (۱/ ۱/ ۱۰۱، ۱۰۲) ''نيل الأوطار'' (۱/ ۱/ ۱۷٤) ''تحفة الأحوذي'' (۱/ ۱۸۰۔ ۱۸۲) ''إرواء الغليل'' (۱/ ۱۳۵) اور ''تحقيق المشكاة'' (۱/ ۹۵) میں دیکھی جا سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ کلمہ شہادت کے بعد یہ دعا بھی کہہ لینی چاہیے، کیوں کہ یہ بھی صحیح اور ثابت ہے۔

تولیے وغیرہ کا استعمال:

وضو سے فارغ ہو جانے کے بعد اپنے ہاتھ منہ کو تولیے، رومال یا کسی دوسرے کپڑے سے پونچھا جا سکتا ہے، جس کا پتا کئی احادیث سے چلتا ہے۔

(۱) مثلاً صحیح بخاری و مسلم میں حضرت اُمِ ہانی رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

« قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِلٰى غُسْلِهِ فَسَتَرَتْ عَلَيْهِ فَاطِمَةُ، ثُمَّ أَخَذَ ثَوْبَهُ فَالْتَحَفَ بِهِ »[2]

''نبیِ اکرم ﷺ غسل فرمانے لگے تو آپ ﷺ کی لختِ جگر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کے لیے پردے کا انتظام کیا۔ پھر (غسل سے فارغ ہوکر) آپ ﷺ نے اپنا کپڑا لیا اور اسے اپنے بدنِ مبارک پر لپیٹا۔''

(۲) ایسے ہی ابن ماجہ اور عمل اليوم والليلة نسائی میں حضرت قیس بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

---

[1] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٤٨) صحيح الترغيب، رقم الحديث (٢١٩)

[2] صحيح البخاري مع عمدة القاري (٢/ ٣/ ١٩٥ دار الفكر۔ بيروت) صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٣٥٧، ٦١٥٨) صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ٢٩) واللفظ له، سنن الترمذي مع تحفة الأحوذي (١/ ٧٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٦٥)

«أَتَانَا النَّبِيُّ ﷺ فَوَضَعْنَا لَهُ مَآءًا فَاغْتَسَلَ ثُمَّ أَتَيْنَاهُ بِمِلْحَفَةٍ وَرْسِيَّةٍ فَاشْتَمَلَ بِهَا فَكَأَنِّي أَنْظُرُ إِلٰى أَثَرِ الْوَرْسِ عَلَيْهِ»[1]

''نبیِ اکرم ﷺ ہمارے یہاں تشریف لائے تو ہم نے آپ ﷺ کے لیے پانی رکھا، جس سے آپ ﷺ نے غسل فرمایا، پھر ہم نے آپ ﷺ کو ورس لگا ہوا کپڑا (تولیے) دیا، جسے آپ ﷺ نے اپنے جسم سے لپٹا لیا، میں گویا آپ ﷺ پر ورس کا نشان دیکھ رہا ہوں۔''

وضو کے بعد:

ان دونوں حدیثوں میں نبیِ اکرم ﷺ کا غسل کے بعد اپنے بدن کو کپڑے سے سکھانے کا ذکر ہے، وضو کے بعد کا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شارح ترمذی علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ان احادیث سے وضو کے بعد تولیے کے استعمال کے جواز پر استدلال میں انھیں تامّل ہے، جب کہ خاص وضو کے بعد نبیِ اکرم ﷺ کے تولیے سے اعضاے وضو کو پونچھنے کا ذکر متعدد احادیث میں آیا ہے، جن میں سے سنن ترمذی، ابن ماجہ، دارقطنی اور بیہقی میں کئی صحابہ وصحابیات کی روایات موجود ہیں۔[2]

لیکن ان احادیث میں سے محدثینِ کرام کے نزدیک کوئی بھی ضعف سے خالی نہیں۔ حتیٰ کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اس موضوع کی کوئی بھی صحیح حدیث نبیِ اکرم ﷺ سے ثابت نہیں ہے۔ البتہ علامہ عینی رحمہ اللہ نے ''عمدة القاري'' میں امام نسائی رحمہ اللہ کی کتاب ''الکنیٰ'' کے حوالے سے ایک حدیث نقل کی ہے اور اس کی سند کو بھی صحیح قرار دیا ہے، جس میں ایک صحابیِ رسول ﷺ کے حوالے سے ابو مریم ایاس بن جعفر بیان کرتے ہیں:

1 «إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ لَهُ مِنْدِيلٌ أَوْ خِرْقَةٌ، يَمْسَحُ بِهَا وَجْهَهُ إِذَا تَوَضَّأَ»[3]

''نبیِ اکرم ﷺ کا ایک (رومال) یا کپڑا تھا، جس سے آپ وضو کے بعد چہرہ مبارک پونچھا کرتے تھے۔''

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٦٦) و صححه ابن حزم، قاله العيني۔ دیکھیں: تلخيص الحبير (١/ ٩٩)

[2] دیکھیں: سنن الترمذي مع التحفة (١/ ١٧٤۔ ١٧٩) سنن ابن ماجه (١/ ١٥٨) سنن الدارقطني (١/ ١/ ١١٠) تلخيص الحبير (١/ ١/ ٩٨، ٩٩)

[3] عمدة القاري (٢/ ٣/ ١٩٥) دار الفكر۔ بيروت.

اس حدیث کو علامہ عینی نے "عمدة القاري شرح صحيح البخاري" میں صحیح قرار دیا ہے، جب کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "التلخيص الحبير" میں اسے مرسل کہا ہے۔[1]

2 سنن ترمذی و دارقطنی، مستدرک حاکم اور سنن بیہقی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كَانَتْ لِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ خِرْقَةٌ يَنْشِفُ بِهَا بَعْدَ الْوُضُوءِ»[2]

"نبی اکرم ﷺ کا ایک کپڑا (تولیا یا رومال) تھا، جس سے آپ ﷺ وضو کے بعد اعضائے وضو کو پونچھا کرتے تھے۔"

اس حدیث کو امام ترمذی نے "ليس بالقائم" کہہ کر اور تلخیص میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی ضعیف قرار دیا ہے، لیکن امام حاکم رحمہ اللہ نے مستدرک میں اسے صحیح کہا ہے اور علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ نے ترمذی کی جو تحقیق کی ہے، اس میں تفصیل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔[3]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ وضو اور غسل کے بعد تولیے کا استعمال جائز ہے۔ امام ابن المنذر لکھتے ہیں کہ وضو کے بعد حضرت عثمان، حسن بن علی اور انس رضی اللہ عنہم نے تولیہ استعمال کیا ہے اور تابعین میں سے حضرت حسن بصری، ابن سیرین، علقمہ، اسود، مسروق اور ضحاک رحمہم اللہ نے اس کی رخصت دی ہے، جب کہ امام سفیان ثوری، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور احناف تولیے وغیرہ کے استعمال میں کوئی مضایقہ نہیں سمجھتے۔[4]

امام نووی رحمہ اللہ نے وضو اور غسل کے بعد تولیے کے استعمال میں علما کے اختلاف کو پانچ صورتوں میں تقسیم کیا ہے:

1 پہلی رائے یہ ہے کہ استعمال نہ کیا جائے، مگر اسے مکروہ بھی نہ کہا جائے۔

2 دوسری رائے یہ ہے کہ اس کا استعمال مکروہ ہے۔

3 تیسری رائے یہ کہ یہ مباح ہے، جس کا فعل اور ترک برابر ہے۔

---

[1] التلخيص الجير (١/ ١/ ٩٩)

[2] سنن الترمذي مع التحفة (١/ ١٧٤) سنن الدارقطني (١/ ١/ ١١٠) مستدرك الحاكم (١/ ١٥٤) مشكاة المصابيح مع الرعاة (١/ ٤٨٣۔ ٤٨٤) تلخيص الحبير (١/ ١/ ٩٩)

[3] دیکھیں: مرعاة المفاتيح (١/ ٤٨٣، ٤٨٤)

[4] دیکھیں: عمدة القاري (٢/ ٣/ ١٩٥)

4 چوتھی یہ کہ اس کا استعمال مستحب ہے، کیوں کہ اس میں میل کچیل سے احتراز اور نظافت کا پہلو پایا جاتا ہے۔

5 پانچویں رائے یہ ہے کہ موسمِ گرما میں تو تولیے کا استعمال مکروہ ہے، مگر سرما میں نہیں۔ سرما میں یہ مباح ہے۔[1]

علامہ احمد عبد الرحمن البنا نے "الفتح الرباني ترتیب و شرح مسند أحمد الشیباني" (۱/ ۲/ ۱۳۷) میں، علامہ عبدالرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ نے "تحفة الأحوذي شرح سنن الترمذي" (۱/ ۷۸) میں اور علامہ عبید اللہ رحمانی نے "المرعاة شرح المشکاة" (۱/ ۳ ۴۸۳۔ ۴۸۴) میں تولیے کے استعمال کے جائز ہونے کو راجح قرار دیا ہے۔ علامہ عینی رحمہ اللہ کا رجحان "عمدة القاري" (۲/ ۳/ ۱۹۴۔ ۱۹۵) میں اور امام شوکانی رحمہ اللہ کا میلان "نیل الأوطار" (۱/ ۱/ ۲۰۸۔ ۲۰۹) میں عدمِ کراہت کی طرف ہی ہے اور یہی اقرب الی الصواب بات ہے، کیوں کہ کراہت کی کوئی صریح اور صحیح دلیل نہیں ہے، جو ہے وہ یا صریح نہیں یا صحیح نہیں۔

مکروہ کہنے والوں کے دلائل اور ان کا جائزہ:

تولیے کا استعمال مشروع اور جائز ہے، جب کہ بعض کے نزدیک یہ مکروہ ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے دلائل بھی ذکر کیے جائیں اور ان پر اہلِ علم کا تبصرہ وغیرہ نقل کر کے ان کا جائزہ لیا جائے۔ چنانچہ ان کے دلائل میں سے ایک تو صحیح بخاری اور دیگر کتبِ حدیث میں مذکور وہ حدیث ہے، جس میں اُم المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے غسلِ جنابت کا واقعہ بیان فرماتی اور آخر میں بتاتی ہیں:

«ثُمَّ أَتِيَ بِمِنْدِيْلٍ فَلَمْ يَنْفُضْ بِهَا»[2]

''پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رومال یا تولیا دیا گیا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے (اپنے بدن کو) خشک نہیں کیا۔''

صحیح ابن خزیمہ میں مذکور ہے:

---

[1] شرح صحیح مسلم للنووي (۲/ ۳/ ۲۳۱)

[2] صحیح البخاري مع عمدة القاري (۲/ ۳/ ۲۰۶) و صحیح مسلم مع شرح النووي (۲/ ۳/ ۲۳۱)

«فَأُتِيَ بِمِنْدِيلٍ فَأَبٰى أَنْ يَّقْبَلَهٗ»

’’آپ ﷺ کو رومال دیا گیا تو آپ ﷺ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔‘‘

سنن دارمی میں ہے:

«فَأَعْطَيْتُهٗ مِلْحَفَةً فَأَبٰى»[1]

’’میں نے آپ ﷺ کو تولیہ دیا، مگر آپ ﷺ نے انکار کر دیا۔‘‘

صحیح مسلم اور سنن نسائی کے الفاظ ہیں:

«ثُمَّ أَتَيْتُهٗ بِالْمِنْدِيلِ فَرَدَّهٗ»[2]

’’پھر میں نے آپ ﷺ کو تولیہ دیا تو آپ ﷺ نے واپس کر دیا۔‘‘

صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے:

«فَنَاوَلْتُهٗ خِرْقَةً فَقَالَ بِيَدِهٖ هٰكَذَا وَلَمْ يُرِدْهَا»[3]

’’پھر میں نے آپ ﷺ کو کپڑے کا ایک ٹکڑا دیا، مگر آپ ﷺ نے ہاتھ سے اشارہ فرمایا کہ نہیں چاہیے۔‘‘

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ أُتِيَ بِمِنْدِيلٍ فَلَمْ يَمَسَّهٗ، وَجَعَلَ يَقُوْلُ بِالْمَآءِ هٰكَذَا، يَعْنِي يَنْفُضُهٗ»[4]

’’آپ ﷺ کو تولیا دیا گیا، مگر آپ ﷺ نے اسے نہیں چھوا اور جسم پر لگے پانی کو اپنے ہاتھوں سے جھاڑنا شروع کر دیا۔‘‘

حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے مروی اس حدیث کے مختلف کتب میں وارد شدہ مختلف الفاظ سے اخذ کیا گیا ہے کہ تولیے کا استعمال مکروہ ہے، جب کہ اس سلسلے میں امام نووی رحمہ اللہ کے ذکر کردہ پانچ اقوال تو آپ

---

[1] دیکھیں: عمدة القاري (٢/ ٣/ ١٩٤)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٣/ ٢٣١) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٢٤٧)

[3] صحيح البخاري مع عمدة القاري (٢/ ٣/ ٢١٢)

[4] صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٣/ ٢٣٢)

سن چکے ہیں۔ اب اس حدیث سے استدلال کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اس حدیث میں بھی کراہت کی دلیل نہیں ہے، کیوں کہ یہ ایک واقعہ ہے، جس میں تولیا رومال یا کپڑا نہ لینے کے کئی احتمال ہیں، بلکہ ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے عدمِ جواز کے بجائے کسی اور وجہ سے وہ کپڑا نہ لیا ہو، جس کا کپڑے کے استعمال کی کراہت سے کوئی تعلق ہی نہ ہو، بلکہ اس کا تعلق اس کپڑے سے ہو یا آپ ﷺ جلدی میں ہوں یا کوئی دوسری وجہ ہو۔ مہلب کا کہنا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے پانی کی برکت کو باقی رکھنے کے لیے یا تواضع اور انکساری کے پیشِ نظر کپڑا نہ لیا ہو یا وہ کپڑا ریشمی ہو یا اس میں کوئی میل کچیل لگی ہو، جب کہ اسی حدیث کی مسند ابو عوانہ والی روایت میں اسماعیلی کے یہاں اعمش کے یہ الفاظ بھی موجود ہیں کہ میں نے یہ بات ابراہیم نخعی سے کہی، تو انھوں نے فرمایا:

''لَا بَأْسَ بِالْمِنْدِيْلِ، إِنَّمَا رَدَّهٗ مَخَافَةَ أَنْ يَّصِيْرَ عَادَةً''

''رومال کے استعمال میں کوئی مضایقہ نہیں۔ آپ ﷺ نے وہ کپڑا محض اس خدشے سے واپس کر دیا تھا کہ کہیں یہ عادت اور رواج ہی نہ بن جائے۔''

علامہ تیمی نے اس حدیث کی شرح میں کہا ہے:

''اس حدیث میں (کراہت کے بجائے) اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ تولیا وغیرہ استعمال فرمایا کرتے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اُم المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا تولیا یا کپڑا ہرگز نہ لا کر دیتیں۔''

علامہ ابن دقیق العید فرماتے ہیں:

''آپ ﷺ کا اپنے ہاتھوں سے پانی جھاڑنا، اس بات کی دلیل ہے کہ تولیے وغیرہ کے استعمال میں کوئی کراہت نہیں، کیوں کہ ہاتھوں سے جھاڑنا یا تولیے سے پونچھنا دونوں ہی پانی کے ازالے کے طریقے ہیں۔ یہی بات امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں بھی لکھی ہے۔''[1]

---

[1] فتح الباري (١/ ٣٦٣) عمدة القاري (٢/ ٣/ ١٩٤) شرح صحيح مسلم للنووي (٢/ ٣/ ٢٣٢) تحفة الأحوذي (١/١٧٨) و الفتح الرباني (١/ ٢/ ١٣٧)

امام نووی رحمہ اللہ نے نبیِ کریم ﷺ کے ہاتھوں سے پانی جھاڑنے کے الفاظ کی شرح کے دوران یہ بھی لکھا ہے کہ یہ الفاظ غسل و وضو کے بعد جسم سے پانی کو جھاڑنے میں کوئی مضایقہ نہ ہونے کی دلیل ہیں اور اس سلسلے میں ہمارے اصحاب کے تین اقوال ہیں:

1. مستحب یہ ہے کہ اسے ترک ہی کیا جائے، لیکن اسے مکروہ نہ کہا جائے۔
2. یہ مکروہ ہے۔
3. یہ مباح ہے، جس کا فعل ترک دونوں یکساں ہیں۔ اس تیسرے قول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہی ظاہر تر اور مختار قول ہے، کیوں کہ صحیح حدیث میں اس کی اِباحت وارد ہوئی ہے اور اس کی ممانعت میں اصلاً کوئی دلیل ثابت نہیں ہے۔[1]

ابن مسیّب، مجاہد اور ابو العالیہ نے تولیے کے استعمال کو مکرہ شمار کیا ہے۔[2] جب کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں ابن مسیّب اور زہری سے کراہت نقل کی ہے اور مکروہ شمار کرنے والوں کی دلیل یہ ذکر کی ہے:

"إِنَّ الْوَضُوْءَ یُوْزَنُ"[3] "وضو کا پانی تولا جائے گا۔"

مگر یہ بات کئی وجوہات کی بنا پر اس کی دلیل نہیں بن سکتی:

1. زیادہ سے زیادہ یہ امام زہری رحمہ اللہ کا موقوف قول ہے، حدیثِ رسول ﷺ یا کوئی اثرِ صحابی نہیں۔
2. بظاہر اس سے مراد اس پانی کا تولا جانا ہے، جو وضو کے لیے استعمال ہوا ہو نہ کہ وہ پانی جو اعضائے وضو پر باقی ہے۔
3. امام ابن دقیق العید اور امام نووی رحمہما اللہ نے آپ ﷺ کے پانی کو جھاڑنے سے تولیے کے استعمال کے جواز کی دلیل لی ہے، کیوں کہ دونوں ہی پانی کے ازالے کا طریقہ ہیں اور جب جھاڑنا ثابت ہے تو پھر وضو کے پانی کا تولا جانا کوئی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ ثابت ہی نہیں ہوتا کہ اعضائے وضو پر رکا ہوا پانی تولا جائے گا۔

---

[1] شرح صحیح مسلم مع للنووي (٢/ ٣/ ٢٣٢)

[2] عمدة القاري (٢/ ٣/ ١٩٥)

[3] سنن الترمذي مع التحفة (١/ ١٧٧)

تولیے کے استعمال کو مکروہ کہنے والوں کی ایک دلیل ”الناسخ والمنسوخ لابن شاھین“ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

«إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ لَمْ يَكُنْ يَمْسَحُ وَجْهَهٗ بِالْمِنْدِيْلِ بَعْدَ الْوُضُوْءِ، وَلَا أَبُوْ بَكْرٍ، وَلَا عُمَرُ، وَلَا ابْنُ مَسْعُوْدٍ»[1]

”نبیِ اکرم ﷺ، ابوبکر، عمر اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم وضو کے بعد رومال سے چہرہ نہیں پونچھا کرتے تھے۔“

لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ”التلخیص الحبیر“ میں اس حدیث کو نقل کر کے ضعیف قرار دیا ہے۔ لہٰذا اس سے استدلال درست نہیں۔[2]

ان کے علاوہ تولیے وغیرہ کے استعمال کی کراہت کے بعض دوسرے دلائل بھی ذکر کیے گئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ وضو کا پانی قیامت کے دن نور ہوگا، لہٰذا اسے پونچھنا نہیں چاہیے، حالانکہ ان کی یہ بات کراہت کی دلیل نہیں بن سکتی، کیوں کہ اوّل تو اس سے مراد وہ پانی ہے، جو وضو کے لیے استعمال ہوتا ہے نہ کہ صرف وہ پانی جو وضو کے بعد اعضاے وضو پر باقی رہے۔ دوسرے اس پانی کو نبیِ اکرم ﷺ نے اپنے ہاتھوں سے جھاڑا تھا، جیسا کہ صحیح احادیث سے ثابت ہے تو پھر اس کا کپڑے سے پونچھنا کیسے مکروہ ہوسکتا ہے؟ کیوں کہ جھاڑنا اور پونچھنا ایک ہی تو ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ وضو ایک عبادت ہے اور وضو کے اعضا سے پانی کو پونچھنا آثارِ عبادت کو زائل کرنا ہے، لہٰذا مکروہ ہے تو اس سلسلے میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ غسل بھی عبادت ہے اور غسل کے بعد جب نبی ﷺ کا ہاتھوں سے پانی جھاڑنا صحیح احادیث سے ثابت ہے تو پونچھنے کو مکروہ کیسے کہا جاسکتا ہے، جب کہ یہ دونوں طریقے ہی آثارِ عبادت کو زائل کرنے والے ہیں؟

ایسے ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ وضو کا پانی جب تک اعضا کے اوپر رہے، وہ تسبیح بیان کرتا ہے، لہٰذا اس کا پونچھنا مکروہ ہے۔ اس کے جواب میں حضرت ملا علی قاری نے لکھا ہے کہ یہ بھی کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں کہ جب پانی کو پونچھ دیا جائے تو وہ تسبیح بند کر دیتا ہے۔[3]

---

[1] التلخيص الحبير (١/ ١/ ٩٨)

[2] التلخيص الحبير (١/ ١/ ٩٨) تحفة الأحوذي (١/ ١٧٨)

[3] دیکھیں: تحفة الأحوذي (١/ ١٧٧)

مختصر یہ کہ کبر اور نخوت کی علامت نہ بنایا جائے تو نظافت اور صفائی کی غرض سے تولیے کا استعمال جائز ہے، اسے مکروہ کہنے کی کوئی صحیح دلیل نہیں ہے۔

"تحیۃ الوضوء" کی دو رکعتیں:

وضو سے فارغ ہوکر دو رکعت نماز "تحیۃ الوضوء" کے طور پر ادا کرنا بہت ہی کارِ ثواب ہے اور کوئی شخص جب بھی وضو کرے، اس کے لیے یہ دو رکعتیں ادا کرنا مستحب ہے۔ کتبِ حدیث میں ان دو رکعتوں کی بہت زیادہ فضیلت ذکر ہوئی ہے، جس کا اندازہ صرف اس ایک حدیث ہی سے لگایا جاسکتا ہے، جو صحیح بخاری و مسلم، سنن ترمذی اور مسندِ احمد میں مروی ہے، جس میں نمازِ فجر کے وقت نبیِ اکرم ﷺ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہوکر فرماتے ہیں:

«حَدِّثْنِي بِأَرْجٰى عَمَلٍ عَمِلْتَهٗ فِي الْإِسْلَامِ، فَإِنِّي سَمِعْتُ دُفَّ نَعْلَيْكَ بَيْنَ يَدَيَّ فِي الْجَنَّةِ»

"مجھے اپنا وہ عمل بتاؤ، جس کے سب سے زیادہ اجر و ثواب کی تمھیں امید ہو، کیوں کہ میں نے تمھارے جوتوں کی چاپ جنت میں اپنے آگے سنی ہے۔"

تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«مَا عَمِلْتُ عَمَلًا أَرْجٰى عِنْدِيْ مِنْ أَنِّيْ لَمْ أَتَطَهَّرْ طُهُوْراً فِيْ سَاعَةٍ مِّنْ لَيْلٍ أَوْ نَهَارٍ إِلَّا صَلَّيْتُ بِذٰلِكَ الطُّهُوْرِ مَا كَتَبَ اللّٰهُ أَنْ أُصَلِّيَ»[1]

"مجھے اپنے اعمال میں سب سے زیادہ اجر و ثواب کی امید اِس سے ہے کہ میں نے رات یا دن کے کسی بھی وقت جب بھی وضو کیا ہے، اس وضو سے میں نے ضرور نماز پڑھی ہے، جتنی نماز کی مجھے اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق ملی۔"

سنن ترمذی، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ منقول ہیں:

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٣/ ٣٤) صحيح مسلم بتحقيق محمد فؤاد (٢٤٥٨) مختصر صحيح مسلم للألباني (ص: ٢٠٦) صحيح سنن الترمذي (٢٩١٢) شرح السنة للبغوي (٤/ ١٤٧) صحيح الترغيب، رقم الحديث (٢٢٦) إرواء الغليل (٢/ ٢٢١) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٧٠، ٧١) رياض الصالحين بمراجعة الأرناؤوط (ص: ٤٥٨)

«مَا أَذَّنْتُ إِلَّا صَلَّيْتُ رَكْعَتَيْنِ، وَمَا أَصَابَنِي حَدَثٌ قَطُّ إِلَّا تَوَضَّأْتُ عِنْدَهَا، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: بِهٰذَا»[1]

''میں نے جب بھی اذان دی ہے، دو رکعتیں ضرور پڑھی ہیں اور جب بھی بے وضو ہوا ہوں، اسی وقت وضو کر لیا ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہی وجہ ہے۔'' یعنی انہی دو رکعتوں کی وجہ سے یہ مقام ملا ہے۔''

مسند احمد کی ایک روایت میں ہے:

«مَا أَحْدَثْتُ إِلَّا تَوَضَّأْتُ وَصَلَّيْتُ رَكْعَتَيْنِ»[2]

''میں جب بھی بے وضو ہوا ہوں، اسی وقت میں نے وضو کیا اور دو رکعتیں پڑھی ہیں۔''

اس حدیث سے وضو کے بعد پڑھی جانے والی دو رکعتوں کی فضیلت واضح ہوگئی۔ یہاں ایک بات اور بھی واضح کر دیں کہ عموماً معروف تو یہ ہے کہ یہ واقعہ جو جنت میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے قدموں کی چاپ نبیِ اکرم ﷺ نے سنی، یہ معراج کا واقعہ ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، بلکہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ ''فتح الباري'' میں لکھتے ہیں:

«عِنْدَ صَلَاةِ الْفَجْرِ» یعنی نماز فجر کے وقت کے الفاظ میں اس بات کی طرف اشارہ موجود ہے کہ یہ واقعہ معراج کا نہیں، بلکہ خواب کا ہے، ورنہ نمازِ فجر کے وقت یہ بات پوچھنے کا کیا معنیٰ ہوا؟ آگے لکھتے ہیں کہ صحیح مسلم کی روایت میں: «سَمِعْتُ دُفَّ نَعْلَيْكَ» کے بجائے «سَمِعْتُ اللَّيْلَةَ دُفَّ نَعْلَيْكَ» آیا ہے کہ ''آج رات میں نے تمھارے جوتوں کی چاپ سنی ہے۔''

یہاں ''آج رات'' کے الفاظ بھی اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ یہ واقعہ معراج کا نہیں، بلکہ خواب کا ہے۔[3] پھر خواب میں بھی یہ واقعہ کوئی ایک بار ہی پیش نہیں آیا، بلکہ کئی بار یہ واقعہ نبیِ مکرم ﷺ کو پیش آیا تھا، چنانچہ سنن ترمذی اور مسند احمد میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

---

[1] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٩١٢) صحيح الترغيب، رقم الحديث (١٩٦) إرواء الغليل أيضاً.

[2] إرواء الغليل أيضاً.

[3] فتح الباري (٣/ ٣٤)

«أَصْبَحَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَدَعَا بِلَالًا، فَقَالَ: يَا بِلَالُ! بِمَ سَبَقْتَنِيْ إِلَى الْجَنَّةِ؟ مَا دَخَلْتُ الْجَنَّةَ قَطُّ إِلَّا سَمِعْتُ خَشْخَشَتَكَ أَمَامِيْ، إِنِّيْ دَخَلْتُ الْجَنَّةَ الْبَارِحَةَ فَسَمِعْتُ خَشْخَشَتَكَ أَمَامِيْ»

''ایک صبح نبیِ اکرم ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بلایا تو آپ ﷺ نے پوچھا: اے بلال! کس عمل کی وجہ سے تم جنت میں جانے میں مجھ سے آگے تھے؟ میں جب بھی جنت میں داخل ہوا تو اپنے آگے تیرے چلنے کی آواز سنی۔ رات میں جنت میں داخل ہوا تو تیری چاپ اپنے آگے سنی۔''

پھر آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے سونے کے بنے ہوئے بلند و بالا محل کو دیکھا اور پوچھا: «لِمَنْ هٰذَا الْقَصْرُ؟» ''یہ محل کس کا ہے؟'' انھوں نے کہا کہ ایک عربی کا ہے۔ میں نے کہا: میں عربی ہوں۔ یہ محل کس کا ہے؟ انھوں نے کہا: امتِ محمدیہ میں سے ایک آدمی کا ہے۔ میں نے کہا: میں محمد ہوں، یہ محل کس کا ہے؟ تو انھوں نے بتایا کہ یہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ہے۔

پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بتایا: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں نے جب بھی اذان دی، دو رکعتیں ضرور ہی پڑھیں اور جب بھی بے وضو ہوا تو وضو کیا اور اپنے آپ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دو رکعتیں ضروری سمجھیں۔ اس پر نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: (تب تمھارا جنت میں جانے میں بظاہر مجھ سے سبقت لے جانا) انھی دو رکعتوں کی پابندی کی وجہ سے ہے۔[1]

اس حدیث سے جہاں یہ بات واضح ہوئی کہ مذکورہ واقعہ معراج کا نہیں، بلکہ خواب کا ہے اور نبیِ اکرم ﷺ کو کئی بار پیش آیا ہے، وہیں یہ حدیث حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے جنتی ہونے کی بھی دلیل ہے، کیوں کہ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح غریب کہا ہے اور محدث البانی جیسے ماہرِ فنِ حدیث کے نزدیک بھی یہ حدیث صحیح مسلم کی شرائط پر ہے اور صحیح ہے۔[2]

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے پورا وضو کر کے

---

[1] سنن الترمذي مع التحفة (١٠/ ١٧٤۔ ١٧٦) تخريج صلاة الرسول (ص: ١٢٦) طبع اول.

[2] إرواء الغليل (٢/ ٢٢١)

دکھایا، جس کی تفصیل بھی اس حدیث میں مذکور ہے اور آخر میں فرمایا:

«مَنْ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوئِي هٰذَا، ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ لَا يُحَدِّثُ فِيهَا نَفْسَهٗ، غَفَرَ اللّٰهُ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ»[1]

''جس شخص نے میرے اس وضو کی طرح وضو کیا اور دو رکعتیں اس توجہ سے ادا کیں کہ ان کے دوران میں پریشان خیالی میں مبتلا نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ اس کے پہلے تمام گناہ معاف کر دیتا ہے۔''

جب کہ صحیح مسلم میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَتَوَضَّأُ فَيُحْسِنُ وُضُوءَهٗ ثُمَّ يَقُومُ، فَيُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ مُقْبِلًا عَلَيْهِمَا بِقَلْبِهٖ وَ وَجْهِهٖ إِلَّا وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ»[2]

''کوئی مسلمان جب اچھی طرح سے وضو کرتا ہے، پھر کھڑے ہو کر دو رکعتیں قلبی توجہ اور یک سوئی سے ادا کرتا ہے تو اس کے لیے جنت واجب ہو جاتی ہے۔''

یہ حدیث صحیح مسلم کے علاوہ سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ، مسند احمد، شرح السنۃ بغوی اور مستدرک حاکم میں بھی مروی ہے۔[3]

ایک روایت میں مذکور ہے:

«وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ وَغُفِرَ لَهٗ»[4]

''اس کے لیے جنت واجب ہو جاتی ہے اور اس کی بخشش ہو جاتی ہے۔''

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ وضو کے بعد کم از کم دو رکعتیں نماز ''تحیة الوضوء'' پڑھنے کا کتنا ثواب ہے اور اخروی سعادت کا یہ عالم ہے کہ موذنِ رسول حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے انھی دو

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (١٥٩) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٠٨، ١١٠) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٩٧) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٨٢، ٨٣) و صحيح الترغيب، رقم الحديث (٢٢٤) مشكاة المصابيح (١/ ٩٥) المنتقىٰ مع النيل (١/ ١/ ١٣٩)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١١٨) مشكاة المصابيح (١/ ٥٩)

[3] الفتح الرباني و شرحه (١/ ٣٠٩۔ ٣١٠) شرح السنة (٤/ ١٤٩)

[4] الفتح الرباني (١/ ٣١٠) و شرح السنة (٤/ ١٥٠)

رکعتوں کی پابندی سے یہ رتبہ پایا۔ ہمیں بھی یہ عادت ڈالنی چاہیے کہ جب بھی وضو کریں، اس سے کم ازکم دو رکعت نفلی نماز ضرور ادا کریں۔ اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنَا جَمِیْعاً. آمین.

ایک وضو سے کئی نمازیں:

اب ہم ایسی بات کا تذکرہ کرتے ہیں جو اگرچہ معروف ہے اور ممکن ہے، ہر کسی کو معلوم بھی ہو، لیکن اس بات کا بھی عین امکان ہے کہ بعض لوگوں کے لیے یہ بات نئی ہو۔ لہٰذا کم ازکم ان کے کام آجائے گی اور جنھیں معلوم ہے، ان کے ہاتھ اس کے دلائل آجائیں گے۔ لہٰذا ہر کس و ناکس کے لیے استفادے کا پہلو نکل آتا ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ ایک وضو سے متعدد نمازیں پڑھی جاسکتی ہیں۔ یہ امر جائز اور ثابت ہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری، سنن ابوداود، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت عمرو بن عامر البجلی بیان کرتے ہیں:

« سَأَلْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ عَنِ الْوُضُوْءِ فَقَالَ: كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَتَوَضَّأُ لِكُلِّ صَلَاةٍ، وَكُنَّا نُصَلِّي الصَّلَوَاتِ بِوُضُوْءٍ وَّاحِدٍ »[1]

”میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے وضو کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے جواب دیا کہ نبیِ اکرم ﷺ تو ہر نماز کے لیے وضو فرمایا کرتے تھے اور ہم کئی کئی نمازیں ایک ہی وضو سے ادا کرلیا کرتے تھے۔“

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبیِ اکرم ﷺ کا عمل مبارک تو افضل پر تھا، جب کہ آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم جواز و رخصت سے فائدہ اٹھا لیا کرتے تھے، کیوں کہ یہ جواز و رخصت بھی خود نبیِ اکرم ﷺ کے اپنے عمل سے ثابت ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٢١٤) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٦) و اللفظ له، مختصر سنن أبي داود للمنذري (١/ ١٢٧) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٥٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٠٩) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٢٧) المنتقىٰ مع النيل (١/ ١/ ٢١٠) و صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٩٠٧)

«صلّى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَوْمَ الْفَتْحِ خَمْسَ صَلَوَاتٍ بِوُضُوْءٍ وَّاحِدٍ، وَمَسَحَ عَلٰى خُفَّيْهِ»

''فتح مکہ کے دن نبیِ اکرم ﷺ نے ایک ہی وضو سے پانچ نمازیں ادا فرمائیں اور اس وضو میں اپنے موزوں پر مسح فرمایا۔''

یہ دیکھ کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے نبیِ اکرم ﷺ سے استفسار فرمایا:

« [إِنِّي رَأَيْتُكَ] لَقَدْ صَنَعْتَ [الْيَوْمَ] شَيْئًا لَمْ تَكُنْ تَصْنَعُهُ»

''میں نے دیکھا ہے، آج آپ ﷺ نے ایک ایسا کام کیا ہے، جو پہلے آپ ﷺ نہیں کیا کرتے تھے۔''

(حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اشارہ کئی نمازیں ایک وضو سے ادا کرنے کی طرف تھا) اس پر نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«عَمَداً صَنَعْتُهٗ يَا عُمَرُ»[1] ''عمر! میں نے ایسا جان بوجھ کیا ہے۔''

ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ ایک وضو کے ساتھ کئی نمازیں پڑھی جا سکتی ہیں۔ ہر نماز کے ساتھ از سرِ نو وضو فرض اور واجب نہیں، البتہ یہ افضل ہے، کیوں کہ صحیح بخاری میں تعلیقاً، سنن نسائی، صحیح ابن خزیمہ اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے موصولاً مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«لَوْلَا أَنْ أَشُقَّ عَلٰى أُمَّتِي لَأَمَرْتُهُمْ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ بِوُضُوْءٍ، وَمَعَ كُلِّ وُضُوْءٍ بِسِوَاكٍ»[2]

''اگر میں اپنی امت کے لیے باعثِ مشقت نہ سمجھتا تو انھیں حکم دے دیتا کہ وہ ہر نماز

---

[1] مختصر صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٧) مختصر السنن للمنذري (١/ ١٢٧) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٥١) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٢٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥١٠) مشكاة المصباح (١/ ١٠١) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٠٩٣)

[2] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٨٨٧) صحيح مسلم (٣/ ١٤٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٧) سنن ابن ماجه (٢٨٧) صحيح الترغيب، رقم الحديث (٢٠٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٣١٨) و الإرواء، رقم الحديث (٧٢)

کے ساتھ وضو کیا کریں اور ہر وضو کے ساتھ مسواک کیا کریں۔‘‘

اسی مفہوم کی ایک حدیث صحیح ابن حبان میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث ہر نماز کے ساتھ تجدیدِ وضو کے عدمِ وجوب پر دلالت کرتی ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے قاضی عیاض رحمہ اللہ کے حوالے سے کہا ہے کہ تمام اہلِ فتویٰ کا اس کے عدمِ وجوب پر اجماع ہے اور ان کے مابین اس سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔[1]

***

[1] نیل الأوطار (۱/ ۱/ ۲۰۴۔ ۲۱۰) طبع بیروت.

تیمّم

قارئینِ کرام! یہاں تک تو مسنون غسل و طہارت اور وضو کرنے کے ضروری احکام و مسائل کا ذکر تھا، جن کا تعلق پانی سے بلکہ پانی کی وافر مقدار موجود ہونے سے ہوتا ہے، مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم کسی ایسے مقام پر ہوں، جہاں پانی ہی میسر نہیں، جس سے غسل یا وضو کیا جا سکے یا اتنا نہیں جو پینے جیسی اہم انسانی ضرورت سے زائد ہو کہ وضو کے کام لایا جائے اور کبھی یوں بھی ہو سکتا ہے کہ پانی تو موجود ہے، مگر کسی بیماری کی وجہ سے غسل و وضو کرنا جان لیوا یا سخت مضر ہوتا ہے۔ سفر و حضر میں کبھی ان حالات کا پیش آجانا کوئی بعید از امکان نہیں تو ایسے میں شریعتِ اسلامیہ کے پاس اس کا کیا حل ہے؟

اس سلسلے میں سب سے پہلی اور بنیادی بات تو یہ ہے کہ قرآنِ کریم اور حدیثِ نبوی کی تعلیمات کسی خاص ملک و قوم اور کسی محدود وقت و زمانے کے لیے نہیں کہ ان مسائل کے حل کا دائرہ محدود ہو، بلکہ دینِ اسلام ایک عالم گیر دین ہے۔ یہ قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے ہے اور اس کی تعلیمات میں ہر زمانے، ہر قوم اور ہر ملک کے باشندوں کو پیش آنے والے ہر قسم کے حالات کا حل اور اس کی راہنمائی کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ یہی چیز تو شریعتِ اسلامیہ کا سب سے بڑا اعجاز ہے، جو اِسے دوسری سابقہ شرائع سے ممتاز کرتی ہے۔

اگر کبھی کوئی شخص ایسے حالات سے دوچار ہو جائے کہ اس کے پاس پانی نہ ہو یا اسے پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہو یا پھر اس کا استعمال مضر ہو تو ایسے میں بھی نماز معاف نہیں کی گئی، کیوں کہ یہ تو دین کا ستون ہے۔ البتہ ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ نے مٹی کو پانی کے قائم مقام قرار دے دیا ہے اور اس کا بھی ایک خاص انداز اور مسنون طریقہ ہے۔ اس اندازِ طہارت کو ''تیمّم'' کہا جاتا ہے۔

تیمّم کا اجمالی طریقہ:

تیمّم کا اجمالی طریقہ یہ ہے کہ حصولِ طہارت کی نیت سے دونوں ہاتھوں کو زمین یا کسی چیز پر

پڑے ہوئے گرد و غبار پر ماریں، پھر دونوں ہاتھوں میں پھونک کر انھیں پہلے منہ پر اور پھر دونوں ہاتھوں کو باہم ایک دوسرے پر پھیر لیں۔ اس طرح صرف ایک ہی بار کر لینے سے تیمّم ہو جاتا ہے۔ کہنیوں اور پاؤں وغیرہ پر ہاتھ پھیرنا اور سر یا کانوں کا مسح کرنا بھی ضروری نہیں، کیوں کہ یہ اندازِ طہارت ایک ''علامت'' ہے۔ اعضاے وضو کا استیعاب اس میں مقصود ہی نہیں ہے۔

تیمّم کی مشروعیت میں حکمت:

قبل اس کے کہ تیمّم کی مشروعیت کے دلائل اور تیمّم کے دیگر احکام و مسائل کا سلسلہ شروع کیا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض مخصوص حالات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر رحمت اور شفقت کرتے ہوئے غسل و وضو کا علامتی قائم مقام جس تیمّم کو قرار دیا ہے، اس کی مشروعیت میں پائی جانے والی حکمتیں اختصار سے ذکر کر دی جائیں۔

اگر بلا غسل و بلا وضو اور بلا تیمّم ہی نماز وغیرہ کی اجازت دے دی جاتی تو اس کا ایک نقصان تو یہ ہوتا کہ ان اتفاقات سے طبائع ترکِ طہارت کی عادی ہو جاتیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوتا کہ غسل و وضو کی پابندی سے اللہ تعالیٰ کے دربار کی حاضر کا جو اہتمام محسوس ہوتا اور اِس کی وجہ سے اِس حاضری کی عظمت و تقدس کا جو تصور ذہن پر چھایا رہتا ہے، وہ مجروح ہوتا۔ اس لیے حکمتِ الٰہی نے مجبوری کے ایسے حالات میں تیمّم کو غسل و وضو کا قائم مقام بنا دیا ہے۔ اب مجبوری کی حالت میں غسل یا وضو کے بجائے آدمی نماز وغیرہ کے لیے تیمّم کا اہتمام کرے گا تو اس کی عادت و ذہن پر کوئی غلط اثر نہیں پڑے گا۔

اس کی ایک حکمت تو بعض اہلِ علم نے یہ بیان کی ہے کہ پوری زمین کے دو ہی حصے ہیں: خشکی اور تری۔ ان دونوں میں سے ایک بڑے حصے کی سطح پانی ہے اور دوسرے حصے کی مٹی۔ اس لیے پانی اور مٹی میں ایک مناسبت ہے۔ نیز انسان کی ابتدائی تخلیق بھی پانی اور مٹی ہی سے ہوئی ہے اور مٹی ہی ایک ایسی چیز ہے، جسے انسان سمندر کے سوا ہر جگہ پا سکتا ہے، پھر مٹی پر ہاتھ مار کر منہ پر پھیرنے میں انکساری اور خاکساری کی بھی ایک خاص شان ہے، چونکہ انسان کا آخری ٹھکانا بھی مٹی اور خاک ہی ہے، مر کر اسے خاک ہی سے جا ملنا ہے، اس لیے تیمّم میں موت اور قبر کی یاد بھی پائی جاتی ہے۔ تیمّم کی مشروعیت میں یہ حکمتیں اور اسرار و رموز محسوس کیے جا سکتے ہیں۔[1]

---

[1] معارف الحدیث مولانا نعمانی (۳/ ۹۵۔ ۹۶) طبع لکھنؤ ۱۹۸۳ء

تیمّم اور قرآنِ کریم:

یہ تیمّم قرآن وسنت اور اجماعِ امت تینوں کی رو سے جائز اور ثابت ہے۔

① چنانچہ قرآنِ کریم کی سورۃ النساء (آیت: ۴۳) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَ لَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا وَ اِنْ کُنْتُمْ مَّرْضٰٓی اَوْ عَلٰی سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْکُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَیَمَّمُوْا صَعِیْدًا طَیِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْھِکُمْ وَ اَیْدِیْکُمْ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا غَفُوْرًا﴾

''مومنو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو جب تک (ان الفاظ کو) جو منہ سے کہو سمجھنے (نہ) لگو، نماز کے پاس نہ جاؤ اور جنابت کی حالت میں بھی (نماز کے پاس نہ جاؤ) جب تک کہ غسل (نہ) کرلو، ہاں اگر بہ حالتِ سفر راستے پر چلے جا رہے ہو (اور پانی نہ ملنے کے سبب غسل نہ کرسکو تو تیمّم کر کے نماز پڑھ لو) اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا کوئی تم میں سے بیت الخلاء سے ہو کر آیا ہو یا تم عورتوں سے ہم بستر ہوئے ہو اور تمھیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی لو اور منہ اور ہاتھوں کا مسح (کر کے تیمّم) کر لو، بے شک اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔''

اس آیت میں اجمالی طور پر اللہ تعالیٰ نے جوازِ تیمّم کے اسباب و حالات اور طریقۂ تیمّم بیان فرمایا ہے۔ معمولی لفظی فرق کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہی مضمون سورۃ المائدہ (آیت: ۶) میں بھی بیان فرمایا ہے۔ اس آیت میں پہلے وضو کے اصول و احکام ہیں، پھر اسباب و طریقۂ تیمّم کا ذکر ہے۔

② چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ وَ اَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَ امْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ وَ اَرْجُلَکُمْ اِلَی الْکَعْبَیْنِ وَ اِنْ کُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّھَّرُوْا وَ اِنْ کُنْتُمْ مَّرْضٰٓی اَوْ عَلٰی سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْکُمْ مِّنَ

الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّ لٰكِنْ يُّرِيْدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَ لِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾

''مومنو! جب تم نماز پڑھنے کا قصد کیا کرو، تو منہ اور کہنیوں تک ہاتھ دھولیا کرو اور سر کا مسح کر لیا کرو اور ٹخنوں تک پاؤں (دھولیا کرو) اور اگر نہانے کی حاجت ہو تو (نہا کر) پاک ہو جایا کرو اور اگر بیمار ہو یا سفر میں ہو یا کوئی تم میں سے بیت الخلاء میں سے ہو کر آیا ہو یا تم عورتوں سے ہم بستر ہوئے ہو اور تمھیں پانی نہ مل سکے تو پاک مٹی لو اور اُس سے منہ اور ہاتھوں کا مسح (تیمّم) کر لو، اللہ تعالیٰ تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنا چاہتا، بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کرے، تاکہ تم شکر ادا کرو۔''

ان دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے تیمّم کی مشروعیت، اسباب، طریقہ اور حکمت؛ تمام امور بیان فرما دیے ہیں۔ آیتِ تیمّم کے لفظ ﴿فَتَيَمَّمُوْا﴾ سے تیمّم میں نیت کے وجوب پر بھی استدلال کیا گیا ہے۔ تمام فقہا کا (سوائے امام اوزاعی رحمہ اللہ کے) یہی قول ہے۔[1]

تیمّم اور احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم:

قرآنِ کریم کی طرح حدیث شریف میں بھی ان امور کا تذکرہ آیا ہے۔

1. چنانچہ صحیح مسلم، مسندِ احمد اور سنن بیہقی میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«فُضِّلْنَا عَلَى النَّاسِ بِثَلَاثٍ: جُعِلَتْ صُفُوْفُنَا كَصُفُوْفِ الْمَلَائِكَةِ، وَجُعِلَتْ لَنَا الْأَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِداً، وَجُعِلَتْ تُرْبَتُهَا لَنَا طَهُوْراً، إِذَا لَمْ نَجِدِ الْمَآءَ»[2]

''ہمیں تین اشیا کے ساتھ دوسری امتوں کے لوگوں پر فضیلت دی گئی ہے: ہماری صفوں کو فرشتوں کی صفیں قرار دیا گیا ہے۔ ہمارے لیے تمام روے زمین مسجد بنادی گئی ہے اور

---

[1] فتح الباري (١/ ٤٣٤)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٥/ ٤) مشكاة المصابيح (١/ ١٦٤) المنتقىٰ مع النيل (١/ ١/ ٢٦٣) إرواء الغليل (١/ ٣١٦)

جب ہم پانی نہ پائیں تو اس زمین کی مٹی ہمارے لیے طہارت کا ذریعہ بنادی گئی ہے۔‘‘

یہ حدیث متعدد کتبِ حدیث میں کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔

۲ صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی و دارمی، صحیح ابی عوانہ اور سنن بیہقی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں:

«أُعْطِيتُ خَمْساً لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ قَبْلِي: نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيْرَةَ شَهْرٍ، وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِداً وَطَهُوْراً، فَأَيُّمَا رَجُلٍ مِنْ أُمَّتِي أَدْرَكَتْهُ الصَّلَاةُ فَلْيُصَلِّ...»

’’مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں، جو پہلے [انبیا میں سے] کسی کو نہیں دی گئیں: میری اس طرح مدد کی گئی ہے کہ میرے اور میرے دشمن کے مابین ایک ماہ کی مسافت ہوتی ہے، مگر اس پر رعب چھا جاتا ہے۔ میرے لیے یہ زمین مسجد اور طہارت بنا دی گئی ہے۔ میری امت کے کسی آدمی کو جہاں بھی نماز کا وقت ہو جائے، وہ وہیں نماز پڑھ لے۔‘‘

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رکھیں کہ پہلی امتوں پر ضروری تھا کہ وہ جہاں بھی ہوں، نماز کے لیے بنائی گئی عبادت گاہوں میں پہنچ کر ہی نماز ادا کریں۔ ان کے علاوہ کہیں ان کی نماز ادا نہیں ہوسکتی تھی۔ اسی حدیث میں آگے آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

«أُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ، وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً، وَبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ كَافَّةً، وَأُعْطِيتُ الشَّفَاعَةَ»[1]

’’میرے لیے اموالِ غنیمت حلال کر دیے گئے ہیں۔ مجھ سے پہلے ہر نبی خاص اپنی قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا، جب کہ میں تمام بنی نوعِ انسان طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں اور مجھے شفاعت کے شرف سے نوازا گیا ہے۔‘‘

۳ صحیح مسلم، سنن ترمذی، ابن ماجہ، صحیح ابی عوانہ اور مسند احمد میں یہی حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں «فُضِّلْتُ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ بِسِتٍّ...» کے الفاظ ہیں، یعنی مجھے پہلے

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٣٣٥) صحيح مسلم مع شرح النووي (٥/ ٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤١٩) إرواء الغليل (١/ ٣١٥۔ ٣١٦) و صحيح الجامع، رقم الحديث (١٠٥٦)

انبیاء علیہم السلام پر چھے اشیا سے فضیلت دی گئی ہے۔ جن میں سے پہلی چیز ہے: «أُعطِيتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ» ''میں جوامع الکلم دیا گیا ہوں۔'' دوسری: «أُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ» ''میرے لیے غنیمت حلال کی گئی ہے۔'' تیسری ہے: زمین کا مسجد اور طہارت ہونا۔ سنن ابن ماجہ میں صرف یہی مذکور ہے۔ چوتھی ہے: ساری مخلوقات کی طرف نبی مبعوث ہونا اور پانچویں ہے: «وَخُتِمَ بِيَ النَّبِيُّونَ» ''میرے ساتھ نبیوں کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے۔''[1]

4. سنن بیہقی اور مسند احمد میں اسی سے ملتے جلتے الفاظ کے ساتھ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں چار چیزیں: ساری زمین کا مسجد و طہارت ہونا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساری مخلوقات کا نبی ہونا، رعب و دبدبہ اور حلّتِ غنائم مذکور ہیں۔[2]

5. اسی حدیث کی پانچویں روایت مسند احمد اور سنن دارمی میں مفصلاً اور سنن ابو داود میں مختصراً حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں پانچ اشیا کا ذکر ہے، جو سابقہ احادیث میں آ گئی ہیں، البتہ اندازِ بیان الگ ہے۔ سنن ابو داود میں صرف تمام زمین کے مسجد و طہارت بنائے جانے کا ذکر کیا گیا ہے اور محدثینِ کرام کے نزدیک یہ پانچویں روایت بھی صحیح سند سے مروی ہے۔

6. چھٹی روایت مسند احمد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حسن درجے کی سند سے مروی ہے۔ اس میں بھی پانچ چیزوں کا ذکر ہے۔ اس روایت میں اس بات کی وضاحت بھی ہے کہ پہلی امتوں کے لوگ اموالِ غنیمت استعمال نہیں کر سکتے تھے، بلکہ جلا دیتے تھے، لیکن میرے لیے وہ حلال کیے گئے ہیں اور پہلی اُمتوں کے لوگ صرف اپنے معبدوں اور کنیسوں ہی میں نماز پڑھ سکتے تھے، لیکن میرے لیے ساری زمین ہی مسجد اور ذریعہ طہارت بنا دی گئی ہے۔

7. ساتویں روایت مسند احمد میں حسن سند کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جس کا مفہوم حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ والی روایت ہی کا ہے۔

8. آٹھویں روایت دلائل النبوۃ بیہقی اور مسند احمد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں رعب و دبدبہ اور مٹی کے طہارت بنائے جانے کے علاوہ تیسری بات یہ ہے کہ مجھے زمین کی

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٥/ ٥) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٥٧) الإرواء (١/ ٣١٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٢٢٢)

[2] مختصر صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧) الإرواء (١/ ١٨٠۔ ٣١٦) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٢٢٢)

چابیاں دی گئی ہیں۔ چوتھی یہ کہ میرا نام احمد رکھا گیا ہے اور پانچویں یہ کہ میری امت کو خیر الامم بنایا گیا ہے۔ اس آخری روایت کی سند میں ضعف واضطراب ہے، مگر مجموعی طور پر ان آٹھوں روایات والی حدیث صحیح بلکہ متواتر ہے۔[1]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اللہ تعالیٰ کے ان خاص عطیات کو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی ذکر کر دیا ہے، جو اُن سے پہلے دوسرے کسی نبی کو نہیں دیے گئے تھے، پھر ان عطیات میں امتِ اسلامیہ کے شرف کا پہلو بھی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے یہ اور دیگر متعدد روایات جمع کر کے ان عطیاتِ الٰہیہ کی تعداد سترہ بیان کی ہے اور ابو سعید نیشاپوری کی آٹھ جلدوں پر مشتمل کتاب شرف المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ ان خصائص کی تعداد ساٹھ ہے۔[2]

بہر حال نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی انعامات الٰہیہ میں سے روے زمین کی مٹی کو طہارت کا ذریعہ بنایا جانا بھی شمار فرمایا، جو تیمّم کی مشروعیت کا ثبوت ہے۔

⑨ سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارقطنی، مستدرک حاکم اور مسند احمد میں حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«إِنَّ الصَّعِيْدَ الطَّيِّبَ وُضُوْءُ الْمُسْلِمِ وَإِنْ لَّمْ يَجِدِ الْمَآءَ عَشْرَ سِنِيْنَ»[3]

''پاک مٹی مسلمان کا وضو ہے، چاہے اسے دس سال بھی پانی میسر نہ آئے۔''

سنن نسائی کے سوا دوسری کتب میں آگے یہ الفاظ بھی مذکور ہیں:

«فَإِذَا وَجَدَ الْمَآءَ فَلْيُمِسَّهٗ بَشَرَتَهٗ، فَإِنَّ ذٰلِكَ خَيْرٌ»[4]

''جب اسے پانی مل جائے، تو پھر اس سے غسل و وضو کرنا چاہیے، کیوں کہ یہی بہتر ہے۔''

---

[1] إرواء الغليل (١/ ٣١٧) و المنتقىٰ مع النيل (١/ ١/ ٢٦٢)

[2] فتح الباري (١/ ٤٣٩) و نيل الأوطار (١/ ١/ ٢٦٢)

[3] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢١) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٧) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣١١) مسند أحمد (٥/ ١٥٥، ١٨٠) موارد الظمآن، رقم الحديث (١٩٦) مشكاة المصابيح (١/ ١٦٥) المنتقىٰ مع نيل الأوطار (١/ ١/ ٢٦٦، ٢٦٧) الإرواء (١/ ١٨١)

[4] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢١) سنن الترمذي مع التحفة (١/ ٣٨٧) صحيح الترمذي، رقم الحديث (١٠٧) و اللفظ له، و صحيح الجامع، رقم الحديث (١٦٦٧)

تیمّم اور اجماعِ امت:

قرآن و سنت کی ان نصوص کی طرح تیمّم کے جواز و مشروعیت پر ایک دلیل پوری امتِ اسلامیہ کا اجماع بھی ہے، جیسا کہ شروحِ حدیث اور کتبِ فقہ میں مذکور ہے۔ البتہ شروح میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا صرف اس صورت میں اختلاف مذکور کہ جنابت والے کے لیے تیمّم جائز نہیں، لیکن سنن ترمذی میں ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے قول سے رجوع کر لیا تھا اور اس بات کے قائل ہوگئے تھے کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں جنابت والا بھی تیمّم کر سکتا ہے۔[1] "تحفة الأحوذي" میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے رجوع کر لینے کا بھی تذکرہ ہے۔[2]

اس مسئلے میں اجماعِ امت اور اتفاقِ علما کا ذکر امام ابن قدامہ نے فقہ مقارن کی بہترین کتاب "المغني" (۱/ ۲۳۳) میں بھی کیا ہے۔

حیض اور جنابت میں تیمّم:

یہ بات تو معروف ہے کہ نماز وغیرہ کے لیے وضو کرنا ہوگا، مگر پانی نہ ملنے یا پانی تو ہو، مگر کسی عذر کی بنا پر پانی استعمال نہ کر سکتا ہو تو وہ شخص تیمّم کر کے نماز ادا کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن نشین کر لیں کہ اگر کسی پر جماع و احتلام یا حیض و نفاس کی وجہ سے غسل واجب ہو اور اس کے پاس پانی نہ ہو یا پانی تو ہو، مگر بیماری یا شدید سردی کی وجہ سے غسل نہ کر سکتا ہو تو ایسے شخص کے لیے بھی جائز ہے کہ وہ تیمّم کر کے نماز ادا کر لے، اس کا یہ تیمّم غسل اور وضو دونوں سے کفایت کر جائے گا۔ امام مالک، شافعی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔[3]

اس کا ثبوت کئی احادیث میں موجود ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم میں مطولاً اور نسائی شریف میں مختصراً مروی ہے، حضرت عمران رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

« كُنَّا فِيْ سَفَرٍ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَصَلّٰى بِالنَّاسِ، فَلَمَّا انْفَتَلَ مِنْ صَلَاتِهٖ، إِذَا

---

[1] سنن الترمذي مع التحفة (۱/ ۳۸۹)

[2] تحفة الأحوذي (۱/ ۳۸۹)

[3] سنن الترمذي مع التحفة (۱/ ۳۸۹)

هُوَ بِرَجُلٍ مُعْتَزِلٍ، لَمْ يُصَلِّ مَعَ الْقَوْمِ، قَالَ: مَا مَنَعَكَ يَا فُلَانُ أَنْ تُصَلِّيَ مَعَ الْقَوْمِ؟ قَالَ: أَصَابَتْنِي جَنَابَةٌ وَلَا مَاءٌ، قَالَ: عَلَيْكَ بِالصَّعِيدِ فَإِنَّهُ يَكْفِيكَ» [1]

''ہم ایک سفر میں نبیِ اکرم ﷺ کے ہمراہ تھے تو آپ ﷺ نے لوگوں کو نماز پڑھائی۔ جب آپ ﷺ نماز پڑھا کر فارغ ہو کر پھرے تو آپ ﷺ نے ایک آدمی کو الگ تھلگ بیٹھے دیکھا، جس نے لوگوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھی تھی۔ نبیِ اکرم ﷺ نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا: اے فلاں! تمھیں لوگوں کے ساتھ مل کر نماز ادا کرنے سے کس چیز نے روکا ہے؟ اس نے جواب دیا: میں جنابت میں مبتلا ہو گیا ہوں، لیکن (غسل کے لیے) پانی نہیں ہے۔ یہ سن کر نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: تمھارے پاس مٹی ہے (اس سے تیمّم کر لو) یہی تمھارے لیے کافی ہے۔''

ایسے ہی صحیح بخاری و مسلم اور سنن اربعہ میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی شخص آیا اور کہنے لگا:

«إِنِّي أَجْنَبْتُ فَلَمْ أُصِبِ الْمَاءَ» ''مجھے جنابت ہوگئی ہے اور پانی نہیں مل رہا۔''

تو حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے کہا:

«أَمَا تَذْكُرُ أَنَّا كُنَّا فِي سَفَرٍ أَنَا وَأَنْتَ [وَفِي مُسْلِمٍ]، فَأَجْنَبْنَا فَأَمَّا أَنْتَ فَلَمْ تُصَلِّ، وَأَمَّا أَنَا فَتَمَعَّكْتُ، فَصَلَّيْتُ، فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ... إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيكَ هٰكَذَا فَضَرَبَ النَّبِيُّ ﷺ بِكَفَّيْهِ الْأَرْضَ وَنَفَخَ فِيهِمَا ثُمَّ مَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ وَكَفَّيْهِ» [2]

''کیا آپ کو یاد نہیں کہ ایک سفر کے دوران میں ہم دونوں کو جنابت لاحق ہوگئی تھی

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٣٤٤) صحيح مسلم مع شرح النووي (٥/ ١٨٩ تا ١٩٢) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣١٠) المشكاة مع المرعاة (١/ ٥٨٧) و صحيح الجامع (٤٠٤٣)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٣٣٨) صحيح مسلم مع شرح النووي (٤/ ٦٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٠٨) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٥) مختصر سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٩٩) المشكاة مع المرعاة (١/ ١٨٧- ١٨٩) و صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٣٦٧)

اورآپ نے تو نماز نہیں پڑھی تھی، جب کہ میں نے مٹی میں لوٹ پوٹ ہونے کے بعد نماز پڑھ لی، پھر میں نے اپنا مٹی لوٹ پوٹ ہونا نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ذکر کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمھارے لیے یوں کرلینا ہی کافی تھا۔ (یعنی چاہے تیمّم برائے جنابت تھا، اپنا مٹی میں لوٹ پوٹ ہونے کے بجائے صرف اتنا ہی کافی تھا) پھر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو زمین پر مارا اور پھر ان دونوں میں پھونک ماری، پھر دونوں ہتھیلیاں منہ پر اور پھر باہم دونوں ہاتھوں پر پھیر لیں۔''

سنن ترمذی میں مذکور ہے کہ جنابت والا اور حیض والی جب پانی نہ پائیں تو تیمّم کر لیں اور نماز پڑھیں۔ تحفۃ الاَحوذی میں اس پر سلف و خلف کا اجماع ذکر کیا گیا ہے۔[1]

مریض اور تیمّم:

اس شخص کے لیے بھی تیمّم کی اجازت ہے، جو پانی تو پاتا ہے، مگر بیمار ہے اور بیماری کی وجہ سے پانی سے غسل نہیں کر سکتا یا اسے غسل کرنے میں مرض کے بڑھ جانے کا خدشہ ہو۔ چنانچہ کتبِ حدیث میں سے سنن ابو داود، ابن ماجہ، دارقطنی اور بیہقی میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں، جس حدیث میں یہ واقعہ مذکور ہے، اس کی سند کے بارے میں ہم پلاسٹر یا پٹی پر مسح کے ضمن میں کچھ تفصیل ذکر کر چکے ہیں کہ ان پر مسح سے متعلق الفاظ ضعیف السند ہیں۔ البتہ تیمّم کے ذکر کی حد تک اس حدیث کو شواہد کی بنا پر حسن درجے کی قرار دیا گیا ہے۔[2]

اُس حدیث میں وہ واقعہ بہ روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ یوں مذکور ہے کہ ہم ایک سفر میں تھے کہ ہم میں سے ایک آدمی کے سر پر پتھر لگا، جس سے اس کا سر پھٹ گیا اور پھر اسے احتلام ہوگیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا:

«هَلْ تَجِدُوْنَ لِيْ رُخْصَةً فِيْ التَّيَمُّمِ؟»

''کیا تم میرے لیے تیمّم کر لینے کی رخصت پاتے ہو یا نہیں؟''

تو انھوں نے جواب دیا:

---

[1] سنن الترمذي مع شرحه تحفة الأحوذي (١/ ٣٨٩)

[2] دیکھیں: التلخيص (١/ ١/ ١٤٧۔ ١٤٨) سبل السلام (١/ ١/ ٩٩) تمام المنة (ص: ١٣١)

«مَا نَجِدُ لَكَ رُخْصَةً، وَأَنْتَ تَقْدِرُ عَلَى الْمَآءِ»

''ہم تمھارے لیے کوئی رخصت نہیں پاتے، کیوں کہ تم پانی کے استعمال پر قادر ہو۔''

لہٰذا اس شخص نے غسل کیا، نتیجہ یہ کہ وہ فوت ہوگیا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب ہم نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور اس واقعے کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«قَتَلُوْهُ قَتَلَهُمُ اللّٰهِ! أَلَا سَئَلُوْا إِذَا لَمْ يَعْلَمُوْا، فَإِنَّمَا شِفَآءُ الْعِيِّ السُّؤَالُ»

''اللہ انھیں غارت کرے! انھوں نے اسے قتل کر دیا ہے۔ جب انھیں معلوم نہیں تھا تو انھوں نے پوچھ کیوں نہ لیا۔ مرضِ جہالت اور نادانی کا علاج صرف سوال ہے۔''

اور آگے فرمایا:

«إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيهِ أَنْ يَّتَيَمَّمَ»[1]

''اس کے لیے یہی کافی تھا کہ وہ تیمّم کر لیتا۔''

ان تین احادیث سے معلوم ہوا کہ تیمّم صرف وضو کا قائم مقام ہی نہیں، بلکہ غسل کا قائم مقام بھی ہے، لہٰذا جنابت وغیرہ کی حالت میں پانی نہ ملے یا مرض کی حالت میں پانی کے استعمال کی قدرت نہ ہو اور ایسے وقت میں صرف تیمّم کر لیا جائے تو کافی ہے۔

سخت سردی اور تیمّم:

اگر مذکورہ حالات کے علاوہ کبھی کہیں سخت سردی ہے اور آدمی تندرست و توانا ہونے کے باوجود اس سردی کی وجہ سے نہانے میں جان کا خطرہ محسوس کرے تو اس صورت میں بھی تیمّم جائز ہے، جیسا کہ صحیح بخاری (تعلیقاً)، سنن ابی داود، دارقطنی، مستدرک حاکم اور مسند احمد میں صحیح سند سے مروی ہے، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ غزوہ ذات السلاسل میں ہمیں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا:

«إِحْتَلَمْتُ فِيْ لَيْلَةٍ بَارِدَةٍ شَدِيْدَةِ الْبَرْدِ فَأَشْفَقْتُ إِنِ اغْتَسَلْتُ أَنْ أَهْلِكَ فَتَيَمَّمْتُ، ثُمَّ صَلَّيْتُ بِأَصْحَابِيْ صَلَاةَ الصُّبْحِ، فَلَمَّا قَدِمْنَا عَلٰى رَسُوْلِ

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٧٢) المشكاة مع المرعاة (١/ ٥٩٣ـ ٥٩٤) المنتقى مع النيل (١/ ١/ ٢٥٧) التلخيص الحبير (١/ ١/ ١٤٧) بلوغ المرام مع سبل السلام (١/ ١/ ٩٩)

اللّٰہِ ﷺ ذَکَرْتُ ذٰلِکَ لَہٗ فَقَالَ: یَا عَمْرُوْ! صَلَّیْتَ أَصْحَابَکَ وَأَنْتَ جُنُبٌ؟»

''ایک سخت سردی والی رات میں مجھے بدخوابی (احتلام کی وجہ) سے غسل کی ضرورت پیش آئی۔ سردی کی سخت شدت سے ڈر گیا کہ میں ہلاک نہ ہو جاؤں، لہٰذا میں نے تیمّم کیا اور اپنے ساتھیوں کو فجر کی نماز پڑھا دی۔ جب ہم نبیِ اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوگئے تو میں نے آپ ﷺ کو یہ واقعہ بتایا۔ واقعہ سن کر نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: اے عمرو! تو نے اپنے ساتھیوں کو جنابت کی حالت ہی میں نماز پڑھا دی؟''

حضرت عمرو رضی اللہ عنہ نے واقعہ ذکر کر کے بتایا کہ اس مجبوری کے وقت میں مجھے اللہ تعالیٰ کا وہ ارشاد یاد آ گیا، جس میں فرمایا ہے:

﴿وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُمْ رَحِیْمًا﴾ [النساء: ۲۹]

''اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو، کچھ شک نہیں کہ اللہ تم پر مہربان ہے۔''

لہٰذا میں نے تیمّم کر کے نماز پڑھا دی:

«فَضَحِكَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ وَلَمْ یَقُلْ شَیْئاً»[1]

''نبیِ اکرم ﷺ یہ سن کر ہنس دیے اور آپ ﷺ نے کچھ نہ کہا۔''

اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد المجد ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ''منتقی الأخبار'' میں لکھا ہے کہ شدید سردی کے خوف سے بھی تیمّم کا جواز ثابت ہے۔ دوسرے یہ بھی کہ جس نے پانی سے باقاعدہ وضو کیا ہو، اس کی نماز تیمّم والے امام کی اقتدا میں جائز و صحیح ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس کی شرح ''نیل الأوطار'' میں لکھا ہے کہ ان حالات میں تیمّم کے جواز کی اس حدیث میں دو دلیلیں ہیں:

1. یہ واقعہ سن کر نبیِ اکرم ﷺ کا تبسّم فرمانا اور خوش ہونا۔ آپ ﷺ کا یہ تبسم تو کسی کام کے جواز پر آپ ﷺ کے خاموش رہنے سے بھی زیادہ قوی دلیل ہے، جب کہ آپ ﷺ کی محض خاموشی بھی دلیلِ جواز ہے، کیوں کہ آپ ﷺ کسی ناجائز کام کو دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتے تھے۔
2. یہ آپ ﷺ کا اس فعل پر نکیر نہ کرنا۔ اگر یہ فعل ناجائز ہوتا تو آپ ﷺ ضرور اسے ناجائز قرار

---

[1] صحیح البخاري مع الفتح (۱/ ۴۵۴) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۳۲۳) المنتقیٰ مع النیل (۱/ ۱/ ۲۵۸) الإرواء (۱/ ۱۸۱۔ ۱۸۲) وصححه.

دیتے، کیوں کہ ناجائز اور باطل کام کو آپ ﷺ ہرگز برقرار نہیں رکھا کرتے تھے۔

اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے امام ثوری، ابو حنیفہ، مالک اور ابن المنذر رحمہم اللہ نے کہا ہے کہ جس نے شدید سردی کے خوف سے تیمّم کرکے نماز ادا کی، اس پر اس نماز کا اعادہ یعنی دوبارہ پڑھنا واجب نہیں رہا، کیوں کہ مذکورہ واقعہ سن کر نبیِ اکرم ﷺ نے حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کو نماز کے اعادے کا حکم نہیں فرمایا اور اگر یہ واجب ہوتا تو آپ ﷺ ضرور حکم فرما دیتے۔[1]

صحیح بخاری میں امام صاحب نے ایک باب قائم کر کے یہی حدیث تعلیقاً ذکر کی ہے اور اس باب میں لکھا ہے:

"بَابٌ إِذَا خَافَ الْجُنُبُ عَلٰی نَفْسِهِ الْمَرَضَ أَوِ الْمَوْتَ أَوْ خَافَ الْعَطَشَ تَيَمَّمَ"[2]

"اگر جنابت والا اپنے آپ پر مرض یا موت سے ڈرے یا (وضو و غسل میں پانی ختم ہو جانے کے نتیجے میں) پیاس کے خدشے میں ہو تو وہ تیمّم کرلے۔"

اعادۂ نماز کا وجوب اور عدمِ وجوب:

یہاں اس بات کی تھوڑی سی وضاحت کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ نماز کے اعادے کے واجب نہ ہونے کے علاوہ بعض صورتوں میں واجب ہونے کی دلیل بھی موجود ہے۔ نماز پڑھی گئی اور اس کا وقت بھی نکل گیا، اب اسے دہرانے کی ضرورت نہیں، جیسا کہ ابھی گذشتہ حدیث میں ذکر ہوا ہے۔ یہ ایک صورت ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ نماز تیمّم کر کے ادا کرلی اور ابھی اس کا وقت باقی تھا کہ پانی بھی مل گیا، اس شکل میں بھی نماز کا دہرانا واجب نہیں ہے، جیسا کہ سنن ابو داود، نسائی، دارمی، دارقطنی اور مستدرک حاکم میں مختلف فیہ سند کے ساتھ اور صحیح ابن سکن میں موصول و صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دو آدمی سفر پر نکلے اور نماز کا وقت ہوگیا، مگر ان دونوں کے پاس (وضو کے لیے) پانی نہیں تھا۔ ان دونوں نے تیمّم کرکے نماز ادا کی۔

«ثُمَّ وَجَدَا الْمَآءَ فِي الْوَقْتِ فَأَعَادَ أَحَدُهُمَا الْوُضُوْءَ وَالصَّلَاةَ، وَلَمْ يُعِدِ الْآخَرُ»

---

[1] نیل الأوطار (۱/ ۱/ ۲۵۸) و المنتقیٰ (۱/ ۱/ ۲۵۹)

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: صحیح البخاري مع فتح الباري (۱/ ٤٥٤۔ ٤٥٥)

''پھر نماز کا وقت ہوتے ہوئے ہی انھیں پانی مل گیا۔ ان میں سے ایک نے تو وضو کر کے نماز دہرائی، مگر دوسرے نے اعادہ نہیں کیا، یعنی نماز نہیں دہرائی۔''

جب وہ دونوں نبیِ اکرم ﷺ کے پاس پہنچے تو انھوں نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ آپ ﷺ نے سارا واقعہ سننے کے بعد جس نے نماز نہیں دہرائی تھی، اس سے مخاطب ہو کر فرمایا:

«أَصَبْتَ السَّنَّةَ، وَأَجْزَأَتْكَ صَلَاتُكَ»

''تم نے سنت کو پا لیا اور تمھاری نماز ہوگئی۔''

پھر دوسرے شخص سے مخاطب ہو کر (جس نے نماز دہرائی تھی) فرمایا:

«لَكَ الْأَجْرَ مَرَّتَيْنِ»[1] ''تمھارے لیے دوہرا اجر ہے۔''

اس حدیث کے الفاظ «اَصَبْتَ السُّنَّةَ، واَجْزَأَتْكَ صَلَاتُكَ» اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ نماز پڑھ چکنے کے بعد وقت ہوتے ہوئے بھی اگر پانی مل جائے تو تیمّم والے پر واجب نہیں کہ وہ وضو کرے اور نماز کو دہرائے۔ امام ابو حنیفہ، مالک، شافعی اور یحییٰ رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے۔[2]

ایک تیسری صورت یہ ہے کہ پانی کی عدمِ موجودگی کی وجہ سے تیمّم کر کے نماز شروع کرنے والا تھا کہ پانی مل گیا۔ داود اور سلمہ بن عبد الرحمٰن کے سوا تمام فقہاے کرام رحمہم اللہ کے نزدیک وہ شخص اب وضو کرے اور پھر نماز پڑھے، کیوں کہ اس نے ابھی نماز شروع نہیں کی کہ پانی مل گیا ہے۔[3]

اسی سلسلے کی ایک چوتھی صورت بھی ہے کہ پانی کی عدم موجودگی کی وجہ سے تیمّم کیا اور نماز بھی شروع کر دی، مگر نماز مکمل کرنے سے پہلے ہی پانی حاصل ہوگیا۔ اس شکل میں امام داود اور مالک رحمہما اللہ کا کہنا ہے کہ وہ نماز نہ توڑے، بلکہ پڑھتا رہے اور مکمل کرے، کیوں کہ سورت محمد (آیت: ۳۳) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَلَا تُبْطِلُوٓا۟ أَعْمَٰلَكُمْ﴾ [محمد: ۳۳] ''اور اپنے اعمال کو ضائع نہ ہونے دو۔''

جب کہ امام ابو حنیفہ، اوزاعی، ثوری، مزنی (صاحبِ شافعی) اور ابن شریح رحمہم اللہ کا کہنا ہے کہ

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٧) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٢٠) المنتقى مع النيل ١/ (١/ ٢٦٥۔ ٢٦٦) مشكاة المصابيح (١/ ١٦٦) التلخيص الحبير (١/ ١/ ١٥٥۔ ١٥٦)

[2] نيل الأوطار (١/ ١/ ٢٦٦) و المرعاة (١/ ٥٩٦)

[3] نيل الأطار (١/ ١/ ٢٦٦) و المرعاة (١/ ٥٩٦)

اس پر واجب ہے کہ وہ نماز قطع کرے، وضو کرے اور پھر سے نماز پڑھے۔ ”منتقیٰ الأخبار“ میں ابو البرکات المجد ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس مسلک کے لیے جس حدیث سے استدلال کیا ہے، وہ سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارقطنی، مستدرک حاکم اور مسند احمد میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِنَّ الصَّعِيدَ الطَّيِّبَ وُضُوءُ الْمُسْلِمِ، وَإِنْ لَّمْ يَجِدِ الْمَاءَ عَشْرَ سِنِيْنَ، فَإِذَا وَجَدَ الْمَاءَ فَلْيُمِسَّ بَشَرَتَهُ فَإِنَّ ذٰلِكَ خَيْرٌ »[1]

”پاکیزہ مٹی مسلمان کا وضو ہے، اگرچہ اسے دس سال بھی پانی نہ ملے۔ جب اسے پانی مل جائے تو اسے چاہیے کہ پانی ہی سے غسل و وضو کرے کہ اس کے لیے یہی بہتر ہے۔“

اس حدیث کے آخری الفاظ « فَإِذَا وَجَدَ الْمَاءَ فَلْيُمِسَّ بَشَرَتَهُ فَإِنَّ ذٰلِكَ خَيْرٌ » سے استدلال کیا گیا ہے کہ نماز مکمل ہونے سے پہلے اگر پانی مل جائے تو پھر اس نماز کو چھوڑ کر وضو کرنا اور نماز کو دہرانا واجب ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ ”نیل الأوطار“ میں لکھتے ہیں کہ یہ استدلال بالکل صحیح ہے، کیوں کہ یہ حدیث مطلق ہے، ہر اس شخص کے حق میں جس نے وقت گزرنے کے بعد پانی پایا یا جس نے دورانِ نماز ہی پانی پالیا یا نماز پڑھ چکنے، مگر وقتِ نماز باقی ہونے کے عرصے میں پایا۔ جب کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ والی حدیث اس شخص کے ساتھ خاص و مقید ہے، جسے نماز سے فارغ ہو چکنے، مگر اس کے وقت ہونے کے دوران ہی میں پانی مل گیا۔ لہٰذا وہ صورت حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ والی حدیث کی رو سے اعادے سے مستثنیٰ ہے، جب کہ دوسری دو صورتیں یعنی تیمّم کر لینے، مگر نماز شروع کرنے سے پہلے پانی پالینے اور نماز شروع کر لینے، مگر اسے مکمل کرنے سے پہلے پانی پا لینے والی صورتیں حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ والی حدیث کے تحت آجاتی ہیں۔ ان میں نماز کا دہرانا ہی ضروری ہے۔[2]

آیتِ تیمّم کا سببِ نزول:

آیئے اس کے بارے میں نازل ہونے والی آیت کا شانِ نزول اور مشروعیتِ تیمّم کا اولین

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢١، ٣٢٢) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٧) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣١١) مشكاة المصابيح (١/ ٥٣٠) صحيح الجامع، رقم الحديث (١٦٦٧)

[2] نيل الأوطار (١/ ١/ ٢٦٧)

محرک دیکھیں۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ابی داود، نسائی، ابن ماجہ اور مسندِ احمد میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں نکلے اور جب ہم مقامِ بیدا یا ذات الجیش پر تھے تو میرا ہار ٹوٹ کر کہیں گر گیا (دوسری روایت کے مطابق انھوں نے وہ اپنی چھوٹی بہن حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے مستعار لے کر پہنا ہوا تھا)

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہار کی تلاش کے لیے رک گئے۔ دوسرے لوگ بھی رکے، جب کہ اس جگہ پانی تھا اور نہ لوگوں کے پاس ہی پانی تھا۔ لوگوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے جا کر شکایت کی کہ دیکھو! عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار گم ہونے کی وجہ سے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور سارے لوگ رکے پڑے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ گئے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو سخت سُست کہا، اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے تیمّم کی مشروعیت والی آیت نازل فرما دی۔ لہٰذا لوگوں نے تیمّم کیا۔ اسی واقعہ اور آیتِ تیمّم کے نزول پر حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«مَا هِيَ بِأَوَّلِ بَرَكَتِكُمْ يَا آلَ أَبِي بَكْرٍ»

''اے خاندانِ ابوبکر رضی اللہ عنہ! یہ تمھاری کوئی پہلی برکت نہیں ہے (یعنی تم لوگ بڑے بابرکت ہو کہ تمھاری وجہ سے مسلمانوں کو کئی آسانیاں میسر آئیں)۔''

اسی حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جس اونٹ پر میں بیٹھی تھی، جب اسے اس کی جگہ سے اٹھایا گیا تو وہیں سے ہار مل گیا، جب کہ صحیح بخاری اور دیگر کتب میں ایک دوسری سند سے بھی یہ واقعہ مذکور ہے، جہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ ہار حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے مستعار لینا ذکر ہوا ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہار کی تلاش میں لوگوں کو بھیجا۔ انھیں ہار تو مل گیا، مگر اسی دوران میں نماز کا وقت ہوگیا، جب کہ ان کے پاس پانی نہیں تھا، تو انھوں نے بغیر وضو ہی کے نماز پڑھ لی۔ واپس آئے تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ماجرا سنایا، تب اللہ تعالیٰ نے تیمّم والی آیت نازل فرما دی۔ اس پر حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مخاطب ہو کر فرمایا:

«جَزَاكِ اللّٰهُ خَيْراً، فَوَ اللّٰهِ مَا نَزَلَ بِكَ أَمْرٌ تَكْرَهِيْنَهُ قَطُّ إِلَّا جَعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ لَكِ مِنْهُ مَخْرَجًا، وَجَعَلَ لِلْمُسْلِمِيْنَ فِيْهِ خَيْراً [وفي رواية: بَرَكَةً]»[1]

[1] مختصر صحيح البخاري للألباني (ص: ٩٣۔ ٩٤) ومع فتح الباري (١/ ٤٣١۔ ٤٤٠) صحيح مسلم مع ←

''اللہ تمھیں جزائے خیر دے۔ اللہ کی قسم! جب کبھی کوئی ایسی بات رونما ہوئی ہے، جو تمھیں پسند نہ ہو، اللہ نے تمھارے لیے اس سے صاف بچ نکلنے کا راستہ بنا دیا اور صرف اسی پر بس نہیں کہ تمھارے لیے نکلنے کا راستہ بنایا، بلکہ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے لیے اس میں خیر و برکت رکھ دی۔''

اس حدیث میں یہ الفاظ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کے تھے، جس کی بطورِ خاص وجہ یہ ہے کہ جو لوگ ہار کی تلاش میں بھیجے گئے تھے، یہ ان کے سربراہ تھے۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا رجحان اس طرف ہے کہ ہار گم ہونے کا یہ واقعہ اور ہے اور جس میں حضرت عائشہ صدیقہ، طیبہ و طاہرہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگی تھی، اس واقعہ میں بھی ہار گم ہوا تھا، لیکن وہ دوسرا الگ واقعہ ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے "فتح الباري" میں محمد بن حبیب کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار غزوہ ذات الرقاع اور غزوہ بنی المصطلق میں الگ الگ دو مرتبہ گم ہوا تھا اور حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کے الفاظ اور اسی مفہوم کی بعض دیگر روایات نقل کرنے کے بعد انھوں نے لکھا ہے:

''یہ اس بات کو قوت دیتی ہیں کہ نزولِ تیمّم اور ہار کے گم ہونے والا یہ واقعہ تہمت اور ہار گم ہونے والے اس واقعے کے بعد کا ہے۔''[1]

بہر حال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہار گم ہونے کی بدولت اُمتِ اسلامیہ کو تیمّم کی رخصت مل گئی اور یہ برکاتِ آل ابی بکر رضی اللہ عنہم میں سے ایک برکت ہے۔

مقیم اور تیمّم:

یہ معروف اور عام سی بات ہے کہ سفر کے دوران میں پانی نہ ہونے کی شکل میں تیمّم کیا جا سکتا ہے، جب کہ حضر میں مقیم کو بھی اجازت ہے کہ اگر وہ پانی نہ پائے اور پانی پا لینے تک نماز کے گزر جانے کا اندیشہ ہو تو وہ بھی تیمّم کر کے نماز ادا کر سکتا ہے۔ صحیح بخاری میں امام صاحب نے ایک باب میں ان دونوں شرطوں کو ذکر کیا ہے، یعنی خروجِ وقت کا اندیشہ یا خدشہ اور پانی کا فقدان، جب کہ

←شرح النووي (٤/ ٥٨) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٠٩) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٢٩٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٦٨) و المنتقىٰ مع النيل (١/ ١/ ٢٦٧)

[1] فتح الباري (١/ ٤٣٤۔ ٤٣٥)

شارح بخاری حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''پانی کے فقدان کے تحت ہی پانی کے استعمال کی قدرت کا فقدان بھی آجاتا ہے کہ پانی تو موجود ہے، مگر سخت سردی یا ہلاکت کے خوف سے اس کے استعمال کی قدرت نہیں تو ان صورتوں میں مقیم کے لیے حضر میں بھی تیمّم جائز ہے۔''[1]

اس کی دلیل صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی اور دارقطنی کی وہ حدیث ہے، جو صحیح مسلم میں تعلیقاً اور باقی کتب میں موصولاً حضرت ابوجہیم بن حارث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«أَقْبَلَ النَّبِيُّ ﷺ مِنْ نَحْوِ بِئْرِ جَمَلٍ فَلَقِيَهُ رَجُلٌ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ فَلَمْ يَرُدَّ النَّبِيُّ ﷺ حَتّٰى أَقْبَلَ عَلَى الْجِدَارِ فَمَسَحَ بِوَجْهِهٖ وَيَدَيْهِ، ثُمَّ رَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ»[2]

''نبیِ اکرم ﷺ (مدینے کے ایک مقام) بئرِ جمل کی طرف سے تشریف لائے تو آپ ﷺ کو ایک آدمی ملا اور اس نے آپ ﷺ کو سلام کیا، آپ ﷺ نے اس کے سلام کا جواب نہ دیا، حتیٰ کہ آپ ﷺ ایک دیوار کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ ﷺ نے اپنا چہرہ مبارک اور دونوں ہاتھوں کا مسح (تیمّم) کیا اور پھر اس شخص کے سلام کا جواب دیا۔''

یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ جو آدمی نبیِ اکرم ﷺ کو ملا اور اس نے سلام کیا، وہ خود راویِ حدیث حضرت ابوجہیم رضی اللہ عنہ ہی تھے، جیسا کہ امام شافعی رحمہ اللہ کی روایت میں مذکور ہے۔ سنن دارقطنی کی روایت میں «حَتّٰى أَقْبَلَ عَلَى الْجِدَارِ» کی بجائے «حَتّٰى وَضَعَ يَدَهُ عَلَى الْجِدَارِ» کے الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے اپنے ہاتھ دیوار پر رکھے اور امام شافعی رحمہ اللہ والی روایت میں ہے: «فَحَتَّهُ بِعَصًا» کہ دیوار کو اپنے عصا مبارک سے کریدا اور پھر اس پر مسح کیا۔[3]

امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ کے پاس اس وقت پانی نہیں تھا، اس لیے آپ ﷺ نے تیمّم کیا۔ امام نووی رحمہ اللہ کی یہ بات نقل کر کے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "فتح الباري" (١/ ٤٤٣)

---

[1] صحيح البخاري مع فتح الباري (١/ ٤٤١)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٤٤١) صحيح مسلم مع شرح النووي (٤/ ٦٣، ٦٤) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١٩) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٠٠) المشكاة مع المرعاة (١/ ٥٩٧) التلخيص الحبير (١/ ١/ ١٤٩)

[3] فتح الباري (١/ ٤٤٢) المرعاة (١/ ٥٩٧)

میں لکھا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اسی لیے اس حدیث پر یہ باب قائم کیا ہے کہ اگر حضر میں بھی پانی ہو تو تیمّم جائز ہے۔ البتہ اس پر اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضر میں یہ تیمّم ایک سبب سے تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سلام کا جواب دینا چاہتے تھے اور سلام چونکہ اسمائے الٰہی میں سے ایک مقدس نام ہے، لہٰذا ذکرِ الٰہی کے ارادے سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیمّم فرمایا تھا۔ اس تیمّم سے نماز کا تو ارادہ نہیں تھا۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ سلام کا جواب تو بلا وضو بھی جائز ہے۔ اس کے باوجود پانی نہ ہونے کی صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیمّم کر لیا اور نماز جو بلا طہارت جائز ہی نہیں، جب اس کا وقت نکلنے کا خدشہ ہو تو حضر میں بھی پانی نہ ہونے کی شکل میں تیمّم کا جواز اَولیٰ ہے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے آثار:

اس موضوع کے بعض دلائل، اس مرفوع حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ سے بھی ملتے ہیں۔ چنانچہ بخاری شریف میں تعلیقاً مذکور ہے، جسے امام شافعی رحمہ اللہ نے موصولاً بیان کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما (مدینہ طیبہ سے بالائی جانب ایک فرسخ دور مقام) جرف سے مدینہ طیبہ کی طرف آ رہے تھے تو (مدینے سے صرف ایک میل پہلے والے مقام) مربد پر انھوں نے تیمّم کیا اور عصر کی نماز ادا کی، پھر مدینہ شریف میں داخل ہوئے، جب کہ ابھی سورج بلند تھا، مگر انھوں نے نماز دہرائی نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے اس اثر کے بارے میں حضرت نافع رضی اللہ عنہ کے الفاظ یہ ہیں:

«أَقْبَلَ ابْنُ عُمَرَ مِنْ أَرْضِهِ بِالْجُرُفِ حَتّٰى إِذَا كَانَ بِالْمِرْبَدِ تَيَمَّمَ، فَمَسَحَ وَجْهَهٗ وَيَدَيْهِ، وَصَلَّى الْعَصْرَ، ثُمَّ دَخَلَ الْمَدِيْنَةَ وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ فَلَمْ يُعِدْ» [1]

یہ اثر اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما حضر میں مقیم کے لیے بھی پانی نہ ملنے پر تیمّم کو جائز سمجھتے تھے، کیوں کہ ایسی مسافت کو، جس میں انھوں نے تیمّم کر کے نماز ادا فرمائی، سفر نہیں کہا جا سکتا۔ معروف محدث و تابعی حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا قول بخاری شریف میں تعلیقاً اور اسماعیل القاضی کی کتاب ''الأحکام'' میں موصولاً مروی ہے، جس میں مذکور ہے کہ اگر کوئی بیمار ہے اور اس کے قریب ہی پانی موجود ہے، لیکن وہاں کوئی دوسرا ایسا شخص نہیں، جو اسے وہ پانی پکڑا دے اور خود وہ

[1] صحيح البخاري مع فتح الباري (١/ ٤٤١) و التلخيص (١/ ١/ ١٤٥)

اٹھ کر لا نہیں سکتا تو وہ مریض تیمّم کر لے۔[1]

مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت حسن بصری رحمہ اللہ اور امام ابن سیرین رحمہما اللہ سے مروی ہے:

«لَا يَتَيَمَّمُ مَا رَجَا أَنْ يَّقْدِرَ عَلَى الْمَآءِ فِي الْوَقْتِ»[2]

''جب تک کسی کو امید ہو کہ وقت نکلنے سے پہلے پہلے وہ پانی پالے گا، تب تک تیمّم نہ کرے۔''

لیکن بقول حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اس کا مفہوم بھی پہلی بات کے موافق ہی ہے، یعنی اگر اُسے ایسی امید نہ ہو تو پھر وہ بھی تیمّم کر لے اور ان کا یہ قول بھی حضر میں مقیم شخص ہی کے بارے میں ہے۔

صحیح بخاری کے ترجمۃ الباب میں جہاں امام صاحب نے پانی نہ ملنے اور نماز کا وقت نکلنے کے خدشے سے حضر میں تیمّم کا بیان شروع کیا ہے، وہیں لکھا ہے:

''وَبِهِ قَالَ عَطَاءٌ'' ''امام عطاء رحمہ اللہ کا قول بھی یہی ہے (کہ حضر میں بھی اس صورت میں تیمّم جائز ہے)۔''

صحیح بخاری کے ترجمۃ الباب میں تو یہ اثر تعلیقاً لایا گیا ہے، جب کہ ''فتح الباري''میں لکھا ہے کہ اسی اثر کو مصنف عبد الرزاق میں صحیح سند سے موصولاً اور ایسے ہی مصنف ابن ابی شیبہ میں بھی ایک دوسری سند سے روایت کیا گیا ہے۔ مزید یہ کہ امام عطا سے منقول اثر میں نماز کو دُہرانے کے واجب ہونے کے بارے میں بھی کوئی ذکر نہیں ہے۔[3]

امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک بھی ان آثار کی بنا پر یہی ہے کہ حضر میں تیمّم سے ادا کی گئی نماز کو دہرانا واجب نہیں ہے۔ البتہ امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ایسی صورتِ حال کبھی کبھار اور شاذ و نادر ہی رونما ہوتی ہے، لہٰذا نماز کو دہرا لینا چاہیے۔ امام ابو یوسف اور ان کے ساتھی امام زفر رحمہما اللہ نے تو کہا ہے:

''ایسا شخص نماز ہی نہ پڑھے، اگرچہ وقت ہی کیوں نہ نکل جائے۔''[4]

لیکن ان کا یہ قول صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے آثار ہی نہیں، بلکہ دیگر ائمہ کے اقوال کے بھی مخالف اور انتہائی منفرد و غیر مستقیم ہے، بلکہ صحیحین، سنن ترمذی اور مسندِ احمد کی اُس حدیث کے بھی

---

[1] صحيح البخاري مع فتح الباري (١/ ٤٤) و التلخيص (١/ ١/ ١٤٥)

[2] فتح الباري (١/ ٤٤١)

[3] فتح الباري (١/ ٤٤١)

[4] فتح الباري (١/ ٤٤٢)

خلاف ہے، جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار تلاش کرنے والے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بغیر وضو ہی کے نماز ادا کر لیتے ہیں اور تیمّم کا اس وقت تک ابھی حکم ہی نازل نہیں ہوا تھا۔ اس کے باوجود نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں نہ تو ان کے اس فعل پر ٹوکا اور نہ نماز دہرانے کا حکم فرمایا، جیسا کہ تفصیل گزری ہے۔ اس اعتبار سے امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہی اقرب الی الصواب ہے کہ ایسی حالت میں تیمّم سے ادا کی گئی نماز کو دہرانا واجب نہیں ہے۔

ایک انتہائی نادر صورت:

یہیں ایک اور بات کی طرف بھی اشارہ کرتے چلے جائیں کہ کبھی کبھار ایک انتہائی نادر و ناممکن سی صورتِ حال بھی پیش آسکتی ہے کہ کسی کو نہ تو پانی ملے اور نہ مٹی ہی یا بہ الفاظ دیگر نہ وضو کا ذریعہ موجود ہو اور نہ تیمّم ہی کا، جس کی کئی اشکال امام نووی رحمہ اللہ نے "المجموع" (۲/ ۳۰۵ وما بعدھا) میں بیان کی ہیں۔ اگر کبھی کسی کو ایسی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑے، تو ایسے میں کیا کیا جائے؟ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں جو تبویب کی ہے، وہاں موصوف کے الفاظ ہیں:

"بَابُ إِذَا لَمْ يَجِدْ مَاءً وَلَا تُرَابًا"

''اگر کسی کو پانی ملے نہ مٹی تو اس کے لیے حکم کا بیان۔''

جیسا کہ ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ امام صاحب رحمہ اللہ نے اس کے بارے میں حکم بیان نہیں کیا، بلکہ اسے کھلا ہی چھوڑ دیا ہے۔ جہاں کہیں اس قسم کی تبویب ہوتی ہے، وہ اس بات کا پتا دیتی ہے کہ اُن کے نزدیک اس کے حکم میں قوی قسم کا اختلاف ہوتا ہے اور بحث ونظر کی گنجایش بھی پاتے ہیں تو باب قائم کر دیتے ہیں، مگر باب میں حکم بتانے کے بجائے مختلف آرا کا دروازہ کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ البتہ اپنی رائے کا اظہار اس باب کے تحت آنے والی حدیث کی شکل میں کر جاتے ہیں، چنانچہ مذکورہ صورت میں حکم یہ ہے کہ پانی اور مٹی چاہے دونوں چیزیں ہی کہیں دستیاب نہ ہوں نماز پھر بھی پڑھی جائے گی، جو اس نادر حالت میں بلا تیمّم و بلا وضو ہی ہوگی اور اس کی دلیل بھی صحیحین، سنن ابی داود نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد والی وہی حدیث ہے، جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار تلاش کرنے کے لیے جانے والے لوگ اسی طرح نماز ادا کر لیتے ہیں، چنانچہ اس حدیث میں ہے:

«فَأَدْرَكَتْهُمُ الصَّلَاةُ، وَلَيْسَ مَعَهُمْ مَاءٌ فَصَلُّوا [وَفي رواية: بِغَيْرِ وُضُوءٍ]»[1]

''نماز کا وقت ہوگیا، جب کہ ان کے پاس پانی نہیں تھا، لیکن انھوں نے بلا وضو ہی نماز ادا کر لی۔''

تیمّم کا اس وقت تک ابھی حکم ہی نہیں ہوا تھا، لہٰذا ابن رشید کے حوالے سے صاحبِ فتح الباری نے لکھا ہے کہ ان کے پاس صرف پانی کا نہ ہونا اور ہمارے پاس پانی اور مٹی دونوں کا نہ ہونا ایک ہی حکم میں ہیں، اسی بات سے اس حدیث کی اس باب سے مناسبت بھی ظاہر ہو جاتی ہے، کیوں کہ حدیث میں مٹی کے فقدان کا ذکر نہیں، صرف پانی کے فقدان کا تذکرہ ہے۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ چاہے کہیں پانی اور مٹی دونوں ہی نہ ملیں، نماز پھر بھی واجب ہے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کے وجوب کے پیشِ نظر ہی نماز ادا کی تھی۔ اگر ایسے حالات میں نماز ممنوع ہوتی، تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان صحابہ رضی اللہ عنہم کو ان کے اس فعل پر ٹوک دیتے، مگر ایسا نہیں ہوا اور ضرورت کے وقت نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی مسئلے میں شرعی حکم بیان کرنے میں تاخیر کرنا جائز ہے اور نہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شایانِ شان ہے۔[2]

امام شوکانی رحمہ اللہ کے بقول صاحبِ ''منتقیٰ الأخبار'' ابو البرکات المجد ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور کثیر محققین کا مسلک یہی ہے کہ ان حالات میں بھی نماز کو ادا کرنا واجب ہے۔[3]

فتح الباری شرح صحیح بخاری میں لکھا ہے کہ امام شافعی، احمد اور امام مالک رحمہم اللہ خود تو نہیں، البتہ ان کے اکثر اصحاب اور جمہور محدثینِ کرام رحمہم اللہ کا مسلک یہی وجوب والا ہی ہے، لیکن نماز کو دہرانے کے واجب ہونے میں ان کا اختلاف ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے اکثر اصحاب کے نزدیک ایسی نماز کو دہرانا واجب ہے کہ جب پانی یا مٹی دستیاب ہوں تو وضو یا تیمّم کر کے وہ نماز دوبارہ ادا کر لے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ عذر شاذ و نادر واقع ہونے والا ہے، لہٰذا یہ نماز دہرانے کو ساقط نہیں کرتا۔

ان کی یہ بات محض ایک قیاس آرائی ہے، ورنہ حدیث میں مذکور اس واقعہ میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٤٣١۔ ٤٤٠) مختصر صحيح البخاري للألباني (ص: ٩٣۔ ٩٤) صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ٥٩) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٠٩) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٢٢٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٦٨) المنتقى مع النيل (١/ ١/ ٢٦٧)

[2] فتح الباري (١/ ٤٤٠)

[3] نيل الأوطار (١/ ١/ ٢٦٧)

نے ان صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو نماز دہرانے کا حکم نہیں فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ امام احمد رحمہ اللہ کے مشہور قول کے مطابق، اسی طرح امام مزنی، سحنون اور ابن منذر رحمہم اللہ کے نزدیک ایسی ادا کردہ نماز کو دوبارہ دہرانے کی کوئی ضرورت ہے نہ یہ واجب ہے، ان کی دلیل مذکورہ بالا حدیث ہی ہے، جب کہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کے مشہور اقوال کے مطابق ایسی صورتِ حال سے دو چار شخص کو نماز ہی نہیں پڑھنی چاہیے۔ البتہ امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب، اسی طرح امام ثوری اور امام اوزاعی رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ اس شخص پر نماز کی قضا واجب ہے، لیکن امام مالک رحمہ اللہ سے ان کے مدنی رواۃ نے جو قول نقل کیا ہے، اس کے مطابق ان کے نزدیک ایسے شخص پر اس نماز کی قضا بھی واجب نہیں۔ گویا ایسے شخص کو وہ نماز ہی معاف ہے، وہ اس وقت ادا کرے نہ بعد میں قضا کرے، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فعل جسے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے برقرار رکھا، وہ ان حضرات کے اقوال کے بجائے نماز کو اس کے وقت پر وجوباً ادا کرنے اور پھر اسے نہ دہرانے کے قول والوں کی تائید کر رہا ہے۔

ایسی صورتِ حال سے دو چار شخص کی نماز کے حکم کے بارے میں یہ چار اقوال ہوگئے ہیں۔ جب کہ "المجموع شرح المهذب"میں امام نووی رحمہ اللہ نے ایک پانچواں قول بھی ذکر کیا ہے، جس کے مطابق ایسے شخص کا وقت پر نماز ادا کر لینا مستحب اور بعد میں اس صورتِ حال کے زائل ہونے پر اس نماز کو دہرا لینا واجب ہے۔[1]

مذکورہ بالا حدیث ان پانچوں اقوال میں سے امام احمد، مزنی، سحنون اور ابن المنذر رحمہم اللہ کے قول کی موید ہے۔ دورِ حاضر کے معروف عالم و مفتی شیخ ابن باز کی نگرانی میں فتح الباری کی جو تحقیق ہوئی ہے، اس میں مذکورہ مقام پر ایک تعلیق یا حاشیہ ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صاحب موصوف اور ان کی نگرانی میں کام کرنے والے کبار علمائے تحقیق کا مسلک بھی یہی ہے کہ ان حالات میں ادا کی گئی نماز کو دہرانا واجب نہیں، کیوں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم نہیں فرمایا۔[2]

بعض مجبوری کے حالات میں ادا شدہ نماز کو وہ مجبوری زائل ہونے کے بعد دوبارہ ادا نہ کرنے یا بالفاظِ دیگر اعادہ یا دہرانے کے واجب نہ ہونے کی تائید تو اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جو

---

[1] المجموع شرح المهذب (٢/ ٣٠٦) فتح الباري (١/ ٤٤٠) نيل الأوطار (١/ ١/ ٢٦٧ـ ٢٦٨)

[2] حاشية فتح الباري (١/ ٤٤٠)

سنن ابی داود، نسائی، دارقطنی، دارمی اور مستدرک حاکم میں ایک مختلف فیہ سند سے، مگر صحیح ابن السکن میں صحیح اور موصول سند سے مروی ہے، جس میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دو آدمی سفر پر نکلے۔ کہیں انھیں نماز کا وقت ہوگیا، لیکن ان کے پاس پانی نہیں تھا، لہٰذا ان دونوں نے تیمّم کر کے نماز ادا کی۔ پھر انھیں پانی مل گیا تو ان میں سے ایک نے وضو کر کے وہ نماز دہرائی، مگر دوسرے نے نہیں دہرائی۔ جب انھوں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سارا واقعہ سنایا تو نماز دہرانے والے سے مخاطب ہو کر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« أَصَبْتَ السُّنَّةَ وَأَجْزَأَتْكَ صَلَاتُكَ » ”تم نے سنت کو پا لیا اور تمھاری نماز ہوگئی۔“

گویا ان الفاظ سے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز نہ دُہرانے والے کے فعل کو سنت کے مطابق قرار دیا اور دوسرے کے اجتہاد کو غیر صحیح قرار دیا۔ تاہم اس سے مخاطب ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَكَ الْأَجْرُ مَرَّتَيْنِ »[1] ”تمھیں دوہرا ثواب ہوگا۔“

یعنی تیمّم سے ادا کرنے کا بھی اور وضو سے ادا کرنے کا بھی۔ کیوں کہ جب وہ دونوں ہی صحیح تھیں تو دونوں ہی کا ثواب بھی ملے گا، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کسی کے عمل کو ضائع نہیں کرتا اور اس سے بھی یہ معلوم ہوا کہ اجتہاد میں خطا ہو جانا اس عمل پر اجر حاصل ہونے کے منافی نہیں، بلکہ اجتہاد میں خطا پر بھی اجر ملتا ہے۔ جیسا کہ صحیحین، سنن اربعہ اور مسند احمد میں معروف حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

« إِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَصَابَ فَلَهُ أَجْرَانِ، وَإِذَا حَكَمَ الْحَاكِمُ فَاجْتَهَدَ ثُمَّ أَخْطَأَ فَلَهُ أَجْرٌ »[2]

”جب کوئی شخص فیصلہ کرے اور اجتہاد سے کام لے اور اپنے اجتہاد میں صحیح حکم کو پالے تو اسے دو اجر ملتے ہیں اور اگر فیصلہ کرنے والے نے اجتہاد کیا اور خطا کر گیا تو اسے (اجتہاد کا) ایک اجر ملے گا۔“

کسی فعل پر اجر کے ثابت ہونے سے اس فعل کا صحیح ہونا بھی لازم نہیں آتا، جیسا کہ اس ذکر

---

[1] مشكاة المصابيح تحقيق الألباني (١/ ١٦٦) تلخيص الحبير (١/ ١/ ١٥٥۔ ١٥٦)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١٣/ ٣١٨) مختصر صحيح مسلم للمنذري (١٠٥٦) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٥٢) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٦٨) صحيح سنن النسائي (٣/ ١٠٨٩) رقم الحديث (٤٩٧٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٣١٤) مسند أحمد (٤/ ١٩٨)

کردہ حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ آپ ﷺ نے غلطی کرنے والے کو بھی ثواب ملنا بتایا ہے۔ یہی معاملہ اس سے پہلی حدیث والے واقعہ کا بھی ہے کہ نماز کو دہرانے والے نے اجتہاد میں خطا کی، اس کے باوجود اس کا اجر ثابت ہوگیا۔ جیسا کہ «لَكَ الْأَجْرُ مَرَّتَيْنِ» کے الفاظ سے پتا چلتا ہے۔ یہ حدیث پہلے بھی ذکر کی جا چکی ہے، مگر وہاں موضوع کچھ اور تھا اور اُس میں مذکور صورتِ حال ہماری اس موجودہ زیرِ بحث صورتِ حال سے بھی قدرے مختلف ہے۔ اس لیے ہم نے اسے استدلال کی بنیاد نہیں بنایا۔ محض تائید کے لیے ذکر کیا ہے کہ اعادہ یا نماز کو دہرانے کا واجب نہ ہونا تو اس میں بھی مذکور ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان کے پاس پانی نہیں تھا تو انھوں نے تیمّم کر کے نماز پڑھ لی اور یہاں پانی ہے نہ مٹی۔ لہٰذا کسی نے بلا وضو و بلا تیمّم نماز ادا کرلی۔ نہ وہاں دہرانا واجب قرار دیا گیا ہے اور نہ یہاں ہی واجب ہے، لہٰذا عدمِ وجوب کا قول ہی راجح ہوا۔

طریقۂ تیمّم:

تیمّم کے متعلق کئی مسائل تو ذکر ہوگئے ہیں۔ اب آئیے مسنون طریقۂ تیمّم کی طرف، تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ تیمّم کا طریقہ بھی قرآنِ کریم کی مذکورہ دونوں آیتوں اور کئی احادیث میں گزرا ہے، مگر ان مواقع پر ان کے ذکر سے مراد طریقۂ تیمّم کا تذکرہ نہیں تھا، بلکہ دوسرے احکام و مسائل تھے۔ مثلاً ان قرآنی آیات کو وہاں ہم نے تیمّم کی مشروعیت اور اس کے جواز کو ثابت کرنے کے لیے ذکر کیا تھا، پھر صحیحین اور سنن اربعہ کے حوالے سے حضرت عمار اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما والی حدیث، حیض و جنابت کی حالت میں تیمّم کے جواز کی دلیل کے طور پیش کی تھی۔ اس کے بعد نبیِ اکرم ﷺ نے تیمّم کر کے سلام کا جواب دینے والی صحیحین، سنن نسائی اور دارقطنی کی حدیث، مقیم کے لیے تیمّم کے جواز پر استدلال کرنے کے لیے ذکر کی تھی اور بخاری تعلیقاً و شافعی موصولاً والا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا اثر بھی اسی سلسلے ہی میں ذکر کیا گیا تھا۔ ان سب آیات و احادیث اور اثر میں تیمّم کا طریقہ بھی مذکور ہے، جسے اب ہم طریقۂ تیمّم کے طور پر بطورِ خاص قدرے تفصیل سے ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

طریقۂ تیمّم کے سلسلے میں قرآنی آیات اور احادیثِ رسول ﷺ میں واضح ہدایات موجود ہیں، چونکہ ہم وہ آیات و احادیث پورے حوالوں کے ساتھ ذکر کر چکے ہیں، لہٰذا اب ہم ان کے حوالے تو ذکر کر دیتے ہیں۔ البتہ ان کی مکمل نصوص ذکر نہیں کریں گے، بلکہ صرف طریقۂ تیمّم سے متعلق الفاظ

کے ذکر ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ چنانچہ سورۃ النساء (آیت: ۴۳) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ﴾

''اور تمھیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی لو اور منہ اور ہاتھوں کا مسح (کر کے تیمّم) کرلو۔''

جب کہ سورۃ المائدہ (آیت: ٦) میں ایک لفظ کے بڑھ جانے سے بات اور بھی قریب الفہم ہوگئی ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ﴾

''اور تمھیں پانی نہ مل سکے تو پاک مٹی لو اور اُس سے منہ اور ہاتھوں کا مسح (تیمّم) کرلو۔''

اس دوسری آیت کے الفاظ میں ﴿مِنْهُ﴾ کے ایک لفظ نے بات کھول دی ہے کہ مٹی کے ساتھ منہ اور ہاتھوں کا مسح کرنا ہے۔ قرآنِ کریم کے ان دونوں مقامات پر تیمّم کا طریقہ تو ان الفاظ میں پورا آگیا ہے۔ معمولی سی دریافت طلب بات یہ رہ جاتی ہے کہ مٹی سے منہ اور ہاتھوں کا مسح کس طرح کیا جائے؟ تو اس کا تفصیلی جواب نبیِ اکرم ﷺ کے ارشادات میں آگیا ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم اور سنن اربعہ والی حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں نبیِ اکرم ﷺ کے طریقہ تیمّم کو بیان کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں:

((فَضَرَبَ النَّبِيُّ ﷺ بِكَفَّيْهِ الْأَرْضَ، ثُمَّ نَفَخَ فِيْهِمَا، ثُمَّ مَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهٗ وَكَفَّيْهِ))[1]

''نبیِ اکرم ﷺ نے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو زمین پر مارا، پھر ان دونوں ہتھیلیوں میں پھونک ماری، پھر ان دونوں ہتھیلیوں کو (پہلے) اپنے منہ پر اور (پھر) اپنے دونوں ہاتھوں پر باہم پھیر لیا۔''

صحیحین اور سنن اربعہ کی اس حدیث میں تیمّم کا مکمل طریقہ مذکور ہے۔ اسی طرح صحیح بخاری،

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٣٣٨) صحيح مسلم مع شرح النووي (٤/ ٦٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٠٨) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٥) مختصر سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٩٩) المشكاة مع المرعاة (١/ ١٨٧۔ ١٨٩) و صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٣٦٧)

مسلم، سنن نسائی اور دارقطنی کی حضرت ابوجہم رضی اللہ عنہ والی حدیث ہے، جو مسلم شریف میں تعلیقاً اور دیگر کتب میں موصولاً مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بے وضو تھے اور کسی کے سلام کا جواب دینے کے لیے تیمّم کیا:

((حَتّٰی أَقْبَلَ عَلٰی الْجِدَارِ)) ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیوار کی طرف متوجہ ہوئے۔''

سنن دارقطنی میں مروی ہے:

((حَتّٰی وَضَعَ یَدَہٗ عَلَی الْجِدَارِ فَمَسَحَ بِوَجْھِہٖ وَیَدَیْہِ)) [1]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ دیوار پر رکھے۔ پھر ان کو چہرہ مبارک پر اور باہم دونوں ہاتھوں پر مارا۔''

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً مروی ان دو احادیث کے علاوہ ایک صحابی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا واقعہ بھی صحیح بخاری میں تعلیقاً مروی ہے، جسے امام شافعی رحمہ اللہ نے موصولاً بیان کیا ہے:

((تَیَمَّمَ فَمَسَحَ وَجْھَہٗ وَیَدَیْہِ، وَصَلَّی الْعَصْرَ)) [2]

''انھوں نے تیمّم کیا تو اپنے منہ اور دونوں ہاتھوں کا مسح کیا اور عصر کی نماز پڑھی۔''

اس اثر اور مذکورہ احادیث میں تیمّم کا طریقہ انتہائی واضح انداز سے آ گیا ہے۔

پھونک مارنا:

ان دونوں حدیثوں اور اثرِ صحابی میں سے صرف ایک حدیث میں زمین پر ہاتھ مارنے کے بعد ان میں پھونک مارنے کا بھی ذکر ہوا ہے۔ شارحینِ حدیث نے لکھا ہے کہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں کو کوئی چیز لگ گئی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدشہ محسوس ہوا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس پر نہ لگ جائے۔ لہٰذا پھونک مار کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیز کو گرا دیا، یا پھر یہ بھی ممکن ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں کو مٹی کی مقدار کچھ زیادہ لگ گئی تھی، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہاتھوں کو اکٹھے کر کے ان میں ہلکی سی پھونک ماری، تاکہ مٹی کی مقدار میں تخفیف ہو جائے یا پھر یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پھونک

---

[1] صحیح البخاري مع الفتح (١/ ٤٤١) صحیح مسلم مع شرح النووي (٤/ ٦٣، ٦٤) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (٣١٩) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (٣٠٠) المشکاۃ مع المرعاۃ (١/ ٥٩٧) التلخیص الحبیر (١/ ١/ ١٤٩)

[2] صحیح البخاري مع فتح الباري (١/ ٤٤١) و التلخیص (١/ ١/ ١٤٥)

کی مشروعیت کو بیان کرنے کے لیے ایسا کیا تھا۔[1]

ویسے بھی تیمّم میں مٹی کے ساتھ منہ اور ہاتھوں کو خوب خاک آلود کرنا مقصود ہے نہ تمام اعضاے وضو کا استیعاب مطلوب ہوتا ہے کہ مٹی کا یہ مسح تمام اعضاے وضو پر کیا جائے، بلکہ یہ تو ایک علامت ہے، جسے وضو کے قائم مقام مقرر کیا گیا ہے۔ شارح بخاری لکھتے ہیں کہ اس پھونک مارنے سے مٹی کی تخفیف کے استحباب پر استدلال کیا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ اس بات کی دلیل بھی ہے کہ جب ایک مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنے سے ان پر لگی مٹی کو بھی پھونک مار کر آپ ﷺ نے کم کر دیا تھا تو معلوم ہوا کہ تیمّم کرتے وقت مختلف اعضا کے لیے بار بار ہاتھوں کو زمین پر مارنا مستحب نہیں ہے۔[2]

کیوں کہ بار بار زمین پر ہاتھ مارنا زیادہ مٹی لانے اور عدمِ تخفیف کو مستلزم ہے، لہٰذا تکرار کا استحباب ساقط ہوگیا۔

زمین پر ہاتھ مارنے میں تکرار:

صرف ایک مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنا جمہور اہلِ علم کا مسلک ہے۔[3] اس مسلک والوں کے استدلال کو دوسری کئی صریح اور صحیح احادیث سے بھی تقویت ملتی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے تیمّم کے لیے اپنے ہاتھ کو صرف ایک ہی مرتبہ زمین پر مارا تھا، بار بار نہیں، مثلاً تیمّم کے طریقے کے بارے میں جو احادیث صحیح بخاری اور دیگر کتب کے حوالے سے گزری ہیں، ان سب سے بھی بظاہر ہاتھوں کو زمین پر ایک مرتبہ مارنے ہی کا ثبوت ملتا ہے، جب کہ صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی، صحیح ابی عوانہ، سنن دارقطنی، بیہقی اور مسندِ احمد میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں صحیح مسلم کے سیاق کی رو سے ارشادِ نبوی ﷺ کے الفاظ یوں ہیں:

«إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيْكَ أَنْ تَقُوْلَ بِيَدَيْكَ هٰكَذَا، ثُمَّ ضَرَبَ بِيَدَيْهِ الْأَرْضَ ضَرْبَةً وَّاحِدَةً»[4]

---

[1] فتح الباري (١/ ٤٤٣۔ ٤٤٤) المرعاة (١/ ٥٨٨)

[2] فتح الباري (١/ ٤٤٤)

[3] المرعاة (١/ ٥٨٨)

[4] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٣٤٧) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١٨) صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ٦١) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٠١، ٣٠٥، ٣٠٦، ٣٠٨) و الإرواء (١/ ١٨٤)

’’تمھارے لیے اپنے دونوں ہاتھوں سے یوں کر لینا ہی کافی تھا، پھر آپ ﷺ نے صرف ایک ہی مرتبہ اپنے دونوں ہاتھوں کو زمین پر مارا۔‘‘

امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے "المنھاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج‘‘ میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث ان لوگوں کے لیے دلیل ہے، جو تیمّم میں منہ اور ہاتھوں کے لیے صرف ایک ہی مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنے کو کافی قرار دیتے ہیں۔ آگے لکھتے ہیں:

’’دوسرے اس کا یہ جواب دے سکتے ہیں کہ یہاں صرف ہاتھ مارنے کی صورت یا طریقہ سکھلانا مراد ہے، پورے تیمّم کا طریقہ بیان کرنا نہیں۔‘‘[1]

امام صاحب کا یہ جواب نقل کر کے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کے اس جواب پر تعاقب کیا گیا ہے (کہ وہ صحیح نہیں، کیوں کہ) اس سارے واقعے کا سیاق اور تفصیل اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہاں مراد پورے تیمّم کا طریقہ سکھلانا ہی ہے (نہ کہ صرف ہاتھ مارنے کا طریقہ سکھلانا) کیوں کہ آپ ﷺ کے ارشاد: «إِنَّمَا كَانَ يَكْفِيكَ» ’’تمھارے لیے یہی کافی ہے۔‘‘ کے الفاظ سے بظاہر یہی معلوم ہو رہا ہے (کہ یہاں تیمّم کا مکمل طریقہ سکھلانا ہی مراد ہے)[2]

اسی طرح سنن ابو داود، ترمذی، دارقطنی، بیہقی، مسند احمد، سنن دارقطنی اور معانی الآثار طحاوی میں صحیح سند سے مروی ایک حدیث ہے، جس میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اَلتَّيَمُّمُ ضَرْبَةٌ لِّلْوَجْهِ وَالْكَفَّيْنِ»[3]

’’تیمّم کے لیے منہ اور ہاتھوں کے لیے صرف ایک ہی مرتبہ ہاتھوں کو زمین پر مارنا ہے۔‘‘

اس حدیث میں بھی صرف ایک ہی مرتبہ ہاتھوں کو زمین پر مارنے کا حکم ہے۔

دو مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنا اور اس کے دلائل کا جائزہ:

بعض روایات ایسی بھی ملتی ہیں، جن میں زمین پر دو مرتبہ ہاتھ مارنے کا ذکر ہے۔ ایک مرتبہ

[1] شرح صحیح مسلم للنووي (٢/ ٤/ ٦١)

[2] فتح الباري (١/ ٤٤٥۔ ٤٤٦)

[3] صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (٣١٨) صحیح سنن الترمذي، رقم الحدیث (١٢٥) إرواء الغلیل (١/ ١٧٥) و صحیح الجامع، رقم الحدیث (٣٠٢٠)

منہ کے لیے اور دوسری مرتبہ دونوں ہاتھوں کے لیے، مگر وہ روایات متکلم فیہ اور ضعیف قرار دی گئی ہیں، مثلاً ایک روایت تو حضرت عمار رضی اللہ عنہ ہی سے سنن ابی داود و ابن ماجہ میں ہے، جس میں مذکور ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے نمازِ فجر کے لیے تیمّم کیا تو انھوں نے اپنے ہاتھوں کو زمین پر مارا اور اپنے چہروں کا ایک مرتبہ مسح کیا۔ پھر دوبارہ اپنے ہاتھوں کو زمین پر مارا:

«فَمَسَحُوا بِأَيْدِيهِمْ كُلِّهَا إِلَى الْمَنَاكِبِ وَالْآبَاطِ مِنْ بُطُونِ أَيْدِيهِمْ»[1]

''پھر اپنے ہاتھوں کا اپنی ہتھیلیوں سے کندھوں اور بغلوں تک مسح کیا۔''

مختصر السنن میں امام منذری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ حدیث منقطع ہے، کیوں کہ اس کی سند کے ایک راوی عبد اللہ نے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا۔ البتہ سنن نسائی و ابن ماجہ میں ایک روایت انھیں عبد اللہ سے ان کے والد کے حوالے سے ہے، یعنی وہ موصول ہے اور مختصر بھی۔[2]

وہ صحیح مگر مختصر اس قدر ہے کہ اس میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے الفاظ صرف اتنے ہیں:

«تَيَمَّمْنَا مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ بِالتُّرَابِ فَمَسَحْنَا بِوُجُوهِنَا وَأَيْدِينَا إِلَى الْمَنَاكِبِ»[3]

''ہم نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں مٹی سے تیمّم کیا اور اپنے چہروں اور ہاتھوں کا کندھوں تک مسح کیا۔''

گویا اس حدیث میں دو مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنے کا ذکر ہی نہیں ہے۔ البتہ شیخ البانی نے تحقیقِ مشکات میں ذکر کیا ہے کہ ابو داود نے اس روایت کو موصولاً بھی بیان کیا ہے، پھر اس کی سند کو انھوں نے صحیح کہا ہے۔[4]

اس موصول روایت سے ان کی مراد غالباً وہ روایت ہے، جسے عبید اللہ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے بیان کیا ہے، مگر اس کی تفصیل میں دو مرتبہ ہاتھ زمین

---

[1] مختصر السنن للمنذري (١/ ٩٩/ ٢٠٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٧) و المشكاة مع المرعاة (١/ ٥٩٧۔ ٥٩٨) شیخ البانی نے اس حدیث کو صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١٠) میں ذکر کیا اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔

[2] مختصر السنن للمنذري (١/ ٢٠٠) و سنن أبي داود مع العون (١/ ٥٠٩۔ ١٥٠)

[3] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١١) سنن النسائي مع التعليقات السلفية (١/ ٣٧) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٠٤) و اللفظ له، سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٦٦)

[4] تحقيق المشكاة (١/ ١٦٧)

پر مارنے کا ذکر نہیں ہے۔ امام ابو داود رحمہ اللہ نے اس روایت کے بعد اپنی سنن میں ابن شہاب کا قول بھی ذکر کیا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

﴿ وَلَا يَعْتَبِرُ بِهٰذَا النَّاسُ ﴾ [1] ''اس روایت کو لوگ قابلِ اعتبار نہیں سمجھتے۔''

پھر آگے کچھ تفصیل ذکر کی ہے کہ ابن اسحاق، یونس اور معمر نے اس روایت کو بیان کیا تو دو دفعہ زمین پر ہاتھ مارنے کا تذکرہ کیا، جب کہ صالح بن کیسان، لیث بن سعد، عمرو بن دینار، مالک بن ابی ذئب اور دیگر رواۃ نے اس کو بیان کرتے وقت دو دفعہ کا ذکر نہیں کیا اور ابن ابی عیینہ سے اضطراب کے واقع ہونے کا ذکر بھی کیا ہے۔[2]

علامہ ابن عبد البر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اکثر آثار یعنی احادیث میں صرف ایک ہی مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنے کا ذکر ہے اور جو بعض روایات دو مرتبہ ہاتھ مارنے والی مروی ہیں، وہ سب مضطرب ہیں۔

دو مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنے کا ذکر ایک دوسری روایت میں بھی ہوا ہے، جو سنن دارقطنی، بیہقی اور مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے:

﴿ اَلتَّيَمُّمُ ضَرْبَتَانِ، ضَرْبَةٌ لِّلْوَجْهِ، وَضَرْبَةٌ لِلْيَدَيْنِ إِلٰى الْمِرْفَقَيْنِ ﴾ [3]

''تیمّم دو ضربیں ہے۔ ایک ضرب منہ کے لیے اور دوسری کہنیوں تک دونوں ہاتھوں کے لیے ہے۔''

امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ یحییٰ القطان اور ہشیم نے اس روایت کو موقوف قرار دیا ہے، یعنی یہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل نہیں ہے، بلکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما پر موقوف ہے، اگرچہ یہ روایت موقوفاً بیان نہیں کی گئی۔

ایک دوسری روایت جو امام دارقطنی نے سنن میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے موقوف بیان کی ہے، اس کی سند میں علی بن ظبیان راوی ہے، جسے قطان، ابن معین اور دیگر کثیر محدّثین نے ضعیف قرار

---

[1] سنن أبي داود مع العون (١/ ٥١٢)

[2] دیکھیں: سنن أبي داود مع عون المعبود (١/ ٥١٢۔ ٥١٣)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٣٠) تلخيص الحبير (١/ ١/ ١٥١) و ضعيف الجامع، رقم الحديث (٢٥١٨) و السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (٣٤٢٧)

دیا ہے۔ سنن دارقطنی ہی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ایک روایت مرفوعاً بھی ہے، جس میں دو ضربوں کا ذکر ہے، لیکن اس میں ایک راوی سلیمان بن ارقم ہے، جسے متروک کہا گیا ہے۔ امام بیہقی کہتے ہیں کہ اسے معمر اور بعض دیگر رواۃ نے امام زہری سے موقوفاً بیان ہے۔ ایک حدیث سنن ابی داود میں بھی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جس میں دو ضربوں کا ذکر آیا ہے، لیکن اس روایت کا دار و مدار ایک راوی محمد بن ثابت پر ہے، جسے ابن معین، ابو حاتم، احمد، بخاری اور خطابی رحمہم اللہ جیسے کبار محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ سنن دارقطنی اور مستدرکِ حاکم میں ایک روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعاً مروی ہے، جس میں مذکور ہے:

«اَلتَّیَمُّمُ ضَرْبَةٌ لِلْوَجْهِ، وَضَرْبَةٌ لِّلذِّرَاعَیْنِ إِلَی الْمِرْفَقَیْنِ»

”تیمّم میں ایک ضرب منہ کے لیے اور ایک ضرب کہنیوں تک دونوں ہاتھوں کے لیے ہے۔“

اس روایت کو امام ابن الجوزی نے ضعیف کہا ہے، کیوں کہ اس کی سند میں ایک راوی عثمان ہے، جو متکلم فیہ ہے، لیکن ان کا یہ قول صحیح نہیں، کیوں کہ ابن دقیق العید کے بقول اس راوی پر کسی نے کلام نہیں کیا۔ البتہ صاحب ”التلخیص الحبیر“ نے نقل کیا ہے کہ ابن دقیق کے بقول یہ روایت شاذ ہے۔ سنن دارقطنی کے حاشیے میں امام دارقطنی کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ روایت موقوف ہے۔ اس حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ کو امام حاکم اور ذہبی نے صحیح قرار دیا ہے، جب کہ تلخیص کے حاشیے میں علامہ یمانی نے بھی اس کی سند کے صحیح ہونے ہی کو ترجیح دی ہے۔ اس طرح یہ محدثین میں صحت و ضعف کے اعتبار سے مختلف فیہ روایت ہے۔

سنن دارقطنی اور معجم طبرانی میں ایک حدیث حضرت اسلع رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعاً مروی ہے، جس میں دو ضربوں کا تذکرہ ہے، لیکن اس کی سند کے ایک راوی ربیع بن بدر کو کبار محدثین نے ضعیف قرار دیا ہے۔ طبرانی میں ایک روایت حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، جس کی سند کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ”التلخیص الحبیر“ میں ضعیف لکھا ہے۔ ایک روایت اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی مسند بزار اور الکامل لابن عدی میں مرفوعاً مروی ہے، جس میں ایک راوی حریش بن خریث متفرد ہیں، امام ابو حاتم نے کہا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے اور حریش کی بیان کردہ حدیث قابلِ حجت نہیں ہوتی۔ مسندِ بزار میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے ایک روایت (سابقہ

روایات کے علاوہ) بھی مروی ہے، جس میں دو ضربوں کا ثبوت ہے، اس کی سند کو غالباً حافظ ابن حجر رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے علامہ یمانی نے "التلخیص الحبیر" کے حاشیے میں حسن درجے کی قرار دیا ہے، لیکن دوسرا کلام ذکر نہیں کیا۔[1]

کیا یہ متعدد روایات دو مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنے کی دلیل بن سکتی ہیں؟ جبکہ ان کی اسنادی حیثیت آپ کے سامنے ہے اور ایک مرتبہ پر دلالت کرنے والی احادیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ہیں۔

فریقین میں محاکمہ:

ہم نے وہ احادیث ذکر کر دی ہیں، جو تیمّم میں منہ اور ہاتھوں کا مسح کرنے کے لیے زمین پر ایک مرتبہ دونوں ہاتھ مارنے پر دلالت کرتی ہیں، جو صحیح بخاری و مسلم، سنن ابی داود، ترمذی، نسائی، دارمی، دارقطنی، بیہقی، مسندِ احمد اور دیگر کتب میں مروی ہیں۔ پھر ہم نے دو مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنے والی روایات، یعنی ایک مرتبہ منہ کے لیے اور دوسری مرتبہ ہاتھوں کے لیے، ذکر کی ہیں اور ان کی اسنادی حیثیت کے بارے میں کبار محدّثین کی نقد و جرح بھی ذکر کی ہے، جس سے معمولی غور و فکر کرنے والا بھی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ ایک مرتبہ والی احادیث ہی کا پلہ بھاری ہے، وہی زیادہ صحیح ہیں اور وہی طریقہ صحیح تر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے محدّثین کو اس کا اعتراف کرتے ہی بنی ہے، حتیٰ کہ امام خطابی اور امام بغوی رحمہما اللہ کو تو یہ کہنا پڑا کہ اہلِ علم کی ایک جماعت کا مسلک یہ ہے کہ تیمّم میں صرف ایک ضرب منہ اور ہاتھوں سب کے لیے ہے۔ یہی امام عطا بن ابی رباح، مکحول، اوزاعی، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ عام اہلِ حدیث کا مسلک ہے۔ آگے فرماتے ہیں:

"وَهٰذَا الْمَذْهَبُ أَصَحُّ فِي الرِّوَايَةِ"

''یہی مذہب روایت کے اعتبار سے صحیح تر ہے۔''

پھر دو ضربوں والے مسلک کے بارے میں لکھا ہے:

"أَشْبَهُ بِالْأُصُولِ، وَأَصَحُّ فِي الْقِيَاسِ"[2]

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: سنن الدارقطني مع التعليق المغني (١/ ١/ ١٧٩۔ ١٨٣) التلخيص مع الحاشية (١/ ١٥١۔ ١٥٣) تحفة الأحوذي (١/ ٤٤٢) و إرواء الغليل (١/ ١٨٦)

[2] معالم السنن للخطابي (١/ ١/ ٣٠٢) شرح السنة للبغوي (١/ ١٣۔ ١٤۔ ١٥)

''اصول کے زیادہ مشابہ اور قیاس کی رو سے صحیح تر ہے۔''

لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ جب صحیحین اور دیگر کتب میں ایک حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو پھر اس کے بعد قیاس کی بھول بھلیوں میں کھونے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ''زاد المعاد'' میں لکھا ہے:

''وَلَمْ يَصِحَّ عَنْهُ أَنَّهُ (ﷺ) تَيَمَّمَ بِضَرْبَتَيْنِ وَلَا إِلٰى الْمِرْفَقَيْنِ''

''نبیِ اکرم ﷺ کی کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں کہ آپ ﷺ نے تیمّم کے لیے ہاتھوں کو دو مرتبہ زمین پر مارا ہو۔ اسی طرح یہ بھی ثابت نہیں کہ آپ ﷺ نے تیمّم کے لیے ہاتھوں کا مسح کہنیوں تک کیا ہو۔''

یہیں یہ بات بھی ذکر کر دیں کہ تلخیص کے حاشیے میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمہ اللہ کے حوالے سے جو لکھا ہے کہ احادیث دونوں طرف موجود ہیں، لہٰذا اگر چہ ایک طرف صحیحین کی احادیث ہیں اور دوسری طرف سنن کی، لیکن دو ضربوں والے مسلک نیز ہاتھوں کو کہنیوں تک مسح کرنے والے مسلک میں احتیاط زیادہ ہے، کیوں کہ اس میں صحیحین والا عمل آ جاتا ہے کہ ایک ضرب بھی آ گئی اور کہنیوں تک ہاتھ دھونے میں کلائی کے جوڑ (گٹے) تک ہاتھ دھونا بھی آ جاتا ہے۔[1]

تو موصوف کا یہ انداز خالص قیاسی نوعیت کا ہے۔ اس کے بجائے یوں کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے کہ احادیث تو دونوں طرف ہیں، مگر ایک طرف صحاح و سنن اور نبیِ اکرم ﷺ تک مرفوع احایث ہیں اور دوسری طرف ضعاف اور مرفوع و موقوف ہونے میں مختلف فیہ بلکہ موقوف روایات ہیں۔ لہٰذا صحاح پر عمل کر لیا جائے، کیوں کہ اگر دوسری حسن درجے کی احادیث بلکہ بعض صحیح درجے والی ہوتیں، تب بھی اوّلیت و اصحیت اسی عمل کو دی جاتی، جو صحیحین سے ثابت ہوتا ہے، جب کہ یہاں تو معاملہ یہ ہے کہ دو ضربوں کی تائید جن احادیث سے ہوتی ہے، وہ سب متکلم فیہ ہیں، حتیٰ کہ مسند بزار کی ایک روایت جو حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جسے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''الدرایۃ'' میں سند کے اعتبار سے حسن درجے کی قرار دیا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ اس روایت کو امام ابو داود نے بھی روایت کیا ہے، جس میں ہاتھوں کو کندھوں تک دھونے کا تذکرہ ہے، امام ابو داود نے اس کی

[1] تحفة الأحوذي (١/ ٤٥٠)

علت اور اس میں پایا جانے والا اختلاف بھی ذکر کیا ہے۔ آگے حافظ عسقلانی رحمہ اللہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی دو ضربوں پر دلالت کرنے والی روایت نقل کی ہے اور لکھا ہے کہ اس پر کلام آگے چل کر آئے گا، پھر کہتے ہیں:

''دو ضربوں والی روایت کے مخالف وہ احادیث ہیں، جو حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے صحیحین میں ثابت ہیں۔'' پھر آگے وہ احادیث بھی نقل کی ہیں۔

علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری ''تحفة الأحوذي شرح جامع الترمذي'' میں لکھتے ہیں کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے اس کلام سے معلوم ہوا کہ مسند بزار کی حضرت عمار رضی اللہ عنہ والی روایت قابلِ حجت اور لائقِ استدلال نہیں ہے، اگرچہ اس کی سند حسن درجے کی ہے۔ جب کہ یہ طے ہے کہ کسی حدیث کی سند کا حسن یا صحیح ہونا، اس حدیث کے متن کے بھی حسن یا صحیح ہونے کو لازم نہیں ہوتا۔ آگے لکھتے ہیں کہ ''آثار السنن'' میں (مولانا شوق نیموی) نے مسندِ بزار والی حدیثِ عمار رضی اللہ عنہ سے استدلال کیا ہے اور ''الدراية'' سے حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا یہ قول کہ یہ حسن سند سے مروی ہے، نقل کیا ہے، مگر انہی کا بقیہ کلام نقل نہیں کیا، جس سے اس کا ضعیف ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ایسے ہی ''العرف الشذي'' میں (علامہ انور شاہ کاشمیری رحمہ اللہ) نے بھی کیا ہے:

''وَلَيْسَ هٰذَا مِنْ شَأْنِ أَهْلِ الْعِلْمِ''[1] ''جب کہ یہ اہلِ علم کی شان نہیں ہے۔''

یہاں ایک بات یہ بھی ذکر کر دیں کہ موطا امام مالک کی فارسی شرح ''مصفیٰ'' میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے اس اثر کے تحت جس میں کہنیوں تک ہاتھ دھونے اور دو مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنے کا ذکر ہے، لکھا ہے کہ اس اثر اور صرف کلائی کے جوڑ تک ہاتھ دھونے اور صرف ایک ہی مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنے والی حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں باہم کوئی تعارض نہیں، بلکہ فعلِ ابن عمر رضی اللہ عنہما میں کمالِ تیمّم ہے۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل میں تیمّم کی کم از کم مقدار مذکور ہے، جیسا کہ لفظ ﴿ يَكْفِيكَ ﴾ سے معلوم ہوتا ہے، یہ بھی اسی طرح ہے، جس طرح وضو میں اصل تو تمام اعضا کو ایک ایک مرتبہ دھونا ہے اور کمالِ وضو تین تین مرتبہ دھونا ہے۔

صاحبِ ''تحفة الأحوذي'' موصوف کا یہ اقتباس نقل کر کے لکھتے ہیں:

[1] تحفة الأحوذي ١/ ٤٤٣۔ ٤٤٤۔ ٤٥)

"اگر دوضربوں اور کہنیوں تک مسح کرنے والی کوئی حدیث صحیح اور مرفوع ہوتی تو حضرت شاہ صاحب محدث دہلوی رحمہ اللہ کی بات بھی درست ہوتی، جب کہ یہاں تو معاملہ ہی بالکل الٹ ہے کہ ایک ضرب اور صرف ہاتھوں کے مسح والی احادیث متفق علیہ ہیں اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی یہی فتویٰ دیا کرتے تھے اور راویِ حدیث اس حدیث کی مراد کو سب سے بہتر جانتے ہیں، خصوصاً جب کہ وہ مجتہد بھی ہوں۔"[1]

لہٰذا مذکورہ بات کیسے صحیح ہوسکتی ہے؟ علاوہ ازیں وہ اثر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما پر موقوف ہے اور صرف ان کا فعل تو کمالِ تیمّم کو ثابت نہیں کرسکتا۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ امام ابن المنذر رحمہ اللہ نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ وہ وضو میں پاؤں کو سات سات مرتبہ دھویا کرتے تھے، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "فتح الباري" میں بھی بیان کیا ہے تو کیا یہاں بھی یہ کہنا صحیح ہوگا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا پاؤں کو سات سات مرتبہ دھونا کمالِ وضو اور کمال غسل الرجلین ہے! نہیں اور قطعاً نہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے تو اپنی صحیح میں ایک باب ہی یوں قائم کیا ہے:

"بَابُ التَیَمُّمُ ضَرْبَۃٌ"[2] "تیمّم ایک ہی ضرب ہے۔"

یہی اَولیٰ اور افضل ہے۔

ہاتھوں کا مسح کہاں تک؟

تیمّم کے احکام و مسائل میں سے اس مسئلے میں بھی اہلِ علم کی آرا مختلف ہیں کہ ہاتھوں کا باہم مسح کہاں تک کیا جائے؟ ہاتھ اور کلائی کے درمیان والے جوڑ (گٹے) تک یا کہنیوں تک؟ یہ اختلاف رائے بھی تقریباً مسح کے لیے ایک ضرب یا دوضربوں والے اختلاف سے ملتا جلتا ہے اور دلائل کے ضعف و قوت کا بھی وہی معیار ہے، جیسا کہ ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ تیمّم محض ایک علامتی طہارت اور غسل و وضو کا قائم مقام ہے اور علامتی طہارت میں ظاہر ہے کہ تمام اعضائے غسل و وضو کا استیعاب مطلوب نہیں ہوسکتا، اگر ایسا ہوتا تو غسل کے لیے تیمّم کرتے وقت پورے بدن پر مٹی ملنا پڑتی اور وضو کے لیے منہ اور ہاتھوں کے علاوہ پاؤں کا بھی مسح کرنا پڑتا، مگر ایسا نہیں ہے۔

---

[1] تحفة الأحوذي (١/ ٤٤٧۔ ٤٤٨)

[2] صحیح البخاري مع الفتح (١/ ٤٥٥)

صرف ہاتھوں تک:

صحیح تر روایات کے مطابق تیمّم صرف چہرے اور ہاتھوں ہی کا ہے۔ حسبِ موقع یہی پورے غسل و وضو دونوں کا قائم مقام بھی بن جاتا ہے اور صرف وضو کا بھی، کیوں کہ حضرت ابوجہیم بن حارث انصاری رحمہ اللہ اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے مروی دو احادیث کے علاوہ طریقۂ تیمّم کے سلسلے میں کوئی حدیث صحیح سند سے ثابت نہیں ہے، ان دونوں کی مروی احادیث میں ہاتھوں کا مسح صرف کلائیوں اور ہاتھوں کے درمیان والے جوڑ تک ہی ہے، جسے عام طور پر ''ہاتھ'' کہا جاتا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی اور دارقطنی کی حضرت ابوجہیم رضی اللہ عنہ والی حدیث جو مسلم میں تعلیقاً اور دیگر کتب میں موصولاً مروی ہے، اس میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تیمّم کا جو طریقہ بتایا گیا ہے، اس میں دیوار پر ہاتھ مارنے کے بعد یہ مذکور ہے:

«فَمَسَحَ بِوَجْهِهِ وَيَدَيْهِ»[1]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چہرۂ اقدس اور دونوں ہاتھوں کا مسح کیا۔''

اس حدیث میں تو مطلقاً دونوں ہاتھوں کا ذکر ہے، جب کہ صحیح بخاری و مسلم اور سننِ اربعہ میں مذکور حضرت عمار رضی اللہ عنہ والی حدیث میں تو مزید واضح اور محدود کرنے والا لفظ «كَفَّيْنَ» آیا ہے۔ اس میں زمین پر ہاتھ مارنے اور ان میں پھونک مارنے کے بعد مذکور ہے:

«ثُمَّ مَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ وَكَفَّيْهِ»[2]

''پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (دونوں ہاتھوں کو) اپنے چہرۂ اقدس پر پھیرا اور (پھر) باہم اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے پر۔''

اب یہاں یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ مطلق «يَدَيْن» کے لفظ میں اس تاویل کی گنجایش تھی کہ عربی میں بلکہ عرفِ عام میں «يَدَيْنَ» یا ہاتھوں سے مراد کہنیوں تک ہاتھ ہوسکتے ہیں، لیکن دوسری

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٣٣٨) صحيح مسلم مع شرح النووي (٤/ ٦٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٠٨) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٥) مختصر سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٩٩) المشكاة مع المرعاة (١/ ١٨٧۔ ١٨٩) و صحيح الجامع، رقم الحديث (٢٣٦٧)

[2] فتح الباري (١/ ٤٣٤۔ ٤٣٥)

حدیث کے لفظ ﴿ کَفَّیْنَ﴾ نے اس تاویل کا راستہ ہی بند کر دیا اور ہاتھوں کی بھی حد بندی کر دی ہے کہ ہاتھوں سے صرف ہاتھوں اور کلائیوں کے جوڑوں تک کا حصہ مراد ہے، اس سے آگے نہیں۔ حضرت عمار رضی اللہ عنہ والی حدیث ہی کی ایک روایت میں بخاری شریف میں مذکور الفاظ کے مطابق نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

﴿ یَکْفِیْكَ الْوَجْهُ وَالْکَفَّانِ ﴾[1]

''تمھیں چہرے اور دونوں ہاتھوں پر باہم ہاتھ پھیر لینا ہی کافی ہے۔''

امام احمد، اسحاق بن راہویہ، ابن جریر، ابن خزیمہ اور ابن المنذر رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے۔ ابن الجہم اور بعض دیگر اہلِ علم نے امام مالک رحمہ اللہ سے بھی یہی مسلک نقل کیا ہے اور امام خطابی رحمہ اللہ کے بقول اہلِ حدیث علما کا بھی یہی مسلک ہے۔[2]

امام ابو داود اور دیگر علما نے امام شافعی رحمہ اللہ سے قدیم قول میں یہی مسلک ذکر کیا ہے اور ''الفروع شرح المھذب'' میں امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ (اگر چہ ہمارے مسلک میں) یہ رائے مرجوح ہے، لیکن دلیل کے اعتبار سے یہی قوی ہے۔[3]

کہنیوں تک:

حضرت حسن بصری، شعبی، امام ابو حنیفہ، ثوری اور ایک روایت کے مطابق امام مالک اور شافعی رحمہم اللہ کا مسلک یہ ہے کہ تیمّم میں ہاتھوں کو کہنیوں تک پھیرا جائے۔[4]

ان کا استدلال بعض روایات اور قیاس دونوں سے ہے۔ وہ روایات تو وہی ہیں جو دو مرتبہ زمین پر ہاتھوں کو مارنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ انھی میں سے بعض میں کہنیوں تک کے الفاظ بھی موجود ہیں، بلکہ بعض میں تو کلائیوں، کندھوں اور بغلوں کا بھی ذکر آیا ہے۔ چنانچہ سنن ابو داود میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی مرفوع حدیث میں مذکور ہے:

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٤٤٥)

[2] فتح الباري (١/ ٤٤٥)

[3] فتح الباري (١/ ٤٤٥)

[4] معالم السنن (١/ ٢٠٠)

«فَمَسَحَ ذِرَاعَیْهِ إِلَی الْمِرْفَقَیْنِ»[1]

''آپ ﷺ نے اپنی دونوں کلائیوں پر کہنیوں تک ہاتھ پھیرا۔''

اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد خود امام ابو داود رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے سنا وہ کہہ رہے تھے کہ (اس کے ایک راوی) محمد بن ثابت نے تیمّم کے بارے میں ایک منکر روایت بیان کی ہے اور ''معالم السنن'' میں امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی یہ حدیث صحیح نہیں، کیوں کہ (اس کا ایک راوی) محمد بن ثابت العبدی رحمہ اللہ سخت ضعیف ہے۔ اس کی بیان کردہ حدیث قابلِ حجت نہیں ہوتی۔[2]

امام منذری رحمہ اللہ نے مختصر سنن ابي داود میں امام بخاری رحمہ اللہ کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے محمد بن ثابت کے اس حدیث کو مرفوعاً بیان کرنے پر نکیر کی ہے۔[3] اس حدیث کے راوی محمد بن ثابت کو امام ابن معین اور ابو حاتم نے بھی ضعیف کہا ہے۔[4]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی سے ایک دوسری حدیث سنن دارقطنی و بیہقی اور مستدرک حاکم میں مرفوعاً مروی ہے اور اس میں بھی کہنیوں تک مذکور ہے، مگر اسے یحییٰ القطان، ہشیم اور دیگر محدّثین نے موقوف قرار دیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہی صحیح ہے کہ وہ روایت موقوف ہے، جب کہ انھی سے مروی تیسری حدیث سنن دارقطنی میں ہے، جس کے ایک راوی سلیمان بن ارقم کے متروک ہونے کی وجہ سے وہ ضعیف ہے۔ ایسے ہی بعض دیگر احادیث میں بھی کہنیوں کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً سنن دارقطنی اور مستدرک حاکم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ والی حدیث ہے، جسے شاذ کہا گیا ہے۔ دارقطنی اور معجم طبرانی میں حضرت اسلع رضی اللہ عنہ کی حدیث مروی ہے۔ مسند بزار اور کامل ابن عدی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی مروی حدیث ہے۔ مسند بزار میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے، جس کے ضعیف ہونے سے متعلق محدّثین کے اقوالِ جرح و تنقید دو مرتبہ زمین پر ہاتھ مارنے کے ضمن میں ذکر کیے جا چکے ہیں۔ لہٰذا ان کے اعادے کی ضرورت نہیں۔

---

[1] سنن أبي داود مع العون (۱/ ۵۳۲)

[2] معالم السنن علی مختصر السنن (۱/ ۳۰٤)

[3] مختصر السنن (۱/ ۲۰۵)

[4] التلخيص الحبير (۱/ ۱/ ۱۵۱)

بغلوں والی حدیث کے بارے میں امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر یہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے تھا تو اس موقع کے بعد جو تیمّم صحیح سند سے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، وہ اس کا ناسخ ہوگا اور اگر وہ بغلوں والا طریقہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بغیر (محض لوگوں کی مرضی سے) واقع ہوا تو وہ حجت نہیں، کیوں کہ حجت تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یا حدیث ہے۔''

آگے لکھتے ہیں:

''صحیحین کی احادیث میں مروی صرف ہاتھوں تک کے مسح کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بھی اسی کا فتویٰ دیا کرتے تھے اور راویِ حدیث ہی مرادِ حدیث کو سب سے بہتر سمجھنے والا ہوتا ہے، خصوصاً جب کہ وہ صحابیِ مجتہد بھی ہو۔''[1]

قیاسی دلیل:

کہنیوں تک ہاتھ پھیرنے کی ایک دلیل عقلی اور قیاسی بھی ہے کہ جب وضو کے لیے کہنیوں کو دھونا شرط ہے تو اسی بنا پر قیاس کرتے ہوئے تیمّم میں بھی کہنیوں تک ہاتھوں کو پھیرنا چاہیے، لیکن یہ ایک نصِ صریح و صحیح کے مقابلے میں قیاس ہے، لہٰذا فاسد الاعتبار ہے۔[2] کیوں کہ نص کے مقابلے میں قیاس جائز ہی نہیں، لہٰذا قیاسی دلیل قابلِ اعتبار ہی نہ ہوئی۔ اس کے علاوہ بعض دیگر قیاس آرائیاں اور صحیحین کی حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے مروی احادیث کی تاویلیں اور انھیں قبول کرنے میں عذر و معذرت کی چارہ سازیاں بھی کی گئی ہیں۔ جنھیں فقہ حنفیہ کی کتاب ''السعایة'' میں نقل کر کے خود مولف مولانا عبد الحی لکھنوی رحمہ اللہ ہی نے ان کا تنقیدی جائزہ لے کر انھیں رد کیا ہے، لہٰذا وہ تفصیل وہیں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ اسے بلا تنقید و تبصرہ علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ نے ''تحفة الأحوذي'' (١/ ٤٤٨، ٤٤٩، ٤٥٠) پر بھی نقل کیا ہے، جو قابلِ مطالعہ ہے، مگر ہم بہ خوفِ طوالت اسے ذکر نہیں کر رہے۔ وفیما ذکرناه كفاية إن شاء الله.

---

[1] فتح الباري (١/ ٤٤٤۔ ٤٤٥) عون المعبود (١/ ٥١٤، ٥٢٠) مختصر السنن للمنذري (١/ ٢٠١)

[2] فتح الباري (١/ ٤٤٦)

جنسِ ارض:

اب ایک تحقیق طلب بات یہ ہے کہ تیمّم کے لیے کیا صرف مٹی پر ہاتھ مارنا ضروری ہے یا زمین کے دیگر اجزا مثلاً ریت، چونا اور پتھر وغیرہ پر بھی ہاتھ مار کر تیمّم کیا جاسکتا ہے؟ اس سلسلے میں اہلِ علم کے دو قول ہیں:

پہلا قول:

تیمّم صرف مٹی پر ہاتھ مارنے ہی سے ہوسکتا ہے، دوسری کسی چیز سے نہیں۔ یہ امام شافعی، امام احمد اور امام داود رحمہم اللہ کا مسلک ہے۔[1] ان کا استدلال آیتِ تیمّم کے الفاظ: ﴿فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا﴾ [النساء: ٤٣] ''(کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں) پاک مٹی سے کام لو۔'' سے ہے۔

یہاں اس مسلک والے ''صعید'' کو صرف مٹی کے معنیٰ میں لیتے ہیں، جب کہ اسی آیت کے اگلے الفاظ ﴿فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ﴾ [المائدة: ٦] ''اس سے مسح کرو، چہرے کا اور دونوں ہاتھوں کا۔'' میں لفظ ﴿مِنْهُ﴾ کو تبعیض کے لیے قرار دیتے ہوئے بھی تیمّم کے لیے مٹی کو شرط قرار دیا گیا ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا "فتح الباري" (١/ ٤٣٨۔ ٤٤٧) میں، علامہ شوکانی رحمہ اللہ کا "نيل الأوطار" (١/ ٢٦٠۔ ٢٦١) میں اور علامہ یمانی رحمہ اللہ کا "سبل السلام" (١/ ١/ ٩٤) میں اسی طرف رجحان ہے۔ گذشتہ صفحات میں ہم ایک حدیث صحیح بخاری و مسلم اور سنن نسائی و دارقطنی کے حوالے سے ذکر کر آئے ہیں جو صرف صحیح مسلم میں تعلیقاً اور باقی میں مرفوعاً ہے۔ اس کے حوالے سے ہم بیان کر آئے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دیوار پر ہاتھ مار کر تیمّم کیا۔

اس حدیث سے ابن بطال نے تو یہ اخذ کیا ہے کہ تیمّم کے لیے مٹی شرط نہیں، بلکہ پتھر وغیرہ سے بھی تیمّم کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ مدینے کے گھروں کی دیواریں عموماً پتھروں کی بنی ہوئی ہوتی تھیں اور پتھروں پر مٹی تو نہیں چمٹی ہوگی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں کو لگتی، لیکن اس بات کو ایک احتمال قرار دیا گیا ہے، یقینی امر نہیں، پھر اسی روایت میں مسند امام شافعی میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں:

((فَحَتَّهُ بِعَصًا)) ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دیوار کو اپنے عصا سے کریدا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ وہ دیوار محض پتھروں کی نہیں، بلکہ ان کے درمیان مٹی بھی تھی، جسے

---

[1] عون المعبود (١/ ٥٢٦)

آپ ﷺ نے کرید کر پھر اس پر ہاتھ مارے اور تیمّم کیا، اس سے تو یہ معلوم ہوا کہ مٹی ہی سے تیمّم ضروری ہے، کسی دوسری چیز سے نہیں۔[1]

اسی طرح صحیح مسلم اور دیگر کتب میں حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ہے:

«وَجُعِلَ لَنَا الْأَرْضُ كُلُّهَا مَسْجِداً، وَجُعِلَتْ تُرْبَتُهَا لَنَا طَهُوراً إِذَا لَمْ نَجِدِ الْمَآءَ»[2]

''ہمارے لیے ساری زمین کو مسجد بنا دیا گیا ہے اور پانی نہ ملنے کی صورت میں زمین کی مٹی ہمارے لیے ذریعۂ طہارت بنادی گئی ہے۔''

گویا مسجد تو ساری ہی زمین ہے، البتہ طہارت کا ذریعہ صرف زمین کی مٹی ہے۔ بعض اہلِ علم نے لفظِ ''تربة'' پر اعتراض کیا ہے کہ یہ مٹی کے ساتھ خاص نہیں، جس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ صحیح ابن خزیمہ میں ''تربة'' کے بجائے ''تراب'' ہے، جو مٹی سے خاص ہے۔ مسند احمد اور سنن بیہقی میں حسن سند سے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«وَجُعِلَتِ التُّرَابُ لِيَ طَهُوراً» ''مٹی میرے لیے طہارت بنائی گئی ہے۔''

ان سب دلائل سے تیمّم کے لیے مٹی شرط معلوم ہوتی ہے۔

دوسرا قول:

اسی مسئلے کے بارے میں دوسرا قول یہ ہے کہ تیمّم کے لیے صرف مٹی ہی شرط نہیں، بلکہ زمین کی جنس کے کسی بھی جزو یا حصے سے تیمّم کیا جاسکتا ہے، وہ چونا ہو یا کلّر وشور، پتھر ہو یا سُرمہ اور ہڑتال ہو یا ریت یا کچھ اور، شرط صرف یہ ہے کہ وہ زمین کا حصہ ہو۔ امام ابو حنیفہ، مالک، عطاء، اوزاعی اور ثوری رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے۔[3]

ان کا استدلال بھی آیتِ تیمّم کے الفاظ ﴿فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا﴾ [النساء: ٤٣] کے لفظ ''صعید'' سے ہے، اس مسلک والے ''صعید'' سے زمین کے تمام اجزا مراد لیتے ہیں۔

---

[1] فتح الباري (١/ ٤٤٣)

[2] صحيح مسلم مع النووي (٢/ ٥/ ٤)

[3] عون المعبود (١/ ٥٢٦)

ایسے ہی ان کا استدلال بعض احادیث سے بھی ہے، مثلاً صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتب میں مذکور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِداً وَطَهُوراً، فَأَيَّمَا رَجُلٍ مِنْ أُمَّتِي أَدْرَكَتْهُ الصَّلَاةُ فَلْيُصَلِّ))[1]

''اور میرے لیے زمین کو مسجد اور ذریعہ طہارت بنایا گیا ہے۔ میری امت کے کسی بھی فرد کو کہیں بھی نماز کا وقت ہو جائے تو وہ وہیں نماز پڑھ لے۔''

اس حدیث کے الفاظ سے استدلال کیا جاتا ہے کہ زمین کے تمام اجزا سے تیمّم جائز ہے، کیوں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کو طہارت بنایا جانا بتایا ہے، لہٰذا اس کے تمام اجزا اس میں شامل ہیں، لیکن بعض دیگر احادیث میں زمین کے عام لفظ سے مٹی کو خاص کیا گیا ہے، جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں، لہٰذا اس عام لفظ کو اس خاص پر محمول کرنا چاہیے، اس طرح طہارت مٹی کے ساتھ خاص ہو جاتی ہے، اگر مٹی کے علاوہ دوسری اشیا سے بھی تیمّم جائز ہوتا تو پھر ''تراب'' کے لفظ پر اکتفا پر نہ کیا جاتا۔[2]

بہر حال اس دوسرے مسلک کی تائید ایک اور روایت سے بھی ہوتی ہے، جو سنن بیہقی اور مسند احمد میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں مذکور ہے:

((وَجُعِلَتِ الْأَرْضُ كُلُّهَا لِيْ وَلِأُمَّتِيْ مَسْجِداً وَطَهُوراً))[3]

''میرے لیے اور میری امت کے لیے ساری زمین ہی مسجد و طہارت بنا دی گئی ہے۔''

جب کہ سنن بیہقی (۱/ ۲۲۸) میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ ہیں:

((فَأَيُّمَا رَجُلٍ مِنْ أُمَّتِيْ أَتَى الصَّلَاةَ فَلَمْ يَجِدْ مَاءًا وَجَدَ الْأَرْضَ طَهُوراً وَمَسْجِداً))[4]

''میری اُمت کے جس شخص پر نماز کا وقت آجائے اور وہ پانی نہ پائے تو وہ زمین ہی کو

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٣٣٥) صحيح مسلم مع شرح النووي (٥/ ٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤١٩) إرواء الغليل (١/ ٣١٥۔ ٣١٦) و صحيح الجامع، رقم الحديث (١٠٥٦)

[2] فتح الباري (١/ ٤٣٨)

[3] مسند أحمد (٥/ ٢٤٨) بحواله تحقيق زاد المعاد (١/ ٢٠٠) فتح الباري (١/ ٤٣٨) و منتقیٰ الأخبار (١/ ١/ ٢٥٩)

[4] مسند أحمد (٥/ ٢٤٨) بحواله تحقيق زاد المعاد (١/ ٢٠٠) فتح الباري (١/ ٤٣٨) و منتقیٰ الأخبار (١/ ١/ ٢٥٩)

طہارت و مسجد پاتا ہے۔‘‘

مسند احمد کے الفاظ ہیں:

((فَعِنْدَهٗ طَهُوْرُهٗ وَمَسْجِدُهٗ))[1] ’’اس کی طہارت اور مسجد اس کے پاس ہے۔‘‘

امام بخاری نے اپنی صحیح کے ایک ترجمۃ الباب میں حضرت یحییٰ بن سعید انصاری سے تعلیقاً نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

((لَا بَأْسَ بِالصَّلَاةِ عَلٰى السَّبِخَةِ وَالتَّيَمُّمِ بِهَا))[2]

’’کلّر زمین پر نماز ادا کرنے اور کلّر سے تیمّم کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔‘‘

مذکورہ باب میں امام صاحب موصوف کا اس اثر کو نقل کرنا، اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ موصوف نے کلّر کو بھی مٹی کے حکم میں شمار کیا ہے۔ علامہ ابن قیم جیسے بعض اہلِ علم نے ارضِ حجاز سے بھی استدلال کیا ہے کہ وہاں اکثر علاقوں میں ریت ہے یا پھر پتھریلی زمین ہے، لہٰذا ان ہر دو پر بھی تیمّم جائز ہے نہ کہ صرف مٹی پر، جو حجاز میں بہت کم یاب چیز ہے۔[3]

مٹی کے علاوہ دیگر اشیاء سے تیمّم کے سلسلے میں مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’خاکسار کو اس میں شبہہ ہے۔‘‘[4]

اس اختلاف کا سبب اور لفظِ ’’صعید‘‘ کی لغوی تشریح:

اب آیئے اس بات کی وضاحت بھی کر دیں کہ ائمہ وفقہا کے مابین جو اختلاف پایا جاتا ہے کہ بعض کے نزدیک ’’صعید‘‘ سے مراد صرف اور صرف مٹی ہے اور بعض دیگر کے نزدیک زمین اور اس کے تمام اجزا اس میں شامل ہیں۔ اس اختلاف کا بنیادی سبب دراصل یہ ہے کہ ائمہ لغت کے نزدیک بھی اس لفظِ ’’صعید‘‘ کے لغوی معنیٰ کے بارے میں دونوں طرح کے اقوال موجود ہیں، لہٰذا اگر اس لفظ کی لغوی تشریح سامنے رہے تو اس اختلاف کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ چنانچہ امام ابن منظور نے عربی کی پندرہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ڈکشنری ’’لسان العرب‘‘ (۳/ ۲۵٤) میں لفظِ ’’صعید‘‘ کی تشریح

[1] ’’زاد المعاد‘‘ (۱/ ۲۰۰) کا حاشیہ ملاحظہ فرمائیں۔

[2] صحيح البخاري مع الفتح (۱/ ٤٤٦)

[3] زاد المعاد (۱/ ۲۰۰)

[4] فتاویٰ ثنائیہ (۱/ ۳۱۰) بحوالہ فتاویٰ علمائے حدیث (۱/ ۱۲۵) نیز دیکھیں: المغني لابن قدامة (۱/ ۲٤۷)

کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے:

''صعید'' زمین کے بلند حصے کو کہتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ صعید سے مراد زمین کا وہ حصہ ہے، جس میں ریت اور کلّر شامل نہ ہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ صعید سے مراد مطلق روے زمین ہے اور اس قول والوں کا استدلال قرآن کی سورۃ الکہف (آیت: ۴۰) کے الفاظ سے ہے، جن میں ہے: ''بعید نہیں کہ میرا رب مجھے تیرے باغ سے بہتر عطا فرما دے اور تیرے باغ پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دے:

﴿فَتُصْبِحَ صَعِيْداً زَلَقًا﴾ [الكهف: ٤٠]

''جس سے وہ پھسلتی زمین (صاف میدان) بن کر رہ جائے۔''

(گو اس آیت میں صعید سے مراد مطلق روے زمین ہے) کہا گیا ہے کہ صعید سے مراد زمین ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ صعید سے پاک زمین مراد ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ ہر پاک مٹی صعید ہیں، اس پر سورۃ المائدۃ کی آیت (٦) کے الفاظ ﴿فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْداً طَيِّباً﴾ سے بھی استدلال کیا گیا ہے۔ فرّاء نے سورۃ الکہف (آیت: ۸) کے الفاظ ﴿صَعِيْداً جُرُزاً﴾ میں صعید کا ترجمہ مٹی کیا ہے اور بعض دیگر نے برابر اور چٹیل زمین کیا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ''صعید'' کا اطلاق صرف اس مٹی پر ہی ہوتا ہے جو غبار والی ہو، پتھریلی جگہ پر ''صعید'' کا لفظ صادق نہیں آتا، ان کے نزدیک چونے، سُرمے اور ہڑتال نامی دھات سے تیمّم نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ یہ سب پتھر کی اقسام ہیں۔

ابو اسحاق زجاج کہتے ہیں:

''صعید سے مراد روے زمین ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ زمین پر ہاتھ مار کر تیمّم کرلے اور اس بات کی پروا نہ کرے کہ اس جگہ مٹی بھی ہے یا نہیں، کیوں کہ ''صعید'' سے مراد مٹی نہیں، بلکہ روے زمین ہے، خواہ وہاں مٹی ہو یا کچھ اور ہو۔''

وہ مزید کہتے ہیں:

''اگر ساری زمین ہی پتھریلی چٹان ہوتی اور اس پر مٹی بھی نہ ہوتی تو کوئی شخص اس پر دونوں ہاتھ مار کر اپنے منہ پر پھیر لیتا تو اس کا تیمّم وطہارت ہو جاتی۔ اس ارشادِ الٰہی کے

الفاظ: ﴿فَتُصْبِحَ صَعِيْداً﴾ [الكهف: ٤٠] کی رو سے مطلق زمین ہی ''صعید'' ہے۔ آگے فرماتے ہیں:

''اہلِ لغت کا اس بارے میں کوئی اختلاف میرے علم میں نہیں ہے کہ ''صعید'' سے مراد روے زمین ہے۔''

زہری رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''زجاج کا قول میرے خیال میں امام مالک اور ان کے موافقین کا مذہب ہے، مگر یہ بات یقینی نہیں ہے۔''

لیث کا کہنا ہے:

جب کوئی باغیچہ ویران ہو جائے اور تمام پھول، پودے ختم ہو جائیں تو کہا جاتا ہے:

"قَدْ صَارَتْ صَعِيْداً"

''وہ صعید یعنی صاف زمین بن گیا ہے، جس میں کوئی درخت پودا نہیں ہے۔''

ابن الاعرابی کا کہنا ہے:

"الصعيد: الأرضُ بعينها" ''صعید سے عین زمین مراد ہے۔''

راستے کو بھی ''صعید'' کہا جاتا ہے، کیوں کہ وہاں بھی مٹی ہوتی ہے۔ مختلف علماے لغت کے اقوال کی روشنی میں یہ ابن منظور کی تشریح ہے، جب کہ دوسری معروف و متداول عربی ڈکشنری "القاموس المحیط" میں علامہ فیروز آبادی لکھتے ہیں:

"اَلصَّعِيْدُ: اَلتُّرَابُ أَوْ وَجْهُ الْأَرْضِ"[1]

''صعید سے مراد مٹی یا روے زمین ہے۔''

علامہ جوہری نے "الصحاح" میں صعید کا معنیٰ مٹی کیا ہے (اور اسے فراء کی طرف منسوب کیا ہے) جب کہ ثعلبی سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"هُوَ وَجْهُ الْأَرْضِ لِقَوْلِهِ تَعَالَىٰ: ﴿فَتُصْبِحَ صَعِيْداً زَلَقًا﴾"[2]

---

[1] القاموس المحيط (١/ ١/ ٣١٨)

[2] بحواله مختار الصحاح للرازي (ص: ٣٦٣ بيروت) و عون المعبود (١/ ٥١٦)

’’اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا﴾ [الکھف: ٤٠] کی رو سے صعید کا معنیٰ روے زمین ہے۔‘‘

ماہرینِ لغت کے ایک بورڈ نے ’’المعجم الوسیط‘‘ کے نام سے ایک ڈکشنری ترتیب دی ہے، اس میں بھی صعید سے مراد روے زمین اور مٹی لکھا گیا ہے اور بطورِ استشہاد آیتِ تیمّم کے الفاظ: ﴿فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا﴾ [النساء: ٤٣] بھی نقل کیے ہیں۔[1]

ماہرِلغت علامہ احمد رضا نے ’’معجم متن اللّغة‘‘ (٣/ ٤٥٣، طبع بیروت) میں لکھا ہے:

’’صعید کا معنیٰ زمین، زمین کا بالائی حصہ یا وہ حصہ ہے، جس میں ریت یا کلّر شامل نہ ہو یا روے زمین یا پاکیزہ زمین اور ہر پاک مٹی اور غبار والی مٹی اور راستے کو بھی صعید کہتے ہیں۔‘‘

راجح بات:

اس ساری تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ صعید کے لغوی معنیٰ میں نزاع کی وجہ سے اس مسئلے میں بھی نزاع ہے کہ تیمّم کے لیے صرف مٹی ہی ضروری ہے یا زمین کے تمام اجزا سے تیمّم جائز ہے؟ البتہ اس سلسلے میں علامہ شمس الحق عظیم آبادی جیسے کبار علما کی تحقیق یہ ہے کہ اگر کسی کو مٹی دستیاب ہوتو اس کے لیے اسی سے تیمّم کرنا متعین ہے۔ اس کے لیے کسی دوسری چیز سے تیمّم روا نہیں، کیوں کہ ائمہ لغت کے نزدیک صعید سے مراد مٹی ہے اور مٹی سے تیمّم بالاتفاق جائز ہے، لہٰذا ایک یقینی امر کو قابلِ احتمال امر کی بنا پر کیسے ترک کیا جاسکتا ہے؟ ہاں جسے مٹی دستیاب نہ ہوتو وہ ریت پر یا پتھر پر تیمّم کر کے ہی نماز پڑھ لے، کیوں کہ بعض علماے لغت کے نزدیک یہ بھی صعید کے مدلول میں شامل ہے، لیکن جس شخص کو پتھر اور ریت بھی نہ ملے تو وہ کسی بھی چیز سے تیمّم کر سکتا ہے، جن کا ذکر لفظ صعید کی تشریح میں گزرا ہے۔ (مثلاً چونا، کلّر، سرمہ اور ہڑتال وغیرہ) البتہ تیمّم کے بغیر وہ نماز نہ پڑھے، لیکن اگر کسی کو ان میں سے کوئی ایک چیز بھی میسر نہیں تو اسے اجازت ہے کہ وہ بلا طہارت ہی نماز پڑھ لے۔ واللّٰہ أعلم۔[2]

جیسا کہ انتہائی نادر بلکہ ناممکن سی صورت کے ضمن میں ہم تفصیل ذکر کر چکے ہیں۔ امام

---

[1] المعجم الوسیط (١/ ٥١٤) طبع بیروت.

[2] عون المعبود (١/ ٥٢٧)

ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے کلّر زمین پر تیمّم کے جائز ہونے پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے، جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ارشادِ نبوی ہے:

﴿ اُرِیتُ دَارَ هِجْرَتِكُمْ سَبِخَةً ذَاتَ نَخْلٍ ﴾ [1]

''مجھے تمھارا دارِ ہجرت (مدینہ طیبہ) دکھایا گیا ہے، جو کلّر والا نخلستان ہے۔''

خود نبیِ اکرم ﷺ نے مدینہ کا نام ''طیبہ'' رکھا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ کلّر زمین بھی طیب (صَعِیْداً طَیِّباً) میں داخل ہے۔

جنسِ ارض:

اب یہاں جنسِ ارض کے سلسلے میں ایک فقہی نقطہ اور موجود دور میں اس کے مجروح ہونے کا تذکرہ بھی مناسبِ حال ہوگا کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ہر اس چیز پر تیمّم کیا جاسکتا ہے، جو جنسِ ارض سے ہو۔

فقہ حنفی کی معروف کتاب ''فتاویٰ عالمگیری'' کے عربی اڈیشن "الفتاویٰ الهندية" کی جلد اوّل کے بالکل ابتدائی صفحات (ص: ۱۴) میں جنسِ ارض کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے:

''جنسِ ارض سے مراد ہر وہ چیز ہے جو جلانے کی وجہ سے خاکستر (راکھ) بنے نہ پگھلے۔ اس طرح لکڑی جو خاکستر بن جاتی ہے اور سونا چاندی جو آگ کی وجہ سے پگھل جاتے ہیں، زمین کی جنس میں شامل نہ ہوں گے اور ان سے تیمّم نہیں کیا جاسکے گا۔''

یہ ''فتاویٰ عالمگیری'' کے الفاظ ومفہوم ہے، جب کہ آج یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ خود مٹی بھی ایک خاص حد تک گرم کرنے کے بعد پگھل جاتی ہے۔ اس طرح ''جنسِ ارض'' کی مذکورہ تعریف مجروح ہو جاتی ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ مذکورہ تعریف میں جلانے سے مراد عام معمول کی حرارت اور آگ ہے، جس سے سونا وغیرہ تو پگھل جاتا ہے، جب کہ مٹی کو پگھلانے کے لیے مخصوص نوعیت کی غیر معمولی حرارت اور گرمی مطلوب ہوتی ہے۔ [2]

ٹرین وغیرہ کی دیواروں پر تیمّم:

مسائلِ تیمّم کے سلسلے میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر کبھی ایسا ہو کہ کوئی شخص ٹرین (ریل

[1] دیکھیں: فتح الباري (١/ ٤٤٧)

[2] دیکھیں: جدید فقہی مسائل (ص: ۲٦)

گاڑی) یا بس وغیرہ میں سوار ہو اور نماز کا وقت ہو جائے۔ اندر پانی ہو نہ اسے رکوانا ممکن ہو تو ایسے میں وہ نمازی کیا کرے؟ اس سلسلے میں یہ تو معروف ہے کہ ٹرین یا بس کی دیواریں عموماً لکڑی، لوہے یا پلاسٹک کی ہوتی ہیں، ان پر تیمّم کرنا تو درست نہیں ہے، البتہ اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ دورانِ سفر عموماً گاڑیوں کی دیواروں پر گرد وغبار جم جاتا ہے اور امام ابوحنیفہ، امام محمد رحمہما اللہ اور ان کے دیگر موافقین کے نزدیک گرد وغبار پر بھی تیمّم کیا جاسکتا ہے، جیسا کہ "هداية، باب التيمم" (١/ ٣٤) میں لکھا ہے:

"وَيَجُوْزُ التَّيَمُّمُ عِنْدَ أَبِيْ حَنِيْفَةَ وَمُحَمَّدٍ بِكُلِّ مَا كَانَ مِنْ جِنْسِ الْأَرْضِ مِنَ التُّرَابِ وَالرَّمْلِ وَالْحَجَرِ وَالْجَصِّ ... وَكَذَا يَجُوْزُ بِالْغُبَارِ"[1]

''امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک جنسِ ارض کی ہر چیز مٹی، ریت، پتھر اور چونے سے تیمّم کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح گرد وغبار سے بھی تیمّم جائز ہے۔''

فقہ حنفی کی اس معروف کتاب "الهداية" کے ان الفاظ کی رو سے اگر ٹرین کی دیواروں پر گرد وغبار ہو تو تیمّم کیا جاسکتا ہے، ورنہ نہیں۔

ایک تیمّم سے متعدد فرضی و نفلی نمازیں اور تلاوت وغیرہ:

یہ بات تو صحیح مسلم (مع شرح النووي: ٤/ ٣/ ١٧٧) اور دیگر کتب میں مروی ایک صحیح حدیث کے حوالے سے ذکر کی جاچکی ہے کہ ایک وضو سے متعدد نمازیں ادا کی جاسکتی ہیں۔ اگرچہ ہر نماز کے لیے ازسرنو وضو کرنا زیادہ بہتر ہے اور تیمّم بھی چونکہ غسل و وضو اور کبھی صرف وضو کے قائم مقام ہوتا ہے، لہٰذا ایک مرتبہ تیمّم کر لینے کے بعد جب تک اس کا کوئی ناقض رونما نہ ہو، تب تک اس سے بھی متعدد نمازیں پڑھی جاسکتی اور تلاوت کی جاسکتی ہے۔ ہر نماز کے لیے تیمّم کرنا ضروری نہیں۔ نہ یہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل مبارک سے ثابت ہے اور نہ کسی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم فرمایا ہے، بلکہ اس کے برعکس سنن اربعہ، دارقطنی، مستدرکِ حاکم، صحیح ابن حبان اور مسندِ احمد میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ہے:

《إِنَّ الصَّعِيْدَ الطَّيِّبَ وُضُوْءُ الْمُسْلِمِ وَإِنْ لَّمْ يَجِدِ الْمَآءَ عَشْرَ سِنِيْنَ》[2]

---

[1] دیکھیں: جدید فقہی مسائل (ص: ٢٦)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢١) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٧) صحيح سنن ←

''پاک مٹی مسلمان کا وضو ہے، چاہے وہ دس سال بھی پانی نہ پائے۔''

اس حدیث کو امام المجد ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ''منتقیٰ الأخبار'' میں ''باب الرخصة في الجماع لعادم الماء'' کے تحت وارد کیا ہے اور ''نیل الأوطار'' میں اس کی شرح بیان کرتے ہوئے امام شوکانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے: اسی موضوع کی ایک حدیث مسند بزار اور معجم طبرانی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، جس کے بارے میں امام دارقطنی نے ''علل'' میں کہا ہے کہ اس کا مرسل ہونا ہی زیادہ صحیح ہے، البتہ شیخ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔[1]

امام شوکانی رحمہ اللہ مزید لکھتے ہیں:

''یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ مٹی ذریعہ طہارت ہے اور جو شخص اس سے تیمّم کر لے، اس کے لیے جائز ہے کہ ہر وہ کام کرے جو پانی سے وضو کرنے والا کرتا ہے، جیسے نماز ادا کرنا، تلاوت کرنا، مسجد میں جانا اور قرآنِ کریم کو چھونا وغیرہ۔ تیمّم کا ان امور کے لیے کافی ہونا کسی محدود وقت کے لیے نہیں، بلکہ چاہے کتنی مدت بھی پانی نہ ملے، تیمّم کفایت کرتا جائے گا اور دس سال کا ذکر اس بات کی دلیل نہیں کہ اس مدت کے بعد تیمّم کافی نہیں ہوگا، کیوں کہ اس مدت کا ذکر تحدید و تقیید کے لیے نہیں ہوا، بلکہ مبالغے کے لیے آیا ہے۔''[2]

امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے فقہ مقارن کی بہترین کتاب ''المغني'' میں لکھا ہے کہ نوافل کے لیے کیے ہوئے تیمّم سے فرائض بھی ادا کیے جا سکتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ اور امام احمد رحمہما اللہ کا یہی مسلک ہے۔[3]

''المرقاۃ شرح المشکاۃ'' میں ملا علی قاری حدیث: ﴿وَإِنْ لَّمْ يَجِدِ الْمَآءَ عَشْرَ سِنِينَ﴾ سے استدلال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کسی نماز کے لیے تیمّم کیا گیا اور وہ نماز بھی ادا کر لی، حتیٰ کہ اس نماز کا وقت بھی گزر گیا، اس کے باوجود اگر نواقضِ وضو و تیمّم میں سے کوئی امر واقع نہ ہوا ہو تو وہ شخص

← النسائي، رقم الحديث (٣١١) مسند أحمد (٥/ ١٥٥، ١٨٠) موارد الظمآن، رقم الحديث (١٩٦) مشكاة المصابيح (١/ ١٦٥) المنتقیٰ مع نيل الأوطار (١/ ١/ ٢٥٩) الإرواء (١/ ١٨١) مشكاة المصابيح (١/ ١٦٥) صحيح الجامع للألباني، رقم الحديث (٦٦٧)

[1] مشكاة المصابيح (١/ ١٦٥) و قواه محقق الزاد (١/ ٢٠١)

[2] نيل الأوطار (١/ ١/ ٢٥٩)

[3] المغني لابن قدامة (١/ ٣٢٦، ٢٥٢)

طہارت ہی سے ہوگا، کیوں کہ محض خروجِ وقت ناقضِ تیمّم نہیں، بلکہ اس کا حکم بھی وضو ہی کا ہے، جیسا کہ ہمارے احناف کا مذہب ہے۔[1]

وقتِ تیمّم:

امام شافعی، احمد، مالک اور ابو داود رحمہم اللہ کے نزدیک تیمّم کے لیے کسی نماز کے وقت کا ہو جانا شرط ہے اور ان کا استدلال بعض احادیث سے ہے، مثلاً مسندِ احمد میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

''میرے اور میری امت کے لیے ساری زمین کو مسجد اور ذریعہ طہارت بنایا گیا ہے۔ میری امت کے کسی آدمی کو جہاں بھی نماز کا وقت ہو جائے، تو اس کے پاس ہی اس کی مسجد و طہارت ہے۔''

اسی مفہوم کی کئی دوسری احادیث بھی صحیحین اور سنن میں مذکور ہیں۔[2]

ان سب احادیث میں جو «أَيْنَمَا أَدْرَكَتْنِيَ الصَّلَاةُ... الخ» یا «أَيْنَمَا أَدْرَكَتْ رَجُلًا مِنْ أُمَّتِيَ الصَّلَاةُ» کے الفاظ ہیں اور صحیحین کے الفاظ ہیں: «فَأَيُّمَا رَجُلٍ مِنْ أُمَّتِي أَدْرَكَتْهُ الصَّلَاةُ فَلْيُصَلِّ...» ان سب کا مفہوم ایک ہی ہے کہ میری امت کے کسی بھی شخص کو جہاں بھی نماز کا وقت ہو جائے، وہ نماز پڑھ لے اور (پانی نہ ہونے کی شکل میں) تیمّم کر لے۔

مذکورہ حضرات نے نماز کا وقت ہو جانے سے استدلال کیا ہے کہ تیمّم کے لیے ضروری ہے کہ پہلے کسی نماز کا وقت ہو۔ قرآنی الفاظ: ﴿إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلٰوةِ﴾ سے بھی استدلال کیا گیا ہے، جب کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب و رفقا کے نزدیک وضو کی طرح ہی تیمّم بھی قبل از وقت کیا جاسکتا ہے اور امام شوکانی رحمہ اللہ نے اس کی تائید کرتے ہوئے ''نیل الأوطار'' میں لکھا ہے:

''وَهٰذَا هُوَ الظَّاهِرُ، وَلَمْ يَرِدْ مَا يَدُلُّ عَلٰى عَدَمِ الْأَجْزَاءِ''

''یہی ظاہر ہے اور وقت سے پہلے کیے گئے تیمّم کے صحیح نہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔''

آگے مزید لکھتے ہیں:

---

[1] بحواله تحفة الأحوذي (١/ ٣٨٧)

[2] دیکھیں: المنتقى مع النيل (١/ ١/ ٢٥٩، ٢٦٠)

’’قرآنِ کریم (سورۃ المائدہ، آیت: ۶) میں جو وضو کے لیے ﴿اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوةِ﴾ کے الفاظ ہیں، ان سے مراد نماز کے لیے کھڑے ہونا نہیں، بلکہ نماز کے لیے کھڑے ہونے کا ارادہ کرنا ہے، جو نماز کے وقت میں بھی ہوسکتا ہے اور نماز کے وقت سے قبل بھی اور وقتِ نماز ہونے کی شرط پر دلالت کرنے والا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔‘‘[1]

گویا پانی نہ ہونے کی شکل میں جب چاہیں تیمّم کرلیں اور تلاوت کریں یا نفلی نماز ادا کریں یا فرائض ادا کریں، وضو کی طرح اس میں بھی وسعت ہے۔

تیمّم سے صرف ایک نماز اور اس کے دلائل کا جائزہ:

یہاں مناسب ہوگا کہ ان بعض اہلِ علم کے دلائل بھی ذکر کر دیے جائیں، جن کے نزدیک ایک مرتبہ کیے گئے تیمّم سے صرف ایک ہی وقت کی نماز ادا کی جاسکتی ہے یا قضا دی جاسکتی ہے۔ ان کا استدلال ایک تو معجم طبرانی اور سنن دارقطنی و بیہقی کی اس حدیث سے ہے، جس میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے:

«مِنَ السُّنَّةِ أَنْ لَّا يُصَلِّيَ الرَّجُلُ بِالتَّيَمُّمِ إِلَّا صَلَاةً وَّاحِدَةً ثُمَّ يَتَيَمَّمُ لِلصَّلَاةِ الْأُخْرَىٰ»[2]

’’سنت یہ ہے کہ تیمّم سے کوئی شخص ایک نماز سے زیادہ نہ پڑھے اور دوسری نماز کے لیے پھر تیمّم کرلے۔‘‘

یہ بات معلوم ہے کہ جب کوئی صحابی کسی معاملے کے بارے میں ’’مِنَ السُّنَّة‘‘ کہے تو اس کا حکم مرفوع حدیث کا ہوتا ہے، یعنی نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مبارک یا آپ کا ارشاد اس کی بنیاد ہوتا ہے اور وہ حدیث حجت ہوتی ہے۔ اگر یہ مذکورہ حدیث سند کے اعتبار سے صحیح ثابت ہوجائے تو پھر یہ اس مسئلے کی بہترین دلیل بن سکتی ہے، لیکن ایسا نہیں ہے، بلکہ محدثینِ کرام رحمہم اللہ نے اس حدیث کو ضعیف اور ناقابلِ حجت قرار دیا ہے۔ کبار محدّثین میں سے حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ’’التلخیص الحبیر‘‘ میں سنن دارقطنی و بیہقی کی طرف منسوب کیا اور لکھا ہے کہ اس کی سند کا ایک

---

[1] نیل الأوطار (۱/ ۱/ ۲۶۱)

[3] سنن الدار قطني باب التيمم (۱/ ۱۸۵) رقم الحديث (۵)

راوی حسن بن عمار سخت ضعیف ہے۔[1]

"بلوغ المرام" میں موصوف نے اسی روایت کو نقل کر کے اس کی سند کے سخت ضعیف ہونے کا بھی تذکرہ کیا ہے۔[2]

"سلسلة الأحاديث الضعيفة و الموضوعة" (١/ ٤٢٣ ، ٤٢٤) میں علامہ البانی نے امام دارقطنی کے حسن بن عمارہ کو ضعیف کہنے کے الفاظ ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ صرف ضعیف ہی نہیں، بلکہ اس سے بڑھ کر ہے، حتیٰ کہ شعبہ نے اس راوی کے بارے میں کہا ہے کہ وہ جھوٹ بولتا تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ کے استاذ علی بن مدینی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ حدیثیں گھڑا کرتا تھا۔ امام احمد رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی بیان کردہ احادیث من گھڑت ہیں۔ یہی وجہ کہ اس حدیث پر موضوع یعنی خود ساختہ اور مَن گھڑت ہونے کا حکم لگایا گیا ہے، لہٰذا اس سے استدلال جائز نہ رہا۔ سنن بیہقی میں حسن بن عمارہ والی سند سے ہی ایک اور روایت مرفوعاً مروی ہے، جسے نقل کر کے خود امام بیہقی نے لکھا ہے کہ حسن بن عمارہ قابلِ حجت نہیں، گویا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً یا موقوفاً کسی طرح بھی یہ حدیث صحیح ثابت نہیں ہے۔[3]

اس مرفوع اور موقوف حدیث کے علاوہ اسی مفہوم کے بعض آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی مروی ہیں، مثلاً سنن دارقطنی میں ایک اثر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، مگر اس کی سند میں حجاج بن ارطاۃ جیسا معروف متکلم فیہ راوی اور حارث بن اعور بھی ہے، جس کی وجہ سے وہ ضعیف ہے۔ سنن دارقطنی میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے بھی ایک اثر مروی ہے کہ وہ ہر نماز کے لیے الگ الگ تیمّم کیا کرتے تھے اور امام قتادہ رحمہ اللہ اسی کا فتویٰ دیا کرتے تھے، جب کہ امام قتادہ رحمہ اللہ اور حضرت عمرو رضی اللہ عنہ کے مابین ارسال ہے، یعنی اوّلاً یہ اثر موقوف ہے، ثانیاً مرسل بھی ہے۔

سنن بیہقی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی ایک اثر مروی ہے، جس میں حضرت نافع بیان کرتے ہیں:

"يَتَيَمَّمُ لِكُلِّ صَلَاةٍ وَإِنْ لَّمْ يُحْدِثْ"

---

[1] التلخيص الحبير (١/ ١/ ١٥٥)

[2] بلوغ المرام مع السبل السلام (١/ ١/ ١٠٠)

[3] سلسلة الأحاديث الضعيفة (١/ ٤٢٣، ٤٤٤)

”حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ہر نماز کے لیے الگ یا نیا تیمّم کیا کرتے تھے، چاہے وہ حادث نہ بھی ہوتے۔“

یعنی اگرچہ نواقضِ وضو و تیمّم میں سے کوئی امر واقع نہ بھی ہوتا، تب بھی وہ ہر نماز کے ساتھ نیا تیمّم کیا کرتے تھے۔ اس اثر کو نقل کرنے کے بعد امام بیہقی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس موضوع کی صحیح تر دلیل یہی اثر ہے اور ہمارے علم کے مطابق صحابہ کرام میں سے ان کا کوئی مخالف بھی نہیں تھا۔[1]

جب کہ علامہ یمانی امیر صنعانی رحمہ اللہ ”سبل السلام“ میں حضرت علی اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے آثار کی طرف اشارہ کر کے لکھتے ہیں کہ یہ دونوں بھی سند کے اعتبار سے ضعیف ہیں اور اگرچہ کہا گیا ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی اثر اس موضوع کا صحیح تر اثر ہے، مگر ہے تو وہ بھی موقوف (یعنی نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل تو نہیں ہے) لہٰذا مذکورہ بالا حدیثِ ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ان آثار سے بھی حجت قائم نہیں ہوتی ہے۔ آگے علامہ صنعانی فرماتے ہیں کہ اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مٹی کو پانی کے قائم مقام بنایا ہے اور یہ بات معلوم و معروف ہے کہ پانی سے وضو کرنا، اس وقت تک واجب نہیں ہوتا، جب تک مدت یا نواقضِ وضو میں سے کوئی امر واقع نہ ہو تو اس معاملے میں تیمّم بھی وضو کی طرح ہی ہے۔ ائمہ حدیث و فقہا کی ایک جماعت کا یہی مذہب اور دلیل کے اعتبار سے بھی یہی مضبوط ہے۔[2]

علامہ ابن حزم کی تحقیق کا نچوڑ:

یہیں یہ بات بھی واضح کر دیں کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی مرفوع و موقوف کوئی بھی روایت صحیح ثابت نہیں اور اسی پر بس نہیں، بلکہ خود انھی سے اس کے برعکس مفہوم کی روایت ملتی ہے، جیسا کہ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے ”المحلّٰی“ (۲/ ۱۳۳) میں ذکر کیا ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ تیمّم والا شخص اس تیمّم سے جو نفلی و فرض نمازیں چاہے، پڑھ سکتا ہے، جب تک پانی نہ مل جائے یا کسی حادث کے واقع ہونے سے اس کا وضو نہ ٹوٹے۔ علامہ ابن حزم کے نزدیک اس مسئلے میں یہی صحیح اور حق بات ہے۔ علامہ موصوف نے ”المحلّٰی“ کی جلد اوّل جزو دوم میں متعدد صفحات پر اس موضوع کو ذکر کیا اور خوب دادِ تحقیق دی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ہر نماز کے لیے پانی کی تلاش کرنا

---

[1] التلخیص الحبیر (۱/ ۱/ ۱۵۵)

[3] سبل السلام (۱/ ۱/ ۱۰۰)

ایک لغو اور باطل بات ہے، کیوں کہ کسی جگہ سے صرف ایک مرتبہ پانی تلاش کر لینا اور اس کے عدمِ وجود کا یقین کر لینا کافی ہوتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا یہ قول کہ فرضی نماز کے بعد تو تیمّم والی طہارت نفلوں کے لیے برقرار رہتی ہے، البتہ نفلوں کے بعد فرضوں کے لیے نہیں، ان کے اس قول کو فاسد قرار دیا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا جو قول ہے کہ ہر فرضی نماز کے ساتھ دوبارہ تیمّم کرے، البتہ نوافل کے ساتھ تجدیدِ تیمّم کی ضرورت نہیں۔ ان کے اس قول کو بھی ظاہر الخطا قرار دیا ہے اور امام ابو ثور رحمہ اللہ نے جو لکھا ہے کہ تیمّم کی طہارت نماز کے وقت تک رہتی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ہی وہ طہارت ختم ہو جاتی ہے، اسے بھی انھوں نے ظاہر الخطا کہا اور لکھا ہے کہ ہمیں قرآن و سنت، کسی سے بھی نواقضِ طہارت میں سے ''خروجِ وقت'' نامی کوئی سبب معلوم نہیں ہے، پھر آگے چل کر انھوں نے وہ چاروں آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی ذکر کیے ہیں، جو ہم نقل کر چکے ہیں اور انھیں غیر صحیح بلکہ ضعیف و ناقابلِ حجت قرار دیا ہے، پھر سورۃ المائدہ (آیت:۶) سے جو تیمّم کے لیے دخولِ وقت کو شرط قرار دیا ہے، اس کی بھی تردید کی ہے۔[1]

علامہ نواب صدیق حسن خان والیِ بھوپال کی تحقیق:

امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''الدرر البهية'' کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں صحیح دلائل والے فقہی مسائل ذکر کیے ہیں اور والیِ ریاست بھوپال علامہ نواب صدیق حسن خان نے دو جلدوں میں اس کی ایک بے نظیر شرح قلم بند کی ہے، جس کا نام ''الروضة الندية'' ہے۔ اس کی دار المعرفۃ بیروت والی طبع (ص: ۵۹) میں علامہ موصوف نے بھی لکھا ہے کہ تیمّم وضو کی طرح ہی ہے اور ایک تیمّم سے متعدد فرضی و نفلی نمازیں ادا کی جاسکتی ہیں۔ ایک نماز سے فارغ ہو جانے یا اس نماز کا وقت نکل جانے سے تیمّم والی طہارت ختم نہیں ہوتی اور ''حجۃ'' سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''وَلَمْ أَجِدْ فِيْ حَدِيْثٍ صَحِيْحٍ تَصْرِيْحاً بِأَنَّهٗ يَجِبُ أَنْ يَّتَيَمَّمَ لِكُلِّ فَرِيْضَةٍ''[2]

''مجھے کسی صحیح حدیث میں یہ صراحت نہیں ملی، جس کی رو سے ہر فرض نماز کے ساتھ ازسرِ نو تیمّم کرنا واجب ہو۔''

---

[1] المحلی (۱/ ۲/ ۱۲۸۔ ۱۳۳)

[2] الروضة الندية (ص: ۹۵) دار المعرفة، بيروت.

حضرت حسن بصری، امام بخاری، امام ابن المنذر رحمہم اللہ:

رئیس المحدّثین امام بخاری رحمہ اللہ کا رجحان بھی واضح طور پر اسی طرف ہے کہ ایک تیمّم سے متعدد فرضی و نفلی نمازیں ادا کی جاسکتی ہیں اور جب تک کوئی ناقض واقع نہ ہو، تیمّم کی طہارت موجود رہتی ہے۔

1. چنانچہ صحیح بخاری کے ایک ترجمۃ الباب میں موصوف نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا وہ قول نقل کیا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

"يُجْزِئُهُ التَّيَمُّمُ مَالَمْ يُحْدِثْ"[1]

''تیمّم والا جب تک حادث نہ ہو جائے، وہ اسے کافی رہتا ہے۔''

2. امام بخاری رحمہ اللہ نے تو یہ اثر تعلیقاً ذکر کیا ہے، جب کہ بعض دیگر کتبِ حدیث میں یہ موصولاً بھی مروی ہے۔ چنانچہ مصنف عبد الرزاق میں اس اثر کے الفاظ ہیں:

"يُجْزِئُ تَيَمُّمٌ وَاحِدٌ مَا لَمْ يُحْدِثْ"

''جب تک کوئی ناقضِ وضو واقع نہ ہو، تیمّم کفایت کرتا جاتا ہے۔''

3. مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے:

"لَا يُنْقِضُ التَّيَمُّمَ إِلَّا الْحَدَثُ"

''تیمّم کی طہارت کو صرف حدث ہی توڑتا ہے۔''

4. سنن سعید بن منصور میں ہے:

"اَلتَّيَمُّمُ بِمَنْزِلَةِ الْوُضُوْءِ إِذَا تَيَمَّمْتَ فَأَنْتَ عَلٰى وُضُوْءٍ حَتّٰى تُحْدِثَ"

''تیمّم وضو کے قائم مقام ہے۔ جب تم تیمّم کر لو تو ناقضِ وضو واقع ہونے تک تم وضو ہی سے ہو۔''

5. مصنف حماد بن سلمہ میں ہے:

"تُصَلِّيْ الصَّلَوٰتِ كُلَّهَا بِتَيَمُّمٍ وَّاحِدٍ مِثْلَ الْوُضُوْءِ مَا لَمْ تُحْدِثْ"[2]

''وضو کی طرح ہی کوئی حادث یا ناقضِ وضو واقع ہونے تک تیمّم سے بھی تمام نمازیں پڑھی

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٤٤٦)

[2] دیکھیں: فتح الباري (١/ ٤٤٦)

جاسکتی ہیں۔‘‘

٦ امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمۃ الباب والے اس اثرِ حسن بصری رحمہ اللہ کے علاوہ اس باب میں وہ حدیث بھی نقل کی ہے، جس میں جماعت کے ساتھ نماز نہ پڑھنے والے آدمی سے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تھا:

«مَا مَنَعَكَ يَا فُلَانُ أَنْ تُصَلِّيَ مَعَ الْقَوْمِ؟»

’’اے فلاں! قوم کے ساتھ مل کر نماز ادا کرنے سے تجھے کس چیز نے روکا ہے؟‘‘

تو اس نے جواب دیا:

«أَصَابَتْنِي جَنَابَةٌ وَلَا مَاءٌ»

’’مجھے جنابت ہوگئی تھی اور پانی نہیں ملا (کہ غسل کر لیتا)۔‘‘

تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

«عَلَيْكَ بِالصَّعِيدِ فَإِنَّهُ يَكْفِيكَ»[1]

’’تمھیں مٹی سے کام لینا (تیمّم کر لینا) تھا اور یہ تمھارے لیے کافی ہے۔‘‘

ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لفظ «يَكْفِيكَ» سے امام بخاری نے یہی اخذ کیا ہے کہ ایک مرتبہ کیا ہوا تیمّم تمھارے لیے کافی ہے، یعنی جب تک تمھاری طہارتِ تیمّم ٹوٹ نہ جائے یا پانی نہ مل جائے۔

کبار علماے اسلام میں سے امام ابن المنذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب ایک تیمّم سے کئی نوافل جائز و صحیح ہیں، تو پھر کئی فرائض بھی صحیح ہیں، کیوں کہ جن امور کو فرائض کے لیے شرط قرار دیا گیا ہے۔ وہی نوافل کے لیے بھی شرط ہیں۔ سوائے کسی ایسی استثنائی شکل کے جو کسی دلیل سے ثابت ہو اور علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کی طرح ہی امام ابن المنذر رحمہ اللہ نے بھی حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ ہر فرض نماز کے لیے پانی کی تلاش واجب نہیں۔[2]

تیمّم کرنے والے کا امامت کروانا:

مذکورہ مسئلے کی مزید وضاحت اس سے بھی ہو جاتی ہے کہ تیمّم کا ہر لحاظ سے وضو کے قائم مقام

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٤٤٧)

[2] كذا في فتح الباري (١/ ٤٤٧)

ہونا اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ تیمّم کرنے والا، وضو والوں کی امامت کروا سکتا ہے۔ اس طرح دو مسئلے حل ہوگئے، ایک مذکورہ زیرِ بحث مسئلہ اور دوسرا تیمّم والے کا وضو والوں کی امامت کروانا اور اس کا جائز ہونا۔ جمہور اہلِ علم اور فقہاے کوفہ کا یہی مسلک ہے اور اس سلسلے میں امام بخاری رحمہ اللہ بھی ان کے موافق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی صحیح کے ایک ترجمۃ الباب میں انھوں نے بڑے جزم و یقین کے ساتھ، مگر تعلیقاً نقل کیا ہے:

"أَمَّ ابْنُ عَبَّاسٍ، وَهُوَ مُتَيَمِّمٌ" [1]

"حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے امامت کروائی، جب کہ وہ تیمّم کیے ہوئے تھے۔"

صحیح بخاری شریف کے ترجمۃ الباب میں یہ اثر تعلیقاً بیان کیا گیا ہے، جب کہ مصنف ابن ابی شیبہ اور سنن بیہقی میں اس اثر کو موصولاً روایت کیا گیا ہے۔ محدثینِ کرام نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ اثر نقل کرکے اشارہ فرما دیا ہے کہ تیمّم پوری طرح وضو کا قائم مقام ہوتا ہے اور اگر اس سے حاصل ہونے والی طہارت وضو والی طہارت سے کم تر ہوتی تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما تیمّم کرکے ان لوگوں کی امامت نہ کرواتے، جنھوں نے وضو کیا ہوا تھا۔ تیمّم والے کی امامت کے صحیح ہونے اور اس کے پیچھے متوضی نمازیوں کی نماز کے صحیح ہونے کا دوسرا ثبوت یا دلیل وہ حدیث ہے، جس میں حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کا واقعہ مذکورہ ہے، جسے امام بخاری نے اپنی صحیح کے ایک ترجمۃ الباب میں تعلیقاً نقل کیا ہے اور صیغہ تمریض استعمال کیا ہے، جس کی توجیہ "فتح الباري" میں یہ بیان کی گئی ہے کہ امام صاحب نے اس واقعہ کو چونکہ مختصراً ذکر کیا ہے، لہٰذا اس کی تصدیر ذکر کرکے صیغۂ تمریض و تضعیف سے کی ہے، ورنہ حدیث قوی سند والی ہے۔ [2]

اس واقعہ کو سنن ابو داود و دارقطنی، مستدرک حاکم، صحیح ابن حبان اور مسند احمد میں موصولاً روایت کیا گیا ہے، جس میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم غزوۂ ذات السلاسل میں بھیجے گئے۔ ایک رات جب کہ سخت سردی تھی، مجھے غسل کی ضرورت پیش آگئی اور مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر میں

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٤٤٦)

[2] فتح الباري (١/ ٤٥٤)

نہایا تو مرجاؤں گا۔ چنانچہ میں نے تیمّم کیا اور لوگوں کو صبح کی نماز پڑھائی۔ جب ہم مدینہ واپس آئے تو لوگوں نے نبیِ اکرم ﷺ سے اس واقعے کا ذکر کیا، اس پر آپ ﷺ نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا: اے عمرو! «صَلَّيْتَ أَصْحَابَكَ وَأَنْتَ جُنُبٌ؟» ''تم نے جنابت کی حالت میں لوگوں کو نماز پڑھا دی؟'' میں نے عرض کی: مجھے قرآنِ کریم کی سورۃ النساء کی آیت (۲۹) یاد آ گئی تھی، جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا﴾

''اپنے آپ کو ہلاک مت کرو، بے شک اللہ تم پر رحم کرنے والا ہے۔''

اس لیے میں نے تیمّم کر کے نماز پڑھا دی۔

بخاری شریف میں ہے:

« فلم يُعَنِّفْ » ''آپ ﷺ نے انھیں کوئی ملامت نہ کی۔''

جب کہ دوسری مذکورہ کتب کے الفاظ ہیں:

« فَضَحِكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَلَمْ يَقُلْ شَيْئًا »[1]

''نبیِ اکرم ﷺ یہ سن کر مسکرا دیے اور مزید کچھ نہ فرمایا۔''

اس حدیث سے امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''فتح الباری'' میں، المجد ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ''منتقیٰ الأخبار'' میں اور امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''نیل الأوطار'' میں استدلال کیا ہے کہ متیمّم کے پیچھے متوضّی کی نماز اور متیمّم کی امامت صحیح ہے۔

صاحبِ فتح الباری نے اسی حدیث سے نبیِ اکرم ﷺ کے عہدِ مبارک میں اجتہاد کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ مالکیہ نے متیمّم کے پیچھے نماز کو جائز، مگر مکروہ کہا ہے، جیسا کہ ''الفقه علی المذاهب الأربعة'' (۱/ ۴۳۰) سے پتا چلتا ہے۔

مالکیہ کا یہ مکروہ کہنا کیا حیثیت رکھتا ہے؟ جب کہ موطا میں خود امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (۱/ ۴۵۴) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۲۳) موارد الظمآن، رقم الحديث (۲۰۲) المنتقى مع النيل (۱/ ۲۵۸) إرواء الغليل (۱/ ۱۸۱۔ ۱۸۲) و صححه الألباني.

"وَلَوْ أَمَّهُمْ هُوَ لَمْ أَرَ بِذٰلِكَ بَأْسًا"

''اگر وہ ان کی امامت کرائے تو میرے نزدیک اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔''

آگے وہ فرماتے ہیں:

"وَلَيْسَ الَّذِيْ وَجَدَ الْمَآءَ بِأَطْهَرَ مِنْهُ وَلَا أَتَمَّ صَلَاةً"[1]

''پانی سے وضو کرنے والا تیمّم والے سے زیادہ طاہر نہیں اور نہ اس کی نماز اس سے زیادہ کامل ہے۔''

---

[1] الموطأ مع تنوير الحوالك للسيوطي (١/ ٧٥) طبع بيروت.

نواقضِ تیمّم اورنواقضِ وضو

نواقضِ تیمّم:

تیمّم کے بارے میں جس قدر ضروری مسائل تھے، وہ بتوفیقہٖ تعالیٰ بیان کر دیے گئے ہیں۔ اب صرف اتنی سی بات رہ گئی ہے کہ نواقضِ تیمّم یعنی وہ کون کون سے امور ہیں، جن سے تیمّم ختم ہوجاتا ہے؟ اس سلسلے میں مختصراً عرض ہے کہ جن کاموں سے وضوٹوٹ جاتا ہے، انہی سے تیمّم بھی ختم ہوجاتا ہے، کیوں کہ وہ اسی کے قائم مقام ہوتا ہے۔ ایسے ہی جس شخص نے پہلے پانی ملنے کی وجہ سے تیمّم کیا ہو، پانی مل جانے پر اس کا تیمّم ختم ہو جاتا ہے۔ البتہ اگر تیمّم والی نماز کے دوران ہی میں پانی مل جانے کا پتا چل جائے تو وہ نماز مکمل کرسکتا ہے، جیسا کہ تفصیل ذکر کی جاچکی ہے اور اگر کسی نے بیماری یا کسی دوسرے عذر کی بنا پر تیمّم کیا ہوتو جب اس کا وہ عذر ختم ہوجائے، تیمّم بھی ختم ہوجاتا ہے۔ گویا نواقضِ تیمّم کو جاننے کے لیے نواقضِ وضو کا جاننا اور ان کا پیشِ نظر ہونا ضروری ہے۔

نواقضِ وضو:

نواقضِ وضو کا ذکر مسائلِ وضو کے ضمن میں گزر چکا ہے، مگر کسی وجہ سے وہاں ہم نے ان کی طرف اشارہ کر دینے پر ہی اکتفا کیا تھا، لیکن اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دیگر مسائلِ طہارت کی تفصیل کی طرح ان کی بھی کچھ تشریح کر دی جائے۔

2,1- پیشاب اور پاخانہ:

«مَا خَرَجَ مِنَ السَّبِیْلَیْنِ» ''پیشاب اور پاخانے کی جگہوں سے کچھ نکلنا۔''

اس کے تحت متعدد اشیا آتی ہیں، جن میں سے پہلی دو چیزیں تو پیشاب اور پاخانہ ہی ہیں، ان دونوں کے نواقضِ وضو ہونے کا ذکر خود قرآنِ کریم میں موجود ہے۔ چنانچہ سورۃ النساء (آیت: ۴۳) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿اَوْجَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ﴾

''یا کوئی تم میں سے بیت الخلاء سے ہو کر آیا ہو۔''

ظاہر ہے کہ رفعِ حاجت پیشاب و پاخانہ ہی سے کنایہ ہے۔ ان دونوں سے وضوٹوٹ جاتا ہے اور فراغت کے بعد نماز کے لیے استنجا اور وضو کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ''مَا خَرَجَ مِنَ السَّبِیْلَیْنِ'' میں سے ان دونوں چیزوں کے ناقضِ وضو ہونے کا ثبوت حدیثِ شریف میں بھی مذکور ہے، چنانچہ سنن ترمذی، نسائی، صحیح ابن خزیمہ اور مسندِ احمد میں حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَأْمُرُنَا إِذَا كُنَّا سَفْراً أَنْ لَّا نَنْزِعَ خِفَافَنَا ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ وَلَيَالِيْهِنَّ إِلَّا مِنْ جَنَابَةٍ وَلٰكِنْ مِنْ غَائِطٍ وَبَوْلٍ وَنَوْمٍ »[1]

''نبیِ اکرم ﷺ سفر کے دوران میں ہمیں یہ حکم فرمایا کرتے تھے کہ ہم اپنے موزوں کو تین دن اور تین راتیں پاخانہ، پیشاب اور نیند کی بنا پر نہ اتارا کریں، ہاں اگر جنابت ہو تو پھر اتار لیں۔''

اس حدیث میں نبیِ اکرم ﷺ نے تین نواقضِ وضو شمار کیے اور بتایا ہے کہ ان سے وضوٹوٹ جاتا ہے، لیکن اگر کسی نے موزے پہنے ہوں تو وضوٹوٹ جانے کے باوجود موزے اتار کر پاؤں دھونے کی ضرورت نہیں، بلکہ ان پر مسح کر لینا ہی کافی ہے۔ ہاں اگر جنابت ہو جائے تو پھر موزوں کا اتارنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس حدیث کو موزوں پر مسح کرنے کے مسائل کے ضمن میں بھی ذکر کیا جا چکا ہے اور یہاں ان دونوں نواقضِ وضو پر استدلال کے لیے اسے دوبارہ ذکر کر دیا ہے۔

سلس البول:

یہیں ایک دوسرا مسئلہ بھی حل کرتے جائیں اور وہ ہے: سلس البول کا مسئلہ۔ اگر کسی کو سلس البول کی بیماری ہو، یعنی پیشاب کے قطرے مسلسل گرتے رہتے ہوں تو وہ نماز کیسے ادا کرے؟ اس سلسلے میں اہلِ علم نے لکھا ہے کہ نماز تو معاف نہیں ہے۔ ایسے بیمار لوگ انڈر ویئر استعمال کریں، وضو

---

[1] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٨٤) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٢٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٧٨) مسند أحمد (٤/ ٢٣٩۔ ٢٤٠) الفتح الرباني (٢/ ٧٣، ٧٤) و نقل تصحيح ابن خزيمة و الترمذي و تحسين البخاري للحديث. مشكاة المصابيح (١/ ١٦١۔ ١٦٢)

کر کے نماز شروع کر دیں اور ایک ہی وضو سے پوری نماز پڑھ لیں، اگر درمیان میں قطرے سے وضو ٹوٹتا ہے تو ٹوٹتا رہے، اللہ تعالیٰ معاف کرے گا۔ البتہ ایسا شخص ایک وضو سے دو نمازیں ادا نہیں کرسکتا، بلکہ ہر نماز کے لیے از سرنو وضو کرنا ضروری ہے۔[1]

جب وضو کرلے تو شرم گاہ پر چھینٹا مارے، پھر مطمئن ہو کر نماز پڑھے، کیوں کہ وہ ایک شرعی عذر میں مبتلا اور مجبور ہے۔ ایسے شخص کو مستحاضہ کے حکم میں شمار کیا گیا ہے۔ مستحاضہ عورت جسے مخصوص ایام کے علاوہ بھی بیماری کی وجہ سے خون آتا رہتا ہے، اسے نبیِ اکرم ﷺ نے ایسے ہی نمازیں ادا کرنے کا حکم فرمایا تھا۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن ابی داود، ترمذی، نسائی، صحیح ابن حبان اور موطا امام مالک جیسی کتبِ حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک صحابیہ حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا کا واقعہ مذکور ہے، انھوں نے نبیِ اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کی:

((إِنِّيْ لَا أَطْهُرُ، أَفَأَدَعُ الصَّلَاةَ؟))

''میں پاک نہیں رہتی تو کیا میں نماز چھوڑ دوں؟''

ان کا اشارہ مرضِ استحاضہ کی طرف تھا۔ اس پر نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّمَا ذٰلِكِ عِرْقٌ، وَلَيْسَ بِالْحَيْضَةِ فَإِذَا أَقْبَلَتِ الْحَيْضَةُ فَاتْرُكِي الصَّلَاةَ، فَإِذَا ذَهَبَ قَدْرُهَا فَاغْسِلِي الدَّمَ وَصَلِّيْ))[2]

''یہ ایک رگ ہوتی ہے، حیض نہیں۔ جب ایامِ حیض آئیں تو نماز چھوڑ دو اور جب ایامِ حیض کے برابر عرصہ گزر جائے تو خون دھو دو (غسلِ حیض کرلو) اور نماز پڑھو۔''

جب کہ ایک اور روایت میں ہے:

((ثُمَّ تَوَضَّئِيْ لِكُلِّ صَلَاةٍ))[3] ''پھر تم ہر نماز کے لیے وضو کرو۔''

---

[1] المغني (١/ ٣٠٣) فقه السنة (١/ ٦٠) فتاویٰ علماے حدیث (۱/۷۴) فتویٰ دار الإفتاء جامعه سلفیه بحواله ہفت روزہ ''اہلِ حدیث'' (جلد۱۲ شمارہ ۸)

[2] صحیح البخاري مع الفتح (٢٢٨) صحیح مسلم مع شرح النووي (٤/ ١٦١، ١٧) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (٢٦١) صحیح سنن الترمذي (١٠٨) صحیح سنن النسائي (٢٠٦، ٣٤٧) سنن ابن ماجه (٦٦١) الموطأ مع المسویٰ (١٠٤)

[3] صحیح البخاري مع فتح الباري (١/ ٤٠٩) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (٢٨٧) و الفتح الرباني (٢/ ١٧١) و جامع الأصول (٧/ ٣٦٣)

انڈرویئر کے استعمال کا فائدہ یہ ہوگا کہ اوپر والے کپڑے ناپاک نہیں ہوں گے، اس کے استعمال کا اشارہ ان احادیث سے ملتا ہے، جن میں استحاضہ والی بعض صحابیات اور ام المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے استحاضے کے باوجود اعتکاف کرنے کا ذکر آیا ہے، جن کی تفصیل "صحیح البخاري، کتاب الحیض، باب الاعتکاف للمستحاضة" اور اس کی شرح "فتح الباري" اور مسندِ احمد کی ترتیب وشرح "الفتح الرباني" (۲/ ۱۶۹ تا ۱۷۲) اور دیگر کتبِ حدیث اور ان کی شروح میں دیکھی جاسکتی ہے۔[1]

3- خروجِ ریح یا ہوا کا آنا:

نواقضِ وضو میں سے تیسری چیز خروجِ ریح ہے، اس کا ثبوت صحیح بخاری ومسلم، مسند احمد اور دیگر کتبِ حدیث میں مذکور ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا تُقْبَلُ صَلَاةُ مَنْ أَحْدَثَ حَتّٰی يَتَوَضَّأَ»

"جو شخص حادث ہو جائے، اس کی اس وقت تک نماز قبول نہیں ہوتی جب تک وہ وضو نہ کرلے۔"

یہ سُن کر حضر موت سے آئے ہوئے ایک شخص نے پوچھا:

"مَا الْحَدَثُ يَا أَبَا هُرَيْرَةَ؟ فَقَالَ: فُسَاءٌ أَوْ ضُرَاطٌ"[2]

"اے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ! حدث کیا ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا: پُھسکی یا گوز یعنی بغیر آواز کے یا آواز کے ساتھ جائے پاخانہ سے ہوا کا خارج ہونا۔"

یہاں یہ بات پیشِ نظر ہے کہ اس معاملے میں خواہ مخواہ شک میں مبتلا ہو جانا بھی صحیح نہیں، کیوں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محض معمولی سا شک گزرنے پر نماز چھوڑ کر وضو کرنے کے لیے چل دینے سے منع فرمایا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری ومسلم، سنن ابو داود اور نسائی میں حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ شکایت کی گئی کہ بعض دفعہ نمازی محسوس کرتا ہے کہ شاید دورانِ نماز اس کے پیٹ سے ہوا خارج ہوگئی ہے۔ (تو ایسے میں وہ کیا کرے؟) اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] صحیح البخاري مع فتح الباري (۱/ ٤١١، ٤١٢) و المغني (۱/ ٤، ٣)

[2] صحیح البخاري مع الفتح (۱/ ٢٣٤) صحیح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٠٤) الفتح الرباني (٢/ ٧٥)

«لَا یَنْفَتِلُ، لَا یَنْصَرِفُ حَتّٰی یَسْمَعَ صَوْتاً أَوْ یَجِدَ رِیْحًا»[1]

''وہ اس وقت تک نماز چھوڑ کر نہ جائے، جب تک وہ آواز نہ سن لے یا بُو نہ پائے۔''

ایسے ہی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح مسلم، سنن ابی داود اور ترمذی میں مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«إِذَا وَجَدَ أَحَدُکُمْ فِيْ بَطْنِهٖ شَیْئًا فَأَشْکَلَ عَلَیْهِ أَخَرَجَ أَمْ لَا؟ فَلَا یَخْرُجَنَّ حَتّٰی یَسْمَعَ صَوْتًا أَوْ یَجِدَ رِیْحًا»[2]

''جب تم میں سے کوئی شخص اپنے پیٹ میں کچھ پائے اور اس کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہو جائے کہ ہوا نکلی ہے یا نہیں؟ تو اس وقت تک (نماز سے) ہرگز نہ نکلے، جب تک آواز نہ سن لے یا بُو نہ پائے۔''

ان دونوں احادیث میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خروجِ ہوا کا یقین کر لینے تک نماز نہ چھوڑنے کا حکم فرمایا ہے کہ صرف معمولی شک گزرنے سے ایسا نہ کرے۔ گویا جب تک وضو کے ٹوٹ جانے کا پختہ یقین نہ ہو جائے، اس کی نماز صحیح ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح صحیح مسلم میں کہا ہے کہ یہ حدیث اس مسئلے میں اصل ہے کہ اشیا اپنی اصل ہی پر رہتی ہیں، جب تک کہ اس کے خلاف (اصل سے ہٹ جانے) کا پختہ یقین نہ ہو جائے اور محض شک کا واقع ہو جانا مضر نہیں ہے۔ جمہور علما نے اسی حدیث کو اختیار کیا ہے۔[3]

ان احادیث سے مرضِ وسواس میں مبتلا لوگوں کے لیے بھی صاف علاج اور عمدہ حل نکل آیا ہے کہ وہ محض وسواس اور شک پر بنیاد بنا کر نماز نہ چھوڑیں اور وضو کرنے نہ چل نکلیں، بلکہ یقین پر بنیاد رکھیں۔ فتح الباری میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے تو مذکورہ حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ بعض لوگوں

---

[1] صحیح البخاري مع الفتح (١/ ٢٣٧) صحیح مسلم مع شرح النووي (٤/ ٥١) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (١٦٣) صحیح سنن الترمذي (٦٥) صحیح النسائي (١٥٤) سنن ابن ماجه (٥١٣) صحیح ابن خزیمة (١٠١٨) جامع الأصول (٨/ ١٠٧)

[2] صحیح مسلم مع شرح النووي (٤/ ٥١) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (٦٣) صحیح سنن الترمذي (٦٥) جامع الأصول (٨/ ١٠٧)

[3] فتح الباري (١/ ٢٣٨) و شرح صحیح مسلم للنووي (٢/ ٣/ ٤٩۔ ٥٠)

نے اس حدیث کو مرضِ وسواس میں مبتلا لوگوں کے ساتھ خاص قرار دیا ہے، مگر انھوں نے صحیح مسلم اور سنن ابو داود میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے الفاظ نقل کر کے ثابت کیا ہے کہ اس حدیث کا حکم وسواس والوں کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ ہر کسی کے لیے عام ہے کہ جب تک خروجِ ہوا یا کسی بھی دوسرے طریقے سے وضو کے ٹوٹ جانے کا یقین نہ ہو جائے، تب تک مطمئن ہو کر اسی وضو سے نماز ادا کرتے جانا چاہیے۔[1]

امام خطابی رحمہ اللہ ''معالم السنن'' میں فرماتے ہیں کہ آواز سننے یا بُو پانے کا معنیٰ پختہ یقین حاصل کر لینا ہے، خاص آواز یا بو پانا مراد نہیں اور جب کوئی معنیٰ خاص نام سے زیادہ وسعت والا ہو تو حکم اسی معنیٰ کا ہوگا نہ کہ اس خاص معنیٰ کا۔[2]

جمہور اہلِ علم کا مسلک تو یہی ہے، البتہ امام مالک رحمہ اللہ ایک قول میں شک سے وضو کے ٹوٹ جانے کے قائل ہیں اور دوسرے قول میں ان کے نزدیک ایسے وقت میں نیا وضو کر لینا زیادہ محبوب ہے۔ ان کا یہ مسلک من حیث النظر تو قوی ہے، مگر مدلولِ حدیث کے مخالف ہے (لہٰذا جمہور کا مسلک ہی اولیٰ ہے)۔[3]

امام ابن مالک رحمہ اللہ نے اس سلسلے میں ایک بڑی عمدہ بات کہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''اگر کسی کو حادث ہونے میں شک ہو جائے تو اس پر وضو کرنا اس وقت تک واجب نہیں جب تک اسے اس کا پختہ یقین نہ آجائے اور پختہ یقین اس حد تک کہ وہ اس پر حلف یعنی قسم کھا سکے، لیکن اگر حادث ہونے کا یقین ہو، جب کہ طہارت کے بحال ہونے کا محض شک رہ جائے تو اس پر وضو کرنا لازم ہے اور اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔''[4]

4- سلس الریح:

جس طرح بعض لوگوں کو تقطیر البول یا سلس البول یعنی پیشاب کے قطروں کے آتے رہنے کا

---

[1] فتح الباري (١/ ٢٣٨)

[2] معالم السنن للخطابي (١/ ١٢٩)

[3] فتح الباري (١/ ٢٣٨)

[4] شرح صحیح مسلم للنووي (٢/ ٣/ ٥٠) فقه السنة (١/ ٥٦)

مرض ہوتا ہے، ایسے ہی بعض کو سلس الریح کی بیماری ہوتی ہے کہ وہ چند منٹ کے لیے بھی ہوا کو نہیں روک سکتے، بلکہ بلا اختیار ہوا خارج ہوتی رہتی ہے۔ ایسے لوگوں کے وضو اور نماز کا حکم بھی سلس البول والوں ہی کی طرح ہے۔ علما نے اسے بھی استحاضہ کے حکم میں داخل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ وضو کر کے اطمینان سے نماز ادا کرلے۔ اس نماز کی سنتیں اور نوافل بھی پڑھ لے، حتیٰ کہ معمول کے مطابق قرآنِ کریم کی تلاوت، درود شریف یا دوسرا کوئی مسنون وظیفہ کرنا چاہے تو نماز کے ساتھ ہی اسی وضو سے کرلے، البتہ ایک وضو سے متعدد نمازیں ادا نہیں کرسکتا۔[1]

[1] فتاوی عزیزی (ص: ۳۶۲) بحوالہ فتاویٰ علماے حدیث (۱/ ۵۷) فقه السنة (۱/ ٦٠) المغني (۱/ ۳۰٤) دليل الطالب (ص: ۲۳۷، ۳٤٥) بحوالہ فتاویٰ علماے حدیث (۱/ ۸۴، ۹۱) دلائل وتفصیل سلس البول کے ضمن میں گزر چکی ہے، لہٰذا دہرانے کی ضرورت نہیں۔

شرم و حیا کے مسائل

بعض نواقضِ وضوخصوصاً ''مَا خَرَجَ مِنَ السَّبِيلَيْنِ'' سے تعلق رکھنے والے نواقض ایسے بھی ہیں، جنھیں شرم و حیا والے امور میں شمار کیا جاتا ہے اور بعض لوگوں کو ناگوار گزرتا ہے کہ ایسے مسائل بیان کیے جائیں، ان کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ ماؤں، بہنوں اور بہو بیٹیوں کی موجودگی میں ایسے مسائل کا ذکر تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ان کے جذبات کا پاس کرتے ہوئے بہ قدرِ امکان مناسب الفاظ سے ان مسائل کا تذکرہ بھی از بس ضروری ہے، کیوں کہ وہ بھی دین کا ایک جزو ہیں۔ مسائلِ دین کے بیان کرنے میں اگر محض اسی بات کو سامنے رکھتے ہوئے تساہل برتا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دین کا ایک حصہ نظروں سے اوجھل رہ جائے گا، ویسے بھی صحیح بخاری، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی اور مسند احمد میں بھی ہے:

«إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِيْ مِنَ الْحَقِّ»[1]

''یقیناً اللہ تعالیٰ حق بیان کرنے سے نہیں شرماتا۔''

نیز سورۃ الاحزاب (آیت: ۵۳) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَ اللّٰهُ لَا يَسْتَحْيِ مِنَ الْحَقِّ﴾ ''لیکن اللہ سچی بات کے کہنے سے شرم نہیں کرتا۔''

خود پیکرِ شرم و حیا نبیِ اکرم ﷺ نے ایسے مسائل اپنی امت کے تمام افرادِ مرد و زن کے لیے بیان فرمائے اور ان مسائل کو اُمہات المومنین رضی اللہ عنہن نے کمال دیانت سے اُمت تک پہنچایا۔ جب عفت مآب صدیقۂ کائنات رضی اللہ عنہا سے ان مسائل کی بکثرت احادیث مروی ہیں اور اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں تو آج ہماری ماؤں، بہنوں اور بہو بیٹیوں کو چیں بہ جبیں نہیں ہونا چاہیے اور نہ مردوں

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٣٨٨) صحيح مسلم (١/ ٣/ ٢٢٣، ٢٢٤) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٣٧) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٦) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٩٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩٢٤) الفتح الرباني (٢/ ٧٤) سنن الدارمي (٧٦٣) طبع دار الكتاب العربي.

کے لیے اس سلسلے میں ضرورت سے زیادہ شرمیلا پن مناسب ہے۔

شرم و حیا اور علم:

شرم و حیا کی حدود کو اتنا بھی تنگ نہ کر دیا جائے کہ مسائلِ دین ہی اوجھل رہ جائیں۔ البتہ بعض مواقع پر تو شرم و حیا قابلِ تعریف ہے، جیسے اکابرین اور بڑوں کے سامنے احتراماً حیا کرنا، جو ایک شرعی مسئلہ ہے۔ وہ حیا مفردات القرآن میں امام راغب اصفہانی کے بقول ''انقباض النفس عن القبیح'' ہے کہ برائی سے نفسِ انسانی جو انقباض سا محسوس کرتا، اسے حیا کہا جاتا ہے۔

آگے فرماتے ہیں:

''وَهُوَ مِنْ خَصَائِصِ الْإِنْسَانِ لِيَرْتَدِعَ عَنْ إِرْتِكَابِ كُلِّ مَا يَشْتَهِي، فَلَا يَكُوْنَ كَالْبَهِيْمَةِ وَهُوَ مُرَكَّبٌ مِنْ جُبْنٍ وَعِفَّةٍ فَلِذٰلِكَ لَا يَكُوْنُ الْمُسْتَحِي فَاسِقاً''

''یہ حیا تو انسان کے خصائص میں سے ہے، تاکہ وہ ہر نفسانی خواہش کی تکمیل و ارتکاب سے رکا رہے اور کہیں حیوان نہ بن جائے۔ یہ شرعی حیا بزدلی اور پاکیزگی کا مجموعہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حیا دار شخص فاسق (کبائر کا ارتکاب کرنے والا اور کھلے عام برائی کرنے والا) نہیں ہوتا۔''

امام ابن قتیبہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''إِنَّ الْحَيَاءَ يَمْنَعُ صَاحِبَهٗ مِنَ ارْتِكَابِ الْمَعَاصِيْ كَمَا يَمْنَعُ الْإِيْمَانُ''

''حیا بھی انسان کو گناہوں کا ارتکاب کرنے سے اُسی طرح روکتی ہے، جیسے ایمان روکتا ہے۔''

صحیح بخاری و مسلم اور موطا امام مالک میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«اَلْحَيَاءُ مِنَ الْإِيْمَانِ»[1] ''حیا ایمان کا جزو ہے۔''

سنن ابن ماجہ میں ہے:

«اَلْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْإِيْمَانِ»[2] ''حیا ایمان کا ایک شعبہ ہے۔''

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٧٤) صحيح مسلم (١/ ٢/ ٦) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٠٩) الموطأ مع المسوى (٢/ ٤٦١) باب فضل الحياء.

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٨)

اسی طرح: «اَلْحَيَاءُ لَا يَأْتِي إِلَّا بِخَيْرٍ»[1] ’’حیا کا نتیجہ بھلائی ہی ہے۔‘‘ سے بھی وہی حیا مراد ہے۔

اگر کہیں ایسی صورتِ حال ہو کہ گناہ کا ارتکاب کرتے وقت حیا دامن گیر ہو اور وہ گناہ سے رک جائے تو یہ قابلِ تعریف حیا ہے، جو اسلام میں مطلوب ہے، لیکن اگر حیا نام کا جذبہ کسی شرعی امر کے ترک کرنے کا موجب بن رہا ہو تو وہ حیا شرعی نہیں، بلکہ حیا کے نام سے ضعف و مداہنت ہے، جو قابلِ مذمت ہے اور اس کی حدود دراصل کبر ونخوت سے جا ملتی ہیں۔ اس شرم و تکبر سے ملے جلے جذبۂ مذمومہ کا نتیجہ حصولِ علم سے پہلو تہی، بلکہ محرومی تک پہنچ جاتا ہے۔ صحیح بخاری کے ایک ترجمۃ الباب میں تعلیقاً اور ’’حلية الأولياء لأبي نعيم‘‘ میں صحیح سند سے موصولاً مروی حضرت امام مجاہد رحمہ اللہ کا ارشاد ہے:

’’لَا يَتَعَلَّمُ الْعِلْمَ مُسْتَحْيٍ وَّلَا مُتَكَبِّرٌ‘‘[2]

’’شرم و حیا اور تکبر کرنے والا شخص علم نہیں سیکھ سکتا۔‘‘

جن لوگوں کو علمِ دین کا حصول اور روز مرہ زندگی کے مسائل کی معرفت عزیز تھی، وہ مرد تو کجا عورتیں تک خود ایسے ایسے مسائل پوچھ لیا کرتی تھیں کہ آج واقعی وہ ان کی بڑی جرأت معلوم ہوتی ہے، لیکن وہ جرأت مذموم بھی نہیں تھی، بلکہ اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کی تعریف کی ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں تعلیقاً اور صحیح مسلم میں موصولاً مروی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

’’نِعْمَ النِّسَآءُ نِسَآءُ الْأَنْصَارِ، لَمْ يَمْنَعْهُنَّ الْحَيَاءُ أَنْ يَّتَفَقَّهْنَ فِي الدِّيْنِ‘‘[3]

’’بہترین عورتیں انصارِ مدینہ کی عورتیں ہیں۔ (نام نہاد) حیا نے انھیں تفقہ فی الدین (علمِ دین) کے حصول سے نہیں روکا۔‘‘ رضي الله عنهن و أرضا هن.

امید ہے کہ بات پوری واضح ہوگئی ہوگی، تو آیئے اب آگے چلتے ہیں۔

---

[1] فتح الباري (۱/ ۷۴۔ ۷۵)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (۱/ ۲۲۸)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (۱/ ۲۲۸) مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (۷۱۲) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۰۸) و سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٤٢)

5- خروجِ مذی:

نواقضِ وضو میں سے "مَا خَرَجَ مِنَ السَّبِيْلَيْنِ" کے تحت ہی یہ بھی آتی ہے، لیکن یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ جماع و احتلام کی شکل میں جو مادہ منویہ (لذّت، شہوت اور ٹپک کے ساتھ) نکلتا ہے، جس سے انسان کی تخلیق ہوتی ہے، اس (منی) کے خروج سے تو غسل واجب ہو جاتا ہے۔ خواہ وہ خروج مذکورہ فطری طریقوں سے ہو یا غیر فطری ذرائع سے، اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔

نواقضِ وضو میں سے ''مذی'' سے مراد لیس دار مادے کا وہ قطرہ ہے، جو ملاعبت یعنی بوس و کنار کے نتیجے میں عضوِ تناسل سے نمودار ہوتا ہے۔ یہ نوجوان اور طاقتور شخص کے ساتھ خاص ہے۔ اس کے خروج سے غسل واجب نہیں ہوتا، بلکہ اس کے بعد صرف استنجا اور وضو کر کے نماز ادا کی جا سکتی ہے، جیسا کہ بخاری شریف و مسلم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كُنْتُ رَجُلًا مَذَّاءً فَأَمَرْتُ الْمِقْدَادَ أَنْ يَّسْأَلَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ... فِيْهِ الْوُضُوْءُ»[1]

''میں بکثرت مذی والا آدمی تھا تو میں نے حضرت مقداد رضی اللہ عنہ سے کہا کہ وہ نبیِ اکرم ﷺ سے اس کے بارے میں حکم پوچھیں، (تو نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:) اس میں وضو ہے۔''

بخاری شریف ہی کی ایک دوسری روایت میں ہے:

«تَوَضَّأْ وَاغْسِلْ ذَكَرَكَ»

مسلم شریف میں تقدیم و تاخیر کے ساتھ یوں مذکور ہے:

«اِغْسِلْ ذَكَرَكَ وَتَوَضَّأْ» ''قضیب کو دھو لو، یعنی استنجا کر لو اور پھر وضو کر لو۔''

معنیٰ دونوں کا ایک ہی ہے، البتہ مسلم شریف میں ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

اس حدیث میں تو صرف اتنا ہی مذکور ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کو مذکورہ مسئلہ پوچھنے کے لیے بھیجا، جب کہ صحیح بخاری ہی میں ایک دوسری روایت میں اس کا سبب بھی مذکور ہے۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«لِمَكَانِ ابْنَتِهِ»[2] ''آپ ﷺ کی بیٹی میری زوجیت میں ہونے کی وجہ سے۔''

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٢٣٠) صحيح مسلم مع شرح النووي (١/ ٣ / ١٢١، ٢١٣) بلوغ المرام مع السبل (١/ ١/ ٦٥ بيروت)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٣٧٩)

ایک اور روایت میں ہے: ”لِمکَانِ فَاطِمَۃَ“ ”فاطمہ کی وجہ سے۔“

مطلب یہ کہ نبیِ اکرم ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں تھیں اور سُسر و داماد کے باہمی حساس رشتے کی بنا پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود مذکورہ مسئلہ پوچھنے کے بجائے اپنے ساتھی حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کو بھیجا، اس رشتے کی نزاکت کا یہی تقاضا تھا کہ وہ اس مسئلے میں حیا کے پیشِ نظر یہی طریقہ اپنائیں۔ ”المجموع شرح المهذب“ میں امام نووی رحمہ اللہ نے اور فتح الباری میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ادب کا تقاضا یہی تھا کہ داماد اپنے سُسرالی رشتے داروں سے ایسے امور کے متعلق گفتگو نہ کرے۔ یہ شک ہوسکتا تھا کہ اس مادے کا خروج شاید صرف مردوں ہی میں ہو، عورتوں میں نہ ہو، لیکن امام نووی رحمہ اللہ نے اس شک کو بھی رفع کر دیا ہے، چنانچہ ”المجموع“ ہی میں موصوف نے لکھا ہے کہ اس مادے کا خروج صرف مرد کے ساتھ خاص نہیں بلکہ عورت تو اس معاملے میں مرد سے بھی آگے ہے۔[1]

سنن ابی داود اور مسند احمد میں اس حدیثِ علی رضی اللہ عنہ کی جو روایت ہے، اس میں یہ الفاظ بھی منقول ہیں:

«یَغْسِلُ ذَکَرَہُ وَأُنْثَیَیْہِ وَیَتَوَضَّأُ»

موطا امام مالک اور ابو داود ہی کی ایک دوسری حضرت عبد اللہ بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے:

«فَتَغْسِلُ مِنْ ذٰلِكَ فَرْجَكَ وَأُنْثَیَیْكَ وَتَوَضَّأْ وُضُوْءَكَ لِلصَّلَاۃِ»[2]

ان دونوں روایتوں کا مفہوم ایک ہی ہے: ”ایسے میں استنجا کرتے وقت (مرد) شرم گاہ کے ساتھ اپنے ہی خصیے بھی دھوئے اور پھر وضو کرے۔“

خروجِ مذی سے متعلقہ احادیث:

نواقضِ وضو میں سے مذی کا ذکر ہو رہا ہے اور آخر میں دو روایتیں سنن ابی داود وغیرہ کے حوالے سے ذکر کی جاچکی ہیں، جن میں مذی کے خروج پر استنجا کرنے اور مردوں کے لیے خصیے بھی

[1] الفروع (٢/ ١٥١۔ ١٥٢)

[2] مختصر السنن للمنذري (١/ ١٤٨) جامع الأصول (٨/ ١١٢) تحقيق فتح الباري (١/ ٣٨٠)

دھونے کا ذکر ہے۔ یہ مسئلہ تو فی ذاتہٖ صحیح ہے، کیوں کہ دوسری روایت سے ثابت ہے، البتہ ان دونوں میں سے پہلی روایت مطعون ہے، کیوں کہ وہ ''عروة عن علي'' کے سلسلۂ سند سے مروی ہے جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے عروہ کا سماع یعنی حدیث سننا ثابت نہیں، جیسا کہ امیر صنعانی نے ''سبل السلام'' میں لکھا ہے۔[1]

لیکن علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے ''معالم السنن'' کی تہذیب میں ذکر کیا ہے کہ خصیوں کے لفظ والی حدیث صحیح ابوعوانہ میں مروی ہے اور اس کی سند میں عروہ بھی نہیں، بلکہ وہ متصل سند ہے۔[2]

''التلخیص الحبیر'' میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ عبیدہ عن علی کی سند والی حدیث پر کوئی طعن نہیں ہے اور حضرت عبد اللہ بن سعد انصاری رضی اللہ عنہ والی دوسری حدیث کی سند کو بھی ضعیف کہا گیا ہے، اگرچہ امام ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔[3]

امام ترمذی رحمہ اللہ کا اسے حسن قرار دینا غالباً شواہد کی بنا پر ہوگا اور صحیح ابی عوانہ والی حدیث اس کی بہترین شاہد ہے اور بقول امیر صنعانی، جب مجموعی طور پر حدیث کی صحت ثابت ہوگئی تو پھر اسے قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہونا چاہیے۔

''فتح الباري'' میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے خصیوں کو دھونے کی حکمت یہ ذکر کی ہے کہ اس طرح پانی کی برودت اور ٹھنڈک کے نتیجے میں مذی کا خروج رک جائے گا۔ گویا یہ ایک طبی نقطہ ہے۔[4]

ان احادیث میں مذکور ''دھونے'' کے لفظ سے استدلال کرتے ہوئے امام ابن دقیق العید رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مذی کو پیشاب پر محمول نہیں کیا جا سکتا کہ صرف ڈھیلے کے استعمال ہی پر کفایت کی جاسکے، بلکہ اس کے لیے پانی سے استنجا کرنا ہی ضروری ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح صحیح مسلم میں تو اسے ہی صحیح کہا ہے، جب کہ دوسری کتب میں اسے بھی پیشاب پر محمول کرتے ہوئے ڈھیلے کے استعمال کو کافی لکھا ہے، لیکن فتح الباری کے محقق شیخ ابن باز اور دیگر علما نے سنن ابی داود اور مسند احمد والی حدیث کے پیشِ نظر مذی کو دھونے کے ساتھ خاص کرنے میں امام ابن دقیق العید رحمہ اللہ کے قول کی

---

[1] سبل السلام (١/ ١/ ٦٥)

[2] تهذيب السنن (١/ ١٤٨۔ ١٤٩)

[3] التلخيص الحبير (١/ ١/ ١١٧)

[4] سبل السلام (١/ ١/ ٦٥) فتح الباري (١/ ٣٨١)

تائید کی ہے۔قضیب کو دھونے کے سلسلے میں بعض مالکیہ و حنابلہ نے دھونے کے لفظ کی حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے استیعاب کو واجب قرار دیا ہے، لیکن جمہور اہلِ علم نے معنیٰ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے استیعاب کو واجب نہیں کہا، کیوں کہ اسے دھونے کا موجب ایک چیز کا خروج ہے، لہٰذا اس کے خروج کی جگہ سے دوسرے حصے تک تجاوز کرنا واجب نہیں ہے۔[1]

اس کی تائید اسماعیلی کی روایت کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے:

«فَقَالَ: تَوَضَّأْ وَاغْسِلْهُ»

''آپ ﷺ نے فرمایا: وضو کرو اور (پہلے) اس (مذی) کو دھو دو۔''

«اِغْسِلْهُ» میں ہا کی ضمیر مذی کی طرف عائد ہے اور انہی احادیث سے مذی کی نجاست پر بھی استدلال کیا گیا ہے۔

6- ودی:

وہ گاڑھا، لیس دار اور سفید مادہ جو پیشاب سے متصل پہلے یا بعد میں دو ایک قطرے کی شکل میں خارج ہوتا ہے، اسے ''ودی'' کہا جاتا ہے۔ اس کے نکلنے پر بھی غسل کرنا واجب نہیں ہوتا، بلکہ ائمہ وفقہا نے اسے بھی مذی کے حکم میں شمار کیا ہے اور بالاتفاق اس پر استنجا اور وضو ہی کافی ہے۔[2]

سنن کبریٰ بیہقی اور سننِ اثرم میں بعض آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی پتا چلتا ہے کہ ودی پر صرف استنجا اور وضو ہی کافی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے منی، مذی اور ودی کے بارے میں فرمایا:

''فَالْمَنِيُّ مِنْهُ الْغُسْلُ، وَمِنْ هٰذَيْنِ الْوُضُوْءُ، يَغْسِلُ ذَكَرَهٗ وَيَتَوَضَّأُ''

''خروجِ منی پر تو غسل واجب ہے اور ان دونوں یعنی مذی و ودی پر قضیب کو دھونا اور وضو کرنا ہے۔''

دوسرا اثر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

''أَلْوَدِيُّ الَّذِيْ يَكُوْنُ بَعْدَ الْبَوْلِ، فِيْهِ الْوُضُوْءُ''[3]

---

[1] فتح الباري (١/ ٣٨٠)

[2] المجموع للنووي (٢/ ١٥٢) اور فتاویٰ علماے حدیث (١/ ٤٥) ملاحظہ فرمائیں۔

[3] بلوغ الأماني شرح و ترتيب مسند أحمد (٢/ ٧٦) سنن أثرم بحواله المغني (١/ ٢٣٣) بتحقيق التركى.

''ودی جو پیشاب کے بعد ہوتی ہے، اس پر صرف وضو ہی ہے۔'' (یعنی استنجا و وضو ہے غسل واجب نہیں ہے)۔''

جریان اور لیکوریا، یا سیلان الرحم:

یہاں یہ بھی واضح کر دیں کہ بعض مردوں کو سلس المذی کا مرض ہوتا ہے کہ انھیں مذی کے قطرات مسلسل آتے رہتے ہیں، جسے ''جریان'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اس بیماری والے مردوں کو بھی استحاضہ والی عورت کے حکم میں شمار کیا گیا ہے، لہٰذا ان پر بھی غسل نہیں، بلکہ محض استنجا اور وضو لازم ہے۔[1]

جو وہ ہر نماز کے ساتھ کریں گے۔ یہ ایک وضو سے ایک سے زیادہ نمازیں ادا نہیں کر سکتے اور بالائی کپڑوں کو صاف رکھنے کے لیے انڈرویئر استعمال کریں، جیسا کہ تقطیر البول یا سلس البول کے ضمن میں ذکر گزر چکا ہے۔

مردوں کی اس بیماری کی طرح بعض عورتوں کو بھی ایسی ہی بیماری ہوتی ہے، جسے سیلان الرحم یا لیکوریا کہا جاتا ہے۔ اس مرض میں مبتلا خواتین کی شرم گاہ سے ایک سفید رطوبت سی خارج ہوتی رہتی ہے۔ اس کا حکم بھی استحاضے اور جریان والا ہی ہے کہ ایسی خواتین ہر نماز کے ساتھ نیا وضو کر لیا کریں اور کپڑوں کی نظافت وطہارت کا اہتمام رکھیں۔

سلس الاحتلام:

ایک اور صورت جس کا نواقضِ وضو سے تو تعلق نہیں، البتہ ہمارے موضوع کے قریبی متعلقات میں سے ہے، وہ صورت یہ ہے کہ کسی کو سلس الاحتلام کا مرض ہو اور ہر رات سونے میں بدخوابی ہو جاتی ہو تو ایسا شخص اٹھ کر غسل کرے، یہ اس پر واجب ہے اور پھر نمازیں وغیرہ ادا کرتا رہے، جو عام فہم سی بات ہے اور اگر وہ حج کرنا چاہے تو بھی ممکن اور جائز ہے، اس کی صورت بھی حیض والی عورت کی طرح ہے مگر اس بیماری والا شخص روزانہ غسل کر لیا کرے اور تمام اعمالِ حج میں شامل رہے اور طہارت کی حالت میں طواف بھی کر لیا کرے۔[2]

---

[1] فتح الباري (١/ ٣٨١)

[2] فتاویٰ علماے حدیث (١/ ٧٠۔ ٧١)

7- خونِ استحاضہ:

نواقضِ وضو کے ضمن میں "مَا خَرَجَ مِنَ السَّبِيْلَيْنِ" سے متعلقہ نواقض کا ذکر چل رہا ہے تو انہی میں سے خونِ استحاضہ بھی ہے، جس کا بار بار ذکر گزرا ہے۔ خونِ حیض تو غسل کا موجب ہے، لیکن خونِ استحاضہ کے لیے صرف وضو ہی کافی ہے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم، ابن ماجہ کے سوا سننِ اربعہ، صحیح ابن حبان اور موطا امام مالک رحمہ اللہ کے حوالے سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش کے استحاضے سے تعلق رکھنے والی حدیث گزری ہے، جس میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے « ثُمَّ تَوَضَّئِيْ لِكُلِّ صَلَاةٍ...» فرما کر "ہر نماز کے ساتھ وضو کرنے کا حکم فرمایا تھا۔" جیسا کہ سلس البول کے ضمن میں اس حدیث کی نص اور انڈر رویئر کے استعمال کا پتا دینے والی احادیث کی طرف اشارہ گزرا ہے۔ ان احادیث کی بنا پر جمہور اہلِ علم کے نزدیک ایامِ حیض کے بہ قدرِ وقت گزرنے کے بعد اور غسلِ حیض کے بعد آتا رہنے والا خون ناقضِ وضو ہے، موجبِ غسل نہیں۔ ایسی عورت کے لیے ہر نماز کے ساتھ وضو کرنا واجب ہے، ایک وضو سے وہ متعدد نمازیں نہیں پڑھ سکتی۔[1]

8- شرم گاہ کو چھونا:

نواقضِ وضو میں سے آٹھواں ناقض "مَا خَرَجَ مِنَ السَّبِيْلَيْنِ" سے تو نہیں، البتہ سبیلین سے تعلق رکھتا ہے اور وہ ہے شرم گاہ کو چھونا۔ اس کے ناقض یا غیر ناقض ہونے کے بارے میں اہلِ علم کی دو الگ الگ آرا ہیں:

پہلی رائے:

جمہور اہلِ علم کی رائے یہ ہے کہ شرم گاہ کو چھونا ناقض ہے اور اس سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ خصوصاً جب کہ درمیان میں کوئی چیز حائل نہ ہو اور یہ چھونا بھی شہوت کے باعث ہو، ان کا استدلال متعدد احادیث سے ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایک حدیث سنن اربعہ، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، مسند احمد و شافعی، موطا امام مالک، مستدرک حاکم اور منتقیٰ ابن جارود میں متعدد طُرق سے مروی ہے، جسے کثیر محدثینِ کرام نے صحیح قرار دیا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے اسے اس موضوع کی صحیح ترین

[1] بلوغ الأماني شرح مسند أحمد (٢/ ٧٦)

حدیث قرار دیا ہے۔ محدّثین کے اقوال کی تفصیل میں جانے کے بجائے ہم چند کتب کے حوالے دے دیتے ہیں۔ تفصیل درکار ہو تو وہ "التلخيص الحبير لتخريج أحاديث الرافعي الكبير" (٢/ ٢/ ١٢٢۔ ١٢٣) "الفتح الرباني ترتيب و شرح مسند أحمد الشيباني" (٢/ ٨٦۔ ٨٧) "سنن الترمذي مع تحفة الأحوذي (١/ ٢٧٠، ٢٧٣) "نيل الأوطار" (١/ ١/ ١٩٧) "سبل السلام" (١/ ١/ ٦٧۔ ٦٨) ملاحظہ فرمائیں۔

یہ مذکورہ حدیث حضرت بسرہ بنت صفوان رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ مَسَّ ذَكَرَهُ فَلَا يُصَلِّي حَتّٰى يَتَوَضَّأَ»[1]

''جو شخص اپنے قضیب کو چھوئے تو وہ اس وقت تک نماز نہ پڑھے، جب تک وضو نہ کرلے۔''

اس حدیث کی تائید میں دیگر متعدد احادیث بھی مروی ہیں، جو امیر صنعانی صاحبِ سبل السلام کے بقول سترہ صحابہ وصحابیات رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں، ان میں سے بعض میں اس بات کی صراحت بھی پائی جاتی ہے کہ اس معاملے میں مرد و زن اور قبل و دبر کا کوئی فرق نہیں ہے۔ مثلاً حضرت اُمِ حبیبہ رضی اللہ عنہا سے سنن ابن ماجہ، بیہقی اور طحاوی میں مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ مَسَّ فَرْجَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ»[2] ''جس نے شرم گاہ کو چھوا، وہ وضو کرے۔''

اس حدیث میں لفظِ فرج عام ہے، جو امام مالک رحمہ اللہ کے نظریے کی تردید کرتی ہے، کیوں کہ انھوں نے مسِ فرج سے نقضِ وضو کو مردوں کے ساتھ خاص کیا ہے، نیز اس کی تردید سنن دارقطنی، بیہقی اور مسند احمد کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جو "عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده" کی سند سے مروی ہے، جس میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

«أَيُّمَا رَجُلٍ مَسَّ فَرْجَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ، وَأَيُّمَا امْرَأَةٍ مَسَّتْ فَرْجَهَا فَلْتَتَوَضَّأْ»[3]

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١/ ٣٧) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٧١، ٧٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٥٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٧٩) سنن الدارمي (٧٢٤، ٧٢٥) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٥٥٤) موارد الظمآن، رقم الحديث (٢١١، ٢١٢، ٢١٣)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٨١) المنتقى مع النيل (١/ ١/ ١٩٩) و صححه الألباني في الإوراء (١/ ١٥٠)

[3] المنتقى مع النيل (١/ ١/ ٢٠٠) الفتح الرباني (٢/ ٥٨) التلخيص الحبير (١/ ١/ ١٢٤) و صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٧٢٥)

''جو مرد اپنی شرم گاہ کو چھوئے، وہ وضو کرے اور جو عورت اپنی شرم گاہ کو چھوئے، وہ وضو کرے۔''

ترمذی کی کتاب العلل کے حوالے سے امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''نیل الأوطار'' میں لکھا ہے کہ اس کے بارے میں امام بخاری رحمہ اللہ نے کہا ہے:

''وھذا عندي صحیح'' ''یہ حدیث میرے نزدیک صحیح ہے۔''

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے ''المحلیٰ'' (۱/ ۱/ ۲۳۸) میں کہا ہے کہ شرم گاہ صرف قُبل ہی ہے، دُبر نہیں۔ لیکن امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''نیل الأوطار'' میں اس نظریے کی تردید کی اور کہا ہے کہ قبل ہو یا دُبر، دونوں ہی شرم گاہ (فرج) ہیں۔

ایک حدیث سے اس بات کی وضاحت بھی ہوتی ہے کہ اگر کوئی کپڑا وغیرہ حائل نہ ہو، تب وضو ٹوٹتا ہے، ورنہ نہیں، یعنی اگر کپڑے کے اوپر سے ہاتھ لگ جائے تو یہ ناقضِ وضو نہیں ہے، جیسا کہ صحیح ابن حبان، مسند احمد، مستدرکِ حاکم، سنن بیہقی اور معجم طبرانی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

﴿مَنْ أَفْضَىٰ بِیَدِہٖ إِلٰی ذَکَرِہٖ لَیْسَ دُوْنَہٗ سِتْرٌ فَقَدْ وَجَبَ عَلَیْہِ الْوُضُوْءُ﴾[1]

''جس نے اپنا ہاتھ کسی رکاوٹ کے بغیر قضیب تک پہنچایا تو اس پر وضو واجب ہے۔''

''الإفضاء'' کے لفظ سے استدلال کرتے ہوئے شافعیہ نے کہا ہے کہ وضو صرف تب ٹوٹے گا، جب شرم گاہ کو صرف ہاتھ کی اندرونی جانب ہتھیلی کی جانب سے چھوا گیا، لیکن علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے ان کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ہاتھ کی اندرونی اور بیرونی دونوں جانب کے لیے برابر ہے اور شوافع کی یہ تفریق قرآن وسنت، اجماعِ امت، کسی صحابی کے قول، قیاس اور صحیح رائے کسی سے بھی ثابت نہیں۔[2]

اسی موضوع کی دیگر احادیث کی تخریج حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''التلخیص الحبیر'' میں، امام ترمذی نے اپنی سنن میں اور علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ نے ''تحفۃ الأحوذي'' میں کر دی ہے۔ لہٰذا

---

[1] موارد الظمآن (۲۵، ۲۷) رقم الحدیث (۲۱۰) المنتقی (۱/ ۱/ ۱۹۹) و الصحیحۃ (۳/ ۲۳۷) صحیح الجامع (۳۶۲)

[2] نیل الأوطار (۱/ ۱/ ۱۹۹) محلی ابن حزم (۱/ ۱/ ۲۳۷۔ ۲۳۸) التلخیص الحبیر (۱/ ۱/ ۱۲۶)

انھیں وہیں اور دیگر کتب میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ان سب احادیث کے مجموعی مفاد کا خلاصہ یہ ہے کہ شرم گاہ کو ہاتھ اندرونی جانب سے لگے یا بیرونی سے، شرم گاہ میں قبل ہو یا دبر اس معاملے میں مرد ہو یا عورت، کسی پردے یا حائل کپڑے کے بغیر ہو، وضوٹوٹ جاتا ہے۔ تین مکاتبِ فکر کے ائمہ امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے علاوہ جمہور ائمہ وفقہا کا یہی مسلک ہے۔ مالکیہ اور شافعیہ میں جو تفصیل ہے، وہ بھی ذکر کی جاچکی ہے۔ امام اوزاعی اور اسحاق بن راہویہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ ”کتاب الاعتبار للحازمي“ (ص: ٤٠) کے حوالے سے علامہ مبارکپوری نے ”تحفة الأحوذي“ میں بارہ کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور گیارہ معروف تابعین رحمہم اللہ کے اسمائے گرامی نام بہ نام ذکر کیے ہیں، جو مسِ فرج سے وضوٹوٹنے کے قائل ہیں۔[1]

دوسری رائے:

مسِ فرج کے بارے میں ایک دوسرا مسلک یہ ہے کہ اس سے وضونہیں ٹوٹتا۔ یہ امام ابوحنیفہ، ابن المبارک، یحییٰ بن معین اور بعض دیگر فقہا رحمہم اللہ کا مسلک ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ”کتاب الاعتبار“ (ص ٤٠) کی رو سے حضرت علی بن ابی طالب، عمار بن یاسر، عبد اللہ بن مسعود اور ایک روایت کے مطابق سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم سے بھی اسی کی روایت ملتی ہے اور تابعین میں سے سعید بن مسیّب، سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی، ربیعہ بن عبدالرحمٰن اور سفیان ثوری رحمہم اللہ سے یہی مسلک منقول ہے۔[2]

اس مسلک والوں کا استدلال سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارقطنی اور مسند احمد میں طلق بن علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے ہے، جس میں مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ جو شخص اپنی شرم گاہ (قضیب) کو چھولے تو کیا اس پر وضو ہے؟ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِنَّمَا هُوَ بُضْعَةٌ مِنْكَ » وَلَفْظُ التِّرْمَذِيِّ: « وَهَلْ هُوَ إِلَّا مُضْغَةٌ مِّنْهُ أَوْ بُضْعَةٌ مِّنْهُ »[3]

---

[1] تحفة الأحوذي (١/ ٢٧٣)

[2] نيل الأوطار (١/ ١/ ١٩٨) سنن الترمذي مع تحفة الأحوذي (١/ ٢٧٥)

[3] صحيح سنن أبي داود للألباني (١/ ٣٧) سنن الترمذي مع التحفة (١/ ٢٧٤) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٨٣) نيل الأوطار (١/ ١/ ١٩٨) تخريج المغني (١/ ٢٤١)

’’کیا وہ اسی کا ایک حصہ نہیں ہے۔‘‘

گویا استفہامِ انکاری سے واضح کر دیا گیا ہے کہ وہ بھی تو جسم کا ایک حصہ ہی ہے، لہٰذا اس کو چھونے پر وضو کیوں؟

امام ابن حبان، طبرانی اور ابن حزم نے اس حدیث کو بھی صحیح قرار دیا ہے، بلکہ فلاس، علی بن مدینی اور طحاوی نے اس حدیث کو حدیثِ بسرہ سے احسن قرار دیا ہے، جب کہ امام شافعی، ابو حاتم، ابو زرعہ، دار قطنی، بیہقی اور ابن الجوزی رحمہم اللہ نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے اور امام ابن حبان، طبرانی، ابن العربی، حازمی اور دیگر ائمہ نے اس حدیث کو حدیثِ بسرہ رضی اللہ عنہا کی وجہ سے منسوخ قرار دیا ہے۔[1]

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اسی مفہوم کی ایک اور حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے، جو حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور وہ حدیث سنن ابن ماجہ میں ہے، مگر اس کی سند میں دو راوی متکلم فیہ ہیں۔ ایک جعفر بن زبیر ہے، جس کو متروک قرار دیا گیا ہے اور دوسرا راوی قاسم ہے، جو ضعیف ہے، حتیٰ کہ خود امام طحاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ امام بخاری، نسائی اور دار قطنی نے جعفر بن زبیر کو متروک قرار دیا اور قاسم ضعیف ہے۔ شیخ محمد فواد عبدالباقی اور علامہ بوصیری کے بقول اس حدیث کی سند میں جعفر بن زبیر ہے، جس کی مروی حدیث کو ترک کرنے پر محدّثین کا اتفاق ہے اور ان کے نزدیک وہ متہم ہے۔ اسی موضوع کی ایک تیسری روایت حضرت عصمہ بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، مگر اسے بھی امام زیلعی رحمہ اللہ نے ضعیف کہا ہے۔[2]

تو گویا اس موضوع کی صرف ایک ہی حدیث ہے، جسے بعض محدّثین نے صحیح اور بعض نے ضعیف قرار دیا ہے۔

مسلکِ اوّل کی ترجیح کی وجوہات:

پہلے مسلک کی تائید میں حضرت بسرہ رضی اللہ عنہا کے علاوہ بھی متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی صحیح اور صالح احادیث موجود ہیں، جن کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اگر اس اختلافِ رائے کو صرف دو حدیثیں سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو ایک طرف حدیثِ بسرہ رضی اللہ عنہا ہے اور دوسری طرف حدیثِ طلق رضی اللہ عنہ۔

---

[1] التلخيص لابن حجر (١/ ١/ ١٢٥) نيل الأوطار (١/ ١/ ١٩٨) التحفة (١/ ٢٨٠)

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: سنن الترمذي مع تحفة الأحوذي (١/ ٢٧٥) سنن ابن ماجه بتحقيق محمد فؤاد (١/ ١٦٣)

امام طحاوی نے فلاس اور علی بن مدینی کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہا ہے کہ انھوں نے حدیثِ طلق رضی اللہ عنہ کو حدیثِ بسرہ رضی اللہ عنہا سے اَحسن و اَثبت قرار دیا ہے۔

1 دیگر محدّثین نے حدیثِ بسرہ رضی اللہ عنہا کو اَثبت، اَقویٰ اور اَرجح قرار دیا ہے۔

2 امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیثِ بسرہ رضی اللہ عنہا کے حدیثِ طلق رضی اللہ عنہ سے راجح ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ امام بخاری و مسلم نے نہ تو حدیثِ طلق رضی اللہ عنہ روایت کی ہے اور نہ اس کے راویوں میں سے کسی راوی سے احتجاج کیا ہے، جب کہ حدیثِ بسرہ کے تمام راویوں سے امام بخاری اور مسلم نے احتجاج کیا ہے، الّا یہ کہ انھوں نے اس حدیث کی تخریج اپنی صحیحین میں نہیں کی اور اس کی وجہ بھی کوئی خاص نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسماعیلی نے کہا ہے کہ اس حدیثِ بسرہ رضی اللہ عنہا کی نظیر صحیح بخاری میں موجود ہے، لہٰذا ان پر اس حدیث کا اپنی صحیح میں لانا لازم تھا۔[1]

3 حدیثِ بسرہ رضی اللہ عنہا والے مسلک کے راجح ہونے کی تیسری وجہ یہ بھی ہے کہ حضرت طلق رضی اللہ عنہ جن سے عدمِ نقض والی حدیث مروی ہے، خود انھی سے معجم طبرانی میں اس کے برعکس اور حدیثِ بسرہ رضی اللہ عنہا کی موید روایت بھی مروی ہے، جس میں مذکور ہے:

﴿مَنْ مَّسَّ فَرْجَهٗ فَلْيَتَوَضَّأْ﴾[2] ''جو اپنی شرم گاہ کو چھوئے تو وہ وضو کرے۔''

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اور امام شوکانی رحمہ اللہ نے امام طبرانی سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے اس حدیثِ طلق رضی اللہ عنہ کو صحیح قرار دیا ہے۔[3]

مزید لکھا ہے: یوں لگتا ہے کہ حضرت طلق رضی اللہ عنہ نے شروع شروع میں تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے وہی حدیث سنی ہو، جس میں وضو نہ ٹوٹنے کا تذکرہ ہے اور پھر بعد میں کبھی یہ دوسری حدیث بھی سنی ہو، جو حدیثِ بسرہ رضی اللہ عنہا کے موافق ہے، جس کی رو سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ امام طبرانی رحمہ اللہ کا مذکورہ کلام نقل کرنے کے بعد امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''نیل الأوطار'' میں لکھا ہے:

''فَالظَّاهِرُ مَا ذَهَبَ إِلَيْهِ الْأَوَّلُوْنَ''[3]

---

[1] التلخيص الحبير (١/ ١/ ١٢٥) و تحفة الأحوذي (١/ ٢٧٦) سبل السلام (١/ ١/ ٦٨)

[2] نيل الأوطار (١/ ١/ ١٩٨)

[3] التلخيص الحبير (١/ ١/ ١٢٤) نيل الأوطار (١/ ١٩٨)

[4] نيل الأوطار (١/ ١/ ١٩٨)

’’جن لوگوں کا ذکر پہلے ہوا ہے، ان کا مسلکِ نقض ہی ظاہر ہے۔‘‘

علامہ امیر صنعانی نے ’’سبل السلام شرح بلوغ المرام‘‘ میں لکھا ہے کہ حدیثِ بسرہ رضی اللہ عنہا اس کے صحیح کہنے والوں کی کثرت اور شواہد کی کثرت کی بنا پر زیادہ راجح ہے۔[1] اس بات کا اعتراف بقول علامہ مبارکپوری خود بعض علمائے احناف نے بھی کیا ہے (موصوف کا اشارہ علامہ عبدالحی لکھنوی کی طرف ہے) انھوں نے موطا امام محمد رحمہ اللہ کے حاشیے ’’التعليق الممجد‘‘ میں کہا ہے:

’’اَلْإِنْصَافُ فِيْ هٰذَا الْبَحْثِ أَنَّهٗ إِنِ اخْتِيْرَ طَرِيْقُ التَّرْجِيْحِ فَأَحَادِيْثُ النَّقْضِ كَثْرَةٌ وَقَوَّةٌ‘‘

’’اس بحث میں انصاف کی بات یہ ہے کہ اگر اس میں ترجیح کا راستہ اختیار کیا جائے تو وضو کے ٹوٹ جانے کی احادیث ہی زیادہ اور قوی ہیں۔‘‘

شرح وقایہ کے حاشیہ ’’السعاية‘‘ میں مولانا لکھنوی موصوف ہی لکھتے ہیں:

’’إِنَّ أَحَادِيْثَ النَّقْضِ أَكْثَرُ وَأَقْوٰى مِنْ أَحَادِيْثِ الرُّخْصَةِ‘‘[2]

’’وضو ٹوٹنے پر دلالت کرنے والی احادیث، رخصت والی احادیث سے اَکثر اور اَقوی ہیں۔‘‘

4 انھی وجوہاتِ ترجیح میں سے چوتھی وجہ یہ بھی ہے کہ بعض کبار محدثینِ کرام نے حدیثِ طلق رضی اللہ عنہ کو منسوخ اور حدیثِ بسرہ رضی اللہ عنہا کو اس کی ناسخ کہا ہے، چنانچہ امام ابن حبان نے اپنی صحیح میں لکھا ہے کہ حدیثِ طلق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کی کثیر تعداد کو اس وہم میں مبتلا کر دیا ہے کہ یہ حدیثِ بسرہ رضی اللہ عنہ کے معارض و مخالف ہے، حالاں کہ ایسا نہیں ہے، کیوں کہ وہ تو حدیث ہی منسوخ ہے، کیوں کہ حضرت طلق بن علی رضی اللہ عنہ کی نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آمد ہجرت کے پہلے سال میں تھی، جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان مسجدِ نبوی کی تعمیر فرما رہے تھے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ۷ھ میں مسلمان ہوئے، گویا حضرت طلق رضی اللہ عنہ والی حدیث سے سات سال بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث صادر ہوئی۔ امام صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ حضرت طلق رضی اللہ عنہ نے ہجرت کے پہلے سال ہی اپنے وطن واپسی اختیار کر لی تھی اور ان کا دوبارہ مدینہ طیبہ آنا بھی ثابت نہیں، جو شخص ان کی

---

[1] سبل السلام (١/ ١/ ٦٨)

[2] دیکھیں: تحفة الأحوذي (١/ ٢٧٦)

دوبارہ واپسی کا دعویٰ کرے، وہ کسی صریح دلیل سے کرے، مگر یہ کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے؟[1]

امام حازمی نے اپنی کتاب "الاعتبار" میں کافی تفصیل کے ساتھ پہلے حدیثِ طلق رضی اللہ عنہ کی سند میں نکارت اور روایت میں ضعف و رکاکت ثابت کی ہے اور پھر حدیثِ طلق رضی اللہ عنہ کو منسوخ اور حدیث بسرہ رضی اللہ عنہا کو ناسخ ثابت کیا ہے، اس نسخ کو یہ بات اور بھی یقینی کر دیتی ہے کہ خود حضرت طلق رضی اللہ عنہ ہی سے مسِ فرج سے نقضِ وضو کی حدیث بھی مروی ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت طلق رضی اللہ عنہ دونوں حالتوں کے شاہد ہیں، انھوں ہی نے ناسخ حدیث بیان کی ہے، جب کہ انھوں نے پہلے والی منسوخ حدیث بھی بیان کی تھی۔

امام حازمی کے جس کلام کا خلاصہ ہم نے ذکر کیا ہے، اسے نقل کرنے کے بعد علمائے احناف میں سے علامہ عبدالحی لکھنوی نے شرح وقایہ کے حاشیہ شرح "السعایة" میں لکھا ہے:

"هٰذَا تَحْقِيقٌ حَقِيقٌ بِالْقُبُولِ"

"یہ تحقیق اس بات کی مستحق ہے کہ اسے قبول کیا جائے۔"

موصوف مزید لکھتے ہیں:

"جانبین کے دلائل پر نظر ڈالنے کے بعد یہ بات متحقق ہو جاتی ہے کہ نقضِ وضو پر دلالت کرنے والی احادیث، عدم والی احادیث سے اکثر اور اقوی ہیں اور رخصت یا عدمِ نقض والی احادیث پہلے کی ہیں۔ اگرچہ اس بات کا یقینی ثبوت کوئی نہیں کہ حدیثِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی مرویات مراسیلِ صحابہ میں سے ہیں، لیکن ظاہر وہی ہے۔ لہٰذا نقضِ وضو کو اختیار کرنے ہی میں زیادہ احتیاط ہے اور اگرچہ یہ مسئلہ ہر اعتبار سے قیاس کے خلاف ہے، لیکن جب حدیث آ جائے تو پھر وہاں قیاس کی مجال ہی کیا ہے؟"

آگے علامہ لکھنوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"بعض کبار صحابہ مثلاً حضرت عبداللہ بن عباس، علی اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کا عدمِ نقض کا قائل ہونا مرفوع احادیث کے صحیح سند سے ثابت ہو جانے کے بعد قادح نہیں رہتا۔ ان کی طرف سے یہ عذر ہو سکتا ہے کہ انھیں حضرت طلق رضی اللہ عنہ والی حدیث اور اسی مفہوم کی

---

[1] دیکھیں: المغني (١/ ٢٤٢) تحفة الأحوذي (١/ ٢٧٩)

دیگر روایات تو پہنچی ہوں، لیکن اس حکم کو منسوخ کرنے والی احادیث نہ پہنچی ہوں۔ اگر انھیں یہ ناسخ حدیث پہنچی ہوتی، تو وہ ضرور اسی حکم کو اختیار فرما لیتے اور یہ ناسخ حدیث کا نہ پہنچنا کوئی بعید از امکان بات بھی نہیں ہے، کیوں کہ نماز میں بہ وقتِ رکوع دونوں ہاتھوں کو باہم جوڑ کر گھٹنوں کے مابین رکھنا، جسے تطبیق کہا جاتا ہے، اس کے منسوخ ہو جانے کی خبر صحابہ کی ایک جماعت کو پہنچ گئی، لیکن حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو نہیں پہنچی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کثرت سے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں رہنے کے باوجود عمر بھر وہ تطبیق پر قائم رہے (یعنی رکوع کے وقت گھٹنوں کو پکڑ کر رکھنے کے بجائے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر دونوں گھٹنوں کے درمیان رکھا کرتے تھے)۔ لہٰذا احادیثِ نقض کا ان تک نہ پہنچنا کوئی انہونی بات بھی نہیں ہے۔''[1]

محلیٰ ابن حزم میں لکھا ہے کہ حدیثِ طلق رضی اللہ عنہ سند کے اعتبار سے تو صحیح ہے، لیکن اس میں قائلینِ عدمِ نقض کے لیے کئی وجوہات کی بنا پر کوئی دلیل و حجت نہیں ہے۔ ان میں سے پہلی وجہ یہ ہے کہ حدیثِ طلق رضی اللہ عنہ میں مسِ فرج سے وضو ٹوٹنے پر دلالت کرنے والی حدیث سے پہلے کے زمانے میں لوگوں کے عمل کا ذکر ہے (کہ پہلے وہ اس سے وضو کا ٹوٹنا نہیں جانتے تھے) اور اس میں کوئی شک نہیں اور اگر ایسا ہی ہے تو پھر اس حدیث کا حکم منسوخ ہو چکا ہے اور نسخ پر وہ ارشاد دلیل ہے، جس میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ جب ایک چیز کے ناسخ اور دوسری کے منسوخ ہونے کا یقین ہو تو پھر یقینی ناسخ کو ترک کرنا اور یقینی منسوخ کو اختیار کرنا ہرگز جائز و حلال نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ: «هَلْ هُوَ إِلَّا بِضْعَةٌ مِنْكَ؟» ''کیا وہ تیرے جسم کا ہی ایک حصہ نہیں؟'' اس بات کی بیّن دلیل ہیں کہ یہ حکم وضو کرنے کے حکم سے پہلے کا ہے، کیونکہ اگر یہ کلام بعد کا ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہرگز نہ فرماتے، بلکہ یہ بیان کرتے کہ اس کا حکم مسنوخ ہو چکا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد تو اس بات کی دلیل ہے کہ اس معاملے میں پہلے اصلاً کوئی حکم تھا ہی نہیں۔

آگے چل کر علامہ ابن حزم نے ان لوگوں کی بھی تردید کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ مسِ فرج سے جس وضو کا حکم دیا گیا ہے، اس سے مراد لغوی وضو یعنی صرف ہاتھوں کو دھونا ہے۔ ان کے نزدیک اور

[1] دیکھیں: تحفة الأحوذي (١/ ٢٧٧۔ ٢٨٠)

ایسے ہی دیگر محدّثین کے نزدیک بھی یہ واجب ہے کہ شرعی الفاظ کو ان کے شرعی معانی پر محمول کیا جائے نہ کہ لغوی مفہوم پر، پھر سنن بیہقی اور محلیٰ ابن حزم میں حضرت بسرہ بنت صفوان رضی اللہ عنہا سے اور سنن دارقطنی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی احادیث میں: « فَلْيَوَضَّأْ وُضُوءَهُ لِلصَّلَاةِ » کے الفاظ ہیں، جن کا معنیٰ یہ ہے کہ ''وہ نماز کے لیے کیے جانے والے وضو کی طرح وضو کرے۔''[1]

5 حدیثِ بسرہ رضی اللہ عنہ کی ترجیح کی وجوہات میں سے پانچویں وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے، جسے امام حازمی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ صحیح سند کے ساتھ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں ہاتھ سے شرم گاہ کو چھونے سے منع فرمایا ہے، جیسا کہ آدابِ استنجا میں حدیث گزر چکی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرم گاہ عام اعضائے جسم، انگوٹھے، ناک اور کان کی طرح نہیں ہوسکتی۔ اگر ایسی ہی ہوتی تو پھر اسے چھونے میں کوئی حرج نہیں تھا، لیکن ایسا نہیں ہے۔[2]

ان پانچوں وجوہاتِ ترجیح کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جمہور اہلِ علم کا مسلک ہی راجح ہے کہ مسِ فرج پر وضو وجوباً کیا جائے اور اسی میں احتیاط بھی ہے۔

بچے کا پاخانہ دھونا:

فرج کے معاملے میں مرد و زن، بچے بڑے، محرم و غیر محرم، اپنے پرائے اور زندہ یا مردہ کا بھی کوئی فرق نہیں، جس کی تفصیل علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کی کتاب ''المحلیٰ'' (۱/ ۱/ ۲۳۵) اور امام محمد بن سعود رحمہ اللہ اسلامک یونیورسٹی ریاض کے ڈائریکٹر ڈاکٹر عبد اللہ عبد المحسن الترکی اور ان کے ایک ساتھی کی تحقیق و تخریج کے ساتھ شائع ہونے والی امام ابن قدامہ کی کتاب ''المغني'' (۱/ ۲٤۰، ۲٤٤) میں دیکھی جاسکتی ہے۔ جب شہوت کا داعیہ بھی شامل ہو تو پھر اس سے نقضِ وضو اور بھی متاکّد ہوجاتا ہے، حتیٰ کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور شیخ البانی رحمہ اللہ جیسے کبار اہلِ علم نے تو اسی داعیے کو پیشِ نظر رکھ کر حدیثِ بسرہ رضی اللہ عنہا اور حدیثِ طلق رضی اللہ عنہ میں تطبیق و مطابقت پیدا کی ہے کہ حدیثِ بسرہ رضی اللہ عنہ میں اس داعیے کا دخل نہیں، جب کہ حدیثِ طلق رضی اللہ عنہ: « إِنَّمَا هُوَ بُضْعَةٌ مِّنْكَ » کے الفاظ میں ایک لطیف اشارہ موجود ہے، جو اس داعیے کی موجودگی میں وضو ٹوٹنے کا پتا دیتا ہے۔[3]

---

[1] المحلی و تحقیقه لأحمد شاکر (۱/ ۲۳۹) و تحفة الأحوذي (۱/ ۲۷٦)

[2] تحفة الأحوذي (۱/ ۲۷۹) مختصراً

[3] تمام المنة (ص: ۱۰۳) و تحقیق مشکاة المصابیح (۱/ ۱۰۳۔ ۱۰٤)

یہ مطابقت بھی اگرچہ کبار علما کی طرف منسوب ہے، لیکن اس سے بھی بہتر مطابقت وہ ہے، جس میں کپڑے کے حائل ہونے پر عدمِ نقض اور بغیر حائل کے نقض کا کہا گیا ہے اور راجح مسلک بھی جمہور ہی کا ہے کہ کپڑا حائل نہ ہو تو مسِ فرج سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

جب اس معاملے میں بڑے اور چھوٹے میں کوئی فرق نہیں کیا گیا تو پھر یہاں ایک بات خواتین بطورِ خاص ذہن نشین کر لیں کہ اگر وہ وضو سے ہوں اور اسی حالت میں انھیں بچی یا بچے کو نہلانا یا ان کے پاخانہ کرنے پر انھیں دھونا پڑے تو اس کے بعد وہ اپنا وضو ختم سمجھیں اور نماز وغیرہ کے لیے از سرِ نو وضو کر لیں۔ "المحلّٰی" اور "المغني" کی عبارات سے تو محسوس ہوتا ہے کہ امام عطاء، شافعی، ابو ثور اور احمد رحمہم اللہ کے نزدیک وہ وجوباً وضو کریں اور چھوٹے بڑے میں امام اوزاعی و زہری کے بقول اگر فرق مانا ہی جائے تو پھر بھی اس اختلاف سے نکلنے کے لیے احتیاطاً یہی بہتر ہے کہ وہ بچے کو دھونے کے بعد نماز وغیرہ کے لیے از سرِ نو وضو کر لیا کریں کہ یہ نہ صرف زیادہ قرینِ احتیاط ہے، بلکہ افضل بھی ہے۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ فرق پر دلالت کرنے والی جو روایت ہے، اسے ذکر کرنے کے بعد امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے اسے غیر ثابت قرار دیا ہے اور "المغني" کے محققین نے لکھا ہے کہ ہماری متداول کتب میں یہ روایت سرے سے کسی میں موجود ہی نہیں ہے۔[1]

9- نیند:

وہ امور جن سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، انہی میں سے ایک نیند بھی ہے کہ اگر کوئی شخص وضو سے ہو اور سو جائے تو اس کا وضو ٹوٹ جائے گا۔ بیدار ہونے پر اسے دوبارہ وضو کر کے نماز وغیرہ ادا کرنا ہوگی اور اس کے متعدد دلائل ہیں۔ چنانچہ سنن ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ، ابن حبان، مسند احمد، شافعی، سنن دارقطنی اور سنن بیہقی میں ایک حدیث ہے، جسے امام بخاری رحمہ اللہ نے "أحسن شيئ في الباب" قرار دیا ہے اور امام ترمذی، خطابی اور نووی نے اسے صحیح کہا ہے۔ اس حدیث میں حضرت صفوان بن عسال رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

«أَمَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ إِذَا كُنَّا [مُسَافِرِيْنَ] أَوْ سَفْراً أَنْ لَّا نَنْزِعَ خِفَافَنَا ثَلَاثَةَ

---

[1] المغني بتحقيق التركي (١/ ٢٤٣ـ ٢٤٤)

أَيَّامٍ وَلَيَالِيهِنَّ إِلَّا مِنْ جَنَابَةٍ وَلٰكِنْ مِنْ غَائِطٍ أَوْ بَوْلٍ أَوْ نَوْمٍ»[1]

''نبی اکرم ﷺ نے ہمیں حکم فرمایا کہ دورانِ سفر ہم تین دن اور تین راتیں موزے نہ اتاریں سوائے جنابت ہوجانے کے، لیکن پیشاب، پاخانہ اور نیند سے (یہی حکم ہے)۔'' یعنی ان تینوں امور سے وضوتو ٹوٹ جاتا ہے، مگر ان سے موزے اتارنے واجب نہیں ہوتے۔

اس حدیث شریف کی رو سے نیند مطلقاً ناقضِ وضو ہے اور چونکہ یہاں نیند کا ذکر مطلقاً آیا ہے، نماز میں ہو یا نماز کے باہر، کھڑے ہوکر یا بیٹھ کر، ٹیک لگا کر ہو یا لیٹ کر، سجدے کی حالت میں ہو یا رکوع کی حالت میں؛ ہر شکل میں نیند مطلقاً ناقضِ وضو ہے۔[2]

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کی طرح ہی ابو عبید قاسم بن سلام کا میلان بھی اسی طرف ہے کہ نیند مطلقاً ناقضِ وضو ہے۔

ایک عجیب واقعہ:

اس سلسلے میں علامہ ابن عبد البر رحمہ اللہ نے موطا امام مالک کی شرح ''التمہید'' میں امام ابو عبید سے ایک عجیب واقعہ بھی نقل کیا ہے، جو مذکورہ موضوع کو سمجھنے کے لیے یقیناً مفید ہے۔ موصوف فرماتے ہیں:

''میں یہ فتویٰ دیا کرتا تھا کہ اگر کوئی شخص بیٹھا بیٹھا سو جائے تو اس پر وضو کرنا واجب نہیں ہے، یعنی اس کا وضو ایسی حالت کی نیند سے نہیں ٹوٹتا اور میں اس رائے پر اس وقت تک قائم رہا، جب تک یہ واقعہ رونما نہ ہوا کہ ایک شخص جمعہ کے دن میرے ساتھ بیٹھا بیٹھا سوگیا۔ نیند کے دوران میں اس کی ہوا خارج ہوگئی۔ میں نے کہا کہ جاؤ وضو کرو۔ اس نے کہا کہ میں تو سویا ہی نہیں۔ (غالبًا اس کی مراد لیٹ کر سونے سے تھی) میں نے کہا: کیوں نہیں! تم سو گئے تھے اور تمھاری ہوا بھی خارج ہوگئی ہے، جو ناقضِ وضو ہے۔ اس پر اس نے اللہ کی قسم کھائی کہ میں سویا ہوں نہ مجھ سے ہوا خارج ہوئی ہے اور الٹا مجھے کہنے لگا کہ

---

[1] سنن الترمذي مع التحفة (١/ ٣١٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٢٢، ١٢٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٧٨) موارد الظمآن (١٧٩) التلخيص الحبير (١/ ١/ ١٥٧) المجموع (١/ ٥١٦) الإرواء (١/ ١٤٠)

[2] المحلى لابن حزم (١/ ١/ ٢٢٢۔ ٢٢٣۔ ٢٣١)

تمھاری ہوا خارج ہوئی ہے، اس واقعہ کے بعد میں نے بیٹھے بیٹھے سونے والے شخص کے بارے میں اپنی رائے بدل لی۔ (یعنی یہ رائے اختیار کرلی کہ اس طرح سونے سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اصل رعایت نیند کے غلبے اور اس کے دل پر قابو پا جانے کی کرنے لگا)[1]

محدثِ عصر علامہ البانی نے بھی یہی موقف اختیار کیا ہے اور ''تمام المنة في التعليق علىٰ فقه السنة'' (ص: ۱۰۰) میں لکھا ہے:

''فَالْحَقُّ أَنَّ النَّوْمَ نَاقِضٌ مُطْلَقًا، وَلَا دَلِيْلٌ يَصْلُحُ لِتَقْيِيدِ حَدِيْثِ صَفْوَانَ''

''حق بات یہی ہے کہ نیند مطلقاً ناقضِ وضو ہے اور حضرت صفوان رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے اطلاق کو مقید کرنے والی کوئی دلیل نہیں ہے۔''

بلکہ اس حدیث کی تائید تو اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے، جس کی سند کو امام منذری، نووی اور ابن صلاح نے حسن قرار دیا ہے، جس کی تفصیل صحیح سنن ابو داود میں حدیث نمبر (۱۹۸) کے تحت ذکر کی گئی ہے۔ اس حدیث میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقاً ہر سونے والے کو وضو کرنے کا حکم فرمایا۔[2]

اُس حدیث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«اَلْعَيْنَانِ وِكَاءُ السَّهِ، فَمَنْ نَامَ فَلْيَتَوَضَّأْ»

''آنکھیں جائے پاخانہ کا سر بند ہیں، پس جو شخص سو جائے اسے (از سرِ نو) وضو کرنا چاہیے۔''

یہ حدیث سنن ابو داود، ابن ماجہ، دارقطنی اور مسندِ احمد میں وارد ہوئی ہے۔[3]

مطلق نیند کے بارے میں دیگر علما کے اقوال:

نیند مطلقاً ناقضِ وضو ہے۔ اس سلسلے میں بعض دیگر علما کے اقوال بھی ہیں، چنانچہ ''فتح الباري'' میں حافظ ابن حجر نے ''باب الوضوء من النوم'' کے تحت آنے والی حدیث کی شرح بیان کرتے

---

[1] التمهيد (............)

[2] تمام المنة (ص: ۱۰۰)

[3] صحيح أبي داود، رقم الحديث (۱۸۸) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۴۷۷) مسند أحمد (۱/ ۱۱۱) الإرواء (۱/ ۱۴۸) مشكاة المصابيح (۱/ ۱۰۳) و صححه الألباني.

ہوئے لکھا ہے کہ امام مزنی رحمہ اللہ نے بھی کہا ہے:

"یَنْقُضُ قَلِیْلُهٗ وَکَثِیْرُهٗ"، "معمولی اور گہری ہر طرح کی نیند ناقضِ وضو ہے۔"

امام اسحاق بن راہویہ کا بھی یہی قول ہے اور امام ابن منذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت صفوان رضی اللہ عنہ والی حدیث جسے امام ابن خزیمہ اور دیگر محدّثین نے صحیح قرار دیا ہے۔ اس کے عموم کے پیشِ نظر میرا قول بھی یہی ہے کہ معمولی اور گہری نیند ناقضِ وضو ہے۔[1]

حضرت انس، ابو ہریرہ اور ابو رافع رضی اللہ عنہم اور عروہ بن زبیر، عطا، حسن بصری، سعید بن المسیب، عکرمہ اور زہری رحمہم اللہ اور حنابلہ سمیت علما کی ایک جماعت کا بھی یہی مسلک ہے۔[2]

دیگر اقوال:

بعض اہلِ علم نے نیند کی مختلف حالتوں کے مختلف احکام ذکر کیے ہیں، حتیٰ کہ علامہ نووی رحمہ اللہ نے "شرح صحیح مسلم" میں، علامہ یمانی امیر صنعانی رحمہ اللہ نے "سبل السلام" میں اور امام شوکانی رحمہ اللہ نے "نیل الأوطار" میں ذکر کیا ہے کہ نیند کے بارے میں علما کے آٹھ اقوال ہیں، پھر آٹھوں اقوال اور ان کے دلائل بھی ذکر کیے ہیں، جن میں سے پہلا قول تو یہی ہے، جس میں نیند کو مطلقاً ناقض کہا گیا ہے۔ انھوں نے خود اسے ہی "أقرب الأقوال" قرار دیا ہے اور تین اقوال نماز کے اندر اور خصوصاً قیام، رکوع اور سجدہ کی حالت میں سونے سے تعلق رکھتے ہیں، ان کا استدلال خلافیاتِ بیہقی اور بعض دیگر کتب کی اس روایت سے ہے، جس میں مروی ہے:

«إِذَا نَامَ الْعَبْدُ فِيْ سُجُوْدِهٖ بَاهٰى اللّٰهُ بِهِ الْمَلَائِكَةَ وَيَقُوْلُ: اُنْظُرُوْا إِلٰى عَبْدِيْ، رُوْحُهٗ عِنْدِيْ وَجَسَدُهٗ سَاجِدٌ بَيْنَ يَدَيَّ»

"جب کوئی شخص حالتِ سجدہ میں سوجائے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے فخر کرتا ہے اور کہتا ہے: دیکھو! میرے بندے کی روح میرے پاس ہے اور اس کا جسم میرے سامنے سجدہ ریز ہے۔"

لیکن امیر صنعانی کے بقول یہ استدلال اوّلاً تو اس لیے صحیح نہیں کہ یہ حدیث ہی ضعیف اور

---

[1] فتح الباري (١/ ٣١٤)

[2] شرح صحیح مسلم للنووي (٢/ ٧٣٤) الإرواء (١/ ١٤١) تحقیق صلاة الرسول (ص: ١٣٥)

نا قابلِ حجت ہے۔ دوسرے اس لیے کہ اس روایت میں اس بندے کو سجدہ ریز اس کی حالت وہیئت کی بنا پر یا پھر محض اوّل الامر والی طہارت کی بنا پر کہا گیا ہے، جو اس بات کی دلیل ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اس طہارت کے باقی ہونے کی وجہ سے اسے سجدہ ریز قرار دیا گیا ہے۔[1]

اسی مفہوم پر دلالت کرنے والی بعض دیگر روایات ہیں، جن کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "التلخیص" میں اور امام شوکانی نے "نیل الأوطار" میں نقل کرکے انھیں ضعیف قرار دیا ہے۔ البتہ ایک روایت کی سند کو حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے جید کہا ہے، مگر وہ بھی مرفوع نہیں، بلکہ موقوف ہے، یعنی وہ الفاظ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہیں۔[2]

پانچویں قول میں قلیل وکثیر میں فرق کیا گیا ہے، جس کی کوئی صریح دلیل ہے نہ قلیل وکثیر کا کوئی معیار ذکر کیا ہے کہ قلیل کیا ہے اور کثیر کیا ہے؟ چھٹے قول میں شافعیہ کے نزدیک نیند بہ ذاتِ خود تو ناقض نہیں، البتہ نقض کا ظن پیدا کرنے والی چیز ہے۔

ساتویں قول میں کہا گیا ہے کہ نیند مطلق ناقض ہے ہی نہیں، ان کا استدلال حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیث سے ہے، جو صحیح مسلم اور سنن ابی داود میں مذکور ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں:

«إِنَّ أَصْحَابَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يَنْتَظِرُوْنَ الْعِشَاءَ فَيَنَامُوْنَ قُعُوْداً، ثُمَّ يُصَلُّوْنَ وَلَا يَتَوَضَّئُوْنَ»[3]

"نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نمازِ عشا کے وقت انتظار میں بیٹھے بیٹھے سو جایا کرتے تھے، پھر وہ اٹھ کر نماز پڑھ لیتے اور دوبارہ وضو نہیں کیا کرتے تھے۔"

سنن ابو داود کی روایت میں "علیٰ عهد رسول الله ﷺ" کے الفاظ بھی ہیں کہ یہ عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات ہے، مگر صحیح مسلم میں یہ الفاظ نہیں ہیں۔ ایک دوسری روایت جو صحیح سند کے ساتھ مسند بزار، محلیٰ ابن حزم اور مسائل الامام احمد لابی داود میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں:

---

[1] دیکھیں: سبل السلام (۱/ ۱/ ٦٢) شرح صحیح مسلم للنووي (۲/ ٤/ ۱۷۳) التلخيص الحبير (۱/ ۱/ ۱۲۱) النيل (۱/ ۱/ ۱۹۰۔ ۱۹۱)

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: التلخيص الحبير (۱/ ۱/ ۱۱۹۔ ۱۲۰) نيل الأوطار (۱/ ۱/ ۱۹۰)

[3] صحيح مسلم مع شرح النووي (۲/ ٤/ ۷۳) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۸٤) فتح الباري (۱/ ۱/ ۳۱٥) التلخيص الحبير (۱/ ۱/ ۱۱۹) عون المعبود (ص: ۳۳۹۔ ۳٤۰)

« إِنَّهُمْ كَانُوا يَضَعُونَ جُنُوبَهُمْ فَيَنَامُونَ، مِنْهُمْ مَنْ يَتَوَضَّأُ وَمِنْهُمْ مَنْ لَا يَتَوَضَّأُ »[1]

''وہ پہلو کے بل لیٹ کر سو جایا کرتے تھے۔ پھر ان میں سے کوئی وضو کر لیتا اور کوئی وضو نہ کرتا (یعنی پہلے وضو ہی سے نماز پڑھ لیتا تھا)۔''

فتح الباری میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری و ابن عمر رضی اللہ عنہم اور حضرت سعید بن المسیب رحمہ اللہ نیند کو مطلقاً ناقض نہیں سمجھتے تھے۔[2]

''التلخیص الحبیر'' میں موصوف نے ان کبار ائمہ کے اقوال ذکر کیے ہیں، جنھوں نے ان احادیث کو بیٹھ کر سونے پر محمول کرتے ہوئے غیر ناقض قرار دیا ہے۔ چنانچہ امام ابن المبارک، عبدالرحمٰن بن مہدی اور امام شافعی رحمہم اللہ نے یہی موقف اختیار کیا ہے۔ امام ابن القطان نے کہا ہے کہ صحیح مسلم میں اس حدیث کا جو سیاق ہے، اسے بیٹھ کر سونے والے کی نیند پر محمول کیا جا سکتا ہے اور اکثر ائمہ نے ایسا ہی کیا ہے، لیکن مسند بزار اور محلّی والی روایت کے الفاظ « كَانُوا يَضَعُونَ جُنُوبَهُمْ » اس تاویل کی اجازت نہیں دیتے، کیوں کہ یہ تو لیٹ کر سونے پر صریح دلالت کرتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ وضو نہیں کیا کرتے تھے۔[3]

علامہ ابن دقیق العید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیثِ انس رضی اللہ عنہ کی « كَانُوا يَضَعُونَ جُنُوبَهُمْ » والی روایت کو خفیف اور ہلکی سی نیند پر محمول کیا جائے گا، جب کہ یہ تاویل سنن دارقطنی والی حدیث کے منافی ہے، جس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کے غطیط یعنی خراٹے سننے والے الفاظ بھی ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ خراٹے تو ہلکی نیند میں نہیں سنے جا سکتے۔ یاد رہے کہ خراٹوں والی حدیث کو علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے ترمذی کی طرف بھی منسوب کیا ہے، مگر یہ اس میں ہمیں نہیں ملی۔[4]

---

[1] فتح الباري (۱/ ۳۱۵) و صححه، المحلی (۱/ ۱/ ۲۲٤) تمام المنة (ص: ۱۰۰) و صححه.

[2] فتح الباري (۱/ ۳۱۵)

[3] التلخیص الحبیر و فتح الباري (۱/ ۳۱۵) ملاحظہ فرمائیں۔

[4] دیکھیں: سنن الترمذي مع التحفة (۱/ ۲۵۱۔ ۲۵۵) سنن الدارقطني (۱/ ۱۳۱) التلخیص الحبیر (۱/ ۱/ ۱۱۹) سبل السلام (۱/ ۱/ ۷۲)

تعارض اور اس کا حل:

حضرت صفوان رضی اللہ عنہ والی حدیث: « وَلٰكِنْ مِنْ غَائِطٍ وَبَوْلٍ وَنَوْمٍ » کی رو سے نیند مطلق ناقضِ وضو ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ والی حدیث کی رو سے نیند مطلق ناقضِ وضونہیں ہے۔ ان دونوں حدیثوں میں باہم تضاد و تعارض واضح ہے، جسے اہلِ علم نے یوں حل کیا ہے کہ اوّلاً تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا نیند سے اٹھ کر وضو نہ کرنا، اس بات کے امکان کا پتا دیتا ہے کہ یہ نیند سے وضو واجب ہونے کے حکم سے پہلے کا واقعہ ہوگا۔ لہٰذا علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کے بقول حدیثِ صفوان رضی اللہ عنہ اس پہلے حکم کو منسوخ کرنے والی ہے۔[1] اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ان دونوں حدیثوں میں سے ایک (حدیثِ صفوان رضی اللہ عنہ) صحیح سند والی اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع ہے، جب کہ دوسری حدیثِ انس رضی اللہ عنہ ایسی نہیں ہے۔[2]

لہٰذا حضرت صفوان رضی اللہ عنہ والی حدیث پر عمل ہی اولیٰ ہے۔

البتہ امام شوکانی رحمہ اللہ نے "نیل الأوطار" میں لکھا ہے کہ مطلق نیند کو ناقض ظاہر کرنے والی احادیث کو لیٹ کر سونے والی نیند پر محمول کیا جائے گا، پھر اس جمع و تطبیق کی تائید میں تین روایات بھی پیش کی ہیں، جنھیں ایک دوسرے کے لیے باعثِ قوت قرار دیا ہے۔ علامہ مبارکپوری نے بھی "تحفة الأحوذي" میں یہی موقف اختیار کیا ہے۔ جب کہ محدث البانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ احادیث تینوں ہی اتنی ضعیف ہیں کہ ان کے مجموعے میں بھی کوئی قوت پیدا نہیں ہوتی اور نہ ان کا ضعف ہی زائل ہوتا ہے۔ لہٰذا انھوں نے جمع و تطبیق کی تردید کی ہے۔ اس کی تفصیل "نیل الأوطار" (۱/ ۱/ ۱۹۱) "تحفة الأحوذي" (۱/ ۲۵۵) اور "تمام المنة" (ص: ۱۰۱، ۱۰۳) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

نیند اور اونگھ کا فرق و حکم:

صرف لیٹ کر سونے والی نیند کے ناقض ہونے کی تائید کرنے والی امام شوکانی رحمہ اللہ کی پیش کردہ تینوں احادیث ضعیف ہیں، جیسا کہ اشارہ گزرا ہے اور صحیح بخاری و مسلم والی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث: « إِذَا أُغْمِيتُ يَأْخُذُ بِشَحْمَةِ أُذُنِيْ » میں "أُغْمِيتُ" سے مراد گہری نیند ہو ہی نہیں سکتی، بلکہ وہاں اونگھ مراد ہے، جیسا کہ "القاموس المحیط" میں "الإغماء" کا معنیٰ دیکھا

---

[1] المحلی لابن حزم (۱/ ۱/ ۲۲۹)

[2] تمام المنة (ص: ۱۰۰)

جا سکتا ہے۔ لہٰذا وہ حدیث بھی موید نہ رہی۔ یوں معلوم ہوا کہ قولِ اوّل (نیند کے متعلق ناقضِ وضو ہونے کی رائے) ہی راجح ہے۔ البتہ یہاں اگر نیند اور اونگھ کے فرق کو بھی اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو اس مسئلے میں پائے جانے والے بہت سارے اشکالات زائل ہو جاتے ہیں، چنانچہ فتح الباری میں لکھا ہے کہ جس کے حواس قائم رہیں، حتیٰ کہ وہ اپنے ساتھی کی بات سن سکتا ہو، مگر اس کا معنیٰ نہ سمجھ سکے تو یہ حالتِ اونگھ ہے اور اگر اس سے بھی بڑھ جائے (معنیٰ کجا بات بھی نہ سن رہا ہو) تو یہ حالت نیند ہے۔[1]

امام خطابی کی "غریب الحدیث" سے نقل کرتے ہوئے صاحبِ "تمام المنۃ" لکھتے ہیں:

''نیند کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک گہری غشی ہے، جو دل پر چھا جاتی ہے اور اسے ظاہری امور کی معرفت سے منقطع کر دیتی ہے، جبکہ اونگھنے والا شخص وہ ہے، جسے طبیعت کے بوجھل ہونے نے ایسا کر رکھا ہو کہ وہ احوالِ باطنہ کی معرفت سے قاصر ہو۔''[2]

مغفل کہتے ہیں:

"السِّنَةُ فِي الرَّأْسِ، وَالنَّوْمُ فِي الْقَلْبِ"[3]

''اونگھ کا اثر سر پر اور نیند کا اثر دل پر پڑتا ہے۔''

نیند اور اونگھ کے اس فرق نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا ہے کہ اونگھ کی وجہ سے اگر کسی کا سر جھک جائے اور اسے جھٹکا سا محسوس ہو تو ایسی اونگھ سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اگر خفیف یا ہلکی سی نیند سے مراد یہی اونگھ ہو تو وہ مسئلہ بھی حل ہو گیا کہ کون سی ہلکی سی نیند غیر ناقض ہے۔ چنانچہ امام ابن المنذر نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت بیان کی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

"وَجَبَ الْوُضُوْءُ عَلٰی كُلِّ نَائِمٍ إِلَّا مَنْ خَفَقَ خَفْقَةً"[4]

''ہر سونے والے پر وضو واجب ہے، سوائے اس کے جسے (اونگھ کی وجہ سے) جھٹکا لگے۔''

یعنی اس پر وضو واجب نہیں۔

خفقہ یا جھٹکا کا معنیٰ ابن التین نے اونگھ ہی کیا ہے اور اہلِ لغت اونگھ میں سر کو حرکت دینے

---

[1] فتح الباري (١/ ٣١٤)

[2] تمام المنة (ص: ١٠١)

[3] غريب الحديث بحواله تحقيق المشكاة (١/ ١٠٤)

[4] دیکھیں: فتح الباري (١/ ٣١٤)

والے ہی کو کہتے ہیں:

"خَفَقَ بِرَأْسِهِ مِنَ النُّعَاسِ: أَمَالَهُ"

"یعنی اونگھ سے اپنے سر کو خفقہ دینے سے مراد سر کو ایک طرف مائل کرنا ہے۔"

ہروی کہتے ہیں:

"مَعْنٰى: تَخْفِقُ رُؤُوسُهُمْ، تَسْقُطُ أَذْقَانُهُمْ عَلٰى صُدُوْرِهِمْ"

"ان کے سروں کا خفقہ کھانا، ان کی ٹھوڑیوں کا ان کے سینوں پر گر جانا ہے۔"

خفقانِ راس اور اونگھ کے متعلق اس تفصیل سے "قيام الليل للمروزي" میں حضرت انس رضی اللہ عنہ والی اس روایت کا مفہوم بھی واضح ہو گیا، جس میں ان کے الفاظ ہیں:

«كَانَ أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يَنْتَظِرُوْنَ الصَّلَاةَ فَيَنْعَسُوْنَ حَتّٰى تَخْفِقَ رُؤُوْسُهُمْ، ثُمَّ يَقُوْمُوْنَ إِلَى الصَّلَاةِ»[1]

"نبیِ اکرم ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم نماز کے انتظار میں اونگھ جاتے، حتیٰ کہ ان کے سر جھک جاتے، پھر وہ اٹھتے اور نماز ادا کرتے۔"

یوں اب بات واضح ہوگئی کہ وہ حالت جو اونگھ کے دائرے میں آتی ہے، اس میں وضو نہیں ٹوٹتا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں جو سر جھکانے کی روایات ملتی ہیں، ان میں یہی اونگھ مراد ہے اور ان کے لیٹ کر سو جانے اور خراٹے سنے جانے کے باوجود ان کے تجدیدِ وضو کے بغیر ہی نماز میں شامل ہو جانے سے مراد نیند سے وضو کے واجب ہونے کے حکم سے پہلے کی حالت کا بیان ہے، اس کا اظہار شیخ ابن باز اور ان کے ساتھی علما نے "فتح الباري" کی تحقیق و تعلیق میں کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"اس مسئلے میں صحیح بات یہ ہے کہ نیند نقضِ وضو (حدث) کا ظن پیدا کرنے والی چیز ہے۔ اس کی (ابتدائی حالت یا) اونگھ اور بالکل معمولی (خفیف) حالت وضو نہیں توڑتی۔ وضو صرف وہ نیند توڑتی ہے، جو شعور (واحساس) کو مطلقاً زائل کر دے۔ اس طرح اس موضوع

---

[1] فتح الباري (١/ ٣١٤) قال: إسناده صحيح و أصله عند مسلم. نیز دیکھیں: صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٨٤) شرح مع النووي (٢/ ٤/ ٧٣) فتح الباري (١/ ١/ ٣١٥) تلخيص الحبير (١/ ١/ ١١٩) عون المعبود (ص: ٣٣٩۔ ٣٤٠)

کے بارے میں وارد شدہ تمام احادیث میں جمع و تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔‘‘[1] واللّٰہ أعلم.

یہیں امام نووی رحمہ اللہ کی تحقیق بھی ذکر کرتے جائیں کہ نیند اور اونگھ کے سلسلے میں وہ کیا فرماتے ہیں؟ چنانچہ صحیح مسلم شریف کی شرح میں موصوف امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب و رفقا سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ’’نعاس یا سِنۃ یعنی اونگھ سے وضو نہیں ٹوٹتا۔‘‘

آگے فرماتے ہیں:

’’نیند کی علامت یہ ہے کہ اس میں عقل پر غلبہ ہو جاتا ہے اور آنکھوں کی بصارت اور دیگر حواس ساقط (و معطل) ہو جاتے ہیں، جب کہ اونگھ عقل پر غلبہ نہیں پاتی، بلکہ اونگھ کے دوران میں حواس میں صرف معمولی سا فتور آجاتا ہے، لہٰذا وہ ساقط (و معطل) نہیں ہوتے۔‘‘

آگے موصوف نے بڑے کام کی بات کی ہے:

’’اگر کسی کو شک ہوجائے کہ وہ سوگیا تھا یا محض اونگھ رہا تھا، تو اس شک کی حالت میں اس پر وضو واجب نہیں ہوگا۔ ہاں یہ مستحب ہے کہ ایسا شخص وضو کرلے۔‘‘[2]

ظاہر ہے کہ احتیاط بھی اسی میں ہے۔

خصائصِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم:

شرح صحیح مسلم میں امام نووی اور انہی سے نقل کرتے ہوئے امام شوکانی ’’نیل الأوطار‘‘ میں لکھتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے یہ بات بھی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وضو لیٹ کر سو جانے سے بھی نہیں ٹوٹتا تھا، کیوں کہ ایک صحیح حدیث حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«نَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حَتّٰی سَمِعْتُ غَطِيْطَهٗ، ثُمَّ صَلّٰی وَلَمْ يَتَوَضَّأْ»[3]

’’نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سو گئے، حتیٰ کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے خراٹے سنے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی اور وضو نہیں کیا۔‘‘

---

[1] حاشیه فتح الباري (١/ ٣١٤)

[2] شرح صحيح مسلم للنووي (٢/ ٤/ ٧٤)

[3] شرح صحيح مسلم للنووي (٢/ ٤/ ٧٤) نيل الأوطار (١/ ١/ ١٩١۔ ١٩٢)

10- زوالِ عقل یا بے ہوشی:

نواقضِ وضو میں سے دسواں ناقض زوالِ عقل ہے، چاہے وہ کسی طرح بھی ہو اور کسی حالت میں بھی ہو، چنانچہ اس سلسلے میں امام نووی رحمہ اللہ نے "المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج" میں لکھا ہے:

"اہلِ علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دیوانگی، غشی، شراب، نبیذ، بنج یا کلورو فارم یا کسی بھی دوا سے نشہ ہونے پر عقل زائل ہونا یا بے ہوش ہو جانا ناقضِ وضو ہے۔ یہ بے ہوشی اور زوالِ عقل تھوڑے عرصے کے لیے ہو یا زیادہ وقت کے لیے ہو۔"[1]

امام شوکانی رحمہ اللہ نے "البحر الرائق" سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نشے کا حکم بھی اکثر اہلِ علم کے نزدیک جنون و دیوانگی والا ہی ہے اور "سبل السلام شرح بلوغ المرام" میں علامہ صنعانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ان امور کو نیند سے ملحق کیا گیا ہے۔ علامہ مغربی کی "البدر التمام شرح بلوغ المرام" (جو "سبل السلام" کی اصل ہے) سے نقل کیا ہے کہ اہلِ علم کا ان امور کے ناقضِ وضو ہونے پر اتفاق ہے اور اگر یہ اتفاق کی بات صحیح ہے تو پھر ان کے ناقض ہونے کی دلیل اجماع ہے۔[2]

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے بھی موجباتِ وضو کے ضمن میں دیوانگی، غشی اور نشے کو ذکر کیا ہے، مگر ان کے ناقض ہونے اور انھیں نیند پر قیاس کرنے اور اس کی دلیل اجماع ہونے کا انکار کیا ہے۔[3] تاہم اس معاملے میں جیسا کہ ظاہر ہے، جمہور اہلِ علم کا قول ہی زیادہ قرینِ صواب ہے۔

11- اونٹ کا گوشت کھانا:

نواقضِ وضو میں سے گیارھواں اور آخری ناقض اونٹ کا گوشت کھانا ہے، اگرچہ جمہور اہلِ علم، خلفاے راشدین (چاروں) اور اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین اور ائمہ میں سے امام شافعی، امام مالک اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ کا مسلک تو یہ ہے کہ اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو نہیں ٹوٹتا، لیکن امام نووی رحمہ اللہ

---

[1] شرح صحيح مسلم للنووي (٢/ ٤/ ٧٤) نيل الأوطار (١/ ١/ ١٩١)

[2] سبل السلام (١/ ١/ ٦٣)

[3] المحلى لابن حزم (١/ ١/ ٢٢١۔ ٢٢٢)

فرماتے ہیں کہ اونٹ کے گوشت کا ناقضِ وضو ہونا ہی دلیل کے اعتبار سے زیادہ قوی ہے۔[1]

اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو کے ٹوٹ جانے کے قائلین میں سے بقول امام نووی، امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، یحییٰ بن معین، ابن المنذر اور ابن خزیمہ رحمہم اللہ ہیں۔ امام بیہقی کا اختیار بھی یہی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت اور عام علماے حدیث سے بھی یہی مروی ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے "البحر الرائق" سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک قول کے مطابق امام شافعی کا بھی یہی مسلک ہے اور ایک قول کی رو سے امام محمد بن حسن (شاگرد امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ) بھی اونٹ کا گوشت کھانے سے نقضِ وضو کے قائل تھے۔

امام بیہقی رحمہ اللہ نے امام شافعی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا:

"اگر اونٹوں کے گوشت سے وضو ٹوٹنے کے بارے میں کوئی حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو میں اسی کے مطابق فتویٰ دوں گا۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کر کے امام بیہقی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ اس مسئلے میں ایک نہیں، بلکہ دو حدیثیں سند سے ثابت ہیں۔"[2]

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ بھی نقض ہی کے قائل ہیں، جیسا کہ "المحلی" (۱/ ۱/ ۲۴۱) میں ہے اور "القواعد النورانیة" میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی تحقیق بھی یہی ہے کہ وضو ٹوٹ جاتا ہے۔[3]

قائلینِ نقض کے دلائل:

1. نقضِ وضو کے قائلین کا استدلال جن احادیث سے ثابت ہے، ان میں سے پہلی حدیث صحیح مسلم اور مسند احمد میں حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ کسی آدمی نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

«أَنَتَوَضَّأُ مِنْ لُحُومِ الْغَنَمِ؟ قَالَ: إِنْ شِئْتَ تَوَضَّأْ وَإِنْ شِئْتَ فَلَا تَتَوَضَّأْ»

"کیا ہم بکری کا گوشت کھانے کے بعد وضو کیا کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر چاہو تو وضو کر لو اور اگر چاہو تو نہ کرو (یعنی تمھیں اختیار ہے)۔"

---

[1] شرح صحیح مسلم للنووي (۲/ ٤/ ٤٩)

[2] نیل الأوطار (۱/ ۱/ ۲۰۰) طبع بیروت.

[3] دیکھیں: تمام المنة (ص: ۱۰۵)

پھر اسی آدمی نے پوچھا:

«أَنَتَوَضَّأُ مِنْ لُحُومِ الْإِبِلِ؟ قَالَ: نَعَمْ»[1]

''کیا ہم اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں۔''

[2] اسی موضوع کی دوسری حدیث سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، مسندِ احمد، صحیح ابن خزیمہ اور ابن حبان میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ سے اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرنے کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«تَوَضَّؤُوا مِنْهَا» ''اس کے بعد وضو کر لو۔''

آپ ﷺ سے بکری کے گوشت کے بعد وضو کے بارے میں استفسار کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَا تَوَضَّؤُوا مِنْهَا»[2] ''اس کے بعد وضو نہ کرو۔''

امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں:

"لَمْ أَرَخِلَافًا بَيْنَ عُلَمَاءِ الْحَدِيْثِ أَنَّ هٰذَا الْخَبَرَ صَحِيْحٌ مِنْ جِهَةِ النَّقْلِ لِعَدَالَةِ نَاقِلِيْهِ"[3]

''میرے نزدیک علمائے حدیث میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہ حدیث از روئے نقل صحیح ہے، کیوں کہ اس کے تمام روات عدول ہیں۔''

[3] ان دونوں صحیح احادیث کے علاوہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی بعض آثار ثابت ہیں کہ وہ اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کیا کرتے تھے، چنانچہ مصنف ابن ابی شیبہ میں صحیح سند کے ساتھ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ مروی ہے:

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ١٧٤) المنتقىٰ مع النيل (١/ ١/ ٢٠٠)

[2] صحيح سنن أبي داود (١/ ٣٧) سنن أبي داود مع العون (١/ ٣١٥۔ ٣١٦) سنن الترمذي مع التحفة (١/ ٢٦٢۔ ٢٦٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٩٤) موارد الظمآن، رقم الحديث (٢١٥) التلخيص الحبير (١/ ١/ ١١٥) المنتقى مع النيل (١/ ١/ ٢٠٢) و صححه الألباني في الإرواء (١/ ١/ ١٥٢)

[3] سلسلة الأحاديث الصحيحة (١/ ٢٢)

«كُنَّا نَتَوَضَّأُ مِنْ لُّحُومِ الْإِبِلِ، وَلَا نَتَوَضَّأُ مِنْ لُّحُومِ الْغَنَمِ»[1]

''ہم اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کیا کرتے تھے اور بکری کا گوشت کھانے کے بعد وضو نہیں کیا کرتے تھے۔''

اب آیئے اس سلسلے میں دوسرا مسلک اور اس کے دلائل بھی دیکھیں۔

قائلین عدمِ نقض کے دلائل:

1 اونٹ کا گوشت کھانے سے وضو کے عدمِ نقض کے قائلین کی ایک اہم دلیل تو یہ ہے کہ خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم عدمِ نقض کے قائل تھے، جیسا کہ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح صحیح مسلم میں ذکر کیا ہے۔ یہ بات واقعی ایک وقیع دلیل ہوتی، اگر صحیح سند سے ثابت ہوتی، لیکن ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ امام نووی رحمہ اللہ کا تسامح ہے، جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''القواعد النورانیۃ'' میں ذکر کیا ہے کہ خلفاے راشدین اور جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم سے جو نقل کیا گیا ہے کہ وہ اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو نہیں کیا کرتے تھے، یہ فعل ان کی طرف غلطی سے منسوب کیا گیا ہے، اس وہم کا سبب دراصل وہ بات ہے کہ وہ پکی ہوئی اشیاے خوردنی کو کھانے کے بعد وضو نہیں کیا کرتے تھے۔ (یہ مسئلہ تو اپنی جگہ صحیح ہے) لیکن اس سے مراد صرف یہ ہے کہ ہر پکی ہوئی چیز کا کھانا ان کے نزدیک وضو کرنے کا سبب نہیں تھا اور جو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اونٹ کا گوشت کھانے کے بعد وضو کرنے کا حکم فرمایا، اس کا سبب اس کا پکا ہوا ہونا نہیں ہے....الخ۔

صاحبِ ''تمام المنۃ'' لکھتے ہیں:

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی اس تحقیق کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ امام طحاوی و بیہقی نے حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق و عمر رضی اللہ عنہما نے روٹی گوشت کھایا اور نماز ادا کی، لیکن از سرِ نو وضو نہیں کیا۔

آگے امام طحاوی و بیہقی ہی نے حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی اسی طرح روایت بیان کی ہے۔ سنن بیہقی میں ایک روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی ایسی ہی ہے، لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان آثار میں اونٹ کے گوشت کا قطعاً ذکر نہیں ہے، بلکہ صرف مطلق گوشت کا ذکر

---

[1] تمام المنة (ص: ١٠٦) و صححه.

ہے۔ اگر ایسی کوئی روایت نبیِ اکرم ﷺ کے بارے میں ہوتی تو بھی ضروری تھا کہ اسے اونٹ کے علاوہ کسی دوسرے گوشت پر محمول کیا جاتا، تاکہ تعارض رفع کیا جاسکے۔ جب یہ آثار نبیِ اکرم ﷺ کے بجائے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں ہیں تو انھیں دوسرے گوشت پر محمول کرنا بالاولیٰ واجب ہے، تاکہ ان کے اعمال کو شریعت کی موافقت پر محمول کیا جاسکے نہ کہ مخالفت پر، یہی وجہ ہے کہ امام طحاوی اور بیہقی رحمہ اللہ نے ان آثار کو ''آگ سے پکی ہوئی چیزوں سے وضو کے باب'' میں ذکر کیا ہے اور امام بیہقی نے سنن کبریٰ میں ''اونٹ کے گوشت سے وضو کے باب'' میں یہ آثار ذکر نہیں کیے، بلکہ وہاں صرف یہ کہا ہے کہ ہمیں حضرت علی و ابن عباس رضی اللہ عنہم سے یہ روایت پہنچی ہے:

"اَلْوَضُوْءُ مِمَّا خَرَجَ وَلَيْسَ مِمَّا دَخَلَ، وَإِنَّمَا قَالَا ذٰلِكَ فِيْ تَرْكِ الْوُضُوْءِ مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ"[1]

''وضو خارج ہونے والی چیز سے ہے نہ کہ داخل ہونے والی چیز سے اور ان کا یہ کہنا آگ پر پکی چیزوں سے وضو نہ کرنے کے بارے میں ہے۔''

2 پھر انھوں نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ روایت بیان کی ہے کہ انھوں نے اونٹ کا گوشت کھایا اور وضو نہ کیا۔ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد خود ہی لکھا ہے کہ یہ اثر منقطع اور موقوف ہے اور کسی ایسی دلیل کی بنا پر اس بات کو ترک نہیں کیا جاسکتا، جو نبیِ اکرم ﷺ سے ثابت ہے۔[2]

2 عدمِ وجوب کے قائلین کی تیسری دلیل سنن اربعہ، صحیح ابن خزیمہ اور ابن حبان میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

«كَانَ آخِرُ الْأَمْرَيْنِ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ تَرْكُ الْوُضُوْءِ مِمَّا غَيَّرَتِ النَّارُ»[3]

''نبیِ اکرم ﷺ کا عمل آخر میں یہ تھا کہ آگ پر پکی چیز کھانے کے بعد آپ ﷺ وضو

---

[1] وقد ضعفه الحافظ في التلخيص (١/ ١/ ١١٨)

[2] القواعد النورانية لابن تيمية (ص: ٩) الطحاوي (١/ ٤١) سنن البيهقي (١/ ١٥٧) بحواله تمام المنة (ص ١٠٥، ١٠٦)

[3] سنن أبي داود (١/ ٣٢٧) سنن الترمذي (١/ ٢٥٨) مفصلًا، و صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٧٩) و سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٨٩) التلخيص الحبير (١/ ١/ ١١٦) مختصراً، موارد الظمآن، رقم الحديث (٢١٨، ٢٢٠، ٣٢١) بألفاظ مختلفة.

نہیں کیا کرتے تھے۔‘‘

یہ مسئلہ تو صحیح ہے کہ آگ پر پکی اشیا کھانے کے بعد وضو کرنا واجب نہیں، جیسا کہ صحیح بخاری اور دیگر کتبِ حدیث میں یہ بات ثابت ہے، اس کی تفصیل بھی آگے چل کر آئے گی، اسی مسئلے کی دلیل یہ حدیثِ مذکور بھی ہے، جس سے اونٹ کے گوشت کے بعد وضو کے عدمِ وجوب پر استدلال صریح نہیں، بلکہ دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے، جیسا کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے کلام اور امام طحاوی و بیہقی رحمہما اللہ کے انداز سے معلوم ہوتا ہے، جو ہم نے (پچھلی سطور میں) ذکر کیا ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ نے صحیح مسلم کی شرح میں اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ حدیث عام ہے اور اونٹ کے گوشت کے بعد وضو کرنے کے حکم پر دلالت کرنے والی صحیح مسلم اور مسند احمد کی حدیث خاص ہے اور خاص کو عام پر مقدم رکھنا ضروری ہے، جیسا کہ امام شافعی اور دیگر ائمہ اصول رحمہم اللہ کا مذہب ہے اور امام شوکانی نے اس اصول کو حق قرار دیا ہے۔[1]

امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے ”المغني“ میں لکھا ہے کہ اونٹ کا گوشت کھانے سے بہر حال وضو ٹوٹ جاتا ہے، پھر انھوں نے نقضِ وضو کی رائے کے راجح ہونے کے متعدد عقلی و نقلی اور اصولی دلائل ذکر کیے ہیں، جو جامعۃ الامام کی طرف سے شائع کردہ ”المغني“ (۱/ ۲۵۰، ۲۵٤) میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ موطا امام محمد رحمہ اللہ کے حاشیے ”التعليق الممجد“ میں علامہ عبد الحی حنفی رحمہ اللہ نے بھی نقضِ وضو والے مسلک ہی کو قوی مذہب قرار دیا ہے۔[2]

بعض اہلِ علم نے وضو کو واجب تو نہیں، البتہ مستحب قرار دیا ہے۔ بہر صورت وضو کرنا ہی زیادہ قرینِ احتیاط ہے۔

---

[1] شرح صحيح مسلم للنووي (۲/ ٤/ ٤۹) نيل الأوطار (۱/ ۱/ ۲۰۱)

[2] دیکھیں: تحفة الأحوذي (۱/ ۲٦٤) علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ نے اس مقام پر بڑے اہم مباحث رقم کیے ہیں اور بذل المجہود کے حنفی مولف کی تردید کی ہے۔

غیر نواقضِ وضو

(جن اشیا سے وضو نہیں ٹوٹتا)

وضو توڑنے والے ان دس امور کے بعد اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض وہ امور بھی ذکر کر دیے جائیں، جن کے بارے میں شک ہوسکتا ہے کہ وہ نواقضِ وضو میں سے ہیں، بلکہ ان میں سے بعض کے بارے میں تو کچھ اہلِ علم نے ناقض ہونے کا کہا بھی ہے حالاں کہ تحقیقی نقطۂ نظر سے صحیح یہ ہے کہ وہ نواقضِ وضو نہیں ہیں۔

(1) آگ پر پکی ہوئی اشیا کا کھانا:

ان میں سے سب سے پہلے تو یہی آگ پر پکی ہوئی اشیا کا کھانا ہے، جس کا ذکر ضمنی طور پر چل رہا ہے۔ یہ شروع اسلام میں تو نواقض ہی میں سے تھا، کیوں کہ اس سلسلے میں متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں:

1. صحیح مسلم، سنن اربعہ اور مسندِ احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

«تَوَضَّأُوا مِمَّا مَسَّتِ النَّارُ»[1] ''ہر اس چیز کے بعد وضو کرو، جو آگ پر پکائی گئی ہو۔''

2. اسی طرح صحیح مسلم، سنن نسائی، ابن ماجہ اور مسندِ احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہی الفاظ مروی ہیں اور امام ترمذی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس موضوع کی احادیث حضرت اُمّ حبیبہ، ام سلمہ، زید بن ثابت، ابوطلحہ، ابو ایوب اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں، جن میں سے پانچ کی تخریج علامہ مبارکپوری نے تحفۃ الاحوذی میں کی ہے، جن میں سے

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ٤٣) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٧٨) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٦٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٨٥) صحيح ابن حبان (الموارد)، رقم الحديث (٢١٧) المنتقى مع النيل (١/ ١/ ٢٠٨)

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ والی حدیث بھی صحیح مسلم کی حدیث ہے، جس کے الفاظ بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی احادیث والے ہیں۔

چنانچہ امام ترمذی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ بعض اہلِ علم نے آگ پر پکی چیز کھانے کے بعد وضو کرنے کی رائے ہی اختیار کی ہے۔ کتاب الاعتبار حازمی کے حوالے سے تحفۃ الاحوذی میں اور حازمی کی طرح ہی امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''نیل الأوطار'' میں وضو کرنے کے قائلین میں سے متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین کے اسمائے گرامی بھی ذکر کیے ہیں، پھر امام شوکانی رحمہ اللہ نے خود بھی یہی موقف اختیار کیا ہے اور انھی کی پُرزور تائید کی ہے۔[1]

جب کہ امام ترمذی کے بقول اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین و اہلِ علم کے نزدیک آگ پر پکی چیز کھانے کے بعد وضو کرنا ضروری نہیں ہے، محض مستحب ہے۔ ترکِ وضو کے قائلین میں چاروں خلفاے راشدین سمیت بیس معروف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، جمہور تابعین اور ائمہ اربعہ سمیت جمہور اہلِ علم، اہلِ حجاز اور اہلِ کوفہ رحمہم اللہ سب شامل ہیں۔[2]

علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ نے بھی اکثر اہلِ علم کے اس مسلک ہی کو راجح قرار دیا ہے کہ پکی ہوئی چیز کے کھانے کے بعد وضو ضروری نہیں ہے۔ ان کے دلائل میں سے ایک تو صحیح بخاری و مسلم میں اُمّ المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث ہے، جس میں وہ بیان فرماتی ہیں:

«أَكَلَ النَّبِيُّ ﷺ مِنْ كَتِفِ شَاةٍ، ثُمَّ قَامَ فَصَلَّىٰ، وَلَمْ يَتَوَضَّأْ»[3]

''نبیِ اکرم ﷺ نے بکری کے کندھے کا گوشت کھایا۔ پھر آپ ﷺ کھڑے ہوئے اور نئے سرے سے وضو کیے بغیر نماز ادا فرمائی۔''

دوسری حدیث بھی صحیح بخاری و مسلم ہی میں حضرت عمرو بن امیّہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَحْتَزُّ مِنْ كَتِفِ شَاةٍ، فَأَكَلَ مِنْهَا، فَدُعِيَ إِلَى الصَّلَاةِ

---

[1] شرح صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٤٣) نيل الأوطار (١/ ١/ ٢٠١، ٢٠٨) تحفة الأحوذي (١/ ٢٥٧)

[2] تحفة الأحوذي (١/ ٢٥٨) و نيل الأوطار (١/ ٢٠٨ مفصلًا)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٣١٢) صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ٤٥)

فقَامَ وَطَرَحَ السِّكِّينَ وَصَلَّىٰ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ»[1]

''میں نے دیکھا کہ نبیِ اکرم ﷺ بکرے کے کندھے کا گوشت کاٹ کاٹ کر کھا رہے تھے۔ پھر آپ ﷺ نماز کے لیے پکارے گئے تو آپ ﷺ کھڑے ہو گئے اور چھری پھینک دی، نئے سرے سے وضو کیے بغیر نماز ادا فرمائی۔''

اس حدیث کی شرح میں امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ چھری سے کاٹ کر گوشت کھانا جائز ہے، کیوں کہ کبھی ہو سکتا ہے کہ گوشت سخت ہو یا بکرا بڑا ہو۔ اس ضرورت سے تو پکے ہوئے گوشت کو کاٹ کر کھانا جائز ہے، ورنہ بلاضرورت ایسا کرنے کو اہلِ علم نے مکروہ کہا ہے۔[2] تاہم حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ''فتح الباري'' میں ممانعت والی سنن ابو داود کی حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے اور بہ صورتِ صحت جواز کو صرف ضرورت پر محمول کیا ہے۔[3]

3 وضو کے عدمِ وجوب کی تیسری دلیل سنن اربعہ، صحیح ابن خزیمہ اور ابن حبان میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی وہ حدیث ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«كَانَ آخِرُ الْأَمْرَيْنِ مِنْ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ تَرْكُ الْوُضُوْءِ مِمَّا غَيَّرَتِ النَّارُ»[4]

''آگ پر پکی ہوئی اشیا کو کھانے کے بعد وضو کرنے یا نہ کرنے کے دونوں امور میں سے نبیِ اکرم ﷺ کا آخری امر ترکِ وضو تھا۔''

ان احادیث کی رو سے معلوم ہوا کہ کھانا کھانے کے بعد وضو کرنا ضروری نہیں، بشرطیکہ اونٹ کا گوشت نہ ہو۔ اگر وہ ہو تو پھر وضو واجب ہے۔ فتح الباری میں ہے:

''امام دارمی سے نقل کرتے ہوئے امام بیہقی لکھتے ہیں کہ جب کسی موضوع کی احادیث مختلف و متعدد اور صحیح ہوں اور ان میں سے راجح کا پتا بھی نہ چلے تو پھر ہم دیکھیں گے کہ

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٣١١) صحيح مسلم (٢/ ٤/ ٤٥)

[2] شرح صحيح مسلم للنووي (٢/ ٤/ ٤٥)

[3] فتح الباري (١/ ٣١٢)

[4] سنن أبي داود (١/ ٣٢٧) سنن الترمذي (١/ ٢٥٨) مفصلًا، و صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٧٩) و سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٨٩) التلخيص الحبير (١/ ١/ ١١٦) مختصراً، موارد الظمآن، رقم الحديث (٢١٨، ٢٢٠، ٣٢١)

نبیِ اکرم ﷺ کے خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم کا عمل کیا تھا؟ پھر ان کے عمل والی جانب کو راجح قرار دیں گے (اور وہ ترکِ وضو ہے)۔''

"المجموع شرح المهذب" میں امام نووی رحمہ اللہ نے اسی بات پر رضا مندی کا اظہار کیا ہے اور شرح مسلم میں وہ فرماتے ہیں کہ صحابہ و تابعین کے مابین یہ اختلافِ رائے معروف تھا۔ پھر اس بات پر اجماع ہو گیا کہ آگ پر پکی چیز سے وضو واجب نہیں، سوائے اونٹ کے گوشت کے کہ وہ مستثنیٰ ہے۔

امام خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جن احادیث میں وضو کرنے کا حکم ہے، انھیں استحباب پر محمول کیا جائے نہ کہ وجوب پر۔ امام ابوالبرکات المجد ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی "منتقیٰ الأخبار" میں کچھ ایسی ہی بات فرمائی ہے کہ جن احادیث میں ترکِ وضو کا ذکر ہے، وہ وجوب کی نفی کرتی ہیں نہ کہ استحباب کی۔[1]

ہاتھ دھونا اور کلی کرنا:

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ اہلِ جاہلیت صفائی ستھرائی پر زیادہ توجہ دینے کے عادی نہیں تھے۔ لہٰذا شروع اسلام میں کھانا کھانے کے بعد وضو کا حکم دیا گیا تھا اور جب اسلامی تعلیمات نے نظافت اور صفائی کی اہمیت لوگوں کے دلوں میں جاگزیں کر دی تو پھر کھانا کھانے کے بعد وضو کا وجوب بھی منسوخ کر دیا گیا اور چکناہٹ والی اشیا کھانے پینے کے بعد پورا وضو استحباباً بھی کیا جائے تو حرج نہیں، لیکن بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم کلی کر لی جائے اور ہاتھ دھو لیے جائیں۔ چنانچہ صحیح مسلم، سنن ابو داود، ترمذی اور ابن ماجہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

« إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ شَرِبَ لَبَناً فَمَضْمَضَ، وَقَالَ: إِنَّ لَهٗ دَسْماً »[2]

''نبیِ اکرم ﷺ نے دودھ پیا اور کلی کی اور فرمایا کہ اس کی چکناہٹ ہوتی ہے۔''

امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ اس سے دودھ پینے کے بعد کلی کرنے کے استحباب کا پتا چلتا ہے اور اہلِ علم نے کہا ہے کہ دودھ کی طرح ہی دوسری اشیاے خور و نوش کو

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: شرح صحيح مسلم للنووي (٢/ ٤/ ٤٣) فتح الباري (١/ ٣١١) المنتقى مع النيل (١/ ١/ ٢٠٩) تحفة الأحوذي (١/ ٢٦١)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٣١٣) صحيح مسلم مع النووي (٢/ ٤/ ٤٦) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٨٠) صحيح سنن الترمذي (٧٧) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٨١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٩٨)

کھانے یا پینے کے بعد بھی کلی مستحب ہے۔[1]

سنن ابن ماجہ میں مذکورہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

« مَضْمِضُوا مِنَ اللَّبَنِ »[2] ''دودھ پی کر کلی کرو۔''

سنن ابن ماجہ ہی میں حضرت اُم سلمہ اور سہل بن سعد رضی اللہ عنہما سے بھی حسن سند کے ساتھ یہی الفاظ مروی ہیں، جن سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ دودھ پینے کے بعد کلی کرنا واجب ہے، کیوں کہ ان میں امر کا صیغہ ہے، جو عموماً وجوب کے لیے ہوتا ہے، لیکن فتح الباری میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہاں استحباب کے لیے ہے، جس کی دلیل یہ ہے کہ اسی حدیثِ مذکور کے راوی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت امام شافعی رحمہ اللہ نے بیان کی ہے کہ انھوں نے دودھ پیا اور کلی کی اور یہ بھی فرما دیا:

"لَوْ لَمْ أَتَمَضْمَضْ مَا بَالَيْتُ" ''اگر میں کلی نہ کروں تو بھی پروا نہیں۔''

مذکورہ الفاظ کے استحباب پر دلالت کرنے کی دوسری دلیل سنن ابو داود میں حسن سند کے ساتھ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث بھی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

« إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ شَرِبَ لَبَناً فَلَمْ يَتَمَضْمَضْ »[3]

''نبی اکرم ﷺ نے دودھ پیا اور کلی نہیں کی۔''

اسی مقام پر صاحبِ فتح الباری لکھتے ہیں:

« إِنَّ لَهٗ دَسْماً » ''اس میں چکناہٹ ہوتی ہے۔'' کے الفاظ میں کلی کی وجہ بتائی گئی ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ ہر چکنی چیز کھانے یا پینے کے بعد کلی کرنا مستحب ہے اور اسی سے یہ استنباط بھی کیا جاسکتا ہے کہ ہر چکنی چیز کھانے کے بعد نظافت و صفائی کی غرض سے ہاتھوں کا دھونا بھی مستحب ہے۔[4]

امام نووی رحمہ اللہ نے شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ کھانا کھانے سے پہلے اور بعد میں ہاتھوں کو دھونے کے مستحب ہونے کے بارے میں اہلِ علم کے مختلف اقوال ہیں، جن میں سے صحیح تر یہی ہے کہ کھانا کھانے سے پہلے ہاتھوں کا دھونا مستحب ہے۔ سوائے اس کے کہ اسے یقین ہو کہ اس کے ہاتھ

---

[1] شرح صحيح مسلم للنووي (٢/ ٤/ ٤٦)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٩٨) صحيح الجامع، رقم الحديث (٥٨٧٤)

[3] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٨١)

[4] فتح الباري (١/ ٣١٣)

گندگی اور میل کچیل سے پاک و صاف ہیں اور کھانا کھانے کے بعد بھی یہ مستحب ہے، سوائے اس کے کہ کھانا وغیرہ خشک ہونے کی وجہ سے اس کا کوئی اثر اس کے ہاتھوں پر باقی نہ رہا ہو۔[1]

یہ مسئلہ کھانے پینے کے آداب سے متعلقہ ہے۔ جو یہاں ضمنی طور پر آ گیا ہے، لہٰذا اس کی تفصیل اس کے اصل مقام پر آئے گی۔ ان شاء اللہ

2 عورت کو چھونا:

وہ اُمور جن سے وضو نہیں ٹوٹتا، ان میں سے دوسرا ہے عورت کا چُھو جانا، اس کے متعدد دلائل ہیں، جن میں سے پہلی دلیل وہ واقعہ ہے، جو صحیح مسلم، سنن ترمذی اور بیہقی میں مذکور ہے، جس میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں:

«فَقَدْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ لَيْلَةً مِّنَ الْفِرَاشِ فَالْتَمَسْتُهُ فَوَقَعَتْ يَدِيْ عَلٰى بَاطِنِ قَدَمَيْهِ وَهُوَ فِيْ الْمَسْجِدِ وَهُمَا مَنْصُوْبَتَانِ»

''ایک دن رات میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو بستر پر نہ پایا۔ میں آپ ﷺ کو تلاش کرنے لگی تو میرا ہاتھ آپ ﷺ کے قدموں پر لگا، جب کہ آپ ﷺ سجدے کی حالت میں تھے اور آپ ﷺ کے دونوں پاؤں کھڑے تھے۔''

اسی حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے وہ دعا بھی مروی ہے، جو اس وقت آپ ﷺ سجدے میں فرما رہے تھے اور وہ یہ ہے:

«اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ أَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ، وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ، وَأَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ، لَا أُحْصِيْ ثَنَآءً عَلَيْكَ، أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ»[2]

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عورت کو چھونا ناقضِ وضو نہیں ہے۔ یہ بات ایک دوسری حدیث میں اور بھی واضح تر ہے، جو صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

---

[1] شرح صحیح مسلم مع النووي (٢/ ٤/ ٤٦)

[2] صحیح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ٢٠٣) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (٧٨٢) صحیح الجامع، رقم الحدیث (١٢٨٠) یہ حدیث صحیح سنن الترمذي، رقم الحدیث (١٨٢٤) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١١٧٩) میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس میں مذکور ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ یہ دعا وتر میں پڑھا کرتے تھے۔ المنتقی مع النیل (١/ ١/ ١٩٦)

سے مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتی ہیں:

« كُنْتُ أَنَامُ بَيْنَ يَدَيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَرِجْلَایَ فِيْ قِبْلَتِهٖ، فَإِذَا سَجَد غَمَزَنِيْ فَقَبَضْتُ رِجْلَيَّ »

''میں نبیِ اکرم ﷺ کے سامنے سو جاتی اور میرے پاؤں نبیِ اکرم ﷺ کی جاے سجدہ پر ہوتے تھے۔ جب آپ ﷺ سجدہ کرتے تو چوکا فرماتے، تب میں اپنے پاؤں سمیٹ لیتی۔''

آگے اسی طرح سونے کی وجہ بیان کرتی اور فرماتی ہیں:

« وَالْبُيُوْتُ يَوْمَئِذٍ لَيْسَ فِيْهَا مَصَابِيْحُ »[1]

''ان دنوں گھروں میں چراغ نہیں ہوا کرتے تھے۔''

اس حدیث کے اطراف کو امام بخاری رحمہ اللہ اپنی صحیح میں تیرہ مقامات پر لائے ہیں اور اس سے متعدد مسائل کا استنباط کیا گیا ہے۔ مثلاً:

1. سب سے پہلے ''کتاب الصلاۃ، باب الصلاۃ علیٰ الفراش'' کے تحت لائے ہیں کہ اپنے بستر پر نماز پڑھی جا سکتی ہے اور ظاہر ہے کہ بستر سے مراد بیڈ یا چارپائی نہیں، زمین پر ڈالا ہوا بستر ہے۔

2. اسی سے یہ استدلال بھی کیا جاتا ہے کہ عورت کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ فتح الباری میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کئی احتمال ذکر کیے ہیں کہ شاید اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاؤں ننگے نہ ہوں، بلکہ کوئی کپڑا حائل ہو یا پھر یہ نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ ہی خاص ہو، لیکن امام شوکانی رحمہ اللہ نے ان کے احتمالات کو ظاہری الفاظ کی خلاف ورزی اور تکلّفِ محض قرار دیا ہے۔[2]

صحیح بخاری کے اسی باب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سونے کے طریقے کی وضاحت بھی موجود ہے، جو حضرت عروہ بن زبیر رحمہ اللہ کے الفاظ میں یوں ہے:

« إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُصَلِّيْ، وَعَائِشَةُ مُعْتَرِضَةٌ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ، عَلَى الْفِرَاشِ الَّذِيْ يَنَامَانِ عَلَيْهِ »

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٤٩١) صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ٢٢٩) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٦٥٦، ٦٥٧، ٦٥٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٦٢)

[2] نيل الأوطار (١/ ١/ ١٩٥)

''نبیِ اکرم ﷺ نماز ادا فرماتے، جب کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کے اور قبلے کے مابین اس بستر پر ہوتیں، جس پر وہ سویا کرتے تھے۔''

دوسری حدیث میں ہے:

«وَهِيَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ عَلٰى فِرَاشِ أَهْلِهِ إِعْتِرَاضَ الْجَنَازَةِ»[1]

''جب کہ وہ آپ ﷺ کے اور قبلے کے ما بین اسی طرح ہوتیں، جیسے کسی کے سامنے جنازہ پڑا ہو۔''

اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اگر سامنے کوئی سویا یا لیٹا ہوا ہو تو نماز ہو جاتی ہے، مکروہ نہیں، جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے اور اس کراہت پر دلالت کرنے والی احادیث کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے، اگر بالفرض وہ صحیح ثابت بھی ہو جائیں تو ان کو اس صورت پر محمول کیا جائے گا کہ اگر نمازی کی سوچ وفکر کے مشغول ہو جانے کا غالب خدشہ ہو تو پھر ایسا نہ کرے۔[2]

③ تیسرا مسئلہ ''صحیح البخاري، باب الصلاۃ إلیٰ السریر'' میں مذکور ہے کہ سامنے چارپائی پر کوئی سویا یا لیٹا ہوا ہو تو اس جگہ نماز ادا کی جا سکتی ہے، جیسا کہ اس باب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ میں ہے:

«لَقَدْ رَأَيْتُنِيْ مُضْطَجِعَةً عَلَى السَّرِيْرِ فَيَجِيءُ النَّبِيُّ ﷺ فَيَتَوَسَّطُ السَّرِيْرَ فَيُصَلِّيْ»[1]

''میں چارپائی پر لیٹی ہوتی تو نبیِ اکرم ﷺ آتے اور چارپائی کو اپنے سامنے رکھ کر اس کے وسط میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے۔''

④ آگے ایک باب میں چوتھا مسئلہ یہ اخذ کیا گیا ہے کہ نمازی کے سامنے اس کا کوئی ساتھی ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، وہ اس کی نماز منقطع نہیں کرتا اور اس سے آگے ''باب الصلاۃ خلف النائم'' میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے الفاظ ہیں:

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٤٩٢) صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ٢٢٨، ٢٢٩)

[2] فتح الباري (١/ ٤٩٢)

[3] صحيح البخاري (١/ ٥٥١، ٥٨٧)

« كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّي وَأَنَا رَاقِدَةٌ مُعْتَرِضَةٌ عَلٰى فِرَاشِهِ فَإِذَا أَرَادَ أَنْ يُّوْتِرَ أَيْقَظَنِي فَأَوْتَرْتُ »[1]

''نبیِ اکرم ﷺ نماز ادا فرماتے، جب کہ میں سامنے آپ ﷺ کے بستر پر سورہی ہوتی تھی اور جب آپ ﷺ وتر پڑھنا چاہتے تو مجھے بھی بیدار کر دیتے اور میں بھی وتر پڑھ لیتی۔''

⑤ ان الفاظ سے یہ بھی استدلال کیا گیا ہے کہ سامنے کوئی سویا ہوا ہو تو نماز ہو جاتی ہے۔ اس حدیث کی شرح میں صاحبِ فتح الباری لکھتے ہیں کہ امام بخاری نے یہ باب قائم کر کے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ سوئے ہوئے شخص کے سامنے نماز پڑھنے کی ممانعت کا پتا دینے والی احادیث ضعیف ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث سنن ابو داود اور ابن ماجہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جس کے بارے میں خود امام ابو داود نے کہا ہے کہ اس کے تمام طُرق واہی ہیں۔ اسی طرح ''الكامل لابن عدي'' میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے اور ''المعجم الأوسط'' میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایات بھی ہیں، مگر ان دونوں کی اسانید بھی واہی ہیں۔[2]

⑥ آگے چل کر ''باب التطوع خلف المرأة'' میں چھٹا مسئلہ یہ اخذ کیا گیا ہے کہ سامنے عورت لیٹی ہو تو نفلی نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

⑦ ''باب من قال: لا يقطع الصلاة شيئ'' میں ساتواں مسئلہ یہ اخذ کیا گیا ہے کہ کوئی چیز نماز نہیں توڑتی۔

⑧ ایک باب میں آٹھواں مسئلہ یہ اخذ کیا گیا ہے کہ نماز کے دوران میں اگر عورت کے پاؤں وغیرہ سے چھو جائے تو اس کی نماز صحیح ہے۔ یہاں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب اس کی نماز صحیح ہے اور سجدے میں وہ عورت کو ہاتھ سے چھو کر پاؤں سمیٹنے کا کہہ سکتا ہے اور نماز جاری رکھ سکتا ہے تو پھر عورت کو چھونا ناقضِ وضو بھی نہیں ہو سکتا۔

⑨ آگے چل کر ایک باب میں اسی حدیث سے اَخذ کیا گیا ہے کہ آدمی نمازِ تہجد کے وقت اپنی اہلیہ کو جگا سکتا ہے، جیسا کہ ''باب إيقاظ النبي ﷺ أهله بالوتر'' سے پتا چلتا ہے۔[3]

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٥٨٧)

[2] فتح الباري (١/ ٥٨٧)

[3] فتح الباري (٢/ ٤٨٧)

⑩ اسی حدیث سے یہ بھی اخذ کیا گیا ہے کہ نماز کے دوران میں اتنے فعل سے نماز پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔[1]

⑪ بخاری شریف کے ایک باب میں اس حدیث سے گیارھواں مسئلہ یہ لیا گیا ہے کہ چارپائی کا استعمال جائز ہے، یہ تقوے اور پرہیز گاری کے خلاف نہیں۔[2]

⑫ بارھواں مسئلہ یہ ہے کہ شوہر کے جاگتے ہوئے بیوی سو سکتی ہے۔

عورت کے چھونے کے ناقضِ وضو نہ ہونے کی تیسری دلیل سننِ اربعہ اور مسندِ احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، وہ فرماتی ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَبَّلَ بَعْضَ نِسَائِهِ، ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الصَّلَاةِ، وَلَمْ يَتَوَضَّأْ»

''نبیِ اکرم ﷺ نے اپنی کسی زوجہ محترمہ کا بوسا لیا اور پھر نماز کے لیے گئے اور وضو نہ کیا۔''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرنے والے راوی ان کے بھانجے حضرت عروہ بن زبیر رحمہ اللہ ہیں، جو حضرت اسما بنت صدیق رضی اللہ عنہا کے بیٹے تھے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے ان سے یہ بات سن کر کہا:

''مَنْ هِيَ إِلَّا أَنْتِ؟ قَالَ: فَضَحِكَتْ''[3]

''آپ کے سوا وہ کون ہو سکتی ہے؟ کہتے ہیں: وہ ہنس دیں۔''

امام ابو داود رحمہ اللہ نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد اسے مرسل کہا ہے اور امام نسائی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مرسل ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے موضوع کی یہ بہترین حدیث ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے امام بخاری رحمہ اللہ سے اس روایت کی تضعیف نقل کی ہے، لیکن امام شوکانی رحمہ اللہ کے بقول اس حدیث کا ضعف دوسری صحیح احادیث کی وجہ سے زائل ہو جاتا ہے، گویا اس حدیث کی سند ضعیف ہے تو پھر بھی کوئی مضایقہ نہیں، کیوں کہ صحیحین کی دوسری احادیث شاہد ہیں کہ عورت کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ یہ حدیث معرضِ استدلال نہ سہی، صرف تائید کے لیے ہی سہی، مگر صحیح احادیث جو موجود ہیں۔

ایک چوتھی حدیث بھی صحیح بخاری و مسلم اور دوسری کتب میں موجود ہے۔ شرح السنہ میں امام بغوی رحمہ اللہ

---

[1] فتح الباري (٣/ ٨٠)

[2] فتح الباري (١١/ ٦٧)

[3] صحيح سنن أبي داود (١/ ٣٦) سنن أبي داود مع العون (١/ ٣٠١) سنن الترمذي مع تحفة الأحوذي (١/ ٢٨١) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٧٥) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (١٦٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٠٢) المنتقى مع النيل (١/ ١/ ١٩٥)

نے اس سے بھی استدلال کیا ہے کہ کسی محرم عورت کے چھو جانے سے وضو نہیں ٹوٹتا، اگرچہ اس حدیث میں جوان عورت نہیں، بلکہ بچی کا ذکر ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں ایک واقعہ مذکور ہے کہ حضرت ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُصَلِّي وَهُوَ حَامِلٌ أُمَامَةَ بِنْتَ زَيْنَبَ بِنْتِ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ وَأَبِي الْعَاصِ بْنِ رَبِيعَةَ بْنِ عَبْدِ شَمْسٍ، فَإِذَا سَجَدَ وَضَعَهَا وَإِذَا قَامَ حَمَلَهَا»[1]

''نبیِ اکرم ﷺ نے نماز ادا فرمائی، جب کہ آپ ﷺ اپنی نواسی حضرت زینب رضی اللہ عنہا اور ابو العاص رضی اللہ عنہ کی بیٹی امامہ رضی اللہ عنہا کو اٹھائے ہوئے تھے۔ جب آپ ﷺ سجدہ میں جاتے تو اسے بٹھا لیتے اور جب کھڑے ہوتے تو اسے اٹھا لیتے۔''

امام ابن دقیق العید رحمہ اللہ نے بھی دیگر مسائل کے علاوہ اس حدیث سے اخذ کیا ہے کہ چھوٹے بچوں کو چھونا وضو پر کوئی اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس حدیث کی شرح میں حافظ عسقلانی رحمہ اللہ نے یہ احتمال ذکر کیا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ بچی کو کپڑوں کے اوپر ہی سے چھوتے ہوں گے۔ لیکن یہ احتمال بھی بلاشبہہ تکلّفِ محض ہے، کیوں کہ امام بغوی کے بقول بچی کے جسم کا کوئی حصہ تو کپڑے کے بغیر بھی ہوگا، جو نبیِ اکرم ﷺ کو بھی لگتا ہوگا، لہٰذا کپڑے وغیرہ کا حائل ہونا یہاں بھی ویسا ہی ہوا، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث میں ہے۔ یاد رہے کہ اسی حدیث والے امامہ رضی اللہ عنہا سے متعلق واقعہ کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ جب سجدے سے اٹھتے ہوئے نبیِ اکرم ﷺ امامہ رضی اللہ عنہا کو اٹھا لیتے تھے تو اگر کسی کے سر سے ٹوپی گر جائے تو وہ بھی اٹھا کر سر پر رکھ سکتا ہے۔ ٹوپی یا عمامہ اٹھانا کیا حضرت امامہ رضی اللہ عنہا کو اٹھانے سے کوئی بڑا فعل ہے؟ ہرگز نہیں۔

ان تمام احادیث کی بنا پر حضرت علی، ابی بن کعب اور ابن عباس رضی اللہ عنہم اور امام عطا، طاؤس، ثوری، مجاہد، حسن بصری، عبید بن عمیر، سعید بن جبیر، شعبی، قتادہ، مقاتل بن حیان، امام ابو حنیفہ اور ابو یوسف رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ عورت کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔[2]

---

[1] صحيح البخاري (١/ ٥٩٠) صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٥/ ٣١، ٣٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٨١١، ٨١٢، ٨١٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٨٧) شرح السنة للبغوي (٣/ ٢٦٥)

[2] تفسير الطبري (٨/ ٣٨٩، ٣٩٢ بتخريج أحمد شاكر طبع مصر) نيل الأوطار (١/ ١/ ١٩٤) فتح القدير للشوكاني (١/ ٤٧٠ بيروت) عون المعبود (١/ ٣٠٢) تحفة الأحوذي (١/ ٢٨٢)

قائلینِ نقض کے دلائل اور ان کا جائزہ:

حضرت عمر بن خطاب، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم، امام زہری، شافعی اور ان کے اصحاب، نیز ربیعہ اور زید بن اسلم رحمہم اللہ کے نزدیک عورت کو چھونے سے وضوٹوٹ جاتا ہے۔ ان کا استدلال بعض احادیث اور قرآنِ کریم کی ایک آیت سے ہے۔

پہلی دلیل:

آیتِ تیمّم یعنی سورۃ النساء (آیت:۴۳) اور سورۃ المائدہ (آیت:۶) میں جو یہ الفاظ ہیں:

﴿اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا﴾

''یا تم عورتوں سے ہم بستر ہوئے ہو اور تمھیں پانی نہ ملے تو پاک مٹی لو اور منہ اور ہاتھوں کا مسح (کر کے تیمّم) کرلو۔''

اس آیت کے ان الفاظ میں جو لفظ ﴿لٰمَسْتُمُ﴾ ہے، اس کا لغوی معنیٰ لمس کرنا اور چھونا ہے، عورت کو چھونے کے نواقضِ وضو ہونے کی رائے رکھنے والوں نے اس سے یہی استدلال کیا اور کہا ہے کہ قرآنِ کریم کے مذکورہ مقام پر اس ''لمس'' کا یہی معنیٰ ہے۔ جبکہ پہلے مسلک والوں نے وہاں اس لفظ کا مجازی معنیٰ صحبت و جماع مراد لیا ہے اور صرف مس کرنے کو ناقض نہیں کہا۔

لمس کا معنیٰ:

قائلینِ نقض کی دلیلِ اوّل سورۃ النساء و سورۃ المائدہ کی آیتِ تیمّم ہے اور اگر قرآن کے ان مقامات پر ﴿اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ﴾ میں لمس کو اس کے لغوی و حقیقی معنوں پر ہی محمول کیا جائے تو بات بن جاتی ہے، لیکن وہاں حقیقی معنیٰ مراد نہیں، بلکہ مجازی معنیٰ مراد ہے اور لمس یا چھونا جماع کرنے سے کنایہ ہے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر مفسرینِ کرام رحمہم اللہ کی آرا:

رئیس المفسّرین حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر سے پتا چلتا ہے اور یہ وہی مفسر ہیں، جو ''ترجمان القرآن'' کے نام سے معروف ہیں اور صحیح بخاری و مسلم اور مسندِ احمد میں مذکور حدیث کی رو سے ان کے لیے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی تھی:

«اَللّٰھُمَّ فَقِّھْهُ فِي الدِّیْنِ»[1] ''اے اللہ! انھیں دین کی سمجھ عطا فرما۔''

صحیح بخاری ہی کی ایک دوسری حدیث میں ہے:

«اَللّٰھُمَّ عَلِّمْهُ الْکِتَابَ»[2] ''اے اللہ! انھیں قرآن کا علم عطا فرما۔''

امام ابن کثیر اور طبری رحمہما اللہ:

امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں سورۃ النساء کی آیت کے تحت لکھا ہے کہ مفسّرین اور ائمہ کرام کے اس لفظ ﴿لٰمَسْتُمُ﴾ کے معنیٰ کے سلسلے میں دو الگ الگ قول ہیں، جن میں سے ایک تو یہ ہے کہ یہاں لمس سے مراد جماع ہے، کیوں کہ قرآنِ کریم ہی کے دوسرے دو مقامات پر بھی مس کرنے یا چھونے سے جماع ہی مراد لیا گیا ہے، جیسا کہ سورۃ البقرہ (آیت: ۲۳۷) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْھُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْھُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَھُنَّ فَرِیْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ یَّعْفُوْنَ اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِهٖ عُقْدَةُ النِّکَاحِ﴾

''اور اگر تم عورتوں کو اُن کے پاس جانے سے پہلے طلاق دے دو، لیکن مہر مقرر کر چکے ہو تو آدھا مہر دینا ہوگا، ہاں اگر عورتیں بخش دیں یا مرد جن کے ہاتھ میں عقدِ نکاح ہے (اپنا حق) چھوڑ دیں۔''

اس آیت میں مس سے مراد جماع ہے۔ اسی طرح سورۃ الاحزاب (آیت: ۴۹) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَکَحْتُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْھُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْھُنَّ فَمَا لَکُمْ عَلَیْھِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَھَا﴾

''مومنو! جب تم مومن عورتوں سے نکاح کر کے اُن کو ہاتھ لگانے (اُن کے پاس جانے) سے پہلے طلاق دے دو، تو تم کو کچھ اختیار نہیں کہ اُن سے عدت پوری کرواؤ۔''

اس آیت میں بھی مس بہ معنیٰ جماع ہی ہے۔ تفسیر القرآن بالقرآن کے طور پر یہ دو آیتیں ذکر کرنے کے بعد امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے متعدد اسانید کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اقوال

---

[1] صحیح البخاري مع الفتح (١/ ٢٤٤) مختصر صحیح مسلم للمنذري، رقم الحدیث (١٦٩٠) المعجم المفهرس (٥/ ١٩٠ لیڈن)

[2] صحیح البخاري مع فتح الباري (١/ ١٦٩)

ذکر کیے ہیں، جن میں سے ہر ایک میں انھوں نے اس جگہ لمس یا مس کا معنیٰ جماع ہی کیا ہے اور لکھا ہے کہ حضرت علی، ابی بن کعب رضی اللہ عنہما، امام مجاہد، طاوس، حسن بصری، عبید بن عمیر، سعید بن جبیر، شعبی، قتادہ اور مقاتل بن حیان رحمہم اللہ سے بھی یہی معنیٰ مروی ہے۔ آگے لمس کو چھونے کے معنیٰ میں لینے والوں کا تذکرہ کرنے کے بعد امام ابن جریر رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں لکھا ہے:

”وَأَوْلٰی الْقَوْلَیْنِ فِيْ ذٰلِكَ بِالصَّوَابِ قَوْلُ مَنْ قَالَ عَنٰی اللّٰهُ بِقَوْلِهٖ: ﴿أَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ﴾ اَلْجِمَاعَ دُوْنَ غَیْرِهٖ مِنْ مَعَانِيْ اللَّمْسِ لِصِحَّةِ الْخَبَرِ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ أَنَّهٗ قَبَّلَ بَعْضَ نِسَآئِهٖ ثُمَّ صَلّٰی، وَلَمْ یَتَوَضَّأْ“[1]

”ان دونوں مذکورہ اقوال میں سے صحیح تر قول انھی کا ہے، جو اس ارشادِ الٰہی ﴿أَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ﴾ میں لمس کو جماع سے کنایہ قرار دیتے ہیں اور لمس کے دوسرے معانی میں سے کوئی معنیٰ نہیں لیتے، ان کے قول کے صحیح تر ہونے کی دلیل یہ ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ سے صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی کسی زوجہ محترمہ کا بوسا لینے کے بعد نماز پڑھی، مگر وضو نہیں کیا۔“

پھر آگے وہ احادیث بھی ذکر کی ہیں، جو ہم بالتفصیل ذکر کر چکے ہیں۔

امام طبری رحمہ اللہ نے ”جامع البیان عن تأویل آي القرآن“ (۸/ ۵۱) میں سورۃ النساء (آیت: ۴۳) کی تفسیر بیان کی ہے۔ جب کہ صفحہ (۳۸۹ تا ۳۹۹) پر مسئلہ زیرِ بحث ہے۔ انھوں نے دونوں اقوال سے متعلقہ احادیث و آثار با سند ذکر کیے ہیں اور ترجیح اسی کو دی ہے کہ یہاں مس سے مراد جماع ہے اور محض چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے۔[2]

تفسیرِ مجاہد:

مولانا عبد الرحمٰن سورتی نے امام مجاہد رحمہ اللہ کی جو تفسیر جمع کی ہے اور حاکمِ قطر کے اخراجات پر شائع ہوئی ہے، اس (ص: ۱۵۹) میں تفسیر طبری کے حوالے سے امام مجاہد اور حسن بصری رحمہما اللہ سے بھی ملامست سے مراد جماع ہی لکھا ہے۔[3]

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۵۰۲، ۵۰٤) دار المعرفة، بیروت.

[2] طبري (۸/ ۳۸۹، ۳۹۹)

[3] تفسیر مجاهد (ص: ۱۵۹) طبع قطر.

زاد المسیر:

علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر ''زاد المسیر'' میں سورۃ النساء کی آیت (۴۳) کے تحت لکھا ہے کہ ملامست سے مراد کے بارے میں دو قول ہیں، پھر ان دونوں کو ذکر کیا ہے، جب کہ ترجیح جماع والی مراد ہی کو دی ہے۔[1]

تفسیر قرطبی:

امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر ''الجامع لأحکام القرآن'' میں سورۃ النساء کی آیت (۴۳) کے تحت بڑی تفصیل بیان کی ہے۔ اس آیت سے انھوں نے اکتالیس مسائل کا استنباط و استخراج کیا ہے، جو اکتالیس صفحات پر محیط ہیں اور مسئلہ (۲۶) اسی لمس سے تعلق رکھتا ہے، جس کے بارے میں انھوں نے مختلف اقوال ذکر کیے ہیں اور دونوں معروف مذاہب یعنی مطلقاً نقضِ وضو یا عدمِ نقض کے بجائے ایک تیسرے مسلک کی بھرپور تائید کی ہے:

ایک درمیانی راہ:

امام مالک، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور لیث بن سعد رحمہم اللہ سے ایک تیسرا مسلک مروی ہے، جس میں مذکورہ دونوں مذاہب کی نسبت درمیانی راہ اختیار کی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص شہوت کے داعیے سے عورت کو چھوئے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے اور اگر اس کے بغیر ہو تو پھر نہیں ٹوٹے گا۔ اس مسلک کو امام قرطبی رحمہ اللہ نے سب سے شدید ترین قرار دیا ہے۔[2]

فی ظلال القرآن:

دَورِ حاضر کی معروف کتبِ تفسیر میں سے ایک کتاب ''في ظلال القرآن'' ہے، جس میں سید قطب شہید رحمہ اللہ نے بھی لمس کے بارے میں چار قسم کے اقوال ذکر کیے ہیں اور آخر میں لکھا ہے کہ ہمارے نزدیک ﴿أَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ﴾ میں لمس سے مرادی معنیٰ وہی ہے، جس سے غسل واجب ہوتا ہے، یعنی جماع، پھر وہ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک ترجیح اسی معنیٰ کو حاصل ہے۔[3]

---

[1] زاد المسیر (۲/ ۹۲، ۹۳) طبع المکتب الإسلامي.

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تفسیر القرطبي (۳/ ۵/ ۲۲۳، ۲۲۸) طبع قاھرہ.

[3] في ظلال القرآن (۲/ ۶۶۸، ۶۶۹) دار الشروق، بیروت و قاھرہ.

فتح القدیر:

امام شوکانی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر ''فتح القدیر'' میں اس مسئلے سے متعلق متعدد اقوال ذکر کیے ہیں اور لکھا ہے کہ ہر قول والے کے پاس دلائل ہیں اور وہ سمجھتا ہے کہ اسی کا قول سب سے زیادہ صحیح ہے، حالاں کہ دوسرے اقوال کے صحیح ہونے کا بھی احتمال موجود ہے۔ خود اُن کا اپنا رجحان اسی طرف ہے کہ عورت کو چھونے سے وضو واجب نہیں ہوتا۔ انھوں نے وجوب والوں کے دلائل کا بڑے علمی انداز سے رد کیا ہے، جس کی تفصیل ''فتح القدیر'' (١/ ٤٧٠۔ ٤٧٤) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

تفسیر روح المعانی:

علامہ آلوسی نے سورۃ النساء کی آیت (۴۳) کے تحت اپنی تفسیر ''روح المعاني'' (٣/ ٥/ ٤١، ٤٢ طبع بیروت) میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ﴿لٰمَسْتُمُ﴾ سے مراد جماع ہی لی ہے، مگر تصریح کے بجائے کنائے سے کام لیا ہے، پھر انھوں نے اپنی تفسیر میں مختلف اقوال بھی بیان کیے ہیں اور ان کے دلائل بھی نقل کیے ہیں۔ البتہ ان کے نزدیک بھی اولیت اسی بات کو حاصل ہے کہ چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔

تفسیر المنار:

ماضی قریب کے مشہور محقق علامہ محمد رشید رضا مصری اپنی تفسیر ''المنار'' میں لکھتے ہیں کہ یہاں عورتوں کو چھونا جماع اور صحبت کرنے سے کنایہ ہے، آگے چل کر علامہ رشید رضا اپنے استاذ الامام محمد عبدہٗ کی جامع ازہر میں بیان کردہ اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

''میں نے اس کی تفسیر معلوم کرنے کے لیے تفسیر کی پچیس کتابوں کا مطالعہ کیا، لیکن میری تسلی نہیں ہوئی اور نہ ان سب میں سے کوئی ایک بھی قول ایسا ملا جو تکلف سے پاک ہو، پھر میں نے صرف قرآنِ کریم کو لیا اور اس کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس آیت کا معنیٰ بڑا واضح اور جلی ہے۔''

اپنے استاد کی گفتگو کو مختصر کرتے اور سمیٹتے ہوئے علامہ موصوف لکھتے ہیں:

''جب انھیں پچیس کتبِ تفسیر میں سے بھی تکلفات سے بالا کوئی قول نہ ملا، تو میں نے

اس مقام کی تفسیر لکھتے وقت "روح المعاني" آلوسی رحمہ اللہ کے سوا دوسری کوئی تفسیر نہیں دیکھی اور یہ تالیف کے اعتبار سے سب سے آخری تفسیر ہے۔ اس کے مولف بڑے وسیع المطالعہ بھی ہیں، مگر روح المعانی کے حوالے سے معلوم ہوا کہ انھوں نے اس آیت کو معضلات القرآن میں سے شمار کیا ہے، حالانکہ واللہ یہ آیت معضل ہے نہ مشکل اور نہ قرآن میں کوئی دوسری آیت ہی معضل ہے۔"

آگے موصوف نے قرآن کو اپنی مرضی کے معانی پہنانے والوں اور قرآن کو اپنے نظریات و مذاہب کے مطابق ڈھالنے کا خوب نوٹس لیا ہے، جو قابلِ مطالعہ ہے مگر ہمارے موضوع سے خارج ہے، اگر کوئی چاہے تو تفسیر المنار (۵/ ۱۱۹۔ ۱۲۱) طبع دار المعرفہ بیروت کو دیکھ سکتا ہے۔

غرض کہ علامہ رشید رضا نے مذہبی تعصب اور تکلفات سے پاک ہو کر قرآنِ کریم کا مطالعہ کرنے کی شکل میں ﴿اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ﴾ میں چھونے کو جماع سے کنایہ قرار دیا ہے۔ خود ہم نے بھی جب "روح المعاني" کا مطالعہ کیا تو دیگر تفصیلات سے قطع نظر یہی لکھا ہے کہ علامہ آلوسی نے بھی چھونے کو جماع وصحبت سے کنایہ قرار دینے ہی کو اولیت دی ہے، اگرچہ دیگر اقوال بھی ذکر کیے ہیں، جن کا تذکرہ مختصراً گزر چکا ہے۔ تفصیل کے لیے "روح المعاني" (۳/ ۵/ ۴۱، ۴۲ طبع بیروت) دیکھ سکتے ہیں۔

تیسیر الکریم الرحمٰن:

علامہ عبد الرحمٰن بن ناصر السعدی ماضی قریب میں سعودیہ کے معروف عالم گزرے ہیں۔ انھوں نے اپنی تفسیر "تیسیر الکریم الرّحمن في تفسیر کلام الرحمٰن" (۱/ ۲/ ۳۵) میں اسی مسئلے کو بیان کیا ہے اور چھونے سے جماع مراد ہونے کو اولیت دی ہے۔

احسن التفاسیر:

برصغیر کے کبار علما میں سے ایک علامہ سید احمد حسن محدث دہلوی رحمہ اللہ بھی ہیں، جن کی "تنقیح الرواۃ شرح المشکاۃ" اور "بلوغ المرام" کا حاشیہ بہ نام "حاشیۃ الدھلوي" دونوں تالیفات عربی میں ہیں اور نہایت اعلی پائے کی کتب ہیں۔ انھوں نے محدّثین کے قبولِ روایت

کے عمدہ معیار کو سامنے رکھتے ہوئے صحیح وحسن درجے کی احادیث ۔الا ما شاء اللہ۔ پر مشتمل تفسیرِ قرآن مرتب کی ہے، جس کا نام ''أحسن التفاسیر'' ہے۔ مکتبہ سلفیہ لاہور کے طبع کردہ اڈیشن (۱/ ۳۲۵) میں لکھا ہے کہ اس آیت میں چھونے سے مراد جماع ہے اور یہ حضرت عباس رضی اللہ عنہما کا اختیار ہے، جب کہ بعض دیگر مفسّرین نے یہاں لمس سے عام چھونا مراد لیا ہے۔ موصوف نے لکھا ہے کہ ہم اس تفسیر کے مقدمے میں وضاحت کر چکے ہیں کہ اگر کسی آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور دیگر صحابہ ومفسّرین کی آرا میں اختلاف ہو تو ترجیح اسی کو ہوگی، جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہوگا۔ یہی بات امام شوکانی رحمہ اللہ نے بھی کہی ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اس آیت کی رو سے عورت کو محض چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا، کیونکہ نقضِ وضو والی رائے تفسیرِ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے خلاف اور مرجوح ہے۔

معارف القرآن:

حنفی دیوبندی مکتبِ فکر کے معروف حنفی عالم مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر ''معارف القرآن'' میں سورۃ النساء کی آیت (۴۳) کی تفسیر میں اس مسئلے کی طرف توجہ نہیں دی۔ البتہ معارف و مسائل سے پہلے خلاصہ تفسیر جو انھوں نے مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی ''بیان القرآن'' سے لیا ہے، اس میں لمس سے مراد قربت (اور صحبت) ہی مذکور ہے۔ معارف القرآن میں آیات کا جو تحت السطور ترجمہ ہے، جو دراصل شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رحمہ اللہ کا ہے، البتہ اس میں مولانا محمود الحسن المعروف شیخ الہند نے کچھ لغوی تہذیب وتجدید کی ہے، جیسا کہ خود ان کا اور مولفِ معارف القرآن کا بیان ہے، اس میں بھی لمس سے مراد قربت ہی مذکور ہے۔ ان کے الفاظ میں:

''یا پاس گئے ہو ان عورتوں کے۔''[1]

ترجمہ شاہ رفیع الدین رحمہ اللہ:

مترجمینِ قرآن میں سے شاہ رفیع الدین محدث دہلوی رحمہ اللہ نے بھی ﴿أَوْ لَمَسْتُمُ النِّسَآءَ﴾ کا ترجمہ ''یا صحبت کرو عورتوں سے'' کیا ہے۔ اس ترجمہ والے قرآنِ کریم کے حاشیے میں طہارت کی

[1] معارف القرآن (۲/ ۴۲۲) طبع ادارہ معارف کراچی۔ مقدمہ ترجمہ قرآن شیخ الہند (ص: ۷) طبع مغربی جرمنی.

ضرورت پیش آنے کی دوصورتیں ذکر کی ہیں، ان میں بھی چھونے سے مراد صحبت کرنا ہی مذکور ہے۔[1]

تفسیری فوائد مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ:

مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ کے ترجمۂ قرآن ''موضح فرقان'' پر سورت آل عمران کے بعد تا آخرِ قرآن تفسیری فوائد مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ کے رقم کردہ ہیں۔ چنانچہ علامہ عثمانی رحمہ اللہ نے سورۃ النساء کی آیت (۴۳) کے تحت فائدہ (۴) کے ضمن میں جو تفصیل بیان کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی چھونے سے صحبت کرنا ہی مراد لیا ہے۔[2]

ترجمہ بریلوی و حاشیہ مراد آبادی:

حنفی بریلوی مکتبِ فکر کے بانی احمد رضا خان فاضل بریلوی کے ترجمہ ''کنز الإیمان'' میں ﴿اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ﴾ کے تحت لکھا ہے: ''یا تم نے عورتوں کو چھوا'' اس پر نعیم الدین مراد آبادی کے تفسیری حواشی خزائن العرفان میں فائدہ: ۱۳۰ کے تحت چھونے سے مراد جماع کرنا لکھا ہے۔[3]

تفہیم القرآن:

صاحبِ تفہیم القرآن مولانا مودودی رحمہ اللہ نے لمس کے مرادی معنیٰ کی تعیین کے سلسلے میں دو معروف اقوال یعنی جماع و مباشرت کرنے اور محض چھونے کی رائے رکھنے والوں کے علاوہ ایک تیسری اور درمیانی راہ اختیار کرنے والوں یعنی امام مالک رحمہ اللہ و حنابلہ کا تذکرہ بھی کیا ہے، جن کے نزدیک محض چھونا بھی اگر شہوت سے ہو تو ناقضِ وضو ہے، ورنہ نہیں۔[4]

خلاصۂ کلام:

ان تمام تراجم، تفسیری فوائد و حواشی اور کتبِ تفسیر کے اقتباسات سے یہ بات واضح طور پر سامنے آگئی کہ مذکورہ آیت کے الفاظ میں چھونا جماع سے کنایہ ہے، اس سے مراد محض چھونا نہیں اور اس سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اس آیت سے عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ جانے پر استدلال صحیح

---

[1] ترجمہ و حاشیہ شاہ رفیع الدین (ص: ۱۴) تاج کمپنی.

[2] ترجمہ قرآن شیخ الهند (ص: ۱۰۹، ۹۴) طبع مغربی جرمنی.

[3] کنز الإیمان (ص: ۱۲٦) طبع چاند کمپنی لاهور.

[4] تفهیم القرآن (۱/ ۳۵۵) لاهور

نہیں ہے اور نہ یہ آیت ان کی دلیل بن سکتی ہے۔

اس مسئلے میں علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کا رجحان شافعیہ کی طرح نقض کی طرف ہے اور "المحلّی" میں انھوں نے بڑے زور وشور سے اس بات کو ثابت بھی کیا ہے۔[1]

لیکن پوری تفصیل میں جانے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلے میں احناف والا مسلک ہی راجح ہے۔

بداية المجتهد:

فقہ مقارن کی مشہور ومعتبر کتاب "بداية المجتهد" میں علامہ ابن رشد کا کہنا ہے کہ لمس کی دلالت اگرچہ دونوں معنوں یعنی محض چھونے اور جماع کرنے ہر دو کے لیے برابر کے قریب ہے، لیکن میرے نزدیک زیادہ ظاہر دلالت جماع کے لیے ہے، اگرچہ یہ مجازی معنیٰ ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے مباشرت اور مس کے الفاظ کے ساتھ ہی جماع سے کنایہ کیا ہے۔ مذکورہ آیت کی اس تفسیر سے وہ تعارض واختلاف بھی ختم ہو جاتا ہے، جو اس آیت کی دوسری تفسیر اور احادیث میں پیدا ہوتا نظر آتا ہے۔

اپنی اس رائے کو ذکر کرنے سے پہلے علامہ ابن رشد نے مذکورہ مسئلے میں ائمہ وفقہا کے مختلف اقوال ذکر کرنے کے بعد اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ ان کے اختلاف کا سبب کلامِ عرب میں لفظِ لمس کا دونوں معنوں کے مابین مشترک ہونا ہے، کیوں کہ اہلِ عرب اس لفظ کو کبھی تو محض ہاتھ سے چھونے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور کبھی اس لفظ سے جماع کے لیے کنایہ کرتے ہیں۔

آگے بھی علامہ موصوف نے اس موضوع پر بڑی عمدہ بحث کی ہے، جسے ۔مؤسسة الناصر للثقافة۔ کی چار الگ الگ چھوٹے سائز کے چار اجزا والی کتاب "بداية المجتهد" کے (١/ ٥٤، ٥٥، ٥٦) پر یا پھر دو جلدوں پر مشتمل دار المعرفہ بیروت والی معروف طباعت (١/ ٣٧، ٣٨، ٣٩) میں دیکھا جا سکتا ہے، مختصر یہ کہ علامہ ابن رشد نے بھی عورت کو چھونے سے وضو نہ ٹوٹنے ہی کو ترجیح دی ہے۔

قائلینِ نقض کی دوسری دلیل:

جن ائمہ وفقہا نے کہا ہے کہ عورت کو محض چھونے سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے، ان کا استدلال بعض احادیث سے بھی ہے، مگر جس طرح ان کے اس مذکورہ آیت سے استدلال کرنے کی پوزیشن ہے،

[1] المحلّى (١/ ١/ ٢٤٤، ٢٤٩) طبع المكتب التجاری، بيروت.

بالکل یہی معاملہ احادیث سے استدلال کا بھی ہے کہ وہ بھی اس مسئلے میں ان کی دلیل نہیں بن سکتیں، جیسا کہ سنن ترمذی، نسائی، دارقطنی، بیہقی، مسندِ احمد اور مستدرکِ حاکم میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی آیا اور اس نے عرض کی کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ اس آدمی کے بارے میں کیا فرماتے ہیں، جو اپنی پہچان والی کسی غیر محرم عورت سے ملا اور صرف جماع کو چھوڑ کر اس سے ہر وہ فعل کیا، جو کوئی شوہر اپنی بیوی سے کرتا ہے؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے سورت ھود کی آیت (۱۱۴) نازل فرمائی، جس میں فرمایا:

﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ طَرَفَیِ النَّھَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّیْلِ اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْھِبْنَ السَّیِّاٰتِ﴾

''اور دن کے دونوں سروں (صبح اور شام کے اوقات میں) اور رات کی چند (پہلی) ساعات میں نماز پڑھا کرو، کچھ شک نہیں کہ نیکیاں گناہوں کو دور کر دیتی ہیں۔''

تب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی سے فرمایا:

((تَوَضَّأْ ثُمَّ صَلِّ)) [1] ''وضو کرو اور پھر نماز پڑھو۔''

قائلینِ نقض کہتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی کو وضو کرنے کا حکم فرمایا، حالانکہ اس نے جماع کی نفی کی تھی، جو اس بات کی دلیل ہے کہ عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ استدلال کئی لحاظ سے صحیح نہیں:

① اس لیے کہ یہ حدیث "عبدالملك بن عمر عن عبدالرحمن بن أبي ليلیٰ عن معاذ" کی سند سے مروی ہے اور اس سند میں انقطاع پایا جاتا ہے، کیوں کہ عبد الرحمٰن بن ابی لیلیٰ کا حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں اور سنن نسائی میں ہے:

"شعبة عن عبد الرحمٰن قال: إنّ رجلًا... فذكر الحديث"

یہ روایت مرسل ہے، کیوں کہ اس میں عبدالرحمٰن نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا ذکر ہی نہیں کیا، بلکہ تابعی نے صحابہ کے واسطے کے بغیر ہی قصہ نقل کر دیا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ واقعہ تو صحیحین میں بھی مذکور ہے، مگر وہاں وضو کرنے اور نماز ادا کرنے کے سرے سے الفاظ ہی مذکور نہیں ہیں۔

② اس لیے بھی اس حدیث سے استدلال درست نہیں، کیوں کہ یہ ثابت نہیں ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

[1] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٨٧) سنن ابن ماجه (١٣٩٨) المنتقى مع النيل (١/ ١/ ١٩٤)

کے اس شخص کو وضو کا حکم دینے سے پہلے وہ وضو سے تھا اور نہ یہ بات ثابت ہے کہ اس عورت سے ملنے سے پہلے وہ وضو کیے ہوئے تھا جو ٹوٹ گیا، جب اس کا وضو ہی ثابت نہیں تو ٹوٹنے پر استدلال کیسے کیا جا سکتا ہے؟

۳ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے اس آدمی کو وضو کرنے کا حکم محض اس لیے فرمایا ہو کہ وضو گناہوں کو مٹانے والا عمل ہے، نہ اس لیے کہ وہ وضو سے تھا اور اس کا وضو ٹوٹ گیا تھا۔

المختصر ایسے ہی بعض دیگر روایات اور آثار سے بھی استدلال کیا جاتا ہے، مگر ان کا حال بھی یہی ہے، جو اس حدیث سے استدلال کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام شوکانی، علامہ ابن رشد اور علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ جیسے کبار محققین نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ عورت کو چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔[1]

3 قہقہہ:

وہ امور جو بعض فقہا کے نزدیک نواقضِ وضو میں سے ہیں، مگر ان کے نواقض ہونے کی کوئی صحیح دلیل نہیں، ان میں سے تیسری چیز ہے: قہقہہ مار کر ہنسنا۔

امام احمد، شافعی اور امام مالک رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب سبھی کا مسلک یہ ہے کہ قہقہہ مار کر ہنسنا نواقض میں سے نہیں ہے، چنانچہ سنن دارقطنی کے حوالے سے فتح الباری میں لکھا ہے کہ ایک مرفوع حدیث میں نبیِ اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ نماز کے دوران میں ہنسنے سے وضو نہیں ٹوٹتا، لیکن وہ حدیث نقل کرنے کے بعد خود امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اسے ضعیف کہا ہے۔ البتہ اس مرفوع حدیث کے راوی حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے موقوفاً، صحیح بخاری کے ایک ترجمۃ الباب میں تعلیقاً اور سنن دارقطنی وسنن سعید بن منصور میں صحیح سند سے موصولاً مروی ہے، فرماتے ہیں:

«إِذَا ضَحِكَ فِي الصَّلَاةِ أَعَادَ الصَّلَاةَ وَلَمْ يُعِدِ الْوُضُوْءَ»[2]

''اگر کوئی نماز میں ہنس دے تو وہ نماز دہرائے، لیکن وضو نہ دہرائے۔''

اس صحیح سند والے اثر سے معلوم ہوا کہ نماز کے دوران میں ہنسنے سے نماز تو باطل ہو جاتی ہے،

---

[1] نيل الأوطار (١/ ١/ ١٩٤، ١٩٥)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٢٨٠)

البتہ وضو پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ علامہ ابن رشد نے ”بدایۃ المجتھد“ میں لکھا ہے کہ اس سلسلے میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے شاذ مسلک اختیار کیا ہے اور نماز کے دوران میں ہنسنے والے کے لیے وضو کرنا واجب قرار دیا ہے، ان کی دلیل طبرانی کی ابو العالیہ سے مروی ایک مرسل روایت ہے (یعنی ابو العالیہ والی روایت میں تابعی کسی صحابی کا حوالہ دیے بغیر ہی نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو روایت کرتا ہے، جب کہ) ایسی روایت جمہور کے نزدیک حجت نہیں ہوتی اور جمہور نے دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ ہنسنے سے وضو کو واجب قرار دینا اصول کے خلاف ہے، کیوں کہ ایک چیز جو نماز سے باہر ناقضِ وضو نہیں، وہ نماز کے دوران میں ناقض کیسے ہو سکتی ہے؟[1]

امام ابن المنذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس بات پر تو اجماع ہے کہ نماز کے باہر ہونے کی صورت میں ہنسنا ناقضِ وضو نہیں ہے، البتہ نماز کے دوران ہو تو اس میں اختلاف ہے۔ جو نماز کے دوران میں وضو کے لیے ہنسنے کو ناقض کہے، وہ ایک تو قیاس جلی کی مخالفت کرتا ہے، جیسا کہ سابق میں جمہور کی طرف سے جواب گزرا ہے کہ یہ اصول کے خلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کے لیے انھوں نے وہ روایت دلیل بنائی ہے، جو صحیح نہیں اور یہ بھی ناممکن ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ خیر القرون کے لوگ تھے، وہ دربارِ الٰہی میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کھڑے ہو کر دورانِ نماز ہنسنے لگیں، جیسا کہ اس مرسل روایت میں ہے۔[2]

لہٰذا جمہور کا مسلک ہی قوی ہے کہ نماز کے دوران ہنسنے سے نماز تو فاسد ہو جاتی ہے، مگر وضو نہیں ٹوٹتا۔

4 میت کو اٹھانا:

جن امور سے وضو نہیں ٹوٹتا، ان میں سے چوتھی چیز میت کو اٹھانا ہے۔ علامہ ابن رشد نے ”بدایۃ المجتھد“ میں لکھا ہے کہ ایک قوم نے یہ شاذ موقف اختیار کیا ہے کہ جو شخص میت کو اٹھائے وہ وضو کرے، ان کے اس موقف کو شاذ کہنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس سلسلے میں جو اثر یا حدیث ہے، وہ ضعیف ہے، پھر انھوں اس اثر کی نص بھی ذکر کی ہے۔[3] چنانچہ سنن اربعہ، سنن بیہقی، صحیح ابن حبان،

---

1. بداية المجتهد (١/ ٥٨) طبع مؤسسه الناصر، نصب الراية (١/ ٤٧۔ ٥٤) طبع المجلس العلمي.
2. فتح الباري (١/ ٢٨٠)
3. بداية المجتهد (١/ ٥٨)

مسندِ احمد اور بزار میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

《 مَنْ غَسَّلَ مَيِّتًا فَلْيَغْتَسِلْ وَمَنْ حَمَلَهُ فَلْيَتَوَضَّأْ 》[1]

''جو شخص میت کو غسل دے، وہ خود غسل کرے اور جو اسے اٹھائے، وہ وضو کر لے۔''

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اسی حدیث کو ''بلوغ المرام'' میں نقل کرنے کے بعد امام احمد رحمہ اللہ کا قول نقل کرتے ہیں:

''لَا يَصِحُّ فِيْ هٰذَا الْبَابِ شَيْئٌ'' ''اس موضوع کی کوئی حدیث صحیح نہیں۔''

جب کہ امیر صنعانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام احمد نے یہ بات اس لیے فرمائی ہے کہ انھوں نے جس سند سے یہ حدیث بیان کی ہے، اس میں ضعف ہے، لیکن امام ترمذی نے اسے حسن اور ابن حبان رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے، کیوں کہ اس کے کئی طُرق ایسے بھی ہیں، جن میں ضعف نہیں ہے۔ امام ماوردی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ بعض محدّثین نے اس حدیث کے ایک سو بیس طُرق کی تخریج کی ہے۔

امام علی بن مدینی اور علامہ ابن رشد نے کہا ہے کہ اس موضوع کی کوئی حدیث صحیح نہیں ہے۔ امام ذہبی اور ابن المنذر نے بھی کہا ہے کہ اس موضوع کی کوئی حدیث ثابت نہیں ہے۔ امام ابن ابی حاتم، امام بخاری، بیہقی اور رافعی نے اسے موقوف قرار دیا ہے۔ البتہ امام ترمذی کی تحسین، ابن حبان کی تصحیح اور دارقطنی کی توثیق کی طرح علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے، انھوں نے تو غسل و وضو بھی واجب قرار دیا ہے، جب کہ حافظ ابن حجر، علامہ صنعانی اور امام شوکانی رحمہم اللہ نے طُرق کی کثرت کے پیشِ نظر اسے کم از کم حسن درجے کی قرار دیا ہے۔

اس حدیث کی صحت و ضعف میں اختلاف کی بنا پر اس سے وضو کا وجوب تو ثابت نہیں ہوسکتا اور نہ غسل دینے والے کے لیے غسل کا وجوب ثابت ہوتا ہے، تاہم بعض دیگر احادیث ایسی بھی ہیں، جن کی موجودگی میں جمع و تطبیق ضروری ہو جاتی ہے اور وہ اس حدیث میں جو امر ہے، اسے وجوب کے بجائے استحباب پر محمول کرنے کی گنجایش پیدا کرتی ہیں۔ علامہ صنعانی نے وضاحت کی ہے کہ میت کو اٹھانے سے مراد تکفین سے پہلے اس کے جسم کے اعضا سے کپڑا اٹھانا ہے اور اس صورت میں بھی

---

[1] المنتقی مع النیل (۱/ ۱/ ۲۳۷) بلوغ المرام مع السبل (۱/ ۱/ ۶۹) المحلی (۱/ ۱/ ۲۲۵، ۲۲۶، ۱/ ۲/ ۲۳) و الإرواء (۱/ ۱۷۳، ۱۷۵)

اٹھانے پر وضو واجب نہیں اور بقول صنعانی اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے محض ہاتھوں کو دھو لینا صرف مستحب ہے، واجب یہ بھی نہیں، کیوں کہ میت پاک ہوتی ہے، جیسا کہ سنن بیہقی میں حدیث ہے:

((إِنَّ مَيِّتَكُمْ يَمُوتُ طَاهِراً فَحَسْبُكُمْ أَنْ تَغْسِلُوا أَيْدِيَكُمْ))[1]

''تمھاری میت پاک ہوتی ہے، لہٰذا تمھارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ہاتھ دھولو۔''

اس حدیث کی سند کو حافظ عسقلانی رحمہ اللہ نے حسن کہا ہے۔ الغرض میت کو ہاتھ لگا کر اٹھانے سے وضو واجب نہیں ہوتا اور اگر وضو کیا ہوا ہو تو وہ نہیں ٹوٹتا۔ اس موضوع کی متعلقہ احادیث اور فقہی تفصیلات کے لیے ''بداية المجتهد''، ''نيل الأوطار''، ''تمام المنة'' (ص: ۱۱۲، ۱۱۳) ''سبل السلام''، ''التلخيص الحبير''، ''المحلّٰی'' اور دیگر کتبِ حدیث وفقہ دیکھی جاسکتی ہیں۔

5، 6 سر یا مونچھوں کے بال کاٹنا اور ناخن تراشنا:

اگر کسی نے وضو کیا ہوا ہو اور اسی حالت میں وہ ناخن تراشنے لگے یا مونچھوں اور سر کے بال کاٹ لے تو اس سے بھی وضو نہیں ٹوٹتا، چنانچہ صحیح بخاری کے ایک ترجمۃ الباب میں تعلیقاً اور سنن سعید بن منصور میں صحیح سند کے ساتھ موصولاً حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے مروی ہے:

''إِنْ أَخَذَ مِنْ شَعْرِهِ أَوْ أَظْفَارِهِ [أَوْ خَلَعَ خُفَّيْهِ] فَلَا وُضُوءَ عَلَيْهِ''[2]

''اگر کوئی بال کاٹے یا ناخن تراشے تو اس پر وضو نہیں ہے۔''

امام مجاہد، حکم بن عتیبہ اور حماد رحمہم اللہ سے منقول ہے کہ وہ ان دونوں کاموں پر وضو کا کہا کرتے تھے، جب کہ امام ابن المنذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اجماع اس کے خلاف ہے، یعنی وضو ضروری نہ ہونے پر علماے امت کا اجماع ہے۔[3]

7 قے کرنا:

وہ امور جن سے وضو نہیں ٹوٹتا، ان میں سے ساتویں چیز خود بہ خود آنے والی قے بھی ہے۔ ایسی قے بھی ناقضِ وضو نہیں، کیوں کہ اس کے ناقض ہونے پر دلالت کرنے والی کوئی صریح حدیث

[1] التلخيص الحبير (۱/ ۱/ ۱۳۷۔ ۱۳۸) نيل الأوطار (۱/ ۱/ ۲۳۸)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (۱/ ۲۸۰، ۲۸۱)

[3] فتح الباري (۱/ ۲۸۱)

نہیں ہے۔ امام شافعی، امام مالک، شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور دیگر محققین کا یہی مسلک ہے کہ قے ناقضِ وضو نہیں ہے، جب کہ حنابلہ کے نزدیک مطلقاً اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک بعض شرائط کے ساتھ یہ قے بھی ناقضِ وضو ہے۔ قے کے ناقضِ وضو ہونے پر جن احادیث سے استدلال کیا جاتا ہے، ان میں سے پہلی تو سنن ابن ماجہ، دارقطنی اور مسند احمد میں مروی ہے، جس میں اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتی ہیں:

«مَنْ أَصَابَهُ قَيْءٌ أَوْ رُعَافٌ أَوْ قَلَسٌ أَوْ مَذْيٌ فَلْيَنْصَرِفْ فَلْيَتَوَضَّأْ ثُمَّ لِيَبْنِ عَلٰى صَلَاتِهِ، وَهُوَ فِيْ ذٰلِكَ لَا يَتَكَلَّمُ»[1]

''جسے قے آئے یا نکسیر پھوٹے یا ڈکار کے ساتھ کھانا منہ میں آجائے (یعنی استفراغ ہو) یا مذی نکل آئے تو اسے چاہیے کہ پھر جائے اور جا کر وضو کرے اور جہاں سے نماز چھوڑی تھی، وہیں سے آکر شروع کر لے اور اس دوران میں کسی سے کوئی بات نہ کرے۔''

اگر یہ حدیث صحیح اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوعاً ثابت ہوتی تو اس سلسلے میں یہ نص تھی، لیکن ایسا نہیں ہے، بلکہ اسے امام احمد، ابن معین، حاتم اور دارقطنی رحمہم اللہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ امام احمد اور بیہقی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ یہ روایت مرسل ہے اور جمہور اہلِ علم محدّثین کے نزدیک مرسل روایت حجت نہیں ہوتی۔

لہٰذا جب یہ حدیث صحیح ثابت ہی نہیں ہے تو وضو کا حکم اپنی اصل حالت پر قائم رہے گا اور وہ ہے عدمِ نقض، اس حکم کو عدمِ نقض سے نقض کی طرف لے جانے کے لیے کسی قوی دلیل کی ضرورت ہے، جو یہاں نہیں ہے۔[2]

یاد رہے کہ اس روایت میں مذکور دیگر اشیا میں سے مذی کے ناقضِ وضو ہونے کے دلائل تو صحیحین کی احادیث میں مذکور ہیں، جو ذکر کیے جا چکے ہیں اور استفراغ یعنی ڈکار کے ساتھ پیٹ سے کھانا منہ میں آجانے کا حکم قے والا ہی ہے کہ یہ ناقضِ وضو نہیں ہے۔ نکسیر کے بارے میں تفصیل بعد

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٢١) المنتقى مع النيل (١/ ١/ ٢٢٢ مصرى) بلوغ المرام مع السبل (١/ ١/ ٦٧) ضعيف الجامع (٥٤٣٤)

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ فرمائیں: سبل السلام (١/ ١/ ٢٧) نيل الأوطار (١/ ١/ ٢٢٢، ٢٢٣) إرواء الغليل (١/ ١٤٨) التلخيص الحبير (١/ ١/ ٢٧٥)

میں ذکر کی جائے گی کہ یہ ناقضِ وضو ہے یا غیر ناقض۔

زیرِ بحث موضوع یعنی قے کے ناقضِ وضو ہونے کے بارے میں ایک اور حدیث ہے، جو صحیح بھی ہے اور مرفوع بھی، مگر وہ صریح نہیں، چنانچہ ترمذی اور مسند احمد میں حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَآءَ فَأَفْطَرَ فَتَوَضَّأَ »[1]

''نبیِ اکرم ﷺ نے قے کی، روزہ افطار کیا اور پھر وضو کیا۔''

لیکن اس حدیث کے الفاظ محفوظ نہیں، جیسا کہ ''تحفة الأحوذي'' میں تفصیل مذکور ہے، جبکہ یہی حدیث سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ، منتقیٰ ابن جارود، صحیح ابن حبان و ابن مندہ، سنن دارقطنی، سنن بیہقی، معجم طبرانی اور مستدرک میں ایک دوسرے طریق سے بھی مروی ہے، جس کے محفوظ الفاظ یہ ہیں:

« إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَآءَ فَأَفْطَرَ »[2]

''نبیِ اکرم ﷺ نے قے کی اور پھر روزہ افطار کیا۔''

مسند احمد کے الفاظ ہیں:

« إِسْتَقَآءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَأَفْطَرَ »[3] ''نبیِ اکرم ﷺ نے قے کی اور روزہ افطار کرلیا۔''

اس حدیث سے بھی قے کے ناقضِ وضو ہونے پر استدلال کیا جاتا ہے، لیکن اس حدیث میں یہ دلالت کہاں ہے؟

اوّلاً:

زیادہ سے زیادہ یہ نبیِ اکرم ﷺ کا فعل ہے، جو کسی چیز کے وجوب پر دلالت نہیں کرتا۔ وجوب کے لیے کوئی خاص دلیل چاہیے، جو کوئی بھی صحیح نہیں اور اس فعل سے زیادہ سے زیادہ یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ کے اس اسوۂ حسنہ کو دیکھتے ہوئے قے کرنے کے بعد وضو کرنا مشروع و مستحب ہے، لیکن یہ واقعہ وجوب کی دلیل نہیں بن سکتا۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا اختیار بھی استحباب ہی ہے۔[4]

---

[1] سنن الترمذي مع التحفة (١/ ٢٨٧) المنتقى مع النيل (١/ ١/ ٢٢١) صححه الألباني في الإرواء (١/ ١٤٧)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٠٨٥) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٥٧٧) سنن الدارمي، رقم الحديث (١٧٢٨) موارد الظمآن، رقم الحديث (٩٠٨)

[3] إرواء الغليل (١/ ٤٧) و نيل الأوطار (١/ ١/ ٢٢٢) و تحفة الأحوذي (٢٨٨، ٢٨٩)

[4] مجموعة الرسائل الكبرىٰ بحواله تمام المنة (ص: ١١٢)

امام بیہقی رحمہ اللہ کے بقول یہ بھی تب ہے، جب کوئی شخص جان بوجھ کر قے کر لے۔ خود بہ خود قے آنے سے تو روزہ بھی نہیں ٹوٹتا، وضو کیسے ٹوٹ جائے گا؟ وہ لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی سند اس قدر مضطرب ہے کہ یہ حجت ہی نہیں بن سکتی اور صحیح ثابت بھی ہو تو اسے صرف عمداً قے کرنے پر محمول کیا جائے گا۔[1]

ثانیاً:

قے کے ناقضِ وضو ہونے کے قائلین جو یہ کہتے ہیں:

① وہ معدے سے ہو۔ ② منہ بھر کر ہو۔ ③ ایک ہی مرتبہ اتنی ہو۔

تو یہ ناقضِ وضو ہے، جب کہ ان حدود و قیود یا شرائط کا سرے سے کسی بھی حدیث میں ذکر نہیں ہے۔ ہاں امیر صنعانی نے ''سبل السلام'' میں حضرت عمار رضی اللہ عنہ سے مروی کسی روایت کی طرف اشارہ کیا ہے، جس میں منہ بھر کر قے کے الفاظ ہیں اور ساتھ ہی لکھ دیا ہے کہ وہ روایت ضعیف ہے۔[2]

ثالثاً:

ان احادیث میں سے کسی ایک میں بھی مذکور نہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہو کہ جو شخص قے کرے، وہ وضو کرے اور نہ کسی حدیث میں یہ وضاحت ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو صرف قے کرنے کی وجہ ہی سے کیا ہو کہ اس سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم با وضو ہوں اور قے آنے سے وضو ٹوٹنے کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا ہو۔ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے ''المحلیٰ'' میں قے کو ناقضِ وضو قرار دینے کی بڑی سختی سے تردید کی ہے۔[3]

اس ساری تفصیل سے معلوم ہوا کہ قے آنے سے وضو تو نہیں ٹوٹتا، ہاں یہ الگ بات ہے کہ کوئی وضو کر لے تو بہر حال یہ بہتر ہے، کیوں کہ اس میں فضیلت بھی ہے اور احتیاط بھی۔

8 نکسیر:

وہ اشیا جن کے ناقضِ وضو ہونے کی کوئی صحیح دلیل نہیں، ان میں سے آٹھویں چیز نکسیر ہے،

---

1. نیل الأوطار (١/ ١/ ٢٢٢) و الإرواء (١/ ١٤٨)
2. سبل السلام (١/ ١/ ٦٧) نیل الأوطار (١/ ١٢٢)
3. المحلی لابن حزم (١/ ١/ ٢٥٥۔ ٢٥٨)

اس سے بھی وضو نہیں ٹوٹتا، کیوں کہ کسی صحیح وصریح اور مرفوع حدیث میں نکسیر سے وضو ٹوٹنے کا ذکر نہیں ملتا اور جن میں اس سے وضو ٹوٹنے کا ذکر ہے، وہ صحیح نہیں یا پھر مرفوع نہیں، بلکہ مرسل ہیں اور جمہور اہلِ علم کے نزدیک مرسل روایت کسی مسئلے میں حجت نہیں ہوتی۔

نکسیر کے ناقضِ وضو ہونے پر دلالت کرنے والی ایک روایت تو وہی ہے، جو سنن ابن ماجہ، دارقطنی اور مسندِ احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

((مَنْ أَصَابَهٗ قَيءٌ اَوْ رُعَافٌ... الخ))

یہ مکمل روایت ترجمہ سمیت ہم قے کے ضمن میں ذکر کر چکے ہیں اور یہ بھی وضاحت کی جا چکی ہے کہ متعدد ائمہ و محدثین نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ بعض نے اس کا مرسل ہونا اقرب الی الصواب لکھا ہے، جب کہ جمہور کے نزدیک مرسل روایت حجت نہیں ہوتی، لہٰذا جب یہ حدیث مرفوعاً ثابت ہی نہیں تو نکسیر کا حکم بھی اپنی اصل حالت پر رہے گا اور وہ ہے عدمِ نقض اور اس حکم سے اسے نقض کی طرف لے جانے کے لیے کسی قوی دلیل کی ضرورت ہے، جو یہاں نہیں ہے۔

اسی طرح سنن دارقطنی، الکامل لابن عدی اور معجم طبرانی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

((اِذَا رَعَفَ أَحَدُکُمْ فِيْ صَلَاتِهٖ فَلْيَنْصَرِفْ فَلْيَغْسِلْ عَنْهُ الدَّمَ، ثُمَّ لْيُعِدْ وُضُوْءَهٗ وَ لْيَسْتَقْبِلْ صَلَاتَهٗ))[1]

''تم میں سے جب کسی کی نماز کے دوران میں نکسیر پھوٹ پڑے تو اسے جا کر خون دھونا اور وضو دہرانا چاہیے، پھر نماز کی طرف آنا چاہیے۔''

یہ روایت ضعیف ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی سند میں سلیمان بن ارقم نامی راوی متروک ہے۔ ایسے ہی سنن دارقطنی میں حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت میں بھی قے اور نکسیر سے وضو کرنے کا ذکر آیا ہے، مگر اس کی سند کے ایک راوی ابوبکر کو متروک، کذاب اور وضاع قرار دیا گیا ہے، اس سند کے دوسرے راوی حجاج بن ارطاۃ پر کلام معروف ہے۔ لہٰذا ضعیف ہونے کی وجہ سے وہ بھی قابلِ استدلال نہ ہوئی۔ البتہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے موقوفاً مصنف عبدالرزاق میں ایک قول مروی ہے، جس کی سند کو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے حسن قرار دیا ہے۔ ایسے ہی حضرت سلمان رضی اللہ عنہ سے بھی

[1] بحوالہ نیل الأوطار (١/ ١/ ٢٢٣) نصب الرایة (١/ ٤٢) و الضعیفة (٢٥٣١) ضعیف الجامع، رقم الحدیث (٦٢٠)

مروی ہے۔ ان دونوں کے ان اقوال یا آثار میں قے اور نکسیر کو ناقضِ وضو کہا گیا ہے۔ موطا امام مالک میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں مروی ہے کہ وہ نکسیر سے وضو کیا کرتے تھے۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے اس سلسلے میں ان کا ایک قول بھی نقل کیا ہے۔[1]

اسی طرح علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے "المحلّی" میں حضرت علی اور ابن عمر رضی اللہ عنہم کے علاوہ متعدد تابعین رحمہم اللہ کے اسماے گرامی بھی ذکر کیے ہیں اور لکھا ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ لوگ نکسیر اور ہر بہنے والے خون سے نقضِ وضو کے قائل تھے تو ہم کہیں گے کہ ٹھیک ہے یہ قائل ہیں تو ہوتے رہیں، حجت صرف ارشادِ نبوی ہے نہ کہ اقوالِ صحابہ و تابعین، پھر اسی پر بس نہیں، بلکہ خود انھی صحابہ و تابعین سے ایسے آثار بھی ملتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نکسیر پھوٹنے اور خون نکلنے سے وضو ٹوٹنے کے قائل نہیں تھے، پھر آگے انھوں نے وہ آثار بھی ذکر کیے ہیں اور نکسیر کو خونِ استحاضہ پر قیاس کرنے کی تردید کی ہے۔[2]

جب صحابہ و تابعین سے دونوں طرح کے اقوال ملتے ہیں اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ناقض ہونا صحیح سند سے ثابت نہیں تو اس کا حکم اپنی اصل حالت پر ہی قائم رہا کہ یہ ناقض نہیں ہے۔

مرسل روایت کی حیثیت:

قَے اور نکسیر کے غیر ناقضِ وضو ہونے کے ضمن میں ایک بات بار بار گزری ہے کہ سنن ابن ماجہ اور دارقطنی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث مرفوعاً ضعیف ہے۔ البتہ بعض محدثینِ کرام نے اسے مرسلاً صحیح قرار دیا ہے۔ اس کے باوجود وہ نقض کی دلیل نہیں بن سکتی، کیوں کہ جمہور محدثینِ کرام کے نزدیک مرسل روایت حجت نہیں ہوتی۔

مرسل روایت کیا ہوتی ہے؟ یہ بات تو آپ کے سامنے رکھی جا چکی ہے کہ "شرح نخبة الفکر للعسقلاني" کے مطابق جس روایت کو کوئی چھوٹا یا بڑا تابعی، جس نے نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا یا ان سے سنا نہیں ہوتا، نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کر دے، وہ مرسل کہلاتی ہے۔[3]

ایسی روایت کی حیثیت کیا ہوتی ہے؟ اور محدّثین نے اسے ناقابلِ حجت کیوں قرار دیا ہے؟ یہ

---

[1] نصب الراية (١/ ٣٩) نيل الأوطار (١/ ٢٢٣)

[2] المحلى (١/ ١/ ٢٥٩۔ ٢٦٠)

[3] دیکھیں: شفاء الغلل في شرح كتاب العلل للمباركفوري مع التحفة (١٠ / ٥١٠)

بات اگرچہ عوام الناس کے لیے کوئی اتنی زیادہ مناسبِ حال نہیں، لیکن اگر تھوڑی سی توجہ دی جائے تو بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ اس سے کئی مسائل حل ہو جاتے ہیں، چنانچہ صحیح مسلم میں امام مسلم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اور دیگر محدّثین کے یہاں مرسل روایات قابلِ حجت نہیں۔[1]

امام ترمذی رحمہ اللہ "کتاب العلل" میں فرماتے ہیں کہ مرسل روایت اکثر محدّثین کے نزدیک صحیح نہیں اور کئی محدّثین نے اسے ضعیف کہا ہے۔[2]

یہ ضعیف و ناقابلِ حجت کیوں ہے؟ اس کی تفصیل تو موطا امام مالک کی شرح "التمهيد لابن عبد البر"، "شرح نخبة الفكر للعسقلاني"، "شفاء الغلل في شرح كتاب العلل" علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ اور دیگر کتب میں دیکھی جاسکتی ہے، جس کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ مرسل روایت کی سند سے جو راوی محذوف ہے، اس کا صحیح علم نہیں ہوسکتا کہ وہ صحابی ہے یا کوئی تابعی، کیوں کہ کبھی کوئی تابعی دوسرے تابعی سے سنتا ہے۔ لیکن اگر محذوف راوی صحابی ہو، تو پھر کسی چیز کا خدشہ اور ضرورت نہیں رہ جاتی، کیوں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم سبھی عدول ہیں۔ ہاں اگر تابعی کسی دوسرے تابعی کے حوالے سے بیان کرے تو اس بات کا واضح احتمال ہوتا ہے کہ وہ دوسرا تابعی، جو محذوف ہے، وہ ثقہ ہونے کے بجائے ضعیف ہو، کیوں کہ کثیر تابعین سے ثابت ہے کہ انھوں نے ثقہ اور ضعیف دونوں قسم کے راویوں سے روایات لی ہیں اور اہلِ علم کا اس بات پر اجماع ہے کہ کسی خبر کو قبول کرنے کے لیے خبر دینے والے راوی کی عدالت و ثقاہت کا علم ہونا ضروری ہے، چونکہ مرسل روایت کی صورت میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور تابعی کے درمیان والے واسطے کی عدالت و ثقاہت کا علم ہونا ناممکن ہے، لہٰذا مرسل راویت ناقابلِ حجت قرار دی گئی ہے۔[3] قے اور نکسیر کے بارے میں مرسل روایات اسی وجہ سے ناقابلِ حجت ہیں۔

9 خون:

یہیں یہ بات بھی واضح کر دیں کہ نکسیر پھوٹنے سے خون ناک سے نکلے یا جسم کے کسی بھی حصے

---

1. صحيح مسلم مع شرح النووي (١/ ١٣٢)
2. العلل في آخر سنن الترمذي مع التحفة (١/ ٥٠٩)
3. التمهيد (١/ ٦ طبع مراكش) شرح نخبة الفكر بحواله شفاء الغلل (١٠/ ٥١٠)

سے نکلے، تھوڑا ہو یا زیادہ ،ٹھہرا ہو یا بہہ نکلے، حلق سے نکلے یا مسوڑھوں سے، تھوک پر اس کا رنگ غالب ہو یا نہ ہو، سینگی یا فصد لگوانے سے نکلے یا زخم آنے سے یا کسی زخم کے دکھ جانے سے، انجکشن کے ذریعے سے سرنج بھر کر خون نکالا جائے یا سرنج سے ٹیکا لگانے کے بعد اس جگہ سے کوئی ایک دو قطرے خون نکل آئے؛ ان تمام شکلوں میں خون کے بارے میں حکم معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس بات کا پتا چلایا جائے کہ بھلا خون ناقضِ وضو ہے یا نہیں؟

اس سلسلے میں بنیادی بات یہ ہے کہ جن احادیث میں خون کے ناقضِ وضو ہونے کا ذکر ہے، وہ ضعیف ہیں، لہٰذا نا قابلِ حجت ہیں۔ ایسی صورت میں حکم براءتِ اصلیہ ہی پر رہے گا کہ وضو نہیں ٹوٹتا۔ اس پر مستزاد یہ کہ متعدد واقعات سے پتا چلتا ہے کہ صحابہ و تابعین خون نکلنے سے وضو نہیں کیا کرتے تھے، جو عدمِ نقض کے قائلین کی تائید ہے۔ چنانچہ نکسیر کے سلسلے میں جو احادیث وآثار گزرے ہیں، ان کا ضعف اور حجیت کی عدمِ صلاحیت ذکر کی جاچکی ہے، لہٰذا انھیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

البتہ بعض دیگر روایات میں سے ایک سنن دارقطنی میں حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«اَلْوُضُوْءُ مِنْ كُلِّ دَمٍ سَائِلٍ»[1] ''ہر بہنے والے خون سے وضو ہے۔''

اس روایت کو ''نصب الرایۃ'' میں نقل کر کے علامہ زیلعی حنفی نے امام دارقطنی کا قول ذکر کیا ہے کہ اس کی سند کے ایک راوی عمر بن عبد العزیز ہیں، جن کا حضرت تمیم رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں اور دوسرے راوی یزید بن خالد اور تیسرے یزید بن محمد دونوں ہی مجہول ہیں، تیسری علت ایک مدلس راوی بقیہ کا عنعنہ ہے۔[2]

انہی الفاظ کی ایک اور روایت مروی ہے، جس کے بارے میں خود امام ابن عدی نے کہا ہے کہ اس روایت کو ہم صرف احمد بن فرج کے حوالے سے جانتے ہیں، جب کہ وہ ایسا راوی ہے، جس کی روایت قابلِ حجت نہیں ہے، اگرچہ بعض محدّثین نے اس کی توثیق بھی کی ہے۔[3]

نکسیر کے ضمن میں ایک روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی بیان کی جاچکی ہے جو

---

[1] دیکھیں: نصب الرایة (١/ ٣٧) سلسلة الأحادیث الضعیفة (٤٧٠) ضعیف الجامع، رقم الحدیث (٦١٧٦)

[2] تحقیق مشکاة المصابیح (١/ ١٠٨)

[3] نصب الرایة (١/ ٣٧، ٣٨ مع حاشیه)

سنن دارقطنی کے حوالے سے تھی اور ضعیف ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

《کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ اِذَا رَعَفَ فِیْ صَلَاتِہٖ تَوَضَّأَ، ثُمَّ بَنٰی عَلٰی صَلَاتِہٖ》[1]

''نبیِ اکرم ﷺ کو نماز میں جب نکسیر پھوٹ پڑتی تو آپ ﷺ وضو کرتے اور جہاں سے نماز چھوٹی ہوتی، وہیں سے شروع فرماتے۔''

''نصب الرایۃ'' میں علامہ زیلعی رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں کہ اس روایت کی سند کے ایک راوی عمر بن رباح کے بارے میں ابن عدی نے ''الکامل'' میں لکھا ہے کہ وہ اپنے سے اوپر کے راوی عبداللہ بن طاؤس سے باطل روایات بیان کرتا ہے، جن پر اس کی کسی نے متابعت نہیں کی، نیز امام بخاری نے اسے ''دجال'' کہا ہے، جب کہ ''التحقیق لابن الجوزي'' میں ہے کہ امام دارقطنی نے اسے متروک کہا ہے۔ امام ابن حبان رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ثقہ راویوں کے نام سے من گھڑت روایات بیان کیا کرتا تھا۔ اس کی بیان کردہ روایت لکھنے کے قابل بھی نہیں ہوتی، سوائے اس کے کہ اسے اظہارِ تعجب و عبرت کے لیے لکھ لیا جائے۔[2]

اس طرح خون کے ناقضِ وضو ہونے سے تعلق رکھنے والی ان احادیث اور آثار کی استنادی حیثیت معلوم ہوگئی کہ وہ کیوں نا قابلِ حجت ہیں؟ ان احادیث و آثار کے ضعف کی وجہ ہی ہوگی کہ علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے ''الخلاصۃ'' سے امام نووی رحمہ اللہ کا قول نقل کیا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

''لَیْسَ فِیْ نَقْضِ الْوُضُوْءِ وَعَدَمِ نَقْضِہٖ بِالدَّمِ وَالْقَیْءِ وَالضِّحْکِ فِی الصَّلَاۃِ حَدِیْثٌ صَحِیْحٌ''[3]

''خون، قے اور دورانِ نماز ہنسنے سے وضو کے ٹوٹ جانے یا نہ ٹوٹنے کے بارے میں کوئی ایک بھی حدیث صحیح نہیں۔''

جب صراحت کے ساتھ کوئی ایک بھی صحیح حدیث ان اشیا کے ناقض ہونے پر دلالت کرنے والی نہیں تو پھر وضو کا حکم براءتِ اصلیہ پر رہے گا کہ وہ نہیں ٹوٹے گا۔

---

[1] دیکھیں: نصب الرایۃ (۱/ ۴۱)

[2] دیکھیں: نصب الرایۃ (۱/ ۴۲)

[3] نصب الرایۃ (۱/ ۴۲)

اس موضوع کی بعض دیگر روایات بھی ہیں، لیکن وہ بھی ضعیف ہیں، ان سب کا تذکرہ باعثِ طوالت ہوگا، لہٰذا انھیں ”نصب الرایة“ (۱/ ۳۷ تا ۴۲) ”التلخیص الحبیر“ (۱/ ۱۱۳، ۱۱۷، ۲۷۵) اور دیگر کتب میں دیکھا جاسکتا ہے۔ البتہ ایک حدیث صحیح بھی ہے، جس کے مفہوم پر قیاس کرتے ہوئے خون کو ناقضِ وضو قرار دیا گیا ہے، یعنی اس میں یہ تو مذکور نہیں کہ عام خون ناقضِ وضو ہے، بلکہ اس میں بات تو کوئی اور ہے، لیکن قائلینِ نقض نے اس کے مفہوم پر قیاس کرتے ہوئے عام اعضائے جسم سے نکلنے والے خون کو بھی ناقض کہا ہے۔ وہ حدیث پہلے بھی گزر چکی ہے، جو صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ اور دیگر کتب میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتی ہیں کہ حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض گزار ہوئیں کہ میں مرضِ استحاضہ میں مبتلا ہوں اور خون جاری رہنے کی وجہ سے پاک نہیں رہتی تو کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا، اِنَّمَا ذٰلِكَ عِرْقٌ، وَلَيْسَتْ بِالْحَيْضَةِ»

”نہیں، یہ ایک رگ ہوتی ہے، یہ خونِ حیض نہیں ہوتا۔“

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بتایا کہ جب ایامِ حیض ہوں تو نماز چھوڑ دیں اور جب ان کے برابر ایام گزر جائیں، تب غسل کرلیں۔ ہشام کہتے ہیں کہ میرے والد (عروۃ) نے کہا:

”پھر آیندہ ایامِ حیض آنے تک ہر نماز کے ساتھ وضو کرلیا کریں۔“[1]

اس حدیث کے الفاظ: «اِنَّمَا ذٰلِكَ عِرْقٌ» ”یہ خونِ حیض نہیں، بلکہ ایک رگ ہے۔“ اِن پر عام خون کو قیاس کیا گیا ہے، چونکہ ایسی عورت کو ہر نماز کے ساتھ از سرِ نو وضو کرنے کا حکم ہے تو ان کے نزدیک اس کا خون ہی ناقضِ وضو ہے اور اسی خون پر قیاس کرتے ہوئے جسم کے ہر حصے سے نکلنے والے خون کو ناقض ہی ہونا چاہیے۔ یہ ہے وجۂ استدلال لیکن یہ محض قیاس ہے، جسے علامہ ابن عبدالبر نے ”التمهيد شرح موطأ الإمام مالك“ میں ضعیف کہا ہے اور علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے تو

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (۲۲۸) صحيح مسلم مع شرح النووي (۲/ ٤/ ١٦، ١٧) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (۲۵۸) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۰۸) صحيح سنن النسائي للألباني (۱/ ٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٢٤) سنن الدارمي، رقم الحديث (۷۷۹)

"المحلیٰ" میں اسے باطل قرار دیا ہے۔ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''یہ قیاس باطل ہے، کیوں کہ خونِ استحاضہ کو تو خونِ حیض پر بھی قیاس کرنا جائز نہیں، حالاں کہ ان دونوں کا مخرج بھی ایک ہی ہے، کیوں کہ خود اللہ تعالیٰ نے ان دونوں طرح کے خون کا الگ الگ حکم بیان فرمایا ہے۔''

یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ علامہ موصوف نے دونوں طرح کے خون کے الگ الگ حکم کا جو اشارہ فرمایا ہے، اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ حائضہ عورت کے لیے نماز پڑھنا جائز ہے اور نہ روزہ رکھنا اور ان ایام میں وہ اپنے شوہر کے لیے بھی مباشرت کے لیے حلال نہیں ہوتی، جب کہ مستحاضہ عورت نماز بھی پڑھے گی اور روزہ بھی رکھے گی اور استحاضے کی حالت والی عورت سے اس کے شوہر کا مباشرت کرنا بھی حلال ہے۔ ان دونوں طرح کی عورتوں کے خون کا مخرج اگرچہ ایک ہی ہے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان کا حکم الگ الگ رکھا ہے۔ آگے علامہ موصوف لکھتے ہیں:

''جب ان دونوں میں یہ فرق کیا گیا ہے تو یہ ایک باطل بات ہوگی کہ جسم کے تمام اعضا سے نکلنے والے خون کو فرج سے نکلنے والے خون پر قیاس کیا جائے، جب کہ یہ بات تو اور بھی زیادہ باطل ہے کہ زخم سے نکلنے والے خون سے خالی پیپ کو خون پر قیاس کیا جائے، اس بات پر اجماع کا دعویٰ بھی یہ قائلین نہیں کر سکتے، کیوں کہ صحیح سند سے ثابت ہے کہ حضرت حسن بصری اور ابو مجلز رحمہما اللہ خون اور پیپ کے مابین فرق کیا کرتے تھے۔''[1]

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ کسی صحیح وصریح حدیث سے ثابت نہیں کہ خون نکلنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، نہ تھوڑا خون نکلنے سے اور نہ زیادہ سے اور نہ عام خون کو خونِ استحاضہ پر قیاس کرنا صحیح ہے، جب کہ اس کے برعکس بعض احادیث و آثار ایسے بھی ملتے ہیں، جن میں مذکور ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خون نکلنے کو ناقضِ وضو نہیں سمجھتے تھے۔

1 پہلا واقعہ "صحيح البخاري، كتاب الوضوء، باب من لم ير الوضوء إلّا من المخرجين من القبل والدبر" میں تعلیقاً اور مغازی ابن اسحاق میں موصولاً اور ابن اسحاق کے طریق ہی سے سنن ابی داود، مسند احمد، سنن دارقطنی، صحیح ابن حبان، ابن خزیمہ اور

[1] المحلی (۱/ ۱/ ۲۵۸، ۲۵۹) التمهيد (۱/ ۱۹۰)

مستدرک حاکم میں بھی موصولاً مروی ہے، جس میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ غزوہ ذات الرقاع کے موقع پر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور لشکرِ اسلامی نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ يَّحْرُسُنَا اللَّيْلَةَ؟»[1] ''آج رات (جاگ کر) کون ہماری چوکیداری کرے گا؟''

انصار اور مہاجرین میں سے ایک ایک صحابی اٹھا اور عرض کی کہ ہم چوکیداری کریں گے۔ پڑاؤ کی جگہ ایک پہاڑی گھاٹی تھی، لہٰذا ان دونوں صحابیوں نے رات کو آدھا آدھا وقت بانٹ لیا کہ آدھی رات ایک جاگے گا اور گھاٹی کے منہ پر پہرہ دے گا اور آدھی رات دوسرا۔ چنانچہ پہلے مہاجر صحابی سوگیا اور انصاری صحابی نماز پڑھنے لگے۔ اتنے میں دشمن کے کسی فوجی نے انصاری صحابی کو نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ اس نے تیر پھینکا، جو اس انصاری صحابی کو آ کر لگا۔ اس نے وہ تیر نکالا اور نماز کو جاری رکھا۔ پھر اس دشمن نے دوسرا تیر مارا۔ صحابی نے وہ بھی نکالا اور نماز میں مشغول رہے، پھر اس ظالم نے تیسرا تیر مارا۔ اس صحابی نے وہ بھی نکالا، رکوع کیا، سجدہ کیا اور اپنی نماز مکمل کی، پھر اس صحابی نے اپنے دوسرے ساتھی کو جگایا۔ اس ساتھی نے جب اسے خون میں غلطاں و پیچاں دیکھا تو کہا:

«لِمَ لَا انْبَهْتَنِي أَوَّلَ مَا رَمٰى؟»

''تم نے مجھے اس وقت کیوں نہ جگایا، جب اس نے پہلا ہی تیر مارا تھا؟''

اس صحابی نے جواب دیا:

«كُنْتُ فِيْ سُوْرَةٍ فَأَحْبَبْتُ أَنْ لَّا أَقْطَعَهَا»[2]

''میں ایک سورت کی تلاوت کر رہا تھا، جسے میں منقطع نہیں کرنا چاہتا تھا۔''

''دلائل النبوۃ'' امام بیہقی میں ایک دوسرے طریق سے یہی واقعہ مروی ہے، جس میں یہ تفصیل بھی مذکور ہے کہ ان دونوں صحابیوں میں سے انصاری صحابی کا نام حضرت عباد بن بشر رضی اللہ عنہ اور مہاجر صحابی کا نام حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ تھا اور جس سورت کی وہ دورانِ نماز تلاوت کر رہے تھے، وہ سورۃ الکہف تھی۔[3]

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٨٣) عن سهل بن الحنظلية.

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٢٨٠، ٢٨١) التلخيص الحبير (١/ ١/ ١١٥)

[3] فتح الباري (١/ ٢٨١)

اس واقعہ کو صحیح بخاری شریف کے ترجمۃ الباب میں ذکر کرنے اور اس کے بعد دیگر آثار نقل کرنے کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک بھی خون کا نکلنا ناقضِ وضو نہیں، خون کو ناقضِ وضو نہ ماننے والوں کا اس واقعہ سے استدلال اس طرح ہے کہ اس صحابی کے جسمِ اطہر سے تین تیروں کے نتیجے میں ظاہر ہے، خون بہنے لگا۔ بایں ہمہ وہ اپنی نماز میں پوری طرح مشغول رہے اور یقیناً اس واقعہ کی خبر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی ہی ہوگی، کیوں کہ یہ تو ناممکن ہے کہ اتنا بڑا واقعہ رونما ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر نہ پہنچے۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو خون کے ناقضِ وضو ہونے کی شکل میں ضروری تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی وضاحت کرتے اور اسے اس کی نماز کے فاسد ہونے کا بتاتے اور اگر ایسا ہوتا تو یقیناً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ کو ضرور ہی نقل فرماتے، جو امتِ اسلامیہ تک پہنچ جاتے، لیکن ان سب امور میں سے کسی کا بھی واقع نہ ہونا، اس بات کی دلیل ہے کہ خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا، خون تھوڑا ہو یا زیادہ۔ اس واقعہ کے سامنے مسوڑوں کے خون کی حقیقت ہی کیا ہے؟ جب کہ پھنسی کے خون سے وضو نہ ٹوٹنے پر دلالت کرنے والے آثار بھی موجود ہیں۔

۲ خون تھوڑا ہو یا زیادہ، ناقضِ وضو نہیں ہے، اس مسلک پر استدلال کرنے کے لیے دوسرا واقعہ موطا امام مالک، سنن دارقطنی اور بعض دیگر کتبِ حدیث میں مذکور رہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو زخمی کیا گیا تو وہ اس زخمی حالت میں نماز میں مشغول رہے، جب کہ زخمی ہونے کی وجہ سے ان کے جسمِ مبارک سے خون جاری تھا۔ اس واقعہ کی سند بھی فتح الباری میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے بقول صحیح ہے۔[1]

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خون سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ اس حالت میں نماز نہ پڑھتے رہتے اور یہ بات تو بعید از قیاس ہے کہ نمازِ پنج گانہ سے متعلق ایسا عام فہم مسئلہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے اوجھل رہ گیا ہو۔

۳ خون کے ناقضِ وضو نہ ہونے پر دلالت کرنے والا تیسرا واقعہ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا ہے، جو صحیح بخاری کے مذکورہ ترجمۃ الباب میں تعلیقاً اور سنن

---

[1] موطأ الإمام مالك مع تنوير الحوالك للسيوطي (١/ ١/ ٦٢) سنن الدارقطني مع التعليق المغني (١/ ٤٠٠) فتح الباري (١/ ٢٨١)

بیہقی و مصنف ابن ابی شیبہ میں صحیح سند کے ساتھ موصولاً مروی ہے، جس کا تذکرہ علامہ ابن حزم نے بھی ''المحلّٰی'' میں کیا ہے، اس اثر میں ہے:

''عَصَرَ ابْنُ عُمَرَ بَثْرَةً فَخَرَجَ مِنهَا الدَّمُ وَلَمْ يَتَوَضَّأْ''[1]

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے پھنسی پھوڑی تو اس میں سے خون نکلا، مگر انھوں نے وضو نہیں کیا۔''

یہ صحیح بخاری کے الفاظ ہیں، جب کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے:

''ثُمَّ صَلَّى وَلَمْ يَتَوَضَّأْ''

''(پھنسی پھوڑنے کے بعد) انھوں نے نماز ادا کی، مگر از سرِ نو وضو نہیں کیا۔''

''المحلّٰی'' ابن حزم وغیرہ میں ہے کہ اس خون کو انھوں نے دو انگلیوں کے ما بین مل دیا، پھر اٹھے اور نماز پڑھی۔ اس طرح امام طاؤس کا اثر صحیح بخاری میں تعلیقاً اور مصنف ابن ابی شیبہ میں صحیح سند سے موصولاً مروی ہے:

''إِنَّهُ كَانَ لَا يَرَىٰ فِي الدَّمِ وُضُوءًا يَغْسِلُ عَنْهُ الدَّمَ ثُمَّ حَسْبُهُ''[2]

''وہ خون سے وضو کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے، خود سے خون دھو دیں، بس یہی کافی ہے۔''

حضرت ابو جعفر باقر رحمہ اللہ کے والد محمد بن حسین بن علی رضی اللہ عنہما کا اثر صحیح بخاری میں تعلیقاً اور فوائدِ حافظ ابو بشر میں موصولاً مروی ہے، جس میں اعمش بیان کرتے ہیں کہ میں نے ابو جعفر باقر رحمہ اللہ سے پوچھا کہ نکسیر بہنے والے خون کا کیا حکم ہے؟ تو انھوں نے فرمایا:

''لَوْ سَالَ نَهْرٌ مِّنْ دمٍ ، مَا أَعَدْتُّ مِنْهُ الْوُضُوءَ''[3]

''اگر خون کی نہر بھی جاری ہو جائے تو میں اس سے وضو نہیں دہراؤں گا۔''

مشہور تابعی و فقیہ امام عطا بن ابی رباح کا اثر صحیح بخاری میں تعلیقاً اور مصنف عبد الرزاق میں موصولاً مروی ہے، حضرت ابن جریج ان سے بیان کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک خون نکلنے سے وضو

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٢٨١) المحلی (١/ ١/ ٢٦٠) التلخيص الحبير (١/ ١/ ١١٤)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٢٨٠، ٢٨١، ٢٨٢)

[3] نفس المرجع.

نہیں تھا۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے عام صحابہ رضی اللہ عنہم اور علمائے حجاز کا یہی مسلک ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے، جب کہ شرح بخاری میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''امام طاؤس، محمد بن علی اور عطا رحمہم اللہ بھی حجازی ہیں، جب کہ مصنف عبد الرزاق میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور سعید بن جبیر اور سعید بن مسیّب رحمہم اللہ کے طریق سے یہی مروی ہے، نیز اسماعیل القاضی نے ابو زناد کے طریق سے اہلِ مدینہ کے فقہائے سبعہ سے بھی یہی روایت بیان کی ہے اور امام مالک و شافعی رحمہما اللہ کا بھی یہی قول ہے۔''[1]

حلق یا مسوڑھوں سے خون بہنے سے بھی وضو ٹوٹنے کے بارے میں صحیح بخاری میں تعلیقاً اور جامع سفیان ثوری اور ''معرفة السنن و الآثار للبيهقي'' میں موصولاً صحیح سند سے مروی اثر ہے:

﴿بَزَقَ ابْنُ أَبِي أَوْفَىٰ دَماً فَمَضَىٰ فِيْ صَلَاتِهِ﴾[2]

''ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہما نے خون تھوکا اور اپنی نماز میں مشغول رہے۔''

یاد رہے کہ ابن ابی اوفی رضی اللہ عنہما کا اسمِ گرامی عبداللہ رضی اللہ عنہ تھا، جو صحابی تھے اور ان کے والد ابو اَوفی رضی اللہ عنہ بھی صحابی تھے، گویا انھیں صحابی ہونے کا شرف حاصل تھا۔ صحیح بخاری میں تعلیقاً اور مصنف ابن ابی شیبہ و مسند شافعی میں موصولاً حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں مروی ہے:

''كَانَ إِذَا احْتَجَمَ غَسَلَ مَحَاجِمَهُ''[3]

''وہ جب سینگی لگواتے تو بس صرف اس مقام (جہاں سینگی لگواتے) کو دھوتے تھے۔''

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے صحیح بخاری میں تعلیقاً اور مصنف ابن ابی شیبہ میں موصولاً مروی ہے کہ جب ان سے پوچھا گیا کہ سینگی لگوانے والا کیا کرے؟ تو انھوں نے فرمایا:

''يَغْسِلُ أَثَرَ مَحَاجِمِهِ''[4] ''اپنے اس مقام (سر) کو دھو ڈالے۔''

صاحبِ ''فتح الباري'' لکھتے ہیں کہ امام لیث کے بارے میں تو یہ روایت بھی ملتی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ سینگی لگوانے والے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ سینگی والی جگہ کو اچھی طرح پونچھ کر

---

[1] فتح الباري (١/ ١٨٢)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٢٨٠، ٢٨٢) التلخيص الحبير (١/ ١/ ١١٤)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٢٨٠، ٢٨٢) التلخيص الحبير (١/ ١/ ١١٤)

[4] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٢٨٠، ٢٨٢) التلخيص الحبير (١/ ١/ ١١٤)

صاف کر دے، اسے دھونے کی ضرورت نہیں۔ امام شافعی نے امام لیث اور طاؤس رحمہ اللہ کے طریق ہی سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایک اثر بیان کیا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

"اِغْسِلْ أَثَرَ الْمَحَاجِمِ عَنْكَ، وَحَسْبُكَ"[1]

"سینگی کے آثار (خون وغیرہ) دھولو اور بس۔"

جیسا کہ امام طاؤس رحمہ اللہ کا قول بھی گزرا ہے۔ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صحیح سند سے ثابت ہے کہ انھوں نے ناک میں انگلی ڈالی تو اس پر خون لگا ہوا نکلا، اسے انھوں نے انگلی سے مل دیا، نماز پڑھی اور از سرِ نو وضو نہیں کیا۔ اسی موضوع کی ایک موقوف روایت "معرفة السنن والآثار للبیهقي" میں بھی ہے۔ یاد رہے کہ سینگی لگوانے کے بعد محض اس مقام کو دھو دینے اور وضو نہ کرنے کا مفہوم رکھنے والی تو ایک مرفوع روایت بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جو سنن دارقطنی اور بیہقی میں ہے، لیکن وہ ضعیف السند ہے، لہٰذا وہ محلِ استدلال تو نہیں ہوسکتی، لیکن اسے بطورِ شاہد لیا جاسکتا ہے، جب کہ "منتقیٰ الأخبار" میں المجد ابن تیمیہ رحمہ اللہ اسی مرفوع مگر ضعیف حدیث کے تحت فرماتے ہیں کہ اس کو تھوڑے خون پر محمول کیا جائے۔ یہی طریقہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور ان کے دوسرے موافقین نے بھی اختیار کیا ہے۔

امام شوکانی رحمہ اللہ "منتقیٰ الأخبار" کی شرح "نیل الأوطار" میں لکھتے ہیں:

"اس جمع و تطبیق کی تائید سنن دارقطنی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی اس روایت سے بھی ہوتی ہے، جس میں مروی ہے کہ ایک دو قطروں سے وضو نہیں الّا یہ کہ خون بہنے والا ہو۔ لیکن اس کی سند میں ایک راوی محمد بن فضل بن عطیہ ہیں، جو متروک ہیں اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "التلخیص الحبیر" میں اس روایت کی سند کو سخت ضعیف کہا ہے۔"[2]

اس ساری تفصیل سے خون کے بارے میں تین مسلک معلوم ہوئے:

1. خون کا مطلقاً ناقضِ وضو نہ ہونا، جو امام مالک، امام شافعی، ظاہریہ اور جمہور محدّثین کا مسلک ہے۔
2. خون کا مطلقاً ناقضِ وضو ہونا، جو احناف کا مسلک ہے۔

---

[1] التلخیص الحبیر (۱/ ۱/ ۱۱۴)

[2] نیل الأوطار مع منتقی الأخبار (۱/ ۱/ ۱۸۹) تلخیص الحبیر (۱/ ۱/ ۱۱۳)

(۳) امام احمد اور حنابلہ کا مسلک کہ خون کم ہو تو ناقضِ وضو نہیں، بہت زیادہ ہو تو ناقض ہے۔

جب کہ دلائل کے اعتبار سے قوی تر اور صحیح ترین مسلکِ اول ہی ہے۔ عساکرِ اسلامیہ کے مجاہدین کی تاریخ میں ان کا زخمی ہونا اور اسی حالت میں نمازیں ادا کرنا بالتواتر ثابت اور مسلکِ اول ہی کا موید ہے۔ حدیثِ جابر بھی اس کی شاہد ہے اور کثیر و قلیل کے فرق والے مسلک کی تائید میں کوئی بھی صحیح حدیث نہیں ہے۔ احناف کے مسلک کے بارے میں علماے احناف میں سے علامہ عینی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''ہمارے اصحاب نے جس قوی اور صحیح ترین حدیث سے استدلال کیا ہے، وہ حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش رضی اللہ عنہا والی حدیثِ استحاضہ ہے، جو بخاری میں مروی ہے، مگر اس کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ وہ عذر والے لوگوں کے ساتھ خاص ہے، جیسے سلس البول وغیرہ ہے۔ لہٰذا اس حدیث میں بھی حجت نہیں ہے۔''[1]

لہٰذا نتیجہ یہ ہوا کہ قلیل و کثیر خون سے وضو نہیں ٹوٹتا، سوائے اس خون کے جو سبیلین سے نکلے۔

(10) ایذاے مسلم:

وہ امور جنھیں بعض اہلِ علم نے ناقضِ وضو کہا ہے اور بعض لوگوں سے اس کی روایات بھی ملتی ہیں، مگر قرآن و سنت کی کسی صحیح دلیل سے ان کا ناقض ہونا ثابت نہیں ہوتا، ایذاے مسلم بھی ہے۔ یہاں اس بات کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ کسی دوسرے مسلمان کو ایذا پہنچانا کتنا بڑا گناہ ہے، حتیٰ کہ سورۃ الاحزاب (آیت: ۵۸) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا﴾

''اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایسے کام (کی تہمت) سے جو انھوں نے نہ کیا ہو ایذا دیں تو انھوں نے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اپنے سر پر رکھا۔''

حتیٰ کہ صحیح بخاری و مسلم میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحیح مسلمان ہی اسے قرار دیا ہے، جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، جیسا کہ ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

---

[1] التلخيص الحبير (۱/ ۱/ ۱۱۵)

«اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ»[1]

''مسلمان وہ ہے، جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔''

صحیح بخاری و مسلم ہی کی ایک دوسری حدیث میں ارشادِ نبوی ہے:

«سِبَابُ الْمُسْلِمِ فُسُوْقٌ وَقِتَالُهٗ كُفْرٌ»[2]

''کسی مسلمان کو گالیاں دینا فسق اور اس سے لڑائی کرنا کفر ہے۔''

یہ سب اپنی جگہ بجا لیکن اس سے وضو پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں؟ کسی صحیح حدیث سے اس کا ناقض ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ البتہ بعض صحابہ و تابعین کے آثار سے پتا چلتا ہے کہ اگر کسی سے ایذا رسانی سرزد ہو جائے تو وہ شخص وضو کرلے۔ مثلاً حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابن عباس رضوان اللہ علیہم اجمعین، اسی طرح حضرت ابراہیم نخعی اور عبیدہ سلمانی رحمہما اللہ سے ایذا رسانی پر وضو کرنا منقول ہے، لیکن نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلے میں کوئی بھی صحیح حدیث نہیں ملتی، اس بات کا انسانی معاشرے میں بہت عام ہونا اور اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسے ناقضِ وضو یا غیر ناقض قرار نہ دینا، اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کا حکم براءتِ اصلیہ ہی پر قائم رہے گا، لہٰذا ایذاے مسلم کے سخت گناہ اور ناجائز ہونے کے باوجود اس سے وضو نہیں ٹوٹے گا۔ اس موضوع کی ایک مرفوع حدیث امام ابن حزم رحمہ اللہ نے ''المحلیٰ'' میں ذکر کی ہے، جس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَتَوَضَّأُ مِنَ الْحَدَثِ وَأَذَى الْمُسْلِمِ»[3]

''نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حدث اور ایذاے مسلم سے وضو کیا کرتے تھے۔''

لیکن اس کی سند کے ایک راوی داود بن محبر کو کذاب، دروغ گو اور احادیث گھڑنے میں شہرت یافتہ قرار دیا گیا ہے، لہٰذا یہ روایت من گھڑت ہے۔ شیخ احمد شاکر رحمہ اللہ نے ''المحلّیٰ'' کے

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (١٠) صحيح مسلم مع شرح النووي (١/ ٢/ ١٠، ١٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٦٨) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٨، ٢١١٩) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٦٢٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨) صحيح مسلم مع شرح النووي (١/ ٣/ ٥٤) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٦١٠، ٢١٢٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٣٨٣١) سنن ابن ماجه (٦٩)

[3] المحلى (١/ ١/ ٢٦١)

حاشیے میں لکھا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ کی طرف ایذاے مسلم کی نسبت کرنے والی اس روایت کا من گھڑت ہونا بڑا واضح اور ظاہر ہے۔ غرض ایذاے مسلم کا ناقضِ وضو ہونا ثابت نہیں، البتہ اگر کوئی شخص وضو کرلے تو اچھا ہے، جیسا کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل سے پتا چلتا ہے، لیکن یہ واجب نہیں ہے۔

11 صلیب اور صنم کو چھونا:

جن امور سے وضو نہیں ٹوٹتا اور نہ ان سے وضو ٹوٹنے کی کوئی دلیل ہے، ان میں سے گیارھویں اور آخری چیز صلیب اور صنم کو چھونا ہے، یعنی اگر کوئی شخص عیسائیوں کے مخصوص مذہبی شعار یعنی صلیب یا سولی کو چھولے، جسے کراس بھی کہا جاتا ہے یا پھر بُت پرستوں کے کسی بت یا مورتی کو ہاتھ لگالے، تو اس سے بھی وضو ٹوٹنے کی کوئی صریح دلیل نہیں ملتی، اگرچہ ان اشیا کو نجس قرار دیا گیا ہے، لیکن ان کی نجاست معنوی ہے، حسی اور ظاہری نہیں، البتہ مصنف عبدالرزاق رحمہ اللہ کے حوالے سے علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ ذکر کیا ہے کہ انھوں نے مستورد عجلی کو توبہ کرائی تو اس کے گلے میں جو صلیب تھی اسے چھوا، پھر جب نماز شروع کی تو کسی دوسرے آدمی کو آگے بڑھایا اور خود وضو کرنے چلے گئے، بعد میں لوگوں کو بتایا کہ انھوں نے یہ وضو کسی حدث کی وجہ سے نہیں کیا، بلکہ دراصل انھوں نے اس نجس چیز کو چھوا تھا:

"فَأَحَبَّ أَنْ يُّحْدِثَ مِنْهَا وُضُوْءاً"[1]

''تو انھیں یہ محبوب معلوم ہوا کہ اس سے وہ ازسرِنو وضو کرلیں۔''

اس اثر کے الفاظ سے بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناقضِ وضو نہیں، بلکہ یہ محض ان کا اپنا اجتہاد و استحباب تھا، اگرچہ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے نماز منقطع کر کے جانے کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نظریہ وجوب ہی محسوس کیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک مرفوع روایت بھی ہے، جس میں حضرت ابن بریدہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ أَمَرَ بُرَيْدَةَ، وَقَدْ مَسَّ صَنَماً، فَتَوَضَّأَ»[2]

''نبیِ اکرم ﷺ نے حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا تو انھوں نے وضو کیا، کیوں کہ انھوں

---

[1] المحلی (١/١/ ٢٦٢)

[2] حوالہ سابقه.

نے ایک بت کو چھوا تھا۔''

اس روایت کی سند کے ایک راوی صالح بن حیان ہیں، جو ضعیف اور ناقابلِ حجت ہیں، لہٰذا قرآن و سنت کی کوئی واضح نص نہ ہونے کی وجہ سے صلیب یا صنم اور بتوں یا دیوی و دیوتاؤں کو ہاتھ لگانے سے وضو نہیں ٹوٹتا، ہاں اگر استحباباً کوئی وضو کر لے تو یہ الگ بات ہے۔

غسل اور وضو کے لیے پانی میں احتیاط:

اس کے ساتھ ہی غسل و وضو کے احکام اور مسائلِ طہارت میں سے تمام ضروری امور مناسب تفصیل کے ساتھ اختتام پذیر ہوئے۔

چلتے چلتے ایک اور بات بھی ذکر کرتے جائیں اور اس پہلو کی طرف توجہ دلانا، اس لیے ضروری لگتا ہے کہ ہمارے بعض اصحاب مساجد کی ٹوٹیوں پر بیٹھ جائیں تو اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ پانی کھلا ہے اور باتیں شروع ہیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ عموماً غسل میں بھی ہوتا ہے، حالاں کہ نبیِ اکرم ﷺ غسل اور وضو کے لیے پانی کے استعمال میں کافی احتیاط فرمایا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں عدمِ احتیاط کو اسراف یا فضول خرچی ہی کہا جائے گا۔ یہ بات تو سنن ابن ماجہ اور مسند احمد کی ایک مرفوع حدیث میں بھی مذکور ہے، جو حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو فرمایا:

«مَا هٰذَا السَّرَفُ يَا سَعْدُ؟» ''اے سعد! یہ کیا فضول خرچی ہے؟''

تو انھوں نے عرض کی:

«أَفِي الْوُضُوْءِ سَرَفٌ؟» ''کیا وضو میں بھی اسراف ہے؟''

جواب ملا:

«نَعَمْ، وَ اِنْ كُنْتَ عَلَى نَهْرٍ جَارٍ»[1] ''ہاں، اگرچہ تو بہتی نہر پر ہی کیوں نہ ہو۔''

لیکن یہ روایت ضعیف ہے، کیوں کہ اس کی سند میں ایک راوی ابن لہیعہ ہے، جو ضُعف میں معروف ہے۔[2]

---

[1] بحواله مشكاة المصابيح (١/ ١٣٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢٥)

[2] تحقيق المشكاة المصابيح (١/ ١٣٣)

تاہم اس مفہوم پر ایک دوسری صحیح حدیث بھی دلالت کرتی ہے کہ پانی میں احتیاط برتی جائے اور کم از کم پانی سے غسل و وضو کیا جائے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَتَوَضَّأُ بِالْمُدِّ، وَ يَغْتَسِلُ بِالصَّاعِ إِلَىٰ خَمْسَةِ أَمْدَادٍ»[1]

''نبیِ اکرم ﷺ ایک مد پانی سے وضو فرمایا کرتے تھے اور ایک صاع یعنی چار مدوں سے لے کر پانچ مدوں تک پانی سے غسل فرمایا کرتے تھے۔''

''القاموس المحیط'' میں علامہ فیروز آبادی نے ''مد'' پیمانے کے بارے میں لکھا ہے:

''مِكْيَالٌ مِلْءُ كَفَّي الْإِنسَانِ الْمُعْتَدِلِ إِذَا مَلَأَهُمَا وَ مَدَّيَدَهُ بِهِمَا، وَبِهٖ سُمِّيَ مُدّاً''[2]

''ایک پیمانہ جو درمیانے قد کے انسان کے دونوں خوب کھلے ہوئے ہاتھوں سے بنائے گئے، چُلو کے برابر ہوتا ہے۔ ہاتھوں کو خوب پھیلا کر کھولنے کی وجہ ہی سے اس پیمانے کا نام ''مد'' ہے (کیوں کہ لغت میں مد کا معنیٰ ہی کھینچنا یا پھیلانا ہے)۔''

اس حدیث سے مسنون مقدار تو معلوم ہوگئی۔ اب پانی کی فراوانی کی وجہ سے کچھ زیادہ استعمال کی گنجایش تو ہے، لیکن پوری ٹینکی بہا دینے کی تو اجازت نہیں ہوسکتی۔ بعض احادیث میں تو دو تہائی مد سے وضو کا بھی پتا چلتا ہے، جیسا کہ مسند احمد اور صحیح ابن حبان میں حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، ایسے ہی ایک انصاری صحابیہ حضرت اُم عمارہ رضی اللہ عنہا سے بھی سنن ابی داود میں دو تہائی مد آیا ہے۔ اس حدیث کو امیر صنعانی نے ''سبل السلام'' میں حسن قرار دیا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اہلِ علم زیادہ پانی استعمال کرنے کو مکروہ خیال کرتے ہیں۔''[3]

بعض لوگوں کو وسواس کا مرض ہوتا ہے کہ وہ اس بات کا یقین ہی نہیں کر پاتے کہ ان کے ہاتھ اب پاک ہو گئے ہیں یا نہیں؟ لہٰذا تا دیر وہ ہاتھوں ہی کو دھوتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے ہی دیگر

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٢١٠) صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٤/ ٧، ٨)

[2] دیکھیں: سبل السلام (١/ ١/ ٤٧) تحقيق المشكاة المصابيح (١/ ١٣٧)

[3] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: المغني لابن قدامة (١/ ٢٠٥، ٢٠٨) بلوغ المرام مع سبل السلام (١/ ١/ ٤٨، ٥٤، ٥٥)

اعضا اور پاؤں کا معاملہ بھی ہوتا ہے، بلکہ ایک حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو وسواس میں مبتلا کرنے پر ایک شیطان متعین ہے، جیسا کہ سنن ترمذی و ابن ماجہ اور مستدرک حاکم میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

«اِنَّ لِلْوُضُوءِ شَيْطَاناً، يُقَالُ لَهٗ: وَلْهَانُ، فَاتَّقُوْا وَسْوَاسَ الْمَاءِ»[1]

''وضو کا ایک شیطان ہے، جسے ''ولہان'' کہا جاتا ہے، پس تم پانی کے وسواس سے بچو۔''

لیکن یہ روایت سخت ضعیف ہے۔[2]

اس کے علاوہ سنن ابو داود، ابن ماجہ اور مسندِ احمد کی ایک صحیح حدیث میں حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے جب اپنے بیٹے کو یہ دعا کرتے ہوئے سنا کہ اے اللہ! میں تجھ سے جنت کے دائیں حصے میں سفید رنگ کا محل مانگتا ہوں تو انھوں نے فرمایا: بیٹا! اللہ سے جنت مانگو اور نارِ جہنم سے پناہ طلب کرو (یعنی دعا کرنے میں اتنی باریکیوں اور تکلفات سے کام نہ لو)، کیوں کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

«اِنَّهٗ سَيَكُوْنُ فِيْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ قَوْمٌ يَعْتَدُوْنَ فِي الطُّهُوْرِ وَ الدُّعَاءِ»[3]

''میری امت میں ایک قوم پیدا ہوگی، جو طہارت اور دعا میں زیادتی (حدود سے تجاوز) کریں گے۔''

اس حدیث کی رو سے بھی غسل اور وضو کے لیے پانی میں احتیاط برتنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

---

[1] دیکھیں: سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢١) المغني (١/ ٢١٨)

[2] ضعيف الجامع الصغير (١/ ٢/ ١٨٧) و تحقيق المشكاة (١/ ١٣١)

[3] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٨٧) مشكاة المصابيح (١/ ١٣١) وقال الألباني. إسناده صحيح وصححه جماعه، وليس عند ابن ماجه الاعتداء في الطهور.

اَوقاتِ نمازِ

غسل وطہارت، وضو اور تیمّم کا مسنون طریقہ اور تقریباً تمام متعلقہ ضروری مسائل تو آپ کے سامنے آچکے ہیں، لہٰذا اب آیئے اسی انداز سے قدرے تفصیل کے ساتھ نماز کے فضائل و مسائل اور احکام کا سلسلہ بھی شروع کریں۔

اوقاتِ نمازِ پنج گانہ؛ قرآنِ کریم کی روشنی میں:

نماز کے احکام و مسائل میں سب سے پہلے اوقاتِ نماز کا موضوع آتا ہے، لہٰذا قرآن و سنت کی رو سے ان اوقات کی تعیین کر لینا ضروری ہے۔ قرآنِ کریم چونکہ اصولِ احکام کی کتاب ہے، لہٰذا اس میں پنج گانہ نمازوں کا بالترتیب اور نام بہ نام تو ذکر نہیں، لیکن متعدد مقامات پر نمازوں اور ان کے اوقات کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ مثلاً سورت ہود (آیت: ۱۴) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَ زُلَفًا مِّنَ الَّيۡلِ﴾

''اور نماز قائم کرو، دن کے دونوں کناروں پر اور رات کی کچھ ساعتوں میں۔''

یہاں دن کے دونوں کناروں پر نماز قائم کرنے سے مراد نمازِ مغرب اور نمازِ فجر ادا کرنا ہے اور رات کی کچھ ساعتوں میں (یا کچھ رات گزارنے پر) نماز قائم کرنے سے عشا کو ادا کرنے کی طرف اشارہ ہے۔[1]

سورۃ الاسراء یا بنی اسرائیل جسے سورت سبحان بھی کہا جاتا ہے، اس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوۡكِ الشَّمۡسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيۡلِ وَقُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ اِنَّ قُرۡاٰنَ الۡفَجۡرِ كَانَ مَشۡهُوۡدًا﴾ [الإسراء: ۷۸]

''نماز قائم کرو اور سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک اور فجر کے وقت قرآنِ کریم

[1] تفسیر ابن کثیر مترجم (۲/۵۵۵) طبع مکتبہ تعمیرِ انسانیت. لاہور

کی تلاوت کرنے کا بھی اہتمام کرو۔ (کیوں کہ) بے شک فجر کے وقت قرآن پڑھنے پر (اللہ کے فرشتے) گواہ بنتے ہیں۔‘‘

اس آیت میں ظہر سے لے کر عصر، مغرب، عشا اور فجر پانچوں نمازیں ہی آجاتی ہیں۔[1] جب کہ تین نمازوں یعنی ظہر، عشا اور فجر کا تو نمایاں طور پر ذکر ہے۔ سورت طٰہٰ (آیت: ۱۳۰) میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا وَ مِنْ اٰنَآئِ الَّیْلِ فَسَبِّحْ وَ اَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰی﴾

’’یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں، ان کی باتوں پر صبر کریں اور اپنے رب کی حمد وثنا کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، سورج نکلتے سے پہلے اور سورج غروب ہونے سے پہلے اور رات کے کچھ اوقات میں بھی تسبیح کرو اور ان کی حدوں (یا کناروں) پر، شاید کہ تم راضی ہو جاؤ۔ (یعنی اس لیے کہ آپ آخرت میں اس کا ثواب پا کر خوش ہو جائیں)۔‘‘

اس آیت میں پہلے فجر، عصر اور عشا، پھر فجر، ظہر، پھر فجر، ظہر اور مغرب پانچوں ہی نمازوں کے اوقات کا اجمالی تذکرہ آگیا ہے۔[2] ان آیات کے ساتھ ہی سورۃ الروم کی آیت (۱۷، ۱۸) کو بھی ملا کر پڑھا جائے تو نمازِ پنج گانہ کے اوقات کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَ حِیْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝ وَ لَهُ الْحَمْدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ عَشِیًّا وَّ حِیْنَ تُظْهِرُوْنَ﴾

’’پس اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتے رہو، جس وقت کہ شام ہوتی ہے اور جس وقت کہ صبح ہوتی ہے اور وہی ہر قسم کی تعریف کے لائق ہے آسمان اور زمین میں اور اس کی پاکی بیان کرو، تیسرے پہر اور دوپہر کو۔‘‘

علمائے تفسیر نے لکھا ہے کہ یہاں تسبیح سے مراد نماز ہے اور اس آیت میں پانچوں ہی نمازوں کا ذکر آگیا ہے۔ امام رازی اور حافظ ابن کثیر رحمہما اللہ لکھتے ہیں کہ صبح سے مراد نمازِ فجر ہے، شام سے مغرب

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۳/ ۲۴۹)

[2] تفسیر ابن کثیر (۲/ ۴۰۶، ۴۰۷)

وعشا، تیسرے پہر سے عصر اور دوپہر سے نمازِ ظہر مراد ہے۔[1]

ان آیات کے علاوہ بھی قرآنِ کریم کے کئی مقامات پر نمازوں کے ناموں اور اوقات کا اجمالی تذکرہ موجود ہے، مثلاً سورۃ الاسراء (آیت: ۷۸) میں اِرشادِ الٰہی ہے:

﴿وَ مِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴾

''اور رات کو کسی وقت جاگ اٹھیں (تہجد کی نماز پڑھیں) یہ آپ ﷺ کے لیے نافلہ (زائد) ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ (اس کی برکت سے) آپ ﷺ کا رب آپ ﷺ کو (قیامت کے دن) مقامِ محمود تک پہنچا دے۔''

اس آیت میں نمازِ تہجد کا ذکر ہے، اگرچہ یہ نماز نفلی نماز ہے اور نمازِ پنج گانہ میں یہ شمار نہیں ہوتی، جب کہ سورۃ الجمعہ (آیت: ۹) میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

''اے ایمان والو! جمعہ کے دن جب نماز کے لیے پکارا (اذان دی) جائے تو اللہ کے ذکر (نماز) کی طرف چل دو اور خرید و فروخت (کاروبار) چھوڑ دو۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے، اگر تم سمجھو۔''

اس آیت میں نمازِ جمعہ کا ذکر ہے، جب کہ ہر آٹھ دن میں ایک مرتبہ ہر عاقل و بالغ مسلمان پر باجماعت نمازِ جمعہ فرض ہے، جس کے بلا عذر ترک کرنے پر سخت وعید آئی ہے۔ سورۃ البقرہ (آیت: ۱۸۷) سورۃ الفجر (آیت: ۱) اور سورۃ القدر (آیت: ۵) میں نمازِ فجر کا ذکر آیا ہے۔ چنانچہ سورۃ البقرہ کی مذکورہ بالا آیت میں روزے کے احکام کے دوران میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾ [البقرة: ١٨٧]

''اور کھاتے پیتے رہو، یہاں تک کہ فجر (صبح) کی سفید دھاری رات کی کالی دھاری سے تم کو صاف دکھائی دینے لگے۔''

---

[1] دیکھیں: أشرف الحواشي يعنى فوائد سلفية (ص: ٤٨٦، حاشيه ٢)

سورۃ الفجر کے شروع میں ہے:

﴿ وَالْفَجْرِ ۝ وَلَيَالٍ عَشْرٍ ۝ وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ﴾ [الفجر: ۱ تا ۳]

''قسم ہے فجر کی۔ اور دس راتوں کی۔ اور جفت و طاق (یوم نحر اور یوم عرفہ) کی۔''

سورۃ القدر میں اسی مبارک رات کے فضائل بیان کرتے ہوئے آخری آیت میں فرمایا ہے:

﴿سَلٰمٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ﴾ [القدر: ۵]

''یہ شب امن و سلامتی والی ہے طلوعِ فجر (صبح نکلنے) تک۔''

اسی پر بس نہیں، بلکہ قرآنِ کریم کے دیگر کئی مقامات بھی ایسے ہیں، جہاں کسی نہ کسی انداز میں ان نمازوں کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً سورۃ النور (آیت: ۳۶ اور ۵۸) سورۃ الانعام (آیت: ۵۲) سورۃ الکہف (آیت: ۲۸) سورۃ الرعد (آیت: ۱۵) سورت قٓ (آیت: ۳۹) سورت یوسف (آیت: ۱۶) سورت آلِ عمران (آیت: ۳) سورت صٓ (آیت: ۱۸) سورۃ الغافر (آیت: ۵۵) اور سورت مریم (آیت: ۱۱) میں دیکھا جاسکتا ہے۔ سورۃ العصر کی پہلی آیت میں ہے: ﴿والعصر﴾ یہاں زمانے کے ساتھ نمازِ عصر بھی مراد ہے۔

قرآنِ کریم کے ان دس مقامات کا تھوڑی سی توجہ سے مطالعہ کیا جائے تو ہماری پنج گانہ نمازوں کے نہ صرف یہ کہ کسی حد تک نام مل جاتے ہیں، بلکہ ان کے اوقات کا بھی پتا چل جاتا ہے، جس کی تفصیل کتبِ تفسیر میں موجود ہے۔ مفسرینِ کرام نے ان آیات کی تفسیر میں نمازوں کے اوقات وغیرہ پر کس طرح استدلال کیا ہے اور ان کے قوی دلائل کون کون سے ہیں؟ اگر ان سب امور سے متعلقہ اقتباسات بھی ذکر کیے جائیں تو بات لمبی ہو جاتی ہے، لہٰذا ہم ان اشاروں ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

اوقاتِ نمازِ پنج گانہ؛ حدیث شریف کی روشنی میں:

قرآنِ کریم کے متعدد مقامات کے حوالے سے نمازِ پنج گانہ کے اوقات کا اجمالی سا تذکرہ ہو چکا ہے، جب کہ اس اجمال کی تفصیل نبیِ اکرم ﷺ نے اپنے ارشادات میں فرما دی ہے۔ ہر نماز کا نام، اس کا اوّل وآخر وقت اور دیگر مسائل بھی تعلیم فرمائے ہیں، جو آج کتبِ حدیث کے بیش بہا خزانوں کی شکل میں تقریباً ہر زبان میں ترجمے کے ساتھ موجود ہیں۔ ان میں سے سنن ترمذی، نسائی، دارقطنی، بیہقی، مسند احمد، صحیح ابن حبان اور مستدرک حاکم میں ایک حدیث ہے، جس کے بارے میں امام ترمذی رحمہ اللہ

نے اپنی سنن میں امیر المومنین فی الحدیث حضرت امام بخاری رحمہ اللہ کا ارشاد نقل کیا ہے:

"أَصَحُّ شَيْئٍ فِي الْمَوَاقِيتِ حَدِيثُ جَابِرٍ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم"[1]

"اوقاتِ نماز کی تعیین کے بارے میں صحیح ترین حدیث وہ ہے، جسے حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا ہے۔"

"قوت المغتذي" سے نقل کرتے ہوئے علامہ مبارکپوری نے "تحفة الأحوذي" میں امام ابن القطان کا قول ذکر کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ انصاری صحابی تھے اور مدینہ طیبہ ہی میں صحابی ہوئے تھے، جس رات نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اسرا و معراج کا سفر درپیش ہوا اور یہ نمازیں فرض کی گئیں، اس رات کی صبح کو (مکہ میں) حضرت جابر رضی اللہ عنہ نہیں تھے، لہٰذا ضروری ہے کہ یہ حدیث مرسل ہو، یعنی انھوں نے کسی دوسرے صحابی سے سنی ہو اور اس کا واسطہ ذکر کیے بغیر بیان کی ہو۔[2]

لیکن صاحب "الإمام" کے بقول یہ جرح موثر نہیں، کیوں کہ اگر صحابی کا واسطہ ذکر نہ بھی ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا، کیوں کہ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم عدول ہیں اور یہ بات تو بعید از قیاس ہے کہ انھوں نے کسی تابعی سے یہ حدیث سنی ہو۔ ایسی حدیث کا شمار مراسیلِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے ہوتا ہے، جس کی حجیت میں کوئی کلام نہیں۔ "نصب الراية" میں ہے:

"قَالَ فِي الْإِمَامِ: وَهٰذَا الْمُرْسَلُ غَيْرُ ضَارٍّ، فَمِنْ أَبْعَدِ الْبُعْدِ أَنْ يَّكُوْنَ جَابِرٌ سَمِعَهٗ مِنْ تَابِعِيٍّ عَنْ صَحَابِيٍّ، وَقَدِ اشْتَهَرَ أَنَّ مَرَاسِيْلَ الصَّحَابَةِ مَقْبُوْلَةٌ وَجَهَالَةُ عَيْنِهِمْ غَيْرُ ضَارَّةٍ"[3]

"الامام میں ہے کہ یہ مرسل مضر نہیں ہے، کیوں کہ یہ بات بعید از قیاس ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث صحابی کے علاوہ کسی تابعی سے سنی ہو اور یہ بات عام ہے کہ مراسیلِ صحابہ رضی اللہ عنہم مقبول (حجت) ہیں اور ان میں سے کسی کی جہالت کوئی نقصان دہ نہیں ہے۔"

یہ حدیث ان مراسیل میں سے نہیں، جن کا ذکر ہم کر چکے ہیں کہ ان میں محذوف راوی کے

---

[1] سنن الترمذي مع التحفة (١/ ٤٦٨) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٨)

[2] تحفة الأحوذي (١/ ٤٦٩) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٢٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٩٠، ٥٠٠، ٥١٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٧٩، ٣٨٤، ٣٨٦) موارد الظمآن (٢٧٨)

[3] نصب الراية (١/ ٢٣)

تابعی ہونے کا امکان ہوتا ہے، جن میں ضعیف بھی ہیں۔ غرض کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ امام بخاری کے مذکورہ قول کے علاوہ امام ترمذی اور حاکم نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ نے ''تلخیص المستدرك'' میں امام حاکم کی موافقت کی ہے۔[1]

چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ اس حدیث میں بیان فرماتے ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ جَاءَهُ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَقَالَ لَهُ: قُمْ فَصَلِّهِ، فَصَلَّى الظُّهْرَ، حِينَ زَالَتِ الشَّمْسُ، ثُمَّ جَاءَهُ الْعَصْرَ فَقَالَ: قُمْ فَصَلِّهِ فَصَلَّى الْعَصْرَ، حِينَ صَارَ ظِلُّ كُلِّ شَيْئٍ مِثْلَهُ، ثُمَّ جَاءَهُ الْمَغْرِبَ فَقَالَ: قُمْ فَصَلِّهِ، فَصَلَّى الْمَغْرِبَ حِينَ وَجَبَتِ الشَّمْسُ، ثُمَّ جَاءَهُ الْعِشَاءَ فَقَالَ: قُمْ فَصَلِّهِ فَصَلَّى الْعِشَاءَ، حِينَ غَابَ الشَّفَقُ، ثُمَّ جَاءَهُ الْفَجْرَ، فَقَالَ: قُمْ فَصَلِّهِ، فَصَلَّى الْفَجْرَ حِينَ بَرَقَ أَوْ قَالَ: سَطَعَ الْفَجْرُ»

''نبیِ اکرم کے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام آئے اور فرمایا: اُٹھیے نماز پڑھیے تو آپ ﷺ نے (ان کے ساتھ) ظہر کی نماز اس وقت پڑھی، جب کہ سورج سر سے ڈھل گیا، پھر وہ عصر کے وقت آئے اور فرمایا: اٹھیے نماز پڑھیے۔ تب آپ ﷺ نے عصر کی نماز اس وقت پڑھی، جب کہ ہر چیز کا سایہ اس کے برابر ہوگیا تھا، پھر وہ مغرب کے وقت نازل ہوئے اور فرمایا: اُٹھیے نماز پڑھیے۔ آپ ﷺ نے نماز مغرب اس وقت ادا کی، جب سورج غروب ہوگیا۔ پھر وہ عشا کے وقت نازل ہوئے اور فرمایا: اُٹھیے نماز پڑھیے۔ تب آپ ﷺ نے نمازِ عشا اس وقت پڑھی، جب کہ شفق (غروبِ آفتاب کے بعد والی سرخی) غائب ہو چکی تھی۔ پھر جبرائیل علیہ السلام فجر کے وقت آئے اور فرمایا: اٹھیے نماز پڑھیے۔ آپ ﷺ نے فجر کی نماز اس وقت پڑھی، جب کہ فجر طلوع ہوئی۔''

اس طرح ایک دن کی پانچ نمازیں نبیِ اکرم ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ ادا فرمائیں، جب کہ اسی حدیث کے اگلے حصے میں دوسرے دن کی پانچ نمازیں پڑھنے کا ذکر ہے، البتہ دوسرے دن کے اوقات مختلف ہیں۔ چنانچہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

---

[1] إرواء الغليل (١/ ٢٧٠، ٢٧١) و صححه.

«ثُمَّ جَاءَہٗ مِنَ الْغَدِ لِلظُّهْرِ، فَقَالَ: قُمْ فَصَلِّهِ فَصَلَّى الظُّهْرَ حِيْنَ صَارَ ظِلُّ كُلِّ شَيْئٍ مِثْلَهٗ ثُمَّ جَاءَهُ الْعَصْرَ حِيْنَ صَارَ ظِلُّ كُلِّ شَيْئٍ مِثْلَيْهِ، ثُمَّ جَاءَهُ الْمَغْرِبَ وَقْتاً وَّاحِداً، لَمْ يَزُلْ عَنْهُ، ثُمَّ جَاءَهُ الْعِشَاءَ حِيْنَ ذَهَبَ نِصْفُ اللَّيْلِ أَوْ قَالَ: ثُلُثُ اللَّيْلِ، فَصَلَّى الْعِشَاءَ، ثُمَّ جَآءَ حِيْنَ أَسْفَرَ جِدًّا فَقَالَ لَهٗ: قُمْ فَصَلِّهِ، فَصَلَّى الْفَجْرَ، ثُمَّ قَالَ: مَا بَيْنَ هٰذَيْنِ وَقْتٌ»[1]

''اگلے دن جبرائیل علیہ السلام ظہر کے لیے تشریف لائے اور فرمایا: اُٹھیے نماز پڑھیے۔ آپ ﷺ نے نمازِ ظہر اس وقت پڑھی، جب کہ ہر چیز کا سایہ اس سے برابر ہو گیا۔ پھر وہ عصر کے لیے اسی وقت آئے، جب کہ ہر چیز کا سایہ اس کے دوگنا ہوگیا۔ پھر وہ مغرب کے لیے اس وقت آئے، جس وقت پہلے دن آئے تھے۔ اس کا وقت نہیں بدلا۔ پھر جبرائیل علیہ السلام نمازِ عشا کے لیے آپ ﷺ کے پاس آئے، جب کہ نصف رات گزر گئی یا کہا کہ ایک تہائی رات گزر گئی، تب نمازِ عشا پڑھی، پھر وہ اس وقت آئے، جب فجر کی روشنی خوب پھیل چکی تھی اور فرمایا: اٹھیے نماز پڑھیے، تو آپ ﷺ نے نمازِ فجر پڑھی۔ تب فرمایا: ان دونوں اوقات کے مابین ان نمازوں کا وقت ہے۔''

اس طرح حکمِ الٰہی سے حضرت جبرائیل علیہ السلام نے نبیِ اکرم ﷺ کو دو دن پانچوں وقت کی نماز پڑھا کر ان کے اوّل و آخر دونوں وقت بتا دیے کہ یہاں سے شروع ہو کر یہاں تک نماز کا وقت ہے۔ اس حدیث کی رو سے تو نمازِ مغرب کا صرف ایک ہی وقت ہے۔ جب کہ صحیح مسلم و سنن ابی داود، نسائی، صحیح ابی عوانہ، سنن دارقطنی اور مسندِ احمد میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازِ مغرب کا بھی اوّل و آخر وقت ہے۔[2]

یعنی دوسری نمازوں کی طرح ہی نمازِ مغرب کو بھی ایک خاص وقت تک موخر کیا جا سکتا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ کے پاس کوئی آدمی آیا اور اس نے نمازوں کے اوقات کے بارے میں پوچھا تو آپ ﷺ نے اسے کوئی جواب نہیں دیا، بلکہ دو دن

[1] صحيح سنن الترمذي للألباني (١/ ٥٠) إرواء الغليل (١/ ٢٧٠، ٢٧١) المنتقى مع النيل (١/ ١/ ٣٥١، مصر)

[2] مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (٢٠٦) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨١) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٠٩)

پانچوں نمازیں اوّل وآخر اوقات میں پڑھائیں اور آخر میں فرمایا:

«أَلْوَقْتُ فِيمَا بَيْنَ هٰذَيْنِ»

''ہر نماز کے ان دو وقتوں کے مابین ہی اس کا وقت ہے۔''

اسی حدیث میں دوسرے دن کی نمازوں کے اوقات کے سلسلے میں نمازِ مغرب کے بارے میں وہ فرماتے ہیں:

«ثُمَّ أَخَّرَ الْمَغْرِبَ حَتّٰى كَانَ عِنْدَ سُقُوطِ الشَّفَقِ»

''پھر آپ ﷺ نے نمازِ مغرب میں اتنی تاخیر کی کہ مغرب کی سرخی (شفق) ختم ہونے والی تھی۔''

ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں:

«فَصَلَّى الْمَغْرِبَ قَبْلَ أَنْ يَّغِيبَ الشَّفَقُ»[1]

''آپ ﷺ نے شام کی سُرخی غائب ہونے سے پہلے مغرب کی نماز ادا فرمائی۔''

اسی مفہوم کی ایک حدیث صحیح مسلم، سنن اربعہ اور دیگر کتب میں حضرت بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے اور صحیح مسلم، ابو داود، نسائی اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے،[2] جو مغرب کے اوّل وآخر وقت کی دلیل ہے۔

نمازِ پنج گانہ کے اوقات سے متعلق بعض دیگر تفصیلات بھی ارشاداتِ رسول ﷺ سے ملتی ہیں، لہٰذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ترتیب اور ان کا تذکرہ بھی کسی حد تک کر دیا جائے، تاکہ کوئی کوئی تشنگی باقی نہ رہے۔

نمازِ فجر:

نمازِ پنج گانہ کے اوقات کے سلسلے میں جو احادیث ذکر کی جا چکی ہیں، ان میں نمازِ فجر کا اوّل وقت یہ مذکور ہے کہ جب فجر (یا صبحِ صادق کا نور) طلوع ہو، پھر دوسرے دن کی نماز میں فجر کا آخری

[1] المنتقىٰ مع النيل (١/ ١/ ٣٥٩، ٣٦٠) إرواء الغليل (١/ ٢٧١)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٥/ ١٠٩، ١١٣، ١١٤، ١١٥) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٠٥، ٥٠٨) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٠) مشكاة المصابيح (١/ ١٨٤) المنتقىٰ مع النيل (١/ ١/ ٣١٠)

وقت یہ بتایا گیا ہے کہ جب فجر کی روشنی خوب پھیل جائے، تب تک نمازِ فجر ادا کی جا سکتی ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث کے الفاظ ہیں:

«وَقْتُ صَلَاةِ الصُّبْحِ مِنْ طُلُوعِ الْفَجْرِ مَا لَمْ تَطْلُعِ الشَّمْسُ»[1]

''صبح کی نماز کا وقت طلوعِ صبح صادق سے لے کر طلوعِ آفتاب تک ہے۔''

جب کہ صحیح بخاری و مسلم، صحیح ابی عوانہ، سنن ترمذی، نسائی، بیہقی، دارمی، مسندِ احمد اور موطا امام مالک اور معانی الآثار طحاوی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنَ الصُّبْحِ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ الصُّبْحَ»[2]

''جو شخص طلوعِ آفتاب سے قبل فجر کی ایک رکعت پڑھ لے تو اس نے نمازِ فجر کو پا لیا۔''

جب کہ بخاری شریف میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ بھی ہیں:

«وَإِذَا أَدْرَكَ سَجْدَةً مِّنْ صَلَاةِ الصُّبْحِ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَلْيُتِمَّ صَلَاتَهُ»[3]

''جس نے طلوعِ آفتاب سے پہلے پہلے ایک سجدہ بھی کر لیا، پس اسے چاہیے کہ اب اپنی نماز مکمل پڑھ لے۔''

ان الفاظ میں سے « فَقَدْ أَدْرَكَ » اس کے بارے میں امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان الفاظ کا ظاہری معنیٰ مراد نہیں، کیوں کہ اس بات پر پوری امتِ اسلامیہ کا اجماع ہے کہ ایک رکعت کو پانے والا پوری نماز کو پانے والا نہیں کہ اسے صرف اسی ایک رکعت سے پوری نماز مل جائے اور اسے صرف ایک رکعت کافی ہو، بلکہ یہاں ان الفاظ کی تاویل کی گئی ہے اور یہاں بعض الفاظ کو محذوف تسلیم کیا گیا ہے، جو شامل ہوں تو اصل عبارت یوں ہو جاتی ہے:

''فَقَدْ أَدْرَكَ حُكْمَ الصَّلَاةِ أَوْ وُجُوبَهَا أَوْ فَضْلَهَا''[4]

---

[1] مختصر صحیح مسلم للمنذري، رقم الحدیث (۲۰۵) مشکاۃ شریف (۱/ ۱۸٤)

[2] صحیح البخاري مع الفتح، رقم الحدیث (۵۷۹) صحیح مسلم مع شرح النووي (۲/ ۵/ ۱۰٤، ۱۰۵) صحیح سنن الترمذي، رقم الحدیث (۳٤۷) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (۵۰۳) و سنن الدارمي، رقم الحدیث (۱۲۲۲) مشکاۃ المصابیح (۱/ ۱۹) المنتقیٰ مع النیل (۱/ ۲/ ۲٤) الإرواء (۱/ ۲۷۳)

[3] صحیح البخاري مع الفتح (۲/ ٥٦)

[4] شرح صحیح مسلم للنووي (۳/ ۵/ ۱۰۵)

”اس نے نماز کے حکم کو یا وجوب کو یا (ادا کرنے کی) فضیلت کو پا لیا۔“

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس عبارت کو ان الفاظ پر محمول کیا جائے گا:

”إِنَّهُ أَدْرَكَ الْوَقْتَ“ ”اس نے وقت کو پا لیا۔“

فتح الباری میں حافظ عسقلانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ جمہور کا قول ہے۔[1]

نسائی شریف میں اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

«فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلَاةَ كُلَّهَا إِلَّا أَنَّهُ يَقْضِي مَا فَاتَهُ»

”اس شخص نے پوری نماز کو پا لیا، البتہ بقیہ فوت شدہ نماز قضا (مکمل) کر لے گا۔“

ایک روایت میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں کہ جس نے طلوعِ آفتاب سے پہلے ایک رکعت پڑھ لی اور بقیہ نماز کو طلوعِ آفتاب کے بعد پڑھ کر مکمّل کر لیا، اس کی نماز فوت نہیں ہوئی، جب کہ صحیح بخاری شریف اور دیگر کتب کے یہ سب الفاظ اس کی تائید کرتے ہیں۔ تاہم امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”اگر کسی کی نمازِ فجر کو ادا کرنے کے دوران میں اس پر سورج طلوع ہو جائے تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی۔“[2]

انھوں نے دلیل کے طور پر وہ احادیث پیش کی ہیں، جن میں طلوعِ آفتاب کے وقت نماز ادا کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ بعض نے تو یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ جواز والی احادیث منسوخ ہیں اور ممانعت والی ناسخ، لیکن صاحبِ فتح الباری لکھتے ہیں:

”یہ دعویٰ دلیل کا محتاج ہے۔ محض کسی احتمال کی بنا پر ناسخ و منسوخ کے چکر میں نہیں پڑ جانا چاہیے۔ یہاں تو دونوں طرح کی احادیث میں جمع و تطبیق بھی ممکن ہے اور وہ اس طرح کہ جواز والی احادیث کو سببی نمازوں پر اور ممانعت والی احادیث کو بلا سبب یعنی عام نفلی نمازوں پر محمول کیا جائے۔ شیخ ابن باز رحمہ اللہ نے امام شافعی، احمد بن حنبل، ابن تیمیہ اور ابن قیم رحمہم اللہ کا یہ مسلک لکھا ہے اور اسے ہی اصح الاقوال قرار دیا ہے۔“[3]

امام شوکانی رحمہ اللہ ”نیل الأوطار“ میں لکھتے ہیں:

---

[1] فتح الباري (٢/ ٥٦)

[2] نيل الأوطار (١/ ٢/ ٢٥)

[3] فتح الباري (٢/ ٥٦) و حاشيه الفتح (٢/ ٥٩)

''یہ طریقہ جمع و تطبیق بھی محض ان کے اپنے مذہب کے موافق ہے، جب کہ حق یہ ہے (یعنی حقیقی جمع و تطبیق یہ ہے) کہ ممانعت والی احادیث عام ہیں اور تمام نمازوں کو شامل ہیں۔ (فرض ہوں یا نفلی اور سببی ہوں یا بلا سبب) جب کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیثِ زیرِ بحث خاص ہے۔ لہٰذا عام کو خاص کے ساتھ مقید کیا جائے گا، لہٰذا اس وقت کوئی بھی نماز جائز نہیں، سوائے اس کے جسے کوئی دلیل خاص دے، وہ چاہے سببی ہو یا غیر سببی۔''[1]

امام شوکانی رحمہ اللہ نے جو تفصیل بیان کی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جو حقیقی جمع و تطبیق ہے، اس کی رُو سے جس نماز کو کوئی حدیث خاص کر دے، وہ پڑھی جا سکتی ہے، دوسری نہیں، جب کہ طلوعِ آفتاب کے وقت ادا کرنے کے جواز کو صحیحین وسنن کی زیرِ بحث حدیث خاص کرتی ہے، لہٰذا اس کو اس وقت ادا کرنا جائز ہے اور بعینہٖ یہی معاملہ نمازِ عصر کا بھی ہے، جس کا اسی حدیث اور دیگر احادیث میں تذکرہ موجود ہے، مگر اس کے بارے میں اس کے موقع پر تفصیل ذکر کی جائے گی۔ إن شاء اللّٰه.

صحیح مسلم، سنن نسائی، ابن ماجہ، بیہقی اور مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ مِنَ الْعَصْرِ سَجْدَةً قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ أَوْ مِنَ الصُّبْحِ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَهَا»[2]

''جس نے غروبِ آفتاب سے پہلے نمازِ عصر کا ایک سجدہ یا طلوعِ آفتاب سے پہلے نمازِ فجر کا ایک سجدہ بھی پا لیا تو اس نے نماز کو پا لیا۔''

یہاں سجدے سے مراد بھی رکعت ہی ہے، جیسا کہ ''منتقی الأخبار'' میں علامہ مجد الدین نے لکھا ہے اور علامہ خطابی رحمہ اللہ نے ''معالم السنن'' میں لکھا ہے:

''سجدے سے مراد رکوع و سجود سمیت پوری رکعت ہے اور رکعت مکمل ہی سجدوں کے ساتھ

---

[1] عون المعبود (٢/ ٨٣) و نيل الأوطار (٢/ ٢٥)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٠٥) الإرواء (١/ ٢٧٢) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٣٦) عن أبي هريرة رضي الله عنه، سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٠٠) لیکن اس میں « ركعةً » کے الفاظ ہیں۔ المنتقى مع النيل (١/ ٢/ ٢٤)

[3] فتح الباري (٢/ ٣٨) المنتقى مع النيل (١/ ٢/ ٢٥)

ہوتی ہے، لہٰذا اُسے سجدہ کہا گیا ہے۔"[1]

یہ آخری وقت محض مجبوری کی حالت میں ہے، ورنہ امام نووی نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ جان بوجھ کران اوقات تک نماز کو موخر کرنا جائز نہیں ہے۔[2]

یہ بھی اللہ کی اپنے بندوں پر رحمت ہے۔ اگر کبھی بعض ناگزیر حالات اور مجبوری میں اوّل وقت گزر جائے تو اس کے بعد آخری وقت تک نماز پڑھ لی جائے، محض لیٹ ہو جانے کی بنا پر چھوڑ نہ دی جائے، لیکن مسنون اور افضل طریقہ یہی ہے کہ نمازِ فجر اور دیگر نمازیں ان کے اوّل وقت ہی میں ادا کی جائیں، کیوں کہ نبیِ اکرم ﷺ کا عملِ مبارک یہی تھا کہ آپ ﷺ نے تمام نمازیں ہمیشہ ہی اوّل وقت میں ادا فرمائی ہیں، سوائے ایک مرتبہ کے اور وہ بھی صرف جواز بتانے کے لیے تھا۔ چنانچہ سنن ترمذی اور مسند احمد میں ایک حدیث ہے، جس کی سند کے بارے میں امام ترمذی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ "وہ متصل نہیں، اور اسے حسن غریب کہا ہے۔ جب کہ وہی حدیث مستدرک حاکم میں بھی ہے اور ہے بھی موصولاً۔ امام حاکم نے اس کی سند کو صحیح بخاری و مسلم کی شرائطِ صحت کے مطابق صحیح قرار دیا ہے۔"[1] علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے بھی ان کی موافقت کی ہے، لہٰذا سنن ترمذی کی سند میں جو کمی تھی، وہ مستدرک حاکم والی سند سے پوری ہوگئی۔ اسے امام زیلعی رحمہ اللہ نے "نصب الرایۃ" میں سنن دارقطنی اور بیہقی کی طرف بھی منسوب کیا ہے اور بعض محدّثین کا کلامِ جرح ذکر کیا ہے۔[3]

اس حدیث میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

«مَا صَلّٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ صَلَاةً لِوَقْتِهَا الْآخِرِ مَرَّتَيْنِ حَتّٰی قَبَضَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی»[4]

"نبیِ اکرم ﷺ نے کسی نماز کو اس کے آخری وقت میں دو مرتبہ ہرگز نہیں پڑھا۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ کی روح کو اللہ تعالیٰ نے قبض کرلیا۔"

---

[1] دیکھیں: نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۲۲) طبع بیروت.

[2] تحقیق مشکاۃ المصابیح (۱/ ۱۹۳)

[3] نصب الرایة (۱/ ۲٤٤)

[4] سنن الترمذي مع التحفة (۱/ ۵۲۱، ۵۲۲) التلخیص (۱/ ۱/ ۱۸۳) مشکاۃ المصابیح (۱/ ۱۹۳) نصب الرایة (۱/ ۲٤٤)

یعنی صرف مرتبہ بیانِ جواز کے لیے آخری وقت میں نماز پڑھی، پھر دوبارہ کبھی نہیں پڑھی۔

خاص نمازِ فجر کے بارے میں تو صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ، دارمی، بیہقی، مسندِ احمد و طیالسی، معانی الآثار طحاوی، صحیح ابی عوانہ اور مصنّف ابن ابی شیبہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كُنَّ نِسَآءُ الْمُؤْمِنَاتِ يَشْهَدْنَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ صَلَاةَ الْفَجْرِ مُتَلَفِّعَاتٍ بِمُرُوْطِهِنَّ ثُمَّ يَنْقَلِبْنَ إِلٰى بُيُوْتِهِنَّ حِيْنَ يَقْضِيْنَ الصَّلَاةَ، لَا يَعْرِفُهُنَّ أَحَدٌ مِّنَ الْغَلَسِ»[1]

''مومن عورتیں یعنی صحابیات رضی اللہ عنہن اپنی چادروں میں لپٹی ہوئی نبیِ اکرم ﷺ کی اقتدا میں نمازِ فجر ادا کرنے کے لیے آتی تھیں اور نماز ادا کر چکنے کے بعد جب وہ اپنے گھروں کو جاتیں، تو اتنا اندھیرا ہوتا تھا کہ انھیں کوئی پہچان نہیں سکتا تھا۔''

غلس یا اندھیرے ہی میں نمازِ فجر ادا کرنے کے مسنون ہونے پر دلالت کرنے والی ایک دوسری حدیث حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، چنانچہ صحیح بخاری، مسلم، ابی عوانہ، سنن نسائی و بیہقی، مسند احمد و طیالسی اور مصنّف ابن ابی شیبہ میں جہاں وہ نمازوں کے اوقات بیان فرماتے ہیں، وہیں وہ فرماتے ہیں:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّيْهَا بِغَلَسٍ»[2]

''نبیِ اکرم ﷺ فجر کی نماز اندھیرے میں پڑھا کرتے تھے۔''

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بیان کرنے والے راوی فرماتے ہیں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے یا تو یہ فرمایا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اندھیرے میں نمازِ فجر پڑھا کرتے تھے یا پھر یہ فرمایا کہ نبیِ اکرم ﷺ اندھیرے میں میں فجر پڑھا کرتے تھے۔

سنن ابی داود، دارقطنی، بیہقی، صحیح ابن حبان اور مستدرکِ حاکم میں حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٥٤) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٨) صحيح مسلم مع شرح النووي (٥/٢/ ١٤٣، ١٤٤) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٨) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣١) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٣١، ٥٣٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٦٩) و سنن الدارمي، رقم الحديث (١٢١٦) إرواء الغليل (١/ ٢٧٨)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٥/ ١٤٤) إرواء الغليل (١/ ٢٧٥)

سے مروی حدیث میں ہے:

«وَصَلَّى الصُّبْحَ مَرَّةً بِغَلَسٍ، ثُمَّ صَلّٰى مَرَّةً أُخْرٰى فَأَسْفَرَ بِهَا، ثُمَّ كَانَتْ صَلَاتُهٗ بَعْدَ ذٰلِكَ التَّغْلِيْسَ حَتّٰى مَاتَ وَلَمْ يَعُدْ إِلٰى أَنْ يُّسْفِرَ»[1]

''نبیِ اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ نمازِ فجر اندھیرے میں پڑھی اور پھر ایک مرتبہ روشنی میں، پھر آپ ﷺ ہمیشہ اندھیرے ہی میں پڑھتے رہے، یہاں تک کہ وفات پائی اور وفات پانے تک دوبارہ روشنی میں کبھی نہیں پڑھی۔''

خلفاے راشدین اور عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار سے بھی پتا چلتا ہے کہ وہ اندھیرے ہی میں فجر کی نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ سنن ابن ماجہ و بیہقی اور معانی الآثار طحاوی میں مغیث بن سمی بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کے ساتھ فجر کی نماز اندھیرے میں پڑھی (جب کہ وہ روشنی پھیلنے پر پڑھتے تھے) جب وہ سلام پھیر چکے تو میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف متوجہ ہوا اور اُن سے کہا: یہ کیا نماز ہوئی؟ تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

"هٰذِهِ صَلَاتُنَا كَانَتْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَأَبِيْ بَكْرٍ وَعُمَرَ"

''نبیِ اکرم ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے ساتھ ہماری فجر کی نماز اسی وقت ہوا کرتی تھی۔''

آگے فرماتے ہیں:

"فَلَمَّا طُعِنَ عُمَرُ، أَسْفَرَ بِهَا عُثْمَانُ"[2]

''جب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو (نمازِ فجر کے دوران) زخمی کر دیا گیا تو اس کے بعد حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ نے روشنی میں نماز پڑھنا شروع کر دی۔''

یہاں اس بات کی وضاحت بھی کر دیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ابتداے خلافت میں روشنی ہوجانے پر نماز فجر پڑھی تھی، کیوں کہ حالات ہی کچھ ایسے تھے، جن میں حضرتِ فاروق رضی اللہ عنہ کو زخمی کیا

---

[1] صحيح سنن أبي داود (١/ ٨٠) و حسنه الألباني، موارد الظمآن، رقم الحديث (٢٧٩) نصب الراية (١/ ٢٤٠) وقال في الإرواء (١/ ٢٧٠) وقال الحاكم: صحيح، و وافقه الذهبي، و صحيحه الخطابي، وحسنه النووي، وهو الصواب.

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٧١) إرواء الغليل (١/ ٢٧٩) نصب الراية (١/ ٢٤٠)

گیا، جن کی شہادت بھی اسی حادثے کے نتیجے میں رونما ہوئی اور زخمی کرنے والا بد بخت مسجد کے محراب ہی میں چھپا بیٹھا تھا۔ ان حالات میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کے بعد خلیفہ مقرر ہوئے تو احتیاطاً کچھ عرصے کے لیے ذرا روشنی (اسفار) میں فجر پڑھنے لگے، لیکن جب حالات سُدھر گئے تو انھوں نے بھی معروف سنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرتے ہوئے اندھیرے ہی میں نماز ادا کرنا شروع کر دیا، جس کا ثبوت مصنّف ابن ابی شیبہ میں مذکور دو آثار سے ملتا ہے، جن میں سے پہلے میں ابوسلمان (یزید بن عبدالملک) بیان کرتے ہیں:

"خَدِمْتُ الرَّكْبَ فِيْ زَمَانِ عُثْمَانَ فَكَانَ النَّاسُ يُغَلِّسُوْنَ بِالْفَجْرِ"[1]

''میں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ایک قافلے کی خدمت کی، وہ لوگ اندھیرے میں نمازِ فجر پڑھا کرتے تھے۔''

اس کی تائید اس اثر سے بھی ہوتی ہے، جسے عبداللہ بن ایاس اپنے والد کے حوالے سے بیان کرتے ہیں، جس میں ایاس فرماتے ہیں:

"كُنَّا نُصَلِّيْ عُثْمَانَ الْفَجْرَ فَنَنْصَرِفُ وَمَا يَعْرِفُ بَعْضُنَا وُجُوْهَ بَعْضٍ"[2]

''ہم حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ساتھ نمازِ فجر پڑھا کرتے تھے، پھر جب (نماز کے بعد) ہم لوگ چلتے تو ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کے چہرے کو نہیں پہچان سکتا تھا۔''

ان اور ایسی ہی دیگر احادیث و آثار کے پیشِ نظر امام ترمذی رحمہ اللہ کے بقول صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما اور کثیر صحابہ و تابعین کا یہی اختیار ہے کہ منہ اندھیرے ہی نمازِ فجر ادا کی جائے اور ائمہ میں سے امام شافعی، امام احمد، امام داود، امام ابو ثور اور اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کا بھی یہی قول ہے کہ اندھیرے میں نمازِ فجر پڑھنا ہی مستحب فعل ہے۔[3]

امام ابن قدامہ نے ''المغني'' میں لکھا ہے کہ صبح کی نماز اندھیرے میں پڑھنا ہی افضل ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور اسحاق رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔ علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم سے صحیح سند سے ثابت ہے کہ وہ اندھیرے میں

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة بحواله إرواء الغليل (١/ ٢٧٩)

[2] حواله سابقه أيضاً.

[3] سنن الترمذي مع التحفة (١/ ٤٧٤، ٤٧٥) بداية المجتهد (١/ ١٣٩، ١٤٠)

نمازِ فجر پڑھا کرتے تھے۔[1]

یہ محال ہے کہ وہ افضل فعل کو نہ کریں اور ادنیٰ کو اختیار کریں، جب کہ فضائل کو اختیار کرنا تو ان پر بس ہے۔ یہی بات ''کتاب الاعتبار'' میں امام حازمی نے بھی لکھی ہے، جسے دیگر علما کے علاوہ امام زیلعی حنفی رحمہ اللہ نے بھی ''نصب الرایۃ'' میں نقل کیا ہے۔[2]

امام حازمی رحمہ اللہ نے خلفاے ثلاثہ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی بھی ذکر کیا ہے۔ ایسے ہی حضرت ابن مسعود، ابو موسیٰ اشعری، ابو مسعود انصاری، عبداللہ بن زبیر، عائشہ اور اُم سلمہ رضی اللہ عنہم اور تابعین میں سے حضرت عمر بن عبدالعزیز اور عروہ بن زبیر رحمہما اللہ کا بھی یہی مسلک لکھا ہے کہ یہ سب اندھیرے میں نمازِ فجر پڑھنے کے قائل تھے۔

اس اندھیرے کا اندازہ کرنے کے لیے کتبِ حدیث میں ایک مادی و حسّی قسم کی دلیل بھی ہے، جس سے فجر کے مستحب وقت (غلس) کو سمجھنے میں کافی آسانی ہو جاتی ہے، چنانچہ بخاری و مسلم، سنن نسائی اور بعض دیگر کتبِ حدیث میں، حضرت انس اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہما کا نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سحری کھانا مذکور ہو ہے، اس حدیث میں مذکور ہے کہ جب ان سے پوچھا گیا کہ سحری کھانے سے فراغت اور نماز شروع کرنے کے مابین کتنا وقت تھا تو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«قَدْرُ مَا يَقْرَأُ الرَّجُلُ خَمْسِيْنَ آيَةً»[3]

''اِتنا وقت تھا کہ جس میں کوئی شخص پچاس آیات کی تلاوت کرتا ہے۔''

اِس حدیث کی رو سے نمازِ فجر کا آغاز سحری کا کھانا بند کرنے کے بعد جلد ہی ہو جاتا ہے۔ صرف اتنا فرق کیا گیا ہے کہ جس میں کوئی پچاس آیتیں تلاوت کر سکے اور اسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ سحری کھانے کے بعد تقریباً وضو کر سکنے کے بہ قدر وقت گزرنے کے بعد نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ فجر ادا فرمائی۔ گویا طلوعِ فجر کے ساتھ ہی غلس اندھیرے میں نماز کا ادا کرنا ہی افضل ہے، اسی حدیث سے رمضان یا عام روزے کے لیے سحری سے امساک یا سحری کھانا بند کرنے کے وقت کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

---

[1] المغني (٢/ ٤٤) التمهيد (٤/ ٣٤٠)

[2] دیکھیں: نصب الراية (١/ ٢٣٩، ٢٤٠) تحفة الأحوذي (١/ ٤٧٥)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٥٤) مختصر صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٨١) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٢٠٣٦) المنتقى مع النيل (٢/ ١٩)

وقتِ فجر کے سلسلے میں احناف کا مسلک:

نمازِ فجر کے سلسلے میں یہ تو جمہور ائمہ کا مسلک ہے، جب کہ امام ابو خلیفہ رحمہ اللہ روشنی ہو جانے پر نماز فجر پڑھنے کو افضل سمجھتے ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ کے بقول کئی صحابہ و تابعین بھی اس کے قائل تھے اور سفیان ثوری رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔[1]

ان کا استدلال سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی، معجم طبرانی کبیر، مصنف ابن ابی شیبہ، معانی الآثار طحاوی اور مسند احمد میں متعدد طُرق اور ملتے جلتے الفاظ سے مروی حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«اَسۡفِرُوۡا بِالۡفَجۡرِ فَإِنَّہٗ أَعۡظَمُ لِلۡأَجۡرِ»[2]

''صبح کی نماز روشنی میں پڑھو، کیوں کہ یہ زیادہ اجر والی ہے۔''

غلس میں نماز پڑھنے پر دلالت کرنے والی احادیث کے کئی جوابات دیے گئے ہیں، جو سبھی مخدوش ہیں۔ مثلاً یہ کہنا کہ شروع اسلام میں اندھیرے میں نماز پڑھنے کا حکم تھا۔ پھر یہ منسوخ ہوگیا، جیسا کہ معانی الآثار میں امام طحاوی نے لکھا ہے۔[3] لیکن یہ دراصل محض ایک دعویٰ ہے، جس کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ غلس میں نماز پڑھنے کی حدیث ثابت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر مبارک کے آخری وقت تک اسی پر عمل کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم غیر افضل فعل پر ہمیشگی نہیں کرتے تھے۔ اندھیرے میں نماز پڑھنے پر تا دمِ واپسیں ہمیشگی کرنے پر دلالت کرنے والی احادیث ذکر کی جا چکی ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارک روشنی میں نماز پڑھنے کی تھی اور اس پر صحیح بخاری و مسلم میں مذکور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے، جس میں فرماتے ہیں:

«مَا رَأَیۡتُ النَّبِيَّ ﷺ صَلّٰی صَلَاۃً بِغَیۡرِ مِیۡقَاتِھَا إِلَّا صَلَاتَیۡنِ، جَمَعَ بَیۡنَ

---

[1] سنن الترمذي مع التحفة (١/ ٤٧٩)

[2] سنن الترمذي مع التحفة (١/ ٤٧٨) الفتح الرباني (٢/ ٢٧٩) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٩) سنن (٥٣٤) سنن ابن ماجه (٦٧٢) و سنن الدارمي (١٢١٧) مشكاة المصابيح (١/ ١٩٤) الإرواء (١/ ٢٨١، ٢٨٣)

[3] نصب الراية (١/ ٢٣٩، ٢٤٠)

الْمَغْرِبِ وَالْعِشَاءِ، بِجَمْعٍ، وَصَلَّى الْفَجْرَ قَبْلَ مِيْقَاتِهَا))[1]

''میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو دو نمازوں کے سوا بے وقت نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔ آپ ﷺ نے مغرب و عشا کو مزدلفہ میں جمع کر کے پڑھا اور فجر کو اس کے وقت سے پہلے پڑھا۔''

یہاں آپ ﷺ کا نمازِ فجر کو عام ایام سے ذرا جلدی ادا کرنا مراد ہے، مگر یہ بھی نہیں کہ آپ ﷺ نے طلوعِ فجر سے بھی پہلے پڑھ لی، بلکہ آغازِ طلوع میں پڑھی گئی اور اس حدیث سے روشنی میں نماز ادا کرنے کو عام عادت شمار کرنے پر استدلال کرنا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔[2]

یہ بھی کہا گیا ہے کہ روشنی کر کے نماز ادا کرنے پر صحابہ کا اجماع ہوگیا تھا۔ اس بات پر حضرت ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کا قول بطورِ دلیل پیش کیا جاتا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

''مَا اجْتَمَعَ أَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ عَلٰى شَيْءٍ مَا اجْتَمَعُوْا عَلٰى التَّنْوِيْرِ''[3]

''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کسی معاملے میں اس طرح اکٹھے نہیں ہوئے، جس طرح وہ فجر کو روشنی میں پڑھنے پر اکٹھے ہوئے۔''

اجماعِ صحابہ کا یہ دعویٰ بھی باطل ہے، کیوں کہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اپنی جامع میں لکھا ہے کہ اندھیرے میں نماز فجر ادا کرنا کئی صحابہ رسول ﷺ کا اختیار ہے، جن میں صدیق و فاروق رضی اللہ عنہما بھی شامل ہیں۔ امام ابن قدامہ کی ''المغني'' اور ''التمهيد'' کے حوالے سے ذکر کیا جا چکا ہے کہ علامہ ابن عبد البر نے لکھا ہے کہ صحیح سند سے ثابت ہے کہ نبیِ اکرم رضی اللہ عنہم، ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم اندھیرے میں نماز فجر پڑھا کرتے تھے۔ ''كتاب الاعتبار للحازمي'' میں حضرت علی اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی اندھیرے میں نمازِ فجر ادا کرنے کا ذکر ہے تو پھر روشنی پر صحابہ کے اجماع کے دعوے کی کیا حیثیت رہ گئی؟

اسی پر بس نہیں، بلکہ امام طحاوی حنفی نے ''معاني الآثار'' میں حضرت صدیق و فاروق اور

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الحج، باب من يصلي الفجر بجمع، صحيح مسلم كتاب الحج، باب استحباب زياده التغليس بصلاة الصبح يوم النحر، فتح الباري (۲/ ۵۵) المنتقىٰ (۲/ ۱۹) تحفة الأحوذي (۱/ ۴۷۹)

[2] فتح الباري (۲/ ۵۵) تحفة الأحوذي (۱/ ۴۷۹)

[3] نصب الراية (۱/ ۳۳۷، ۳۳۸)

حضرت جابر رضی اللہ عنہم کے آثار بھی ذکر کیے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اِسفار یعنی روشنی میں نہیں، بلکہ غلس (اندھیرے) میں نمازِ فجر پڑھتے تھے۔[1]

اس طرح اجماعِ صحابہ کے دعوے کا بطلان اور امام نخعی کے قول کا ضعف واضح ہو گیا ہے۔

جمع و تطبیق:

ان دونوں اقوال میں اس بات پر تو سب کا اتفاق ہے کہ نمازِ فجر کا وقت طلوعِ فجر ہی سے شروع ہو جاتا ہے اور غلس میں نماز پڑھ لینا جائز ہے اور اسفار میں بھی۔ اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ ان دونوں اوقات میں سے افضل کون سا ہے؟ دلائل و براہین آپ کے سامنے آ چکے ہیں، جنھیں سامنے رکھنے پر بہ آسانی اندازہ ہو جاتا ہے کہ اندھیرے میں نماز ادا کرنے کے افضل ہونے پر دلالت کرنے والی احادیث تعداد میں زیادہ اور سند و متن کے اعتبار سے صحیح تر اور قوی ہیں۔ علامہ مبارکپوری رحمہ اللہ کے بقول اکثر اہلِ علم کا یہی مذہب ہے، جیسا کہ "تحفة الأحوذي" میں انھوں نے بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اسفار والی حدیث بھی حدیث صحیح ہے، جس کے اہلِ علم نے متعدد جوابات دیے ہیں۔ امام ترمذی کے بقول امام شافعی، امام احمد اور اسحاق رحمہم اللہ نے اِسفار کا معنیٰ یہ کیا ہے کہ طلوعِ فجر کا یقین کر لے، حتیٰ کہ اس میں کوئی شک نہ رہ جائے، مگر کئی روایات سے اس کی نفی ہوتی ہے۔[2]

ان ہر دو طرح کی احادیث میں جمع و تطبیق اس طرح ممکن ہے کہ اِسفار سے مراد نمازِ فجر کا آغاز کرنا نہیں، بلکہ صحیح احادیث کی رو سے آغاز تو غلس ہی میں مسنون ہے، البتہ دونوں رکعتوں میں قراءت اتنی طویل ہو کہ نماز کا اختتام اسفار پر ہو۔ «أَسْفِرُوا بِالْفَجْرِ» اور ایسی ہی دیگر احادیث کے الفاظ سے یہی معنیٰ معلوم ہوتا ہے۔ امام طحاوی رحمہ اللہ نے معانی الآثار میں اسی مفہوم کی تائید کی اور لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ، ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔[3]

اس تطبیق کی تائید کئی احادیث سے بھی ہوتی ہے، جن میں سے ایک صحیح بخاری اور مسلم، سنن ابو داود، نسائی، ابن ماجہ، بیہقی، مسندِ احمد، مصنف ابن ابی شیبہ اور معانی الآثار طحاوی میں حضرت

---

[1] معاني الآثار (ص: ١٠٤) بحواله تحفة الأحوذي (١/ ٤٨٠)

[2] دیکھیں: تحفة الأحوذي (١/ ٤٨١) نصب الراية (١/ ٢٣٩) الإرواء (١/ ٢٨٦، ٢٨٧)

[3] دیکھیں: تحفة الأحوذي (١/ ٤٨٢) إرواء الغليل (١/ ٢٨٧)

ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يَنصَرِفُ مِنَ الصُّبحِ فَيَنظُرُ الرَّجُلُ إِلٰى وَجهِ جَلِيسِهِ الَّذِي يَعرِفُهُ فَيَعرِفُهُ»[1]

''نبی اکرم ﷺ نمازِ فجر سے اس وقت فارغ ہوتے کہ آدمی اپنے ساتھ والے جانے پہچانے آدمی کو دیکھتا تو پہچان سکتا تھا۔''

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دوسرے ساتھی کو پہچان سکنے والا وقت نماز سے فراغت کا ہے نہ کہ نماز کے آغاز کا۔ ایک دوسری حدیث سنن نسائی، مسند احمد اور مسند ابو یعلی میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں پانچوں نمازوں کے اوقات مذکور ہیں، جن میں نبیِ اکرم ﷺ انھیں پڑھا کرتے تھے اور نماز فجر کے سلسلے میں وہ فرماتے ہیں:

«وَالصُّبحَ إِذَا طَلَعَ الفَجرُ إِلٰى أَن يَّنفَسِحَ البَصَرُ»[2]

''اور صبح کی نماز آپ ﷺ طلوع فجر سے لے کر اس وقت تک ادا فرماتے، جب کافی دور تک چیزیں دیکھی جاسکتیں، یعنی روشنی پھیل جانے تک۔''

اس حدیث کے الفاظ بھی اس بات کی صریح دلیل ہیں کہ نماز کا آغاز تو اندھیرے میں ہی کرنا چاہیے، البتہ اس سے فراغت روشنی پھیل جانے پر ہو۔ « اَسفِرُوا بِالفَجرِ » کا یہی معنیٰ ہے۔ امام طحاوی کے بقول امام ابوحنیفہ اور ان کے دونوں صاحبین کا بھی یہی مسلک ہے، جو سنتِ رسول ﷺ کے موافق بھی ہے، پھر معلوم نہیں کہ متاخرین احناف نماز کا آغاز تاخیر سے کیوں کرتے ہیں؟ جب کہ "المبسوط للسرخسي" میں بھی مذکور ہے:

"يُستَحَبُّ الغَلَسُ وَتَعجِيلُ الظُّهرِ إِذَا اجتَمَعَ النَّاسُ"[3]

''جب لوگ اکٹھے ہو جائیں تو فجر کو اندھیرے میں اور ظہر کو جلدی ادا کرنا مستحب ہے۔''

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٥٤٧) صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٥/ ٤٥، ١٤٦) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٥) إرواء الغليل (١/ ٢٨٠)

[2] صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٣٨) إرواء الغليل (١/ ٢٨٠) صححه الألباني و إسناد أبي يعلىٰ حسنه الهيثمي في مجمع الزوائد (١/ ٣٠٤)

[3] دیکھیں: تحفة الأحوذي (١/ ٤٨٣)

"العرف الشذي" کے مولف نے "المبسوط" کے یہ الفاظ ذکر کیے ہیں۔ معانی الآثار میں امام ابو حنیفہ اور صاحبین رحمہم اللہ کا قول بھی یقیناً ان کی نظروں سے گزرا ہوگا اور صحیحین و سنن کی احادیث و آثار بھی سامنے ہوں گے، جن میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاے راشدین کا عمل مذکور ہے کہ وہ سب غلس میں نماز کے قائل و فاعل تھے۔ اس کے باوجود ان کا یہ کہنا کہ ترجیح احناف کے مذہب کو حاصل ہے محل نظرات ہے۔

البتہ اس کی انھوں نے جو دلیل دی ہے، وہ یہ ہے کہ غلس والی احادیث فعلی ہیں اور اسفار والی احادیث قولی ہے اور قولی و فعلی اختلاف کی شکل میں قول حدیث مقدم ہوتی ہے، لیکن اہلِ علم جانتے ہیں کہ یہ اصول صرف اس وقت اختیار کیا جاتا ہے، جب قولی و فعلی حدیث میں جمع و تطبیق ممکن ہی نہ ہو، جب کہ مسئلہ زیرِ بحث میں تو ایسا نہیں ہے، بلکہ امام طحاوی رحمہ اللہ نے وضاحت کی ہے کہ ان ہر دو طرح کی احادیث میں موافقت ممکن ہے۔ کبار علماے تحقیق میں سے علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے بھی "أعلام الموقعین" میں اسی موافقت کا ذکر کیا ہے کہ نماز کا آغاز غلس میں ہو اور اس کی تکمیل اِسفار میں، جیسا کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل مبارک تھا۔ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے موافق ہوتا ہے۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ گمان کیسے کیا جا سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ایسے عمل پر مواظبت اور ہمیشگی کی ہو، جس میں اجرِ عظیم نہ ہو، بلکہ اجرِ عظیم اس خلاف عمل میں ہو۔[1]

اس ساری تفصیل سے نمازِ فجر کے وقت کی تعیین واضح ہوگئی اور خوب روشنی ہو جانے پر جماعت کھڑی کرنا افضل ہونا ثابت نہیں، بلکہ غلس یا اندھیرے میں جماعت کھڑی کرنا ہی افضل و اولیٰ ہے۔[2] والله ولي التوفيق.

نمازِ ظہر:

نمازِ ظہر کا وقت زوالِ آفتاب سے شروع ہو جاتا ہے اور اس وقت تک رہتا ہے، جب تک ہر چیز کا سایہ اس کے برابر یعنی ایک مثل نہ ہو جائے، جیسا کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام والی حضرت جابر رضی اللہ عنہ

---

[1] دیکھیں: تحفة الأحوذي (۱/ ٤٨٢)

[2] دیکھیں: معالم السنن للخطابي (۱/ ٢٤٤) سبل السلام (۱/ ۱۰۹) فقه السنة (۱/ ۱۰٤، ۱۰۵) بداية المجتهد (۱/ ۱۳۹، ۱٤۰) نيل الأوطار (۱/ ۲/ ۱۷، ۲۰)

سے مروی حدیث میں پہلے دن کی نمازِ ظہر کے بارے میں مروی ہے:

«فَصَلَّى الظُّهْرَ حِيْنَ زَالَتِ الشَّمْسُ»

''آپ ﷺ نے نمازِ ظہر اس وقت پڑھی، جب کہ سورج سر سے ڈھل گیا۔''

دوسرے دن کی نماز کے بارے میں مروی ہے:

«فَصَلَّى الظُّهْرَ حِيْنَ صَارَ ظِلُّ كُلِّ شَيْئٍ مِثْلَهُ»

''آپ ﷺ نے ظہر اس وقت پڑھی، جب کہ ہر چیز کا سایہ اس کے مثل یعنی اس کے برابر ہو گیا تھا۔''

عام حالات میں نمازِ ظہر ہو یا دیگر نمازیں، ان سب کا اوّل وقت میں ادا کرنا ہی افضل ہے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبیِ اکرم ﷺ سے پوچھا:

«أَيُّ الْعَمَلِ أَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ» ''اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب عمل کون سا ہے؟''

تو نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«اَلصَّلَاةُ عَلٰى وَقْتِهَا»[1] ''نماز کو اس کے اول وقت میں ادا کرنا۔''

یہ تو عام حالات کا حکم ہے، البتہ شدید گرمی کے موسم میں نمازِ ظہر کو تھوڑی تاخیر کر کے ادا کرنا مستحب ہے، کیوں کہ صحیح بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ إِذَا اشتَدَّ الْبَرْدُ، بَكَّرَ بِالصَّلَاةِ إِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ أَبْرَدَ بِالصَّلَاةِ»[2]

''جب سردی بہت سخت ہو جاتی تو نبیِ اکرم ﷺ نمازِ ظہر جلدی پڑھ لیتے اور جب گرمی شدید ہو جاتی تو نمازِ ظہر کو تھوڑی ٹھنڈی کر کے ادا فرماتے تھے۔''

اسی طرح صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم دونوں سے مروی ارشادِ نبوی ہے:

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٥٢٧) صحيح مسلم مع شرح النووي (١/ ٢/ ٧٣، ٧٤) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١١) و لكن عن أم فروة. صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٥) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٩٤) نيل الأوطار (١/ ٣٠٤) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (١٤٨٩)

[2] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٣٣ـ ٥٣٤)

«إِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ فَأَبْرِدُوا بِالصَّلَاةِ فَإِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ»[1]

''جب گرمی شدید ہو جائے تو نمازِ ظہر کو دوپہر کے ٹھنڈے ہو جانے پر ادا کرو، کیوں کہ گرمی کی یہ شدت جہنم کے (باہر کو) سانس نکالنے سے ہوتی ہے۔''

صحیح بخاری شریف ہی میں اس مفہوم کی ایک حدیث حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، جس میں فرمانِ نبوی:

«اَبْرِدُوا بِالظُّهْرِ فَإِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ»

''نمازِ ظہر کو ٹھنڈا کر کے پڑھو، کیوں کہ گرمی کی یہ شدت جہنم کے سانس لینے سے ہے۔''

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم لوگ ایک سفر میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے۔ موذن نے ظہر کی اذان کہنا چاہی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَبْرِدْ أَبْرِدْ» أَوْ قَالَ: «اِنْتَظِرْ اِنْتَظِرْ»

''ٹھنڈا کرو'' یا فرمایا: ''انتظار کرو، یعنی گرمی کم ہونے دو۔''

ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دومرتبہ یہی حکم فرمایا:

«حَتّٰى رَأَيْنَا فَيْئَ التُّلُوْلِ» ''یہاں تک کہ ہم نے دیکھا کہ ٹیلوں کا سایہ نظر آنے لگا ہے۔''

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گرمی کی شدت جہنم کے سانس لینے سے ہے، لہٰذا جب گرمی شدید ہو جائے تو نمازِ ظہر کو ذرا ٹھنڈا کر لیا کرو، یعنی وقت سے ذرا موخر کر لیا کرو۔[2] یہاں ٹھنڈا کرنے کا مطلب کچھ تاخیر کرنا ہے، مگر اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ نماز کو اتنا موخر کر دیا جائے کہ اس پر عصر کا گمان ہونے لگے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے ''فتح الباري شرح صحيح البخاري'' میں ظہر کو ٹھنڈا کر کے پڑھنے کی حدود کے بارے میں ائمہ و علما کے مختلف اقوال ذکر کیے ہیں:

- کسی نے کہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ کسی چیز کا سایہ اس کے ذاتی سائے کے علاوہ ایک ہاتھ ہو جائے۔
- کسی نے قد کا چوتھائی۔

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ١٥)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ١٨، ٢٠)

❀ کسی نے ایک تہائی۔

امام مازری کے بقول ان میں سے مختلف اوقات و حالات میں مختلف حدود مراد لی جا سکتی ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ یہ حدود نمازِ ظہر کے آخری وقت کو نہ جا پہنچیں کہ وہ ظہر کے بجائے عصر محسوس ہونے لگے (جیسا کہ ہمارے پاک و ہند میں عموماً دیکھنے میں آتا ہے)

گرمی کے ایام میں نمازِ ظہر کو تھوڑا تاخیر سے ادا کیا جائے اور عام حالات میں اسے اوّل وقت میں ادا کرنا ہی افضل ہے اور اس کا اوّل وقت سورج کا سر سے ڈھل جانا ہے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام والی حدیث اور دیگر احادیث میں جو زوالِ آفتاب کے ساتھ ہی اوّل وقت کے آغاز اور کسی چیز کے سائے کے ایک مثل ہو جانے تک اس کے آخری وقت کا ذکر ہے، ان کے پیشِ نظر امام مالک، شافعی، احمد بن حنبل اور عام محدّثین کرام رحمہم اللہ نے اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے دونوں شاگردوں امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کا بھی یہی مسلک ہے اور ایک روایت کی رو سے تو خود امام صاحب کا بھی یہی مسلک ہے، لیکن مشہور قول کے مطابق امام صاحب کا مسلک یہ ہے کہ ظہر کا وقت تب تک رہتا ہے، جب تک ہر چیز کا سایہ دوگنا نہ ہو جائے۔ ان کا استدلال حضرت انس و ابو ذر رضی اللہ عنہما سے مروی ان احادیث سے ہے، جن میں نمازِ ظہر کو ٹھنڈا کر کے ادا کرنے کا حکم ہے، مگر وہ روایات چونکہ مخصوص حالات اور صرف شدید گرمی کے ایام کے بارے میں ہیں، لہٰذا ان سے اس مسئلے پر استدلال کرنا صحیح نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ خود علماے احناف مثلاً حضرت مولانا محمد زکریا سہارنپوری رحمہ اللہ نے "الکوکب الدري" میں لکھا ہے کہ احتیاط یہ ہے کہ ظہر کو ایک مثل سے پہلے پہلے ہی پڑھ لیا جائے۔[1]

نمازِ ظہر کو موسم گرما میں کتنا موخر کیا جا سکتا ہے؟ اس کا کچھ اندازہ سنن ابی داود و نسائی اور مستدرکِ حاکم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث سے ہوتا ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«كَانَ قَدْرُ صَلَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ الظُّهْرَ فِي الصَّيْفِ ثَلَاثَةَ أَقْدَامٍ إِلٰى خَمْسَةِ أَقْدَامٍ وَفِي الشِّتَاءِ خَمْسَةَ أَقْدَامٍ إِلٰى سَبْعَةِ أَقْدَامٍ»[2]

''نبی اکرم ﷺ کی نمازِ ظہر کا اندازہ یہ ہوتا ہے کہ گرمیوں میں انسان کا سایہ تین قدم

[1] الکوکب الدري (١/ ٩٠، ٩١) بحوالہ فقہ السنّة اردو، محمد عاصم (١/ ١٠٧)

[2] سنن أبي داود مع العون (٢/ ٧٢، ٧٣) المشکاۃ مع المرعاۃ (٢/ ٣٧) صحیح سنن النسائی للالبانی حدیث (٤٨٩)

سے لے کر پانچ قدم تک کے مابین ہوتا تھا اور موسم سرما میں پانچ سے سات قدم تک کے مابین ہوتا تھا۔‘‘

امام سیوطی رحمہ اللہ اور علامہ سندھی نے حاشیہ سنن ابو داود ونسائی میں وضاحت فرمائی ہے کہ جس انسان کا سایہ دیکھنا ہو تو وہ اسی کے قد کاٹھ اور قدم کی لمبائی کے مطابق ہوگا اور اصل و زائد دونوں سایوں کا مجموعہ اتنا ہو، جب کہ اصلی سایہ (فئ) سے مراد وہ سایہ ہے جو سورج کے عین سر پر ہوتے اور عام طور عام پر مشاہدہ میں آنے والی بات بھی ہے کہ موسمِ سرما میں سایہ لمبا ہوتا ہے بنسبت گرما کے۔

امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مختلف اقالیم وممالک میں سائے کی یہ مقدار کم وبیش ہوتی ہے، کیوں کہ جن ممالک میں سورج جتنا بلند ہوگا، اتنا ہی وہاں سایہ کم ہوگا اور جہاں سورج جتنا سر سے دور ہوگا، وہاں سایہ لمبا ہوگا اور مکہ و مدینہ اقلیم ثانی میں شمار ہوتے ہیں اور سائے کی اس مقدار کا اندازہ بھی وہیں کا ہے اور دوسری اقالیم میں یہ کم وبیش ہوگا۔[1]

اور ہر ملک میں زوال معلوم کرنے کے لیے علامہ شمس الحق ڈیانوی رحمہ اللہ نے ”عون المعبود شرح سنن أبي داؤد“ میں ایک ضابطہ بھی وضع کیا ہے، جس کی تفصیل مذکورہ مقام پر دیکھی جا سکتی ہے۔
”المرقاۃ شرح المشکاۃ“ میں ملا علی قاری رحمہ اللہ نے علامہ سبکی رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

’’ابو داود اور نسائی کی حدیث کے معنیٰ میں علما کے مابین اختلاف ہے اور میرے نزدیک اس کا معنیٰ یہ ہے کہ آپ ﷺ موسمِ گرما میں نمازِ ظہر کو اس کا آدھا وقت گزر جانے کے بعد ادا فرمایا کرتے تھے۔‘‘[2]

اس کا معنیٰ یہ ہوا کہ ان کے نزدیک نمازِ ظہر کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اتنا انتظار کیا جائے کہ کسی بھی چیز کا سایہ اس سے آدھا ہو جائے۔ بالفاظ دیگر چھے فٹ کی چیز کا سایہ تین فٹ ہو جائے، مگر یہ صرف انتہائی شدید گرمی کے دو تین ماہ کے لیے ہے۔ عام حالات میں نہیں۔

ظہر وعصر کا وقت معلوم کرنے کا طریقہ:

ظہر وعصر کا وقت معلوم کرنے کے بارے میں احادیث میں جو کسی چیز کے سائے کے ایک

[1] عون المعبود (٢/ ٥٣)

[2] مصدر سابق.

مثل یا دو مثل ہو جانے کا ذکر آتا ہے تو اس سے وقت معلوم کرنا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔ آج اگرچہ گھڑی اور کیلنڈر کا زمانہ ہے۔ سایہ ناپنے کی کسے ضرورت ہوسکتی ہے؟ مگر درحقیقت کیلنڈروں پر جو اوقاتِ ظہر و عصر لکھتے ہیں، وہ بھی تو اسی طریقے سے وقت دیکھ دیکھ کر مہینوں اور سالوں کے تجربات کے نتائج ہی سے لکھے جاتے ہیں۔ بہرحال وقت دیکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ زوالِ آفتاب سے پہلے پہلے کسی کھلی اور ہموار جگہ پر کوئی لکڑی وغیرہ گاڑ دیں۔ اس لکڑی کا سایہ آہستہ آہستہ کم ہونا شروع ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ نصف النہار یعنی عین دوپہر کے وقت بالکل معمولی سا رہ جائے گا۔ یہ دراصل اس چیز کا اصل سایہ کہلاتا ہے۔ جب یہ سایہ دوسری جانب بڑھنا شروع ہو جائے تو وہ اس بات کی علامت ہے کہ زوالِ آفتاب شروع ہو گیا ہے یا بالفاظِ دیگر نماز کے اول وقت کا آغاز ہو گیا ہے۔ پھر جب یہ سایہ اس قدر بڑھ جائے کہ زوال کے وقت والا لکڑی کا اصل سایہ منہا کرنے کے بعد اس لکڑی کے برابر ہوگیا تو یہ ایک مثل وقت ہو جائے گا، جو نمازِ ظہر کا آخری وقت ہے، یعنی اس سے پہلے ظہر پڑھ لینی چاہیے۔

نمازِ عصر کا وقت اور ایک اشکال کا حل:

ایک مثل سے جب سایہ بڑھنا شروع ہوگا تو نمازِ عصر کا اوّل وقت شروع ہو جائے گا اور جب دوگنا یا دو مثل ہوگا تو جبرائیل علیہ السلام والی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کی رُو سے یہ نمازِ عصر کا آخری وقت ہوگا۔

یہاں ایک اشکال یا شبہہ پیش آتا ہے، جو اس طرح ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے دن جب نمازِ عصر پڑھی تو ہر چیز کا سایہ اس کے برابر یعنی ایک مثل تھا اور دوسرے دن جب ظہر کا آخری وقت دکھانے کے لیے نمازِ ظہر پڑھی، تو وہ بھی اسی وقت تھی، جب کہ سایہ ایک مثل تھا تو گویا دونوں نمازوں کے اوّل و آخر وقت میں اشتراک ہوگیا اور کوئی حد فاصل نہ ہوئی۔ امام نووی اور شوکانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اکثر اہلِ علم کے نزدیک نمازِ ظہر و عصر کے اوقات میں باہم کوئی اشتراک نہیں ہے، اس پر صحیح مسلم، سنن ابو داود، نسائی اور مسندِ احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث سے استدلال کیا گیا ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں:

''وَقْتُ الظُّهْرِ إِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ، وَكَانَ ظِلُّ الرَّجُلِ كَطُوْلِهِ مَا لَمْ

يَحْضُرِ الْعَصْرُ"[1]

"ظہر کا وقت زوالِ آفتاب سے لے کر آدمی کا سایہ اس کے برابر ہو جانے تک ہے، جب کہ ابھی ظہر نہ ہوئی ہو۔"

اس طرح «مَا لَمْ يَحْضُرِ الْعَصْرُ» کے الفاظ نے مسئلہ واضح کر دیا کہ نمازِ ظہر و عصر کے اوقات میں کوئی اشتراک نہیں ہے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام والی حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ کا جواب بھی دیا گیا ہے کہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ دوسرے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ ظہر سے اس وقت فارغ ہوگئے، جب کسی چیز کا سایہ اس کے برابر ہوا اور پہلے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت نمازِ عصر کا آغاز فرمایا، جب کسی چیز کا سایہ اس کی ایک مثل کے برابر تھا۔[2]

اس طرح دونوں نمازوں کے اوقات میں کوئی باہمی اشترک نہ رہا اور یہ شبہہ زائل ہوگیا۔ حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ کی رُو سے نمازِ عصر کا آخری وقت کسی چیز کے سائے کا دومثل ہو جانا ذکر ہوا ہے، جب کہ صحیح مسلم، سنن ابو داود، نسائی اور مسندِ احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں:

«وَقْتُ صَلَاةِ الْعَصْرِ مَا لَمْ تَصْفَرَّ الشَّمْسُ»[3]

"نمازِ عصر کا وقت اس وقت تک ہے، جب تک سورج کا رنگ زرد نہ ہو جائے۔"

ایک دوسری روایت میں ہے:

«وَوَقْتُ صَلَاةِ الْعَصْرِ مَا لَمْ تَصْفَرَّ الشَّمْسُ وَيَسْقُطُ قَرْنُهَا الْأَوَّلُ»[4]

"اور عصر کا وقت تب تک ہے، جب تک سورج کا رنگ زرد نہ پڑ جائے اور اس کا پہلا کنارہ (افق میں) نہ بیٹھ جائے۔"

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١١٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٠٨) النيل (١/ ١/ ٣٠٣)

[2] شرح صحيح مسلم للنووي (٣/ ٥/ ١١٠) نيل الأوطار (١/ ١/ ٢٠٢، ٣٠٣)

[3] صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٥/ ١١٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٠٨)

[4] صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٥/ ١١٣) مع النيل (١/ ١/ ٣٠٦)

صحیح بخاری و مسلم، صحیح ابی عوانہ، سنن ترمذی، نسائی، بیہقی، دارمی، مسند احمد، موطا امام مالک اور معانی الآثار طحاوی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«وَمَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنَ الْعَصْرِ قَبْلَ أَنْ تَغْرُبُ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ الْعَصْرَ»[1]

''اور جس نے غروبِ آفتاب سے پہلے نمازِ عصر کی ایک رکعت بھی پڑھ لی، اس نے عصر کی نماز پالی۔''

صحیح بخاری میں ارشادِ نبوی کے الفاظ ہیں:

«وَإِذَا أَدْرَكَ أَحَدُكُمْ سَجْدَةً مِّنْ صَلَاةِ الْعَصْرِ قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ فَلْيُتِمَّ صَلَاتَهُ»[2]

''جس نے غروبِ آفتاب سے پہلے ایک سجدہ بھی کر لیا، پس اسے چاہیے کہ اب اپنی نماز پوری کر لے۔''

جب کہ صحیح مسلم، سنن نسائی، ابن ماجہ، مسند احمد، منتقیٰ ابن الجارود، سنن بیہقی اور معانی الآثار میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی ایک حدیث اسی مفہوم کی مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ مِنَ الْعَصْرِ سَجْدَةً قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ أَوْ مِنَ الصُّبْحِ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَهَا»[3]

''جس نے غروبِ آفتاب سے پہلے نمازِ عصر کا ایک سجدہ یا طلوعِ آفتاب سے پہلے نمازِ فجر کا ایک سجدہ کر لیا تو اس نے نماز کو پا لیا۔''

ان الفاظ کے بارے میں امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کا ظاہری معنیٰ مراد نہیں اور اس پر پوری امت کے علما کا اتفاق ہے کہ ایک رکعت کو پانے والا پوری نماز کو پانے والا نہیں کہ اسے صرف ایک ہی رکعت سے پوری نماز مل جائے اور وہی ایک رکعت اسے کافی ہو، ایسا ہرگز نہیں، بلکہ یہاں

[1] صحیح البخاري مع الفتح، رقم الحدیث (٥٧٩) صحیح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٥/ ١٠٤، ١٠٥) صحیح سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٤٧) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (٥٠٣) و سنن الدارمي، رقم الحدیث (١٢٢٢) مشکاة المصابیح (١/ ١٩) المنتقیٰ مع النیل (١/ ٢/ ٢٤) الإرواء (١/ ٢٧٣)

[2] صحیح البخاري مع الفتح (٢/ ٥٦)

[3] مصنف ابن أبي شیبة بحواله إرواء الغلیل (١/ ٢٧٩)

ان الفاظ کی تاویل ضروری ہے۔ مذکورہ الفاظ کے ساتھ ہی بعض دیگر الفاظ کو یہاں محذوف کیا گیا ہے، جنھیں شامل کرنے سے عبارت یوں ہوئی:

"فَقَدْ أَدْرَكَ حُكْمَ الصَّلَاةِ أَوْ وُجُوبَهَا أَوْ فَضْلَهَا" [1]

"اس نے نماز کے حکم کو یا وجوب کو یا (ادا کرنے کی) فضلیت کو پالیا۔"

یہ بھی کہا گیا ہے:

"إِنَّهُ أَدْرَكَ الْوَقْتَ" "اس نے (اس نماز کے) وقت کو پالیا۔"

شرح بخاری میں لکھا ہے کہ یہ جمہور کا قول ہے۔[2] نسائی شریف میں اس حدیث کے الفاظ ہیں:

«فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلَاةَ كُلَّهَا إِلَّا أَنَّهُ يَقْضِي مَا فَاتَهُ» [3]

"اس شخص نے پوری نماز کو پالیا۔ البتہ وہ فوت شدہ نماز قضا (مکمل) کرلے گا۔"

ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ جس نے غروبِ آفتاب سے پہلے ایک رکعت پڑھ لی اور بقیہ رکعتیں غروبِ آفتاب کے بعد پڑھ کر نماز کو مکمل کرلیا، اس کی عصر فوت نہیں ہوئی۔ الفاظ یہ ہیں:

«مَنْ صَلَّى رَكْعَةً مِّنَ الْعَصْرِ قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ، وَصَلّٰى مَا بَقِيَ بَعْدَ غُرُوْبِ الشَّمْسِ لَمْ تَفُتْهُ صَلَاةُ الْعَصْرِ» [4]

"جس نے غروبِ آفتاب سے پہلے عصر کی ایک رکعت پڑھ لی اور باقی نماز (تین رکعتیں) غروبِ آفتاب کے بعد پڑھی (مکمّل کرلیں) تو اس کی نمازِ عصر فوت نہیں ہوئی۔"

نمازِ فجر کی طرح ہی جمہور ائمہ وفقہا کے نزدیک تو اس طرح نمازِ عصر صحیح و مکمل ہو جاتی ہے، حتیٰ کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک اگرچہ یہ ہے کہ نمازِ عصر کا آخری وقت سورج کے زرد پڑ جانے تک ہے، جب کہ ان کے نزدیک بھی ایسی نماز، جس کے دوران ہی سورج غروب ہو جائے، وہ نماز باطل نہیں ہوتی۔[5]

---

[1] شرح صحیح مسلم مع النووي (٣/ ٥/ ١٠٥)

[2] فتح الباري (٢/ ٥٦)

[3] صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (٥٤٤)

[4] مسند أحمد (٢/ ٢٥٤) بحواله المعجم الفهرس لا الفاظ الحدیث (٥/ ٢٠٥)

[5] شرح صحیح مسلم للنووي (٣/ ٥/ ١٠٦)

یاد رہے کہ ان احادیث میں جو ایک سجدہ پا لینے کا ذکر ہے، اس سے مراد ایک رکعت ہے، جیسا کہ ''المنتقی'' میں علامہ المجد ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے اور علامہ خطابی رحمہ اللہ نے ''معالم السنن'' میں لکھا ہے کہ سجدے سے مراد رکوع و سجود سمیت پوری رکعت ہے اور ایک رکعت مکمّل ہی دوسرے سجدے سے ہوتی ہے۔ لہٰذا رکعت کو سجدہ کہا گیا ہے۔[1]

یاد رہے کہ غروبِ آفتاب کے وقت نمازِ عصر ادا کرنا محض مجبوری کی شکل میں ہے، ورنہ امام نووی رحمہ اللہ نے اس بات پر اجماع نقل ہے کہ جان بوجھ کر اس وقت نماز موخر کرنا جائز نہیں ہے۔[2]

بلکہ بلا عذر و مجبوری نمازِ عصر کو غروبِ آفتاب کے قریب تک موخر کرنا منافق کی نماز شمار کیا گیا ہے، جیسا کہ صحیح مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، موطا امام مالک اور مسندِ احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

«تِلْكَ صَلَاةُ الْمُنَافِقِ يَجْلِسُ حَتّٰى إِذَا كَانَتِ الشَّمْسُ بَيْنَ قَرْنَيِ الشَّيْطَانِ قَامَ فَنَقَرَ أَرْبَعاً لَا يَذْكُرُ اللّٰهَ فِيْهَا إِلَّا قَلِيْلًا»[3]

''یہ منافق کی نماز ہے کہ بیٹھا رہے اور سورج کا انتظار کرتا رہے۔ یہاں تک کہ جب سورج شیطان کے دو سینگوں کے مابین (ڈوبنے کے قریب) ہوتا ہے تو وہ اٹھتا ہے اور چار ٹھونگے مار لیتا ہے اور کم ہی اللہ کا ذکر کرتا ہے۔''

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بلا عذر غروبِ آفتاب کے قریب تک نماز کو موخر کرنا مکروہ ہے اور ایسی نماز کو منافق کی نماز کہا گیا ہے، کیوں کہ وہ خشوع، خضوع اور سکون و اطمینان سے خالی نماز ادا کرے گا، جس میں مناسب ذکرِ الٰہی بھی نہیں کر پائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے آدمی کی مذمّت آئی ہے۔

نمازِ عصر کو جلدی ادا کرنا:

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ عصر بہت جلدی ادا فرمایا کرتے تھے۔

---

[1] فتح الباري (٢/ ٣٨) المنتقی (١/ ٢/ ٢٢)

[2] شرح صحيح مسلم للنووي (٣/ ٥/ ١٠٦) المنتقیٰ أيضاً (ص: ٣٠٨، ٢٢)

[3] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٧) و صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٩٧) صحيح مسلم (٥٣/ ٣/ ١٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٩) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٣٧) المغني (٢/ ١٦) المنتقی مع النيل (١/ ١/ ٣٠٧)

چنانچہ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كُنَّا نُصَلِّي مَعَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ الْعَصْرَ ثُمَّ تُنْحَرُ الْجَزُوْرُ فَتُقْسَمُ عَشْرَ قِسَمٍ ثُمَّ تُطْبَخُ فَنَأْكُلُ لَحْمًا نَضِيْجًا قَبْلَ مَغِيْبِ الشَّمْسِ»[1]

''ہم نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ نمازِ عصر پڑھتے، پھر اونٹ ذبح کرتے اور اس کے گوشت کو دس حصوں میں تقسیم کرتے، پھر ہم گوشت پکاتے اور کھاتے، جب کہ ابھی سورج غروب نہ ہوا ہوتا۔''

ایک دوسری حدیث صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں کہ ہمیں نبیِ اکرم ﷺ نے نمازِ عصر پڑھائی۔ تب آپ ﷺ کے پاس بنی سلمہ کا کوئی آدمی آیا اور کہنے لگا: اے اللہ کے رسول! ہم اونٹ ذبح کرنا چاہتے ہیں اور ہماری خواہش ہے کہ آپ ﷺ تشریف لائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ٹھیک ہے۔ چل دیے۔ ہم بھی آپ ﷺ کے ساتھ تھے۔ ہم نے دیکھا کہ ابھی اونٹ ذبح کیے گئے اور پھر (ہمارے پہنچنے پر) انھیں ذبح کیا گیا۔ انھیں کاٹا گیا، یعنی گوشت بنایا گیا، پھر ان کا گوشت پکایا گیا، پھر ہم نے وہ کھایا، جب کہ ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا۔[2]

ان دونوں حدیثوں میں مذکور ہے کہ عصر کے بعد اونٹ ذبح کیے، گوشت کو بنایا پکایا اور کھایا، جب کہ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ کتنی جلدی اوّل ہی وقت میں عصر ادا فرمایا کرتے تھے۔ نمازِ عصر جلدی ادا کرنے پر دلالت کرنے والی احادیث صحیح بھی ہیں اور صریح بھی۔ مثلاً صحیحین میں اور سنن ترمذی کے علاوہ سنن اربعہ میں بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُصَلِّي الْعَصْرَ، وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ حَيَّةٌ فَيَذْهَبُ الذَّاهِبُ إِلَى الْعَوَالِي فَيَأْتِيْهِمْ، وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ»[3]

''نبیِ اکرم ﷺ نمازِ عصر اس وقت ادا فرماتے، جب کہ سورج ابھی بلند خوب روشن) ہوتا

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٢٥) مختصر صحيح البخاري للألباني، رقم الحديث (١١٣٩) و المنتقى مع النيل (١/ ١/ ٣١٠) مشكاة المصابيح تحقيق الألباني، رقم الحديث (٦١٥)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٢٤) والمنتقى أيضاً (١/ ٣١٠)

[3] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٥٥٠) صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٥/ ١٢١) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩١) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٣٩٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٨٢) سنن الدارمي، رقم الحديث (١٢٠٨)

تھا اور جانے والا (عصر پڑھ کر) عوالی مدینہ کی طرف جاتا اور ان کے پاس پہنچ جاتا، جب کہ سورج ابھی بلند ہوتا تھا۔‘‘

بخاری شریف میں یہ الفاظ بھی ہیں:

’’وَبَعْضُ الْعَوَالِي مِنَ الْمَدِيْنَةِ عَلٰى أَرْبَعَةِ أَمْيَالٍ أَوْ نَحْوِهٖ‘‘[1]

’’بعض عوالی مدینہ طیبہ سے چار میل یا اس سے کم وبیش کے فاصلے پر تھیں۔

یاد رہے کہ عوالی مدینہ سے مراد وہ دیہات یا بستیاں ہیں، جو مدینے کے مضافات میں نجد کی جانب واقع تھیں، جن میں سے بعض سنن دارقطنی کی حدیث کے مطابق چھے میل پر اور مصنف عبدالرزاق کی ایک روایت کی رو سے دو میل پر تھیں، جب کہ قاضی عیاض، علامہ ابن عبدالبر اور امام ابن الاثیر رحمہم اللہ نے سب سے زیادہ مسافت والی بستی کو مدینے سے آٹھ میل کہا ہے۔[2] اس حدیث سے بھی بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ آپ ﷺ کتنی جلدی نمازِ عصر پڑھ لیا کرتے تھے۔

مختلف احادیث میں تطبیق:

پچھلے اوراق میں ایک حدیث ذکر کی گئی ہے، جس کی رُو سے غروبِ آفتاب کے قریب تک تاخیر کر کے ادا کی جانے والی نماز کو ’’منافق کی نماز‘‘ قرار دیا گیا ہے اور اس کے بعد چند اور احادیث بھی ذکر کی گئی ہیں، جن میں منقول ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ جلدی نمازِ عصر پڑھا کرتے تھے اور ان میں سے پہلے کی احادیث میں سے ایک میں نمازِ عصر کا آخری وقت کسی چیز کے سائے کا دو مثل ہو جانا مذکور ہوا ہے۔ ایک دوسری روایت میں سورج کے زرد ہو جانے تک اور تیسری روایت میں سورج کا ایک کونا ڈوبنے تک اور ایک چوتھی روایت میں غروبِ آفتاب سے پہلے پہلے کم از کم ایک رکعت پڑھ لینے تک ہے۔

ان متعدد روایات میں مذکور مختلف تین شکلوں کا امکان ہے:

1. پہلی یہ کہ بعض کو ناسخ اور بعض دیگر کو منسوخ مانا جائے، مگر یہ شکل صرف اس صورت میں اپنائی جا سکتی ہے، جب کہ مختلف احادیث میں مطابقت ممکن نہ ہو اور یہاں مطابقت ممکن ہے۔

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٢٨) المنتقى مع النيل (١/ ١/ ٣٠٩) صحيح مسلم (٣/ ٥/ ١٢١، ١٢٢)

[2] فتح الباري (٢/ ٢٨، ٢٩)

2 دوسری شکل یہ ہے کہ بعض احادیث کو راجح اور بعض دوسری احادیث کو مرجوح قرار دیا جائے، لیکن اس کی بھی یہاں ضرورت نہیں، بلکہ اس سے بھی اولیٰ یہ ہے کہ ان احادیث میں مطابقت پیدا کی جائے۔

3 اور یہ تیسری شکل ممکن بھی ہے، بلکہ اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں اور وہ یوں ہے کہ حدیث جبرائیل جس میں عصر کا وقت کسی چیز کا سایہ ایک مثل ہو جانے سے لے کر دو مثل ہو جانے تک بیان ہوا ہے، اس میں صرف ''وقتِ اختیار'' کا ذکر آیا ہے۔ اس حدیث میں ''وقتِ جواز'' اور ''وقتِ اضطرار'' یا مجبوری سب کا استیعاب نہیں کیا گیا، اس جمع و تطبیق کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں آخری وقت کی نماز کو منافق کی نماز کہا گیا ہے، جب کہ وہ معذور و مجبور نہ ہو، لیکن معذوری اور مجبوری والے کی نماز ایک رکعت پڑھ سکے تو گویا جو شخص معذور و مجبور ہو، اس کے لیے تو نمازِ عصر کا وقت اس حد تک ہے اور ایسا نہیں، اس کے لیے وقت صرف کسی چیز کے سائے کے دو مثل ہو جانے تک ہی ہے، جب کہ سورج ابھی سفید اور شفاف ہو اور اگر وہ بلا عذر ہی اسے سورج کے زرد ہونے تک یا اس سے بھی بعد تک موخر کر دے گا، تو پھر وہ منافق کی نماز ہو جائے گی۔[1]

اسی قسم کی مطابقت امام نووی رحمہ اللہ نے صحیح مسلم شریف کی شرح میں بھی ذکر کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے اصحاب کے نزدیک نمازِ عصر کے پانچ اوقات ہیں:

1 وقتِ فضیلت، جو نمازِ عصر کا اوّل وقت ہے۔

2 وقتِ اختیار، جو کسی چیز کا سایہ دوگنا ہو جانے تک ہے۔

3 وقتِ جواز بلا کراہت، جو سورج کے زرد پڑ جانے سے پہلے پہلے تک ہے۔

4 جواز مع الکراہۃ، جو سورج زرد پڑ جانے سے لے کر غروبِ آفتاب تک ہے۔

5 وقتِ عذر، یہ وقت اس شخص کے لیے ہے جو سفر یا بارش کے عذر کی بیان پر نمازِ ظہر و عصر کو جمع کر کے ادا کرنا چاہے۔ (جب کہ جمع تقدیم ہوگی کہ نمازِ عصر کو مقدم کر کے، یعنی اس کے وقت سے پہلے نمازِ ظہر کے ساتھ اسی کے وقت میں اسے ادا کیا جائے)۔

---

[1] نیل الأوطار (۱/ ۱/ ۳۰۶)

ان پانچوں اوقات میں نماز ادا ہو گی۔ اگر ان میں سے کوئی بھی نہ ہو، بلکہ سورج غروب ہو گیا ہوتو پھر وہ قضا ہوگی۔[1]

امام ابن قدامہ نے "المغني" میں لکھا ہے کہ جب کسی چیز کا سایہ دوگنا ہو جائے تو عصر کا وقتِ اختیار ختم ہوگیا اور صحیح تر روایت کی رو سے امام احمد رحمہ اللہ کا قول یہ نقل کیا ہے کہ ان کے نزدیک عصر کا آخری وقتِ اختیار سورج زرد ہونے تک ہے اور غروبِ آفتاب سے پہلے ایک رکعت پانا وقتِ اضطرار ہے۔[2]

نمازِ عصر کا اوّل وقت:

یہیں یہ بات بھی ذکر کر دیں کہ جمہور اہلِ علم کے نزدیک نمازِ عصر کا اوّل وقت کسی کے سائے کا ایک مثل ہو جانا ہے۔ امام احمد، امام مالک اور امام محمد رحمہم اللہ بھی ان میں شامل ہیں اور صحیح احادیث سے اسی مسلک اوّل کی تائید ہوتی ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک بھی ایک مثل والا ہی ہے۔ البتہ وہ ایک مثل سے تھوڑا زیادہ سایہ ہو جانے کا اوّل وقت کہتے ہیں۔ قاضی ابو یوسف جو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے معروف اور ارشد تلامذہ میں سے ہیں، ان کا مسلک بھی جمہور والا ہی ہے اور ایک روایت کے مطابق تو خود امام صاحب رحمہ اللہ کا بھی یہی مسلک ہے، لیکن مشہور روایت کی رو سے امام صاحب کا مسلک یہ ہے کہ عصر کا وقت اس وقت شروع ہوتا ہے، جب کسی چیز کا سایہ اس سے دوگنا ہو جائے۔[3]

اس قول کی تائید کسی حدیث سے نہیں ہوتی اور جو بعض روایات ملتی ہیں، وہ محدّثین کرام کے نزدیک ضعیف اور ناقابلِ حجت ہیں۔ چنانچہ سنن ترمذی میں امام صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ عصر کو موخر کر کے پڑھنے کے بارے میں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے ایک مرفوع حدیث مروی ہے، مگر وہ صحیح نہیں۔[4]

ترمذی شریف کی شرح میں علامہ مبارکپوری نے وضاحت کی ہے کہ حضرت رافع رضی اللہ عنہ والی وہ حدیث سنن دارقطنی و بیہقی میں مروی ہے، جس کے بارے میں انھوں نے امام دارقطنی، بیہقی اور بخاری رحمہ اللہ

---

[1] شرح صحیح مسلم للنووي (٣/ ٥/ ١١٠، ١١١)

[2] المغني (٢/ ١٥، ١٦)

[3] الكواكب الدري (١/ ١٩٠) بحواله فقه السنة اردو (١/ ١٠٨)

[4] سنن الترمذي مع التحفة (١/ ٤٩٤)

کی شدید جرح بھی نقل کی ہے، لہٰذا وہ قابلِ حجت نہ ہوئی۔[1]

امام محمد رحمہ اللہ نے موطا میں لکھا ہے کہ ہمارے نزدیک عصر کو موخر کر کے پڑھنا جلدی پڑھنے سے افضل ہے، جب کہ سورج ابھی سفید و شفاف ہو اور اس میں زردی داخل نہ ہوئی ہو۔ عام آثار میں یہی آیا ہے اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ صاحبِ ہدایہ وغیرہ نے اس تاخیر کے افضل ہونے کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ اس طرح نوافل زیادہ پڑھے جا سکتے ہیں۔

امام محمد رحمہ اللہ کے ان الفاظ اور اس وجہ پر تعاقب کرتے ہوئے علامہ عبد الحی حنفی لکھنوی رحمہ اللہ "التعليق الممجد علىٰ موطأ الإمام محمد رحمہ اللہ" میں لکھتے ہیں کہ صحاح ستہ اور دیگر کتبِ حدیث میں ایسی احادیث مروی ہیں، جو نمازِ عصر کو جلد ادا کرنے کی فضیلت پر دلالت کرتی ہیں اور یہ مذکورہ وجہ یا علّت صحیح نصوص کے مقابلے میں (ان کے خلاف) ہے۔

علامہ عینی حنفی رحمہ اللہ نے "البناية شرح الهداية" میں عصر کو تاخیر سے پڑھنے کی فضیلت پر چار روایات سے استدلال کیا ہے، جن میں سے ایک تو یہی ہے، جس کی طرف ابھی ہم نے اشارہ کیا ہے کہ وہ ضعیف ہے اور دوسری حدیث سنن ابو داود میں ہے، جس میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وہ مدینے میں آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم تاخیر سے نمازِ عصر پڑھتے تھے، جب کہ اس حدیث کے ایک راوی یزید کو التقریب، الخلاصہ اور میزان الاعتدال میں مجہول کہا گیا ہے، لہٰذا یہ حدیث ضعیف اور نا قابلِ استدلال ہے۔[2]

تیسری حدیث سنن ترمذی میں اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔[3] چوتھی حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ علامہ عبد الحی حنفی رحمہ اللہ نے "التعليق الممجد" میں ان دونوں یعنی تیسری اور چوتھی حدیث کو بھی تاخیرِ عصر کی افضلیت کی دلیل ہونے میں صریح قرار نہیں دیا اور صحیح و صریح احادیث میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز کو جلد پڑھنا ثابت ہے۔ ایسے ہی بعض دیگر روایات و آثار بھی ہیں، جو یا صحیح نہیں یا صریح نہیں۔ جس کی تفصیل "التعليق الممجد" یا "تحفة الأحوذي" (۱/ ٤٩٤، ٥٠٢) میں دیکھی جا سکتی ہے۔

---

[1] تحفة الأحوذي (۱/ ٤٩٥)

[2] دیکھیں: تحفة الأحوذي (۱/ ٤٩٥)

[3] سنن الترمذي مع التحفة (۱/ ٤٩٨)

وقتِ مغرب:

نمازِ فجر و ظہر اور عصر کے اوقات کے بارے میں تفصیل ذکر کی جا چکی ہے اور اب آیئے وقتِ مغرب بھی دیکھیں تو نمازِ مغرب کا اوّل وقت اور آخر وقت حدیثِ جبرائیل میں تو غروبِ آفتاب ہی ہے، کیوں کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی آمد پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں دن ایک ہی وقت پر نمازِ مغرب ادا کی تھی، جیسا کہ تفصیل گزر چکی ہے، لیکن جیسا کہ یہ بات بھی ذکر کی جا چکی ہے کہ اس حدیث میں صرف ''وقتِ اختیار'' کا بیان ہے۔ وقتِ جواز اور وقتِ اضطرار اس میں شامل نہیں، جس کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ صحیح مسلم، سنن ابو داود، نسائی اور مسندِ احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ پنج گانہ کے جو اوقات ذکر فرمائے ہیں، وہاں نمازِ مغرب کے بارے میں ارشادِ نبوی ہے:

«وَوَقْتُ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ مَا لَمْ يَغِبِ الشَّفَقُ»[1]

''نمازِ مغرب کا وقت اس وقت تک ہے، جب تک شفق غائب نہ ہو جائے۔''

ایسے ہی حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث صحیح مسلم، سنن ابی داود، نسائی، صحیح ابی عوانہ، سنن دارقطنی اور مسند احمد میں ہے۔ اس میں بھی نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کو دو دن کی نمازیں پڑھ کر بتائی تھیں اور ہر نماز کے دو یعنی اوّل و آخر وقت بتائے تھے۔ اس حدیث میں بھی نمازِ مغرب کے آخری وقت کے بارے میں وضاحت موجود ہے کہ دوسرے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے آخری وقت میں ادا فرمایا تھا۔ چنانچہ اس حدیث میں ہے:

«ثُمَّ أَخَّرَ الْمَغْرِبَ حَتَّىٰ كَانَ عِنْدَ سُقُوطِ الشَّفَقِ»[2]

'' پھر (دوسرے دن) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کو اتنا موخر کر دیا کہ شفق غائب ہونے کے قریب پڑھی۔''

---

[1] صحیح مسلم (۲/ ۵/ ۱۲) المشكاة مع المرعاة (۲/ ۱۷) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۸۳) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (۵۰۸)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (۲/ ۵/ ۱۱۶) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۸۱) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (۵۰۹)

شفق اس سُرخی کو کہتے ہیں، جو غروبِ آفتاب کے بعد کچھ وقت کے لیے آسمان پر باقی رہتی ہے۔ اس کے بارے میں ایک حدیث بھی ہے، جو سنن دار قطنی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«اَلشَّفَقُ الْحُمْرَةُ»[1] ''شفق سرخی ہے۔''

یہ حدیث امام بیہقی نے اپنی سنن میں بھی روایت کی ہے اور مرفوع کے بجائے اس کا موقوف ہونا صحیح قرار دیا ہے کہ یہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں، بلکہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

نیز امام بیہقی نے کہا ہے کہ حدیثِ ابن عباس عبادہ بن صامت، شداد بن اوس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے بھی (مرفوعاً) مروی ہے، مگر ان میں سے کوئی روایت بھی صحیح نہیں گویا یہ حدیث مرفوعاً ضعیف اور موقوفاً صحیح ہے۔

مذکورہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، امام عطاء، مجاہد، سعید بن جبیر، شافعی، ابن ابی لیلیٰ، ثوری، اسحاق بن راہویہ، زہری، ابو یوسف اور محمد رحمہم اللہ شفق سے سرخی ہی مراد لیتے ہیں۔

ائمہ لغت میں سے خلیل بن احمد اور فرّاء کا بھی یہی قول ہے اور ''القاموس المحیط'' میں علامہ فیروز آبادی نے بھی شفق کا معنیٰ صرف سرخی ہی لکھا ہے۔

امیر صنعانی نے ''سبل السلام'' میں لکھا ہے کہ شفق کے معنیٰ کی بحث لغوی ہے اور اس میں رجوع اہلِ لغت کی طرف ہی جائے گا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما اہلِ لغت تھے، لہٰذا ان کا کلام اگرچہ موقوف ہے، لیکن حجت ہے۔ علامہ عبید اللہ رحمانی نے ''المرعاۃ شرح المشکاۃ'' میں امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ سے بھی شفق کا معنیٰ سرخی ہی نقل کیا ہے۔ البتہ ''نیل الأوطار'' میں امام شوکانی نے امام احمد کا قول یوں نقل کیا ہے کہ امام احمد کے نزدیک شفق سے مراد صحراء میں سُرخی ہے اور آبادی میں سفیدی، جب کہ اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے شفق سے مراد سفیدی ہی کیا ہے، لیکن صحیح تر بات حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی کی ہے کہ شفق سے مراد سرخی ہے۔

اس حدیث کی استنادی حیثیت اور شفق کے معنیٰ کی تفصیل ''المغنی'' (۲/ ۷۲۵) ''نیل الأوطار'' (۱/ ۲/ ۹) ''المرعاۃ شرح المشکاۃ'' (۲/ ۱۷، ۱۸) ''سبل السلام شرح بلوغ المرام'' (۱/ ۱/ ۱۱۴، ۱۱۵) اور دیگر کتب میں دیکھی جاسکتی ہے۔ جب کہ ''ضعیف الجامع

[1] المنتقیٰ مع النیل (۱/ ۲/ ۹)

الصغیر‘‘ (۲/ ۳/ ۲۷۵) میں علامہ البانی نے اس حدیث کو مرفوعاً ضعیف قرار دیا ہے۔ ’’المرقاۃ شرح المشکاۃ‘‘ میں ملا علی قاری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ فتویٰ اسی پر ہے کہ شفق سے مراد سُرخی ہے۔

در مختار میں بھی سُرخی ہی لکھا گیا ہے اور ’’صدر الشریعۃ‘‘ نے بھی یہی فتویٰ دیا ہے۔ ’’المواھب‘‘ میں بھی اسی پر فتویٰ بتایا گیا ہے اور ’’البرھان‘‘ میں بھی سُرخی کو ترجیح دی گئی ہے اور ’’شروح المجمع‘‘ وغیرہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ خود امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے بھی اپنے پہلے قول یعنی سفیدی سے رجوع کر لیا تھا۔ گویا ان کے نزدیک بھی شفق سے مراد سرخی ہی ہے۔ یوں معاملہ طے ہوگیا کہ چاروں ائمہ مذاہب شفق سے مراد سُرخی ہونے پر متفق ہیں۔ الحمدللہ

نمازِ مغرب کا وقت غروبِ آفتاب سے شفق نمایاں ہونے تک ہے، لیکن یہ تاخیر عذر اور مجبوری والے کے لیے روا ہے، ورنہ اوّل وقت ہی میں نمازِ مغرب پڑھنا افضل ہے، کیوں کہ نبیِ اکرم ﷺ کا عمل مبارک یہی تھا کہ آپ ﷺ غروبِ آفتاب کے فوراً بعد روشنی ہی میں نمازِ مغرب پڑھ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری، مسلم، ابوعوانہ، سنن بیہقی، مسند احمد اور مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت رافع رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

« كُنَّا نُصَلِّي الْمَغْرِبَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَيَنْصَرِفُ أَحَدُنَا وَإِنَّهُ لَيَبْصِرُ مَوَاقِعَ نَبْلِهِ »[1]

’’ہم نبیِ اکرم ﷺ کے ساتھ اس وقت نمازِ مغرب پڑھتے کہ نماز پڑھ کر ہم میں سے کوئی نکلتا تو تیر پھینکنے پر وہ اپنے تیر کے گرنے کی جگہ دیکھ سکتا تھا، یعنی ابھی اتنی روشنی ہوتی تھی۔‘‘

صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، ترمذی اور ابن ماجہ میں حضرت سلمہ بن اکوع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

« إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يُصَلِّي الْمَغْرِبَ إِذَا غَرَبَتِ الشَّمْسُ، وَتَوَارَتْ بِالْحِجَابِ »[2]

’’نبیِ اکرم ﷺ مغرب کی نماز اس وقت پڑھا کرتے تھے، جب سورج غروب ہوتا اور اس کی ٹکیا چھپ جاتی۔‘‘

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (۲/ ٤٠) صحيح مسلم مع شرح النووي (۳/ ٥/ ١٣٦) الإرواء (١/ ٢٧٧)

[2] حواله جات بالا، صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٥٥٩) صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٥/ ١٣٦) المنتقى مع النيل (١/ ٢/ ٣)

امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں حدیثیں اس بات کی دلیل ہیں کہ غروبِ آفتاب کے بعد نمازِ مغرب کو جلد پڑھ لینا چاہیے، اس بات پر اجماع ہے اور جن احادیث میں شفق کے غائب ہونے پر نمازِ مغرب پڑھنے کا ذکر ہے، وہ بیان جواز کے لیے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ کسی سائل کے جواب میں تھیں اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مبارکہ کے بارے میں ہیں، جن پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسلسل قائم رہے، لہٰذا اُن پر اعتماد نہیں ہوگا۔[1]

اہلِ بیتِ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی احادیث میں سے ایک صحیح بخاری، مسلم، ابی عوانہ، سنن ابی داود اور دیگر کتب میں مذکور ہے، جس میں ۷۴ھ میں حجاج بن یوسف ثقفی کے امیر بن کر مدینہ آنے کے وقت کا واقعہ درج ہے۔ چنانچہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے پوتے حضرت محمد بن عمرو بن حسن بن علی رضی اللہ عنہم بیان کرتے ہیں کہ جب حجاج آیا تو ہم نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے نمازوں کے اوقات کے بارے میں پوچھا۔ صحیح مسلم میں حجاج کی موجودگی میں اس سوال کا سبب بھی لکھا ہے:

''كَانَ الْحَجَّاجُ يُؤَخِّرُ الصَّلَاةَ'' ''حجاج نماز میں تاخیر کیا کرتا تھا۔''

لہٰذا اسے تنبیہ کرنے کے لیے یہ سوال پوچھا گیا تو اس وقت حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز پنج گانہ کا جو وقت بتایا، اس میں نماز مغرب کے بارے میں فرمایا:

«كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّي الْمَغْرِبَ إِذَا غَرَبَتِ الشَّمْسُ»[2]

''نبیِ اکرم نمازِ مغرب اسی وقت پڑھ لیا کرتے تھے، جب سورج غروب ہوتا۔''

نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے سنن ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ اور مستدرک حاکم میں مروی ایک مرفوع حدیث ہے، جسے امام ترمذی نے موقوفاً صحیح کہا ہے اور بعض محدّثین نے اسے منکر بھی کہا ہے، لہٰذا یہ قابلِ استدلال نہ بھی مانی جائے تو کم از کم صحیحین اور سنن والی پہلی احادیث کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے، جس کے الفاظ ہیں:

«لَا تَزَالُ أُمَّتِي عَلَى الْفِطْرَةِ مَا لَمْ يُؤَخِّرُوا الْمَغْرِبَ حَتَّىٰ تَشْتَبِكَ النُّجُومُ»[3]

---

[1] شرح النووي (٣/ ٥/ ١٣٦)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٤١) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٤٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٧)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٨٩) نيل الأوطار (١/ ٢/ ٥٠٤)

''میری امّت اس وقت تک فطرتِ سلیمہ پر رہے گی، جب وہ ستاروں کی جھلمل جھلمل کرنے تک نمازِ مغرب کو موخر نہ کیا کریں گے۔''

بالکل اسی مفہوم بلکہ انہی الفاظ والی ایک حدیث سنن ابو داود، مسند احمد اور مستدرک حاکم میں بھی ہے، جو حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، اس کی سند میں محمد بن اسحاق ہیں، جنھوں نے تحدیث کی بھی صراحت کی ہے۔ فرق صرف اِتنا ہے کہ اس حدیث میں ہے:

«لَا تَزَالُ أُمَّتِيُ بِخَيُرٍ» أَوُ قَالَ: «عَلَى الُفِطُرَةِ»[1]

''میری امّت بہتری سے رہے گی، اور فطرتِ سلیمہ پر رہے گی۔''

اور پہلی میں ہے:

«لَا تَزَالُ أُمَّتِيُ عَلَى الُفِطُرَةِ» ''میری امت ہمیشہ فطرتِ سلیمہ پر رہے گی۔''

جب کہ اسی موضوع کی کئی اور احادیث بھی ہیں تو پھر اندازہ فرمائیں کہ اہلِ بیت رضی اللہ عنہم کی مرویات سے تو معلوم ہوتا ہے کہ غروبِ آفتاب کے فوراً بعد ستاروں کے جگمگانے سے پہلے نماز پڑھنا فطرتِ سلیمہ کا تقاضا ہے، مگر آج کچھ لوگ (حبِّ اہلِ بیت رضی اللہ عنہم سے سرشاری کے دعوے دار) اذانِ مغرب کے لیے ستارہ نظر آنے کے منتظر رہتے ہیں!!

وقتِ عشا:

فجر و ظہر اور عصر و مغرب کے اوقات ذکر کیے جا چکے ہیں۔ آیئے اب نمازِ عشا کے اوّل و آخر وقت کی تعیین بھی احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں کریں، چنانچہ حضرت جبرائیل علیہ السلام والی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں مذکور ہے کہ عشا کا وقت شفق کے غائب ہونے سے شروع ہوتا ہے اور ایک تہائی رات یا نصف شب تک رہتا ہے، چنانچہ اس حدیث میں پہلے دن کی نمازِ عشا کے بارے میں یہ الفاظ ہیں:

«فَصَلَّى الُعِشَاءَ حِيُنَ غَابَ الشَّفَقُ»

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشا کی نماز تب پڑھی، جب شفق (یعنی شام کی سُرخی) غائب ہوگئی۔

دوسرے دن کی نمازِ عشا کے بارے میں یہ الفاظ ہیں:

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٠٤)

«ثُمَّ جَاءَهُ الْعِشَاءَ حِيْنَ ذَهَبَ نِصْفُ اللَّيْلِ أَوْ قَالَ: ثُلُثُ اللَّيْلِ فَصَلَّى الْعِشَاءَ»

''پھر (دوسرے دن) حضرت جبرائیل علیہ السلام نمازِ عشا کے لیے اس وقت آئے، جب کہ آدھی رات یا فرمایا کہ ایک تہائی رات گزر چکی تھی۔ تب آپ ﷺ نے نمازِ عشا پڑھی۔''

اس حدیث کے علاوہ بعض دیگر احادیث میں نمازِ عشا کے آخری وقت کی صراحت آئی ہے۔ مثلاً صحیح بخاری و مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«أَخَّرَ النَّبِيُّ ﷺ صَلَاةَ الْعِشَاءِ إِلٰى نِصْفِ اللَّيْلِ ثُمَّ صَلّٰى»[1]

''نبی اکرم ﷺ نے نمازِ عشا کو نصف شب تک موخّر کر کے ادا فرمایا۔''

صحیح احادیث میں شطر اللیل، قریبٌ من نصف اللیل اور نصف اللیل الاوسط کے الفاظ ہیں۔ صحیح مسلم، سنن ابی داود، نسائی اور مسند احمد میں حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما والی حدیث میں بھی یہ صراحت ہے:

«فَإِذَا صَلَّيْتُمُ الْعِشَاءَ فَإِنَّهُ وَقْتٌ إِلٰى نِصْفِ اللَّيْلِ»[2]

''جب تم عشا کی نماز پڑھو تو اس کا وقت نصف رات تک ہے۔''

جب کہ صحیح مسلم، سنن ابی داود کے علاوہ سنن اربعہ، مسند احمد اور منتقی ابن الجارود میں حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں جو نبیِ اکرم ﷺ کی نمازِ پنج گانہ کے اوقات بیان ہوئے ہیں، ان میں نمازِ عشا کے بارے میں یہ الفاظ ہیں:

«وَصَلَّى الْعِشَاءَ بَعْدَ مَا ذَهَبَ ثُلُثُ اللَّيْلِ»[3]

''آپ ﷺ نے نمازِ عشا (دوسرے دن) ایک تہائی رات گزارنے کے بعد ادا فرمائی۔''

اور صحیح مسلم میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے:

«ثُمَّ أَخَّرَ الْعِشَاءَ حَتّٰى كَانَ ثُلُثُ اللَّيْلِ الْأَوَّلُ»[4]

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٥١) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٣٩، ١٤٠)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١١١، ١١٢، ١١٣) نیز دیکھیں: صحيح مسلم مع شرح النووي (٢/ ٥/ ١٠٩، ١١٣) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٠٨) مشكاة المصابيح (١/ ١٨٤) المنتقىٰ مع النيل (١/ ١/ ٣١٠)

[3] صحيح مسلم مع النووي (٣/ ٥/ ١١٤، ١١٥) مشكاة مع المرعاة (٢/ ٢٠)

[4] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١١٦)

آپ ﷺ نے (دوسرے دن) نمازِ عشا کو اتنا موخر کیا کہ رات کا ایک تہائی حصہ گزر گیا تو نماز پڑھی۔''

ان احادیث میں سے بعض میں نصف اور بعض میں ثلث کا ذکر ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں ان کے مابین تطبیق یوں دی ہے کہ ایک رات گزرنے کے بعد آپ ﷺ نے نمازِ عشا کا آغاز کیا اور آدھی رات پر جا کر ختم کی، لہٰذا دونوں طرح کی احادیث میں کوئی اختلاف نہ رہا، نیز ان کا کہنا ہے کہ صحیح تر قول کے مطابق امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک نمازِ عشا کا وقتِ اختیار نصف شب تک ہی رہتا ہے۔[1]

پھر حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ والی حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ نصف رات تک تو نمازِ عشا کا وقتِ اختیار رہے، جب کہ وقتِ جواز طلوعِ فجر ثانی (یا طلوعِ صبح صادق) تک رہتا ہے، کیوں کہ حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ''صحیح مسلم، باب من نسي صلاۃً أو نام'' کی حدیث میں نبیِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّہٗ لَیْسَ فِي النَّوْمِ تَفْرِیْطٌ، إِنَّمَا التَّفْرِیْطُ عَلٰی مَنْ لَّمْ یُصَلِّ الصَّلَاۃَ حَتّٰی یَجِیْءَ وَقْتُ الصَّلَاۃِ الْأُخْرٰی»[2]

نیند میں تقصیر اور گناہ نہیں ہے، گناہ یہ ہے کہ کوئی شخص اگلی نماز کا وقت ہو جانے تک کوئی نماز ہی ادا نہ کرے۔''

یہ الفاظ نبیِ اکرم ﷺ نے اس وقت فرمائے تھے، جب آپ ﷺ اور سارا لشکر نمازِ فجر سے سوئے رہ گئے تھے اور صبح سورج کی گرمی نے سب کو اُٹھایا تھا۔ یاد رہے کہ یہ حدیث سنن اربعہ اور مسند احمد میں بھی ہے، مگر اس میں اگلی نماز تک کسی نماز کو نہ پڑھنے کا ذکر نہیں ہے۔

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ والی حدیث کے الفاظ: «حَتّٰی یَجِیْءَ وَقْتُ الصَّلَاۃِ الْأُخْرٰی» کی رُو سے جمہور علما کا مسلک یہ ہے کہ فجر تک عشا کا وقت رہتا ہے، جب کہ بعض اہلِ علم و تحقیق نے کہا ہے کہ نصف شب گزرنے کے بعد نماز ادا نہیں، بلکہ قضا ہوگی۔[3]

فتح الباری شرح صحیح بخاری میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام نووی کی یہی بات نقل کی ہے اور

---

[1] شرح صحیح مسلم للنووي (۳/ ۵/ ۱۱۶، ۱۱۷)

[2] شرح صحیح مسلم (۳/ ۵/ ۱۱۱) المرعاۃ (۲/ ۴۵)

[3] دیکھیں: المشکاۃ مع المرعاۃ (۲/ ۲۲، ۴۵)

لکھا ہے کہ اس حدیث میں جو عموم ہے، وہ نمازِ فجر کے بارے میں اجماعِ امت سے مخصوص ہے، یعنی نمازِ فجر کا وقت صرف طلوعِ آفتاب تک رہتا ہے نہ کہ نمازِ ظہر تک۔ طلوعِ آفتاب کے بعد وہ قضا ہوگی اور جن حضرات نے کہا ہے کہ نمازِ عشا کا آخری وقت ادا نصف رات تک ہے، فجر تک نہیں، وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ عشا کی نماز نصف شب والی احادیث کی وجہ سے خاص ہے، لہٰذا اس کا وقت بھی نمازِ فجر تک نہیں رہتا، جیسا اصطخری نے کہا ہے۔[1]

محلّی میں علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے بھی ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس میں اس بات کی دلیل تو نہیں کہ عشا کا وقت نمازِ فجر تک رہتا ہے یا ہر نماز کا وقت اگلی نماز تک رہتا ہے، بلکہ تمام علماے امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ فجر کا وقت صرف طلوعِ آفتاب تک رہتا ہے، نہ کہ ظہر تک۔[2]

یہی معاملہ نمازِ عشا کا بھی ہے کہ نصف شب تک ہی اس کا وقت رہتا ہے۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے "نیل الأوطار" میں تو یہی موقف اختیار کیا ہے کہ عشا کا آخری وقت فجر تک ہے، یعنی وقتِ اختیار نصف شب تک اور وقتِ جواز و اضطرار فجر تک ہے۔[3] جب کہ "السیل الجرار" (۱/ ۱۸۳) بحوالہ "تمام المنۃ" (ص: ۱۴۲) میں امام شوکانی رحمہ اللہ نے، اسی طرح انھوں نے "الدرر البھّیۃ" میں رات کے نصف تک ہی عشا کا آخری وقت شمار کیا ہے۔ علامہ نواب صدیق حسن خان نے بھی "الروضۃ الندیۃ شرح الدرر البھیۃ" میں ان کی موافقت ہی ظاہر کی ہے، کیوں کہ انھوں نے ان کے مذکورہ الفاظ پر کوئی تعاقب نہیں کیا۔[4]

"بدایۃ المجتھد" (۱/ ۱۸۳) میں علامہ ابن رشد رحمہ اللہ نے امام مالک کا ایک قول یہی روایت کیا ہے، جو اصطخری (یکے از شافعیہ) ابن حزم، شوکانی، علامہ صدیق حسن خان والی بھوپال اور شیخ البانی کا اختیار ہے۔ ثلثُ اللیل، نصف اللیل، شطر اللیل اور قریب من نصف اللیل کے الفاظ والی احادیث جو حضرت جابر، انس، عبداللہ بن عمرو بن عاص، بریدہ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم سے

---

[1] فتح الباري (۲/ ۵۱، ۵۲) و انظر: المجموع (۳/ ۴۰)

[2] انظر المحلّی (۲/ ۳/ ۱۷۸، ۱۷۹)

[3] دیکھیں: نیل الأوطار (۱/ ۲/ ۱۱)

[4] دیکھیں: الروضۃ الندیۃ (۱/ ۷۰) طبع دار المعرفۃ، بیروت.

مروی ہیں اور ابھی ہم نے ذکر کی ہیں اور ان کے علاوہ بھی متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی احادیث اسی مفہوم کی کتبِ حدیث میں موجود ہیں،[1] ان سب سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگلی نماز تک پچھلی نماز کے وقت کی توسیع کے عموم کو یہ خاص کر دیتی ہیں اور عشا کا آخری وقت نصف شب تک طے کر دیتی ہے۔

علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ نے ترمذی شریف کی بے نظیر شرح ''تحفة الأحوذي'' میں فجر تک نمازِ عشا کا وقت ماننے والوں کے دلائل کا بھرپور جائزہ لیا ہے اور یہ فیصلہ دیا ہے کہ صحیح وصریح احادیث کی رُو سے عشا کا آخری وقت آدھی رات تک ہی ہے۔[2]

اس مسلک کی تائید موطا امام مالک، معانی الآثار طحاوی اور محلیٰ ابن حزم میں صحیح سند کے ساتھ مروی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس مکتوبِ گرامی سے بھی ہوتی ہے، جس میں انھوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا:

''وَأَنْ صَلِّ الْعِشَاءَ مَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ ثُلُثِ اللَّيْلِ، وَإِنْ أَخَّرْتَ فَإِلٰى شَطْرِ اللَّيْلِ وَإِلَّا تَكُنْ مِنَ الْغَافِلِيْنَ''[3]

''نمازِ عشا ایک تہائی رات تک پڑھ لیا کرو، اگر اس سے بھی تاخیر کرو تو آدھی رات تک پڑھ لیا کرو، وگرنہ تم غافلوں میں سے ہو جاؤ گے۔''

کتبِ حدیث میں مروی بعض احادیثِ نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اندازہ ہوتا ہے کہ نمازِ عشا کو موخر کرکے ادا کرنا چاہیے۔ لیکن اس کے اوّل و آخر وقت میں سے کون سا افضل ہے اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ مبارکہ کیا تھی؟ اب اس کا مختصر تذکرہ ملاحظہ فرمائیں۔

نمازِ عشا کا افضل وقت:

اوقاتِ نمازِ پنج گانہ کے سلسلے میں نمازِ عشا کے وقت کی تعیین بھی احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رو سے ذکر کی جا چکی ہے اور یہ بات بھی گزر چکی ہے کہ نمازِ عشا کا وقت غروبِ شفق سے شروع ہو جاتا ہے اور نصف شب تک رہتا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے:

[1] النيل (١/ ٢/ ١٠، ١٣)

[2] تحفة الأحوذي (١/ ٥٠٤، ٥٠٥)

[3] المحلّى (٢/ ٣/ ١٨٥) وصححه الألباني في تمام المنة (ص: ١٤٢) موطأ الإمام مالك مع تنوير الحوالك (١/ ٢٥) دار الكتب العلمية.

«كَانُوْا يُصَلُّوْنَ الْعَتَمَةَ فِيْمَا بَيْنَ أَنْ يَّغِيْبَ الشَّفَقُ إِلٰى ثُلُثِ اللَّيْلِ الْأَوَّلِ»[1]

''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم غروبِ شفق اور ایک تہائی رات گزرنے کے مابین نمازِ عشا ادا کیا کرتے تھے۔''

جب کہ بعض دیگر احادیث میں نصف اللیل کے الفاظ بھی ہیں۔ اب رہی یہ بات کہ نمازِ عشا کے اوّل و آخر اوقات میں سے افضل کون سا ہے تو اس سلسلے میں اہلِ علم کے دو قول ہیں:

اوّل وقت:

علما کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ نمازِ عشا کے اوّل و آخر اوقات میں سے بھی اوّل وقت ہی افضل ہے اور اس پر ان کا استدلال ان احادیث سے ہے، جن میں اول وقت میں نمازوں کو ادا کرنے کو افضل اعمال میں سے شمار کیا گیا ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم کی متفق علیہ حدیث میں، جو صحیح ابن حبان، ابن خزیمہ اور سنن بیہقی میں بھی مروی ہے، حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

''أَيُّ الْأَعْمَالِ أَفْضَلُ؟''، ''افضل عمل کون سا ہے؟''

تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«اَلصَّلَاةُ عَلٰى وَقْتِهَا»[2] ''نماز کو اس کے وقت پر ادا کرنا۔''

ایک جگہ ہے:

«اَلصَّلَاةُ فِيْ أَوَّلِ وَقْتِهَا»[3] ''نماز کو اس کے اوّل وقت میں ادا کرنا۔''

میں نے پوچھا: اس کے بعد؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«بِرُّ الْوَالِدَيْنِ» ''ماں باپ کی خدمت کرنا۔''

میں نے کہا: اس کے بعد؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] صحیح البخاري مع الفتح، رقم الحدیث (٢٦٩) المنتقی (١/ ٢/ ١١) فقه السنة (١/ ١٠٢)

[2] صحیح البخاري مع الفتح، رقم الحدیث (٥٢٧) مختصر صحیح مسلم للمنذري، رقم الحدیث (٢٢٦) موارد الظمآن، رقم الحدیث (٢٨٠)

[3] فتح الباري (٢/ ١٠)

«اَلْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ»[1] ''اللہ کی راہ میں جہاد کرنا۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں افضل اعمال میں سب سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان باللہ کو شمار کیا ہے۔ صاحبِ ''فتح الباری'' لکھتے ہیں کہ ان ہر دو میں سے کوئی تضاد تعارض نہیں، کیونکہ امام ابن دقیق العید کے بقول ابن مسعود رضی اللہ عنہ میں بدنی اعمال مذکور ہیں، جب کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ایمان باللہ کا ذکر ہے تو وہ قلبی اعمال میں سے ہے۔[2]

ایک حدیث سنن ابو داود، نسائی، موطا امام مالک اور صحیح ابن حبان میں مروی ہے، جس میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے:

« خَمْسُ صَلَوَاتٍ افْتَرَضَهُنَّ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ، مَنْ أَحْسَنَ وُضُوْئَهُنَّ وَصَلَّاهُنَّ لِوَقْتِهِنَّ وَأَتَمَّ رُكُوْعَهُنَّ وَسُجُوْدَهُنَّ وَخُشُوْعَهُنَّ كَانَ لَهٗ عَلَى اللّٰهِ عَهْدٌ أَنْ يَّغْفِرَ لَهٗ، وَمَنْ لَّمْ يَفْعَلْ فَلَيْسَ لَهٗ عَلَى اللّٰهِ عَهْدٌ إِنْ شَآءَ غَفَرَ لَهٗ وَإِنْ شَآءَ عَذَّبَهٗ»[3]

''اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں فرض کی ہیں، جس نے ان کے لیے اچھی طرح (مسنون طریقے سے) وضو کیا اور انھیں ان کے (اوقات اولیٰ) میں ادا کیا۔ ان کے رکوع وسجود اور خشوع وخضوع کا اہتمام کیا تو اس کے لیے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اسے بخش دے گا اور جس نے ایسا نہ کیا، اس کے لیے اللہ کا کوئی عہد نہیں، اگر وہ چاہے گا تو اسے بخش دے اور اگر چاہے گا تو اُسے عذاب دے گا۔''

اس مفہوم کی دیگر احادیث سے استدلال کرتے ہوئے نمازِ عشا کے بھی اوّل وقت میں ادا کرنے ہی کو افضل قرار دیا گیا ہے۔

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٩) صحيح ابن خزيمة (١/ ١٦٩) بتحقيق الأعظمي، صحيح ابن حبان، رقم الحديث (٢٨٠)

[2] فتح الباري (٢/ ٩)

[3] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٠) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٤٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠١) موارد الظمآن، رقم الحديث (٢٥٢) صحيح الجامع الصغير (٢/ ٣/ ١١٤) و صححه الألباني و ابن عبد البر و النووي كما في تحقيق المشكاة (١/ ١٨٠)

نمازِ عشا کے اوّل وقت کے افضل ہونے کی ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ آپ ﷺ نے ہمیشہ اوّل وقت میں نماز ادا فرمائی اور بعض اوقات میں آپ ﷺ نے جو عشا کو موخر کر کے ادا فرمایا، وہ کسی کام یا عذر اور بیانِ جواز کے لیے تھا۔ اگر تاخیر سے عشا کا ادا کرنا افضل ہوتا تو پھر آپ ﷺ اسی پر ہمیشگی فرماتے، چاہے اس میں مشقت بھی ہوتی۔

آخری وقت:

اہلِ علم کی دوسری جماعت کا کہنا ہے کہ باقی چاروں نمازوں کو تو ان کے اوّل اوقات میں ادا کرنا ہی افضل ہے، لیکن نمازِ عشا کو اس کے آخری وقت میں ادا کرنا زیادہ فضیلت کا باعث ہے۔ اس رائے والے علما اوّل وقت میں نمازوں کو ادا کرنے پر دلالت کرنے والی احادیث کا یہ جواب دیتے ہیں کہ ان میں مطلقاً نمازوں کو اوّل وقت میں ادا کرنے کا حکم ہے، جب کہ نمازِ عشا کو موخر کر کے ادا کرنے کی تو خود نبیِ اکرم ﷺ نے ترغیب دلائی ہے، جس کا ذکر متعدد احادیث میں وارد ہوا ہے، لہٰذا عمومی احادیث کی نمازِ عشا کے بارے میں ان احادیث سے تخصیص کی جائے گی۔ یعنی عشا کی تاخیر والی احادیث پر عمل کیا جائے گا۔

نبیِ اکرم ﷺ کی جو عادت مبارکہ تھی کہ آپ ﷺ نے نمازِ عشا اوّل وقت ہی میں ادا فرمائی، لہٰذا یہی افضل ہے تو اس بات کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ بات تب قابلِ قبول ہوتی، جب نبیِ اکرم ﷺ کا صرف عمل مبارک ہی ہوتا کہ آپ ﷺ نے اوّل وقت میں عشا ادا فرمائی اور اس سلسلے میں کوئی ارشاد نہ ہوتا، جب کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ نبیِ اکرم ﷺ کے متعدد ارشادات سے پتا چلتا ہے کہ آپ ﷺ نے آخری وقت میں نمازِ عشا ادا کرنے کو افضل قرار دیا ہے۔ اوّل وقت میں ادا کرنا صرف اس بنا پر فرمایا کرتے تھے کہ آپ ﷺ امت کو مشقت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے تھے، جیسا کہ بعض احادیث میں واضح طور پر اس بات کا ذکر بھی آیا ہے۔[1]

اور آخری وقت میں نمازِ عشا ادا کرنے کو افضل قرار دینے والے علما کا استدلال جن احادیث سے ہے، ان میں سے ایک تو صحیح مسلم، سنن نسائی اور مسند احمد میں مروی ہے، جس میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

[1] شرح صحيح مسلم للنووي (٣/ ٥/ ١٣٨) دار إحياء التراث، نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٠)

«كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يُؤَخِّرُوا الْعِشَآءَ الْآخِرَةَ»[1]

''نبیِ اکرم ﷺ نمازِ عشا کو موخر کر کے ادا کیا کرتے تھے۔''

دوسری حدیث سنن ترمذی و ابن ماجہ اور مسند احمد میں مروی ہے، جس میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

«لَوْلَا أَنْ أَشُقَّ عَلٰى أُمَّتِي لَأَمَرْتُهُمْ أَنْ يُّؤَخِّرُوا الْعِشَاءَ إِلٰى ثُلُثِ اللَّيْلِ أَوْ نِصْفِهٖ»[2]

''اگر میں اس بات کو اپنی امت کے لیے باعثِ مشقت نہ سمجھتا تو انھیں حکم دے دیتا کہ نمازِ عشا کو ایک تہائی یا نصف رات گزرنے تک موخر کیا کرو۔''

اس مفہوم کی تیسری حدیث صحیح مسلم اور سنن نسائی میں مروی ہے، جس میں اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں:

«أَعْتَمَ النَّبِيُّ ﷺ ذَاتَ لَيْلَةٍ حَتّٰى ذَهَبَ عَامَّةُ اللَّيْلِ، وَحَتّٰى نَامَ أَهْلُ الْمَسْجِدِ، ثُمَّ خَرَجَ فَصَلّٰى، فَقَالَ: إِنَّهٗ لَوَقْتُهَا لَوْلَا أَنْ أَشُقَّ عَلٰى أُمَّتِي»[3]

''ایک رات نبیِ اکرم ﷺ نے نمازِ عشا کو اتنا موخر کیا کہ کافی رات گزر گئی، حتیٰ کہ اہلِ مسجد سو گئے۔ پھر آپ ﷺ تشریف لائے، نمازِ عشا پڑھی اور فرمایا: اگر میں افرادِ امت کے لیے اس امر کو باعثِ مشقت نہ سمجھتا تو نمازِ عشا کا وقت تو یہی ہے۔''

اس حدیث کے الفاظ: «حَتّٰى ذَهَبَ عَامَّةُ اللَّيْلِ» کی شرح بیان کرتے ہوئے شرح مسلم میں امام نووی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس تاخیر سے، جو ان احادیث میں مذکور ہے، ایسی تاخیر بھی مراد نہیں، جو وقتِ اختیار یعنی تہائی یا نصف رات سے بھی آگے گزر جائے۔ بلکہ عامۃ اللّیل سے مراد اس کا کثیر حصہ گزر جانا ہے نہ کہ اکثر حصہ گزرنا اور اس تاویل کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں، کیوں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے «إِنَّهٗ لَوَقْتُهَا» فرمایا ہے کہ یہ اس کا وقت ہے، جس سے اس نصف شب کے بعد کا حصہ ہرگز مراد نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ علما میں سے آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ نصف رات کے بعد

[1] صحيح مسلم مع النووي (٣/ ٥/ ١٤٢) صحيح سنن النسائي (١/ ١١٧) المنتقى (١/ ٢/ ١١)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٩١) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤١) مسند أحمد (٢/ ٢٥٠، ٤٣٣) المنتقى (١/ ١/ ١١)

[3] مختصر صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٤) المنتقى مع النيل (١/ ٢/ ١٢) صحيح سنن النسائي (١/ ١١٨)

نمازِ عشا پڑھنا افضل ہے، لہٰذا عامۃ اللّیل سے رات کا کافی حصہ گزرنا مراد ہے اور وہ بھی نصف سے زیادہ نہیں، بلکہ اس کے اندر اندر ہے۔[1]

اسی موضوع کی چوتھی حدیث صحیح بخاری و مسلم، سنن ابی داود اور نسائی میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ پانچوں نمازوں کے اوقات نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نمازوں کے حوالے سے بیان فرماتے ہیں، اس حدیث میں ہے:

«وَ الْعِشَاءَ أَحْيَاناً يُؤَخِّرُهَا وَأَحْيَانًا يُعَجِّلُ إِذَا رَآهُمُ اجْتَمَعُوْا عَجَّلَ، وَإِذَا رَآهُمْ أَبْطَؤُوْا أَخَّرَ»[2]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نمازِ عشا کو کبھی تو موخر کر کے پڑھتے اور کبھی جلدی ادا فرماتے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتے کہ لوگ اکٹھے ہوگئے ہیں تو جلدی نماز پڑھا دیتے اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھتے کہ لوگ لیٹ ہو رہے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز ہی لیٹ کر لیتے تھے۔''

صحیح بخاری و مسلم کی ایک متفق علیہ پانچویں حدیث حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

«اَخَّرَ النبيُّ صلی اللہ علیہ وسلم صَلَاةَ الْعِشَاءِ إِلٰى نِصْفِ اللَّيْلِ، ثُمَّ صَلّٰى، ثُمَّ قَالَ: قَدْ صَلَّى النَّاسُ وَنَامُوْا، أَمَا إِنَّكُمْ فِيْ صَلَاةٍ مَا انْتَظَرْتُمُوْهَا»[3]

''نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ عشا کو نصف شب تک موخر کیا اور پھر پڑھا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دوسرے لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے اور وہ سو بھی چکے ہیں۔ تم لوگ جب تک انتظار میں ہو گویا نماز ہی ادا کر رہے ہو۔''

چھٹی حدیث سنن ابی داود، نسائی، صحیح ابن ماجہ، ابن خزیمہ اور مسند احمد میں مروی ہے، جس میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

«اِنْتَظَرْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم لَيْلَةً بِصَلَاةِ الْعِشَآءِ، حَتّٰى ذَهَبَ نَحْوًا مِّنْ شَطْرِ اللَّيْلِ»

---

[1] شرح صحيح مسلم للنووي (٣/ ٥/ ١٣٨) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٢)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٤١) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٤٤) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٤) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥١٣)

[3] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٥٨٢) و صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٣٩، ١٤٠)

''ہم نے ایک رات نبیِ اکرم ﷺ کا نمازِ عشا کے لیے انتظار کیا، حتیٰ کہ تقریباً آدھی رات گزر گئی۔''

آگے فرماتے ہیں:

«فَجَآءَ فَصَلّٰی بِنَا» ''پھر آپ ﷺ تشریف لائے اور نماز پڑھائی۔''

پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

«خُذُوا مَقَاعِدَكُمْ فَإِنَّ النَّاسَ قَدْ أَخَذُوا مَضَاجِعَهُمْ وَإِنَّكُمْ لَمْ تَزَالُوا فِي صَلَاةٍ مُنْذُ انْتَظَرْتُمُوهَا، وَلَوْ لَا ضُعْفُ الضَّعِيفِ وَسُقْمُ السَّقِيمِ وَحَاجَةُ ذِي الْحَاجَةِ الْأَخَّرْتُ هٰذِهِ الصَّلَاةَ إِلٰى شَطْرِ اللَّيْلِ»[1]

''(صفوں میں) اپنی اپنی جگہ پکڑو اور دوسرے لوگ اپنے بستروں میں دراز ہو چکے ہیں اور تم مسلسل اس وقت سے نماز کی حالت میں شمار کیے جا رہے ہو، جب سے تم اس کا انتظار کر رہے ہو۔ اگر مجھے بیمار کی بیماری، کمزور کی کمزوری اور حاجت مند کی حاجت کا پاس نہ ہوتا تو میں نمازِ عشا کو آدھی رات تک موخر کر کے پڑھا کرتا۔''

اسی موضوع کی بعض دیگر احادیث بھی ہیں، جن میں سے ساتویں حدیث صحیح بخاری اور مسلم، اسی طرح سنن نسائی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتی ہیں:

«اَعْتَمَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ لَيْلَةً بِالْعَتَمَةِ فَنَادَاهُ عُمَرُ رضی اللہ عنہ: نَامَ النِّسَاءُ وَالصِّبْيَانُ»

''نبیِ اکرم ﷺ نے ایک رات نمازِ عشا کو بہت موخر کیا تب حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو آواز دیتے ہوئے فرمایا کہ عورتیں اور بچے سو گئے ہیں۔''

آپ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا:

«مَا يَنْتَظِرُهَا غَيْرُكُمْ»[2] ''تمھارے سوا کوئی اس نماز کا انتظار نہیں کر رہا ہے۔''

جب کہ آٹھویں حدیث صحیح بخاری و مسلم اور سنن نسائی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی

---

[1] صحيح سنن النسائي (١/ ١١٨) و صحيح سنن أبي داود (٤٠٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٩٣) المنتقى (١/ ١٢/ ١٣) و صححه الشوكاني في النيل.

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٤٧) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٣٧) سنن النسائي (١/ ١١٨) المنتقى (١/ ٢/ ١٠)

ہے، جس میں وہ بیان فرماتے ہیں کہ ہم ایک رات نبیِ اکرم ﷺ کی نمازِ عشا کے لیے انتظار کر رہے تھے۔ آپ ﷺ ایک تہائی یا اس سے بھی زیادہ رات گزر جانے کے بعد تشریف لائے اور آتے ہی فرمایا:

«إِنَّكُمْ تَنْتَظِرُوْنَ الصَّلَاةَ مَا يَنْتَظِرُهَا أَهْلُ دِيْنٍ غَيْرَكُمْ وَلَوْلَا أَنْ يَّثْقُلَ عَلٰى أُمَّتِيْ لَصَلَّيْتُ بِهِمْ هٰذِهِ السَّاعَةَ»[1]

''تم اس نماز کا انتظار کر رہے ہو، کہ جس کا انتظار دوسرے کسی بھی دین کا کوئی پیروکار نہیں کر رہا۔ اگر میں اپنی امت کے لیے اسے بوجھل نہ سمجھتا، تو انھیں ہمیشہ اسی وقت ہی پڑھایا کرتا۔'' اس ارشاد کے بعد آپ ﷺ نے موذن سے اقامت کہلوائی اور نماز ادا کی۔

جب کہ نویں حدیث سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی، بیہقی اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی ہے:

«لَوْلَا أَنْ أَشُقَّ عَلٰى أُمَّتِيْ لَأَمَرْتُهُمْ بِتَأْخِيْرِ الْعِشَاءِ وَبِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ وُضُوْءٍ»[2]

''اگر میں اپنی امّت کے لیے اسے باعثِ مشقّت نہ سمجھتا تو انھیں حکم دیتا کہ وہ عشا کو موخر کر کے پڑھا کریں اور ہر وضو کے وقت مسواک کیا کریں۔''

جب کہ بخاری شریف میں تعلیقاً اور مسند احمد میں مرفوعاً «عِنْدَ كُلِّ وُضُوْءٍ» اور «مَعَ كُلِّ وُضُوْءٍ» کے الفاظ بھی ہیں کہ ہر وضو کے ساتھ مسواک کرنے کا حکم دیتا۔

ایک دسویں حدیث صحیح بخاری و مسلم اور سنن نسائی میں حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں:

«أَخَّرَ النَّبِيُّ ﷺ الْعِشَاءَ ذَاتَ لَيْلَةٍ حَتّٰى ذَهَبَ مِنَ اللَّيْلِ... الصَّلَاةَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَدْ نَامَ النِّسَاءُ وَالصِّبْيَانُ»[3]

''نبیِ اکرم ﷺ نے ایک رات نمازِ عشا کو اتنا موخر کر دیا کہ رات کا کافی حصہ گزر گیا تو

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٥٧٠) صحيح مسلم مع النووي (٣/ ٥/ ١٣٩) و صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٥) صحيح سنن النسائي (١/ ١١٨)

[2] سنن النسائي (١/ ١١٧) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٩٠، ٦٩١) إرواء الغليل (١/ ١٠٨ تا ١١١)

[3] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٥٧١) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٤١)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے اللہ کے رسول! نماز کے لیے تشریف لائیں، اب تو عورتیں اور بچے سو گئے ہیں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سرِ اقدس سے پانی ٹپک رہا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے:

«إِنَّهُ الْوَقْتُ لَوْلَا أَنْ أَشُقَّ عَلٰى أُمَّتِيْ»

''اگر میں اپنی امت کے لیے اسے باعثِ مشقت نہ سمجھوں تو عشا کا یہی وقت ہے۔''

دوسری روایت میں ہے:

«لَوْ لَا أَنْ أَشُقَّ عَلٰى أُمَّتِيْ لَأَمَرْتُهُمْ أَنْ لَّا يُصَلُّوْهَا إِلَّا هٰكَذَا»[1]

''اگر یہ افرادِ امت کے لیے باعث مشقتِ نہ ہوتا تو میں انھیں حکم دے دیتا کہ وہ نمازِ عشا کو صرف اسی طرح ہی ادا کیا کریں۔''

اسی مفہوم کی گیارھویں حدیث سنن ابو داود، ترمذی، بیہقی، معانی الآثار اور مسند احمد میں حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جسے امام ترمذی نے حسن صحیح قرار دیا ہے۔ بارھویں حدیث حضرت علی رضی اللہ عنہ سے، تیرھویں حدیث مستدرک حاکم، مسند احمد اور سنن کبریٰ بیہقی میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جسے علامہ احمد شاکر نے صحیح قرار دیا ہے، ایسے ہی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے معانی الآثار طحاوی میں، حضرت زینب بنت حبیش رضی اللہ عنہا سے مسند احمد میں، حضرت عبداللہ بن حنظلہ بن ابی عامر رضی اللہ عنہ سے سنن ابو داود اور مستدرکِ حاکم میں اور ایک صحابی سے مسند احمد و معانی الآثار میں، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے سنن ابو داود میں اور حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ سے زوائدِ مسند احمد میں بھی اسی معنیٰ و مفہوم کی حدیث مروی ہے۔[2]

یہ تقریباً انیس حدیثیں ہیں اور بیسوں حدیث صحیحین و سنن اربعہ میں مروی ہے، جس میں حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

---

[1] صحیح البخاري مع الفتح، رقم الحدیث (٥٧١) صحیح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٤١) صحیح سنن النسائي (١/ ١١٧)

[2] دیکھیں: نصب الرایة (١/ ٤٦، ٢٤٨) التلخیص الحبیر (١/ ١/ ١٧٦) نیل الأوطار (١/ ٢/ ١٠) الإرواء (١/ ١٠٨، ١١١)

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَسْتَحِبُّ أَنْ يُؤَخِّرَ الْعِشَاءَ الَّتِي يَدْعُوْنَهُ الْعَتَمَةَ، وَكَانَ يَكْرَهُ النَّوْمَ قَبْلَهَا وَالْحَدِيْثَ بَعْدَهَا»[1]

''نبیِ اکرم ﷺ نمازِ عشا جسے لوگ عتمہ بھی کہتے تھے، اسے موخر کر کے ادا فرمانا مستحب سمجھتے تھے اور آپ ﷺ عشا سے پہلے سونے کو اور عشا کے بعد باتیں کرنے کو مکروہ سمجھتے تھے۔''

اس حدیث میں نمازِ عشا کے بعد فضول گوئی، قصہ خوانی اور فالتو باتوں کی ممانعت بھی آ گئی ہے۔ اس موضوع کی قدرے تفصیل بھی ہم بعد میں ذکر کریں گے، لیکن سرِدست اس حدیث کا پہلا جز ہی ہمارا محلِ شاہد ہے، لہٰذا بیس تک پہنچنے والی ان تمام احادیث کی بنا پر اہلِ علم کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ نمازِ عشا کو موخر کر کے ادا کرنا افضل ہے اور نبیِ اکرم ﷺ کی اکثر عادتِ مبارکہ اول وقت میں نمازِ عشا ادا کرنے کو مشقت کے خیال پر محمول کیا جائے گا۔

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رکھیں کہ نمازِ عشا کا موخر کرنا ہی افضل مان لیا جائے، تب بھی اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں لیا جا سکتا کہ کوئی شخص نمازِ باجماعت کو محض اس بنا پر نہ چھوڑ دیا کرے کہ میں نماز کو مؤخر کر کے ادا کروں گا، کیوں کہ اس طرح وہ ایک فضیلت کو حاصل کرنے کی فکر میں جماعت میں حاضری کے وجوب کا تارک اور بہت بڑے ثواب سے محروم ہو جائے گا۔

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٥٤٧) و صحيح مسلم مع النووي (٣/ ٥/ ١٣٥) و صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥١٦) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٥) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٠١) المنتقى (١/ ٢/ ١٣) نصب الراية (١/ ٢٤٨)

طویل الاوقات علاقوں میں نماز

ان مقامات پر جہاں بعض نمازوں کا وقت ہی ملتا ہو، مثلاً آفتاب کے طلوع وغروب کے درمیان نصف گھنٹے کا فاصلہ رہتا ہو یا چھے ماہ مسلسل دن اور چھے ماہ مسلسل رات رہتی ہو۔ وہاں ان نمازوں کا کیا حکم ہوگا، جن کا وقت ہی نہیں آیا؟ (جیسے قطبین یا ان کے قریبی علاقے ہیں) اس سوال کا جواب مولانا سیف اللہ رحمانی (فاضل دیوبند) نے اپنی کتاب ''جدید فقہی مسائل'' میں یوں دیا ہے:

اس سلسلے میں فقہاے احناف کی آرا مختلف ہیں۔ یہ اختلاف دراصل اس پر مبنی ہے کہ نماز کے لیے وقت کی کیا حیثیت ہے؟

ایک جماعت کے نزدیک اس کی حیثیت شرط کی ہے اور شرط ہی مفقود ہو تو ظاہر ہے کہ وہ چیز واجب ہی نہیں ہوگی۔ اس لیے وہ ایسے مقامات پر ان نمازوں کو ضروری ہی قرار نہیں دیتے جن کا وقت ہی نہیں آیا۔

دوسری رائے یہ ہے کہ وقت شرط نہیں ''علامت'' ہے اور ایک علامت کے نہ پائے جانے سے ضروری نہیں کہ وہ حکم ہی باقی نہ رہے۔ ایک علامت کی جگہ دوسری علامت لے سکتی ہے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ چاہے وقت نہ پایا جائے، نماز پھر بھی واجب ہوگی اور اندازے سے وقت متعین کر کے نماز ادا کی جائیں گی۔ (فتح القدیر شرح ھدایة)

حدیثِ اوّل:

قرآن و حدیث میں عام طور پر نماز کے ساتھ جس طرح وقت کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے وقت کی ان دونوں صورتوں میں کوئی ایک حیثیت غیر مبہم اور دوٹوک طور پر سامنے نہیں آتی، مگر دو باتیں ایسی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وقت کو علامت ہی کی حیثیت دینی چاہیے۔ ان میں سے ایک یہ کہ نماز کی پانچ وقتوں کی فرضیّت بلاتخصیص تمام مسلمانوں کے لیے ہے۔ یہ عموم اسی وقت برقرار رہ سکتا

ہے، جب ایسے مقامات پر اندازے سے پانچوں نمازیں ادا کی جائیں۔

دوسری بات یہ کہ حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ کی وہ روایت، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کے ظہور کے وقت ایسے دن کی پیشین گوئی کی ہے، جو ایک سال کے برابر ہوگا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ اس میں ایک ہی دن کی نمازیں کافی ہو جائیں گی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''نہیں بلکہ اندازے سے نمازیں ادا کرو گے۔''

اس حدیث کے الفاظ یوں ہیں:

«قُلْنَا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ! فَذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَسَنَةٍ أَتَكْفِيْنَا فِيْهِ صَلَاةُ يَوْمٍ؟ قَالَ: لَا، أُقْدُرُوْا لَهٗ قَدْرَهٗ»[1]

''ہم نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اس دن جو ایک سال کے مساوی ہوگا، کیا ایک دن کی نماز کافی ہو جائے گی؟ آپ نے فرمایا: نہیں، بلکہ اس دن نماز کے لیے اندازے سے کام لو۔''

آگے موصوف لکھتے ہیں:

''اس حدیث نے گویا اس مسئلے کو دوٹوک حل کر دیا ہے۔''

راقم الحروف کی رائے بھی یہی ہے کہ ایسے مقامات پر نمازیں اندازے سے ادا کی جائیں گی اور ہر چوبیس گھنٹے کو شب و روز تصور کر کے اوقاتِ نماز کے درمیان جو فاصلہ ہے، اس کا تناسب ملحوظ رکھتے ہوئے نمازیں پڑھی جائیں گی۔[2]

شرح مسلم نووی میں اندازے سے کام لینے کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فجر پڑھیں اور جب طلوعِ فجر اور ظہر کے درمیانی وقت کا عرصہ گزر گیا تو ظہر پڑھیں اور جب ظہر و عصر کے درمیانی وقت کے مطابق عرصہ گزر گیا تو عصر پڑھیں۔ پھر عصر و مغرب کے درمیانی وقت کا عرصہ گزر گیا تو مغرب پڑھیں اور اسی طرح ہی عشا، پھر فجر، پھر ظہر، پھر عصر، پھر مغرب اور نمازوں کا یہ سلسلہ اسی طرح اندازے سے چلتا رہے گا، یہاں تک کہ وہ دن ختم نہ ہو جائے۔[3]

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٩/ ١٨/ ٦٥، ٦٦) صحيح سنن الترمذي للألباني (٢/ ٢٤٩) طبع مكتبه التربية لدولة الخليج۔ الرياض.

[2] جدید فقہی مسائل (ص: ۴۰، ۴۱)

[3] شرح صحيح مسلم للنووي (٩/ ١٨/ ١٦٦، ١٥٦)

طویل الاوقات علاقوں (قطبین) میں نماز اور روزے کے اوقات سے متعلق بعض اہم اداروں کے فیصلے:

اس سلسلے میں ندوہ بروکسل ہیئت کبار العلماء، سعودیہ اور فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ، جیسے اہم اداروں کی طرف سے بعض قرار دادیں اور فیصلے بھی صادر ہوئے ہیں، جنھیں ہم رابطہ عالمِ اسلامی کی طرف سے شائع کی گئی کتاب ''قرارات المجمع الفقهي الإسلامي'' بلکہ ''الدورة الخامسة'' (ص: ۸۹، ۹۱) [۸/ ۱۶ ربیع الآخر ۱۴۰۲ھ] سے نقل کر رہے ہیں۔ مذکورہ کتاب میں انتہائی درجے کے خطوط عرض بلد (قطبین) پر واقع (طویل الاوقات) علاقوں میں نماز روزے کے اوقات سے متعلقہ قرارداد نمبر (۳) میں حمد وثنائے باری تعالیٰ اور صلوٰۃ وسلام بر نبی خیر الانام ﷺ کے بعد لکھا ہے:

''اسلامی فقہ اکیڈمی کے تیسرے اجلاس منعقدہ بروز جمعرات بہ تاریخ ۱۰/۴/۱۴۰۲ھ بہ مطابق ۴/۲/۱۹۸۲ء میں ندوہ بروکسل ۱۴۰۰ھ = ۱۹۸۰ء کی قرارداد اور سعودی عرب کے ادارے ''ہئیت کبار علماء'' کی قرار داد نمبر ۶۱ بہ تاریخ ۱۲/ ۴/ ۱۳۹۶ھ پر شرکائے مجلس کو مدعو کیا گیا کہ جن کا تعلق ان علاقوں میں نماز روزے کے اوقات سے ہے، جن میں سال کے کچھ موسموں میں رات بہت ہی زیادہ چھوٹی ہوتی ہے اور بعض موسموں میں دن بہت ہی زیادہ چھوٹا ہوتا ہے، یا پھر جہاں چھے ماہ سورج (دن) اور چھے ماہ غروبِ آفتاب کی کیفیت (رات) رہتی ہے۔

اس موضوع کے بارے میں قدیم و جدید فقہا نے جو لکھا ہے، اس کا جائزہ لینے کے بعد درج ذیل قرارداد پاس ہوئی۔

وہ علاقے (یا سمتیں) جو عالی درجات (انتہائی بلند درجے کے) خطوط عرض بلد (قطبین) پر واقع ہیں ہیں، انھیں تین حصوں (یا قسموں) میں تقسیم کیا جائے گا:

1 وہ علاقے (یا سمتیں) جن میں موسموں کے اختلاف کے باوجود چوبیس گھنٹے کے برابر دن ہوتا ہے اور چوبیس گھنٹوں کے برابر ہی رات ہوتی ہے (یعنی چوبیس گھنٹے دن اور چوبیس چوبیس گھنٹے رات) یا اس سے بھی زیادہ مدت کے دن اور رات ہوتے ہیں (یعنی کم و بیش چھے ماہ دن اور چھے ماہ رات) دن اور رات کی اس کیفیت میں ان علاقوں (یا جہتوں)

میں نماز اور روزے وغیرہ کے اوقات کا اندازہ ان جہات (یا علاقوں) کے اعتبار سے لگایا جائے گا، جو ان کے سب سے زیادہ قریب ہوں گے اور ان میں دن اور رات (دونوں) کی تمیز چوبیس گھنٹے کے اعتبار سے ہوتی ہو۔ (یعنی ان علاقوں یا جہات میں ہر چوبیس چوبیس گھنٹوں کو ایک شب و روز تصور کر کے اندازہ لگا کر اور اوقاتِ نماز کے درمیان جو فصل ہے، اس کا تناسب ملحوظ رکھتے ہوئے پانچ نمازیں ادا کی جائیں گی)

2 دوسرے وہ علاقے جہاں شفقِ غروب (شام کی سرخی) غائب ہی نہیں ہوتی کہ شفقِ فجر (صبح کا سفیدہ یا سرخی) طلوع ہو جاتی ہے اور ان علاقوں میں شفقِ غروب اور شفقِ شروق میں کوئی فرق بھی نہیں کیا جا سکتا۔ (یعنی پتا نہیں چلتا کہ کون سی شفق غروب ہے اور کون سی شفق شروق)۔ (جو علاقے ان جہات پر واقع ہوں) ان علاقوں میں نمازِ عشا، سحری کے آخری وقت اور نمازِ فجر کے اوقات کا اندازہ لگایا جائے گا۔ (یعنی ان کے اوقات کا کام اندازے سے لیا جائے گا) اور یہ اندازہ بھی اس آخری وقت کے اعتبار سے ہوگا، جس میں دونوں شفق (طلوع و غروب کی سرخی) میں کچھ تمیز و فرق ہو سکے۔ (یعنی پہلے اندازہ لگایا کہ یہ شفق غروب ہے تو اس کے زائل ہونے (غائب ہونے) پر نمازِ عشا ادا ہوگی اور پھر اس کے بعد اندازے کے مطابق جتنا وقت نمازِ عشا سے لے کر طلوعِ صبح صادق تک ہوتا ہے، اس کا اندازہ لگا کر اتنا وقت گزرنے پر سحری کا وقت ہو جائے گا اور پھر صبح کی نماز کا وقت شروع ہو جائے گا اور نمازِ فجر پڑھی جائے گی، اسی طرح ہی اندازے سے دوسری نمازیں ادا کی جائیں گی۔ یہ یاد رہے کہ سورج غروب ہوتے ہی نمازِ مغرب ادا ہوگی۔

3 تیسرے وہ علاقے جہاں دن اور رات دونوں چوبیس گھنٹوں کے ہوتے ہیں اور ان علاقوں میں نمازوں کے اوقات بھی علاحدہ ہوتے ہیں (کہ یہ ظہر کا وقت ہے، یہ عصر کا، یہ مغرب کا اور یہ عشا کا) اور ان علاقوں میں سال کے کچھ موسموں میں دن بہت زیادہ چھوٹا ہوتا ہے اور بعض موسموں میں رات بہت زیادہ چھوٹی ہوتی ہے۔ جو کوئی ان علاقوں میں مقیم ہو، جہاں رات اور دن کی تمیز و فرق طلوعِ فجر اور غروبِ آفتاب کے اعتبار سے کی جاتی ہو، مگر موسم گرما میں ان علاقوں میں دن بہت لمبا اور موسمِ سرما میں دن بہت چھوٹا

ہوتا ہو تو ان علاقوں میں شرعی طور پر پانچوں نمازیں اللہ تعالیٰ کے اس قول کے عموم کے اعتبار سے اپنے اپنے معروف وقت پر ادا کی جائیں گی۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا﴾ [بني إسرائيل: ٧٨]

''زوالِ آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک نماز قائم کیجیے اور فجر کے وقت قرآن (نمازِ فجر) کا بھی التزام کیجیے، کیوں کہ قرآنِ فجر (نمازِ فجر میں فرشتوں کے) حاضر ہونے کا وقت ہے۔''

نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴾ [النساء: ١٠٣]

''یقیناً نماز پابندیِ وقت کے ساتھ مومنین پر فرض کی گئی ہے۔''

حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں:

« إِنَّ رَجُلًا سَأَلَهُ عَنْ وَقْتِ الصَّلَاةِ قَالَ: فَقَالَ لَهُ: صَلِّ مَعَنَا هٰذَيْنِ يَعْنِي الْيَوْمَيْنِ فَلَمَّا زَالَتِ الشَّمْسُ أَمَرَ بِلَالًا فَأَذَّنَ ثُمَّ أَمَرَهُ فَأَقَامَ الظُّهْرَ ثُمَّ أَمَرَهُ فَأَقَامَ الْعَصْرَ، وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ بَيْضَاءُ نَقِيَّةٌ، ثُمَّ أَمَرَهُ فَأَقَامَ الْمَغْرِبَ حِيْنَ غَابَتِ الشَّمْسُ، ثُمَّ أَمَرَهُ فَأَقَامَ الْعِشَاءَ حِيْنَ غَابَ الشَّفَقُ، ثُمَّ أَمَرَهُ فَأَقَامَ الْفَجْرَ حِيْنَ طَلَعَ الْفَجْرُ، فَلَمَّا كَانَ الْيَوْمُ الثَّانِيْ أَمَرَهُ فَأَبْرَدَ بِالظُّهْرِ فَأَبْرَدَ بِهَا فَأَنْعَمَ أَنْ يُّبْرِدَ بِهَا، وَصَلَّى الْعَصْرَ، وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ، أَخَّرَهَا فَوْقَ الَّذِيْ كَانَ، وَصَلَّى الْمَغْرِبَ قَبْلَ أَنْ يَّغِيْبَ الشَّفَقُ، وَصَلَّى الْعِشَاءَ بَعْدَ مَا ذَهَبَ ثُلُثُ اللَّيْلِ وَصَلَّى الْفَجْرَ فَأَسْفَرَ بِهَا، ثُمَّ قَالَ: أَيْنَ السَّائِلُ عَنْ وَقْتِ الصَّلَاةِ؟ فَقَالَ الرَّجُلُ: أَنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ: وَقْتُ صَلَاتِكُمْ بَيْنَ مَا رَأَيْتُمْ »[1]

''ایک شخص نے (خدمتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہو کر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اوقاتِ نماز کے

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١١٤، ١١٥)

بارے میں سوال کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ دو دن تم ہمارے ساتھ نماز پڑھو۔ جب زوال ہوا تو آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کہنے کا حکم فرمایا۔ پھر اقامت کا حکم فرمایا اور نمازِ ظہر پڑھی۔ پھر آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو عصر کی اقامت کا حکم فرمایا تو انھوں نے عصر کی اقامت کہی، جب کہ ابھی سورج بلند سفید (اور) صاف تھا۔ (یعنی ابھی تک دھوپ میں زردی نہیں آئی تھی) جب سورج غروب ہوگیا تو آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو مغرب کی اقامت کا حکم دیا اور پھر جب شفق (شام کی سرخی) غائب ہوگئی تو آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اقامتِ عشا (نمازِ عشا کی تکبیر) کا حکم دیا۔ (نماز پڑھی) اور پھر جب فجر (صبح صادق) طلوع ہوئی تو آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اقامت (تکبیر) کہنے کا حکم فرمایا (نماز فجر پڑھی) جب دوسرا دن ہوا تو آپ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو نمازِ ظہر کو ٹھنڈا کرنے کا حکم فرمایا تو انھوں نے ظہر کو ٹھنڈا کیا، یعنی نمازِ ظہر خوب ٹھنڈے وقت میں پڑھائی۔ پھر نمازِ عصر اس وقت پڑھی، جب کہ سورج بلند تھا، لیکن پہلے روز سے ڈھل چکا تھا (یعنی اس روز پہلے روز کی نسبت تاخیر کی) اور شام کی سرخی ہو جانے سے پہلے نمازِ مغرب پڑھی اور ایک تہائی رات گزر جانے کے بعد نمازِ عشا پڑھائی اور صبح کی نماز خوب روشنی پھیل جانے پر پڑھائی، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: نمازوں کے اوقات کے بارے میں سوال کرنے والا کہاں ہے؟ تو اس شخص نے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں موجود ہوں تو آپ ﷺ نے فرمایا: جو کچھ تم نے دیکھا ہے، تمھاری نمازوں کا وقت اس کے درمیان ہے۔''

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«وَقْتُ الظُّهْرِ إِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ، وَكَانَ ظِلُّ الرَّجُلِ كَطُوْلِهِ مَا لَمْ يَحْضُرِ الْعَصْرُ، وَوَقْتُ الْعَصْرِ مَالَمْ تَصْفَرِّ الشَّمْسُ، وَوَقْتُ صَلَاةِ الْمَغْرِبِ مَا لَمْ يَغِبِ الشَّفَقُ، وَوَقْتُ صَلَاةِ الْعِشَآءِ إِلٰى نِصْفِ اللَّيْلِ الْأَوْسَطِ، وَوَقْتُ صَلَاةِ الصُّبْحِ مِنْ طُلُوْعِ الْفَجْرِ مَا لَمْ تَطْلُعِ الشَّمْسُ فَإِذَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ

فَأَمْسِكْ عَنِ الصَّلَاةِ فَإِنَّهَا تَطْلُعُ بَيْنَ قَرْنَيِ الشَّيْطَانِ»[1]

''ظہر کا وقت زوالِ آفتاب سے لے کر آدمی کا سایہ اس کے برابر ہو جانے تک ہے، جب کہ ابھی عصر نہ ہوئی ہو اور نمازِ عصر کا وقت اس وقت تک ہے، جب تک کہ سورج کا رنگ زرد نہ پڑ جائے (یعنی ابھی دھوپ میں زردی نہ آئی ہو) اور نمازِ مغرب کا وقت اس وقت تک ہے، جب تک کہ شفق غائب نہ ہو جائے۔ نمازِ عشا کا وقت ٹھیک آدھی رات تک ہے اور نمازِ فجر کا وقت طلوعِ فجر (صبح صادق) سے لے کر طلوعِ آفتاب تک ہے۔ پس جب سورج طلوع ہو رہا ہو تو تم نماز پڑھنے سے رُک جاؤ، کیوں کہ سورج شیطان کے دو سینگوں کے درمیان طلوع ہوتا ہے۔''

ان دو احادیث کے علاوہ بھی بعض ایسی احادیث ہیں جو قولی و فعلی اعتبار سے پانچوں نمازوں کے وقت کی تحدید کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، ان احادیث میں دن رات کے بعض موسموں میں بہت زیادہ بڑے اور چھوٹے ہونے کے اعتبار سے بھی کوئی فرق نہیں کیا گیا، جب کہ وہ اوقات نماز بھی علامات کے ذریعے سے جو رسول اللہ ﷺ نے بیان کی ہیں، علاحدہ علاحدہ ہیں (یعنی وقت کے اعتبار سے ہر نماز کی علامت رسول ﷺ نے واضح طور پر بیان کی ہے، جو اس نماز کو دوسری نماز سے ممتاز کر دیتی ہے)۔

یہ احادیث تو نمازوں کے اوقات کی تحدید کے بارے میں ہیں، جب کہ ماہِ رمضان کے روزوں کے وقت کی تحدید کے بارے میں اپنے اپنے علاقوں میں مکلّفین پر واجب ہوگا کہ وہ طلوعِ فجر سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے، پینے اور ہر اس چیز سے رکے رہیں جو روزے کے ٹوٹنے یا افطار کا سبب بنے۔ جب تک ان علاقوں میں دن رات سے علاحدہ ہوتا رہے گا (یعنی ان دونوں میں طلوع وغروب آفتاب کے لحاظ سے فرق و تمیز ہوتی رہے گی) ان دونوں (دن اور رات) کا مجموعی وقت بھی چوبیس گھنٹوں کا ہوگا تو ان علاقے والوں کے لیے رمضان میں صرف رات کو کھانا، پینا اور اجماع وغیرہ حلال ہوگا، اگرچہ رات کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو، کیوں کہ شریعتِ اسلامیہ تمام بلاد میں بسنے

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١١٢، ١١٣)

والے لوگوں کے لیے عام ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ﴾ [البقرة: ١٧٨]

''کھاؤ اور پیو، یہاں تک کہ صبح سفید دھاری اندھیرے کی کالی دھاری سے نمایاں نظر آجائے، یعنی علاحدہ ہو جائے، پھر روزے کو رات تک (غروبِ آفتاب تک) پورا کرو۔''

جو کوئی دن لمبا ہونے کی وجہ سے روزہ پورا کرنے سے یا روزہ رکھنے سے عاجز آجائے، جسے علامات یا تجربہ یا کسی امانت دار ڈاکٹر کے بتانے سے اپنے غالب گمان (ظن غالب) کی وجہ سے یہ یقین ہو جائے کہ روزہ رکھنے سے وہ شدید ترین بیماری میں مبتلا ہو جائے گا یا روزہ رکھنے کی وجہ سے اس کا مرض مزید بڑھے گا یا روزہ رکھنے سے اسے بیماری سے شفایاب ہونے میں تاخیر ہوگی تو ایسے شخص کے لیے رمضان المبارک میں روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے۔ یہ مریض یا ایسا شخص ماہِ رمضان میں روزے نہیں رکھے گا، بلکہ دوسرے دنوں میں جس مہینے میں بھی ممکن ہو (رمضان میں چھوڑے ہوئے روزوں کی) قضا دے گا، جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ [البقرة: ١٨٥]

''پس جو کوئی تم میں سے اس ماہِ (رمضان) میں موجود ہو، اسے چاہیے کہ وہ اس میں روزے رکھے اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے، یعنی روزوں کی قضا دے۔''

نیز فرمانِ الٰہی ہے:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ [البقرة: ٢٨٦]

''اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت (واختیار) سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ [الحج:٧٨]

''اللہ نے تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں کی۔''

وَاللّٰهُ وَلِيُّ التَّوْفِيْقِ. وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ، وَعَلٰى آلِهٖ وَصَحْبِهٖ وَسَلَّمَ.

ممبرانِ فقہ اکیڈمی:

بیماری کی وجہ سے معذوری	دستخط	دستخط سماحۃ الشیخ
رئیس فقہ اکیڈمی	نائب رئیس شیخ	عبدالعزیز ابن باز
شیخ عبداللہ بن حمید	محمد علی الحرکان	دستخط
دستخط	دستخط	شیخ محمد بن صالح العثیمین
شیخ محمد عبداللہ السبیل	الشیخ محمد محمود الصواف	غائب ازاجتماع
دستخط	دستخط	الشیخ مسردک العوادی
الشیخ محمد الشاذلی النیفر	شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء	دستخط
دستخط	غائب از اجتماع	مولانا عبدالقدوس ہاشمی
الشیخ محمد رشیدی	مولانا ابوالحسن علی الندوی	دستخط
غائب ازاجتماع	دستخط	شیخ ابوبکر محمود جرمی
شیخ حسین محمد الخلوف	شیخ محمد رشید قبانی	غائب از اجتماع
دستخط	شیخ محمود شیت خطاب	الشیخ محمد سالم عدود

قرار دادیں: شیخ محمد عبدالرحیم الخالد

اوقاتِ نہی یا مکروہہ:

نمازِ پنج گانہ ادا کرنے کے اوّل و آخر اوقات کی تفصیل کسی حد تک ذکر کی جا چکی ہے اور اب ان اوقات کو بھی ذہن نشین کر لیں، جن میں (عام نفلی) نمازیں ادا کرنا منع ہے اور جنھیں اوقاتِ مکروہہ

[1] كتاب قرارات المجمع الفقهي الإسلامي مكة المكرمة۔ الدورة الخامسة ٨/ ١٦ ۔ ربيع الآخر ١٤٠٢ھ (ص: ٨٩ ۔ ٩١) طبع رابطه عالم الإسلامي مكة مكرمة.

کہا جاتا ہے، وہ اوقات پانچ ہیں:

1. ان میں پہلا وقت ہے نماز فجر ادا کر لینے کے بعد سے لے کر سورج طلوع ہونے تک۔
2. دوسرا وقت ہے نمازِ عصر ادا کر چکنے سے لے غروبِ آفتاب تک۔
3. تیسرا وقت وہ ہے، جب کہ سورج طلوع ہو رہا ہو، یہاں تک کہ وہ افق سے نکل کر بلند نہ ہو جائے۔
4. چوتھا وقت وہ ہے، جب نصف النہار یا عین دوپہر ہو، یہاں تک کہ سورج سر سے ڈھل جائے۔
5. پانچواں وقت وہ ہے جب سورج غروب ہو رہا ہو، جب تک کہ وہ غروب نہ ہو جائے۔[1]

بعد از فجر وعصر:

ان پانچوں اوقات میں سے پہلے دو یعنی نمازِ فجر سے لے کر طلوعِ آفتاب تک اور نمازِ عصر سے لے کر غروبِ آفتاب تک کے دوران نماز کی ممانعت ہے۔

حدیثِ اوّل:

صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، بیہقی اور مسند احمد میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهٰى عَنِ الصَّلَاةِ بَعْدَ الصُّبْحِ حَتّٰى تَشْرُقَ الشَّمْسُ وَبَعْدَ الْعَصْرِ حَتّٰى تَغْرُبَ»[2]

''نبی اکرم ﷺ نے نمازِ فجر کے بعد سورج طلوع ہو جانے تک نماز سے منع فرمایا اور نمازِ عصر کے بعد سے لے کر غروبِ آفتاب تک کے دوران میں نماز پڑھنے سے بھی منع فرمایا۔''

حدیثِ ثانی:

اس موضوع کی دوسری حدیث بخاری شریف میں جہاں مذکورہ حدیثِ عمر رضی اللہ عنہ مروی ہے، اسی

---

[1] فتح الباري (٢/ ٦٢) المرعاة (٢/ ٥١)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٥٨) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٦/ ١١١) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١١٣٦) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٤) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٤٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٥٠) الفتح الرباني (٢/ ٢٩٢) صحيح الجامع (٣/ ٦/ ٥٥، ١٩٤)

باب میں ہے اور اس سے اگلے باب میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی ایک حدیث مروی ہے، جس میں دیگر امور کے علاوہ یہ بھی مذکور ہے:

«إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰى عَنِ الصَّلَاةِ بَعْدَ الْفَجْرِ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ، وَبَعْدَ الْعَصْرِ حَتّٰى تَغْرُبَ الشَّمْسُ» [1]

''نبی اکرم ﷺ نے نمازِ فجر کے بعد سورج طلوع ہو جانے تک نماز سے منع فرمایا اور عصر کے بعد سے لے کر غروبِ آفتاب تک کے دوران میں نماز پڑھنے سے بھی منع فرمایا۔''

حدیثِ ثالث:

صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی، ابن ماجہ، بیہقی اور مسند احمد میں اسی مفہوم کی ایک تیسری حدیث حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں کہ میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے:

«لَا صَلَاةَ بَعْدَ الصُّبْحِ حَتّٰى تَرْتَفِعَ الشَّمْسُ، وَلَا صَلَاةَ بَعْدَ الْعَصْرِ حَتّٰى تَغِيْبَ الشَّمْسُ» [2]

''نمازِ فجر کے بعد سورج چڑھ آنے تک کوئی نماز نہیں اور عصر کے بعد بھی کوئی نماز نہیں، جب تک کہ سورج غروب نہ ہو جائے۔''

اسی مفہوم و موضوع کی کئی دیگر احادیث بھی متعدد وصحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں، جن کی بنا پر جمہور اہلِ علم کا مسلک ہے کہ ان اوقات میں نمازِ فجر پڑھنا مکروہ ہے۔ امام نووی رحمہ اللہ نے تو شرح صحیح مسلم میں اس کراہت پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

اس بات پر پوری امت کا اجماع ہے کہ ان اوقات میں کوئی بھی غیر سببی نماز پڑھنا مکروہ ہے، البتہ فرائض کے جواز پر اتفاق ہے۔ سببی نفلی نمازوں کو ادا کرنے کے جواز اور کراہت میں اختلاف ہے، جیسے ''تحیۃ المسجد'' سجدۂ تلاوت، سجدۂ شکر، نمازِ عید، نمازِ کسوف (سورج گرہن کی نماز) نمازِ جنازہ اور فوت شدہ نمازوں کی قضا ہے۔

---

[1] صحيح مسلم مع النووي (٣/ ٦/ ١١٠)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٦/ ١١٠) الفتح الرباني (٢/ ٢٩١) صحيح الجامع (٣/ ٦/ ١٩٤)

اس سلسلے میں امام شافعی رحمہ اللہ اور فقہا و محدثین کے ایک گروہ کا مسلک یہ ہے کہ یہ سب سببی نمازیں ان اوقاتِ مکروہہ میں بھی جائز ہیں اور وہ بھی بلا کراہت، جب کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور بعض دیگر ائمہ وفقہا کے نزدیک یہ نمازیں بھی ممانعت والی احادیث کے تحت آتیں اور ممنوع ہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے موافقین کا استدلال یوں ہے کہ جب یہ بات ثابت ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ ظہر کی بعد والی سنتیں نمازِ عصر کے بعد پڑھی تھیں،[1] اور یہ فوت شدہ سنتوں کی قضا کے بارے میں صریح ہے۔ لہٰذا یہ سنن میں بالاولیٰ جائز ہے اور قضاے فریضہ میں بھی بالاولیٰ ہے اور یہی معاملہ نمازِ جنازہ کا بھی ہے۔[2]

یہ امام نووی رحمہ اللہ کے الفاظ ہیں، جو انھوں نے اختصار کے ساتھ فرمائے ہیں، جب کہ یہاں ہم تفصیل میں نہیں جانا چاہتے، بلکہ ان امور کی قدرے زیادہ تفصیلات مذکور نمازوں کے احکام و مسائل کے ضمن میں ذکر کی جائیں گی۔ یہاں جو امام نووی رحمہ اللہ نے غیر سببی نمازوں کی ان اوقاتِ مکروہہ میں ادا کرنے کی کراہت پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے، اس پر امام عسقلانی رحمہ اللہ نے تعاقب کرتے ہوئے "فتح الباري" میں لکھا ہے کہ یہ اجماع کا دعویٰ صحیح نہیں، کیوں کہ امام داود اور اہلِ ظاہر کا کہنا ہے کہ ان اوقات میں بھی مطلقاً نماز جائز ہے اور امام ابن حزم رحمہ اللہ نے بھی یہی بات بالجزم کہی ہے۔ حافظ عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سلف صالحین کی ایک جماعت مطلقاً اباحت کی قائل رہی ہے اور وہ ممانعت و کراہت والی احادیث کو منسوخ قرار دیتے ہیں۔[3]

اس طرح اجماع کا دعویٰ تو ثابت نہ ہوا۔ یہی بات امام شوکانی رحمہ اللہ سے بھی مذکور کی ہے۔[4] البتہ جمہور اہلِ علم کے نزدیک ان اوقات میں نماز اور خصوصاً غیر سببی نماز ادا کرنا مکروہ ہے۔ ہاں مذکورہ بالا سببی نمازیں تو الگ بات ہے۔ یہی معاملہ اس صورت میں بھی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے گھر میں کسی وجہ سے نماز پڑھ لے اور مسجد میں چلا جائے، وہاں دیکھے کہ جماعت ہو رہی ہے تو وہ اس جماعت میں شامل ہو سکتا ہے، کیوں کہ اس بات پر دلالت کرنے والی وہ احادیث جن میں سے چار

[1] صحيح البخاري (٢/ ٦٤)

[2] شرح مسلم مع النووي (٣/ ٦/ ١١٠، ١١١)

[3] فتح الباري (٢/ ٥٩)

[4] كما في الفتح الرباني (٢/ ٢٩٦)

احادیث جماعت کو سنتِ موکدہ کہنے والوں کے دلائل کے ضمن میں اور دو اس کے بعد بھی ذکر کی جا چکی ہیں اور وہ چھے احادیث ہی مطلق ہیں، ان میں سے کسی میں بھی نبیِ اکرم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ فلاں فلاں نماز ہو تو جماعت میں مل جاؤ اور فلاں فلاں ہو تو نہ ملو، بلکہ آپ ﷺ کا حکم عام ہے، جو پانچوں نمازوں ہی کو شامل ہے۔ امام شافعی، احمد، اسحاق بن راہویہ، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ابن قیم رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے اور شیخ ابن باز نے تحقیق "فتح الباري" میں اسے ہی صحیح قول قرار دیا ہے۔[1]

جن احادیث میں مذکور ہے کہ نمازِ فجر وعصر کے بعد طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب تک کوئی نماز نہیں ہوتی، وہ احادیث عام ہیں اور دوسری مرتبہ کسی نماز کو ادا کرنے کے لیے جماعت میں شامل ہو جانے والی احادیث خاص ہیں اور صرف ایسے ہی مواقع سے تعلق رکھتی ہیں۔ لہٰذا ان میں باہم کوئی تعارض یا تضاد بھی نہیں بنتا، بلکہ اصول میں مذکور تصریحات کی رو سے خاص احادیث کو عام پر مقدم کرنا ضروری ہوتا ہے، بلکہ مطلقاً عام کی خاص پر بنیاد رکھنے کو واجب قرار دیا گیا ہے۔[2]

امام شوکانی رحمہ اللہ اور علامہ عبید اللہ رحمانی رحمہ اللہ کی تفصیلات کے علاوہ معروف مصری عالم سید سابق نے "فقه السنة" میں ممنوع اوقات کے دوران میں بھی سببی نمازوں کو ادا کرنے کے بلا کراہت جواز والے مسلک کو "أقرب إلی الحق" قرار دیا ہے۔[3]

ان اوقات میں نفلی نمازوں کے مکروہ ہونے کے بارے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عمر، علی، ابن مسعود، ابن عمر، خالد بن ولید، ابو ہریرہ اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کے اقوال ملتے ہیں۔ تابعین میں سے امام حسن بصری اور سعید بن مسیّب رحمہما اللہ بھی اسے مکروہ سمجھتے تھے۔ جب کہ ائمہ مذاہب میں سے امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ بھی کراہت کے قائل تھے۔ امام شافعی سببی نمازوں کو جائز قرار دیتے تھے اور حنابلہ سببی و غیر سببی سب کی حرمت کے قائل ہیں، سوائے طواف کی دو رکعتوں کے۔ البتہ خود امام احمد رحمہ اللہ سے ایک روایت میں جواز کا قول منقول ہے۔[4]

جو استثنائی صورتیں بیان کی گئی ہیں، جن میں وہ نمازیں آتی ہیں، جو ان اوقاتِ مکروہہ میں بھی

---

[1] فتح الباري (٢/ ٨٩)

[2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: نیل الأوطار (١/ ٢/ ٢٤) المرعاة (٢/ ١٣٦، ١٣٧)

[3] فقه السنة (١/ ١٠٧)

[4] معالم السنن (١/ ١٦٤) فقه السنة (١/ ١٠٧) تحقيق فتح الباري (٢/ ٥٩) المرعاة (٢/ ١٣٦)

بلا کراہت جائز ہیں، انھی میں سے فجر کی دو سنتیں بھی ہیں، جنھیں فرضوں کے بعد ہی طلوعِ آفتاب سے پہلے پڑھا جا سکتا ہے، جس کے ایک دو نہیں بلکہ متعدد دلائل ہیں۔

فجر کی دو سنتیں:

اگر کوئی شخص فرضوں سے پہلے دو سنتیں نہ پڑھ سکا ہو، بلکہ اس کے مسجد آتے ہی مسجد میں اقامت ہوگئی ہو تو وہ اسی وقت جماعت میں شامل ہو جائے اور جب فرضوں کی تکمیل پر سلام پھر جائے تو بعد میں اٹھ کر وہ اپنی دو سنتیں پڑھ لے۔ اسے اب طلوع آفتاب کا انتظار کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں، کیوں کہ اس کا جواز متعدد احادیث و آثار سے ثابت ہے۔

حدیثِ اوّل:

سنن ابی داود، ترمذی، ابن ماجہ، صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن حبان، مصنف ابن ابی شیبہ، مصنف عبدالرزاق، سنن دارقطنی و بیہقی اور مسند احمد میں حضرت قیس بن عمرو رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

((خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَأُقِيْمَتِ الصَّلَاةُ فَصَلَّيْتُ مَعَهُ الصُّبْحَ ثُمَّ انْصَرَفَ النَّبِيُّ ﷺ فَوَجَدَنِيْ أُصَلِّيْ فَقَالَ: مَهْلًا يَا قَيْسُ! أَصَلَوٰتَانِ مَعاً؟ قُلْتُ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ! إِنِّيْ لَمْ أَكُنْ رَكَعْتُ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ))

''نبی اکرم ﷺ تشریف لائے تو جماعت کی اقامت ہوگئی، میں نے آپ ﷺ کے ساتھ نمازِ فجر پڑھی، پھر جب آپ ﷺ صحابہ کی طرف پھرے تو مجھے نماز پڑھتے ہوئے پایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ٹھہرو! کیا ایک ہی وقت میں دو نمازیں پڑھتے جا رہے ہو؟ میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! میں نے (جماعت میں شامل ہونے سے پہلے) فجر کی دو سنتیں نہیں پڑھی تھیں۔''

اس پر نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا: ((فَلَا اِذَنْ))[1] ''تب پھر کوئی حرج نہیں۔''

اس ((فَلَا إِذَنْ)) کا تفصیلی معنیٰ اور دیگر متعلقہ تفصیلات ''تحفة الأحوذي'' (۲/ ٤٨٨) میں

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١١٢٨) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١١٥٤)

ملاحظہ فرمائیں۔[1]

اس حدیث میں نبیِ اکرم ﷺ نے صراحتاً فرضوں کے فوراً بعد دو سنتیں پڑھنے کی اجازت دی ہے، کیوں کہ یہ بات تو آپ ﷺ کے منصبِ نبوت کے ہی خلاف ہے کہ آپ ﷺ کوئی غلط کام ہوتا دیکھیں تو اس پر نکیر کریں اور نہ ٹوکیں، بلکہ اسے بحال رہنے دیں۔ یہ آپ ﷺ کی شان ہی کے خلاف بات ہے اور جب اس صحابی کو آپ ﷺ نے منع نہیں فرمایا، بلکہ « فَلَا إِذَنْ » فرما کر اجازت بخشی تو اس کا معنیٰ یہ ہوا کہ یہ جائز ہے۔ اس حدیث سے کبار محدّثین کرام رحمہم اللہ نے بھی یہی مفہوم سمجھا ہے۔ چنانچہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی اس حدیث پر یہ باب قائم کیا ہے:

"باب فيمن تفوُتُه الرّكعتان قبلَ الفجرِ يصلّيهما بعد صلاة الصّبح"

''جس کی فجر سے پہلے والی دو رکعتیں فوت ہو جائیں، تو وہ انھیں فجر کے فرضوں کے بعد پڑھ لے۔''

امام ابو داود نے یوں تبویب کی ہے:

"باب من فاتَتُه متى يقضيهما"

''جس کی یہ دو رکعتیں رہ جائیں، وہ ان کی قضا کب کرے؟''

اس کے بعد حدیث ذکر کی ہے، جس سے ان کا مقصود واضح ہے کہ وہ فرضوں کے بعد پڑھ لے۔ امام ابن ماجہ کی تبویب ہے:

"بابُ ما جآءَ فيمَنْ فاتَتُه الرّكعتان قبل صلاة الفجر متىٰ يقضيهما"

مفہوم اس کا بھی امام ابو داود کی تبویب والا ہے۔ سنن ابی داود والی حدیث کے الفاظ کچھ یوں ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے اس صحابی سے مخاطب ہو کر فرمایا:

« صَلَاةُ الصُّبحِ رَكْعَتَانِ » ''صبح کی نماز تو دو ہی رکعتیں ہیں۔''

اس پر انھوں نے جواب دیا کہ میں نے پہلی دو رکعتیں نہیں پڑھی تھیں، وہ اب ادا کی ہیں:

« فَسَكَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ » ''تو نبیِ اکرم ﷺ خاموش ہو گئے۔''

---

[1] نیز دیکھیں: سنن أبي داود مع العون (٤/ ٤٤) سنن الترمذي مع التحفة (٢/ ٤٨٧، ٤٨٨) سنن ابن ماجه (١/ ٣٦٥) صحيح ابن خزيمة (٢/ ١٦٤) مصنف ابن أبي شيبة (٢/ ٢٥٤)

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے، آپ ﷺ کی خاموشی رضا کی علامت ہوا کرتی تھی، کیوں کہ ''التمهيد لابن عبد البر'' میں سہل بن سعد الساعدی رضی اللہ عنہ کی ایک ضعیف السند روایت میں ہے:

﴿ دَخَلْتُ الْمَسْجِدَ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِي الصَّلَاةِ، وَلَمْ أَكُنْ صَلَّيْتُ الرَّكْعَتَيْنِ فَدَخَلْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِي الصَّلَاةِ فَصَلَّيْتُ مَعَهُ، وَقُمْتُ أُصَلِّيْ... أَلَمْ تَكُنْ صَلَّيْتَ مَعَنَا؟ قُلْتُ: بَلٰى وَلَمْ أَكُنْ صَلَّيْتُ الرَّكْعَتَيْنِ فَصَلَّيْتُ الْآنَ، فَسَكَتَ﴾

''میں مسجد میں داخل ہوا تو نبی اکرم ﷺ نماز میں تھے، جب کہ میں نے ابھی پہلی دو سنتیں نہیں پڑھی تھیں۔ میں آپ ﷺ کے ساتھ نماز میں شامل ہوگیا اور نماز پڑھ لی، پھر میں نے اُٹھ کر نماز (سنتیں) پڑھیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی؟ میں نے کہا: ہاں پڑھی ہے۔ البتہ میں دو سنتیں نہیں پڑھ سکا تھا، وہ میں نے اب پڑھی ہیں۔ پس آپ ﷺ خاموش ہوگئے۔''

اسی حدیث کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں:

﴿وَكَانَ إِذَا رَضِيَ شَيْئاً سَكَتَ﴾

''آپ ﷺ جب کسی کام پر رضا مند ہوتے تو خاموشی اختیار فرماتے تھے۔''

حدیثِ دوم:

اسی موضوع کی دوسری حدیث صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ میں ہے، جس میں حضرت قیس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انھوں نے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نمازِ فجر ادا کی اور سنتیں نہیں پڑھ سکے تھے، جب آپ ﷺ نے سلام پھیرا تو انھوں نے کھڑے ہوکر دو سنتیں پڑھیں۔ آگے الفاظ ہیں:

﴿وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَنْظُرُ إِلَيْهِ فَلَمْ يُنْكِرْ عَلَيْهِ﴾[1]

''جب کہ آپ ﷺ انھیں دیکھ رہے تھے، مگر آپ ﷺ نے نکیر نہیں فرمائی، یعنی منع نہیں کیا۔''

حدیثِ سوم:

اسی سلسلے کی تیسری حدیث مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے، جس میں فرضوں کے بعد اُٹھ کر سنتیں

[1] موارد الظمآن، رقم الحديث (٦٢٤)

پڑھنے والے صحابی کا بیان ہے کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! میں آیا تو آپ ﷺ نماز شروع کر چکے تھے، میں نے ابھی سنتیں نہیں پڑھی تھیں اور آپ ﷺ کے نماز پڑھانے کے دوران میں جماعت کے پاس کھڑے ہو کر سنتیں پڑھنا میں نے مکروہ و ناپسندیدہ سمجھا۔ لہٰذا جب جماعت ختم ہوئی تو میں نے دو سنتیں ادا کیں، یہ سن کر نبیِ اکرم ﷺ ہنسے۔

«فَلَم يَأْمُرُهُ وَلَمْ يَنْهَهُ»[1] ''پس آپ ﷺ نے نہ کوئی حکم فرمایا اور نہ منع ہی فرمایا۔''

حدیثِ چہارم:

محلی ابن حزم میں امام عطا رحمہ اللہ ایک انصاری صحابی سے بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فجر کی فرض نماز کے بعد کسی کو نماز پڑھتے دیکھا، پوچھنے پر اس نے بتایا کہ میں نے سنتیں نہیں پڑھیں تھیں اور اب ادا کی ہیں۔

«فَلَمْ يَقُلْ لَّهٗ شَيْئًا»[2] تو آپ ﷺ نے اسے کچھ نہیں فرمایا۔

اسی طرح ''مجمع الزوائد'' میں علامہ ہیثمی ''طبراني كبير'' کے حوالے سے ایک متکلم فیہ سند والی روایت لائے ہیں، جسے علامہ شمس الحق عظیم آبادی شارح ابو داود اپنی کتاب ''إعلام أهل العصر بأحكام ركعتي الفجر'' میں لائے ہیں اور اس کی تصحیح کی ہے۔ اس میں حضرت ثابت بن قیس بن شماس اپنے باپ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

«اَتَيتُ الْمَسْجِدَ، وَالنَّبِيُّ ﷺ فِي الصَّلَاةِ فَلَمَّا سَلَّمَ النَّبِيُّ ﷺ اِلْتَفَتَ إِلَيَّ وَأَنَا أُصَلِّيْ فَلَمَّا فَرَغْتُ قَالَ: أَلَمْ تُصَلِّيْ؟ قُلْتُ: نَعَمْ»

''میں مسجد میں آیا، جب کہ نبیِ اکرم ﷺ نماز کی حالت میں تھے، جب نبیِ اکرم ﷺ نے سلام پھیرا تو میری طرف متوجہ ہوئے، جب کہ میں نماز پڑھ رہا تھا، جب میں نماز سے فارغ ہوا تو آپ ﷺ نے پوچھا: کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھی تھی؟ میں نے عرض کیا: ہاں۔''

تب آپ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] مصنف ابن أبي شيبة (٢/ ٢٥٣)

[2] المحلىٰ بتحقيق ڈاكٹر عبد الغفار سليمان، طبع دار الكتب، بيروت.

«فَمَا هٰذِهِ الصَّلَاةُ» ''تو پھر یہ کون سی نماز ہے (جواب تم نے پڑھی ہے)؟۔''

میں نے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ!

«رَكْعَتَا الْفَجْرِ، خَرَجْتُ مِنْ مَنْزِلِي وَلَمْ أَكُنْ صَلَّيْتُهُمَا»

''یہ فجر کی سنتیں تھیں، میں گھر سے نکلا تو میں نے وہ سنتیں نہیں پڑھی تھیں۔''

آگے وہ بیان کرتے ہیں:

«فَلَمْ يَعِبْ ذٰلِكَ عَلَيَّ»

''(یہ سن کر) آپ ﷺ نے پھر میرے اس فعل کو معیوب نہیں کہا۔''

اس حدیث کو محدث ابو موسیٰ نے روایت کیا اور کہا ہے کہ ابن جریج نے اسے عطا بن ابی رباح کے حوالے سے قیس بن سہل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے اور یہ صحیح بھی ہے۔[1]

آثار:

ایسے ہی بعض آثار سے بھی پتا چلتا ہے کہ فجر کے فرضوں کے بعد طلوعِ آفتاب سے پہلے فجر کی سنتیں پڑھی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ مصنف عبدالرزاق میں ابن جریج رحمہ اللہ امام عطاء رحمہ اللہ سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

"إِذَا أَخْطَأْتَ أَنْ تَرْكَعَهَا قَبْلَ الصُّبْحِ فَارْكَعْهُمَا بَعْدَ الصُّبْحِ"[2]

''اگر فجر کی سنتیں فرضوں سے پہلے نہ پڑھ سکو تو فرضوں کے بعد پڑھ لو۔''

امام طاؤس کے فرزند اپنے والد سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا:

"إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلَاةُ وَلَمْ تَرْكَعْ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ، صَلِّ مَعَ الْإِمَامِ، فَإِذَا فَرَغَ إِرْكَعْهُمَا بَعْدَ الصُّبْحِ"[3]

''جب جماعت کھڑی ہو جائے اور تم نے ابھی سنتیں نہیں پڑھیں تو امام کے ساتھ مل کر فرض پڑھ لو اور جب وہ (امام) فرضوں سے فارغ ہو تو تم وہ سنتیں پڑھ لو۔''

---

[1] إعلام أهل العصر (ص: ۲۳۱)

[2] مصنف عبد الرزاق (۲/ ٤٤۲)

[3] المصدر السابق.

امام عبدالرزاق رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”رَأَيْتُ ابْنَ جُرَيْجٍ رَكَعَهُمَا بَعْدَ الصُّبْحِ فِيْ مَسْجِدِ صَنْعَآءِ بَعْدَ مَا سَلَّمَ الْإِمَامُ“[1]

”میں نے ابن جریج کو دیکھا کہ انھوں نے مسجدِ صنعاء میں اس وقت فجر کی دو سنتیں پڑھیں، جب امام نے فرضوں کا سلام پھیرا۔“

حاصل کلام یہ ہوا کہ گذشتہ صفحات میں ذکر کردہ چاروں احادیث اور تینوں آثار سے صراحتاً واضح ہو گیا کہ نبیِ اکرم ﷺ کے سامنے کئی مرتبہ فرضوں کے بعد اٹھ کر فجر کی پہلی سنتیں پڑھی گئیں، مگر آپ ﷺ نے کسی پر بھی اعتراض نہیں کیا، بلکہ بعض کا تو «فَلَا إِذَنْ» کہہ کر مثبت میں جواب دیا اور بعض کی وضاحت پر کہ ”یہ سنتیں تھیں، جو میں پہلے نہیں پڑھ سکا“ آپ ﷺ خاموش ہوگئے، جو آپ ﷺ کی رضامندی کی دلیل ہے، ورنہ ناجائز کام دیکھ کر خاموشی اختیار کر لینا تو شانِ نبوت اور مقامِ رسالت کے منافی ہے۔

اس تفصیل سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ایسی مخصوص صورت میں فجر کی نماز کے بعد طلوعِ آفتاب سے پہلے یہ دو سنتیں پڑھی جاسکتی ہیں اور یہ صورت اس عمومی حکم سے مستثنیٰ ہے، جس کی رو سے یہ وقت: اوقاتِ کراہت میں سے ہے۔ یہاں اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتے جائیں کہ فجر کی سنتوں کا اصل وقت اقامت ہو جانے تک ہے۔ اگر اس وقت تک کسی وجہ سے نہ پڑھی جاسکیں تو پھر اقامت ہو جانے کے بعد جماعت کے پاس کھڑے ہو کر یہ سنتیں نہیں پڑھنی چاہییں، کیوں کہ اقامت ہو جانے کے بعد اس فرضی نماز کے سوا دوسری کوئی نماز نہیں ہوتی۔ چاہے وہ فجر کی سنتیں ہی کیوں نہ ہوں، اس بات کے متعدد دلائل موجود ہیں، جن میں سے کئی احادیث و آثار بھی ہیں۔ ان کے ذکر و تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ ان کا تذکرہ آگے چل کر سنن موکدہ کی تفصیلات کے ضمن میں آئے گا۔ ان شاء اللہ

فجر کے بعد سے مراد:

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ جن احادیث میں فجر کے بعد سے طلوعِ آفتاب کے وقت کو وقتِ کراہت شمار کیا گیا، وہاں حضرت سعید بن مسیّب، حمید اور اہلِ رائے کے نزدیک نمازِ فجر مراد نہیں، بلکہ ”المغني لابن قدامة“ میں مذکورہ صراحت کی رو سے طلوعِ فجر

[1] المصدر السابق.

یعنی اذانوں کا وقت مراد ہے کہ اذانوں کے وقت سے لے طلوعِ آفتاب تک کے درمیان کوئی نفلی نماز یا سنتیں نہیں ہوتیں، سوائے فجر کی دو سنتوں کے۔[1]

جیسا کہ سنن ابی داود، ترمذی، دارقطنی، بیہقی اور مسندِ احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے آزاد کردہ غلام یسار بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے مجھے دیکھا کہ میں فجر طلوع ہو جانے کے بعد (نفلی) نماز پڑھ رہا ہوں تو فرمایا: اے یسار! نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم (ایک مرتبہ) گھر سے ہمارے پاس مسجد میں تشریف لائے تو ہم ایسی ہی (نفلی) نماز پڑھ رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لِيُبَلِّغْ شَاهِدُكُمْ غَائِبَكُمْ: لَا تُصَلُّوْا بَعْدَ الْفَجْرِ إِلَّا سَجْدَتَيْنِ»[2]

”تم میں سے جو شخص موجود ہے، وہ غیر حاضر لوگوں تک یہ بات پہنچا دے کہ فجر کے بعد دو سنتوں کے سوا کوئی (غیر فرض) نماز نہ پڑھو۔“

صاحب ”إرواء الغليل“ نے اس حدیث کے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے چار دیگر طُرق بھی ذکر کیے ہیں اور ان طُرق کی بنا پر اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ نے بھی محلّی ابن حزم کی تحقیق (۳/ ۳۳۔۳۴) میں اسے صحیح کہا ہے۔ اسی مفہوم پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی احادیث بھی دلالت کرتی ہیں، جن کی اسانید پر بھی محدّثین کرام رحمہم اللہ نے کلام کیا ہے، لیکن سابقہ حدیث اور اس کے طُرق اور اُن دونوں احادیث کے مجموعے پر مبنی حدیث کو صحیح کہا گیا ہے۔[3]

بہر حال ان میں سے طبرانی اوسط میں مرفوعاً اور بیہقی میں مرسلاً (بسند صحیح) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث کے الفاظ ہیں:

«إِذَا طَلَعَ الْفَجْرُ فَلَا صَلَاةَ إِلَّا رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ»[4]

”جب فجر طلوع ہو جائے تو پھر کوئی نماز نہیں سوائے فجر کی دو رکعتوں کے۔“

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما والی مصنف ابن شیبہ، سنن دارقطنی، بیہقی، قیام اللیل مروزی، طبرانی کبیر اور مسند بزار کی حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

---

[1] المغني (۲/ ۹۶۔ ۹۷) و الفتح الرباني ۲/ ۲۹۹۔ ۳۰۰)

[2] إرواء الغليل (۲/ ۲۳۳) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۱۳۸) قيام الليل للمروزي (ص: ۱۳۷)

[3] تفصیل کے لیے دیکھیں: إرواء الغليل (۲/ ۲۳۲) و تحقيق المحلٰى أيضاً.

[4] تفصیل کے لیے ”المغني لابن قدامة“ ملاحظہ فرمائیں۔ صحيح الجامع، رقم الحديث (۶۷۸)

«لَا صَلَاةَ بَعْدَ طُلُوعِ الْفَجْرِ إِلَّا رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ»[1]

''طلوعِ فجر کے بعد فجر کی دوسنتوں کے سوا دوسری کوئی (غیر فرضی) نماز نہیں ہے۔''

البتہ حضرت حسن بصری، امام شافعی اور ایک روایت میں امام احمد کے نزدیک یہ نہی بھی فجر کی نماز سے متعلق ہے، طلوعِ فجر سے نہیں۔[2]

طلوعِ فجر یا اذانِ فجر کے بعد عام نوافل:

ان احادیث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ طلوعِ فجر یا اذانِ فجر کے بعد کی دوسنتوں اور دو فرضوں کے سوا دوسری کوئی نماز پڑھنا جائز نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص حد سے تجاوز کرتے ہوئے اس وقت عام نماز پڑھنا شروع کر دے تو وہ ثواب کے بجائے عتاب و عذاب کو آواز دینے والا ہوگا۔ چنانچہ سنن کبریٰ بیہقی میں صحیح سند کے ساتھ حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے ایک آدمی کو دیکھا، جو طلوعِ فجر کے بعد دوسنتوں کے علاوہ بھی نوافل پڑھتا ہے اور اس نفلی نماز میں بکثرت رکوع و سجود کرتا ہے، تو انھوں نے اسے فعل سے منع کیا۔ اس شخص نے کہا: اے ابو محمد:

''يُعَذِّبُنِي اللّٰهُ عَلَى الصَّلَاةِ؟''

''کیا اللہ تعالیٰ مجھے نماز پڑھنے پر عذاب دے گا؟''

تو انھوں نے فرمایا:

''لَا وَلٰكِنْ يُعَذِّبُكَ عَلٰى خِلَافِ السُّنَّةِ''[3]

''نہیں (نماز پڑھنے پر تو نہیں البتہ) سنت کی خلاف ورزی کرنے پر عذاب کرے گا۔''

حضرت سعید بن مسیّب رحمہ اللہ کے یہ الفاظ بڑے فکر انگیز ہیں اور اگر کوئی شخص انھیں اچھی طرح سمجھ کر ذہن نشین کرے تو پھر بدعات و خرافات پر کاربند لوگوں کے بکثرت اعمال کے سلسلے میں فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے، کیوں کہ اہلِ بدعت پہلے کسی عمل کو ایجاد کرتے ہیں، پھر اسے نماز اور ذکرِ الٰہی کے طور پر پیش کر کے اس کے جائز ہونے کا ڈنڈھورا پیٹنے لگتے ہیں۔ ایسے تمام لوگوں کو

---

[1] قيام الليل للمروزي (ص: ١٣٧)

[2] دیکھیں: الإرواء (٢/ ٢٣٦)

[3] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٤٤٤) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ٢٢٥۔ ٢٢٦) و صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٤٢) صحيح الجامع، رقم الحديث (٤٦٠)

حضرت ابن مسیّب رحمہ اللہ کی یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ کوئی عمل چاہے نماز اور ذِکرِ الٰہی کی قبیل ہی سے کیوں نہ ہو، جب وہ اس انداز اور اوقاتِ سنت کے مخالف ہو تو وہ ثواب کے بجائے عذاب کا موجب ہوگا۔

تحیۃ المسجد اذانِ فجر کے بعد:

یہ تو عام نوافل کے بارے میں حکم ہے، البتہ بعض محققین نے ایک شکل میں تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں ادا کرنے کی اس وقت بھی اجازت دی ہے، لیکن اس شکل کو سمجھنے سے پہلے یہ بات ذہن میں رہے کہ اگر فجر کی اذان سن کر کسی نے وضو کیا اور مسجد میں آیا۔ جماعت کھڑی ہونے میں ابھی کچھ وقت باقی ہے تو اسے چاہیے کہ ایسے میں وہ تحیۃ المسجد ادا کرنے میں مشغول نہ ہو، بلکہ وہ فجر کی دو سنتیں پڑھ لے، فجر کی یہی سنتیں تحیۃ المسجد سے بھی کفایت کر جائیں گی، لہٰذا علاحدہ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ یہ اس طرح ہے، جیسے حجۃ الوداع کے موقع پر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد حرام میں داخل ہو کر طواف شروع کر دیا تھا۔ تحیۃ المسجد کی نماز بھی اس میں شامل ہوگئی تھی۔ البتہ اگر کوئی شخص صبح کی دو سنتیں گھر میں ادا کر کے مسجد میں آتا ہے اور جماعت کھڑی ہونے میں ابھی کچھ وقفہ ہے تو وہ تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں پڑھ کر ہی بیٹھے، کیوں کہ صحیح بخاری مسلم اور سنن ابی داود میں حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ارشادِ نبوی ہے:

«إِذَا جَآءَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْيُصَلِّ سَجْدَتَيْنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَّجْلِسَ»

''جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں آئے تو چاہیے کہ بیٹھنے سے پہلے دو رکعتیں پڑھ لے۔''

اِس حدیث کے عموم کی رو سے ایسا شخص اس وقت بھی دو رکعتیں پڑھ سکتا ہے، بلکہ اس حدیث کے عموم کے پیشِ نظر تمام اوقاتِ مکروہہ میں ان دو رکعتوں کی اجازت دی گئی ہے، اس موضوع کی تفصیل ''تحیة المسجد'' کے ضمن میں آتی ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل از فرائض اذانِ فجر کے بعد صرف دو سنتیں ہی ثابت ہیں، لہٰذا تحیۃ المسجد کی یہ دو رکعتیں اس سنت پر اضافہ ہوں گی، جو صحیح نہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اضافہ اس صورت میں ہوگا، جب نئے سرے سے کوئی یہ دو رکعتیں پڑھنے لگے، یعنی مسجد میں بیٹھا تھا، پھر کھڑے ہو کر دو رکعتیں پڑھنے لگا اور پھر سنتیں پڑھیں، جب کہ اذان ہو چکی ہے۔ اس

طرح تو یہ ناجائز ہے، لیکن اگر دخولِ مسجد کی وجہ سے ادا کرے تو یہ نماز ہوگی جو جائز ہے، جیسے باہر سے آنے والا تحیۃ المسجد ادا کرتا ہے۔

ہمارے استاذ شیخ الحدیث حافظ ثناء اللہ صاحب مدنی حفظہ اللہ کا فتویٰ بھی یہی ہے، جو ہفت روزہ ''الاعتصام'' لاہور (جلد۴۲، شمارہ ۳۹، بابت ۲۸/ستمبر ۱۹۹۰ء الموافق ربیع الاول ۱۴۱۱ھ) میں شائع ہو چکا ہے۔

اور ''الكافي'' لابن عبد البر میں ہے:

''وَمَنْ أَتَى الْمَسْجِدَ وَقَدْ رَكَعَ رَكْعَتَيِ الْفَجْرِ فِيْ بَيْتِهِ، فَإِنْ شَآءَ رَكَعَ الرَّكْعَتَيْنِ تَحِيَّةَ الْمَسْجِدِ وَإِنْ شَآءَ جَلَسَ وَكُلُّ ذٰلِكَ مَبَاحٌ لَهٗ وَقَدْ قِيْلَ لَا يَرْكَعُهُمَا، وَكِلَاهُمَا صَحِيْحٌ عَنْ مَالِكٍ، وَالْأُوْلٰى أَوْلٰى وَأَحْفَظُ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ''[1]

''جو شخص گھر میں صبح کی دو رکعتیں، یعنی سنتیں پڑھ کر مسجد میں آئے۔ اگر وہ چاہے تو تحیۃ المسجد پڑھ لے اور اگر چاہے تو بغیر (تحیۃ المسجد) پڑھے (مسجد میں) بیٹھ جائے۔ یہ سب کچھ اس کے لیے مباح و جائز ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ تحیۃ المسجد پڑھ لے۔ یہ دونوں (عمل) امام مالک کے نزدیک صحیح ہیں اور پہلی بات (تحیۃ المسجد کو پڑھنا) زیادہ بہتر اور زیادہ محفوظ ہے، اِن شاء اللہ۔''

نمازِ وتر، طلوعِ فجر کے بعد:

طلوعِ صبح صادق کے بعد اور نمازِ فجر سے پہلے پہلے عام نوافل ادا کرنے میں اگرچہ حضرت حسن بصری، امام شافعی رحمہ اللہ اور علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کے نزدیک جائز ہے، لیکن اس سلسلے میں صحیح ترین بات وہی ہے، جو ذکر کی چکی ہے کہ فجر کی سنتوں یا ایک مخصوص شکل میں تحیۃ المسجد کے علاوہ عام نوافل جائز نہیں ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے طلوعِ فجر کے بعد وتر ادا کرنے کو جائز قرار دیا ہے اور دلیل کے طور پر کئی آثار نقل کیے ہیں، مثلاً: ان کے بلاغات میں سے ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما، قاسم بن محمد اور حضرت عبداللہ بن عامر بن ربیعہ رحمہم اللہ نے طلوعِ فجر کے بعد وتر پڑھے۔[2] حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

---

[1] الكافي لابن عبد البر (١/ ١٩٦) تحقيق ڈاکٹر محمد محمد مور يتاتي. طبع مكتبة الرياض الحديثة.

[2] الموطأ مع التنوير (١/ ١/ ١٤٧)

”مَا أُبَالِي لَوْ أُقِيمَتْ صَلَاةُ الصُّبْحِ وَأَنَا أُوتِرُ“[1]

”میں اس بات کی پروانہیں کرتا کہ صبح کی اقامت ہو جائے، جب کہ میں وتر پڑھ رہا ہوں۔“

یحیٰ بن سعید رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

”كَانَ عُبَادَةُ بْنُ الصَّامِتِ يَؤُمُّ قَوْمًا فَخَرَجَ يَوْمًا إِلَى الصُّبْحِ فَأَقَامَ الْمُؤَذِّنُ صَلَاةَ الصُّبْحِ فَأَسْكَتَهُ عُبَادَةُ حَتَّىٰ أَوْتَرَ، ثُمَّ صَلَّى بِهِمُ الصُّبْحَ“[2]

”حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ قوم کی امامت کرواتے تھے۔ ایک دن وہ فجر کے لیے آئے تو موذن نے اقامت کہہ دی۔ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے اسے خاموش کر دیا اور وتر پڑھے۔ پھر صبح کی نماز پڑھائی۔“

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے مروی ہے:

”إِنَّ عَبَّاسٍ رَقَدَ ثُمَّ اسْتَيْقَظَ فَقَالَ لِخَادِمِهِ: أُنْظُرْ مَا ذَا صَنَعَ النَّاسُ؟ وَهُوَ يَوْمَئِذٍ قَدْ ذَهَبَ بَصَرُهُ، فَذَهَبَ الْخَادِمُ، ثُمَّ رَجَعَ فَقَالَ: قَدِ انْصَرَفَ مِنَ الصُّبْحِ فَقَامَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَأَوْتَرَ ثُمَّ صَلَّى الصُّبْحَ“[3]

”حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سو گئے اور پھر بیدار ہوئے، پھر انھوں نے اپنے خادم سے کہا کہ جاؤ دیکھو! لوگوں نے کیا کیا ہے؟ ان دنوں ان کی آنکھوں کی بصارت ختم ہو چکی تھی۔ خادم گیا اور آ کر اس نے بتایا کہ لوگ فجر کی نماز ادا کر چکے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اٹھے، انھوں نے پہلے نمازِ وتر پڑھی اور پھر نمازِ فجر ادا کی۔“

ایسے ہی بعض مرفوع آثار بھی ہیں۔ مثلاً سنن ابی داود، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد اور مستدرکِ حاکم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

«مَنْ نَامَ عَنِ الْوِتْرِ أَوْ نَسِيَهُ فَلْيُوتِرْ إِذَا ذَكَرَهُ أَوْ إِذَا اسْتَيْقَظَ»[4]

---

[1] حوالا بالا

[2] حوالا بالا.

[3] حواله باله.

[4] الفتح الرباني (٢/ ٣١٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٢٦٨) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٨) وقال حاكم صحيح على شرط الشيخين وصححه العراقي إسناد طريق أبي داود.

''جس کے وتر نیند یا بھول جانے کی وجہ سے رہ جائیں، جب اسے یاد آجائیں یا وہ نیند سے بیدار ہو جائے تو وتر پڑھ لے۔''

اسی طرح مسند احمد اور طبرانی اوسط میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يُصْبِحُ فَيُوْتِرُ»

''رسول اللہ ﷺ صبح کے وقت وتر پڑھ لیا کرتے تھے۔''

سنن بیہقی اور مستدرک حاکم (وصححہ) میں حضرت ابو داود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«رُبَمَا رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يُوْتِرُ وَقَدْ قَامَ النَّاسُ لِصَلَاةِ الصُّبْحِ»[1]

''کبھی کبھار میں رسول اللہ ﷺ کو وتر پڑھتے دیکھتا، جب کہ لوگ نمازِ فجر کے لیے کھڑے ہوگئے ہوتے۔''

عصر کے بعد قضائے فوائت وفرائض اور سنن راتبہ:

مستثنیٰ صورتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ نمازِ عصر کے بعد فوت شدہ نمازیں فرض ہوں یا عام، سبھی نمازیں ہوں یا پھر سننِ رواتب، ان کی قضا دی جاسکتی ہے، جیسا کہ نبیِ اکرم ﷺ سے یہ ثابت ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری ''بابَ ما صلّٰی بعد العصر من الفوائت و نحوها'' کے ترجمہ میں تعلیقاً اور مختصراً، اسی طرح ''باب إذا كُلِّمَ وهو يصلّي فَأَشَارَ بيده'' میں موصولاً اور تفصیلاً روایت ہے، جو بخاری شریف کے علاوہ صحیح مسلم، سنن ابی داود و دارمی اور معانی الآثار طحاوی میں بھی ہے۔ یہ حدیث تو طویل ہے، البتہ اس میں یہ بھی ہے کہ اُم المومنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو نمازِ عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھتے ہوئے دیکھا تو ایک لڑکی کو بھیجا کہ پوچھ کر آؤ کہ آپ ﷺ تو ان دو رکعتوں سے روکتے ہیں اور میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ ﷺ خود پڑھ رہے ہیں؟ اس لڑکی نے امُ المومنین رضی اللہ عنہا کا یہ پیغام آپ ﷺ کو نماز کے دوران ہی سُنا دیا تو آپ ﷺ نے اسے اپنے دستِ مبارک سے اشارہ کیا تو وہ پیچھے ہٹ گئی۔ جب آپ ﷺ نماز پڑھ چکے تو فرمایا:

«يَا بِنْتَ أَبِيْ أُمَيَّةَ! سَأَلْتِ عَنِ الرَّكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعَصْرِ وَإِنَّهٗ أَتَانِيْ نَاسٌ مِنْ

---

[1] حواله بالا، و الإرواء (٢/ ١٥٥)

عَبْدِ الْقَيْسِ فَشَغَلُونِي عَنِ الرَّكْعَتَيْنِ الَّتَيْنِ بَعْدَ الظُّهْرِ فَهُمَا هَاتَانِ»[1]

''اے ابو اُمیہ کی بیٹی! تم نے عصر کے بعد دو رکعتوں کے بارے میں پوچھا ہے۔ میرے پاس بنو عبد القیس کے کچھ لوگ آئے تھے تو انھوں نے مجھے ظہر کے بعد والی دو رکعتوں سے مشغول کر دیا تھا۔ یہ دو رکعتیں (جو میں نے اب پڑھی ہیں) وہی تھیں۔''

اس حدیث کا دوسرا طریق سنن نسائی اور مسند احمد میں ہے، جس کی سند کو بھی صحیح قرار دیا گیا ہے۔[2] اس طریقِ روایت میں بنو عبد القیس کے بجائے بنو تمیم ہے اور معانی الآثار طحاوی میں بھی بنو تمیم کی روایت ہے۔ حافظ عسقلانی رحمہ اللہ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ بنو عبد القیس ہی صحیح ہے اور بنو تمیم کی روایت غلط ہے۔[3]

اسی موضوع کی ایک حدیث صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی اور مسند احمد میں اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے، جس میں وہ بیان فرماتی ہیں:

«رَكْعَتَانِ لَمْ يَكُنْ يَدَعُهُمَا سِرًّا وَلَا عَلَانِيَةً رَكْعَتَانِ قَبْلَ صَلَاةِ الصُّبْحِ وَرَكْعَتَانِ بَعْدَ الْعَصْرِ»[4]

''دو رکعتیں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم درپردہ اور علانیہ کسی طرح بھی نہیں چھوڑا کرتے تھے۔ دو رکعتیں فجر کے فرضوں سے پہلے اور دو رکعتیں نمازِ عصر کے بعد۔''

بخاری شریف کی ایک روایت میں وہ فرماتی ہیں:

«وَكَانَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم يُصَلِّيهِمَا وَلَا يُصَلِّيهِمَا فِي الْمَسْجِدِ مَخَافَةَ أَنْ يُثَقِّلَ عَلٰى أُمَّتِهِ وَكَانَ يُحِبُّ مَا يُخَفِّفُ عَنْهُمْ»[5]

''نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے، مگر مسجد میں نہیں پڑھا کرتے تھے، تاکہ

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٦٣، ٣/ ١٠٥) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٦/ ١١٩۔ ١٢١) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١١٣٤) الإرواء (٢/ ١٨٧) صحيح الجامع (٣/ ٦/ ٦٨٦)

[2] إرواء الغليل (٢/ ١٨٨)

[3] فتح الباري (٣/ ١٠٦)

[4] صحيح البخاري (٢/ ٦٤) صحيح مسلم (٣/ ٦/ ١٢٢) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٦٢) الإرواء (٢/ ١٨٨۔ ١٨٩)

[5] حواله بالا

امت کے لیے بوجھ نہ بن جائیں اور آپ ﷺ اس چیز کو پسند فرماتے تھے، جو آپ ﷺ کی امت کے لیے ہلکی پھلکی ہو۔‘‘

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ عصر کے بعد فوت شدہ فرضی نمازوں اور سننِ راتبہ یعنی سنن موکدہ کی قضا دی جاسکتی ہے اور یہ عصر کے بعد والے وقتِ کراہت سے ایک مستثنیٰ صورت ہے۔

دوامِ عمل یکے از خصائصِ مصطفی ﷺ:

نبیِ اکرم ﷺ کی یہ دو سنتیں تو ایک بار قضا ہوئی تھیں، لیکن آپ ﷺ ان احادیث کی رو سے پھر ہمیشہ ہی دو رکعتیں عصر کے بعد پڑھا کرتے تھے، اگرچہ اس دن سے پہلے ایسا نہیں کیا کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا والی حدیث سے پتا چلتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جس دن نمازِ ظہر کی آخری دو سنتیں قضا ہوئی تھیں، اس دن تو آپ ﷺ نے ان کی قضا دی، پھر بعد میں کیوں پڑھا کرتے تھے؟ تو اس کا جواب صحیح مسلم میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں موجود ہے، جس میں وہ ارشاد فرماتی ہیں:

«كَانَ إِذَا صَلَّى صَلَاةً أَثْبَتَهَا»[1]

’’نبیِ اکرم ﷺ جب کوئی نماز پڑھتے تو پھر اس پر ہمیشگی اختیار کرتے تھے۔‘‘

گویا یہ آپ ﷺ کی عادت مبارکہ اور آپ ﷺ کے خصائص میں سے تھا۔ امام نووی رحمہ اللہ نے شرح صحیح مسلم میں لکھا ہے کہ بعد کی سنتوں کو ادا کرنے پر دوام اور ہمیشگی تو آپ ﷺ کے خصائص میں سے ہے۔ البتہ ایسی موکدہ سنتوں کی اوقاتِ کراہت میں قضا کو آپ ﷺ نے خصائص میں سے نہیں بتایا، بلکہ آپ ﷺ نے یہ بیان فرمایا کہ یہ ظہر کی دو سنتیں ہیں اور یہ نہیں فرمایا کہ یہ فعل صرف میرے ہی ساتھ خاص ہے اور آپ ﷺ کا سکوت فرمانا جوازِ اقتدا کی اظہر دلیل ہے۔[2]

حافظ ابن حجر نے ’’فتح الباري‘‘ میں لکھا ہے کہ ان احادیث کی بنا پر اہلِ علم کے تین مختلف نظریات ہیں:

① اوقاتِ مکروہہ میں فوت شدہ نمازوں کی قضا دی جاسکتی ہے۔

---

[1] صحيح مسلم (٣/ ٦/ ١٢٢) صحيح الجامع (٢/ ٤/ ٢٢٥)

[2] شرح صحيح مسلم للنووي (٣/ ٦/ ١٢١)

② یہ فعل نبیِ اکرم ﷺ کے خصائص میں سے ہے۔
③ جس شخص کے ساتھ ایسا ہی واقعہ پیش آ جائے، جیسا کہ آپ ﷺ کو پیش آیا تھا تو یہ اسی کے ساتھ خاص ہے۔[1]

ایک دوسرے مقام "باب ما یصلیٰ بعد العصر من الفوائت ونحوھا" میں وارد شدہ احادیثِ بخاری کی شرح میں لکھا ہے کہ ان احادیث کو ان علما نے بھی بنیاد بنایا ہے، جو کہتے ہیں کہ نمازِ عصر کے بعد مطلقاً نوافل جائز ہیں، جب تک کہ غروبِ آفتاب کے وقت نماز کا قصد نہ ہو (اور ہم اس سند میں مختلف مذاہب نقل کر چکے ہیں) اور جن کے نزدیک اس وقت مطلقاً نوافل مکروہ ہیں، انھوں نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ آپ ﷺ کا یہ فعلِ گرامی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اگر سنن موکدہ میں سے کوئی چیز رہ جائے تو اسے بلا کراہت ان اوقات مکروہہ میں قضا کیا جاسکتا ہے۔ رہا آپ ﷺ کا ان دو رکعتوں پر ہمیشگی کرنا تو یہ آپ ﷺ کے خصائص میں سے ہے۔ جیسا کہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث ((كَانَ إِذَا صَلَّى صَلَاةً أَثْبَتَهَا)) سے پتا چلتا ہے۔

امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان دو رکعتوں کے عصر کے بعد ادا کرنے پر ہمیشگی کرنا تو یہ آپ ﷺ کے خصائص میں سے تھا نہ کہ اصل قضا کرنا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے آزاد کردہ غلام حضرت ذکوان نے جو روایت بیان کی ہے (جو مسند احمد اور معانی الآثار طحاوی میں مروی ہے) کہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے نبیِ اکرم ﷺ سے پوچھا:

((أَنَقْضِيهِمَا إِذَا فَاتَتَا؟))

"(اگر کبھی) ہم سے بھی یہ دو سنتیں رہ جائیں تو کیا ہم بھی ان کی قضا دیں؟"

تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((لَا)) "نہیں۔"

یہ روایت ضعیف ہے، جس سے حجت قائم نہیں ہوتی۔ امام بیہقی رحمہ اللہ کا یہ کلام نقل کرنے کے بعد حافظ عسقلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ طحاوی رحمہ اللہ نے یہ روایت بیان کی ہے اور اس سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ یہ (دو سنتیں قضا کرنا) آپ ﷺ کے خصائص میں سے تھا، لیکن اس پر کلام کیا گیا ہے۔[2]

---

[1] فتح الباري (٣/ ٦/ ١٢١)

[2] فتح الباري (٢/ ٦٤۔ ٦٥)

تحقیقِ روایت:

امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس روایت کو نقل کر کے ضعیف اور نا قابلِ حجت قرار دیا ہے اور امام طحاوی کی تخریج کا حوالہ دے کر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے بھی اس روایت سے استدلال کے ضُعف پر اشارتاً کلام کیا ہے۔ وہ روایت نہ صرف یہ کہ معانی الآثار طحاوی میں ہے، بلکہ صحیح ابن حبان (۶۲۳۔ الموارد) سے اس کا ضُعف واضح کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ اس میں اُم المومنین حضرت اُمِّ سلمہ اور حضرت ذکوان کے مابین انقطاع پایا جاتا ہے اور دوسرے یہ کہ اس کے ایک راوی حماد سے آگے بیان کیا ہے۔ لہٰذا یہ الفاظ شاذ ہیں۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ حدیث سنن نسائی اور مسند احمد میں کئی طُرق سے حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے، لیکن ان میں سے کسی میں بھی یہ اضافی الفاظ نہیں ہیں۔[1]

ان الفاظ پر مشتمل حدیث کو علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے منکر قرار دیا ہے، کیوں کہ ان کے بقول حماد بن سلمہ کی کتب میں یہ حدیث موجود ہی نہیں ہے، نیز یہ منقطع بھی ہے اور ذکوان نے اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے نہیں سنا، پھر انھوں نے آگے اس کی دلیل بھی ذکر کی ہے۔[2]

علامہ ابن باز کی نگرانی میں فتح الباری کی جو تحقیق شائع ہوئی ہے، اس میں لکھا ہے کہ امام بیہقی رحمہ اللہ نے حضرت ذکوان والی حدیث کو ضعیف کہا ہے (جسے حافظ عسقلانی اور علامہ البانی نے بھی ضعیف قرار دیا ہے) وہ ایسے (ضعیف) نہیں ہے، بلکہ اس کی سند حسن درجے کی ہے۔[3]

فتح الباری کی اس تحقیق میں جو بات کہی گئی ہے، اس کی کچھ تائید سنن ابو داود کی ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں حضرت ذکوان ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے ان سے کہا:

«إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يُصَلِّي بَعْدَ الْعَصْرِ، وَيَنْهٰى عَنْهَا، وَيُوَاصِلُ وَيَنْهٰى عَنِ الْوِصَالِ»[4]

---

[1] إرواء الغليل (٢/ ١٨٨)

[2] المحلى (٢/ ٢٧١)

[3] تحقيق فتح الباري (٢/ ٦٥)

[4] دیکھیں: الإرواء (٢/ ١٨٩)

”نبیِ اکرم ﷺ نمازِ عصر کے بعد خود تو (یہ دو رکعتیں) پڑھا کرتے تھے، لیکن دوسروں کو اس سے روکتے تھے اور آپ ﷺ (افطاری ترک کر کے روزوں کے مابین) وصال کیا کرتے تھے، لیکن دوسروں کو وصال کرنے سے روکتے تھے۔“

اس حدیث کی سند کے تمام راوی تو ثقہ ہیں، لیکن محمد بن اسحاق مدلّس ہیں اور انھوں نے عنعنہ سے یہ روایت بیان کی ہے۔[1]

اگر کوئی مدلّس راوی عنعنہ سے روایت بیان کرے تو محدّثین اسے ضعیف شمار کرتے ہیں اور اگر وہ تحدیث کی صراحت کر دے تو پھر تدلیس کی وجہ سے پیدا شدہ ضعف ختم ہوتا ہے، لیکن اس حدیث میں ایسا نہیں ہے، بلکہ حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا کو منکر کہا گیا ہے، کیوں کہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحیح سند کے ساتھ مسند احمد (۶/ ۱۳۵) میں مروی ہے کہ جب ان سے عصر کے بعد نماز پڑھنے کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے اس کی اجازت دی۔ نیز صحیح بخاری میں یہ ثابت ہے کہ وہ خود عصر کے بعد نماز پڑھا کرتی تھیں۔

یہ امور اس بات کی دلیل ہیں کہ ابن اسحاق والی اس روایت میں خطا اور نکارت پائی جاتی ہے۔ یہ تو عصر کے بعد نماز پڑھنے کی نسبت سے ہے، البتہ اسی حدیث کا دوسرا حصہ جو روزوں میں وصال کرنے کی ممانعت کے بارے میں ہے تو وہ صحیحین میں متعدد صحابہ کرام سے مروی احادیث سے ثابت ہے اور جہاں تک عصر کے بعد نماز کا تعلق ہے تو اس کی ممانعت اس سے ثابت نہیں ہوتی، کیوں کہ یہ منکر اور ناقابلِ حجت ہے، پھر یہ حدیث بتاتی ہے کہ خود نبیِ اکرم ﷺ کے عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھنے کے بعد یہ ممانعت صادر ہوئی، جب کہ حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی وفد بنی عبد القیس والی صحیحین کی سابق میں ذکر کردہ حدیث سے پتا چلتا ہے کہ ممانعت کا صدور پہلے سے تھا اور آپ ﷺ نے وہ دو رکعتیں اس کے بعد پڑھی تھیں۔

اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ عصر کے بعد ظہر کی دو رکعتوں کی قضا کا حکم منسوخ بھی نہیں ہوا ہے۔ ”إعلام أهل العصر بأحكام ركعتي الفجر“ میں علامہ شمس الحق عظیم آبادی نے ان احادیث کے ضعف و انکار کے علاوہ بعض دیگر اسباب و علل بھی ذکر کیے ہیں۔

---

[1] حوالہ سابقہ و نیل الأوطار (۲/ ۳/ ۹۲)

مختصر یہ کہ نماز عصر کے بعد فوت شدہ نماز کی قضا کی مشروعیت واضح ہے اور از روے دلیل یہی راجح ہے اور خصائص کے ساتھ مربوط کرنے والی مذکورہ دونوں روایات منکر ہیں۔[1]

عدمِ اطلاق:

یہاں یہ بات بھی ذکر کرتے جائیں کہ جن احادیث میں عصر کے بعد نماز کی ممانعت آئی ہے، وہاں بعض محققین کے نزدیک مطلق ممانعت مراد نہیں، بلکہ وہاں سورج کے زرد پڑ جانے اور غروب ہونے کے قریب ہونے کے اوقات کی ممانعت مراد ہے، اس قید کا پتا بھی بعض صحیح احادیث اور آثارِ صحابہ سے چلتا ہے، جیسا کہ سنن ابو داود و نسائی، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ، مسند احمد و طیالسی، منتقی ابن جارود، الاحادیث المختار للضیاء المقدسی، مسند ابی یعلی، سنن کبریٰ بیہقی، مصنف ابن ابی شیبہ اور محلی ابن حزم میں صحیح وقوی سند کے ساتھ امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«نَهٰى عَنِ الصَّلَاةَ بَعْدَ الْعَصْرِ إِلَّا وَالشَّمْسُ (بَيْضَآءُ) مُرْتَفِعَةٌ»[2]

''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کے بعد (نفل) پڑھنے سے منع فرمایا، سوائے اس کے کہ جب تک سورج سفید اور کافی بلند ہو، یعنی ابھی زردی مائل نہ ہوا ہو تو اس وقت تک گنجایش ہے۔''

اس حدیث کو ''المحلی'' میں علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے، ''طرح التثریب'' میں حافظ عراقی رحمہ اللہ نے اور ''فتح الباري'' میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے صحیح قرار دیا ہے۔[3]

ایسے ہی اس حدیث کا ایک دوسرا طریق بھی ہے جو مسند احمد، صحیح ابن خزیمہ (۲/ ۲۶۵۔ تحقیق عظمی) اور مسند ابی یعلی میں ہے، جس کی سند کو بعض کبار محدّثین نے جید قرار دیا ہے۔ اس سے بھی پہلے طریق کو قوت ملتی ہے۔ اس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث نبوی کے الفاظ یہ ہیں:

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة (۲/ ۳۵۱۔ ۳۵۲) اس میں حافظ ابن حزم، ابن حجر اور شوکانی کے کلام پر نقد کیا گیا ہے۔

[2] صحيح ابن حبان (الموارد) بحواله السلسلة الصحيحة (۱/ ۳۴۱) فتح الباري (۲/ ۶۱۔ ۶۳) الإرواء (۲/ ۲۳۷) صحيح ابن خزيمة (۲/ ۲۶۵) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (۱۱۳۵) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (۵۵۸)

[3] السلسلة الصحيحة (۱/ ۳۴۴)

«لَا تُصَلُّوا بَعْدَ الْعَصْرِ إِلَّا أَنْ تُصَلُّوا وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ»[1]

''عصر کے بعد نماز نہ پڑھو، سوائے اس کے کہ سورج ابھی بلند ہو، یعنی زرد نہ ہوا ہو۔''

اس حدیث کی شاہد ایک دوسری حدیث بھی ہے، جو مسند ابی یعلیٰ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس کی سند کو حسن قرار دیا گیا ہے۔ اس میں ارشادِ نبوی ہے:

«لَا تُصَلُّوا عِنْدَ طُلُوعِ الشَّمْسِ، وَلَا عِنْدَ غُرُوبِهَا فَإِنَّهَا تَطْلُعُ وَتَغْرُبُ عَلٰى قَرْنِ شَيْطَانٍ، وَصَلُّوا بَيْنَ ذٰلِكَ مَا شِئْتُمْ»[2]

''سورج کے طلوع ہوتے وقت اور اس کے غروب ہوتے وقت نماز مت پڑھو، کیوں کہ سورج شیطان کے سینگوں پر طلوع ہوتا اور غروب ہوتا ہے اور اس کے مابین جو چاہو پڑھو۔''

سورج کے شیطان کے سینگوں پر طلوع یا غروب ہونے سے کیا مراد ہے۔ اس سلسلے میں اہلِ علم نے کافی کچھ کہا ہے، مختصر یہ کہ ان اوقات میں شیطان اپنے سینگ افق کے اس مقام پر سورج کے سامنے کر دیتا ہے، جہاں اس کے غروب یا طلوع ہو جانے کا مقام ہے اور سورج کی پرستش کرنے والے چونکہ اس وقت سورج کی پوجا کرتے اور اسے سجدہ کرتے ہیں تو شیطان یہ باور کراتا ہے کہ یہ لوگ مجھے سجدہ کر رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ عین طلوع و غروب کے وقت نماز پڑھنے سے منع کیا گیا ہے، تاکہ سورج پرستوں سے مشابہت نہ ہونے پائے اور شیطان کی ہوا نہ بندھے۔ یہ وجہ احادیث میں بھی مذکور ہے، جو آگے چل کر آئے گی۔ البتہ مجبوری کی شکل اس سے مستثنیٰ ہے، جس کی تفصیل بھی آگے چل کر آئے گی۔ طلوع و غروب جیسا معاملہ تب بھی ہے، جب سورج عین سر پر ہو۔

بہرحال جو احادیث ابھی ہم نے ذکر کی ہیں، ان سے معلوم ہوا کہ عصر کے بعد نماز کی ممانعت والی احادیث مطلق ہیں اور ان احادیث سے ان کی تقیید ہو جاتی ہے، جن میں عصر سے لے کر غروب تک نماز کی ممانعت آئی ہے، انھیں سورج کے زرد پڑ جانے سے لے کر اس کے غروب ہونے تک کے وقت پر محمول کرنا پڑے گا۔

حافظ عراقی رحمہ اللہ کے بقول حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہی مسلک تھا کہ سورج کے زرد

---

[1] السلسلة الصحيحة (١/ ٣٤٤) صحيح ابن خزيمة (٢/ ٢٦٥)

[2] السلسلة الصحيحة (١/ ٥٦)

پڑ جانے تک نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے بھی یہی مسلک اختیار کیا ہے اور دیگر محدّثین میں سے امام ابن خزیمہ رحمہ اللہ کا بھی اختیار یہی ہے، جیسا کہ ان کی تبویب (۲/ ۲۶۵) سے ظاہر ہے۔ دورِ حاضر کے معروف محدث علامہ البانی نے بھی اس اس کی تائید کی ہے۔[1]

اس مسلک کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ سے ثابت ہے کہ وہ نمازِ عصر کے بعد دو رکعات پڑھا کرتے تھے، حتیٰ کہ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ نے ''المحلی'' میں چاروں خلفائے راشدین اور متعدد کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے اسمائے گرامی ذکر کیے ہیں، جو عصر کے بعد دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ جسے تفصیل مطلوب ہو، وہ محلی ابن حزم دیکھ سکتا ہے۔[2]

یہ تو عصر کے بعد دو رکعتوں سے متعلق ہوا، جب کہ موذنِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے ''المحلّٰی'' ہی میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

''لَمْ يُنْهَ عَنِ الصَّلَاةِ إِلَّا عِنْدَ غُرُوْبِ الشَّمْسِ''[3]

''عصر کے بعد نماز سے منع نہیں کیا گیا، سوائے غروب آفتاب کے قریبی وقت کے۔''

حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے مروی اس اثر سے اصل موضوع کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

عصر کے بعد سے مراد:

اس اطلاق و تقیید کی بحث سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ نمازِ عصر کے بعد والی ممانعت مطلق نہیں ہے، بلکہ سورج کے بلند نہ ہونے یا زرد ہو جانے سے مقید ہے، جیسا کہ بعض کبار ائمہ کا مسلک ہے۔

ہاں اگر اسے معروف فقہی مسلک کے مطابق مطلقاً ممنوع ہی مان لیا جائے کہ عصر کے بعد نوافل وغیرہ مطلقاً منع ہیں، سورج بلند ہو یا زرد ہو چکا ہو تو اس اطلاق و عموم کی صورت میں اس ممانعت کا تعلق نمازِ عصر ادا کرنے سے ہوگا نہ کہ دخولِ وقت سے، کیوں کہ فجر کے ساتھ تعلق رکھنے والی ممانعت کو دخولِ وقت سے متعلق قرار دیا گیا ہے کہ طلوعِ فجر کے بعد نفلی نماز منع ہے۔ سوائے دو سنتوں

---

[1] السلسلة الصحيحة (١/ ٣٤٤ـ ٥٦١)

[2] المحلیّ (٣/ ٢ـ ٧)

[3] المحلّی (٣/ ٤)

کے، لیکن عصر کے سلسلے میں اہلِ علم نے وضاحت کی ہے کہ اس کا تعلق وقت کے داخل ہو جانے سے نہیں، بلکہ نمازِ عصر کے ادا کر لینے سے ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کسی شخص نے ابھی عصر کی نماز نہیں پڑھی، اگرچہ عصر کا وقت کب سے ہو چکا ہے تو وہ شخص تحیۃ الوضو، تحیۃ المسجد یا عام نوافل پڑھ سکتا ہے اور جب وہ عصر پڑھ لے گا تو پھر اس کے لیے نوافل کی ممانعت ہوگی۔ اس طرح فجر اور عصر سے متعلقہ ممانعت کے مابین فرق ہوگیا۔ عصر سے متعلقہ ممانعت نماز کے ساتھ خاص ہونے کے بارے میں امام ابن قدامہ رحمہ اللہ ''المغني'' میں لکھتے ہیں کہ اہلِ علم مطلقاً نمازِ عصر کے بعد نوافل کی ممانعت کے قائل ہیں۔ اس سلسلے میں علما کا کوئی اختلاف ہمارے علم میں نہیں ہے۔[1]

اس کا معنیٰ یہ ہوا کہ امام ابن قدامہ رحمہ اللہ کے نزدیک تمام علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اطلاق ممانعت کی شکل میں اس کا حکم نماز ادا کرنے کے بعد سے تعلق رکھتا ہے۔ محض عصر کا وقت ہو جانے سے نہیں۔

نمازِ طواف:

انہی مستثنیٰ نمازوں میں سے طواف بیت اللہ کے بعد پڑھی جانے والی دو رکعتیں، یعنی نمازِ طواف بھی ہے، جسے ان ممنوع اوقات میں بھی پڑھا جا سکتا ہے، کیوں کہ سننِ اربعہ، صحیح ابن حبان، مستدرک حاکم اور مسند احمد میں حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متولیانِ کعبہ بنی عبدِ مناف سے مخاطب ہو کر فرمایا:

«يَا بَنِيْ عَبْدِ مَنَافٍ! لَا تَمْنَعُوْا أَحَداً طَافَ بِهٰذَا الْبَيْتِ وَصَلّٰى أَيَّةَ سَاعَةٍ شَآءَ مِنْ لَّيْلٍ أَوْ نَهَارٍ»[2]

''اے بنی عبدِ مناف! کسی ایسے شخص کو مت روکو، جو بیت اللہ کا طواف کرے یا نماز پڑھے، دن کا وقت ہو یا رات کا۔''

---

[1] المغني (٢/ ١٦) تحقيق محمد خليل هراس، طبع مصر.

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٦٦٨) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (٦٨٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٧٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٥٤) صحيح ابن حبان (الموارد)، رقم الحديث (٦٢٦) صحيح الجامع (٣/ ٦/ ٢٨٦)

سوئے رہ جانے یا بھول جانے والے کی نماز:

یہی معاملہ اس شخص کا بھی ہے، جو سویا رہ جائے یا اسے سرے سے نماز بھول جائے اور یاد نہ رہے کہ اس نے فلاں نماز ابھی ادا ہی نہیں کی۔ ایسا شخص ان تمام اوقاتِ مکروہہ میں بھی نماز پڑھ سکتا ہے۔ جیسا کہ نبیِ اکرم ﷺ کے ارشادات سے پتا چلتا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، صحیح ابن حبان، سنن اربعہ، دارمی، بیہقی، مصنف ابن ابی شیبہ، مسند احمد اور معانی الاثار طحاوی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ نَسِيَ صَلَاةً فَلْيُصَلِّ إِذَا ذَكَرَهَا، لَا كَفَّارَةَ لَهَا إِلَّا ذٰلِكَ»

''جو شخص کوئی نماز بھول جائے تو اس کا کفارہ یہی ہے کہ یاد آتے ہی اسے پڑھ لے۔''

آخر میں ہے کہ آپ ﷺ نے سورت طٰہٰ (آیت:۱۴) کی تلاوت کی، جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ﴾ ''اور نماز قائم کر میرے ذکر کے لیے۔''[1]

یہ بخاری شریف کے الفاظ ہیں، جب کہ مسلم شریف میں ہے:

«إِذَا رَقَدَ أَحَدُكُمْ عَنِ الصَّلَاةِ أَوْ غَفَلَ عَنْهَا فَلْيُصَلِّهَا إِذَا ذَكَرَهَا، فَإِنَّ اللّٰهَ يَقُوْلُ: ﴿وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ﴾»[2]

''اگر تم میں سے کوئی نماز سے سویا رہ جائے یا اس سے غافل رہے تو یاد آتے ہی اسے پڑھ لے۔ ارشادِ الٰہی ہے: میرے ذکر کے لیے نماز قائم کرو۔''

صحیح مسلم ہی کی ایک روایت میں ہے:

«مَنْ نَسِيَ صَلَاةً أَوْ نَامَ عَنْهَا، فَكَفَّارَتُهَا أَنْ يُّصَلِّيَهَا إِذَا ذَكَرَهَا»

''جو شخص کوئی نماز بھول جائے یا اس سے سویا رہ جائے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ یاد آتے ہی اسے پڑھ لے۔''

اس بات پر اہلِ علم میں اختلافِ رائے ہے کہ قرآن کریم کی آیت کے مذکورہ بالا الفاظ خود نبیِ اکرم ﷺ پڑھے تھے یا حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت بیان کرنے والے راوی حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہے ہیں؟

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٥١٧)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٩٣)

صحیح بخاری کے الفاظ میں تو اس کی صراحت نہیں، البتہ صحیح مسلم کی ایک روایت میں یہ الفاظ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہیں، جب کہ ہم نے جو پہلی روایت ذکر کی ہے، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ الفاظ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے تلاوت فرمائے تھے۔ راوی کی طرف سے نہیں ہیں۔

بخاری شریف والی حدیث کے ترجمہ میں مَیں نے ان الفاظ کو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اسی بنا پر منسوب کیا ہے اور صحیح مسلم والی روایت کو "فتح الباري" میں نقل کر کے حافظ عسقلانی رحمہ اللہ نے بھی یہی رائے اختیار کی ہے کہ ظاہر بات یہی ہے کہ یہ سارے الفاظ (بہ شمول الفاظِ آیت) نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک ہی سے صادر شدہ ہیں۔[1]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی اس حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ یہی مفہوم اس واقعہ کے بارے میں مروی حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے آخری الفاظ میں بھی ہے، جس میں مذکور ہے کہ غزوہ خیبر سے واپسی پر راستے میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور پورا اسلامی لشکر نمازِ فجر سے سویا رہ گیا، حتیٰ کہ سورج کی گرمی نے انھیں اُٹھایا، پھر وہاں سے تھوڑا آگے جا کر باجماعت نماز ادا کی گئی اور جب نماز ادا کر لی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ نَسِيَ الصَّلَاةَ فَلْيُصَلِّهَا إِذَا ذَكَرَهَا، فَإِنَّ اللّٰهَ تَعَالَىٰ قَالَ: أَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِيْ»

معنیٰ اس حدیث کا بھی وہی ہے جو پہلی حدیثِ انس رضی اللہ عنہ کا ہے۔ یہ حدیث و واقعہ صحیح مسلم، سنن ابو داود، ترمذی، نسائی، بیہقی، ابن ماجہ اور صحیح ابوعوانہ میں ہے اور امام مالک نے اسے موطا میں سعید بن مسیّب رحمہ اللہ سے مرسلاً روایت کیا ہے، جب کہ یہ صحیح یہ ہے کہ یہ موصول حدیث ہے۔[2]

مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت ابو جحیفہ رضی اللہ عنہ سے بھی صحیح سند سے یہی واقعہ مروی ہے، مگر انتہائی اختصار کے ساتھ ہے اور اس کے آخر میں ارشاد نبوی کے الفاظ ہیں:

"جو شخص نماز سے سویا رہ جائے یا بھول ہی جائے تو وہ یاد آنے پر پڑھ لے یا جب سو کر اٹھے تو پڑھ لے۔"

ایسا ہی واقعہ سنن ابی داود، مسند طیالسی، مسند احمد اور مصنف ابن ابی شیبہ میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے، جس میں غزوہ حدیبیہ مذکور ہے اور اس کے آخر میں ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[1] فتح الباري (۲/ ۷۲)

[2] إرواء الغليل (۱/ ۲۹۲)

«وَافْعَلُوْا كَمَا كُنْتُمْ تَفْعَلُوْنَ، قَالَ كَذٰلِكَ لِمَنْ نَّامَ أَوْ نَسِيَ»[1]

''(اب بھی) اسی طرح کرو، جس طرح تم کیا کرتے ہو اور فرمایا: اسی طرح ہے، جب کوئی سو جائے یا بھول جائے۔''

اس حدیث میں آپ ﷺ نے وضاحت فرما دی ہے کہ ایسی حالت میں بھی نماز ادا کرنے کا طریقہ وہی ہوگا، جو معمول کے مطابق ہوتا ہے، یعنی اگرچہ اصل وقت گزر چکا تھا، اس کے باوجود آپ ﷺ نے باقاعدہ اقامت و جماعت کے ساتھ نماز ادا فرمائی، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث والے واقعے کی جزئیات میں بھی یہ بات مذکور ہے۔

اس ساری تفصیل سے معلوم ہوا کہ بھول جانے یا سو جانے کی شکل میں یاد آنے یا جاگ جانے پر جو بھی وقت ہو، اسی وقت نماز ادا کی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے کوئی وقتِ کراہت مانع نہیں ہے، وہ عصر کے بعد سے غروبِ آفتاب تک کے درمیان میں ہو یا فجر کے بعد سے طلوعِ آفتاب تک کا وقت ہے۔ احناف کے سوا جمہور علما کا یہی مسلک ہے کہ ان اوقات میں بھی فوت شدہ نمازوں کی قضا جائز ہے۔ البتہ عام نوافل پڑھنا مکروہ ہے۔ جب کہ احناف کا کہنا ہے کہ اوقاتِ مکروہہ میں جا گنے یا بھولی نماز یاد آنے پر کچھ انتظار کرنے کے بعد نماز پڑھے، جب وقتِ کراہت گزر چکا ہو، لیکن نبیِ اکرم ﷺ کے عصر کے بعد ظہر کی آخری دو سنتیں پڑھنے اور دیگر احادیث سے جمہور ہی کی تائید ہوتی ہے۔

طلوعِ اور استواے اور غروب کا وقت:

اوقاتِ مکروہہ میں سے دو کا ذکر ہو چکا ہے اور اب آیئے بقیہ تین اوقاتِ مکروہہ کی طرف، جو طلوعِ آفتاب، غروبِ آفتاب اور استوا یعنی زوال یا سورج کے عین سر پر ہونے کے اوقات ہیں۔ ان اوقات میں بھی نماز پڑھنا مکروہ ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم و ابی عوانہ، سنن بیہقی، طیالسی، مسند احمد اور سنن اربعہ میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا:

«ثَلَاثُ سَاعَاءٍ، نَهَانَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ أَنْ نُّصَلِّيْ فِيْهَا، وَأَنْ نَّقْبُرَ فِيْهِنَّ مَوْتَانَا، حِيْنَ تَطْلُعُ الشَّمْسُ بَازِغَةً حَتّٰى تَرْتَفِعَ، وَحِيْنَ يَقُوْمُ الظَّهِيْرَةُ

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٣٠) الإرواء (١/ ٢٩٣)

حَتّٰی تَمِیْلَ الشَّمْسُ، وَحِیْنَ تُضَیِّفُ لِلْغُرُوْبِ حَتّٰی تَغْرُبَ» [1]

''تین اوقات ایسے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ہمیں ان میں نماز پڑھنے اور مردوں کو دفن کرنے سے منع فرمایا ہے، جب سورج صاف نکل رہا ہو، جب تک کہ وہ چڑھ نہ آئے (یعنی کچھ بلند نہ ہو جائے) اور جب دوپہر کے وقت عین سر پر ہو، یہاں تک کہ سر سے ڈھل نہ جائے اور جب سورج غروب ہو رہا ہو، یہاں تک کہ غروب نہ ہو جائے۔''

نمازِ جنازہ اور تدفین کی کراہت:

ان تین اوقات میں نمازوں کی ممانعت کے علاوہ نبیِ اکرم ﷺ نے فوت شدگان کو دفن کرنے کی بھی ممانعت کر دی ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ ''شرح صحیح مسلم'' میں لکھتے ہیں کہ بعض علما کا کہنا ہے کہ «اَنْ نَّقْبُرَ مَوْتَانَا» سے مراد دفن کرنا نہیں، بلکہ اس سے مراد نمازِ جنازہ ہے، لیکن ان کا یہ قول ضعیف ہے، کیوں کہ ان اوقات میں نمازِ جنازہ کے مکروہ نہ ہونے پر اجماعِ امت ہے، لہٰذا کسی حدیث کی ایسی تشریح و مراد بیان کرنا، جو اجماع کے خلاف ہو، جائز نہیں ہے، بلکہ صحیح یہی ہے کہ اس سے مراد جان بوجھ کر تاخیر کر کے مردے کو ان اوقات میں دفن کرنا ہے۔ ہاں اگر بلا ارادہ اتفاق سے کسی کو ایسے وقت میں دفن کر دیا جائے، تو پھر یہ مکروہ نہیں ہے۔ [2]

امام نووی رحمہ اللہ نے یہاں جو قید لگائی ہے کہ اگر جان بوجھ کر ایسا نہ کیا جائے، بلکہ اتفاق سے ہی ایسا ہو جائے تو مکروہ نہیں ہے۔ موصوف کے اس قید لگانے کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ حدیث مطلق ہے اور اس کا حکم بھی مطلق ہی رہے گا کہ جان بوجھ کر یا بلا ارادہ کسی بھی صورت میں ان اوقات میں تدفین ممنوع ہے، لہٰذا واجب ہے کہ ان اوقات کو گزار کر تدفین عمل میں لائی جائے، البتہ اگر لاش کے کسی وجہ سے پھٹنے یا خراب ہونے کا خطرہ ہو تو پھر یہ جائز ہوگا کہ وقتِ کراہت ہی

---

[1] صحیح مسلم مع شرح النووي (۳/ ٦/ ١١٤) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (۲۷۳۳) صحیح سنن الترمذي، رقم الحدیث (۸۲۲) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (٥٥١) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١٥١٩) فقه السنة (١/ ١٠٦۔ ٥٤٤) أحكام الجنائز (ص: ١٢٠)

[2] شرح صحیح مسلم (۳/ ٦/ ١١٤) مختصراً

میں تدفین عمل میں لائی جائے۔[1]

امام نووی رحمہ اللہ نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان اوقات میں نماز کے جواز پر اجماع ہے، ان کا یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں، کیوں کہ یہ ایک معروف اختلافی مسئلہ ہے۔ بلکہ بعض کبار محدّثین نے حضرت عقبہ رضی اللہ عنہ والی اسی اوقات مکروہہ والی حدیث کے عموم سے ان اوقات میں نمازِ جنازہ پڑھنے کے بھی مکروہ ہونے پر استدلال کیا ہے اور اس حدیث سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی یہی بات سمجھی تھی، یہی وجہ ہے کہ بعض آثارِ صحابہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ اوقاتِ مکروہہ میں نمازِ جنازہ نہیں پڑھتے تھے۔ جیسا کہ موطا امام مالک اور سنن کبری بیہقی میں روایت ہے کہ زینب بنت ابی سلمہ رضی اللہ عنہا فوت ہوگئیں، جب کہ مدینہ طیبہ کے گورنر طارق تھے، جنازہ، نمازِ فجر کے بعد لایا گیا اور بقیع میں رکھ دیا گیا۔ طارق نماز کو (غلس) اندھیرے میں پڑھا کرتے تھے۔ محمد بن ابو حرملہ راویِ حدیث بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

”إِمَّا أَنْ تُصَلُّوا عَلٰى جَنَازَتِكُمُ الْآنَ، وَإِمَّا أَنْ تَتْرُكُوهَا حَتّٰى تَرْتَفِعَ الشَّمْسُ“[2]

”یا تو اپنے جنازے پر ابھی نماز پڑھ لو یا پھر سورج چڑھ آنے تک جنازہ پڑا رہنے دو۔“

امام مالک رحمہ اللہ ہی نے موطا میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ اثر بھی روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا:

«يُصَلّٰى عَلَى الْجَنَازَةِ بَعْدَ الْعَصْرِ وَبَعْدَ الصُّبْحِ إِذَا صُلِّيَتَا لِوَقْتَيْهِمَا»[3]

”نمازِ فجر و عصر کے بعد نمازِ جنازہ صرف اسی شکل میں پڑھی جاسکتی ہے، جب کہ ان نمازوں کو ان کے اوّل اوقات میں پڑھا جائے۔“

اگر یہ نمازیں اپنے اصل اول وقت سے کچھ موخر کر کے وقتِ اختیار میں پڑھی جائیں اور سورج کی روشنی اور سہ پہر کی زردی پھیل جائے تو پھر ان کے بعد نمازِ جنازہ ٹھیک نہیں، بلکہ اسے مکروہ سمجھا گیا ہے۔ ہاں اگر اول وقت میں پڑھی گئی ہو تو فوراً بعد میں ممکن ہے، جیسا کہ پہلے اثر میں وضاحت

---

[1] محلی ابن حزم (٥/ ١١٤۔ ١١٥) تمام المنة (ص: ١٤٣) أحكام الجنائز (ص: ١٣٤)

[2] تنوير الحوالك (١/ ١/ ٢٢٨) وقال الألباني: و سنده صحيح على شرط الشيخين. (أحكام الجنائز، ص: ١٣١)

[3] موطأ الإمام مالك (١/ ٢٢٩) رقم الحديث (٢١)

ہے کر یا تو منہ اندھیرے (غلس میں) پڑھ لو یا پھر سورج نکلنے دو۔ اس سے بھی زیادہ واضح طور پر یہ بات سنن کبریٰ بیہقی میں مروی ایک دوسرے اثر میں ہے، جس میں حضرت جریج بیان کرتے ہیں کہ حضرت زیاد رحمہ اللہ نے انھیں بتایا کہ انھیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ اہلِ بصرہ کے قبرستان میں جنازہ لاکر رکھا گیا۔ جب کہ (عصر کے بعد) سورج زرد پڑ چکا تھا تو انھوں نے اس پر نمازِ جنازہ نہیں پڑھی، یہاں تک کہ سورج غروب ہوگیا، تب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے منادی کرنے والے کو حکم دیا کہ لوگوں میں منادی کر دو (اذان کہہ دو) پھر انھوں نے نمازِ مغرب کی جماعت کرائی، جب کہ اس جماعت میں حضرت انس بن مالک اور دوسرے حضرت ابو برزہ انصاری رضی اللہ عنہما صحابیِ رسول موجود تھے، پھر نمازِ مغرب کے بعد انھوں نے نمازِ جنازہ پڑھی۔[1]

غرض کہ امام خطابی رحمہ اللہ "معالم السنن" (٤/ ٣٢٧) میں لکھتے ہیں کہ ان تینوں اوقات میں نمازِ جنازہ پڑھنے اور مردے کو دفن کرنے کے جواز میں اختلاف ہے۔ اکثر اہلِ علم ہی امام عطاء، ابراہیم نخعی، اوزاعی، سفیان ثوری، اصحابِ رائے یعنی فقہاے احناف اور اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ اسے مکروہ قرار دیتے ہیں۔ البتہ امام شافعی رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ جنازہ و تدفین دن یا رات کے کسی بھی وقت ہوں، بلا کراہت جائز ہیں، لیکن اوّل الذکر جماعتِ علما والا کراہت کا قول ہی حدیث کے موافق ہونے کی وجہ سے اولیٰ ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان اوقاتِ مکروہہ میں نمازِ جنازہ پڑھنا اور مردے کو دفن کرنا، اکثر کے نزدیک مکروہ ہے اور یہی قول اقرب الی السنۃ ہے۔

امام ابو حنیفہ، شافعی، احمد اور جمہور کے نزدیک تو سورج کے عین سر پر ہونے کے وقت نماز مکروہ ہے۔ البتہ امام مالک رحمہ اللہ اس وقت نماز کے جواز کے قائل ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ میں نے جتنے بھی اہلِ علم وفضل (اہلِ مدینہ) کو پایا ہے، وہ عبادت میں محنت کرتے تھے اور نصف النہار یعنی سورج کے سر پر ہونے کے وقت بھی نماز پڑھتے تھے۔

علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ کے اس قولِ جواز کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے خود اپنے موطا میں حضرت صنابحی رحمہ اللہ سے مروی حدیث روایت کی ہے۔ (جس میں اس وقت

---

[1] قال الألباني: روى البيهقي بسند جيد (الجنائز، ص: ١٣١)

نماز کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ اس کے باوجود ان کی طرف سے جواز کے قول کی توجیہ یہی ممکن ہے کہ) یا تو وہ حدیث ان کے نزدیک صحیح نہیں۔ پھر انھوں نے اہلِ مدینہ کے جس عمل کی طرف اشارہ کیا ہے، اس کی بنا پر حدیث کو نہیں اپنایا۔

بہر حال یہ بات پیشِ نظر رکھیں کہ ائمہ ثلاثہ اور جمہور والا مسلکِ کراہت ہی اقرب الی السنۃ ہے، کیوں کہ اس پر دلالت کرنے والی متعدد صحیح احادیث موجود ہیں۔ مثلاً ایک حدیث تو وہی ہے، جسے صحیح مسلم و ابی عوانہ، سنن اربعہ و بیہقی، مسند طیالسی اور مسند احمد کے حوالے سے ہم بیان کر چکے ہیں، جو حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں وہ بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین اوقات میں نماز پڑھنے اور میت کو دفن کرنے سے منع فرمایا، جن میں سے:

پہلا وقت: جب سورج طلوع ہو رہا ہو۔

دوسرا وقت: ''حِيْنَ يَقُوْمُ قَائِمُ الظَّهِيْرَةِ حَتّٰى تَمِيْلَ الشَّمْسُ'' ''جب دوپہر کے وقت سورج عین سر پر ہو، یہاں تک کہ وہ سر سے ڈھل نہ جائے۔''

تیسرا وقت: جب سورج غروب ہو رہا ہو، یہاں تک کہ وہ اچھی طرح غروب نہ ہو جائے۔[1]

حدیثِ ثانی:

اسی سلسلے کی ایک دوسری حدیث صحیح مسلم، سنن نسائی، ابن ماجہ، بیہقی اور مسند احمد میں حضرت عمرو بن عنبسہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ان کے اسلام لانے کے واقعے اور کئی دیگر احکامِ دین کی تفصیلات بھی ہیں، اسی حدیث میں اوقاتِ نماز بھی مذکور ہیں، جن کے ضمن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عین دوپہر کے موقع پر جب سورج نصف النہار پر ہو، نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ اس حدیث میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ سورج کے طلوع ہو جانے کے بعد نماز (نوافل وغیرہ) پڑھو۔ بلاشبہہ نماز پڑھنے پر فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔ آگے فرمایا کہ نماز پڑھ سکتے ہو:

«حَتّٰى يَسْتَقِلَّ الظِّلُّ بِالرُّمْحِ، ثُمَّ اقْصِرْ عَنِ الصَّلَاةِ فَإِنَّ حِيْنَئِذٍ تُسَجَّرُ جَهَنَّمُ»

''یہاں تک کہ نیزے کا سایہ اس کے مقابل ہو جائے (یعنی سورج سر پر ہو) تب تم نماز

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٤/ ١١٤) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٦٩) فقه السنة (١/ ١٠٤ـ ١٠٧، ٥٤٤) أحكام الجنائز للألباني (ص: ١٣٠)

سے رک جاؤ، کیوں کہ اس وقت جہنم کو بڑھکایا اور گرمایا جاتا ہے۔‘‘

آگے فرمایا:

«فَإِذَا أَقْبَلَ الْفَيْئُ فَصَلِّ»[1]

’’جب سایہ بڑھ جائے (سورج ڈھل جائے) تو نماز پڑھو۔‘‘

امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں اس حدیث کے تحت لکھا ہے کہ اس حدیث میں اس بات کی تصریح کر دی گئی ہے کہ سورج کے سر پر ہونے یعنی زوال کے وقت نماز پڑھنا منع ہے، یہاں تک کہ سورج سر سے ڈھل نہ جائے۔[2]

حدیثِ ثالث:

ایک تیسری حدیث سنن اربعہ و بیہقی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«حَتّٰى تَسْتَوِيَ الشَّمْسُ عَلٰى رَأْسِكَ كَالرُّمْحِ فَإِذَا زَالَتْ فَصَلِّ»[3]

’’(طلوعِ آفتاب کے بعد سے لے کر اس وقت تک نماز پڑھو) یہاں تک کہ سورج عین نیزے کی طرح تمھارے سر پر آجائے (تب رک جاؤ) اور جب سورج سر سے ڈھل جائے تو پھر نماز پڑھ سکتے ہو۔‘‘

حدیثِ رابع:

چوتھی حدیث موطا امام مالک، سنن نسائی و ابن ماجہ میں ہے، جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ صنابحی رحمہ اللہ سے مروی مرسل حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، جس میں ہے کہ جب سورج طلوع ہوتا ہے تو شیطان اپنے سینگ اس کے ساتھ (یا سامنے) کر دیتا ہے اور جب سورج بلند ہو جاتا ہے تو وہ سینگ ہٹا لیتا ہے:

«ثُمَّ إِذَا اسْتَوَتْ قَارَنَهَا وَإِذَا زَالَتْ فَارَقَهَا»

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٦/ ١١٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٥١) سنن أبي داود، رقم الحديث (١١٣٧)

[2] شرح صحيح مسلم (٣/ ٦/ ١١٦)

[3] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٥٢)

’’پھر جب سورج سر پر آتا ہے تو وہ دوبارہ سینگ وہیں کر دیتا ہے اور جب سورج ڈھل جاتا ہے تو پھر سینگ الگ کر لیتا ہے۔‘‘

پھر جب سورج غروب ہونے لگتا ہے تو پھر وہیں کر لیتا ہے، اس حدیث کے آخر میں ہے:

﴿نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ عَنِ الصَّلَاۃِ فِيْ تِلْكَ السَّاعَاتِ﴾[1]

’’نبی اکرم ﷺ نے ان اوقات میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔‘‘

’’إرواء الغلیل‘‘ میں علامہ البانی نے استوائے شمس کے وقت شیطان کے سینگوں کو سورج کے سامنے کرنے والے الفاظ کو منکر قرار دیا ہے، کیوں کہ یہ صحیح مسلم اور دیگر کتب والی حدیثِ عمرو بن عنبسہ کے الفاظ: ﴿فَإِنَّ حِیْنَئِذٍ تُسَجَّرُ جَھَنَّمُ﴾ کے خلاف ہیں۔ اس حدیث کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ مرسل ہے۔ اگرچہ اس کی سند کے تمام راوی قوی ہیں۔[2]

اس حدیث کے مرسل ہونے کا سبب امام سیوطی رحمہ اللہ نے ’’تنویر الحوالك شرح موطأ الإمام مالك‘‘ میں علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کے حوالے سے ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت عبداللہ صنابحی رحمہ اللہ کی نبیِ اکرم ﷺ سے ملاقات ثابت نہیں ہے۔[3]

مرسل حدیث چونکہ ضعیف کی اقسام میں شمار کی جاتی ہے اور اسے حجت نہیں مانا جاتا ہے، یہی وجہ ہوسکتی ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ نے اپنے موطا میں اس روایت کو ذکر کرنے کے باوجود سورج کے سر پر ہونے کے وقت نماز کے کراہت کے قول کو اختیار نہیں کیا، بلکہ وہ جواز کے قائل تھے اور ساتھ ہی وہ اہلِ مدینہ کا عمل بھی جواز ہی بتاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اگر صرف یہی ایک مرسل روایت ہی ہوتی تو پھر امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک بلاشبہہ صحیح ہوتا، لیکن اب جب کہ تین دیگر احادیث بھی ہیں، جن سے کراہت کا پتا چلتا ہے، جن میں صحیح مسلم کی احادیث بھی ہیں تو پھر کہا جا سکتا ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ کی نسبت دیگر ائمہ ثلاثہ اور جمہور کا مسلک ہی اقرب الی السنۃ ہے اور حسن ظن کا تقاضا یہ ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ کے بارے میں یہ سمجھ لیا جائے کہ انھیں وہ صحیح احادیث نہیں پہنچی ہوں گی اور صرف ان

---

[1] صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (٥٤٥) الموطأ مع تنویر الحوالك للسیوطي (١/ ١/ ٢٢٠) الإرواء (٢/ ٢٣٨) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١٢٥٣)

[2] فتح الباري (٢/ ٦٣)

[3] تنویر الحوالك (١/ ١/ ٢٢٠)

احادیث پر ہی بس نہیں، بلکہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار سے بھی کراہت کا پتا چلتا ہے، چنانچہ صاحبِ فتح الباری نے تین آثار ذکر کیے ہیں:

پہلا اثر:

امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"فَنَهٰى عَنِ الصَّلَاةِ نِصْفَ النَّهَارِ"[1]

"عین دوپہر کے وقت نماز پڑھنے سے روکتے تھے۔"

دوسرا اثر:

دوسرے اثر میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"كُنَّا نُنْهٰى عن ذلك" "ہم اس سے روکے جاتے تھے۔"

تیسرا اثر:

تیسرے اثر میں حضرت ابوسعید مقبری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"أَدْرَكْتُ النَّاسَ وَهُمْ يَتَّقُوْنَ ذٰلِكَ"[2]

"میں لوگوں کو اس حال میں پایا کہ وہ اس (عین دوپہر کے وقت نماز پڑھنے) سے بچتے تھے۔"

ان آثار سے بھی جمہور کے مسلک ہی کی تائید ہوتی ہے کہ عین دوپہر یا زوالِ آفتاب کے وقت پر نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

استثنائی صورتیں:

یہاں اس بات کی وضاحت بھی کر دیں کہ فقہاے احناف کے نزدیک تو ان تینوں اوقات میں مطلقاً نماز منع ہے، فرض ہو یا واجب، چاہے نفل ہو اور ادا ہو یا قضا، البتہ اس دن کی عصر کو اس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے ایک قول کی رو سے فجر کی نماز بھی طلوعِ آفتاب سے فاسد نہیں ہوتی۔ ایسے ہی نمازِ جنازہ اور ان اوقات میں تلاوت کی گئی آیات پر سجدہ تلاوت بھی مستثنیٰ

---

[1] فتح الباري (٢/ ٦٣)

[2] فتح الباري (٢/ ٦٣)

ہیں۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے نزدیک جمعہ کے دن عین دوپہر میں سورج کے سر پر ہونے کے وقت نوافل پڑھنا اس حکمِ کراہت میں نہیں آتا اور شافعیہ کے نزدیک ان اوقاتِ ثلاثہ میں غیر سببی نوافل پڑھنا مکروہ ہے۔ البتہ فرض مطلقاً اور سببی نوافل، جمعہ کے دن عین سورج کے سر پر ہونے کے وقت نوافل اور حرمِ مکہ میں نوافل بلا کراہت جائز ہیں۔

مالکیہ کے نزدیک طلوعِ آفتاب اور غروب کے وقت نوافل پڑھنا (نہ صرف مکروہ بلکہ) حرام ہے، اگرچہ وہ سببی ہی کیوں نہ ہوں۔ نذر والی نماز اور سجدہ تلاوت کا بھی یہی حکم ہے اور نمازِ جنازہ بھی اسی میں شامل ہے، سوائے اس کے کہ لاش کے خراب ہونے کا خطرہ ہو تو پھر یہ جائز ہے۔ انھوں نے ان دونوں اوقات میں فرائض ادا کرنے کو مباح قرار دیا ہے، خواہ وہ ادا ہوں یا قضا۔

اسی طرح سورج کے عین سر پر ہونے کے وقت بھی انھوں نے مطلقاً نماز کو مباح کہا ہے، فرض ہوں یا نفل (یعنی اس وقت ان کے یہاں جمعہ کے دن اور حرم مکی کی شرط بھی نہیں)

علامہ باجی موطا امام مالک کی شرح میں المبسوط کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ ابن وہب سے مروی ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ سے عین دوپہر کے وقت نماز پڑھنے کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا:

> ''میں نے لوگوں کو پایا کہ وہ جمعہ کے دن سورج کے سر پر ہونے کے وقت نماز پڑھتے تھے اور بعض احادیث میں اس کی ممانعت بھی وارد ہوئی ہے۔ میں اسے منع نہیں کرتا، کیوں کہ میں نے لوگوں (اہلِ مدینہ) کو اس وقت نماز پڑھتے پایا ہے اور نہ میں اس وقت نماز پڑھنے کو محبوب رکھتا ہوں، کیوں کہ اس کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔''

حنابلہ کے نزدیک ان تینوں اوقات یعنی طلوع وغروب اور نصف النہار کے وقت میں کوئی نفلی نماز نہیں ہوتی، وہ سببی ہو یا غیر سببی، مکہ مکرمہ میں ہو یا کسی دوسری جگہ پر اور جمعہ کا روز ہو یا کوئی دوسرا دن۔ ہاں البتہ انھوں نے جمعہ کے دن تحیۃ المسجد کی دو رکعتوں کو بلاکراہت جائز قرار دیا ہے۔ وہ چاہے عین دوپہر کے وقت واقع ہوں اور خطبے کے دوران ہی کیوں نہ پڑھی جائیں۔

ان کے نزدیک نمازِ جنازہ بھی ان تینوں اوقات میں حرام ہے۔ ہاں اگر لاش کے بگڑ جانے کا خدشہ ہو تو پھر بلاکراہت جائز ہے اور ان تینوں اوقات میں ان کے نزدیک فوت شدہ فرضی نمازوں کی

قضا، نذر مانی ہوئی نماز اور طواف کی دو رکعتیں پڑھ لینا بھی جائز ہے۔[1]

یہ چاروں معروف فقہی مکاتبِ فکر کے ائمہ وفقہا کی آرا ہیں اور ان میں سے بعض امور ایسے بھی ہیں، جنھیں مکروہ وممنوع بتایا گیا ہے، حالانکہ ان کے استثنا و جواز کے دلائل صحیح احادیث میں موجود ہیں۔ مثلاً:

1. بھولی ہوئی۔
2. نیند کی وجہ سے رہ جانے والی فرض نماز کے یاد آنے پر، یا نیند سے بیدار ہونے کے وقت اس کو ادا کرنے کے جواز کے دلائل ذکر کیے جا چکے ہیں۔
3. حرم مکی میں طواف کی دو رکعتوں، یعنی نمازِ طواف وغیرہ تمام اوقات میں، کے جواز کی دلیل پر مشتمل حدیث بھی ذکر کی جا چکی ہے۔
4. عام سببی نفلی نمازوں کے جواز کی طرف بھی اشارہ گزرا ہے۔
5. نمازِ جنازہ اور تدفین کی کراہت کے راجح ہونے کا تذکرہ بھی ہو چکا ہے، سوائے اس کے کہ لاش کے بگڑنے کا خطرہ ہو تو پھر بلا کراہت نماز و تدفین جائز ہے۔

اس دن کی فجر و عصر:

احناف کی طرف سے، یہ جو کہا گیا ہے کہ ان تینوں اوقات میں نماز پڑھنا منع ہے، فرض ہو یا واجب یا نفل ہو، ادا ہو یا قضا اور صرف اس دن کی نمازِ عصر کو اس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے تو اس کی دلیل بھی موجود ہے، البتہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کی طرح اس کے ساتھ ہی اس دن کی نمازِ فجر کو بھی مستثنیٰ کر لینا چاہیے، کیوں کہ اس کے بھی دلائل موجود ہیں۔ ایسے ہی عین سر پر ہونے کے وقت نوافل کے جواز کا معاملہ بھی ہے اور اس کے بھی دلائل موجود ہیں۔

بعض احادیث ایسی ہیں، جو خاص انھی دو مواقع سے تعلق رکھتی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی عذر کی وجہ سے اگر فجر کی نماز موخر ہو جائے، حتیٰ کہ سورج طلوع ہو رہا ہو تو عذر و مجبوری میں ان اوقات کے دوران میں بھی نماز پڑھی جا سکتی ہے اور یہ طلوع وغروب کے وقت نماز ادا کرنا تو صرف اس دن کی فجر و عصر کے ساتھ خاص ہے، البتہ کسی بھی نماز کے آخری وقت میں ایک رکعت ادا کرنا اور

---

[1] دیکھیں: فقه السنة (۱/ ۷/ ۱۰۸)

بقیہ نماز کے اگلی نماز کو پا لینے کا معاملہ ہر نماز کے لیے عام ہے، جیسا کہ ارشادِ نبوی سے پتا چلتا ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الصَّلَاةِ فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلَاةَ»[1]

چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن اربعہ، مسند احمد اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ اَدْرَكَ مِنَ الصُّبْحِ رَكْعَةً قَبْلَ أَنْ تَطْلُعُ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ الصُّبْحَ، وَمَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنَ الْعَصْرِ قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ الْعَصْرَ»[2]

''جس نے فجر کی ایک رکعت طلوعِ آفتاب سے پہلے پڑھ لی، اس نے فجر کی نماز پا لی اور جس نے غروبِ آفتاب سے پہلے عصر کی ایک رکعت پڑھ لی، اِس نے عصر کو پا لیا۔''

یہاں عصر یا فجر کو پا لیا سے مراد یہ نہیں ہے کہ محض ایک رکعت پڑھ لینا ہی کافی ہوگیا، بلکہ مراد یہ ہے کہ وہ اپنی نماز مکمل کرلے۔ اس نے نماز کو پا لیا ہے۔ فوت نہیں ہونے دی۔ البتہ وہ بقیہ نماز پڑھ کر رکعتیں مکمل لے، جیسا کہ صحیح بخاری و مسلم اور سنن بیہقی کی ایک دوسری روایت میں اس کے نماز کو پا لینے کا ذکر ہے:

«مَنْ اَدْرك رَكْعَةً مِّنَ الصَّلَاةِ فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلَاةَ»[3]

''جس نے کسی نماز کی ایک رکعت پالی تو اس نے وہ نماز پا لی۔''

بقیہ نماز پڑھ کر رکعتیں پوری کر لینے کا ذکر بھی ایک دوسری روایت میں آیا ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«إِذَا أَدْرَكَ أَحَدُكُمْ سَجْدَةً مِّنْ صَلَاةِ الْعَصْرِ قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ٧٥) مختصر صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٨) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٩٩١) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٤١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١١٢٢) نيل الأوطار (١/ ٢/ ٢٢)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ١٥٦) صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٠٤۔ ١٠٥) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٨) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٧) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٠١، ٥٠٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٩٩) المنتقىٰ مع النيل (١/ ٢/ ٢١)

[3] صحيح البخاري (٢/ ٥٧) مختصر صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٢٨)

فَلْيُتِمَّ صَلَاتَهُ، وَإِذَا أَدْرَكَ سَجْدَةً مِنْ صَلَاةِ الصُّبْحِ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَلْيُتِمَّ صَلَاتَهُ»[1]

''جب تم میں سے کوئی شخص غروبِ آفتاب سے پہلے نمازِ عصر کا ایک سجدہ ایک رکعت، (جیسا کہ امام مسلم، امام خطابی رحمہ اللہ اور المجد ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے تشریح کی ہے۔ فتح الباری: ۲/ ۳۸) پالے، اسے چاہیے کہ اپنی نماز مکمل کر لے اور جب کوئی شخص صبح کی نماز کی ایک رکعت طلوعِ آفتاب سے پہلے پالے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنی نماز کو مکمل کر لے۔''

ان احادیث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جو شخص عذر و مجبوری کی وجہ سے ان اوقات میں سے ایک رکعت بھی پالے اور بقیہ نماز طلوع یا غروب کے بعد پڑھ لے تو اس کی نماز مکمل ہوگئی، اس بات کی صراحت بھی بعض دیگر روایات میں آئی ہے۔ مثلاً سنن کبریٰ بیہقی میں ہے:

«مَنْ اَدْرَكَ مِنَ الصُّبْحِ رَكْعَةً قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلَاةَ»[2]

''جس نے فجر کی ایک رکعت طلوعِ آفتاب سے پہلے پالی اور ایک رکعت طلوعِ آفتاب کے بعد پڑھ لی تو اس نے نماز پالی۔''

اس سے بھی زیادہ صریح روایت دوسری ہے، جس میں ہے:

«مَنْ صَلّٰى رَكْعَةً مِّنَ الْعَصْرِ قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ، ثُمَّ صَلّٰى مَا بَقِيَ بَعْدَ غُرُوْبِ الشَّمْسِ فَلَمْ يَفُتْهُ الْعَصْرُ»[3]

''جس نے عصر کی ایک رکعت غروبِ آفتاب سے پہلے پڑھ لی اور بقیہ نماز غروبِ آفتاب کے بعد پڑھ لی تو اس کی عصر فوت نہیں ہوئی۔''

یہی بات نمازِ فجر کے بارے میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی نسائی شریف کی روایت میں ارشادِ نبوی کے الفاظ ہیں:

«مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنَ الصَّلَاةِ فَقَدْ أَدْرَكَ الصَّلَاةَ كُلَّهَا إِلَّا أَنَّهُ يَقْضِيْ مَا فَاتَهُ»[4]

---

[1] صحيح البخاري مع فتح الباري (٢/ ٥٦)

[2] فتح الباري (٢/ ٥٦)

[3] حواله بالا و نيل الأوطار (١/ ٢/ ٢١)

[4] دیکھیں: صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٤٤) عن سالم، فتح الباري (٢/ ٥٦)

”جس نے نماز کی ایک رکعت پالی، اس نے ساری نماز ہی پالی، البتہ اسے چاہیے کہ وہ بقیہ رکعتوں کو پورا کرلے۔“

سنن بیہقی کی ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنَ الصُّبْحِ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَلْيَصِلْ إِلَيْهَا أُخْرٰى»[1]

”جس نے سورج نکلنے سے پہلے ایک رکعت پالی، اسے چاہیے کہ وہ اس رکعت کے ساتھ ایک اور رکعت ملائے (یعنی نماز مکمل کرلے)۔“

اسی مفہوم کی ایک حدیث اُم المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی صحیح مسلم، سنن نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں مروی ہے، جس میں ارشاد نبوی ہے:

«مَنْ اَدْرَكَ مِنَ الْعَصْرِ سَجْدَةً قَبْلَ أَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ أَوْ مِنَ الصُّبْحِ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَهَا»[2]

”جس نے غروبِ آفتاب سے پہلے ایک رکعت عصر پڑھ لی یا طلوعِ آفتاب سے پہلے فجر کی ایک رکعت پالی، اس نے نماز پالی۔“

حضرت عائشہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث اور اس کی متعدد روایات کے الفاظ سے اصل موضوع تو واضح ہوگیا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوگیا کہ امام شافعی، احمد بن حنبل اور اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ کا یہی مسلک اس سلسلے میں اقرب الی السنۃ ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے دوسری رائے اختیار کی ہے کہ اگر کسی کے فجر پڑھنے کے دوران ہی سورج طلوع ہو جائے تو اس کی نماز باطل ہو جاتی ہے، لیکن مذکورہ حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اس کے خلاف ہے، جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ خود امام صاحب کے شاگرد امام ابو یوسف رحمہ اللہ کو بھی اپنے استاذِ گرامی کی اس رائے سے اتفاق نہیں تھا، بلکہ وہ دیگر ائمہ کی طرح جواز کے قائل تھے اور عصر کے بارے میں تو عام احناف بھی جواز ہی کے قائل ہیں۔

امام صاحب رحمہ اللہ جو نماز کے دوران میں سورج طلوع ہو جانے سے اس کے باطل ہو جانے

---

[1] حواله سابقه.

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٠٥۔ ١٠٦) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٣٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٠٠) المنتقى مع النيل (١/ ٢/ ٢١)

کے قائل ہیں، ان کا استدلال ان احادیث سے ہے، جن میں طلوعِ آفتاب کے وقت نماز ادا کرنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے، لیکن حدیث ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں استدلال صحیح نہیں رہتا، پھر یہ معاملہ صرف نمازِ فجر کے ساتھ ہی خاص کیوں کیا جائے، جب کہ ممانعت والی احادیث ہی میں غروبِ آفتاب کے وقت نمازِ عصر کی ممانعت بھی آئی ہے، لیکن اسے احناف نے مستثنیٰ مانا ہے تو پھر فجر کو مستثنیٰ ماننے میں کیا چیز مانع ہے؟

بعض حنفی اہلِ علم نے جو یہ دعویٰ کیا ہے کہ ممانعت والی احادیث سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی روایت منسوخ ہوگئی ہے، ان کا یہ دعویٰ محتاجِ دلیل ہے اور کوئی قطعی دلیل نہ ہونے کی صورت میں محض احتمال کی بنا پر ناسخ تو نہیں مانا جا سکتا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کے بقول ان دونوں کی احادیث سے بعض کو ناسخ اور بعض کو منسوخ ماننے کے بجائے اور ہر دو طرح کی احادیث کے مابین جمع و تطبیق ممکن ہے اور وہ اس طرح کہ ممانعت والی احادیث کو غیر سببی نفلی نمازوں کی ممانعت پر محمول کیا جائے نسخ ماننے سے یہ تخصیص ہی اولی ہے۔[1]

اسی سببی و غیر سببی والے فرق کو نقل کر کے امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ یہ بھی حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کے مسلک کی رو سے ہے، جب کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ ممانعت کی احادیث عام ہیں اور ہر نماز ہی کو شامل ہیں، جب کہ جواز والی یہ حدیث خاص ہے، پس عام کی خاص پر بنیاد رکھی جائے گی (اور کہا جائے گا کہ) اس وقت کوئی نماز ہی جائز نہیں، چاہے وہ سببی ہو یا غیر سببی۔ سوائے اس کے کہ کوئی دلیل موجود ہو جو کسی نماز کو خاص کر دے تو اسے ادا کرنا ہوگا، جیسا کے یہاں فجر و عصر کا معاملہ ہے) ہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ امام نووی رحمہ اللہ کے بقول اس بات پر تمام علما کا اتفاق ہے کہ جان بوجھ کر فجر کو طلوعِ آفتاب تک اور عصر کو غروبِ آفتاب تک موخر کرنا جائز نہیں ہے، بلکہ یہ صرف مجبوری کی حالت کے لیے خاص ہے۔[2]

سورج کے عین سر پر ہونے کے وقت نماز کی کراہت ہونے سے جمعہ کے دن کا استثنا:

یہ تو ہوا طلوع وغروب کے سلسلے میں اور اب آیئے سورج کے عین سر پر ہونے کے وقت نماز کی

[1] فتح الباري (٢/ ٥٦)

[2] نيل الأوطار (١/ ٢/ ٢٢)

کراہت واستثنائی صورت کی طرف۔

بقول علامہ ابن قیم رحمہ اللہ ”زاد المعاد“ (۱/ ۳۸۰ محقق) سورج کے عین سر پر ہونے کے وقت نماز کے مکروہ ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اہلِ علم کے تین اقوال ہیں:

پہلا قول:

یہ وقت، وقتِ کراہت ہے ہی نہیں۔ یہ امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔ ہم سابق میں ذکر کر آئے ہیں کہ ان کا یہ مسلک مرجوح ہے اور احادیث سے اس کی تائید نہیں ہوتی، حتیٰ کہ خود امام مالک رحمہ اللہ کے اپنے موطا میں حدیث موجود ہے، جس سے اس وقت کے وقتِ کراہت ہونے کا پتا چلتا ہے، جیسا کہ تفصیل گزر چکی ہے۔

دوسرا قول:

سورج کے عین سر پر ہونے کا وقت روزانہ ہی وقتِ کراہت ہے۔ اس میں جمعہ یا غیر جمعہ کا بھی کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور مشہور روایت کی رو سے امام احمد رحمہ اللہ کا مسلک ہے (اگرچہ ایک دوسری روایت کی رو سے وہ جمعہ کے دن کو مستثنیٰ مانتے ہیں) لیکن دلائل کی رو سے یہ مسلک بھی موجود ہے۔

تیسرا قول:

تیسرا راجح قول یا اقرب الی السنہ مسلک امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ وقت تو واقعی وقتِ کراہت ہے، لیکن جمعہ کا وقت اس سے مستثنیٰ ہے۔

امام عطاء، مکحول، طاؤس، حسن بصری اور امام ابو یوسف رحمہم اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ و ابن قیم رحمہما اللہ کا اختیار بھی یہی ہے اور بعض دیگر کبار محدثین و علما نے بھی اس کی تائید کی ہے۔[1]

دلائل کی رو سے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ جمعہ کے دن وقتِ زوال میں بھی نوافل پڑھے جا سکتے ہیں یا با الفاظ دیگر جیسا کہ عموماً کہا جاتا ہے کہ جمعہ کے دن زوال ہوتا ہی نہیں، گویا یہ ایک عامی تعبیر

---

[1] دیکھیں: زاد المعاد (۱/ ۳۷۸، ۳۸۰) فتح الباري (۲/ ۳۷۲) تمام المنة (ص: ۱۴۳) فقه السنة (۱/ ۱۰۷، ۱۰۸)

ہے، ورنہ زوال تو ہر روز ہی ہوتا ہے۔ البتہ جمعہ کے دن زوال کے وقت بھی نوافل کے جواز کا پتا چلتا ہے۔ چنانچہ "زاد المعاد في هدي خير العباد"، میں علامہ ابن قیم رحمہ اللہ نے جمعہ کے ۳۳ خصائص ذکر فرمائے ہیں اور ہر خصوصیت پر سیر حاصل بحث کی ہے جو محقق طباعت کے باسٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان خصائص میں سے گیارھویں خصوصیت یہی لکھی ہے کہ جمعہ کے دن امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے موافقین کے نزدیک زوال کے وقت بھی نوافل مکروہ نہیں ہیں اور ہمارے استاد ابو العباس ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا اختیار بھی یہی ہے اور ان کا اعتماد "ليث عن مجاهد عن أبي الخليل عن أبي قتادة عن النبي ﷺ" کی سند سے مروی حدیث پر بھی نہیں تھا۔[1]

جس میں ہے کہ نصف النہار یا زوال کے وقت نماز مکروہ ہے سوائے جمعہ کے دن کے اور اس میں ہے:

«إِنَّ جَهَنَّم تُسَجَّرُ إِلَّا يَوْمَ الْجُمُعَةِ»[2]

"ہر روز دوپہر کے وقت جہنم کو بھڑکایا جاتا ہے، سوائے جمعہ کے دن کے۔"

اس کے برعکس امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا اعتماد اس بات پر تھا کہ جو شخص جمعہ کے لیے آئے، اس کے لیے مستحب یہ ہے کہ وہ امام کے نکلنے (خطبہ کے شروع کرنے) تک نوافل اور سنتیں پڑھے اور صحیح بخاری "كتاب الجمعة، باب الدهن للجمعة" اور "باب لا يفرق بين اثنين يوم الجمعة" دو مقامات پر) ایسے ہی مسند احمد و سنن دارمی کی ایک صحیح حدیث میں ارشادِ نبوی ہے:

«لَا يَغْتَسِلُ رَجُلٌ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَيَتَطَهَّرُ مَا اسْتَطَاعَ مِنْ طُهْرٍ، وَيَدَّهِنُ مِنْ دُهْنِهِ أَوْ يَمَسُّ مِنْ طِيْبِ بَيْتِهِ، ثُمَّ يَخْرُجُ، فَلَا يُفَرِّقُ بَيْنَ اثْنَيْنِ، ثُمَّ يُصَلِّيْ مَا كُتِبَ لَهُ ثُمَّ يُنْصِتُ إِذَا تَكَلَّمَ الْإِمَامُ إِلَّا غُفِرَ لَهُ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ الْأُخْرَىٰ»[3]

[1] اس حدیث پر امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا اعتماد نہ ہونے کی وجہ دراصل یہ ہے کہ امام ابو داود کی یہ روایت سند کے اعتبار سے ایک تو منقطع ہے اور دوسرے "لیث بن ابی سلیم" کے ضعیف راوی ہونے کی وجہ سے ناقابلِ حجت ہے۔ دیکھیں: تحقيق الزاد (١/ ٣٧)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٠٨٣)

[3] صحيح البخاري مترجم اردو (١/ ٤٢٢)

”جو شخص جمعہ کے دن غسل کرے اور حسبِ امکان طہارت و نظافت کا اہتمام کرے، تیل لگائے یا اپنے گھر سے خوشبو لگائے اور پھر جمعہ کے لیے نکلے اور (مسجد میں بیٹھے ہوئے) دو آدمیوں میں تفریق نہ کرے (یعنی اکٹھے بیٹھے ہوؤں کے درمیان گھس کر انھیں الگ الگ نہ کر دے) پھر وہ جتنی اس کی قسمت میں لکھا ہے، نفلی نماز پڑھے اور پھر جب امام خطبہ شروع کرے تو اسے خاموشی سے بہ غور سنے تو اس کے دوسرے جمعہ تک تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔“

اس حدیث میں دلیل ہے کہ مسجد میں پہنچنے والے کے لیے جتنی استطاعت ہو، نماز پڑھنا مندوب ہے اور اس سے ممانعت اس وقت تک نہیں، جب تک کہ امام خطبہ کے لیے نہ آئے۔ کئی حضرات، جن میں سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور ان کی متابعت میں، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ بھی ہیں، کا کہنا ہے کہ امام کا لوگوں کے سامنے نکل آنا نماز سے منع کرتا ہے اور اس کا خطبہ شروع کرنا بات چیت سے مانع ہوتا ہے، گویا سلف صالحین نے امام کے نکلنے کو نماز سے مانع قرار دیا ہے نہ کہ سورج کے سر پر آنے کو (یعنی زوال کا وقت ہونے کو نماز سے مانع نہیں قرار دیا گیا)۔

دوسری دلیل:

جمعہ کے دن زوال کے وقت بھی نوافل کے جائز ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ مسجد میں لوگ چھتوں کے نیچے ہوتے ہیں اور انھیں زوال کے وقت کا پتا نہیں چل سکتا اور وہ آدمی جو نفلی نماز میں مشغول ہے، اسے کیا معلوم کہ کب زوال کا وقت ہو گیا اور اس کے لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ لوگوں کی گردنوں کو پھلانگتا ہوا باہر نکلے، سورج کو دیکھے اور پھر لوٹ جائے اور نہ یہ اس کے لیے مشروع ہے۔

جمعہ کے دن وقت زوال کی عدمِ کراہت کی دلیل سنن ابی داود والی حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث بھی بن سکتی ہے، کیوں کہ اگرچہ امام ابو داود رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ مرسل ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ ابو خلیل کا حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے سماع (سننا) ثابت نہیں ہے، لیکن جن کی مرسل کے مطابق صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل بھی ہوا اور قیاس سے بھی اس تائید ہوتی ہو، یا کسی صحابی کا قول اس کا مؤید ہو یا ارسال کرنے والا راوی اساتذہ کے اختیار میں اور ضعفا و متروکین سے روایت بیان نہ کرنے میں معروف ہو یا ایسی ہی کوئی دوسری صورت ہو، جس سے اسے قوت ملتی ہو تو ایسی مرسل روایت پر بھی عمل کیا جائے گا۔

نیز حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ والی اس مرسل روایت کی تائید میں کئی دوسرے شواہد بھی ہیں، مثلاً مسند امام شافعی اور انہی کی کتاب "إختلاف الحدیث" اور "کتاب الجمعة" میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

《إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ نَهىٰ عَنِ الصَّلَاةِ نِصْفَ النَّهَارِ حَتَّىٰ تَزُوْلَ الشَّمْسُ إِلَّا يَوْمَ الْجُمُعَةِ》[1]

"نبی اکرم ﷺ نے زوال کے وقت نماز پڑھنے سے منع فرمایا، سوائے جمعہ کے دن کے۔"

اس روایت کی سند میں دو راوی ابراہیم بن محمد اور اسحاق بن عبداللہ ہیں، جنھیں تحقیق زاد المعاد میں متروک بتایا گیا ہے اور امام شوکانی رحمہ اللہ کے حوالے سے فتح الربانی کی شرح میں شیخ احمد عبدالرحمٰن البنّاء نے بھی کہا ہے کہ اس کی سند پر کلام کیا گیا ہے۔ یہی روایت سنن اثرم اور بیہقی کی "معرفة السنن" میں بھی مروی ہے، جہاں حضرت ابوسعید اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہما دونوں بیان کرتے ہیں:

《كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَنْهٰى عَنِ الصَّلَاةِ نِصْفَ النَّهَارِ إِلَّا يَوْمَ الْجُمُعَةِ》[2]

"نبی اکرم ﷺ عین دوپہر کے وقت نماز پڑھنے سے روکا کرتے تھے، سوائے جمعہ کے دن کے۔"

زاد المعاد میں علامہ ابن قیم امام بیہقی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اس روایت کی سند میں بعض راوی ایسے ہیں، جو قابلِ حجت نہیں، لیکن اگر ان احادیث کو حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے ساتھ ملا لیا جائے تو کچھ قوت اختیار کر جاتی ہیں۔ فتح الباری میں حافظ ابن حجر نے بھی لکھا ہے کہ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ والی حدیث کی سند میں انقطاع ہے اور امام بیہقی نے اس کے کچھ ضعیف شواہد ذکر کیے ہیں، جنھیں ملانے سے حدیث قوی ہو جاتی ہے۔[3]

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لوگ جمعہ کی دن جلد مسجد پہنچ جاتے ہیں اور امام کے خطبے کے لیے نکلتے تک نوافل پڑھتے رہتے ہیں۔ امام بیہقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام شافعی رحمہ اللہ نے جو یہ بات

---

[1] صحیح البخاري مع الفتح الرباني (٢/ ٣٧٠، ٣٩٢) عن سلمان فارسي رضی اللہ عنہ، صحیح الجامع (٣/ ٦/ ٢٤١) بحواله زاد المعاد (١/ ٣٧٩) و شرح الفتح الرباني (٢/ ٣٠٠) فتح الباري (٢/ ٦٣)

[2] حواله جات بالا.

[3] فتح الباري (٢/ ٦٣)

کہی ہے، وہ صحیح احادیث میں موجود ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے لوگوں کے جلد مسجد کی طرف جانے اور بلا استثنائے زوال امام نکلنے تک نماز پڑھنے کی ترغیب دلائی ہے۔ یہ بات جمعہ کے زوال کے وقت نماز کے جواز پر دلالت کرنے والی احادیث کے موافق و مفید ہے اور اس رخصت کی روایت امام عطاء، طاؤس، حسن بصری اور مکحول رحمہم اللہ سے بھی ملتی ہے۔[1]

امام شافعی رحمہ اللہ نے ثعلبہ بن ابی مالک کے حوالے سے عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں روایت بیان کی ہے:

"إِنَّهُمْ كَانُوا يُصَلُّوْنَ نِصْفَ النَّهَارِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ"[2]

''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمعہ کے دن زوال کے وقت بھی نفلی نماز پڑھا کرتے تھے۔''

ان احادیث و آثار کا مجموعی مفاد یہ ہے کہ جمعہ کے دن زوال کے وقت یعنی جب سورج عین سر پر ہو، نفلی نماز جائز ہے، لیکن عام حالات میں یہ اوقاتِ مکروہہ میں سے ہے۔ البتہ جمعہ اس سے مستثنیٰ ہے۔

بعض دیگر مواقع کراہت:

یہ پانچ اوقات تو نمازوں کے مکروہ ہونے کے معروف ہیں اور نمازِ پنج گانہ کے اصل اوقات کی مناسبت سے ہیں۔ البتہ اہلِ علم نے بعض دیگر مواقع بھی ذکر کیے ہیں، جن میں نماز مکروہ ہے اور وہ مواقع بھی پانچ ہیں:

۱ جب نماز کی اقامت ہو رہی ہو یا ہو چکی ہو۔

۲ جب خطبہ جمعہ کے لیے امام و خطیب منبر پر پہنچ جائے۔

۳ اس فرض نماز کی جماعت ہونے کے دوران میں جو اس نے ابھی پڑھنی ہو۔

۴ صرف مالکیہ کے نزدیک وہ وقت کہ جمعہ کی نماز ختم ہو، مگر لوگ ابھی مسجد سے گئے نہ ہوں۔ تب ان کے نزدیک نفلی نماز مکروہ ہے۔

۵ صرف احناف کے نزدیک وہ وقت جو مغرب کی اذان اور جماعت کے درمیان تھوڑا سا وقفہ ہے

---

[1] زاد المعاد (۱/ ۳۷۸، ۳۸۰)

[2] دیکھیں: شرح الفتح الرباني (۲/ ۳۰۰)

(جس میں لوگ دو رکعت نماز پڑھتے ہیں اور صحیح بخاری و دیگر کتبِ حدیث میں ان دو رکعتوں کے جواز کا ثبوت موجود ہے)۔[1]

بہر حال اصلی اوقاتِ نماز کی مناسبت سے جو مکروہ اوقات ہیں، ان کی طرح ہی ان مکروہ مواقع کی تفصیل میں جانا شاید سردست باعثِ ثقل ہو، لہٰذا ہم صرف اتنا کہنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں کہ نماز کی اقامت اور جماعت کے دوران میں سنتیں پڑھنا یقیناً مکروہ ہے۔ اس وقت فوراً جماعت میں شامل ہو جانا چاہیے۔ اس کی کچھ تفصیل تو نمازِ فجر کے بعد والے وقتِ کراہت کے ضمن میں گزری ہے اور مزید تفصیل کا موقع نمازِ پنج گانہ کی سنتوں کے موضوع میں آئے گا۔ اُسی مقام پر خصوصاً نماز پنج گانہ سے متعلقہ غیر موکدہ سنتوں کے ضمن میں اذانِ مغرب اور جماعت کے مابین دو رکعتوں کے جواز کی تفصیل بھی ذکر کی گئی ہے۔

جب خطیب خطبہ شروع کر چکا ہو تو بھی عام نفلی نماز شروع کرنا مکروہ ہے۔ ہاں تحیۃ المسجد کے طور پر صرف مختصر سی دو رکعتیں پڑھ لینا چاہیے، کیوں کہ ان دو رکعتوں کو کثیر فقہا کے نزدیک وجوب کا درجہ حاصل ہے، اس بات کے دلائل اور تفصیل ''مسائل و احکامِ جمعہ'' اور ''تحية المسجد'' کے موضوعات میں ہیں۔ نمازِ جمعہ کے بعد اُٹھ کر چار یا دو رکعتیں پڑھی جا سکتی ہیں۔ لوگوں کے چلے جانے تک نوافل کی کراہت کے واضح دلائل ہمیں نہیں مل سکے کہ جن سے یہ کراہت ثابت ہوتی ہو۔

کراہت میں تفاوت:

اوقاتِ مکروہہ کا موضوع ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کی وضاحت بھی کر دی جائے کہ نمازِ پنج گانہ کے اصل اوقات کی مناسبت سے جو پانچ اوقاتِ مکروہہ ہیں، ان میں نماز پڑھنے کی کراہت ایک جیسی نہیں ہے، بلکہ ان کے مابین تفاوت ہے۔ بعض اوقات میں نماز کی ممانعت دوسرے تین اوقات کی نسبت زیادہ شدید ہے۔[2]

خوابوں کی تعبیر بیان کرنے کے ماہر و محدث امام محمد بن سیرین، امام المفسّرین ابن جریر طبری رحمہم اللہ اور بعض دیگر اہلِ علم نے نمازِ فجر و عصر کے بعد نماز کی ممانعت میں پائی جانے والی حکمت کے

[1] فتح الباري (٢/ ٦٣)

[2] الفتح الرباني و شرحه (٢/ ٢٩٩)

مابین فرق کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پہلے دو اوقات میں نماز مکروہ ہے اور دوسرے دونوں اوقات میں نماز حرام ہے، اس تفاوت اور فرق پر ان کی دلیل یہ ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ سے یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے عصر کے بعد نماز پڑھی تھی۔ (جس کی تفصیل ذکر کی جا چکی ہے)

اس سے معلوم ہوا کہ عصر کے بعد نماز پڑھنا حرام نہیں، گویا انھوں نے آپ ﷺ کے ظہر کی دو سنتیں عصر کے بعد پڑھنے کو بیانِ جواز پر محمول کیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک روایت ملتی ہے کہ ان کے نزدیک نمازِ فجر کے بعد سے لے کر طلوعِ آفتاب تک مابین نماز پڑھنا حرام تھا اور وہ عصر کے بعد سے لے کر سورج کے زرد پڑ جانے تک مابین نماز پڑھنا مباح سمجھتے تھے۔ جب کہ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ (اور بعض دیگر علما و محدث کا) بھی یہی مسلک تھا۔ (جیسا کہ تفصیل ذکر کی جا چکی ہے)

ان کی دلیل کے سلسلے میں سنن ابی داود کی وہ حدیث بھی ذکر کی گئی تھی، جسے کبار محدّثین میں سے کسی نے صحیح اور کسی نے قوی کہا ہے، جس میں مذکور ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے عصر کے بعد نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے، سوائے اس وقت کے جب کہ سورج ابھی کافی بلند اور صاف شفاف ہو، یعنی زردی مائل نہ ہوا ہو۔

بہر حال بعض اہلِ علم کی رائے ہے کہ بعض اوقات میں نماز مکروہ اور بعض میں حرام اور بعض میں مباح ہے، جب کہ مشہور بات یہ ہے کہ ان تمام اوقات میں نماز مکروہ ہے، اس کراہت کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ کراہت تحریمی ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ نہیں بلکہ وہ کراہت تنزیہی ہے۔ یعنی بچنا افضل و اولی ہے۔[1] ظاہر ہے کہ سب اوقات ان پانچوں نمازوں کو بر وقت ادا کرنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ادائی وقتِ اختیار میں یا چاہے وقتِ اضطرار میں ہو۔ بہرحال ان اوقات میں پڑھی گئی نمازیں ادا شمار ہوں گی، قضا نہیں۔

فرضوں کی قضا:

فرضی نمازوں کی قضا یا عدمِ قضا کے سلسلے میں اہلِ علم کی آرا مختلف ہیں۔ اس سلسلے میں ہم صرف اتنا کہنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں کہ جو شخص بھول کر یا سویا رہ کر کسی نماز کو قضا کر دے تو اس پر اس نماز کی قضا ضروری ہے، اس پر پوری امت کا اتفاق ہے۔[2]

[1] فتح الباري (٢/ ٦٣)

[2] بداية المجتهد (١/ ١٤٢)

جیسا کہ نماز سے نبیِ اکرم ﷺ کے سوئے رہ جانے والی احادیث سے پتا چلتا ہے اور اگر کوئی شخص قصداً کوئی نماز چھوڑ دے تو ائمہ اربعہ سمیت جمہور اہلِ علم کے نزدیک گناہ گار ہوگا اور اس کے لیے ان نمازوں کی قضا کرنا ضروری ہے۔

البتہ امام داود ظاہری، علامہ ابن حزم اور امام شافعی کے بعض اصحاب رحمہم اللہ کا مذہب یہ ہے کہ ایسا شخص گناہ گار تو ہے، لیکن وہ قضا نہیں کرسکتا۔ اسے چاہیے کہ توبہ و استغفار کے ذریعے اور مختلف نیک کاموں کی بدولت کفارے کی کوشش کرتا رہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ، علامہ ابن قیم رحمہ اللہ، العزبن عبدالسلام، امام شوکانی رحمہ اللہ اور شیخ البانی کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔[1]

الغرض اہلِ علم کے مابین یہ ایک طویل بحث ہے، جس کی تفصیلات میں جانے سے بہتر یہی ہے کہ ائمہ اربعہ اور جمہور کے مسلک پر عمل کرتے ہوئے کسی شکل میں بھی اپنے وقت سے رہ جانے والی نماز کو قضا ہی کر لیا جائے۔[2]

دیکھیں! عذر و مجبوری نہ ہونے اور محض کاہلی کے نتیجے میں موخر کرنے پر اس کی قضا بھی کی جائے اور توبہ و استغفار کر کے اس کوتاہی پر اللہ سے معافی بھی مانگی جائے، یہی احوط ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ کسی عذر و مجبوری کی وجہ سے کسی نماز کا وقتِ ادا گزر ہی جائے، اول رہے نہ اختیار اور نہ اضطرار ہی، بلکہ نماز فوت ہو جائے تو اسے قضا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ اگر کبھی ایک سے زیادہ نمازیں یکے بعد دیگرے رہ جائیں یا فوت ہو جائیں تو ان کی قضا کیسے کی جائے گی؟ کیا قضا نماز کے لیے اذان و اقامت بھی کہی جاسکتی ہے یا نہیں؟ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان سوالوں کا تفصیلی جواب بھی ذکر کر دیا جائے، کیوں کہ ان کا تعلق بھی اوقاتِ نماز ہی سے ہے، تا کہ یہ موضوع تشنہ تکمیل نہ رہے تو اس سلسلے میں سب سے پہلے موضوع ہے: قضا نماز کے لیے اذان۔

قضا نماز کے لیے اذان:

بعض صحیح احادیث میں مذکور نبیِ اکرم ﷺ کے اپنے عمل مبارک سے پتا چلتا ہے کہ قضا نماز

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: بداية المجتهد (١/ ١٤٢) نيل الأوطار (١/ ٢/ ٢٥، ٢٦) كتاب الصلاة لابن القيم (ص: ٧٢) السلسلة الصحيحة (١/ ٩٩۔ ١٠٢، ٦٨١۔ ٦٨٣) مجموع فتاویٰ ابن تيمية (٢٢/ ١٠٣) شرح صحيح مسلم للنووي (٣/ ٥/ ١٨٣) مشكاة المصابيح (١/ ١٩١)

[2] دیکھیں: السلسلة الصحيحة (١/ ١٠٢) شرح صحيح مسلم للنووي (٣/ ٥/ ١٨٣)

کے لیے بھی اذان کہی جاسکتی ہے، بلکہ کہی جانی چاہیے۔ قدیم قول کے مطابق امام شافعی، اسی طرح امام ابوحنیفہ، امام احمد، ابوثور اور امام ابن المنذر رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے کہ فوت شدہ نماز کے لیے بھی اذان دی جائے، جب کہ امام اوزاعی، مالک اور جدید قول کی رو سے امام شافعی کے نزدیک قضا کے لیے اذان نہ کہی جائے گی۔ البتہ امام شافعی رحمہ اللہ کے کثیر اصحاب کے نزدیک بھی مذہب مختار یہی ہے کہ اذان کہی جائے، کیوں کہ اس کی دلیل صحیح حدیث ہے۔[1]

قائلینِ اذان کے دلائل میں سے ایک تو وہ حدیث ہے، جو صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتبِ حدیث میں حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک رات نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر میں تھے۔ کسی نے کہا: اے اللہ کے رسول! ہم سب کچھ دیر آرام کر لیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَخَافَ أَنْ تَنَامُوْا عَنِ الصَّلَاةِ» ”میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تم نماز سے سوئے نہ رہ جاؤ۔“

حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں سب کو جگا دوں گا، پس سب لوگ لیٹ گئے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے پشت کی ٹیک اپنی سواری سے لگائی تو ان پر بھی نیند غالب آ گئی اور وہ بھی سو گئے۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت بیدار ہوئے جب سورج کا کنارہ افق سے نکل آیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

« يَا بِلَالُ! اَيْنَ مَا قُلْتَ؟» ”اے بلال! تم نے جو وعدہ کیا تھا، اس کا کیا ہوا؟“

تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«مَا اُلْقِيَتْ عَلَيَّ نَوْمَةٌ مِثْلُهَا قَطُّ» ”مجھے تو ایسی گہری نیند آج تک کبھی نہیں آئی تھی۔“

تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ اللّٰهَ قَبَضَ أَرْوَاحَكُمْ حِيْنَ شَآءَ وَرَدَّهَا عَلَيْكُمْ حِيْنَ شَآءَ، يَا بِلَالُ! قُمْ فَأَذِّنْ بِالنَّاسِ بِالصَّلَاةِ»

”بے شک اللہ تعالیٰ نے تمھاری روحین جب چاہا قبض کر لیں اور جب چاہا تمھیں لوٹا دیں۔ اے بلال! اٹھو اور لوگوں کو نماز کی طرف بلانے کے لیے اذان کہو۔“

بخاری شریف میں آگے یہ الفاظ ہیں:

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٨٤ تا ١٧٨) فتح الباري (٢/ ٦٨) نيل الأوطار (١/ ٢/ ٦٠)

﴿ فَتَوَضَّأَ فَلَمَّا ارْتَفَعَتِ الشَّمْسُ وَابْيَضَّتْ قَامَ فَصَلّٰى ﴾[1]

''پس نبیِ اکرم ﷺ نے وضو کیا اور جب سورج سفید ہوگیا (کچھ اوپر چڑھ آیا) تو آپ ﷺ اٹھے اور نماز پڑھی۔''

سنن ابو داود میں ہے:

﴿ فَصَلّٰى بِالنَّاسِ ﴾[2] ''پھر آپ ﷺ نے لوگوں کو نماز پڑھائی۔''

جب کہ مستخرج ابو نعیم میں نبیِ اکرم ﷺ کے وضو کے ذکر کے بعد یہ بھی ہے:

﴿ فَتَوَضَّأَ النَّاسُ ﴾ ''اور لوگوں نے بھی وضو کیا۔''

صحیح بخاری میں کتاب التوحید میں ہشیم بن حصین کے طریق سے جو حدیث مروی ہے، اس میں الفاظ یوں ہیں:

﴿ فَقَضَوْا حَوَائِجَهُمْ فَتَوَضَّأُوْا إِلٰى أَنْ طَلَعَتِ الشَّمْسُ ﴾[3]

''اور (بیدار ہونے کے بعد) لوگوں نے قضاے حاجت کی اور پھر وضو کیا، یہاں تک کہ سورج طلوع ہوگیا۔''

کچھ ایسے ہی الفاظ سنن ابی داود میں خالد عن حصین کے طریق سے مروی روایت میں بھی موجود ہیں۔

وقتِ کراہت میں قضا:

صحیح بخاری اور سنن ابی داود کے ان الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے سورج کے طلوع ہونے اور اس کے بلند ہو جانے (خوب صاف و روشن ہو جانے) تک جو نماز کو موخر کیا تھا، اس کا اصل سبب درحقیقت یہ تھا کہ لوگ قضاے حاجت سے واپس نہ ہوئے تھے (جیسا کہ ان الفاظ سے پتا چل رہا ہے) ورنہ یہ سبب ہرگز نہیں تھا کہ وقتِ کراہت گزر جائے۔[4]

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٦٦، ٦٧)

[2] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢٣)

[3] صحيح البخاري مع الفتح (١٣/ ٤٤٧) رقم الحديث (٧٤٧١)

[4] فتح الباري (٢/ ٦٧)

اس طرح ان الفاظ نے وہ اختلافی مسئلہ بھی حل کر دیا، جو اوقاتِ نماز اور اوقاتِ مکروہہ سے تعلق رکھتا ہے، یعنی اگر کبھی کسی کے سوئے رہ جانے یا بھول جانے سے کسی کی نماز رہ جائے تو محض یاد آتے ہی یا بیدار ہوتے ہی پڑھ سکتا ہے۔ وہ چاہے وقتِ کراہت ہی کیوں نہ ہو، جس کے دلائل قریب ہی گزرے ہیں۔ فقہا (احناف) میں سے جو لوگ کہتے ہیں کہ وقتِ کراہت کو گزرنے دیا جائے، وہ اس پر اسی واقعے سے استدلال کرتے ہیں تو ان کے استدلال کا ضعف صحیح بخاری اور سنن ابی داود کی حدیث کے ان الفاظ نے واضح کر دیا ہے۔

الغرض اس واقعے پر مشتمل حدیث سے معلوم ہوگیا کہ وقت گزر جانے کے بعد قضا کی جانے والی نماز کے لیے بھی اذان کا کہنا ثابت ہے، اس حدیث پر امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں یوں تبویب کی ہے:

"باب الأذانِ بعد ذهابِ الوقتِ"

یعنی کسی نماز کا اصل وقت گزر جانے کے بعد اذان کہنے کا بیان۔

صحیح بخاری میں امام موصوف کی یہ عادت ہے کہ کسی اختلافی مسئلے میں حکم پر مشتمل ایسی تبویب نہیں کرتے، سوائے اس کے کہ ان کے نزدیک کسی حکم کے دلائل قوی و راجح ہوں۔ حافظ عسقلانی شارح بخاری کے نزدیک یہاں ایسا ہی ہے کہ مولف کے نزدیک اذان کہنے کے دلائل قوی ہیں، لہٰذا امام بخاری نے تبویب ہی میں حکم بیان کر دیا ہے۔

ایسے ہی بعض احادیث میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر نماز نہیں پڑھی تھی، بلکہ اس سے آگے نکل گئے تھے اور وہاں جا کر فجر کی نماز پڑھی تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جگہ سے کوچ کر جانے اور آگے کہیں جا کر نماز پڑھنے سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے کہ یہ وقتِ کراہت کے گزارنے کے لیے تھا، لیکن یہ استدلال بھی درست نہیں ہے، کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جگہ سے کوچ کر جانے کا سبب خود ان احادیث میں مذکور ہے، جیسا کہ صحیح مسلم، سنن نسائی، بیہقی اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لِيَأْخُذْ كُلُّ رَجُلٍ برأْسِ رَاحِلَتِهِ فَإِنَّ هٰذَا مَنْزِلٌ حَضَرَنَا فِيهِ الشَّيْطَانُ»[1]

---

[1] الفتح الرباني ترتيب مسند أحمد (٢/ ٣٠٧) و اللفظ لأحمد، صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ١٨٣/٥) المنتقى مع النيل (١/ ٢/ ٥٩) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٠٦)

”ہر شخص اپنی سواری پکڑ لے (اور آگے چل نکلے) بے شک یہ مقام ایسا ہے کہ جہاں ہمارے پاس شیطان پہنچ گیا ہے۔“

تو گویا اس وادی یا مقام پر شیطان کا ڈیرہ ہونے کی وجہ سے نبیِ اکرم ﷺ نے وہاں سے کوچ کیا تھا۔ شرح مسلم میں امام نووی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے تحت لکھا ہے کہ اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ شیطان کے ڈیروں میں (جہاں شیطان کا تسلط ہو) سے اجتناب کرنا مستحب ہے۔[1]

شیطان کے ڈیرے کن کن مقامات کو قرار دیا گیا، یہ ایک الگ اور مستقل موضوع ہے، جو آگے چل کر زیرِ بحث آئے گا۔ ان شاء اللہ۔ بہر حال قضائے نماز کے لیے اذان کا ثبوت اس واقعے میں موجود ہے، اس صحیح حدیث کی رو سے یہی راجح مسلک ہے اور اس کے دلائل پر مشتمل دیگر احادیث بھی ہیں، جن سے ہم صَرفِ نظر کر رہے ہیں۔

مانعینِ اذان کے دلائل کا جائزہ:

بعض دیگر احادیث میں اذان کا ذکر نہیں آتا، جیسا کہ صحیحین کی ان دونوں حدیثوں میں نمازوں کو ان کے اوقات کے بعد پڑھنے کا ذکر ہے، لیکن ان میں اذان کا تذکرہ نہیں آیا اور نہ صحیح مسلم میں حدیثِ ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ میں ہے۔[2] ایسے ہی سنن ابی داود و بیہقی اور مسند احمد میں حضرت عمرو بن امیہ العمری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث ہے۔[3] اس میں صرف اتنا مذکور ہے کہ ہم سفر میں نبیِ اکرم ﷺ کے ہمراہ تھے کہ آپ ﷺ نمازِ فجر سے سوئے رہ گئے، حتیٰ کہ سورج نکل آیا تو نبیِ اکرم ﷺ نے دو رکعتوں (سنتوں) سے نماز شروع کی، پھر نماز کی اقامت کہلوائی اور نماز پڑھی۔

ایسے ہی ایک دوسری حدیث سنن نسائی، مسند امام شافعی، صحیح ابن حبان و ابن خزیمہ اور مسندِ احمد میں ہے، جس میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ غزوۂ خندق کا واقعہ بیان فرماتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ایک دن ہماری نمازِ ظہر و عصر اور مغرب قضا ہوگئیں تو مغرب کے بعد نبیِ اکرم ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا تو انھوں نے ظہر کی اقامت کہی۔ آپ ﷺ نے اس طرح ظہر کی نماز پڑھی، جیسے

[1] دیکھیں: شرح النووي (٣/ ٥/ ١٨٣) و شرح الفتح الرباني (٢/ ٣٠٧)

[2] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٦٨) و نيل الأوطار (١/ ٢/ ٦٠)

[3] الفتح الرباني (٢/ ٣٠٦) وقال البناء ”وسنده جيد“

آپ ﷺ اس کے وقت پر اسے پڑھتے تھے، پھر عصر کی اقامت ہوئی اور اسے بھی ایسے ہی پڑھا، جیسے کہ اس کے وقت میں پڑھتے تھے۔[1]

ان احادیث میں نمازوں کو ان کے اوقات کے بعد پڑھنے کا ذکر ہے، لیکن ان میں اذان کا تذکرہ نہیں آیا۔ ایسی احادیث سے استدلال کرتے ہوئے امام اوزاعی، مالک اور جدید قول کے مطابق امام شافعی رحمہ اللہ نے ایسے موقع پر اذان نہ کہنے کی رائے اختیار کی ہے، لیکن یہ رائے مرجوح ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث سے ثابت کیا گیا ہے اور جن احادیث میں اذان کا ذکر نہیں آیا، ان کے بارے میں امام نووی رحمہ اللہ نے ان حضرات کو دو طرح سے جواب دیا ہے:

پہلا جواب:

ان احادیث میں اذان کا ذکر نہ آنے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ آپ ﷺ نے اذان کہلوائی ہی نہ ہو، بلکہ ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے اذان کہلوائی ہو، مگر راوی نے اس کا ذکر نظر انداز کر دیا ہو یا پھر اذان کا راوی کو علم نہ ہوا ہو۔ یہ جواب فتح الباری میں بھی دیا گیا ہے۔[2]

دوسرا جواب:

ممکن ہے کسی مرتبہ آپ ﷺ نے اذان نہ کہلوائی ہو، بلکہ اسے ترک کر دیا ہو، تا کہ اذان ترک کر دینے کا جواز بیان کر دیں اور اس بات کی طرف اشارہ کر دیں کہ قضا نماز کے لیے اور خصوصاً جب کہ سفر میں بھی ہو عام حالات کی طرح اذان واجب نہیں رہتی۔ یعنی اس کے وجوب میں کچھ نرمی آجاتی ہے۔[3]

سرّی و جہری نمازوں کی قضا:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی غزوۂ خندق والی اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگر دن کی کوئی سرّی نماز قضا ہو جائے اور اسے رات کے وقت پڑھا جائے تو رات ہونے کے باوجود

---

[1] المنتقى مع النيل (١/ ٢/ ٢٩، ٣٠) ونقل الشوكاني عن المعمري: وهذا إسناد صحيح جليل (١/ ٢/ ٣٠، ٦١) فتح الباري (٢/ ٦٩) مختصراً الفتح الرباني (٢/ ٣٠٩) وقال: رجال إسناده رجال الصحيح، و صححه ابن السكن.

[2] الفتح الرباني (٢/ ٧٠)

[3] دیکھیں: شرح صحيح مسلم للنووي (٣/ ٥/ ١٨٣) و نيل الأوطار (١/ ٢/ ٦٠) الفتح الرباني (٢/ ٣١١)

اسے سرّی ہی پڑھا جائے گا، یعنی اس میں قراءت جہری یا بلند آواز سے نہیں کی جائے گی، جیسا کہ حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ کے الفاظ ظہر وعصر کے بارے میں ہیں:

«فَصَلَّاهَا كَمَا يُصَلِّيهِمَا فِي وَقْتِهَا»[1]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس طرح پڑھا، جس طرح اسے اس کے وقت پر پڑھا کرتے تھے۔''

ایسے ہی فجر وغیرہ میں دن کے وقت بھی قراءت جہری ہوگی، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قضاے فجر سے پتا چلتا ہے۔[2]

قضا نماز کی اقامت وجماعت:

قضا نماز کے لیے اقامت و جماعت کے حکم کے سلسلے میں امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں مستقبل ایک باب باندھا ہے:

"بابُ من صلیّٰ بالناسِ جماعةً بَعْدَ ذهابِ الوقتِ"

''جس نے وقت گزر جانے کے بعد کسی نماز کو جماعت کے ساتھ لوگوں کو پڑھائی۔''

اس باب کے تحت جو حدیث لائے ہیں، وہ صحیح مسلم، ترمذی اور دیگر کتبِ حدیث میں بھی مروی ہے، جس میں غزوہ خندق یا خواب کا ایک واقعہ مذکور ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ غزوۂ خندق کے دن غروبِ آفتاب کے بعد آئے، جب کہ وہ کفارِ قریش کو بُرا بھلا کہہ رہے تھے اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی، اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! "مَا كِدْتُّ أُصَلِّيْ الْعَصْرَ حَتّٰى كَادَتِ الشَّمْسُ تَغْرُبُ"، ''میں نمازِ عصر اس وقت تک نہیں پڑھ سکا، جب تک کہ سورج غروب ہونے کے قریب نہیں ہوگیا۔'' تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«وَ اللّٰهِ مَا صَلَّيْتُهَا» ''اللہ کی قسم! میں نے بھی ابھی تک نہیں پڑھی۔''

آگے وہ بیان فرماتے ہیں:

«فَقُمْنَا إِلٰى بُطْحَانَ فَتَوَضَّأَ لِلصَّلَاةِ وَتَوَضَّأْنَا لَهَا، فَصَلَّى الْعَصْرَ بَعْدَ مَا غَرُبَتِ الشَّمْسُ، ثُمَّ صَلّٰى بَعْدَهَا الْمَغْرِبَ»

---

[1] الفتح الرباني ترتيب، مسند أحمد (٣/ ٤٩، ٢٥، ٦٧) صحيح سنن النسائي (٦٣٨) نصب الراية (٢/ ١٦٥)

[2] نيل الأوطار (١/ ٢/ ٢٧) منتقى الاخبار.

’’پس ہم سب وادیِ بطحان کی طرف گئے۔ نبیِ اکرم ﷺ نے نماز کے لیے وضو کیا اور ہم سب نے بھی اسی غرض کے لیے وضو کیا تو سورج غروب ہوجانے کے بعد آپ ﷺ نے نمازِ عصر پڑھی، پھر اس کے بعد آپ ﷺ نے مغرب کی نماز پڑھی۔‘‘

اس حدیث سے امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ بات اخذ کی ہے کہ وقت گزرنے کے بعد بھی جب کوئی نماز پڑھی جائے تو اس کی جماعت کرانا نبیِ اکرم ﷺ سے ثابت ہے، کیوں کہ حدیثِ مذکور کی رو سے نبیِ اکرم ﷺ نے عصر کی نماز غروبِ آفتاب کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مل کر جماعت سے پڑھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ فتح الباری میں شارح بخاری لکھتے ہیں:

’’اس حدیث میں قضا نمازوں کو باجماعت ادا کرنے کے استحباب کی دلیل ہے۔ اکثر اہلِ علم کا یہی قول ہے، سوائے لیث کے۔ اگرچہ وہ بھی نمازِ جمعہ کی قضا کی صورت میں اسے باجماعت ادا کرنے کے قائل ہیں اور ہر قضا نماز کے لیے اقامت کو بھی روا سمجھتے ہیں۔ (البتہ وہ ہر قضا کے لیے جماعت کے حق میں نہیں) جب کہ یہ حدیث اور بعض دیگر احادیث جماعت کے استحباب کے قائلین کی مؤید اور امام لیث کی رائے کے سراسر خلاف ہیں، جن میں سے ایک حدیث تو وہی ہے، جو صحیحین اور بعض دیگر کتبِ حدیث کے حوالے سے ’’قضا نماز کے لیے اذان‘‘ کے موضوع کے ضمن میں گزر چکی ہیں، جس میں حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ نے نمازِ فجر سے نبیِ اکرم ﷺ اور لشکرِ اسلامی کے سوئے رہ جانے کا واقعہ بیان کیا ہے اور وہ نماز سب نے طلوعِ آفتاب کے بعد باقاعدہ اذان اور اقامت کے ساتھ باجماعت ادا کی تھی۔

’’فجر سے سوئے رہ جانے والا واقعہ بھی کسی ایک حدیث میں نہیں، بلکہ متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے مروی احادیث میں آیا ہے اور سوائے دو ایک میں اذان کا ذکر نہ ہونے کے (جیسا کہ اس کا جواب بھی ذکر کیا جا چکا ہے) سبھی صحابہ رضی اللہ عنہم کی مرویات میں اذان و اقامت اور جماعت کا ذکر ہے۔ اگر سوئے رہ جانے والے واقعہ کو صرف ایک مرتبہ ہی شمار کیا جائے تو یہ کہا جائے گا کہ متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس واقعہ کو اپنے اپنے انداز سے بیان فرمایا ہے، جب کہ یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ وہ واقعہ ایک ہی مرتبہ پیش آیا ہو، بلکہ عین امکان

ہے کہ ایسا واقعہ کئی مرتبہ پیش آیا ہو اور احادیث سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایسا واقعہ متعدد پیش آیا تھا اور امام نووی رحمہ اللہ نے تعددِ واقعہ کے قول ہی کو ترجیح دی ہے۔''[1]

تو اس شکل میں یہ واقعہ سے متعلق حدیث مستقل ایک حجت و دلیل ہے کہ قضا نماز کو باجماعت ادا کرنا ہی مستحب ہے اور واقعۂ خندق یا غزوۂ احزاب کے دوران میں حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی صحیحین کی حدیث کی رو سے تو صرف نمازِ عصر ہی قضا ہوئی تھی، جب کہ سنن نسائی، مسند شافعی، صحیح ابن حبان و خزیمہ اور مسند احمد کی حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث (جو ابھی قریب ہی گزری ہے) کی رو سے غزوہ خندق کے موقع پر نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب کی یکے بعد دیگرے تین نمازیں ظہر، عصر اور مغرب سبھی قضا ہوگئی تھیں، جب کہ سنن ترمذی، نسائی اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث میں وہ بیان کرتے ہیں:

«إِنَّ الْمُشْرِكِيْنَ شَغَلُوْا النَّبِيَّ ﷺ يَوْمَ الْخَنْدَقِ عَنْ أَرْبَعِ صَلَوَاتٍ حَتّٰى ذَهَبَ مِنَ اللَّيْلِ مَا شَآءَ اللّٰهُ»

''مشرکین نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو غزوۂ خندق کے دن چار نمازوں سے روکے رکھا، حتیٰ کہ رات کا ایک حصہ گزر گیا، جتنا کہ اللہ نے چاہا۔''

آگے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

«فَأَمَرَ بِلَالًا فَأَذَّنَ ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى الظُّهْرَ، ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى الْعَصْرَ، ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى الْمَغْرِبَ، ثُمَّ أَقَامَ فَصَلَّى الْعِشَآءَ»[2]

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم فرمایا تو انھوں نے اذان کہی، پھر اقامت کہی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر کی نماز پڑھی، پھر انھوں نے اقامت کہی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز پڑھی، پھر انھوں نے اقامت کہی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کی نماز پڑھی، پھر انھوں نے اقامت کہی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عشا کی نماز پڑھی۔''

---

[1] دیکھیں: شرح الفتح الرباني (٢/ ٣٠٩)

[2] الفتح الرباني (٢/ ٣٠٩، ٣١٠) سنن الترمذي مع التحفة (١/ ٥٢٣) المنتقى مع النيل (١/ ٢/ ٦٠) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٦٣٩)

اس حدیث کو نقل کرکے علامہ مجد الدین ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے "منتقی الأخبار" میں امام ترمذی نے جامع میں کہا ہے کہ اس کی سند میں کوئی خاص قابلِ گرفت علت نہیں، "لیس بإسنادہ باسٌ" سوائے اس کے کہ اس کے دوسرے راوی ابو عبیدہ کا اپنے والد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے سماع (سننا) ثابت نہیں۔ امام شوکانی رحمہ اللہ نے "نیل الأوطار" میں لکھا ہے کہ اس کے تمام راوی صحیح کے راوی ہیں اور اس کی سند میں کوئی علت نہیں، سوائے ابو عبیدہ کے اپنے والد سے عدمِ سماع کے اور حفاظِ حدیث نے عدمِ سماع کو ہی یقینی قرار دیا ہے اور "الفتح الرباني" میں اس کی سند کو جید قرار دیا گیا ہے۔

موطا امام مالک میں واقع ایک طریق ایسا بھی ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ ان کی دو نمازیں یعنی نمازِ ظہر و عصر قضا ہوئی تھیں۔[1] اس طرح کی چار روایات ہیں اور سوئے رہ جانے والی احادیث کی طرح ہی سب قضا نماز کو باجماعت ادا کرنے کی دلیل ہیں۔

ایک اِشکال اور اس کا حل:

اب رہی یہ بات کہ ایسا کیوں ہے کہ بعض صحابہ نے غزوہ خندق کے موقع پر ایک نمازِ عصر قضا ہونے کا ذکر کیا ہے، بعض نے دو کا، کسی نے تین کا اور کسی نے چار کا؟

اس اشکال کے حل کی طرف ہم "صلاۃ الوسطیٰ" کی تعیین کے ضمن میں بھی اشارہ کریں گے کہ اہلِ علم میں سے بعض نے ترجیح کو اختیار کیا ہے اور معمری نے کہا ہے کہ صحیحین یعنی بخاری و مسلم میں جو ہے وہ راجح ہے۔ یعنی ترجیح اس بات کو ہے کہ صرف ایک نمازِ عصر ہی قضا ہوئی تھی، اس بات کی تصریح کرتے ہوئے امام ابن العربی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحیح یہی ہے کہ مشرکین و کفارِ قریش نے جس نماز سے روکا تھا، وہ صرف ایک ہی نمازِ عصر تھی۔ شارح بخاری حافظ ابن حجر رحمہ اللہ "فتح الباري" میں لکھتے ہیں کہ امام ابن العربی رحمہ اللہ کے اس قول کی تائید صحیح مسلم (اور دیگر کتبِ حدیث) میں مروی حضرت علی رضی اللہ عنہ والی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے، جس میں ہے:

«شَغَلُوْنَا عَنِ الصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ صَلَاةِ الْعَصْرِ»[2]

"کفار نے ہمیں نمازِ وسطیٰ یعنی نمازِ عصر سے روکے رکھا۔"

---

[1] بحواله فتح الباري (٢/ ٦٩)

[2] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٢٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٥٩)

یہ تو اس اشکال کا ایک حل ہوا کہ بخاری و مسلم کی احادیث چونکہ صحیح تر اور شکوک و شبہات سے بالا ہیں، لہٰذا یہی کہا جائے کہ صرف نمازِ عصر قضا ہوئی تھیں، جب کہ بعض اہلِ علم نے دوسری رائے اختیار فرمائی ہے اور ترجیح کے بجائے جمع و تطبیق سے اس اشکال کو حل کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ واقعہ خندق صرف ایک ہی دن پر نہیں، بلکہ کئی دنوں پر مشتمل ہے اور یہ مختلف صورتیں، مختلف ایام میں الگ الگ پیش آئیں۔ (یعنی یہ سبھی واقع ہوئیں، لیکن کوئی کسی دن اور کوئی کسی دوسرے دن) امام ابن سید الناس جیسے بعض اہلِ علم نے اس جمع و تطبیق سے رفعِ اشکال کو اولیٰ قرار دیا ہے۔[1]

امام شوکانی رحمہ اللہ نے ''نیل الأوطار'' میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ والی حدیث میں نمازوں کے قضا ہونے کے ذکر پر مشتمل حدیث کی شرح بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اگرچہ صحیحین کی حدیث میں صرف ایک نمازِ عصر کا ذکر ہے، لیکن اس حدیث اور ایسی ہی دیگر احادیث، جن میں سے کسی میں دو نمازوں کے قضا ہونے کا ذکر ہے تو کسی میں چار کا، ان میں صحیحین کی حدیث کی نسبت اضافی بات وارد ہوئی ہے اور اس اضافے کو لینا ضروری ہے۔ (خصوصاً جب کہ اس کی سند بھی قابلِ حجت ہو) اور کسی راوی نے اگر صرف نمازِ عصر کے ذکر پر ہی اکتفا کیا ہے تو یہ دوسرے (زیادہ نمازوں کو ذکر کرنے والے) راویوں کے لیے ذریعہ تردید و تنقید نہیں بن سکتا، جنھوں نے ظہر و عصر یا چار نمازیں کہی ہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس نے صرف ایک نمازِ عصر کا ذکر کیا ہے، اس نے اپنے علم کے مطابق ذکر کیا ہے اور جو اُسے معلوم نہیں ہو سکا، وہ اس نے ترک کر دیا ہے (اور جنھیں ایک سے زیادہ نمازوں کی تاخیر و قضا کا علم ہوا، انھوں نے زیادہ بیان کر دیا) اور معروف قاعدہ ہے:

''مَنْ عَلِمَ حُجَّةٌ عَلَىٰ مَنْ لَمْ يَعْلَمْ''

''جسے کسی بات کا علم ہو گیا، وہ اس پر حجت ہے، جسے اس بات کا علم نہ ہو سکا۔''

اس طرح اس واقعہ کے کئی دنوں میں متعدد بار وقوع پذیر ہونے والی جمع و تطبیق کی بھی ضرورت نہیں رہ جاتی۔[2]

---

[1] فتح الباري (٢/ ٦٩، ٧٠) الفتح الرباني (٢/ ٣١١)

[2] نيل الأوطار (١/ ٣٠٢)

الغرض اس واقع کو ایک شمار کر لیں تو یہ ایک دلیل ہے کہ قضا نماز کی جماعت بھی مستحب ہے اور اگر اسے چار مختلف اوقات میں واقع ہونے والی صورتیں شمار کریں تو یہ چاروں الگ الگ دلائل ہیں کہ قضا کے لیے نبیِ اکرم ﷺ نے جماعت کرائی تھی۔

قضا نمازوں کو پڑھنے میں ترتیب:

قضا نمازوں کے لیے اذان و اقامت اور جماعت کے شرعی حکم کے بعد اب آیئے ایک تیسرے سوال کی طرف اور یہ سوال صرف اس صورت میں سامنے آتا ہے، جب کسی کی صرف ایک نماز قضا نہ ہوئی ہو، بلکہ متعدد نمازیں قضا ہوجائیں۔ ایسی شکل میں اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان نمازوں کو ان کی اصل ترتیب کے مطابق ہی پڑھا جائے، جس ترتیب سے وہ قضا ہوئی ہیں یا قضا نمازوں کو پڑھتے وقت ترتیب کا خیال رکھنا واجب نہیں ہے اور کسی وقت کی ادا نماز اور قضا شدہ نماز میں ترتیب کا حکم کیا ہے؟

اس سلسلے میں بنیادی بات یہ ہے کہ قضا نمازوں کو پڑھتے وقت ان کی ترتیب کا خیال رکھنا ہی افضل اور اولیٰ ہے، تاکہ وہ جس ترتیب سے قضا ہوئی تھیں، اسی ترتیب ہی سے پڑھی جاسکیں۔ یہ حکم بعض صورتوں میں استحباباً ہے، وجوباً نہیں، کیوں کہ بعض صورتوں میں ترتیب ساقط ہو جاتی ہے اور وجوب کی رائے رکھنے والے فقہا نے جو دلائل ذکر کیے ہیں، ان سے استدلال میں بعض اہلِ علم نے ضُعف واضح کیا ہے۔

قضا اور ادا میں ترتیب:

ائمہ و فقہا میں سے امام ابو حنیفہ، مالک، لیث، زہری، نخعی اور ربیعہ رحمہم اللہ نے قضا نماز کو کسی وقت کی ادا نماز سے پہلے پڑھنے کو واجب قرار دیا ہے۔ اگرچہ ان کے مابین بھی بعض تفصیلات میں اختلاف ہے۔ پہلے قضا پڑھنے اور پھر اس وقت کی ادا یا حاضر نماز پڑھنے والی ترتیب کے وجوب پر غزوہ خندق میں نمازِ عصر کے قضا ہونے اور غروبِ آفتاب کے بعد نمازِ مغرب سے پہلے پڑھنے اور پھر مغرب پڑھنے کے واقعہ پر مشتمل صحیحین اور دیگر کتبِ حدیث میں مروی حدیث سے استدلال کیا گیا ہے، جب کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ قضا و ادا میں سے پہلے قضا پڑھنا واجب نہیں ہے۔

وجوب کے قول والوں کا جواب دیتے ہوئے ”فتح الباري“ میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے اور ”نیل الأوطار“ میں امام شوکانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ غزوہ خندق والی حدیث وجوب کی دلیل نہیں بن سکتی، سوائے اس کے کہ یہ مانا جائے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل محض امت کے حق میں وجوب کی دلیل ہے، جب کہ معروف قاعدہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل محض اس فعل کے وجوب پر دلالت نہیں کرتا۔ ہاں اگر معروف حدیثِ بخاری: «صَلُّوْا کَمَا رَأَیْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ»

”تم بھی اسی طرح نماز پڑھو، جیسے تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔“

اس ارشادِ نبوی کے عمل سے استدلال کرتے ہوئے وجوب کا کہیں تو بات قوی ہو جاتی ہے، جب کہ اس مسئلے پر بحث کے سوا دیگر امور میں خود شافعیہ نے بھی اس کا اعتبار کیا ہے۔[1]

”نیل الأوطار“ میں آگے چل کر یہ بھی لکھا ہے کہ قائلینِ وجوب کا استدلال اس بات سے بھی ہے کہ یاد آنے والی نماز، جو اصل وقت سے نکل چکی ہو، اب یاد آنے پر اس کا وقت بہت تھوڑا ہے، جب کہ وقتی نماز کا وقت کھلا ہے، لہٰذا تھوڑے اور تنگ وقت والی قضا نماز کو پہلے پڑھنا واجب ہے۔[2]

تنگ وقت والی حاضر نماز پہلے یا قضا پہلے؟:

فتح الباری کے ایک دوسرے مقام پر شارح بخاری حافظ عسقلانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس بات میں اختلاف ہے کہ اگر کسی کو کسی حاضر نماز کے تنگ سے وقت ہی میں کوئی قضا نماز یاد آجائے تو وہ قضا کو پہلے پڑھے، چاہے حاضر نماز کا وقت گزر ہی کیوں نہ جائے یا حاضر نماز کو پہلے پڑھے یا اسے اختیار ہے کہ وہ ان دونوں میں سے جسے چاہے پہلے پڑھ لے؟

1. پہلا قول ہے کہ قضا ہی کو پڑھے، چاہے حاضر کا وقت گزر ہی کیوں نہ جائے۔ یہ امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے۔
2. امام شافعی، اصحابِ رائے یعنی احناف اور اکثر اہلِ حدیث کا مسلک یہ ہے کہ (اس صورت میں) حاضر نماز کو پہلے پڑھے (تا کہ کہیں اس کا بھی وقت نہ نکل جائے)۔
3. امام اشہب رحمہ اللہ نے تیسرے قول کو اختیار کیا ہے کہ ان میں سے جسے چاہے پہلے پڑھ لے اور

[1] فتح الباري (٢/ ٧٢) نیل الأوطار (١/ ٢/ ٢٩)

[2] نیل الأوطار (١/ ٢/ ٢٩)

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ اختلاف صرف اس وقت ہے، جب قضا نمازیں زیادہ نہ ہوں اور اگر قضا نمازیں (کثیر) زیادہ ہوں تو پھر اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ پہلے موجودہ وقت کی حاضر نماز ہی کو ادا کیا جائے گا، پھر نمازوں کی قلیل و کثیر کی حد میں بھی اختلاف ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ اگر صرف ایک ہی نماز قضا ہوئی ہو تو قلیل ہے۔ (اور زیادہ ہو جائیں تو کثیر) اور یہ بھی کا گیا ہے کہ اگر چار نمازیں قضا ہوں تو قلیل ہیں (اس سے زیادہ ہو جائیں تو کثیر)۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ کے اس قول سے اس بات کی وضاحت تو ہوگئی ہے کہ اگر قضا نماز قلیل ہو، یعنی دو ایک ہو تو پہلے اسے پڑھ لیا جائے اور پھر وقتی نماز کو۔ قلیل و کثیر کے سلسلے میں دو ایک نماز کو قلیل شمار کرنا ہی مناسب لگتا ہے اور یہی وہ صورت ہے، جس میں انھیں پڑھنے کی شکل میں وقتی نماز کا تنگ سا وقت نہیں گزرنے پائے گا۔ اگر وقت بھی تنگ ہو اور قلیل کی مقدار چار شمار کرتے ہوئے چار نمازوں کو یکے بعد دیگرے پڑھنے لگیں تو ظاہر ہے کہ پھر تو پانچویں حاضر نماز کے بھی قضا ہو جانے کا خدشہ ہے۔ ہاں اگر حاضر نماز کا وقت تنگ نہ ہو تو پھر دوسری بات ہے، تب چاروں یا تینوں ہی کو پہلے پڑھ لیں۔

جب حاضر نماز کی جماعت کھڑی ہو؟

یہ بھی اس وقت ہے جب کہ حاضر نماز کا وقت کافی ہو اور قضا پڑھنے والے صرف آپس ہی میں ہوں اور اگر قضا والا اکیلا ہے اور حاضر نماز کا وقت بھی بہت کم ہے، بلکہ ابھی ابھی شروع ہی ہوا ہے، لیکن جب وہ مسجد میں پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے کہ حاضر یا وقتی نماز کی جماعت کھڑی ہو چکی ہے تو وہ کیا کرے؟

اسی سے ملتا جلتا سوال شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے بھی کیا گیا، جو ان کے مجموعہ فتاویٰ (۲۲/ ۱۰۶) میں مذکور ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ ایک شخص کی نمازِ عصر قضا ہوگئی۔ جب وہ مسجد میں پہنچا تو دیکھا کہ مغرب کی جماعت ہو رہی ہے تو کیا وہ قضا نماز مغرب سے پہلے پڑھے یا نہیں؟

حمد و ثنائے باری تعالیٰ کے بعد موصوف نے جواب دیا کہ وہ (عصر پہلے نہ پڑھے) بلکہ وہ امام کے ساتھ شامل ہو کر پہلے مغرب کی نماز پڑھے، پھر عصر کی نماز پڑھ لے، اس پر علما کا اتفاق ہے، لیکن کیا وہ عصر کی نماز کے بعد مغرب کی نماز کو پھر دہرائے گا یا نہیں؟ اس سلسلے میں ہمارے علما کے دو قول ہیں:

1. دہرائے گا۔ یہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما، امام مالک، ابو حنیفہ اور مشہور روایت کے مطابق امام احمد رحمہم اللہ کا قول ہے۔

2 وہ نمازِ مغرب کو نہیں دہرائے گا۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، امام شافعی اور ایک قول میں امام احمد رحمہما اللہ کا مذہب ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ ان دونوں اقوال کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں، اگر کوئی شخص حسبِ استطاعت اللہ کا تقویٰ اختیار کرتا ہے تو:

"فَإِنَّ اللّٰهَ لَمْ يُوجِبْ عَلَى الْعَبْدِ أَنْ يُصَلِّيَ الصَّلَاةَ مَرَّتَيْنِ."[1]

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے کسی بندے پر یہ واجب نہیں کیا کہ وہ کسی نماز کو دو مرتبہ پڑھے۔"

اس سے اگلے سوال کے ضمن میں انھوں نے لکھا ہے کہ ترتیب کو واجب قرار دینے والوں کا بھی اس میں اختلاف ہے کہ وقت کی تنگی میں ترتیب ساقط ہو جاتی ہے یا نہیں؟ امام احمد کے مشہور ترین قول میں ہے کہ ایسی ترتیب ساقط ہو جاتی ہے، جیسا کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے اصحاب کا قول بھی ہے۔ البتہ ان کے ایک غیر معروف قول کی رو سے اسی طرح امام مالک کے نزدیک ایسے وقت میں بھی ترتیب ساقط نہیں ہوتی اور زیادہ مشہور ہی زیادہ صحیح بھی ہے۔ واللہ أعلم.[2]

قضا نماز اور خطبہ جمعہ:

ایک صورت یہ بھی ہے کہ کوئی شخص جمعہ کے دن دوپہر کے وقت مسجد میں اس وقت داخل ہو، جب کہ خطبہ جمعہ شروع تھا اور اسے یاد آیا کہ اس پر تو ابھی ایک نماز قضا بھی ہے تو اس نے دورانِ خطبہ ہی وہ قضا نماز پڑھ لی، جب کہ وہ خطبہ کی آواز بھی نہیں سن پا رہا۔ کیا اس کا فعل صحیح ہے یا نہیں؟

اس سلسلے میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا فتوی ہے کہ وہ خطبے کی آواز سن پا رہا ہو یا نہ سن پا رہا ہو، اسے چاہیے کہ اگر وہ قضا نماز پڑھ لینے کے بعد بھی جمعہ کو پا سکتا ہے تو پہلے قضا نماز ہی پڑھے، بلکہ جمہور علما کے نزدیک ایسا کرنا ہی اس پر واجب ہے۔

کیوں کہ خطبے کے دوران میں جو نماز پڑھنے کی ممانعت ہے وہ علما کے صحیح تر قول کی رو سے فریضے کو شامل نہیں ہے اور قضا نماز فریضہ ہے، بلکہ وہ ممانعت تو تحیۃ المسجد کو بھی شامل نہیں ہے، کیوں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۲/ ۱۰۶)

[2] مجموع الفتاویٰ (۲۲/ ۱۰۸)

«إِذَا دَخَلَ أَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ، وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ فَلَا يَجْلِسْ حَتَّىٰ يُصَلِّيَ رَكْعَتَيْنِ»

''جب تم میں سے کوئی شخص مسجد میں داخل ہو اور امام خطبہ دے رہا ہو تو پھر بھی وہ دو رکعت پڑھے بغیر نہ بیٹھے۔''

ایسے ہی قضا نماز کو ممنوع وقت میں پڑھنا صحیح حدیث سے ثابت ہے، کیوں کہ نبیِ اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنَ الْفَجْرِ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَقَدْ أَدْرَكَ الْفَجْرَ»[1]

''جس نے طلوعِ آفتاب سے پہلے فجر کی ایک رکعت بھی پڑھ لی، تو اس نے فجر کی نماز پالی (جیسا کہ اس کی تفصیل ذکر کی جا چکی ہے)۔''

متعدد قضا نمازوں کے پڑھنے میں ترتیب:

اب آیئے اس سلسلے کے آخری موضوع کو بھی حل کر لیں کہ اگر متعدد نمازیں قضا ہو گئی ہوں تو کیا انھیں پڑھتے وقت ترتیب واجب ہے یا نہیں؟ دراصل یہ مسئلہ بھی اہلِ علم کے مابین مختلف فیہ ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور بعض دیگر فقہا نے کہا ہے کہ ان کے مابین بھی ترتیب واجب ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور بعض فقہاے محدّثین کے نزدیک قضا نمازوں کو پڑھتے وقت ان کے مابین ترتیب واجب نہیں ہے۔

قائلینِ وجوب کا استدلال تو غزوہ خندق والی احادیث سے ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ''باب قضاء الصلاة الأولىٰ فالأولىٰ'' میں اسی طرف اشارہ کیا ہے اور اس باب کے تحت غزوہ احزاب سے متعلق حضرت جابر رضی اللہ عنہ والی حدیث وارد کی ہے، جس میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا کفارِ قریش کو برا کہنا اور غروبِ آفتاب کے بعد نمازِ عصر اور پھر مغرب پڑھنے کا ذکر ہوا ہے۔ اس تبویب سے بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ قضا نمازوں کو ترتیب ہی سے پڑھنا چاہیے، لیکن شارح بخاری

---

[1] صحيح مسلم مع شرح النووي (٣/ ٥/ ١٠٤) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٨) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٠٤) الإحسان في تقريب صحيح ابن حبان، رقم الحديث (١٨٢) و مجموع الفتاویٰ (٢٢/ ١٠٧)

لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے قائلینِ وجوب کا دلیل حاصل کرنا صحیح نہیں، سوائے اس کے کہ جب یہ کہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ کے افعال امت کی نسبت وجوب کے لیے ہوتے ہیں۔ ہاں اگر ارشادِ نبوی:

«صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ»

''تم اسی طرح نماز پڑھو، جیسے مجھے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔''

کے عموم سے استدلال کریں تو بات میں قوت آجاتی ہے اور خود شافعیہ نے بھی اس مسئلے کے سوا کئی امور میں اس کا اعتبار کیا ہے۔[1]

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ترتیب کا عدمِ وجوب ہی ظاہر ہے، کیوں کہ نبیِ اکرم ﷺ کا محض کوئی فعل امت کے حق میں وجوب کے لیے نہیں ہوتا۔ اور «صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِيْ أُصَلِّيْ» والی حدیث سے استدلال بھی اعتراض سے خالی نہیں ہے۔

قائلینِ وجوب کے بعض دیگر دلائل کا جائزہ:

ترتیب کے وجوب کو مزید قوی بنانے کے لیے بعض دیگر احادیث سے بھی استدلال کیا جاتا ہے کہ اگر وہ صحیح ہوتیں تو بات بن جاتی، لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں، جو قابلِ استدلال ہو۔ مثلاً معجم کبیر طبرانی اور مسند احمد میں ایک حدیث ہے، جس میں حضرت ابو جمعہ حبیب بن سباع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ عَامَ الْأَحْزَابِ صَلَّى الْمَغْرِبَ فَلَمَّا فَرَغَ قَالَ: هَلْ عَلِمَ أَحَدٌ مِنْكُمْ إِنِّيْ صَلَّيْتُ الْعَصْرَ؟ قَالُوْا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ مَا صَلَّيْتَهَا فَأَمَرَ الْمُؤَذِّنَ فَأَقَامَ الصَّلَاةَ فَصَلَّى الْعَصْرَ، ثُمَّ أَعَادَ الْمَغْرِبَ»

''نبیِ اکرم ﷺ نے غزوۂ احزاب کے موقع پر مغرب کی نماز پڑھی، جب آپ ﷺ نمازِ مغرب سے فارغ ہوگئے تو لوگوں سے پوچھا: کیا تم میں سے کوئی یہ بات جانتا ہے کہ میں نے عصر کی نماز پڑھی تھی یا نہیں؟ صحابہ نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ نے عصر نہیں پڑھی، تب آپ ﷺ نے موذن کو حکم فرمایا اور اس نے اقامت کہی تو آپ ﷺ نے عصر کی نماز پڑھی اور پھر مغرب کی نماز دہرائی۔''

---

[1] نيل الأوطار (١/ ٢/ ٣٠) الفتح الرباني (٢/ ٣١١)

اس روایت میں نمازِ مغرب کو دہرانے کے الفاظ سے ترتیب کے وجوب کو کافی تقویت مل سکتی تھی، بشرطیکہ یہ حدیث قابلِ حجت ہو، لیکن ایسا نہیں، اس حدیث کے متن اور سند دونوں پر کلام کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کے بارے میں ''فتح الباري'' (٢/ ٦٩) میں لکھا ہے کہ اس حدیث کا صحیح ہونا محلِ نظر ہے، کیوں کہ یہ صحیح بخاری و مسلم میں وارد شدہ حدیث کے مخالف ہے اور وہ اس طرح کہ یہاں تو آپ ﷺ کی طرف یہ منسوب کیا جا رہا ہے کہ آپ ﷺ نے مغرب کے بعد لوگوں سے پوچھا کہ میں نے عصر پڑھی ہے یا کہ نہیں اور بخاری و مسلم میں صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے کفارِ قریش کو برا بھلا کہتے ہوئے آنے اور عصر کے غروبِ آفتاب کے قریب پڑنے کا سن کر حلفیہ فرمایا تھا:

«وَاللّٰهِ مَا صَلَّيْتُهَا» ''اللہ کی قسم! میں نے بھی عصر کی نماز نہیں پڑھی۔''

گویا نبیِ اکرم ﷺ ہرگز نہیں بھولے تھے، بلکہ مشرکین سے مقابلہ جاری ہونے کی وجہ سے عصر رہ گئی تھی۔ جب کہ اس روایت سے یہ اثر ملتا ہے کہ آپ ﷺ عصر ہی کو بھول گئے تھے اور آپ ﷺ نے مغرب کی نماز پڑھ لی تھی، پھر مغرب پڑھ چکنے کے بعد شک گزرا کہ میں نے تو شاید عصر نہیں پڑھی۔ چنانچہ آپ ﷺ نے لوگوں سے پوچھا تو پتا چلا کہ آپ ﷺ نے عصر نہیں پڑھی تھی۔ صحیحین کی حدیث کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس روایت کے متن کو غیر صحیح قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی سند کو بھی ضعیف قرار دیا گیا ہے، جس کی دو وجوہات ہیں:

1. اس کا ایک راوی ''محمد بن یزید'' جو ''ابن ابی زیاد فلسطینی'' ہے، اسے ابن ابی حاتم نے اپنے والد گرامی کے حوالے سے مجہول قرار دیا ہے اور اس کے بارے میں یہی بات امام دارقطنی رحمہ اللہ نے کہی ہے، ان دونوں کی طرح علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے بھی اسے مجہول کہا ہے۔
2. اس روایت کے ضعیف ہونے کی دوسری علت، اس کا ایک دوسرا راوی ابن لہیعہ ہے، جن کے بارے میں کلام معروف ہے کہ وہ خرابیِ حفظ کی وجہ سے ضعیف ہے۔ ''الدراية في تخريج أحاديث الهداية'' میں حافظ عسقلانی رحمہ اللہ نے اسی وجہ سے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے اور ''نصب الراية'' میں علامہ زیلعی رحمہ اللہ حنفی نے اس روایت کو ان دونوں وجوہات کی بنا پر معلول قرار دیا ہے۔ علامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے ''مجمع الزوائد'' میں روایت کو نقل کر کے لکھا ہے

کہ امام احمد رحمہ اللہ نے (مسند میں) اور طبرانی نے ”المعجم الکبیر“ میں روایت کیا ہے اور اس کی سند میں ابن لہیعہ ہے، جس میں ضعف پایا جاتا ہے۔ دورِ حاضر کے معروف محدث علامہ البانی رحمہ اللہ نے بھی اس روایت کو اپنی کتاب ”إرواء الغلیل“ میں ضعیف قرار دیا ہے۔[1]

اس ساری تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ روایت مفیدِ مطلب نہیں ہے۔

ایسے ہی ایک روایت سنن کبریٰ بیہقی و دارقطنی میں مرفوعاً اور موطا امام مالک رحمہ اللہ میں موقوفاً حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

«مَنْ نَسِيَ صَلَاةً فَلَمْ يَذْكُرْهَا إِلَّا وَهُوَ مَعَ الْإِمَامِ فَإِذَا سَلَّمَ الْإِمَامُ فَلْيُصَلِّ صَلَاتَهُ الَّتِيْ نَسِي، ثُمَّ لِيُصَلِّ بَعْدَهَا الصَّلَاةَ الْأُخْرٰى... وَفِي لَفظ: ثُمَّ لِيُعِدِ الَّتِيْ صَلّٰى مَعَ الْإِمَامِ»[2]

”کوئی شخص اپنی نماز پڑھنا بھول گیا اور اسے وہ اس وقت یاد آئی جب کہ وہ (کسی دوسری نماز کے لیے) امام کے ساتھ جماعت میں کھڑا تھا۔ اسے چاہیے کہ جب امام سلام پھیرے تو وہ اسی نماز کو پڑھ لے، جسے وہ بھول کر نہیں پڑھ سکا تھا اور پھر اس نماز کو دوبارہ پڑھ لے جو اس نے امام کے ساتھ پڑھی تھی۔“

اس روایت کو نقل کرنے کے بعد حافظ عسقلانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اس حدیث کو دارقطنی و بیہقی نے مرفوعاً حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے اور امام دارقطنی نے کہا ہے کہ اس کے ایک راوی ابو ابراہیم ترجمانی کو وہم ہوگیا ہے کہ اس قول کو مرفوعاً بیان کیا ہے (ابو ابراہیم کا وہم واضح ہوگیا) اور یہ موقوف روایت سنن دارقطنی و موطا امام مالک میں موجود ہے۔ امام نسائی نے اس روایت کے بارے میں ”الکنیٰ“ میں کہا ہے کہ اس کا مرفوعاً بیان ہونا غیر محفوظ ہے اور ابو زرعہ نے کہا ہے کہ اس کا مرفوعاً بیان ہونا غلط ہے۔[3]

ایسے ہی ایک تیسری حدیث بھی ہے، جس میں ہے:

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: نصب الرایة (٢/ ٦٤) مجمع الزوائد (١/ ٣٢٤) إرواء الغلیل (١/ ٢٩)

[2] سنن الدارقطني (ص: ١٦٢) و سنن البیهقي (٢/ ٢٢١) بحواله نصب الرایة (٢/ ١٦٢)

[3] الدرایة بحواله تحفة الأحوذي (١/ ٥٣٢)

«لَا صَلَاةَ لِمَنْ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ»[1]

''اس کی کوئی نماز نہیں، جس پر کوئی پہلی نماز واجب الاداء ہو۔''

جب کہ علامہ عینی حنفی نے اس روایت کے بارے میں کہا ہے کہ ابوبکر کے بقول یہ روایت باطل ہے اور بعض نے اس کی تاویل یہ کی ہے کہ جس پر کوئی فرض نماز باقی ہو، اس کی کوئی نفلی نماز نہیں ہوتی۔ علامہ ابن الجوزی نے کہا ہے کہ اس روایت کو ہم لوگوں کی زبان سے سنتے تو ہیں، لیکن مجھے اس کی کوئی اصل معلوم نہیں ہوسکی۔ یعنی یہ روایت بے اصل اور من گھڑت ہے۔[2]

اس سے معلوم ہوا کہ یہ روایت نہ صرف نا قابلِ استدلال ہے، بلکہ بے اصل اور جعلی ہے۔

خلاصہ کلام:

قضا نمازوں اور ان میں ترتیب سے متعلق گفتگو کا لبِ لباب اور خلاصہ یہ ہے کہ عذر و مجبوری کی وجہ سے جو نمازیں قضا ہو جائیں، ان کو با قاعدہ اذان و اقامت اور جماعت کے ساتھ ادا کیا جائے اور ایک سے زیادہ قضا ہونے کی صورت میں انھیں ترتیب ہی سے پڑھنا بہتر ہے۔ حتیٰ کہ بعض اہلِ علم نے اسے واجب کہا ہے۔ بعض دیگر نے عدمِ وجوب کی رائے اختیار کی ہے اور اکثر محققین نے اسے ظاہر قرار دیا ہے۔ اگر کوئی مسجد میں پہنچے اور وہاں جماعت کھڑی ہو تو اسے چاہیے کہ پہلے وہ جماعت سے مل کر وہ حاضر نماز پڑھ لے اور بعد میں قضا نمازوں کو ترتیب وار پڑھ لے اور اس ادا شدہ نماز کو دہرانے کی بھی ضرورت نہیں، کیوں کہ دہرانے پر دلالت کرنے والی روایات نا قابلِ حجت ہیں۔

وتر اور سنتوں کی قضا:

قضا نمازوں کے سلسلے میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ کسی نماز کے قضا ہو جانے کی صورت میں کیا اس نماز کے صرف فرض ہی پڑھے جائیں گے یا اس کی سننِ راتبہ یا موکدہ سنتیں بھی پڑھنی چاہییں؟ تو اس سلسلے میں ''فتح الباري'' (۲/ ۶۸۰) میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے اور شیخ احمد عبدالرحمٰن بن البناء نے ''الفتح الرباني'' (۲/ ۳۱۲) میں فجر کی نماز قضا ہو جانے والے واقعہ پر مشتمل حدیث کی شرح کے ضمن میں لکھا ہے کہ اس حدیث میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ قضا نماز کی موکدہ سنتیں بھی

---

[1] مصدر سابق.

[2] دیکھیں: تحفة الأحوذي (۱/ ۵۳۲)

پڑھنی چاہییں، کیوں کہ صحیح بخاری و مسلم اور دیگر کتب والی اس صحیح حدیث کی رو سے سورج طلوع ہونے کے بعد فجر پڑھنے کی صورت میں بھی نبیِ اکرم ﷺ نے سنتیں پڑھی تھیں۔

اس سلسلے میں امام محمد بن قدامہ نے ''المغني'' میں سنتوں کے بیان کے ضمن میں بڑی عمدہ بحث کی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''وہ سنتیں جو فرضوں سے پہلے پڑھی جاتی ہیں (جیسے فجر و ظہر کی پہلی سنتیں ہیں) ان کا وقت نماز کے وقت کا آغاز ہونے سے لے کر نماز پڑھ چکنے کے درمیان ہے اور وہ سنتیں جو فرضوں کے بعد پڑھی جاتی ہیں (جیسے ظہر و مغرب اور عشا کی سنتیں ہیں) ان کا وقت نماز پڑھ چکنے سے لے کر اس نماز کا وقت گزر جانے تک ہے۔ اگر کوئی سنتیں اپنے ان اوقات سے رہ جائیں (قضا ہو جائیں) تو امام احمد رحمہ اللہ کا کہنا ہے:

''فجر کی دو سنتوں کو قضا کرنے اور عصر کے بعد (ظہر کی آخری دو رکعتوں کو) قضا کرنے کے سوا کسی دوسری سنتوں کو قضا کرنا ہمیں نبیِ اکرم ﷺ سے معلوم نہیں ہو سکا (یعنی امام احمد کے نزدیک فجر کی پہلی دو سنتوں اور ظہر کی آخری دو سنتوں کی قضا کرنا ثابت ہے)۔''

ابن حامد رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''تمام موکدہ سنتوں کو اوقات مکروہہ کے سوا تمام اوقات میں قضا کیا جائے گا، کیوں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے بعض نمازوں کی موکدہ سنتوں کو قضا کیا ہے اور باقی نمازوں کی موکدہ سنتوں کو ہم انھی پر قیاس کرتے ہیں۔''

آگے امام ابن قدامہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''ہمارے بعض اصحاب کا کہنا ہے کہ ضحیٰ یا چاشت کے وقت تک فجر کی دو سنتوں کو اور ظہر کی (آخری) دو سنتوں کے سوا کوئی سنتیں قضا نہیں کی جائیں گی۔''

امام احمد رحمہ اللہ نے کہا ہے:

''فجر کے بعد میں وتروں کی قضا کو جانتا ہوں اور فجر کی سنتیں ضحیٰ کے وقت تک قضا کی جا سکتی ہیں۔''

امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے:

’’فجر کی سنتوں کو دو پہر یعنی وقتِ زوال تک قضا کیا جاسکتا ہے، پھر اس کے بعد نہیں۔‘‘

امام ابراہیم نخعی، سعید بن جبیر اور حسن بصری رحمہم اللہ کا کہنا ہے:

’’جب سورج طلوع ہو جائے تو پھر کوئی وتر نہیں۔‘‘

بعض دیگر اہلِ علم کا کہنا ہے:

’’جس نے فجر کی نماز پڑھ لی، اب اس پر کوئی وتر نہیں ہے۔ جب کہ پہلا قول ہی زیادہ صحیح ہے، جس کی وجہ ہم نے ذکر کر دی ہے۔‘‘

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ آدمی کے لیے کچھ ایسے نوافل ہوں، جس کی وہ پابندی کرتا ہو، جو اگر کبھی فوت ہو جائیں تو انھیں قضا کر لے۔‘‘[1]

آگے چل کر امام ابن قدامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام احمد رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

’’وتر فرض کے درجے کی نماز تو نہیں، لہٰذا اگر کوئی شخص صرف فرض نماز ہی پڑھ لے تو جائز ہے اور وتر و سننِ فجر سنتِ موکدہ ہیں، اگر کوئی چاہے تو وتر کی قضا کر لے اور نہ چاہے تو نہ کرے اور پھر فجر کی سنتوں اور وتر میں موازنہ کرتے ہوئے زیادہ بہتر اس بات کو قرار دیا گیا ہے کہ وتر فجر کی سنتوں سے زیادہ تاکید والے ہیں۔‘‘[2]

سنتوں کی قضا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے بھی ایک سوال کیا گیا تھا کہ ایک آدمی کی ایک سے زیادہ نمازیں قضا ہوگئی ہیں تو کیا اب وہ موکدہ سنتوں سمیت انھیں پڑھے یا ان کی صرف فرض رکعتیں پڑھے گا اور کیا شب و روز کے تمام اوقات میں قضا نمازوں کو پڑھ سکتا ہے؟ اس پر موصوف نے جواب دیا تھا:

’’قضا نمازیں زیادہ ہوں تو سنتوں یا نوافل میں مشغول ہونے سے بہتر یہ ہے کہ جلد از جلد قضا نمازوں کے فرائض پڑھ لے اور اگر قضا نمازیں قلیل ہوں تو انھیں سنتوں سمیت پڑھنا اچھا ہے، کیوں کہ جب نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم غزوۂ حنین

---

[1] المغني لابن قدامة بتحقيق ڈاکٹر ترکی (٢/ ٥٤٤)

[2] المغني لابن قدامة بتحقيق ڈاکٹر ترکی (٢/ ٥٩٥)

کے موقع پر (راستے میں) نمازِ فجر سے سوئے رہ گئے تھے تو انھوں نے سنتیں اور فرض سبھی قضا کیے تھے اور غزوۂ خندق کے موقع پر جب نبیِ اکرم ﷺ کی متعدد نمازیں رہ گئیں تو آپ ﷺ نے انھیں سنتوں کے بغیر صرف فرض قضا کیے تھے۔''

دوسرے حصے کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ قضا شدہ فرض نمازیں تمام اوقات میں (بلا تفریق اوقاتِ مکروہہ و غیر مکروہہ) پڑھی جا سکتی ہیں، کیوں کہ صحیح حدیث میں نبیِ اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

«مَنْ أَدْرَكَ رَكْعَةً مِّنَ الْفَجْرِ قَبْلَ أَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَلْيَصِلْ إِلَيْهَا أُخْرٰى»[1]

''جس نے طلوعِ آفتاب سے پہلے فجر کی ایک رکعت پالی تو اسے چاہیے کہ اس کے ساتھ ہی دوسری رکعت بھی ملا لے۔''

اس حدیث کے ان الفاظ میں اگرچہ صرف نمازِ فجر کا ذکر ہے، لیکن موصوف کا استدلال اس طرح ہے کہ اوقاتِ مکروہہ میں (جو طلوعِ آفتاب کا وقت ہے) اس میں فجر کی نماز قضا کی جاسکتی ہے تو دوسرے اوقاتِ مکروہہ میں کوئی بھی فرض نماز قضا کی جا سکتی ہے، جیسا کہ اوقاتِ مکروہہ سے استثنائی صورتیں ذکر کی جا چکی ہیں۔

الغرض موصوف کا یہ فتویٰ انتہائی معتدل ہے کہ اگر قضا نمازیں زیادہ ہوں تو صرف فرض پڑھ لیں اور اگر قضا نماز صرف ایک آدھی ہو تو موکدہ سنتیں بھی پڑھ لیں۔

یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ صحیح مسلم، سنن کبریٰ بیہقی اور مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث ہے:

«إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ إِذَا غَلَبَتْهُ عَيْنُهُ أَوْ وَجَعٌ فَلَمْ يُصَلِّ بِاللَّيْلِ صَلّٰى بِالنَّهَارِ اثْنَتَيْ عَشْرَةَ رَكْعَةً»[2]

''نبیِ اکرم ﷺ جب غلبہ نیند یا کسی تکلیف کی وجہ سے رات کو (تہجد کی) نماز نہ پڑھ پاتے تو دن چڑھنے پر بارہ رکعتیں پڑھ لیتے تھے۔''

---

[1] مجموع الفتاویٰ (۲۲/ ۱۰۴) الإحسان في تقریب صحیح ابن حبان، رقم الحدیث (۵۸۱)

[2] صحیح مسلم مع شرح النووي (۳/ ٦/ ۲۸) الفتح الرباني (۲/ ۳۱۲)

ایسے ہی سنن ابو داود، ترمذی، ابن ماجہ، مسند احمد اور مستدرک میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

«مَنْ نَامَ عَنِ الْوِتْرِ أَوْ نَسِيَهُ فَلْيُوتِرْ إِذَا ذَكَرَهُ أَوِ اسْتَيْقَظَ»[1]

''جو شخص وتر سے سویا رہ جائے یا بھول جائے تو اسے چاہیے کہ بیدار ہونے پر یا یاد آنے پر پڑھ لے۔''

اسی طرح مسند احمد اور طبرانی اوسط میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ يُصْبِحُ فَيُوتِرُ»[2]

''نبیِ اکرم ﷺ صبح ہونے پر وتر پڑھ لیتے تھے۔''

سنن بیہقی اور مستدرک حاکم (وصححہ) میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«رُبَمَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يُوتِرُ وَقَدْ قَامَ النَّاسُ لِصَلَاةِ الصُّبْحِ»[3]

''بعض دفعہ میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو اس وقت بھی وتر پڑھتے دیکھا، جب لوگ نمازِ فجر پڑھنے کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔''

فجر وظہر کی سنتوں کی قضا سے متعلقہ احادیث سے احکام اخذ کرتے ہوئے شیخ عبدالرحمٰن البنا لکھتے ہیں:

''ان احادیث میں موکدہ سنتوں، وتر اور تہجد وغیرہ کی قضا کی مشروعیت کا ثبوت ہے۔ ائمہ اربعہ سمیت بعض دیگر ائمہ اور صحابہ و تابعین کی ایک جماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وتر قضا ہو جائیں تو ان کی قضا ہے، لیکن اس بات میں اختلاف ہے کہ کب تک قضا ممکن ہے؟''

اس سلسلے میں تین اقوال ہیں:

---

[1] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (١٢٦٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١١٨٨) سنن الترمذي مع التحفة (٢/ ٥٦٨) الإرواء (٢/ ١٥٣) و مشكاة (١/ ٣٩٧ـ ٣٩٩) و حاله، صحيح الجامع، رقم الحديث (٦٥٦٢)

[2] شرح الفتح الرباني (٢/ ٣١٢)

[3] حواله سابقه. و الإرواء (٢/ ١٥٥)

1. فجر پڑھنے سے پہلے پہلے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما، امام عطاء، مسروق، حسن بصری، نخعی، مکحول قتادہ، مالک، شافعی، احمد، اسحاق، ابو ایوب اور ابو حنیفہ رحمہم اللہ کا مسلک ہے، جیسا کہ قیام اللیل للمروزی میں منقول ہے۔
2. دن یا رات کو جب بھی موقع ملے، قضا کر لے۔ شافعیہ کا فتویٰ اسی پر ہے۔
3. سونے یا بھولنے کی شکل اور جان بوجھ کر چھوڑنے کی شکل میں تفریق۔

امام ابن حزم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سونے یا بھولنے کی شکل میں دن یا رات کے کسی وقت میں جاگے یا یاد آئے تو پڑھ لے اور جان بوجھ کر چھوڑنے کی صورت میں جب اس پر فجر طلوع ہو جائے تو وہ اسے قضا کر ہی نہیں سکتا۔

وتر کے علاوہ دیگر نوافلِ راتبہ یعنی سنن مؤکدہ کی قضا کے بارے میں بھی اہلِ علم کے کئی اقوال ہیں:

1. عذر سے قضا ہوں یا بلا عذر، مطلقاً ان کی قضا مستحب ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما، عطاء، طاؤس، قاسم بن محمد، ابن جریج، اوزاعی، قول جدید میں امام شافعی، احمد، اسحاق، محمد بن حسن (تلمیذ امام ابوحنیفہ) اور مزنی رحمہم اللہ کا یہی مسلک ہے۔
2. ان کی قضا نہیں ہے۔ یہ امام ابو حنیفہ، مالک، مشہور روایت کے مطابق ابو یوسف، قدیم کے مطابق امام شافعی اور ایک روایت کی رو سے امام احمد رحمہم اللہ کا بھی مسلک ہے۔ امام مالک کا مشہور مسلک یہ ہے کہ فجر کی سنتوں کو طلوعِ آفتاب کے بعد قضا کیا جائے۔
3. مستقل بالذات اور تابع لغیر میں تفریق۔ یعنی نمازِ عید و نمازِ ضحیٰ وغیرہ کی قضا ہے اور فرض نمازوں کی سنن موکدہ کی قضا نہیں ہے۔ یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا ایک قول ہے۔
4. اختیار ہے، چاہے تو قضا کر لے اور چاہے تو نہ کرے۔ یہ احناف اور امام مالک رحمہ اللہ سے مروی ہے۔
5. نیند و بھول کے عذر اور بلا عذر قضا میں تفریق، عذر پر قضا ہے۔ بلا عذر یعنی عمداً پر قضا نہیں ہے۔ یہ علامہ ابن حزم رحمہ اللہ کا مذہب ہے اور جمہور کا کہنا ہے کہ جب عذر پر قضا ہے تو عمداً بلا عذر پر بالاولیٰ قضا ہے۔[1] واللہ أعلم

---

[1] شرح الفتح الرباني (٢/ ٣١٣، ٣١٤) موطأ الإمام مالك (١/ ١/ ١٤٧) نيل الأوطار (٢/ ٣/ ٤٧۔ ٤٨) تحفة الأحوذي (٢/ ٧٦٨۔ ٥٧) بذل المجهود (٤/ ٣٣٧) طبع ثالث بيروت.

الغرض فجر اور ظہر کی دو دوسنتوں کی اہمیت ذکر کی جاچکی ہے اور نبیِ اکرم ﷺ کا انہیں قضا کرنا بھی ثابت ہے۔ وتروں کو فجر کی سنتوں سے بھی زیادہ موکد شمار کیا گیا ہے، لہٰذا کم از کم مذکورہ رکعتوں کو تو قضا کر لینا ہی زیادہ بہتر ہے۔

عشا سے پہلے سونا اور بعض استثنائی صورتیں:

اب نماز پنج گانہ کے اوقات کا موضوع ختم کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نمازِ عشا سے پہلے سونے اور نمازِ عشا کے بعد فضول باتیں کرنے کے بارے میں شرعی نقطہ نظر کی بھی تھوڑی سی وضاحت کر دی جائے، اس سلسلے میں صحیحین اور سنن اربعہ کے حوالے سے حضرت ابو برزہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث گزر چکی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يَسْتَحِبُّ أَنْ يُؤَخِّرَ الْعِشَآءَ الَّتِيْ يَدْعُوْنَهُ الْعَتَمَةَ، وَكَانَ يَكْرَهُ النَّوْمَ قَبْلَهَا وَالْحَدِيْثَ بَعْدَهَا»[1]

''نبیِ اکرم ﷺ نمازِ عشا جس کو لوگ ''عتمہ'' بھی کہتے تھے، اسے موخر کرنے کو مستحب سمجھتے اور اس سے پہلے سونے اور اس کے بعد باتیں کرنے کو مکروہ جانتے تھے۔''

امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اکثر اہلِ علم نمازِ عشا سے پہلے سونے کو مکروہ شمار کرتے ہیں اور بعض نے اس کی رخصت دی ہے خصوصاً ماہ رمضان میں۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جن سے رخصت منقول ہے، ان سے بھی اس شرط کے ساتھ رخصت منقول ہے کہ سونے والے کے پاس ایسا شخص موجود ہو، جو اُسے نماز کے لیے جگا دے یا وہ خود سے اٹھ جاتا ہو اور یہ شرط مناسب بھی ہے، کیوں کہ نمازِ عشا سے پہلے سونے کی ممانعت کا سبب اس کا وقت نکلنے کا خدشہ ہے۔ امام طحاوی نے رخصت کو عشا کا وقت ہونے سے پہلے پہلے پر اور ممانعت کو عشا کا وقت ہو جانے کے بعد پر محمول کیا ہے۔[2]

قائلینِ کراہت کا استدلال تو اسی مذکورہ حدیث اور ایسی ہی بعض دیگر احادیث سے ہے، جب

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٤٩، ٧٣) صحيح مسلم (٣/ ٥/ ٤٥۔ ١٤٦) نصب الراية (١/ ٢٤٨) المنتقىٰ مع النيل (١/ ٢/ ١٣) الفتح الرباني (٢/ ٢٧٢) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٥) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٢) صحيح سنن النسائي (٥١٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٠١)

[2] الفتح الرباني (٢/ ٤٩) نيل الأوطار (١/ ٢/ ١٣)

کہ قائلینِ جواز کا استدلال صحیح بخاری کی اس حدیث سے ہے، جس میں ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ایک رات نمازِ عشا کو بہت موخر کر دیا تو اس وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو آواز دیتے ہوئے فرمایا:

«اَلصَّلَاۃَ! نَامَ النِّسَاءُ وَالصِّبْیَانُ»[1]

''نماز کے لیے تشریف لائیں کہ اب تو عورتیں اور بچے سو گئے ہیں۔''

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث پر یوں باب باندھا ہے:

"بابُ النَّوم قبلَ العشآءِ لمن غُلِبَ"

''عشا سے پہلے غلبہ نیند کی وجہ سے سونے کے جواز کا بیان۔''

گویا ان کے نزدیک عشا سے پہلے سونا تب مکروہ ہے، جب آدمی کی اپنی مرضی و احتیاط سے ہو، ورنہ نہیں، کیوں کہ عورتوں اور بچوں کے سو جانے کا سن کر بھی آپ ﷺ نے ان پر نکیر نہیں کی تھی۔

شارح بخاری فرماتے ہیں:

''اگر ایسی حالت میں نماز کے انتظار کے لیے بیٹھے بیٹھے سونے اور اپنے گھر میں غلبہ نیند کی وجہ سے سونے میں فرق کیا جائے تو یہ زیادہ اولیٰ ہے۔''

امام شوکانی رحمہ اللہ نے ابن سید الناس سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''نماز کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے سونا تو کوئی ممنوع نہیں ہے اور نہ اس کا نیند سے کوئی تعلق ہے، بلکہ وہ نیند کی ابتدائی حالت اونگھ ہے۔ یعنی اس حالت میں اونگھنے کی ممانعت کیسے ہوسکتی ہے اور اس سے نیند کے جواز کا استدلال کیسے کیا جا سکتا ہے؟''[2]

مختصر یہ کہ امام ترمذی رحمہ اللہ کے بقول اکثر اہلِ علم کے نزدیک عشا سے پہلے سونا مکروہ ہے اور ابن سید الناس کہتے ہیں کہ صحابہ کی ایک جماعت نے اسے مکروہ قرار دیا ہے اور شدت سے ممانعت بیان کی ہے۔ جب کہ ان میں سے حضرت عمر، ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم بھی ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ کا اختیار بھی کراہت ہی ہے اور امام عبداللہ بن مبارک فرماتے ہیں کہ اکثر احادیث کراہت ہی پر دلالت کرتی ہیں۔

---

[1] صحیح البخاري مع الفتح، رقم الحدیث (٥٦٩)

[2] نیل الأوطار (١/ ٢/ ١٤)

حضرت علی اور ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہما اور فقہاے کوفہ جواز کے قائل تھے اور بعض نے اس میں جگانے والے کی موجودگی شرط عائد کی ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے اور امام طحاوی رحمہ اللہ سے بھی۔ امام ابن العربی رحمہ اللہ نے کہا ہے:

''کوئی جگانے والا موجود ہو یا خود سے جاگ جانے کی عادت ہو تو پھر سونا جائز ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اقوال کی تفصیل آپ کے سامنے ہے۔ اکثریت کا مسلک کراہت کا ہے اور زیادہ احتیاط پر بھی یہی مبنی ہے۔''[1]

اب آیئے اس حدیثِ ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ کے آخری حصے میں مذکور مسئلے کی طرف۔

عشا کے بعد باتیں کرنے کی کراہت اور استثنائی صورتیں:

نمازِ عشا کے بعد باتیں کرنے کے بارے میں بھی اہلِ علم کے دو گروہ ہیں۔ بعض علما کا کہنا ہے کہ نمازِ عشا کے بعد باتیں کرنا مکروہ ہے اور ان کا استدلال ایک تو اسی حدیث سے ہے، جو حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اسی بات کی دلیل وہ حدیث بھی ہے، جس کی طرف امام ترمذی رحمہ اللہ نے اشارہ کیا ہے، جو سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

((جَدَبَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ السَّمَرَ بَعْدَ الْعِشَآءِ))[2]

''نبیِ اکرم ﷺ نے ہمیں نمازِ عشا کے بعد باتیں کرنے سے منع فرمایا۔''

اسی مفہوم کی دیگر احادیث کے پیشِ نظر نمازِ عشا کے بعد باتیں کرنے کو مکروہ قرار دیا گیا ہے، جب کہ بعض علما نے بھلائی کی باتوں کو جائز قرار دیا ہے اور اس کے دلائل بھی موجود ہیں، حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ والی حدیث کی شرح بیان کرتے ہوئے امام نووی رحمہ اللہ نے ''المنہاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج'' میں لکھا ہے:

''نمازِ عشا کے بعد باتیں کرنے کی کراہت کا سبب یہ ہے کہ وہ رات کو طویل وقت تک جگائے رکھیں گی، جس کے نتیجے میں وہ شخص تہجد یا ذکر و تلاوت سے رہ جائے گا، یا نمازِ فجر

---

[1] شرح صحیح مسلم للنووي (٣/ ٥/ ١٤٢۔ ١٤٧) نیل الأوطار (٢/ ١٣۔ ١٤)

[2] المنتقیٰ (١/ ٢/ ١٤) الفتح الرباني (٢/ ٢٧١) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٧٠٣)

کو اس کے جائز و مختار یا افضل وقت میں ادا نہیں کر سکے گا اور رات کو باتوں میں جاگنا اسے دن کے وقت سست کر دے گا، جس سے وہ حقوقِ دین، امورِ اطاعت اور دنیوی مصلحتوں سے بھی محروم ہوسکتا ہے۔‘‘

پھر امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

’’نمازِ عشا کے بعد باتیں کرنے کے مکروہ ہونے پر علماے امت کا اتفاق ہے، سوائے ان باتوں کے جو خیر پر مبنی ہوں۔ مثلاً حصولِ علم کی غرض ہو، مہمان آ جائے، دلہن کا دل بہلانا ہو، شفقت و محبت میں اپنے بچوں اور اہلیہ سے کچھ باتیں ہوں، اصلاح بین الناس اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی باتیں ہوں تو ان میں کوئی کراہت نہیں ہے اور ان میں سے بعض امور کے بارے میں صحیح احادیث میں اجازت وارد ہوئی ہے۔‘‘[1]

جن احادیث و دلائل کی بنا پر نمازِ عشا کے بعد باتوں کو جائز قرار دیا گیا ہے، خصوصاً جب کہ وہ باتیں بھلائی اور دینِ و آخرت کی ہوں، علم سے تعلق رکھتی ہیں یا پھر وہ باتیں ہوں جو حوائج ضروریہ میں شمار ہوتی ہیں، مثلاً اہلیہ، بچوں اور مہمان سے گفتگو، ان امور کے جواز پر اس حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے جو سنن ترمذی، نسائی اور مسند احمد میں ہے، جس میں امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں:

«إِنَّ النَّبِيَّ صلی اللہ علیہ وسلم كَانَ يَسْمُرُ هُوَ وَ أَبُوْ بَكْرٍ فِي الْأَمْرِ مِنْ أُمُوْرِ الْمُسْلِمِيْنَ وَأَنَا مَعَهُمَا»[2]

’’نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی فلاح کے امر میں سے کسی امر میں (نمازِ عشا کے بعد) باتیں کرتے تھے اور (میں بھی) ان کے ساتھ ہوتا تھا۔‘‘

جواز کی دوسری دلیل صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر مہمان بن کر گیا اور یہ اس رات تھا جب کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

[1] شرح صحيح مسلم للنووي (٢/ ٣/ ١٤٦۔ ١٤٧)

[2] الفتح الرباني (٢/ ٢٧٢) فتح الباري (٢/ ٧٤) و (١/ ٢١٣) المنتقىٰ (٢/ ١٤) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٣)

ان کے گھر میں تھے، تاکہ میں دیکھوں کہ نبیِ اکرم ﷺ رات کو نمازِ تہجد کیسے پڑھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

«فَتَحَدَّثَ النَّبِيُّ ﷺ مَعَ أَهْلِهِ سَاعَةً ثُمَّ رَقَدَ...» [1]

''نبیِ اکرم ﷺ نے اپنی زوجۂ محترمہ سے باتیں کیں اور پھر سو گئے۔''

اس حدیث سے یوں استدلال کیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ نمازِ عشا کے بعد گھر تشریف لے گئے تھے اور گھڑی بھر کے لیے گھر والوں سے باتیں کی تھیں۔

صاحبِ ''نیل الأوطار'' تو لکھتے ہیں:

''اس حدیث کو انھوں نے اپنے لیے دلیل بنایا ہے، جو نمازِ عشا کے بعد مطلقاً باتوں کے جواز کے قائل ہیں، وہ خیر و طاعت کی ہوں یا عام باتیں ہوں۔ ممکن ہے کہ یہ واقعہ جواز کے لیے ہی ہو۔ تاکہ ممانعت والی احادیث کو نہی تحریمی پر محمول نہ کیا جائے۔'' [2]

یہاں یہ بات بھی واضح کر دیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ام المومنین حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے بھانجے تھے اور بھانجے کا خالہ کے گھر میں اس طرح رات رہنا بلاشبہہ ممکن ہے، کیوں کہ خالہ محرمات میں سے ہوتی ہے اور وہ تو ان کی صرف خالہ ہی نہیں، بلکہ اُمّ المومنین بھی تھیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح کے کتاب العلم کے باب (۴۰ اور ۴۱) میں اسی طرح ''کتاب مواقیت الصلاۃ'' کے باب (۴۰ اور ۴۱) میں خیر و بر اور تعلیم و تعلم کے لیے باتیں کرنے کے جواز پر دلالت کرنے والی احادیث ذکر کی ہیں۔ جب کہ ''کتاب مواقیت الصلاۃ'' کے باب (۳۹) میں حضرت ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ والی حدیث نقل کی ہے اور اس طرح باب باندھا ہے:

''بَابُ مَا يُكْرَهُ من السَّمَرِ بَعْدَ الْعِشَآءِ''

اس طرح امام بخاری رحمہ اللہ نے واضح کر دیا کہ عام مباح باتوں میں راتوں کو جاگتے رہنا تو مکروہ ہے، البتہ خیر و بر کی باتوں کے لیے یہ جائز ہے۔ چنانچہ کتاب العلم کے چالیسویں باب میں اُمّ المومنین حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث لائے ہیں، جس میں وہ فرماتی ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ

[1] المنتقیٰ مع النیل (۱/ ۲/ ۱۵) في فتح الباري (۱/ ۱۲۳) صحیح البخاري (۱/ ۲۱۲) صحیح مسلم مع شرح النووي (۳/ ٦/ ۵۰، ۵۱)

[2] نیل الأوطار (۲/ ۱۵)

ایک رات نیند سے بیدار ہوئے تو فرمایا:

«سُبْحَانَ اللّٰهِ مَا ذَا أُنْزِلَ اللَّيْلَةَ مِنَ الْفِتَنِ، وَمَا ذَا فُتِحَ مِنَ الْخَزَائِنِ، أَيْقِظُوْا صَوَاحِبَ الْحُجَرِ فَرُبَّ كَاسِيَةٍ فِيْ الدُّنْيَا عَارِيَةٍ فِيْ الْآخِرَةِ»[1]

''اللہ پاک ہے، آج رات کتنے ہی فتنے نازل ہوئے ہیں اور کتنے ہی خزائن کھلے ہیں! پھر فرمایا: ان حجروں میں موجود تمام امہات المومنین کو جگا دو، کتنی ہی عورتیں دنیا میں تو لباس پہنے ہوئے ہیں، مگر آخرت میں عریاں ہوں گی۔''

اس حدیث کو ''باب العلم والعظة باللیل'' میں لاکر امام بخاری رحمہ اللہ نے اس بات پر تنبیہ کرنا چاہی ہے کہ نمازِ عشا کے بعد جن باتوں کی ممانعت ہے، وہ ایسی باتیں ہیں، جن میں کوئی خیر نہ ہو۔[2]

بخاری شریف کے کتاب العلم کے اکتالیسویں باب ''باب السمر في العلم'' میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی وہ مشہور حدیث لائے ہیں، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیاتِ مبارکہ کے آخری ایام میں ایک رات ہمیں عشا کی نماز پڑھائی، سلام پھیرنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوگئے اور (خطبہ دیتے ہوئے) فرمایا:

«رَأَيْتُكُمْ لَيْلَتَكُمْ هٰذِهٖ فَإِنَّ رَأْسَ مِائَةِ سَنَةٍ مِنْهَا لَا يَبْقٰى مِمَّنْ هُوَ عَلٰى ظَهْرِ الْأَرْضِ أَحَدٌ»[3]

''یہ آج کی رات تم نے دیکھی ہے؟ آج سے ایک سو سال تک کوئی ذی روح، جو اس وقت روے زمین پر ہے، نہیں رہے گا۔''

اس روایتِ ابن عمر رضی اللہ عنہما میں تو اس ارشاد کی تاریخ مطلق آخری ایام ہے، جب کہ یہی واقعہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے بھی بیان فرمایا ہے۔ اس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے ایک ماہ پہلے بیان فرمائی تھی۔[4]

نمازِ عشا کے بعد ایسی علمی گفتگو کا ذکر بکثرت احادیث میں آیا ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (١/ ٢١٠)

[2] فتح الباري أيضاً (١/ ٢١٠)

[3] صحيح البخاري (١/ ٢١١، ٢/ ٧٤)

[4] فتح الباري أيضاً.

وعظ ونصیحت اور درس و تدریس ہوتو یہ بلاکراہت جائز اور ثابت ہے۔ چنانچہ وعظ و درس کے جواز پر دلالت کرنے والی ایک حدیث امام بخاری رحمہ اللہ اپنی کتاب کے مواقیت الصلاۃ کے "باب السمر في الفقه والخير بعد العشاء" میں لائے ہیں، جس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے دیکھا کہ ایک دفعہ آدھی رات سے زیادہ گزر گئی تو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ہمیں نماز پڑھائی، پھر خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

«أَلَا إِنَّ النَّاسَ قَدْ صَلَّوْا ثُمَّ رَقَدُوْا وَإِنَّكُمْ لَمْ تَزَالُوْا فِيْ صَلَاةٍ مَا انْتَظَرْتُمُ الصَّلَاةَ»[1]

"لوگوں نے نماز پڑھ لی ہے اور وہ سو بھی چکے ہیں اور تم اس وقت تک نماز ہی میں ہو، جب تک کہ اس کے انتظار میں ہو۔"

اس حدیث سے اور خصوصاً اس میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ ارشاد فرمانے سے امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ بات اخذ کی ہے کہ اگر علم و فقہ اور خیر و بر کی بات ہو تو وہ نمازِ عشا کے بعد بھی جائز ہے، اس مفہوم پر دلالت کرنے والی متعدد احادیث ہیں۔[2]

جبکہ مہمان اور اہلِ خانہ سے گفتگو کے جواز کے بارے میں بھی امام بخاری رحمہ اللہ نے مستقل ایک باب قائم کیا ہے: "بَابُ السَّمَرِ مَعَ الضَّيْفِ وَالْأَهْلِ" اور اس باب کے تحت وہ حدیث لائے ہیں، جس میں حضرت عبدالرحمٰن بن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اصحابِ صفہ فقرا لوگ تھے (یعنی ان کے پاس کھانے پینے کی اشیا کی قلت تھی، لہٰذا اپنے دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے مخاطب ہو کر) نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ كَانَ عِنْدَهُ طَعَامُ اثْنَيْنِ فَلْيَذْهَبْ بِثَالِثٍ، وَإِنْ أَرْبَعٌ فَخَامِسٌ أَوْ سَادِسٌ»

"جس کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو، وہ اپنے ساتھ ایک تیسرے کو بھی لے جائے، جس کے پاس چار اشخاص کا کھانا ہو، وہ پانچواں یا چھٹے کو بھی لے جائے۔"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے ساتھ تین آدمیوں کو لائے اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھ دس

---

[1] صحيح البخاری مع الفتح (۲/ ۷۳)

[2] دیکھیں: فتح الباري (۱/ ۲۱۳)

افراد کو لے گئے۔ ہمارے گھر میں ایک خود میں، میرے والد اور والدہ یا انھوں نے بیوی کہا۔ میرے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر میں کام کرنے والا خادم بھی تھا۔ اس طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اور نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا کھا لیا اور نمازِ عشا تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ہی رہے۔ نمازِ عشا کے بعد وہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر ہی پہلے گئے۔

پھر رات کا ایک حصہ گزرنے کے بعد وہ اپنے گھر آئے تو ان کی اہلیہ نے پوچھا کہ آپ کو مہمانوں کی مہمان نوازی کرنے سے کس نے روک لیا تھا؟ انھوں نے پوچھا:

"کیا تم لوگوں نے ابھی تک مہمانوں کو کھانا نہیں کھلایا؟ ان کی اہلیہ نے بتایا کہ انھوں نے آپ کے شامل ہوئے بغیر کھانا کھانے سے انکار کر دیا تھا، ہم نے تو کھانا پیش کیا تھا، مگر وہ نہ مانے۔"

یہ حدیث طویل ہے، جس میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے انھیں کھانا کھلایا۔ وہ کھاتے جاتے، مگر کھانا کم ہونے کے بجائے بڑھتا گیا، حتیٰ کہ ان مہمانوں کے کھا لینے کے باوجود کھانا ان کی بیوی کے بقول تیار کیے گئے کھانے سے تین گنا زیادہ ہوگیا۔ وہ کھانے والا برتن نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر بھیج دیا گیا، صبح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر سے وہ فوج کے بارہ دستوں کو بھیجا گیا تو ان سب نے بھی وہ کھانا کھایا۔

اس حدیث کو امام بخاری رحمہ اللہ "كتاب مواقيت الصلاة" کے علاوہ "باب علامات النبوة" یعنی کتاب المناقب میں بھی لائے ہیں، کیوں کہ اس میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی علامت و معجزہ بھی ہے، اگرچہ اس میں حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت و کرامت بھی ہے۔ حافظ عسقلانی رحمہ اللہ، اسی طرح علامہ عینی صاحبِ "عمدة القاري شرح صحيح البخاري" کے بقول امام بخاری رحمہ اللہ نے نمازِ عشا کے بعد مہمان اور اہلِ خانہ سے گفتگو کے جواز کا جواب قائم کیا تو ان کا استدلال حضرتِ صدیق رضی اللہ عنہ کے اپنی اہلیہ اور پھر مہمانوں سے بات کرنے کے الفاظ سے ہے۔ یاد رہے کہ یہ حدیث صحیح بخاری کے متعدد مقامات کے علاوہ صحیح مسلم، کتاب الاطعمۃ اور سنن ابی داود میں بھی مروی ہے۔[1]

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح (٢/ ٧٥، ٧٦) و مع عمدة القاري (٥/ ٩٨ دار الفكر، بيروت) و (٨/ ١٦/ ١٢٤)

خلاصہ کلام:

ان احادیث سے حاصل شدہ تفصیلات کا خلاصہ یہ ہوا کہ نمازِ عشا کے بعد معمول کے ذکر اذکار کر کے سو جانا چاہیے۔ بلاوجہ داستان گوئی، قصہ خوانی، فحش کلامی اور لا یعنی گفتگو میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں اگر کوئی قرآن و سنت پر مشتمل درس و تدریس، وعظ و ارشاد، پند و نصیحت ہو، مہمان آجائے اور اس کی خدمت مطلوب ہو، مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے کاموں میں مشورہ مقصود ہو یا اہلِ خانہ اور بچوں سے ضروری امور پر گفتگو کرنا ہو تو پھر جائز ہے۔

نماز میں پابندیِ وقت
قرآنِ کریم کی روشنی میں

نمازِ پنج گانہ کے اوقات سے تعلق رکھنے والی تفصیلات، تمام نمازوں کے اوقات کی تعیین اور اوّل وقت میں نمازوں کو ادا کرنے کی فضیلت پر دلالت کرنے والی احادیث سے معلوم ہو جاتا ہے کہ نمازوں کو ادا کرنے میں پابندیِ وقت بھی ضروری ہے۔ یہ نہیں کہ جب چاہا نماز پڑھ لی، بلکہ اصل یہ ہے کہ جب نماز کا وقت ہو جائے تو اسے ادا کرنے میں تاخیر اور سُستی نہیں ہونی چاہیے۔ یہاں تک کہ دورانِ جنگ بھی نماز کا وقت ہو جائے تو اگرچہ اس کا طریقۂ ادا بدل جاتا ہے، مگر بلا وجہ اس کے وقت میں تقدیم و تاخیر کی اس حالت میں بھی اجازت نہیں دی گئی، یہاں تک کہ سورۃ البقرۃ (آیت: ۲۳۹) میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴾ [البقرۃ: ۲۳۹]

’’اگر (دشمن کا) خوف ہو تو پیدل چلتے چلتے یا سواری پر بیٹھے ہی نماز ادا کر لو۔ ہاں جب تم (دشمن کے خوف سے) امن پا لو تو پھر اللہ تعالیٰ کو اسی طرح یاد کرو، جیسا کہ اس نے تمھیں سکھلایا ہے، جو تم پہلے نہیں جانتے تھے۔‘‘

سورۃ النساء (آیت: ۱۰۳) میں صلاۃ الخوف کا طریقہ ذکر کرنے کے بعد ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ﴾

’’اور جب تم (دشمن کے خوف سے) مطمئن ہو جاؤ تو پھر (مقررہ اوقات ہی میں) نماز قائم کرو، کیوں کہ اہلِ ایمان پر مقررہ اوقات میں نماز کا ادا کرنا فرض ہے۔‘‘

سورۃ البقرۃ میں طلاق وغیرہ کے مسائل کے تذکرے کے درمیان (آیت: ۲۳۸) میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ﴾

''سب نمازوں کو بر وقت ادا کرنے پر محافظت کرو اور خاص طور پر درمیانی نماز کی اور دورانِ نماز اللہ کے سامنے ادب و عاجزی سے کھڑے ہوا کرو۔''

مسائلِ طلاق کے درمیان نماز کی پابندی و اہتمام کا ذکر کرنا، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ معاشی، معاشرتی یا عائلی، کسی بھی قسم کی مصروفیات میں نمازوں کے اوقات کا پورا پورا خیال رکھو اور اس میں تقدیم و تاخیر نہ کرو۔

نمازِ وسطیٰ:

مذکورہ آیت میں ﴿وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾ یعنی درمیانی نماز سے کون سی نماز مراد ہے؟ خصوصی اہمیت کی مالک اس نماز کی تعیین میں اہلِ علم کے متعدد اقوال ہیں:

① اس سے مراد نمازِ فجر ہے۔
② کچھ کا کہنا ہے کہ یہ نمازِ ظہر ہے۔
③ ایک قول کے مطابق اس سے مراد نمازِ مغرب ہے۔
④ کسی نے نمازِ عشا کہا ہے۔
⑤ بعض نے کہا ہے کہ پانچوں میں سے کوئی ایک ہے، مگر اسے لیلۃ القدر کی طرح مبہم رکھا گیا ہے۔
⑥ کسی نے نمازِ باجماعت کو وسطیٰ قرار دیا ہے۔
⑦ نمازِ جمعہ، نمازِ خوف، عید الفطر، عید الاضحیٰ، نمازِ وتر اور نمازِ ضحیٰ یا چاشت کو بھی نمازِ وسطیٰ کہا گیا ہے۔
⑧ یہ بھی منقول ہے کہ پانچوں نمازوں کے مجموعے کو نمازِ وسطیٰ کہا گیا ہے۔
⑨ نمازِ عصر نمازِ وسطیٰ ہے اور یہی از روئے دلیل صحیح تر ہے۔

جبکہ ان میں سے اکثر اقوال بلا دلیل ہیں۔ خصوصاً نمازِ جمعہ، نمازِ خوف، نمازِ عید الفطر و عید الاضحیٰ، نمازِ وتر اور نمازِ ضحیٰ کو ﴿وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾ کہنے والوں کے پاس قرآن و سُنّت کی واضح مرفوع اور صحیح دلیل کوئی نہیں ہے۔

امام ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے جو روایت بیان کی ہے کہ نمازِ پنج گانہ کے مجموعے کا نام نمازِ وسطیٰ ہے، اس روایت کو امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے محلِ نظر قرار دیا اور لکھا ہے کہ امامِ ماوراء النہر علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ پر تعجب ہے کہ انھوں نے کثیر الاطلاع اور قوی الحافظہ ہونے کے باوجود نمازِ پنج گانہ کے مجموعے والے اسی قول کو اختیار کیا ہے، حالانکہ قرآن و سُنّت اور آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بھی اس کی دلیل نہیں ہے۔ نیز یہ جو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اور حضرت سعید بن مسیّب، قاضی شریح، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے آزاد کردہ غلام حضرت نافع، ربیع بن خثیم، امام قرطبی اور امام الحرمین جوینی رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ لیلۃ القدر کی طرح نمازِ وسطیٰ کو بھی مبہم رکھا گیا ہے۔[1]

یہ قول بھی اس بنا پر صحیح نہیں کہ نمازِ وسطیٰ کی تعیین باقاعدہ صحیح احادیث میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، جیسا کہ ہم ان احادیث کو بھی ذکر کرنے والے ہیں۔

معروف تفسیر واحدی کے مولف نے نمازِ عشا کے نمازِ وسطیٰ ہونے کے قول کو اختیار کیا ہے اور امام ابن جریر طبری نے حضرت قبیصہ بن ذؤیب رحمہ اللہ سے نمازِ مغرب کے بارے میں نمازِ وسطیٰ ہونے کا قول نقل کیا ہے، لیکن قبیصہ رحمہ اللہ والی ابن جریر رحمہ اللہ کی روایت غیر ثابت ہے۔[2] یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے، مگر اس کی سند بھی امام ابن کثیر کے بقول محلِ نظر ہے۔[3]

محض یہ کہہ دینا کہ مغرب سے پہلے ظہر و عصر ہیں اور بعد میں عشا و فجر ہیں، لہٰذا یہ وسطیٰ ہوئی، یہ بات نصوص کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

علمائے تفسیر کی تصریحات:

اب نمازِ وسطیٰ کے بارے میں صرف تین قول باقی ہیں اور وہ ہیں: فجر، ظہر اور عصر۔ تو آیئے ان میں سے راجح تر کی تعیین کے لیے احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوالِ شارحین سے پہلے علمائے تفسیر کی تصریحات ملاحظہ کریں:

---

[1] تفسیر ابن جریر الطبري (٥/ ٢٢٠)

[2] تحقیق تفسیر ابن جریر (٥/ ٢١٤۔ ٢١٥)

[3] تفسیر ابن کثیر (١/ ٢٩٠۔ ٢٩٤) و نیل الأوطار (١/ ١/ ٣١١) وحسّنه في فتح القدیر ولکنه موقوف بتحقیق ابن جریر (٥/ ٢١٤، ٢١٥، ٢٢٠)

امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ:

سورۃ البقرہ کی اس مذکورہ آیت (۲۳۸) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے امام المفسرین ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر (۵/ ۱۶۷ تا ۲۲۷) میں مختلف اقوال اور ان کے دلائل ذکر کیے ہیں۔ ۶۰ صفحات میں دی گئی تفصیلات کا خلاصہ صفحہ (۲۲۱) پر ذکر کیا اور لکھا ہے:

”وَالصَّوَابُ مِنَ الْقَوْلِ عَنْ ذٰلِكَ مَا تَظَاهَرَتْ بِهِ الْأَخْبَارُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ الَّتِي ذَكَرْنَاهَا قَبْلُ، وَهُوَ أَنَّهَا الْعَصْرُ“[1]

''ہماری ذکر کردہ احادیثِ رسول ﷺ کے مجموعے سے ثابت ہوتا ہے کہ مختلف اقوال میں سے صحیح تر قول یہ ہے کہ نمازِ وسطیٰ سے مراد نمازِ عصر ہے۔''

امام قرطبی رحمہ اللہ:

امام قرطبی رحمہ اللہ نے مذکورہ آیت کے تحت لکھا ہے کہ نمازِ وسطیٰ کی تعیین کے سلسلے میں اہلِ علم کے دس اقوال ہیں، پھر کچھ تفصیل و دلائل بھی ذکر کیے ہیں، جب کہ نمازِ عصر والے قول کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ حضرت علی، ابن عباس، ابن عمر، ابو ہریرہ اور ابو سعید خدری رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا بھی یہی اختیار ہے۔ امام شافعی اور اکثر علماے حدیث نے بھی یہی کہا ہے۔ مالکی علما میں سے ابن حبیب، ابن العربی اور ابن عطیہ کی بھی یہی رائے ہے۔

ابن عطیہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ جمہور اہلِ علم کا یہی قول ہے۔ آگے صحیح مسلم، سنن ترمذی اور دیگر کتب کے بعض دلائل ذکر کیے اور بعض کی طرف اشارہ کیا ہے، جس سے امام قرطبی کا دلی رجحان بادیِ النظر میں یہی نظر آتا ہے کہ وہ بھی کسی حد تک نمازِ عصر ہی کے نمازِ وسطیٰ ہونے کے قائل ہیں، لیکن انھوں نے صحیح تر قول اسے قرار دیا ہے کہ وہ نماز غیر معیّن اور مبہم ہے، کیوں کہ اقوال کے دلائل متعارض ہیں اور ترجیح کی کوئی واضح صورت بھی نہیں۔[2]

امام مسلم کا اختیار بھی یہی بتایا ہے اور صحیح مسلم، مسند عبد بن حمید، ابو داود فی الناسخ، تفسیر ابن جریر، سنن بیہقی، ابن حزم، مستدرک حاکم اور معانی الآثار طحاوی کی وہ حدیث بطورِ دلیل ذکر کی ہے، جس

---

[1] تفسیر ابن جریر طبري (٥/ ٢٢١) طبع دار المعارف مصر بتحقیق علامه أحمد شاكر.

[2] تفسیر القرطبي (٢/ ٣/ ٢٠٩۔ ٢١٣) طبع مصر.

میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ پہلے یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْعَصْرِ﴾

''نمازوں کی محافظت کرو، خصوصاً نمازِ عصر کی۔''

جب تک اللہ نے چاہا، ہم اس آیت کی اسی طرح تلاوت کرتے رہے، پھر یہ آیت اللہ نے منسوخ کر دی اور یہ آیت اتاری:

﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾ [البقرة: ٢٣٨]

''نمازوں کی محافظت کرو، خصوصاً نمازِ وسطیٰ کی۔''

تب ایک آدمی نے کہا: تو پھر وہ نمازِ عصر ہوئی؟ اس پر حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''میں نے تمھیں بتایا ہے کہ پہلے یہ آیت کیسے نازل ہوئی اور پھر اللہ نے اسے کیسے منسوخ کیا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔''[1]

امام قرطبی رحمہ اللہ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''اس سے لازم آتا ہے کہ اس نماز کی پہلے تعیین تو کی گئی، مگر پھر وہ تعیین منسوخ کر دی گئی اور اسے مبہم چھوڑ دیا گیا، لہٰذا تعیین نہ رہی۔'' وَاللّٰهُ أَعْلَمُ.[2]

علامہ آلوسی رحمہ اللہ:

علامہ آلوسی نے اپنی تفسیر ''روح المعاني'' (١/ ٢/ ١٥٦، ١٥٧) میں یہ بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ صحیح مسلم کی یومِ احزاب کے واقعے سے تعلّق رکھنے والی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رو سے اکثر اہلِ علم نے صحیح اسے ہی قرار دیا ہے کہ وہ نمازِ عصر ہے۔ آگے چل کر انھوں نے بعض محقّقین کے حوالے سے اس کے نمازِ عصر ہونے پر متعدد احتمالات وارد کیے ہیں اور چند احادیث سے یہ واضح کیا ہے کہ وہ نمازِ ظہر ہے اور لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف بھی یہ قول منسوب کیا گیا ہے۔

علامہ محمد رشید رضا:

علامہ محمد رشید رضا مصری نے اپنی ''تفسير المنار'' (٢/ ٤٣٧، ٤٣٨) میں یہ بحث کی ہے اور احادیث کی رو سے سب سے صحیح تر قول نمازِ عصر والے قول کو قرار دیا ہے۔

---

[1] تفسير القرطبي (٢/ ٣/ ٢١٢) و تحقيق تفسير ابن جرير (٥/ ١٩٣) و فتح القدير للشوكاني (١/ ٢٥٧)

[2] تفسير القرطبي (٢/ ٣/ ٢١٢)

امام شوکانی رحمہ اللہ:

معروف مجتہد امام شوکانی رحمہ اللہ نے "منتقیٰ الأخبار" کی شرح "نیل الأوطار" میں بڑی تفصیل ذکر کی ہے اور اس سلسلے کے سترہ اقوال نقل کیے ہیں، پھر ان کے دلائل وغیرہ کے تذکرے کے بعد سب سے راجح تر قول نمازِ عصر والی رائے ہی کو قرار دیا ہے۔[1]

انہی سترہ اقوال کی طرف اشارہ کر کے اپنی تفسیر "فتح القدیر" میں بھی مذکورہ آیت کے تحت لکھا ہے:

"أَرْجَحَ الْأَقْوَالِ وَأَصَحِّهَا مَا ذَهَبَ اِلَيْهِ الْجَمْهُوْرُ مِنْ أَنَّهَا الْعَصْرُ لِمَا ثَبَتَ عِنْدَ الْبُخَارِيِّ وَمُسْلِمٍ وَأَهْلِ السُّنَنِ وَغَيْرِهِمْ"[2]

"صحیح بخاری و مسلم اور سُنن وغیرہ کتبِ حدیث میں ثابت شدہ احادیث کے پیشِ نظر صحیح تر قول جمہور ہی کا ہے، جو کہتے ہیں کہ نمازِ وسطیٰ نمازِ عصر ہے۔"

امام ابن کثیر رحمہ اللہ:

انتہائی مشہور و معروف مفسر امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے مذکورہ آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کافی تفصیل ذکر کی ہے۔ دیگر اقوال سے قطع نظر نمازِ فجر و ظہر اور عصر کے نمازِ وسطیٰ ہونے والے اقوال کے دلائل بھی ذکر کیے ہیں اور سب سے زیادہ جگہ نمازِ عصر سے متعلق دلائل کو دی اور لکھا ہے کہ امام ترمذی و بغوی رحمہما اللہ نے کہا ہے کہ اکثر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور بعد والے علما نے نمازِ عصر ہی کو نمازِ وسطیٰ کہا ہے۔ قاضی ماوردی کے بقول جمہور تابعین کا بھی یہی قول ہے اور امام ماوراء النہر علامہ ابن عبدالبر رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ اکثر محدثینِ کرام نے بھی یہی کہا ہے۔ ابن عطیہ رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ جمہور اہلِ علم کا بھی یہی قول ہے اور حافظ دمیاطی کی کتاب "كشف الغطاء في تبيين الصلاة الوسطىٰ" سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ نمازِ عصر ہے۔ صحابہ کرام میں سے حضرت عمر فاروق، علی، ابن مسعود، ابو ایوب، عبداللہ بن عمرو، سمرہ بن جندب، ابو ہریرہ، ابو سعید خدری، ام المومنین حضرت حفصہ، ام حبیبہ اور ام سلمہ رضی اللہ عنہم سے بھی نمازِ عصر ہی کی روایات وارد ہوئی ہیں، جبکہ حضرت عبداللہ بن عمر،

[1] نيل الأوطار (١/ ١/ ٣١١ ـ ٣١٨)

[2] تفسير فتح القدير (١/ ٢٥٦) دار الفكر بيروت.

ابن عباس اور ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم سے (اگرچہ بعض دیگر اقوال بھی مروی ہیں لیکن) صحیح تر قول کے مطابق ان کے نزدیک بھی نمازِ عصر ہی ہے۔

تابعین میں سے حضرت عبیدہ، ابراہیم نخعی، زر بن حبیش، سعید بن جبیر، ابن سیرین، حسن بصری، قتادہ، ضحاک، کلبی، مقاتل، عبید بن مریم اور دیگر حضرات رحمہم اللہ سے یہی نماز مروی ہے، جب کہ ائمہ و فقہاے مذاہبِ اربعہ میں سے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا یہی مذہب ہے اور قاضی ماوردی کے بقول امام شافعی رحمہ اللہ کا بھی اور ابن المنذر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے دو ارشد تلامذہ امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ سے (اگرچہ دوسرے اقوال بھی مروی ہیں، لیکن) ان کے صحیح تر قول کے مطابق ان کے نزدیک بھی عصر ہی ہے اور حبیب مالکی رحمہ اللہ کا اختیار بھی یہی ہے۔[1]

نمازِ فجر کہنے والوں کے دلائل اور ان کا جائزہ:

نمازِ فجر کو نمازِ وسطیٰ کہنے والوں نے جن روایات سے استدلال کیا ہے، ان میں سے کسی ایک بھی مرفوع، صریح اور صحیح روایت سے نمازِ فجر کے نمازِ وسطیٰ ہونے کا پتا نہیں چلتا، بلکہ وہ جتنی بھی روایات ہیں یا تو صحابہ رضی اللہ عنہم پر موقوف ہیں یا تابعین رحمہم اللہ کے آثار ہیں۔

امام طبری رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں بارہ روایات وہ ذکر کی ہیں، جو صحابہ رضی اللہ عنہم پر موقوف ہیں، ان میں سے نو (۹) تو صرف ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں۔ ایک روایت ابو عالیہ رحمہ اللہ نے صحابی کا نام لیے بغیر بیان کی ہے اور ایک عام صحابہ سے نام ذکر کیے بغیر نقل کی ہے۔ ایک حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ ان میں سے کسی روایت میں بھی یہ مذکور نہیں کہ یہ بات نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے۔[2]

ہاں ایک تیرھویں روایت سنن نسائی میں مرفوع بھی ہے، لیکن علامہ احمد شاکر کی وضاحت کے مطابق اس روایت کی سند کے صحیح ہونے اور اس کے مرفوع ہونے کے باوجود اس میں نمازِ وسطیٰ کے تعلق سے آخر میں جو تفسیری الفاظ ہیں، وہ پھر موقوف ہیں، یعنی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے الفاظ ہیں، نہ کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور تفسیر ابن کثیر میں حضرت ابن عمر و انس رضی اللہ عنہم کی طرف بھی ایسے اقوال منسوب ہیں۔[4]

---

[1] تفسير ابن كثير (۱/ ۲۹۱)

[2] تفسير الطبري (۵/ ۲۱٤۔ ۲۱۹) و تفسير ابن كثير (۱/ ۲۹۰)

[3] تحقيق تفسير ابن جرير طبري (۵/ ۲۱۵) تفسير ابن كثير (۱/ ۲۹۰)

فتح القدیر میں امام شوکانی رحمہ اللہ کے بقول (حضرت ابن عباس، ابن عمر اور جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہم کے علاوہ) حضرت علی اور ابو امامہ رضی اللہ عنہما سے بھی موقوف آثار ہی ملتے ہیں۔[1]

امام ابن جریر رحمہ اللہ نے تابعین میں سے امام عطاء، عکرمہ، عبداللہ بن شداد اور ربیع رحمہم اللہ سے ایک ایک اور حضرت مجاہد رحمہ اللہ سے دو (۲) قول نقل کیے ہیں، جن میں ان سب نے نمازِ فجر کو نمازِ وسطیٰ کہا ہے۔[2] جب کہ ان آثارِ صحابہ و تابعین کے دلیل کا کام دینے یا دلیل نہ بن سکنے کے سلسلے میں امام شوکانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم ان کے اپنے اقوال پر مبنی ہیں اور ان میں سے کوئی ایک اثر بھی ایسا نہیں ہے، جس میں اس بات کی نسبت نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہو۔ ایسے اقوال دلیل و حجت نہیں بن سکتے، خصوصاً جب کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بات ثابت ہو، جس پر تواتر کا دعویٰ کرنا بھی ممکن ہو۔ ایسی ثابت شدہ بات کے مقابلے میں آنے والے اقوال تو قطعاً دلیل نہیں ہو سکتے اور کسی ایسے معاملے میں جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اقوال دلیل نہیں بن سکتے تو تابعین اور تبع تابعین سے مروی اقوال بالاولیٰ دلیل نہیں ہوں گے۔[3]

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ نمازِ فجر کو نمازِ وسطیٰ کہنے والوں کے دلائل میں کوئی جان نہیں ہے۔

نمازِ ظہر کہنے والوں کے دلائل اور ان کا جائزہ:

اب آیئے دیکھیں کہ نمازِ ظہر کو وسطیٰ کہنے والوں کے پاس کیا دلائل ہیں اور ان کی حجت کی کیا حیثیت ہے؟ چنانچہ اس کے دلائل ذکر کرتے ہوئے امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے تیرہ روایات ذکر کی ہیں، جن میں سے آٹھ تو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے موقوفاً مروی ہیں اور انھی سے ایک روایت ایسی بھی مروی ہے، جسے سند کے اعتبار سے تو ضعیف قرار دیا گیا ہے، لیکن اس کے مرفوع ہونے کو امام شوکانی رحمہ اللہ نے غیر صحیح اور علامہ احمد شاکر نے وہم قرار دیا ہے۔ یعنی وہ الفاظ جو نمازِ وسطیٰ کی تعیین سے تعلق رکھتے ہیں، نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں، بلکہ وہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہی کے ہیں۔[4]

---

[1] فتح القدیر (۱/ ۲۵۶)

[2] سنن الطبري (۵/ ۲۱۹)

[3] فتح القدیر (۱/ ۲۵۶)

[4] تحقیق تفسیر الطبري (۵/ ۲۰۰۔ ۲۰۱) فتح القدیر (۱/ ۲۵۶)

جبکہ چار روایات حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہیں، جن میں سے ایک میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا ارشاد بھی شامل ہے، جبکہ انہی دونوں حضرات رضی اللہ عنہما سے دوسری صحیح اسناد والی روایات میں نمازِ ظہر کے بجائے نمازِ عصر بھی مروی ہے، جیسا کہ امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے اشارہ کیا ہے اور امام طبری رحمہ اللہ نے وہ روایات بھی اسانید کے ساتھ اپنی تفسیر میں درج کی ہیں۔[1]

ایسے ہی بعض دیگر آثار ہیں، لیکن صحیح بخاری و مسلم اور سنن وغیرہ کی ان صحیح احادیث کا مقابلہ نہیں کر سکتے، جو نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع ہیں، یعنی خود نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ وسطیٰ کی تعیین نمازِ عصر سے فرمائی ہے، جیسا کہ نمازِ فجر کہنے والوں کے دلائل کے جائزے کے ضمن میں بھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ ایسے ہی امہات المومنین حضرت حفصہ، ام سلمہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہن سے بھی روایات ملتی ہیں، جن سے نمازِ ظہر پر استدلال کیا جاتا ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان میں یہ وضاحت نہیں ہے، بلکہ ان سے اس کے برعکس وہ روایات بھی ملتی ہیں، جن میں نمازِ عصر کے نمازِ وسطیٰ ہونے کی صراحت موجود ہے، لہٰذا ظہر والی روایات سے استدلال کمزور ہے۔[2]

نمازِ عصر کہنے والوں کے دلائل:

اکثر صحابہ و تابعین، ائمہ و فقہا اور محدثینِ کرام کے نزدیک راجح تر قول یہ ہے کہ نمازِ وسطیٰ سے مراد نمازِ عصر ہے، اس بات کے دلائل میں صرف امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں دو چار نہیں، بلکہ چھیاسٹھ احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور اقوالِ تابعین روایت کیے ہیں اور علامہ احمد شاکر رحمہ اللہ نے درست ہی کہا ہے کہ نمازِ وسطیٰ کی تفسیر میں امام طبری نے ایک سو تیرہ (۱۱۳) احادیث و آثار روایت کیے ہیں اور اس موضوع پر ایسا استیعاب تفسیر طبری کے سوا کسی دوسری کتابِ تفسیر و حدیث میں نہیں، انھوں نے اس کا حق ادا کر دیا ہے اور حسبِ عادت انھوں نے دلیل کے اعتبار سے قوی ترین رائے کو راجح قرار دیتے وقت نمازِ عصر ہی کو اختیار کیا ہے اور اسی کو ثابت کرنے کے لیے چھیاسٹھ (٦٦) احادیث و آثار بیان کیے ہیں۔ ان سب کا یکے بعد دیگر ذکر تو باعثِ طوالت ہوگا۔ تشنگانِ علم مذکورہ تفسیر کی جلد پنجم (ص: ۱٦۸) سے لے کر (ص: ۱۹۸) تک یعنی اکتیس (۳۱)

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۲۹۱) طبری و تحقیقه (٥/ ۱۷۲۔ ۱۷۳، ٥/ ۱۹۸۔ ۲۰٤)

[2] تفصیل کے لیے دیکھیں: تفسیر الطبري (٥/ ۲۰٥۔ ۲۱٤) فتح القدیر (۱/ ۲٥٦۔ ۲٥۷) نیل الأوطار (۱/ ۱/ ۳۱۲)

صفحات کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ ہم یہاں تفسیر طبری اور دیگر کتبِ حدیث سے چند احادیثِ رسول ﷺ، آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور اقوالِ تابعین ذکر کرتے ہیں۔

حدیثِ اوّل:

ان میں سے پہلی حدیث صحیح بخاری و مسلم، سنن ابو داود اور مسند احمد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ غزوہ احزاب کے دن مشرکین کے بارے میں نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

﴿ مَلَأَ اللّٰهُ قُبُوْرَهُمْ وَ بُيُوْتَهُمْ نَاراً كَمَا شَغَلُوْنَا عَنِ الصَّلَاةِ الْوُسْطٰى حَتّٰى غَابَتِ الشَّمْسُ ﴾

''اللہ ان کی قبروں اور گھروں کو آگ سے بھر دے، جیسے اُنھوں نے ہمیں نمازِ وسطیٰ سے روکے رکھا، یہاں تک کہ سورج غروب ہوگیا۔''

جب کہ صحیح مسلم، سنن ابو داود اور مسند احمد کے الفاظ یوں ہیں:

﴿ شَغَلُوْنَا عَنِ الصَّلَاةِ الْوُسْطٰى، صَلَاةِ الْعَصْرِ ﴾[1]

''اُنھوں نے ہمیں درمیانی نماز، نمازِ عصر سے روکے رکھا۔''

اِن الفاظ میں نمازِ وسطیٰ کی وضاحت و تعیین نمازِ عصر سے کی گئی ہے۔

حدیثِ دوم:

دوسری حدیث سنن ابن ماجہ، بیہقی، مصنف عبدالرزاق، محلّٰی ابن حزم اور تفسیر طبری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں:

﴿ كُنَّا نَرَاهَا الصُّبْحَ [أَوِ الْفَجْرَ] حَتّٰى سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ يَوْمَ الْأَحْزَابِ: شَغَلُوْنَا عَنِ الصَّلَاةِ الْوُسْطٰى صَلَاةِ الْعَصْرِ مَلَأَ اللّٰهُ قُبُوْرَهُمْ وَأَجْوَافَهُمُ النَّارَ ﴾[2]

---

[1] صحيح البخاري (٨/ ١٩٥) صحيح مسلم (٣/ ٥/ ١٢٨) صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٥) المنتقى مع النيل (١/ ١/ ٣١٠ـ ٣١١)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٨٤) طبري و تحقيقه (٥/ ١٨٤) و صححه أحمد شاكر.

''ہم نمازِ فجر کو ہی نمازِ وسطیٰ سمجھا کرتے تھے، حتیٰ کہ غزوۂ احزاب کے دن میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سُنا: ''انھوں نے ہمیں نمازِ وسطیٰ نمازِ عصر سے رو کے رکھا۔ اللہ ان کے پیٹوں اور قبروں کو آگ سے بھر دے۔''

حدیثِ سوم:

اِسی طرح حدیثِ اوّل سے ملتی جلتی ایک حدیث صحیح مسلم، سنن ترمذی و ابن ماجہ، مسند احمد، سنن بیہقی اور طیالسی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اس میں بھی نبیِ اکرم ﷺ نے نمازِ عصر ہی کو نمازِ وسطیٰ قرار دیا ہے۔[1]

یاد رہے کہ غزوۂ احزاب یا غزوۂ خندق کے موقع پر بعض احادیث کی رو سے نمازِ عصر و ظہر اور مغرب وعشا سبھی میں دیر ہوگئی تھی، جبکہ صحیحین کی حدیث میں صرف نمازِ عصر مذکور ہے۔ امام ابن العربی نے کہا ہے کہ دونوں طرح کی احادیث ہی صحیح ہیں اور غزوۂ خندق کا واقعہ کئی دنوں پر محیط تھا، لہٰذا ممکن ہے کہ کسی دِن چار نمازیں اور کسی دن صرف عصر میں تاخیر ہوگئی ہو۔[2]

حدیثِ چہارم:

صحیح مسلم، سنن ترمذی اور دیگر کتبِ حدیث میں ایک چوتھی روایت بھی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

«صَلَاةُ الْوُسْطٰی صَلَاةُ الْعَصْرِ»[3] ''نمازِ وسطیٰ نمازِ عصر ہے۔''

حدیثِ پنجم:

پانچویں حدیث سنن ترمذی، مسند احمد، سنن بیہقی، تفسیر طبری اور معانی الآثار طحاوی میں حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں وہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے فرمایا:

---

[1] المنتقیٰ (۱/ ۱/ ۲۱۴) طبري و تحقیقه (۵/ ۱۸۲۔ ۱۸۳)

[2] دیکھیں: نیل الأوطار (۱/ ۱/ ۳۱۳۔ ۳۱۴)

[3] صحیح مسلم (۳/ ۵/ ۱۲۸) صحیح سنن الترمذي، رقم الحدیث (۱۵۲) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (۶۸۶) المنتقیٰ أیضاً.

«الصَّلَاةُ الْوُسْطٰى صَلَاةُ الْعَصْرِ»[1] ''نمازِ وسطیٰ نمازِ عصر ہے۔''

حدیثِ ششم:

چھٹی حدیث سنن بیہقی اور معجم طبرانی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ بھی یہی ہیں:

«الصَّلَاةُ الْوُسْطٰى صَلَاةُ الْعَصْرِ»[2] ''نمازِ وسطیٰ نمازِ عصر ہے۔''

آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم:

اس موضوع ومفہوم کی اور بھی کتنی ہی احادیث ہیں، لیکن ہم نے ان میں سے صرف صحیح اسانید والی یہ چھے احادیث ہی ذکر کی ہیں جو مرفوع ہیں، یعنی نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر مشتمل ہیں، جن کی موجودگی میں کسی دوسری دلیل کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی، تاہم صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ کے اسی معنیٰ کے بکثرت آثار بھی ملتے ہیں۔

اثرِ اوّل:

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملتے جلتے الفاظ سے تفسیر طبری، شعب الایمان بیہقی، مصنف ابن ابی شیبہ اور مسند عبد بن حمید میں مروی ہے، ابو صہباء بکری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ نمازِ وسطیٰ کون سی ہے؟ تو انھوں نے فرمایا:

''هِيَ صَلَاةُ الْعَصْرِ، وَ هِيَ الَّتِيْ فُتِنَ بِهَا ابْنُ دَاوٗدُ''[3]

''وہ نمازِ عصر ہے اور یہی وہ نماز ہے، جس سے (حضرت سلیمان) ابن داود علیہما السلام آزمائے گئے تھے۔''

اثرِ ثانی:

تفسیر طبری، سنن بیہقی اور محلّی ابن حزم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

---

[1] صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٣) الفتح الرباني (١/ ٢/ ١٦٢) المنتقىٰ (١/ ١/ ٣١٤) تفسير الطبري (٥/ ١٨٠، ١٩٤)

[2] تفسير الطبري و تحقيقه (٥/ ١٨٩) صحيح الجامع، رقم الحديث (٣٨٣٥)

[3] تفسير الطبري و تحقيقه (٥/ ١٧٠) و صححه أحمد شاكر.

"الصَّلَاةُ الْوُسْطٰى صَلَاةُ الْعَصْرِ"[1] "نمازِ وسطیٰ نمازِ عصر ہے۔"

اثرِ ثالث:

اثرِ ثالث حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے تفسیر طبری، مصنف عبد الرزاق، محلّی ابن حزم اور معانی الآثار طحاوی (واللفظ لہ) میں مروی ہے اور اس کے الفاظ بھی من وعن یہی ہیں، جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ہیں۔[2]

اثرِ رابع:

اثرِ رابع ترجمان القرآن حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، جو تفسیر طبری اور دیگر کتب میں مذکورہ آیت کی تفسیر کے ضمن میں وارد ہوا ہے اور انھوں نے بھی نمازِ وسطیٰ کی تفسیر نمازِ عصر سے کی ہے۔[3]

اثرِ خامس:

اثرِ خامس تفسیر طبری، مصنف ابن ابی شیبہ اور محلّی ابن حزم میں ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے اور اس کے الفاظ بھی: "الصَّلَاةُ الْوُسْطٰى صَلَاةُ الْعَصْرِ" ہی ہیں۔

ان آثار سے بھی پتا چلا کہ (نمازِ وسطیٰ) نمازِ عصر ہی ہے، نہ کہ کوئی دوسری نماز۔

آثارِ تابعین رحمہم اللہ:

آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح تابعینِ کرام رحمہم اللہ سے بھی بکثرت آثار ملتے ہیں، جن میں نمازِ وسطیٰ کی تعیین نمازِ عصر ہی سے کی گئی ہے۔ چنانچہ امام ابراہیم نخعی، حسن بصری، قتادہ، زرّ بن حبیش، ضحاک اور مجاہد رحمہم اللہ کے آثار تفسیر ابن جریر طبری اور اس کی تحقیق میں دیکھے جا سکتے ہیں۔[4]

خلاصۂ کلام:

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ نمازِ وسطیٰ، جس کی محافظت کی قرآنِ کریم میں سخت تاکید کی گئی ہے، وہ نمازِ عصر ہے اور یہی راجح مسلک ہے۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "فتح الباري" (۸/ ۱۹۵۔ ۱۹۸) میں بیس (۲۰) اقوال اور ان کے دلائل کا جائزہ لینے کے بعد نمازِ عصر والے قول کو ترجیح دی ہے۔

---

[1] تفسير الطبري و تحقيقه (۵/ ۱۷۰) صحيح الجامع، رقم الحديث (۳۸۳۵)

[2] تحقيق تفسير الطبري (۵/ ۱۷۰) صحيح الجامع، رقم الحديث (۳۸۳۵)

[3] تحقيق تفسير الطبري (۵/ ۱۷۹ ـ ۱۸۰)

[4] تحقيق الطبري (۵/ ۱۷۷۔ ۱۷۹۔ ۱۸۰۔ ۱۸۲)

نماز میں پابندیِ وقت
حدیث شریف کی روشنی میں

نمازوں کو ادا کرنے میں پابندیِ وقت کی بات شروع ہوئی اور قرآنِ کریم کی بعض آیات سے اس موضوع کا آغاز کیا گیا تھا۔ سورۃ البقرہ کی آیت (۲۳۸) میں نمازوں کو ادا کرنے میں پابندیِ وقت کی تاکید کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے نمازِ وسطیٰ کی محافظت کا بطورِ خاص حکم فرمایا ہے اور نمازِ وسطیٰ کی تعیین بھی ہم نے احادیث و آثار کی روشنی میں قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر کر دی ہے کہ وہ نمازِ عصر ہے۔

ترکِ عصر پر وعید:

نمازِ عصر اتنی قدر و منزلت کی حامل ہے کہ اس کی اہمیت صرف اسی بات سے معلوم ہو جاتی ہے کہ صحیح بخاری و مسلم اور سنن اربعہ میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«اَلَّذِي تَفُوْتُهٗ صَلَاةُ الْعَصْرِ كَأَنَّمَا وُتِرَ أَهْلُهٗ وَمَالُهٗ»[1]

''جس کی نمازِ عصر فوت ہوگئی، وہ ایسے ہے جیسے کسی کے اہل و مال ہی ہلاک و برباد ہو گئے ہوں۔''

اس حدیث پر امام بخاری رحمہ اللہ کی تبویب ''باب إثم من فاتته العصر'' اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر کے فوت ہو جانے سے مراد اس کا بالکلیہ ترک کرنا نہیں، بلکہ اس کے جواز کے وقت سے اس کو ادا کرنے میں تاخیر کرنا مراد ہے۔

اسی طرح صحیح بخاری، سنن نسائی و ابن ماجہ، مصنف ابن ابی شیبہ اور مسند احمد میں حضرت ابو ملیح رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ ایک غزوے کے سلسلے میں ہم حضرت ابو بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تھے، جبکہ اس

[1] صحيح البخاري (٢/ ٣٠) صحيح مسلم (٣/ ٥/ ١٢٥) صحيح سنن أبي داود (٤٠٠) صحيح سنن الترمذي (١٤٧) صحيح سنن النسائي (٤٦٤) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٦٨٥) صحيح ابن خزيمة (١/ ١٧٣) صحيح الجامع الصغير (٣/ ٥/ ١١٣)

دن آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے تو حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«بَكِّرُوْا صَلَاةَ الْعَصْرِ لِأَنَّ النَّبِي ﷺ قَالَ: مَنْ تَرَكَ صَلَاةَ الْعَصْرِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ»[1]

''نمازِ عصر ادا کرنے میں جلدی کرو، کیوں کہ نبیِ کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''جس نے نمازِ عصر ترک کر دی، اس کے تمام اعمال برباد ہو گئے۔''

یہاں یہ بات پیشِ نظر رہے کہ اس مقام پر بھی ترک سے مراد بالکلیہ ترک نہیں، بلکہ نماز کو اہمیت نہ دیتے ہوئے اس کے وقتِ جواز سے اسے نکال دینا مراد ہے، جیسا کہ حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کے نمازِ عصر کو جلدی ادا کرنے کے حکم سے پتا چلتا ہے۔ مطلق ترک کر دینا یا انکار کر دینا یا انکار تو نہ کرنا، مگر اس کی پروا نہ کرتے ہوئے اس کو ترک کر دینا، جیسے اقوال بھی ملتے ہیں، لیکن ان سب اقوال سے اولیٰ مفہوم وہی ہے، جو اس ارشادِ نبوی ﷺ کے راوی صحابی رضی اللہ عنہ نے بتایا ہے اور تمام اعمال کا برباد ہو جانا، وعیدِ شدید اور سخت زجر و توبیخ ہے۔

حافظ عسقلانی رحمہ اللہ کے نزدیک تمام اعمال کی بربادی کے ظاہری معنیٰ کے بجائے اقرب تاویل یہ ہے کہ اس سے مراد زجرِ شدید ہے۔[2]

محافظتِ عصر و فجر:

بعض احادیثِ رسول ﷺ ایسی ہیں کہ جن میں نمازِ عصر کے ساتھ ہی نمازِ فجر ادا کرنے پر محافظت اور ان دونوں نمازوں کی فضیلت ذکر کی گئی ہے، مثلاً صحیح بخاری و مسلم کی ایک متفق علیہ حدیث میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ صَلّٰى الْبَرْدَيْنِ دَخَلَ الْجَنَّةَ»[3]

''جس نے دو ٹھنڈی نمازیں (فجر و عصر) پابندی سے ادا کیں، وہ جنت میں داخل ہو گیا۔''

صحیح مسلم، سنن ابی داود، نسائی، مسندِ احمد اور صحیح ابن خزیمہ میں ابو زہیرہ عمارہ بن رویبہ رضی اللہ عنہ

---

1. صحيح البخاري (٢/ ٣١) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٦٠) سنن ابن ماجه (٦٩٤) صحيح ابن خزيمة (١/ ١٧٣)
2. فتح الباري (٢/ ٣٢۔ ٣٣)
3. صحيح البخاري (٢/ ٥٢) و صحيح مسلم (٣/ ٥/ ١٣٥) صحيح الجامع (٣/ ٥/ ٣١١)

سے مروی ہے کہ میں نے نبیِ اکرم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سُنا:

«لَنْ یَّلِجَ النَّارَ أَحَدٌ صَلّٰی قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا. یَعْنِی: الْفَجْرَ وَالْعَصْرَ»[1]

''وہ شخص ہرگز جہنم میں داخل نہیں ہوگا، جس نے طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب سے پہلے والی نمازیں (فجر وعصر) پابندی سے ادا کیں۔''

صحیح مسلم، سنن ترمذی، مسندِ احمد اور معجم طبرانی میں حضرت جندب بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«مَنْ صَلَّی الصُّبْحَ فَهُوَ فِيْ ذِمَّةِ اللّٰهِ فَلَا یَطْلُبَنَّکُمُ اللّٰهُ مِنْ ذِمَّتِهٖ بِشَيْءٍ فَإِنَّهٗ مَنْ یَّطْلُبُهٗ مِنْ ذِمَّتِهٖ بِشَيْءٍ یُدْرِکُهٗ، ثُمَّ یَکُبُّهٗ عَلٰی وَجْهِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ»[2]

''جس نے نمازِ فجر ادا کی، وہ اللہ کے ذمے میں آگیا۔ اللہ تمھیں اپنے ذمے کو ترک کرنے کے لیے کسی معاملے میں مواخذہ نہ کرے، ورنہ جسے اس نے اپنے ترکِ ذمہ کے لیے طلب کر لیا تو وہ اسے پکڑے گا اور اس شخص کو منہ کے بَل جہنم میں پھینک دے گا۔''

جب کہ صحیحین و سنن اربعہ اور مسند احمد میں حضرت جریر بن عبداللہ البجلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

«کُنَّا عِنْدَ النَّبِیِّ ﷺ فَنَظَرَ اِلَی الْقَمَرِ لَیْلَةَ الْبَدْرِ فَقَالَ: اِنَّکُم سَتَرَوْنَ رَبَّکُمْ کَمَا تَرَوْنَ هٰذَا الْقَمَرَ، لَا تُضَامُوْنَ فِيْ رُؤْیَتِهٖ فَاِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَلَّا تُغْلَبُوْا عَلٰی صَلَاةٍ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا فَافْعَلُوْا»[3]

''ہم نبیِ اکرم ﷺ کے پاس موجود تھے، آپ ﷺ نے چودھویں کے چاند کو دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''تم اپنے پروردگار کو بھی اسی طرح دیکھو گے، جس طرح آج اس چاند کو دیکھ رہے ہو، تمھیں اسے دیکھنے میں کمی کرنے والی کوئی چیز حائل نہیں ہوگی، (لیکن اس کے

[1] صحیح مسلم (٣/ ٥/ ١٣٥) صحیح سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤١٢) صحیح سنن النسائي (٤٥٧) صحیح ابن خزیمة (١/ ١٦٤) صحیح الجامع (٣/ ٥/ ٥٤)

[2] صحیح مسلم (٥/ ١٥٨) صحیح سنن الترمذي (١٨٤) صحیح الجامع (٥/ ٣١٢) و المشکاة مع المرعاة (٢/ ٦٧)

[3] صحیح البخاري (٢/ ٣٣) صحیح مسلم (٥/ ١٣٤) صحیح سنن أبي داوٗد (٣٩٥٥) صحیح سنن الترمذي، رقم الحدیث (٢٠٦٧) سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (١٧٧) صحیح الجامع، رقم الحدیث (٢٣٠٦)

لیے ضروری ہے کہ) اگر ہوسکے تو طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب سے پہلے والی دو نمازوں (فجر وعصر) کوادا کرنے سے روکنے میں تم پر کوئی چیز غالب نہ آنے پائے۔''

پھر آپ ﷺ نے سورت قٓ کی اس آیت (۳۹) کی تلاوت کی، جس میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ﴾

''اور طلوعِ آفتاب سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اللہ کی تسبیح کرو۔''

اس حدیث کے ایک راوی اسماعیل فرماتے ہیں:

"اِفْعَلُوْا فَلَا تَفُوْتَنَّكُمْ"[1] ''یہ کام کرگزرو کہ یہ نمازیں فوت نہ ہونے پائیں۔''

فضیلتِ عصر و فجر کے اسباب:

صحیح مسلم اور سُنن نسائی میں حضرت ابو بصرہ غفاری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ہمیں مُخمص نامی جگہ پر عصر کی نماز پڑھائی اور فرمایا:

«اِنَّ هَذِهِ الصَّلَاةَ عُرِضَتْ عَلٰى مَنْ كَانَ قَبْلَكُم فَضَيَّعُوْهَا، فَمَنْ حَافَظَ عَلَيْهَا كَانَ لَهٗ أَجْرُهٗ مَرَّتَيْنِ، وَلَا صَلَاةَ بَعْدَهَا حَتّٰى يَطْلُعَ الشَّاهِدُ»[2]

''یہ نماز تم سے پہلے لوگوں پر بھی فرض کی گئی، مگر انھوں نے اسے ضائع کر دیا۔ پس جس نے اس کی نگہداشت کی اُسے دوہرا اجر ملے گا اور اس کے بعد ستارہ نکلنے (غروبِ آفتاب) تک کوئی (نفلی) نماز نہیں ہے۔''

اِس حدیث میں نمازِ عصر کی فضیلت کا سبب بھی آ گیا ہے، جبکہ ایک دوسری حدیث میں نمازِ فجر وعصر دونوں کی فضیلت و محافظت کا ایک اور سبب بھی مذکور ہے کہ ان نمازوں کی محافظت کرنے والوں کے لیے فرشتوں کی اللہ کے حضور گواہی ہے، چنانچہ صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی، صحیح ابن خزیمہ، السنۃ لابن ابی عاصم اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبیِ اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

«يَتَعَاقَبُوْنَ فِيْكُمْ مَلَآئِكَةٌ بِاللَّيْلِ وَمَلَآئِكَةٌ بِالنَّهَارِ يَجْتَمِعُوْنَ فِي صَلَاةِ الْفَجْرِ وَصَلَاةِ الْعَصْرِ، ثُمَّ يَعْرُجُ الَّذِيْنَ بَاتُوْا فِيْكُمْ، فَيَسْئَلُهُمْ رَبُّهُمْ

---

[1] صحيح البخاري مع الفتح، رقم الحديث (٥٥٤)

[2] صحيح مسلم (٣/ ٦/ ١١٣) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٠٧) صحيح الجامع (٣/ ٦/ ٢٦١)

وَهُوَ أَعْلَمُ بِهِمْ: كَيْفَ تَرَكْتُمْ عِبَادِيْ؟»

''(تمھارا نامہ اعمال لکھنے والے) فرشتے دن اور رات کو بدلتے رہتے ہیں، جبکہ نمازِ فجر اور عصر کے وقت دن اور رات والے فرشتے سب ہی اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ پھر جن فرشتوں نے تمھارے مابین رات گزاری ہوتی ہے، وہ آسمان کی طرف چڑھ جاتے ہیں۔ انھیں اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے، حالانکہ وہ خود زیادہ جاننے والا ہے: تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا ہے؟''

تو فرشتے کہتے ہیں:

«تَرَكْنَا هُمْ وَهُمْ يُصَلُّوْنَ وَأَتَيْنَاهُمْ وَهُمْ يُصَلُّوْنَ»[1]

''ہم نے انھیں اس حال میں چھوڑا ہے کہ وہ نماز پڑھ رہے تھے اور جب ہم ان لوگوں کے پاس گئے تھے تو بھی وہ نماز ہی پڑھ رہے تھے۔''

سبحان اللہ! فجر و عصر کی پابندی پر مومن کے لیے فرشتوں کی یہ گواہی کیا شان لیے ہوئے ہے۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِمَّنْ يُحَافِظُوْنَ عَلَيْهَا وَ عَلَى الْأُخْرٰى. آمِيْنَ.

محافظتِ فجر و عشا:

بعض احادیث ایسی بھی ہیں، جن میں صرف فجر اور بعض میں فجر کے ساتھ ہی عشا کا ذکر آیا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری شریف اور سنن نسائی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«تَفْضُلُ صَلَاةُ الْجَمْعِ صَلَاةَ أَحَدِكُم وَحْدَهٗ بِخَمْسٍ وَّعِشْرِيْنَ جُزْءًا وَتَجْتَمِعُ مَلَآئِكَةُ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ فِيْ صَلَاةِ الْفَجْرِ»

''تم میں سے کسی اکیلے کے نماز پڑھنے سے نمازِ باجماعت کا ثواب پچیس (۲۵) حصے زیادہ ہے اور نمازِ فجر میں رات اور دن کے (نامہ اعمال لکھنے والے) فرشتے جمع ہوتے ہیں۔''

پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ چاہو تو سورۃ الاسراء (بنی اسرائیل) کی آیت (۷۸)

---

[1] صحيح البخاري (۲/ ۳۳) صحيح مسلم (۳/ ۸/ ۱۳۳) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (۴۷۱) صحيح الجامع (۳/ ۶/ ۳۱۸)

پڑھ لو، (جس میں ارشادِ الٰہی ہے):

﴿اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا﴾[1]

''بے شک فجر کے وقت قرآن پڑھنے پر (اللہ کے فرشتے) گواہ بنتے ہیں۔''

صحیح مسلم اور مسند احمد میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا:

« مَنْ صَلَّى الْعِشَاءَ فِيْ جَمَاعَةٍ فَكَأَنَّهُ قَامَ نِصْفَ اللَّيْلِ، وَ مَنْ صَلَّى الصُّبْحَ فِيْ جَمَاعَةٍ فَكَأَنَّهُ صَلَّى اللَّيْلَ كُلَّهُ »[2]

''جس نے نمازِ عشا باجماعت ادا کی، اس نے گویا نصف رات قیام کیا اور جس نے فجر کی نماز بھی جماعت سے پڑھی تو اس نے گویا ساری رات ہی نماز میں گزار دی۔''

سنن ابو داود و ترمذی میں بھی حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ صَلَّى الْعِشَاءَ فِيْ جَمَاعَةٍ كَانَ كَقِيَامِ نِصْفِ لَيْلَةٍ، وَمَنْ صَلَّى الْعِشَاءَ وَ الْفَجْرَ كَانَ كَقِيَامِ لَيْلَةٍ »[3]

''جس نے نمازِ عشا باجماعت ادا کی، اس نے گویا آدھی رات قیام کیا اور جس نے نمازِ فجر وعشا دونوں جماعت سے پڑھ لیں، اس نے گویا پوری رات ہی قیام میں گزار دی۔''

صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« لَيْسَ صَلَاةٌ أَثْقَلَ عَلَى الْمُنَافِقِيْنَ مِنْ صَلَاةِ الْفَجْرِ وَالْعِشَاءِ، وَلَوْ يَعْلَمُوْنَ مَا فِيْهِمَا لَأَتَوْهُمَا وَلَوْ حَبْوًا »[4]

''منافقین پر نمازِ فجر وعشا سے بھاری کوئی نماز نہیں۔ اگر انھیں معلوم ہو جائے کہ ان دونوں نمازوں میں کتنا اجر ہے تو پھر یہ ضرور آئیں، چاہے انھیں گھٹنوں کے بل گھسٹ کر

---

[1] صحيح البخاري (٢/ ١٣٧) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٤٧٦) صحيح الجامع (٢/ ٣/ ٤٩)

[2] مختصر صحيح مسلم للمنذري، رقم الحديث (٣٢٤) صحيح الجامع (٣/ ٥/ ١٣٢)

[3] صحيح سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١٩) صحيح سنن الترمذي، رقم الحديث (١٨٣) صحيح الجامع (٣/ ٣١٣)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥٧) صحيح مسلم (٥/ ١٥٤) و المشكاة مع المرعاة (٢/ ٢٨)

ہی کیوں نہ آنا پڑے۔''

ایسے ہی صحیح بخاری و مسلم، سنن نسائی، موطا امام مالک اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَوْ یَعْلَمُ النَّاسُ مَا فِي النِّدَاءِ وَ الصَّفِّ الْأَوَّلِ، ثُمَّ لَمْ یَجِدُوْا اِلَّا أَنْ یَّسْتَهِمُوْا عَلَیْهِ لَاسْتَهَمُوْا، وَلَوْ یَعْلَمُوْنَ مَا فِي التَّهْجِیْرِ لَاسْتَبَقُوْا لَهٗ، وَلَوْ یَعْلَمُوْنَ مَا فِي الْعَتَمَةِ وَ الصُّبْحِ لَأَتَوْهُمَا وَلَوْ حَبْواً»[1]

''اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اذان کہنے اور صفِ اوّل میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرنے میں کس قدر اجر و ثواب ہے، تو پھر انھیں اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہے کہ ان میں اپنی باری مقرر کرنے کے لیے وہ قرعہ اندازی کیا کریں اور اگر انھیں (نمازِ ظہر کے لیے) مسجد میں بروقت جانے کے ثواب کا پتا چل جائے تو ضرور پہل کر جایا کریں اور اگر انھیں نمازِ عشا و فجر کے فضائل و برکات کا صحیح اندازہ ہو جائے تو وہاں دونوں نمازوں میں ضرور شریک ہوا کریں، چاہے انھیں گھٹنوں (سرینوں) کے بَل گھسٹ کر ہی کیوں نہ آنا پڑے۔''

اسی طرح ہی مگر قدرے مختصر الفاظ سے سنن ابن ماجہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَوْ یَعْلَمُ النَّاسُ مَا فِي صَلَاةِ الْعِشَاءِ وَ صَلَاةِ الْفَجْرِ لَأَتَوْهُمَا وَلَوْ حَبْواً»[2]

''اگر لوگوں کو نمازِ عشا اور فجر کے ثواب کا علم ہو جائے تو وہ ان نمازوں میں ضرور شامل ہوں، چاہے کولہوں (گھٹنوں) کے بل گھسٹتے ہی کیوں نہ آئیں۔''

نمازِ فجر کی عمومی فضیلت کے علاوہ جمعہ کے دن فجر کا خصوصی مقام بتایا گیا ہے، حتیٰ کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے با جماعت ادا کرنے کی شکل میں تمام نمازوں سے افضل قرار دیا ہے، جیسا کہ شعب الایمان بیہقی

---

[1] صحیح البخاري (٢/ ٩٦) مختصر صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٨) صحیح سنن النسائي، رقم الحدیث (٥٢٦) صحیح الجامع (٥/ ٧٩)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحدیث (٧٩٦) صحیح الجامع (٥/ ٧٩)

اور حلیۃ الاولیاء ابونعیم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«أَفْضَلُ الصَّلَوَاتِ عِنْدَ اللّٰهِ صَلَاةُ الصُّبْحِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فِي جَمَاعَةٍ»[1]

''اللہ کے نزدیک تمام نمازوں سے افضل ترین نماز، جمعہ کے دن باجماعت ادا کی گئی نمازِ فجر ہے۔''

بروز جمعہ نمازِ فجر کو باجماعت ادا کرنے کے افضل ترین نماز ہونے کی وجہ بڑی واضح سی ہے کہ بعض احادیث (جن میں سے بعض ''نمازِ جمعہ'' کے احکام و مسائل اور آداب پر مشتمل اپنی کتاب میں ہم ذکر کر چکے ہیں، جہاں وضاحت بھی قدرے زیادہ ہے) کے پیشِ نظر اس رات کو لوگ عموماً عام دنوں کی نسبت ازدواجی معاملات میں زیادہ وقت دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں صبح کی نماز رہ جانے کا زیادہ خدشہ ہوتا ہے، لہٰذا جو شخص ازدواجی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہو اور صبح ہونے پر نمازِ فجر بھی باجماعت ادا کرے تو ایسی نماز کو یقیناً دوسری نمازوں سے افضل ہونا ہی چاہیے۔ آج اکثر عربی و اسلامی ممالک میں جمعہ کے دن کو ہفتہ وار چھٹی ہوتی ہے۔ اس لیے بھی لوگ رات کو زیادہ جاگ لیتے ہیں کہ چلو صبح چھٹی ہے، سو لیں گے۔ نتیجتاً فجر کے رہ جانے کا بھی امکان زیادہ ہو جاتا ہے۔

نمازِ فجر و عشا کی اہمیت کا اندازہ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی اس ارشاد سے بھی لگایا جا سکتا ہے، جو صحیح ابن خزیمہ، مسند بزار اور معجم طبرانی میں ہے، جس میں وہ فرماتے ہیں:

''كُنَّا اِذَا فَقَدْنَا الرَّجُلَ فِي الْفَجْرِ وَالْعِشَاءِ أَسَأْنَا بِهِ الظَّنَّ''[2]

''جب ہم کسی شخص کو نمازِ فجر اور عشا سے غائب پاتے تو اس کے بارے میں (نفاق میں مبتلا ہونے) کا بُرا گمان کرتے تھے۔''

ان تمام احادیث میں نمازِ فجر و عشا پر محافظت و پابندی کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی اثر میں یہ بتایا گیا ہے کہ تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک نمازِ عشا و فجر سے غائب رہنے والے شخص کا ایمان مشکوک ہو جاتا تھا اور وہ اس کے بارے میں بدظن ہو جاتے تھے کہ کہیں وہ منافق تو نہیں ہو گیا۔

---

[1] صحيح الجامع (١/ ١/ ٣٦٦)

[2] كتاب الصلاة لعبد الملك (ص: ٢٢٣)

نمازِ ظہر کی فضیلت اور اس پر محافظت:

مذکورہ احادیث میں جس طرح نمازِ فجر وعشا اور عصر پر محافظت کی مذکورہ احادیث میں تاکید آئی ہے، ایسے ہی صحیح بخاری ومسلم، سنن نسائی، موطا امام مالک اور مسند احمد میں مروی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث میں نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نمازِ ظہر کی محافظت کی بھی ترغیب دلائی اور اُسے اوّل وقت میں ادا کرنے پر ثواب کی بشارت دیتے ہوئے فرمایا ہے:

《... وَلَوْ يَعْلَمُوْنَ مَا فِي التَّهْجِيْرِ لَاسْتَبَقُوْا إِلَيْهِ》[1]

''اگر ان لوگوں کو نمازِ ظہر بر وقت ادا کرنے کے اجر وثواب کا پتا چل جائے تو وہ ضرور اس کی طرف بھاگے بھاگے آئیں اور ایک دوسرے پر سبقت کرنے لگیں۔''

نمازِ مغرب کی فضیلت اور اس پر محافظت:

سابق میں چار نمازوں کی فضیلت اور ان پر محافظت کے سلسلے میں متعدد احادیث آگئی ہیں۔ پانچویں نماز ہے نمازِ مغرب۔ خاص نمازِ مغرب کے نام سے مطلق تو ہمیں کوئی حدیث نہیں ملی، جس میں اس کی فضیلت اور اس پر محافظت کا ذکر ہو۔ البتہ بعض مطلق احادیث میں فرض نمازوں کو بروقت ادا کرنا اور محافظت کا ذکر آیا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ نمازِ مغرب بھی ان میں شامل ہے۔ دو ٹھنڈی نمازوں کی فضیلت صحیح بخاری ومسلم کی ایک حدیث میں آئی ہے اور ان ٹھنڈی نمازوں میں سے ایک اس نمازِ مغرب کو بھی شمار کیا گیا ہے، چنانچہ صحیحین میں حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

《مَنْ صَلَّى الْبَرْدَيْنِ دَخَلَ الْجَنَّةَ》[2]

''جس نے دو ٹھنڈی نمازیں پابندی سے ادا کیں، وہ جنت میں داخل ہوگیا۔''

اِن دونوں نمازوں سے مراد تو فجر اور عصر ہیں اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں ان دونوں کے نام بھی وارد ہوئے ہیں۔ البتہ حضرت ابوعبید رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ نمازِ مغرب بھی اس میں داخل

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٥) صحيح مسلم مع شرح النووي (٤/ ١٥٧) صحيح سنن النسائي، رقم الحديث (٥٢٦) صحيح الجامع (٥/ ٧٩)

[2] صحيح البخاري (٢/ ٥٢) صحيح مسلم (٣/ ٥/ ١٣٥) صحيح الجامع (٣/ ٥/ ٣١١)

ہے۔ ویسے تو نمازِ عشا وقت کے لحاظ سے اس سے بھی ٹھنڈی ہوتی ہے، مگر اُسے کسی نے اس حدیث میں داخل نہیں کیا، کیونکہ وہ رات کی نماز شمار ہوتی ہے، جب کہ ٹھنڈی نمازوں کو دن کی نمازیں کہا گیا ہے، جیسا کہ امام خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ عصر و فجر کو ٹھنڈی نمازیں اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ دونوں دن کے ٹھنڈے اوقات میں ادا کی جاتی ہیں، جو اس کے اطراف یعنی آغاز و اختتام ہیں۔ جب طلوعِ آفتاب سے پہلے پڑھی جانے والی نماز کو آغاز شمار کر لیا گیا ہے تو مغرب کو اختتامِ دن کی نماز شمار کیا جا سکتا ہے۔ ابو عبید رحمہ اللہ نے غالباً اسی وجہ سے نمازِ مغرب کو اس حدیث میں داخل قرار دیا ہے۔[1]

جب کہ بعض دیگر احادیث سے بھی نمازِ مغرب کی فضیلت اَخذ کی جاسکتی ہے، جو اگرچہ نمازِ مغرب کے ساتھ تو خاص نہیں، بلکہ نمازِ پنج گانہ سے متعلق ہیں، لیکن چونکہ یہ بھی نمازِ پنج گانہ میں سے ایک ہے، لہٰذا یہ بھی اس فضیلت کی حامل ہے جو احادیث میں وارد ہے، جیسا کہ ان احادیث میں سے بعض ہم آگے ذکر کرنے والے ہیں۔

[1] فتح الباري (٢/ ٥٣)

مصادر و مراجع

نمبر شمار	اسم الکتاب	طبع
۱	قرآن الکریم	
۲	ابن جریر طبری ۔ تحقیق احمد شاکر ۔ محمد شاکر	دار المعرفة القاهرة
۳	ابن کثیر (عربی)	بيروت
۴	ابن کثیر (اردو)	لاهور
۵	سنن أبي داود	مكتبه رياض الحديثة
۶	سنن أبو داود مع عون المعبود	طبع مدنى
۷	الإجماع لابن المنذر. تحقیق ڈاکٹر ابو حماد صغیر احمد	رياض
۸	أحكام الجنائز للالباني	بيروت
۹	أحكام القرآن جصاص	طبع بيروت
۱۰	إحياء علوم الدين للغزالي	دمشق
۱۱	آداب الزفاف ـ الألباني	المكتب الإسلامي
۱۲	الأدب المفرد ـ للبخاري	اوقاف الامارات
۱۳	الأذكار ـ للنووي	دمشق
۱۴	إرواء الغليل ـ للألباني	المكتب الإسلامي
۱۵	أضواء البيان ـ للشنقيطي	القاهره (مصر)
۱۶	الاعتصام للشاطبي ـ تحقیق وتعریف: علامہ محمد رشید رضا	مصر
۱۷	الإعلام بنقد كتاب الحلال والحرام. ڈاکٹر الفوزان	الرياض
۱۸	أعلام أهل العصر	طبع الهند

#	الكتاب	الناشر
۱۹	أعلام الموقعين ـ لابن قيم	دار الفكر ـ بيروت
۲۰	إقتضاء الصراط المستقيم ـ تحقيق ڈاکٹر ناصر العقل	مطبوع على نفقه امير سلطان بن عبد العزيز آل سعود
۲۱	الاقناع مع كشّاف القناع	مطبوعه حكوميه مكه المكرمة ـ بأمر شاه فيصل
۲۲	الأوسط ـ لامام ابن المنذر، تحقيق ڈاکٹر صغير احمد	مكتبه دار الطيبة ـ رياض
۲۳	بخاري مع الفتح البارى	طبع دار الإفتاء ـ رياض ـ سعوديه وطبع مكتبه سلفيه مدينه منوره
۲۴	بدائع الصنائع ـ علامه كاساني	دار الكتاب العربي
۲۵	بدائع الفوائد ـ ابن قيم	دار الكتاب العربي
۲۶	بداية المجتهد ـ لابن رشد	مؤسسه ناصر
۲۷	بذل المجهود شرح سنن أبي داود	طبع ثالث ـ بيروت
۲۸	بلوغ المرام مع سبل السلام ـ لابن حجر	دار إحياء التراث العربي
۲۹	بلوغ الأماني ـ شرح مسند احمد	طبع دار الشهاب ـ قاهره
۳۰	بهشتى زيور (مكمّل ومدلّل) اشرف على تهانوى	تاج كمپنى ـ لاهور
۳۱	تحفة الأحوذي شرح سنن الترمذي ـ مولانا عبد الرحمان مباركپورى	طبع قديم وطبع مدنى
۳۲	ترجمة وحاشية قرآن ـ شاه رفع الدين	تاج كمپنى ـ لاهور
۳۳	ترجمه حاشية (قرآن) مولانا مودودى	إدارة ترجمان القرآن ـ لاهور
۳۴	ترجمة وحاشية ـ شيخ الهند مولانا محمود الحسن علامه شبير احمد عثمانى	جرمنى
۳۵	ترمذي شريف مع تحفة الأحوذي	طبع مدنى

٣٦	الترغيب والترهيب للمنذري تحقيق محی الدين عبد المجيد	طبع مصر
٣٧	تطهير المجتعات (عربی)	طبع قطر
٣٨	تفسير الكشفاف للزمخشري	دار المعرفة ۔ بيروت
٣٩	تفسير مجاهد ۔ مولانا عبد الرحمن سورتي	طبع قطر
۴٠	تفهيم القرآن ۔ مولانا مودودي	ادارة ترجمان القرآن ۔ لاهور
۴١	تقريب التهذيب۔ لابن حجر	نشر السنة ۔ لاهور
۴٢	تلخيص الحبير ۔ لابن حجر	جامعه سلفيه ۔ فيصل آباد
۴٣	تمام المنّه ۔ للالباني	دار الراية ۔ رياض
۴۴	التمهيد ۔ لابن عبد البر	طبع مرائش
۴۵	تهذيب معالم السنن لابن قيم على عون المعبود	طبع مدنی وطبع دار المعرفة۔ بيروت
۴٦	جامع الأصول لابن أثير	طبع دار الافتاء وطبع اول قاهره
۴٧	جديد فقهي مسائل. مولانا محمد خالد سيف اللّٰه فاضل ديوبند	مجلس تحقيقات اسلامی حيدر آباد (انڈيا)
۴٨	جلالين (تفسير)	دار المعرفة ۔ بيروت
۴٩	حاشيه دهلوي على بلوغ المرام	المكتب الاسلامی
۵٠	الحاوي للفتاویٰ۔ السيوطي	طبع بيروت
۵١	حجة اللّٰه البالغة (مترجم اردو) ۔ مولانا عبد الحق حقّاني.	طبع كراچی
۵٢	حجة النبﷺ. للألباني	المكتب الإسلامي
۵٣	الحلال والحرام في الإسلام ۔ يوسف قرضاوي	المكتب الإسلامي
۵۴	الحلال والحرام (اردو وترجمه)مولانا شمس پر زاده	الدار السلفية ۔ بمبئی

۵۵ دار قطني مع التعليق المغني ـ عظيم آبادي — نشر السنة ـ ملتان

۵۶ رحمة للعالمين ـقاضي سيد محمد سليمان منصور پوری — شيخ غلام علی ـ لاهور

۵۷ راهِ سُنَّت ـ أبو عبد السلام مفتي مولانا محمد صديق — سرگودها

۵۸ روح المعاني — طبع بيروت

۵۹ الروضة الندية ـ نواب صديق حسن خان. — دار إحياء التراث العربي

۶۰ روضة المحبّين ـ لابن قيم. — دار المعرفة ـ بيروت

۶۱ رياض الصالحين ـ تحقيق الأرناؤوط. — دار الكتب العلمية

۶۲ زاد المسير ـ لابن قيم — المكتب الإسلامي

۶۳ زاد المعاد لابن قيم ـ تحقيق الأرناؤوط — مؤسسة الرسالة ـ مكتبة المنار الإسلامية

۶۴ زاد المعاد ـ بلا تحقيق — طبع قديم

۶۵ الزواجر ـ للهيثمي — طبع بيروت

۶۶ سبل السلام شرح بلوغ المرام ـ للصنعاني — طبع بيروت وطبع مصر

۶۷ سلسلة الأحاديث الصحيحة ـ الألباني — المكتب الإسلامي

۶۸ سلسلة الأحاديث الضعيفة ـ الألباني — المكتب الإسلامي

۶۹ سنن ابن ماجه ـ تحقيق محمد فؤاد عبد الباقي — دار إحياء التراث العربي

۷۰ السنن المبتدعات ـ محمد بن عبد السلام — دار الكتب العلمية

۷۱ سوئے حرم ـ محمد منیر قمر — طبع مكتبه كتاب وسنت ريحان چيمه (سيالكوٹ)

۷۲ شرح السنة ـ للبغوي — المكتب الإسلامي

۷۳ الشرح الصغير ـ للدردير — طبع على نفقة شيخ راشد ـ حاكم دبئی

۷۴ شرح صحيح مسلم مع النووي. — دار المعرفة و دار إحياء التراث

۷۵ شرح نخبة الفكر. طبع قديم

۷۶ شفاء الغِلل في شرح كتاب العلل ـعلامة مباركپورى مع التحفة. طبع مدني

۷۷ صحيح ابن حبان (الموارد) دار الكتب العلمية

۷۸ صحيح ابن خزيمة ـ تحقيق الأعظمي طبع رياض

۷۹ صحيح الجامع الصغير ـ للألباني المكتب الإسلامي

۸۰ صحيح سنن ابن ماجة ـ للألباني مكتب التربية وتعليم لدول الخليج ـ الرياض

۸۱ صحيح سنن أبي داؤد ـ للألباني مكتب التربية و تعلم لدول الخليج۔ الرياض

۸۲ صححيح سنن الترمذي ـ للألباني مكتب التربية وتعلم لدول الخليج۔ الرياض

۸۳ صحيح سنن النسائي ـ للألباني مكتب التربية و تعليم لدول الخليج ـ الرياض

۸۴ صحيح مسلم مع تحقيق وتعليق محمد فواد عبد الباقي دار إحياء التراث العربي

۸۵ صلاة الرسولﷺ (مولانا حكيم محمد صادق سيالكوٹی تحقيق و تخريج. عبد الرؤف، عبدالحنان) مكتبه أشرفية۔ سند هو بلوكی

۸۶ ضعيف الجامع الصغير ـ للألباني المكتب الإسلامي

۸۷ علل في آخر الترمذي مع التحفة طبع مدنی

۸۸ عمدة القارئ شرح صحيح البخاري دار الفكر بيروت

۸۹ عمل اليوم و الليلة۔ للنسائي۔ تحقيق ڈاكٹر فاروق أحمد حماده مراكش

۹۰ عون المعبود شرح أبي داود. طبع قديم وطبع مدنی

۹۱	غاية المرام في تخريج أحاديث الحلال والحرام الألباني	المكتب الإسلامي
۹۲	غنية الطالبين (اردو) مولانا راغب رحماني	نفیس اکیڈمی کراچی
۹۳	فتاویٰ ثنائیہ	ادارة ترجمان السنة لاهور
۹۴	فتاویٰ عالمگیری	ادراہ نشریات اسلام لاهور
۹۵	فتاویٰ علماے حدیث ۔ مولانا محمد سعیدی	مکتبہ سعیدیہ خانیوال
۹۶	الفتاویٰ الہندیہ (عالمگیری ۔ عربی)	طبع مصر
۹۷	فتح الباري شرح صحيح البخاري ۔ لابن حجر	دار الافتاء ۔ رياض
۹۸	فتح الرباني	دار الشهاب ۔ قاهره
۹۹	فتح القدير ۔ للشوكاني	دار الفكر ۔ بيروت
۱۰۰	الفقه الاسلامي ۔ للزحيلي	دار الفكر
۱۰۱	فقہ السنۃ ۔ سید سابق	دار الكتاب العربي
۱۰۲	فقہ السنۃ (اردو) محمد عاصم حداد	مکتبہ چراغ راہ کراچی
۱۰۳	الفقه على المذهب الأربعة ۔ للجزيري	دار إحياء التراث العربي
۱۰۴	فوائد سلفية ۔ اشرف الحواشي (حاشية قرآن) مولانا محمد عبده الفلاح	لاهور
۱۰۵	الفوائد المجموعة ۔ الشوكاني	المكتب الإسلامي
۱۰۶	في ظلال القرآن ۔ سيد قطب شهيد	دار الشروق ۔ بيروت
۱۰۷	قاموس المحيط ۔ فيروز آبادي	مؤسسه الرسالة ۔ بيروت
۱۰۸	قبولیت عمل کی شرائط ۔ محمد منیر قمر	طبع مکتبہ کتاب وسنت ریحان چیمہ (سیالکوٹ)
۱۰۹	قدوري مع اللباب	الكتاب الإسلامي
۱۱۰	قرارات المجمع الفقه الاسلامي	رابطہ عالم اسلامی
۱۱۱	قرطبي (تفسير) الجامع لأحكام القرآن	طبع مصر

۱۱۲	القواعد النورانية ـ لا بن تيميه	مكتبة المعارف ـ الرياض وطبع قديم
۱۱۳	الكافي لابن عبد البر	مكتبه الرياض الحديثة
۱۱۴	كتاب الصلوٰة لابن قيم	اداره ترجمان السنة لاهور
۱۱۵	كنز الايمان	چاند كمپنى لاهور
۱۱۶	اللباب شرح قدوري	الكتاب الإسلامي
۱۱۶	مجمع الزوائد للهيثمي	مؤسسة المعارف
۱۱۷	المجموع للنووي شرح المذهب	مطبعة الامام ـ مصر
۱۱۸	مجموعة رسائل في الصلوٰة	طبع دار الافتاء سعوديه
۱۱۹	مجموع فتاوىٰ لابن تيميه	
۱۲۰	المحلىٰ لابن حزم ـ تحقيق ڈاكٹر عبد الغفار سليمان	دار الكتاب ـ بيروت
۱۲۱	مختار الصحاح ـ للرازي	دار الكتاب العربي
۱۲۲	مختصر ابن كثير ـ للرفاعي	طبع اولىٰ ـ بيروت
۱۲۳	مختصر بخاري ـ للألباني	المكتب الإسلامي
۱۲۴	مختصر الترغيب ـ لابن حجر	طبع مالى گاؤں ـ انڈيا
۱۲۵	مختصر الترغيب للشيخ مبارك تميمي ـ تحقيق ڈاكٹر محمد حسن خلوف	طبع على نفقه شيخ راشد ـ حاكم دبئى
۱۲۶	مختصر سنن أبي داؤد مع معالم السنن للخطابي و تهذيب لابن قيم	دار المعرفة ـ بيروت
۱۲۷	مختصر صحيح مسلم للمنذري ـ تحقيق الألباني	المكتب الإسلامي
۱۲۸	مختصر طبرى (علىٰ المصحف)	دار الشروق
۱۲۹	مراسيل أبي داؤد ـ تحقيق مولانا محمد عبده الفلاح	معهد الشريعة والصناعة كوٹ ادو

١٣٠ المرعاة شرح مشكوٰة ـ علامه عبيد اللّٰه رحمانى — سانگله هل

١٣١ مسلم شريف مع شرحه النووي — دار إحياء التراث العربي

١٣٢ مسند أحمد مرتب (الفتح الرباني) — دار الشهاب ـ قاهره

١٣٣ مشكوٰة شريف ـ تحقيق الألباني — المكتب الإسلامي

١٣٤ مصنف ابن أبي شيبة — الدار السلفية۔ بمبئى

١٣٥ معارف الحديث۔ مولانا نعماني — طبع لكهنؤ

١٣٦ معارف القرآن ـ مفتي محمد شفيع — ادارة المعارف ـ كراچى

١٣٧ معاشره کی مہلک بیماریاں ـ نصیر احمد ملّی ـ (اردو ترجمہ تطهير المجتمعات) — الدار السلفية۔ بمبئى

١٣٨ معالم السنن للخطابي — دار المعرفة۔ بيروت

١٣٩ المعجم المفهرس لألفاظ القرآن ـ محمد فواد عبد الباقي — طبع بيروت

١٤٠ المعجم المفهرس لألفاظ الحديث مستشرقين — ليڈن

١٤١ المعجم الوسيط — طبع بيروت

١٤٢ المغني لابن قدامة ـ تحقيق ڈاكٹر تركي — جامعة الإمام ـ الرياض

١٤٣ المغني لابن قدامة ـ تحقيق محمد خليل هراس — طبع مصر

١٤٤ المناسك ـ الألباني — المكتب الإسلامي

١٤٥ المنتقىٰ ـ لابن تيمية (أبو البركات) مع نيل الأوطار — طبع مصر و بيروت

١٤٦ مؤطا امام مالك مع تنوير الحوالك للسيوطي — دار الكتب العلمية

١٤٧ سنن النسائي مع تعليقات السلفية. — المكتبة السلفية۔ لاهور

١٤٨ نصب الراية ـ للزيلعي — المجلس العلمي

١٤٩ نيل الأوطار ـ للشوكاني — مصر و بيروت

جرائد ومجلّات

نمبر شمار	جرائد مجلّات	مقام اشاعت
۱	ماہنامہ محدّث	بنارس۔انڈیا
۲	ماہنامہ محدث	لاہور۔پاکستان
۳	ماہنامہ منار الاسلام (عربی)	وزارت امور اسلامیہ اوقاف۔ الامارت العربیہ المتحدہ
۴	ہفت روزہ الاعتصام	لاہور۔پاکستان
۵	ہفت روزہ اہلحدیث	لاہور۔پاکستان
۶	روزنامہ الاتحاد (عربی)	ابوظبی
۷	روزنامہ جنگ	لاہور۔پاکستان
۸	روزنامہ نوائے وقت	کراچی۔پاکستان